پاک و ہند میں مسلمانوں کا

نظامِ تعلیم و تربیت

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ رحمانیہ

520/-

پاک و ہند میں مسلمانوں

کا

نظامِ تعلیم و تربیت

مطبوعہ

حصہ اوّل

حضرت مولانا سیّد مناظر احسن صاحب گیلانی

مکتبۂ رحمانیہ

اردو بازار
لاہور - پاکستان

Marfat.com

نام کتاب : ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

تالیف : حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی

صفحات : ۷۴۴

بار : اوّل

مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور۔

قیمت :

ناشر

مکتبہ رحمانیہ، ۱۸ اُردو بازار، لاہور۔

Marfat.com

عنوانِ معذرت

جناب مؤلف مدظلہم کی اس عظیم الشان تالیف کا موضوع جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ ہے کہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے وقت سے آج تک مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہے، اس سلسلہ میں جگہ جگہ نہایت اہم اور دلچسپ اور حد درجہ مفید بحثیں آگئی ہیں، اس سلسلہ میں بیان کا تسلسل کچھ اس انداز کا ہے کہ کوشش کے باوجود عنوانات کی فہرست مرتب نہیں کی جاسکی، کتاب جن گوناگوں مورخانہ اور متصوفانہ مباحث پر مشتمل ہے اُن کو سامنے رکھ کر سیکڑوں عنوان دماغ میں آتے ہیں لیکن بحالت موجودہ اُن کو فہرستِ مضامین کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر نہیں رکھا جاسکتا، اس معذرت کے ساتھ چند بڑے عنوانوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

○

Marfat.com

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
تعارف	۵	معقولات کا الزام	۱۳۸
دیباچہ	۹	درجۂ فضل کی کتابیں	۱۴۵
تمہید	۱۵	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۵۳
ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا خاکہ	۱۵	اس معاشی انقلاب کا نتیجہ	۲۲۰
فراہمی کتب	۳۸	درس حدیث کی اصلاح	۲۴۰
ایک ذیلی بحث	۷۶	ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ	۲۵۸
تعلیمی مضامین	۱۱۰	اعادہ یا تکرار	۳۳۷

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال و انحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور اُن کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اور اُس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ و استیلاء پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر و نفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کرلیتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ اقوام اپنے قومی خصائص و روایات اور ملی شعائر و علامات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کردیتی ہیں بلکہ ایک مدت تک عملِ تجاذب کے مسلسل جاری رہنے کے باعث آخر کار وہ اُن سے نفرت کرنے لگتی ہیں اور اب اُن کے لیے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلیدی سرمایۂ افتخار رہ جاتی ہے ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان اربابِ فکر و علم نے اس خطرہ کا اُسی وقت احساس کرلیا۔ اور اُس کا سدباب کرنے کے لیے اُنھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اربابِ فکر کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشی اور دوربینی پر مبنی تھا، کیونکہ سیاسی طاقت و قوت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ مسلمان اپنی قومیت کا تحفظ کرسکتے اور مغلوب و محکوم ہونے کے باوجود بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہ سکتے۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے باوصف خود اربابِ فکر میں دو طبقے ہوگئے۔ ایک طبقہ جو علماء کرام

کا تھا اُس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصابِ درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعہ دینیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق بعض اور عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج کل کی عام اصطلاح میں اس طبقہ کو قدیم تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ گروہ علم اور عمل، وضع اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بالکل قدیم ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم وفنون کو سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس گروہ کو عام بول چال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چال ڈھال، وضع قطع اور فکر و دماغ کے اعتبار سے علماء کے گروہ کی ضد ہیں۔ بہر حال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک قدیم، دوسری جدید۔ ان دونوں قسم کی تعلیم کے لیے درسگاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں تعلیم جدید کی درس گاہ اسکول اور کالج کہلائی اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام بھی وہی پرانا مدرسہ رہا، اگرچہ یہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی تھیں اور اُن کی کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں، لیکن یہ امر نہایت افسوسناک تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک زنی پیدا ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا، یہ صورتِ حال ایک عرصہ تک قائم رہی۔

۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا زور ہوا تو اس تحریک نے علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر کھڑا کر دیا۔ اور اب دونوں طبقوں کی باہمی کشمکش اور آویزش خود بخود کم ہونے لگی، آپس کے میل جول باہمی تبادلۂ خیالات، وطنی اور ملکی سیاسیات، بین الاقوامی حالات سے واقفیت ان تمام چیزوں کا ایک نہایت اچھا

Marfat.com

اثر یہ ہوا کہ ہر طبقہ کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس پیدا ہوگیا، اس سلسلہ میں کبھی مسلم یونیورسٹی کے حلقہ سے آواز اُٹھی کہ مسلمانوں کو مغرب کی کورانہ تقلید نے ایک نہایت خطرناک راستہ پر ڈال دیا ہے، اُن کے نصاب تعلیم میں اسلامیات و دینیات کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہیے۔ اسی طرح علماء کرام کی زبان سے یہ بارہا سُننے میں آیا کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم سے قدیم فلسفۂ یونان وغیرہ ایسی غیر ضروری چیزوں کو خارج کرکے اُن کی جگہ جدید علوم عصریہ کو شامل کرنا چاہیے۔ مسلم یونیورسٹی کے حلقہ میں اصلاح کا جو نعرہ بلند ہوا تھا اُس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں جنم لیا اور اُدھر اصلاح نصاب عربی سے متعلق علمائے کرام کے جو خیالات تھے وہ ندوۃ العلماء کے محسوس پیکر میں ظاہر ہوئے۔ اب اس وقت بھی چار درسگاہیں ہیں جو مسلمانان ہند کی تعلیم کے مرکزی ادارے سمجھے جاتے ہیں، خالص دنیوی درس گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، خالص دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند دینی مگر دنیوی درس گاہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ دنیوی مگر دینی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حالات میں اب بھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی مشکلات کا حل اب تک زعمائے اسلام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی ضرورت اس شدومد کے ساتھ پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی کہ اب کیجاتی ہے۔ آئے دن اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں تحریروں اور تقریروں میں گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان سب امور کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کا کوئی خاطر خواہ حل دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقبل کے لیے اپنی تعلیم کا خاکہ مرتب کرتے وقت کبھی اپنی گذشتہ تعلیم کا پورا نظام پیش نظر نہیں رکھا۔ ورنہ اُن پر یہ حقیقت مخفی نہ رہتی کہ گذشتہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ایک ہی رہا ہے جو علوم دینیہ اور دنیویہ دونوں پر مشتمل ہوتا تھا، علوم دینیہ سے مُراد تفسیر و حدیث اور فقہ اور ان کے لوازم و

Marfat.com

مبادی ہیں اور علوم دنیویہ سے مُراد وہ علوم ہیں جن کا ہر زمانہ میں چرچا اور رواج رہا ہے اور جن کا پڑھنا پڑھانا، تہذیبی و تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں فکری یا عملی طور پر ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی گذشتہ تعلیم کے اس خاکہ کو پیش نظر رکھیں اور پھر اُس کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی نظامِ تعلیم مرتب کریں تو اُن کی بہت سی مشکلات اور بہت سے وساوس و شبہات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)، اسلامی ہند کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک بلند مقام کے مالک ہیں، سیکڑوں بلند پایہ محققانہ مقالات اور متعدد علمی اور وقیع تصنیفات آپ کی وسعتِ نظر اور علوم اسلامیہ و دینیہ میں آپ کی محققانہ بصیرت کی شاہد عدل ہیں حجم کی موزونیت کے لیے کتاب کو دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے، دوسرا حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ آپ کو اس کے لیے کچھ زیادہ دنوں تک زحمت کش انتظار نہیں ہونا پڑیگا، جیسا کہ آپ خود محسوس کرینگے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف نے نہایت جامعیت اور تفصیل سے اپنے مخصوص طرزِ انشا میں یہ بتایا ہے کہ ہندوستان میں شروع سے لے کر اب تک مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت کیا رہا ہے، نصاب تعلیم میں کن کن علوم و فنون کا درس شامل ہوتا تھا۔ طریق تعلیم کیا تھا؟ طلبا کے قیام و طعام کا کیا انتظام ہوتا تھا؟ اساتذہ اور طلبا کے آپس کے تعلقات کس نوعیت کے ہوتے تھے، عام لوگ اور امراء و اعیان ملک ان طلبا کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، پھر تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس کا بھی کتنا اہتمام ہوتا تھا۔ غرض یہ ہے کہ تعلیم اور تعلم سے متعلق بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو، اور جس پر فاضل مصنف نے سیر حاصل کلام نہ کیا ہو۔ بے شبہ اردو لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس جامعیت سے ہمارے گذشتہ نظامِ تعلیم و تربیت پر بحث کی گئی ہے

۶ جمادی الاول ۶۳ھ

عتیق الرحمن عثمانی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

دیباچہ

عجب اتفاق ہے، دار العلوم دیوبند کے مجلہ شہریہ "دار العلوم" کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیج دو، دار العلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کر کے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کر کے میں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب مآثر الکرام کو الٹنا پلٹنا شروع کیا، بعض کارآمد دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں، قلم اٹھایا، لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا، قلم رواں ہوا، چلا چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا، اور میں لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۵۰۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

یہ کیا ہے، کوئی مضمون ہے، مقالہ ہے، کتاب ہے، تجویزوں کا مجموعہ ہے یا تاریخی واقعات کا ذخیرہ مجھے خود نہیں معلوم، کیا ہے۔ ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری اور وہ بھی ایک خاص حال میں، تعلیم کے ابتدائی دن اپنے دیہاتی مستقر گیلانی (بہار) میں گذرے، وہاں سے اٹھا، راجپوتانہ ٹونک کی ایک معقولی اور منطقی آزاد درس گاہ مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں پہنچایا گیا، آٹھ نو سال وہاں گذارے، قسمت نے ٹونک سے دار العلوم دیوبند کے دینی حول میں پہنچا دیا، وہاں حدیث پڑھی، شیخ الہند حضرت سیدی و مرشدی مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

کی صحبت کی سعادت میسر آئی، علامہ کشمیری رحؒ سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اصغر حسین نیز دیگر اساتذہ کی عنایتیں شامل حال رہیں، دیوبندہی میں دار العلوم کے ماہوار مجلات القاسم والرشید کی ادارت، کچھ درس و تدریس کی خدمت انجام دیتا رہا۔ وہاں سے بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ مونگیر پہنچا دیا گیا، تقریباً سال ڈیڑھ سال کے قریب قریب خانقاہی زندگی جس میں ندوۃ العلمائی رنگ بھی بہرحال جاری و ساری تھا، گذاری، اور مقدر نے بالآخر میرا آخری ٹھکانہ مشرق کی اس جامعہ کو بنایا جس نے پہلی دفعہ مغربی علوم و فنون طور طریقہ، رنگ ڈھنگ میں مشرقیت کے اجزاء و عناصر شریک کیے ہیں بیس سال سے زیادہ مدت گذری جب سے زیر ظل عافیت سلطان العلوم، سلطان الشعراء، شاہ جم جاہ معارف پناہ مخدوم الملت، محبوب الامۃ، سراج الشرق، وارث السلطنت للعلیہ، شہریار دکن جلالۃ الملک النواب میر عثمان علی خاں بہادر ادام اللہ نصرہ العزیز و خلد اللہ ملکہٗ اسی جامعہ میں معلم الصبیانی کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ خالص مشرقی مدارس کی تعلیم کے بعد مغربی طرز کی اس جامعہ کے ہر شعبہ میں میرے عملی اشتراک نے خیالات کا ایک سلسلہ تعلیم کے متعلق پیدا کر دیا ہے، خود نہ مجھ میں عزم ہے نہ ارادہ، عمل کی قوت سے تقریباً محروم ہوں، اور عمر بھی جو کام کرنے کی ہو سکتی ہے، گذر چکی، منتشر طریقہ سے برسوں کے یہی مدفونہ خیالات آپ کو ان اوراق میں بکھرے ہوئے نظر آئینگے۔ مقصد میرا صرف عہد ماضی کے تعلیمی نظام کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنا تھا، لیکن واقعات کو درج کرتے ہوئے میرے ذاتی خیالات بھی بے چین ہو ہو کر قلم سے ادھر ادھر ٹپکتے چلے گئے ہیں، اسی لیے اب اس کتاب کی حیثیت نہ کسی تجویزی مضمون کی باقی رہی اور نہ کسی تحقیقی مقالہ کی، اور سچ تو یہ ہے کہ تجویز ہو یا تحقیق دونوں سے مجھے کوئی خاص لگاؤ بھی نہیں بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری، ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والوں سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے، وہ بھی کل بیس دن کی یہ محنت ہے۔ طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی، لکھتا چلا گیا، اور اسی مسودہ کو پریس

میں بھیج رہا ہوں عجلت ہی کی وجہ سے فارسی کے اقتباسی و استدلالی فقرات کا ترجمہ بھی نہ کر سکا، کچھ اس پر بھی اعتماد ہے کہ اُردو پڑھنے والی جماعت ابھی فارسی سے اتنا زیادہ بیگانہ نہیں ہوئی ہے کہ است و بود کے ترجمہ کی بھی حاجت ہو، اسی لیے جہاں جہاں کوئی نادر و ناموس الفاظ آئے ہیں اُن کے معانی لکھ دیے گئے ہیں، بعض فقرے اگر مشکل تھے تو ان کا ترجمہ یا حاصل ترجمہ درج کر دیا گیا ہے، اس پر بھی اگر لوگوں نے دشواری محسوس کی تو آئندہ اشاعت میں ان شاء اللہ سب کا ترجمہ کر دیا جائیگا، اگرچہ ضخامت کتاب کی بلاوجہ بڑھ جائیگی اور بہت زیادہ بڑھ جائیگی بہر حال جس حال میں کام ہوا ہے، نقائص کا رہ جانا ایسی صورت میں خلاف توقع نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مواقع میں بے ربطی بھی نظر آئے، ایک تو یونہی میرا دماغ کچھ غیر مربوط سا فطرتاً ہے، اسی کے ساتھ پندرہ بیس دن میں فنی ترتیب آسان بھی نہ تھی، اب تو جو حاضر پیشکش ہے، دل صد پارہ کی چند ٹوٹی پھوٹی قاشیں ہیں، شاید کہ ان کا بھی کوئی خریدار نکل آئے کہ دلکل ساقط لاقطۃ پڑھنے والوں سے اتنی التجا ضرور ہے کہ حسب ذیل امور کا خصوصی طور پر توجہ کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔

(۱) اس وقت ملک میں دو مستقل تعلیمی نظامات کے برخلاف وحدت نظام کی جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے، اور جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کیا وہ واقعی قابلِ توجہ محل نظر و فکر نہیں ہیں؟

(۲) وحدتِ تعلیم کے نفاذ سے پہلے عربی کے غیر سرکاری آزاد مدارس میں غیر مقابلاتی صناعات اور معاشی فنون کے اضافہ کا جو مشورہ دیا گیا ہے وہ کس حد تک قابلِ عمل ہے۔

(۳) جامعاتی اقامت خانوں کے فردسی نظامات کیا ہندستانی طلبہ کے آئندہ معاشی توقعات کی بنیاد پر قابلِ نظر ثانی نہیں ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا جو نقشہ خاکسار نے پیش کیا ہے، مروجہ طریقوں کے مقابلہ میں کیا وہ زیادہ نتیجہ خیز اور مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۵) دماغی تنور کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں قلبی تنوم و خوابیدگی کا جو عارضہ پھیل رہا ہے کیا اس کے نتائج اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔

یہ چند کلیاتی امور ہیں جنہیں اس کتاب کے مختلف مقامات پر آپ کو ڈھونڈھنا چاہیے ان کے سوا تصوف اور صوفیا کے متعلق جن بدگمانیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے میں چاہتا ہوں کہ وہی لوگ نہیں جو ان بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہیں بلکہ روٹھے ہوؤں سے بھی عرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے مخلی بالطبع ہو کر آپ کو واقعات پر غور کرنا چاہیے۔ ان امور کے سوا اصل کتاب میں یا حواشی اور فٹ نوٹس میں جن جزئیات کا موقعہ موقعہ سے ذکر کرتا چلا آیا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ ان شاء اللہ مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ ان سے ہوگا خصوصاً اس ملک میں جس کا سب کچھ چھن چکا ہے۔ لے دے کر پچھلوں کا اپنے اگلوں، اُن کی عظمتوں اور کارناموں پر جو تھوڑا بہت ناز باقی تھا، اس پر بھی ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں، غیروں سے کہلوایا جاتا ہے کہ

ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ایک محقق کو (ایسا محقق جس نے ہندوستان کی شاید ہی کبھی صورت دیکھی ہو بلکہ پیرس کی گلیوں میں ہندوستان کو ڈھونڈھتا رہا۔ ہاں تو اسی محقق کو) محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب (اسلام) کی بُری طرح مٹی پلید ہوئی۔ (تمدن ہند از محقق لیبان صاحب ص۲۳)

اور جو اپنے ہیں وہ اسی کو شہادت قرار دے کر تشریح کرتے ہوئے اقرار کرتے ہیں کہ

"اس ملک کی قسمت میں اسلام کے ایسے پیامبر (صوفیا و علما) آئے جو اس کے دینی اسلام کے، احکام سے بھی صحیح طور پر واقف نہ تھے، اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی تو اس پر عامل نہ تھے" (الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر)

کتنی مطابقِ واقعہ توجیہ ہے کہ

"اللہ کی کتاب عربی زبان ہے، اور یہ خدا کے بندے (ہندوستان میں اسلام کے پیامبر) فارسی لکھتے اور بولتے تھے، عربی سے اُن کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا (مجلہ الفرقان)

لہ ملاحظہ ہو ص ۱۳۱۔

سب کا خلاصہ آخر میں ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔

"نتیجۃً ظاہر ہے بھارت کی سرزمین پر حجاز سے نکلے ہوئے نکھرے ہوئے توحیدی مذہب کی مٹی پلید ہوگئی"۔

الغرض اسلام کی مٹی کو پلید ہوتے ہوئے غریب لبنان نے تو دور سے دیکھا تھا، وہ بیچارہ خدا جانے اسلام سے بھی واقف ہے یا نہیں، اور ہمارے بزرگوں کو تو وہ کیا جان سکتا ہے، جب ان ہی سے پیدا ہونے والی نسلوں کو اپنے بھارت کی پوتر سرزمین میں یہ نظر آرہا ہے کہ جن سے ان کو صرف وجود اور وجود کے سارے لوازم ہی نہیں بلکہ اگر انصاف کرینگے تو نظر آئیگا کہ ان ہی سے دین بھی ملا ہے اور ایمان بھی علم بھی اور فضل بھی، وہی اسلام کی مٹی پلید کرنے والوں کی شکل میں دکھائی دے رہے ہیں، اللہ اللہ حکومت کی جادوگری: تیرا کیا کہنا ہے، کہ

ناموس چند سالہ اجداد نیک نام درزیر پائے غرب و رسیر حرش نہادہ ایم

جن صاحب کے مضمون سے میں نے مذکورہ بالا چند فقرے نقل کئے ہیں، کوئی ناواقف عامی آدمی نہیں، انگریزی درسگاہوں کے بگاڑے ہوئے بھی نہیں بلکہ ایک مشہور مرکزی اسلامی دارالعلوم کے چند ممتاز رشتہ پاروں میں آپ کا شمار ہے، ان کے علم و فضل کا مجھے بھی اعتراف ہے، نیازمندی کا تعلق رکھتا ہوں، اسی لئے تکلیف بھی زیادہ ہوئی، عزیزوں کے اس حال پر جگر پھٹتا ہو، کلیجے کے ٹکڑے اڑتے ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، خیال تو کیجئے ایک اچھے لکھے پڑھے عالم کے قلم سے جب یہ الفاظ نکلیں کہ ہندوستان میں

(حاشیہ صفحہ ۱۲) اس غیر ذمہ دارانہ قلم کی ان بے باکیوں کو ملاحظہ فرمائیے ہندوستانی علماء و صوفیہ کو عربی سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا، جن صاحب نے یہ الفاظ لکھے ہیں، کیا وہی بتا سکتے ہیں کہ خود انہوں نے یا ان کے اساتذہ یا اساتذہ کو جو کچھ بھی عربی آتی ہے، وہ بیرون ہند کے کسی عالم سے سیکھی گئی ہے، خیر اس کی تفصیل تو آئندہ آپ کتاب میں پڑھینگے لیکن سردست میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جن اسلامی ممالک کی زبان عربی ہے، جو فارسی نہیں عربی ہی میں لکھتے اور بولتے ہیں کیا وہاں کے عوام نے اسلام کو اپنی اصلی صورت پر باقی رکھا ہے، مصر ہو یا عراق، شام ہو یا الجیریا، بلکہ خود عرب ہی کا کیا حال ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اسلام اب بھی بسا غنیمت ہے، آج بھی غنیمت ہے، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کل بھی غنیمت تھا، چند جزئی واقعات سے کلیات بنا لینے کی مشق جن استادوں نے سکھائی ہے اب اس مشق سے اس کے برعکس بھی تو کام لے سکتے تھے، بجائے مسجد کنی کے ہاتھ کے اس تیشہ سے ہیزم شکنی کا بھی تو امکان تھا، فتل من مدکر!

Marfat.com

"دین توحید ہندوانہ آلودگیوں سے لت پت ہوگیا، اللہ کی کتاب سامنے نہ ہوتو پھر ہندوانہ عقیدوں دیدانت کی دوراز کار موشگافیوں کا اسلامی عقائد میں گھُل مل جانا کیا تعجب ہے"

کیا تماشے کی بات ہے، دعویٰ خود کرتے ہیں اور دلیل میں پھر ان ہی آسمانی شہادتوں کو پیش فرماتے ہیں جو یورپ کے آسمانوں سے نازل ہورہی ہیں، یہ لکھتے ہوئے کہ شہادتیں سُن لیجیے "کتنی پاکیزہ شہادت سناتے ہیں، لیبان لکھتا ہے"

"اگر ہندوستان میں دین محمدی نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں، اور یہاں کے مذہب و عقائد میں کچھ تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے" بلکہ "ہندوان سے (مسلمانوں سے) اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا یہ (مسلمان) ہنود سے" ص ۱۲۵

تقریباً نصف صدی بلکہ کچھ زیادہ ہی مدت سے اس قسم کی ناوک اندازیوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ہے جو جاری ہے۔

اس کتاب میں رہ رہ کر ان ہی ٹیسوں، اور ہوکوں کی ہیچنیاں آپ کو محسوس ہونگی جوان ہی تیروں کے زخموں نے مجھ میں پیدا کیے ہیں، مجھے رُلایا گیا ہے، تب رویا ہوں، ستایا گیا ہے تب کراہا ہوں ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہو گئے ہوں، قابو سے قلم کہیں باہر ہو گیا ہو، اس میں مجھے معاف رکھا جائے گا، میں احسان فراموش ہوتا، اگر جاننے کے باوجود بھی نہ جاننے والوں کے سامنے واقعات کی حقیقی روئداد نہ پیش کرتا۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

بہر حال۔ زدیم صف رنداں و ہرچہ بادا باد۔

عبدہ الاٰمھن الجانی المغرور بالاماني

السید مناظر احسن الگیلانی غفر اللہ لہ ولمن رباہ

حیدرآباد دکن۔ جوار الجامعۃ العثمانیہ

صباح یوم الجمعہ ۲ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۴۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبحَانَ اللهِ وَبِحَمدِهٖ وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ رَسُولِهٖ وَعَبدِهٖ وَاٰلِهٖ وَصَحبِهٖ

کہنے والے نے کہا تھا اور کتنا سچ کہا تھا ؎

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
جی میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں

نہ ریل تھی، نہ موٹر، نہ تار اور نہ ٹیلی فون، اور نہ امنِ راہ کے یہ بلند بانگ دعوے، لیکن (عارف مشرق)

"شیخ طاہر جد شیخ عبدالعزیز قدس اللہ اسرارہما از ولایت ملتان رفتہ در بلدۂ بہار[1] رسید" (تذکرۃ الکرام وغیرہ)

---

[1] عجیب بات ہے کہ لفظ "بہار" جو "دیہار" کا ایک تلفظ ہے، یہ بدھ مذہب کی تعلیمی خانقاہوں کا نام تھا، اس صوبہ میں چونکہ اس مذہب کی تعلیم گاہوں کی کثرت تھی، حتی کہ اسی میں ہندوستانِ قدیم کا سب سے بڑا مرکز نالندا بھی موجود تھا جس میں کہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد بارہ بارہ ہزار تک پہنچ جاتی تھی، حال میں حکومت ہند نے راجگیر کے پاس مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کے قریب اس کے کھنڈروں کو نمایاں کیا ہے، میلوں میں معلوم ہوا کہ ہندوستان کے اس قدیم جامعہ کی عمارتیں دفن تھیں، جن لوگوں نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھا ہے اور اس کے بعد نالندے کے اس مدرسہ کی عمارت کو دیکھنے جاتے ہیں، اس کے دروازے اور اس کے اندر میں دارالطلبہ کے جو مختلف قطعات بنے ہوئے ہیں، جب ان کو دیکھتے ہیں تو دیر تک حیرت ہوتی ہے کہ آخر وہ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ نالندہ کے مدرسہ کا نقشہ جو تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کو دیکھ کر کسی نے دیوبند کی عمارتوں کا نقشہ قائم کیا ہے۔ یہی سرخ سرخ موٹی موٹی اینٹوں سے نالندہ کی بھی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جن سے دیوبند کے مدرسے کی عمارت بنی ہوئی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ قدیم ہند میں حالانکہ عموماً پتلی اینٹوں کا رواج تھا لیکن خلاف دستور نالندہ میں موٹی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب مٹی کے لوٹوں کا وہ ذخیرہ ہے جو اس "متکلفہ" آبادی سے برآمد ہوئے ہیں یعنی مسلمانوں کی مسجدوں میں مٹی کے بدھنے جیسے ہوتے ہیں بجنسہ اسی شکل و صورت کے ہزاروں کی تعداد میں نکلے ہیں۔ ڈھائی تین ہزار سال کے فاصلے کے بعد ہندوستان میں تاریخ نے واقعہ کو عجیب طریقہ سے دہرایا ہے کم از کم دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والوں کو ایک دفعہ تو نالندہ کے "دیہار" کا معائنہ ضرور کرنا چاہیے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے اگر نالندہ کی آخری یادگار زائد دیاقی ہے۔

یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دودمان عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکربار کے دادا شیخ طاہر ملتان سے چلتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے، سیکھتے ہوئے بالآخر بہار پہنچ جاتے ہیں اور "پیش شیخ بدھ حقانی تحصیل علم نمود" (اخبار الاخیار۔ ص ۱۹۵)

یوں ہی "ملا موہن بہاری قدس سرہ کہ نام اصلی او محی الدین است مولد و منشا بلدۂ بہار در نہ سالگی کلام اللہ حفظ کرد و بخدمت پدر خود ملا عبداللہ کسب علوم نمود و در ہفدہ سالگی فاتحۂ فراغ خواند چندے در وطن خود بہ درس وافادہ پرداخت بعد ازاں بہ ملازمت شاہجہاں بادشاہ رسید، و بہ تعلیم شاہزادہ محمد اورنگ زیب معین گردید" (مآثر الکرام ص ۴۳)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵) قرار دیا جائے جیسا کہ ہندی زبان کا دستور ہے تو دیوہند و نالند ہم قافیہ الفاظ بھی ہیں۔ بہرحال اسی مدرسہ یا اس کے ساتھ دوسرے ذیلی مدارس کی وجہ سے بہار کا نام بہار ہوگیا ہے۔ اسلامی عہد میں بھی ابوالفضل نے بہار کے شمالی حصہ ترہٹ کے متعلق لکھا ہے "ترہت از دیرگاہ بنگاہ (مرکز) ہندی دانش" آئینِ اکبری ج ۲ ص ۶۷، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہندی دانش" (فلسفۂ ہند) کا بہار مدت تک مرکز رہا میں نے جو عبارتیں مآثر الکرام سے نقل کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی علوم کی مرکزیت کا مقام بھی بہار کو اسلامی عہد میں حاصل تھا، ملتان سے لوگوں کا بہار پڑھنے کے لیے آنا صاحبِ قرآن شاہجہاں کا اپنے سب سے بڑے اقبالمند بیٹے اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے بہار ہی سے ایک عالم ملا موہن کو بلانا آخر کس بات کی دلیل ہے کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیری عہد میں اسلام نے جو سنبھالا اس ملک میں لیا اس میں ملا موہن کی تعلیم کو دخل نہ تھا خصوصاً جب ملا موہن کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی تعلیم کی ابتداء اور انتہا دونوں بہار ہی میں ہوئی، بہار ہی سے وہ پڑھ کر دلی آئے اور شاہزادہ کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ بہرحال مجھے تو اس لفظ بہار کی وجہ تسمیہ کو ظاہر کرنا تھا، عجیب بات ہے کہ بخارا جو مشرقی ممالک کا علمی و اسلامی مرکز تھا کہتے ہیں کہ وہ بھی اسی "دیہارا" کا ایک تلفظ ہے جس کی تصدیق ان سرحدی پٹھانوں کے تلفظ سے ہوتی ہے جو ح کو ہمیشہ خ کی شکل میں تلفظ کرتے ہیں۔ بلخ کا مشہور تاریخی نوبہار بھی بودھسٹ مذہب ہی کی خانقاہ کا نام تھا ابوالفضل نے بودھ کے ذکر میں بدھا کا نام شاکیہ منی بتا کر اس کے باپ کا نام درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پدر او (بدھا) راجہ سدھودن مرزبان بہار" جس کا مطلب یہی ہوا کہ سدھودن یعنی بدھا کے والد کی راج دہانی بہار ہی میں تھی، لیکن شاید انگریزی تقسیم میں اس کو گورکھپور میں شامل کر دیا گیا ہے، مگر بدھا اور بدھسٹ مذہب کو جو تعلق بہار سے ہے اس سے ابوالفضل ہی کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ اسلامی عہد میں بہار کا صوبہ جونپور تک کے علاقہ کو شامل تھا، زمانیہ، غازی پور، بلیا یہ سب بہار ہی کے اضلاع تھے۔

Marfat.com

پڑھنے کے لیے ایک شخص ملتان سے بہار جا رہا ہے اور پڑھانے کے لیے دوسرا بہار سے دلی آ رہا ہے، یہ تھا آمد و رفت کا وہ سلسلہ جس کا تانا ہند کے اس فراخنائے اعظم میں بندھا ہوا تھا مشرق سے مغرب، مغرب سے مشرق، جنوب سے شمال، شمال سے جنوب، قافلوں پر قافلے تھے جو چلے آ رہے تھے چلے جا رہے تھے تاکہ سیکھا جائے یا سکھایا جائے، پڑھا جائے یا پڑھایا جائے۔ ہزارہا میل مربع سرزمین کی اس وسعت کا اندازہ کیجیے، سوچیے کہ ہر صوبہ، ہر صوبہ کی ہر سرکار، ہر سرکار کے ہر پرگنے میں قضاۃ بھی ہیں، مفتی بھی ہیں، مدرسین بھی ہیں اور صاحبانِ ہدایت وارشاد بھی ہیں، کیسا عجب زمانہ اور کیسا دلچسپ تماشا تھا حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں، گویا اپنی آنکھوں دیکھی شہادت پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہندستان کی عام نہیں خاص اور اعلیٰ تعلیم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

اگرچہ جمیع صوبہ جات ہندبہ وجود حاملانِ علوم تفاخر دارند سیما حصار پائے تخت خلافت یعنی دلی، کہ بواسطہ مرجعیت صاحب کمالان ہر قسم درآنجا فراہم می آیند واز تزاکم افکار واجتماع عقول اہلِ عصر کمالات نفس ناطقہ راچہ علم عقلی ونقلی وچہ غیر آں بہ پایہ بالا ترمی سازند[۲۲]

ان مختصر الفاظ میں اسلامی ہندوستان کے علمی ارتقاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے ایک ایسے شخص کے قلم سے جو افکار کے اس تزاکم اور عقول اہلِ عصر کے اسی اجتماع سے خود بھی مستفید ہو کر علم کو ایک زینہ سے اٹھا کر دوسرے زینہ تک چڑھانے میں مصروف تھا اپنے اندر بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد چونکہ خود "پورب" یعنی بلگرام کے رہنے والے ہیں، ہندستان کی حد تک انہوں نے وہیں پڑھا، اور پورب ہی میں سیکھا جو کچھ سیکھا۔ اس لیے جن لوگوں میں خود تھے کافی قرب کی وجہ سے انہی لوگوں کے معائنہ کا ان کو کافی موقع ملا تھا۔ سبحۃ المرجان میں الفوار بہ جو خود ان ہی کا گھڑا ہوا لفظ ہے یعنی فورب (پورب) سے بنایا گیا ہے مراد پورب کے علماء ہیں۔ اس لفظ کی

Marfat.com

تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

الفوادبة جمع الفوربی نسبة الی الفورب	الفوادبہ الفوربی لفظ کی جمع ہے یعنی پورب کی طرف
معرب پورب بضم الباء الفارسیة و	جو پورب کا معرب ہے یہ نسبت ہے، اور پورب دلّی
ھو ملك وسیع فی الجانب الشرقی من	سے بجانب مشرق ایک وسیع ملک کا نام ہے دراصل
دھلی و عبارة عن ثلاث صوب صوبه	پورب کا اطلاق تین صوبوں پر ہوتا ہے صوبا اودھ اور صوبہ
اودھ و صوبہ الہ آباد و صوبہ عظیم آباد	الہ آباد، صوبہ عظیم آباد (یعنی جواب پٹنہ کے نام سے مشہور ہے)

پھر لفظ صوبہ کی تشریح ان الفاظ میں کرنے کے بعد

والصوبہ عبارة عن ارض وسیعة محدودة	الصوبہ دراصل بڑی فراخ محدود زمین کا نام ہے جس میں
فیھا دار الامارة و بلدان اخرلھا توابع	صوبہ کا دار الامارۃ (کیپٹل) اور دوسرے شہر ہوتے ہیں
وکل بلدة لھا قصبات تضاف الیھا	ہر شہر کے ساتھ چند قصبے (پرگنے) اور ہر قصبہ کے ملحق میں مختلف
وکل قصبة لھا قری تضاف الیھا	دیہات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے پرگنوں کی طرف منسوب ہیں۔

مولانا آزاد غلام علی بلگرامی[1] رحمۃ اللہ علیہ اسی کے بعد پھر فرماتے ہیں :-

وقصبات الفورب فی حکم البلدان لانھا	دراصل پورب کے قصبات کی حیثیت شہروں کی ہے
مشتملة علی العمارات العالیة و علی	کیونکہ اونچی اونچی عمارتوں سے عموماً یہ معمور ہیں ان
محلات الشرفاء والنجباء والمشائخ والعلماء	میں شرفاء، نجباء، مشائخ (صوفیا) علماء کے مستقل محلے
وغیرھم من الاقوام المختلفة وارباب	ہیں جن کا تعلق مختلف قوموں سے ہے۔ ان قصبوں

---

[1] اس زمانہ میں بلگرام کے باشندے چونکہ امامیہ مذہب رکھتے ہیں، اس لیے اس کا گوش گذار کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنا تذکرہ مولانا غلام علی نے جہاں درج فرمایا ہے وہاں لکھتے ہیں : الفقیر غلام علی بن السید نوح الحسینی نسباً والواسطی اصلاً والبلگرامی مولداً ومنشاءً والحنفی مذہباً والچشتی طریقۃً " صرف الچشتی نہیں بلکہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد آخر جس کے الفاظ یہ ہوں " المجدد الثانی والبرہان الساطع علی شرفیۃ النوع الانسانی سحاب ہاطل روی العرب والعجم امطارہ نیر اعظم بلغ المشارق والمغارب انوارہ الخ سبحۃ المرجان۔ ان کے مشرب کے لیے اتنی شہادت کافی ہے۔

الحِرفِ المتنوعۃ وعلی المساجدُ المدارس والصوامع ومساجد ھامعمورۃ بصلوٰۃ الجمعۃ والجماعات یصحان یطلق علی القصبۃ اسم البلدۃ (ص ۵۳)

میں مختلف پیشوں اور دستکاریوں کے جاننے والے بھی رہتے ہیں ان میں مساجد بھی ہیں مدارس بھی ہیں خانقاہیں بھی ہیں۔ ان قصبوں کی مسجدیں جمعہ اور جماعت سے ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ ان قصبوں کو بجائے قصبہ کے شہر کا نام دینا درست ہے۔

یہ بیان تو پورب اور نواربہ کے متعلق سبحۃ المرجان میں ہے۔ مآثر الکرام میں اسی پورب کے متعلق شاہجہاں بادشاہ اسلام انار اللہ برہانہ کے مشہور شاہانہ فقرہ "پورب شیرازِ مملکت ماست" کو نقل فرمانے کے بعد ہندوستان کے صرف اس ایک حصہ "پورب" کے علمی چرچوں کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ اس علاقہ میں

بہ فاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کروہ[1] تخمیناً آبادی شرفا و نجبا است کہ از سلاطین و حکام ذطائف وزمین مدد معاش داشتہ اند، و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہاں کشادہ و صدائے اطلبوا العلم در دادہ"

پھر اطلبوا العلم کے اس صلائے عام کی تعمیل جس شکل میں ہوتی تھی اس کی تصویر مولانا ہی کے قلم نے یہ کھینچی ہے۔

"طلبۂ علم خیل خیل (گروہ در گروہ) از شہرے بہ شہرے می روند و ہر جا موافقت دست دہد بہ تحصیل مشغول می شوند"

ان طلبہ کے طعام و قیام کے نظم کی جو صورت تھی اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ می دارند و خدمت ایں جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند"[2]

گویا آج بورڈنگ ہاؤس اور اقامت خانوں کے کپکپا دینے والے مصارف سے تعلیم کے جس مسئلہ کو حل کیا جا رہا ہے، پڑھنے والے بچوں کے ماں باپ جن مصارف کی تکمیل میں دیوانے بنے ہوئے ہیں

[1] مغل عہد میں میل اور کوس کے سوا کروہ سے بھی مسافت کا اندازہ کیا جاتا تھا موجودہ زمانہ میں دو میل ہی کے قریب قریب اسے سمجھنا چاہیے۔

[2] مآثر الکرام۔ ص ۲۲۲۔

جائدادوں کو بیچ بیچ کر بلکہ بسا اوقات ماں اور بہنوں کے زیوروں کو بھی فروخت کر کر کے جس مقصد کو آج ہندوستان میں حاصل کیا جا رہا ہے۔ صرف دو ڈھائی صدی پہلے یہ مسئلہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اُسے سوچا جائے بلکہ ہر آبادی کے باشندوں کا باورچیخانہ علم کے پیاسوں کا باورچیخانہ بنا ہوا تھا اور ان کے مکانات محلہ کی مسجدوں کے حجرے ان طلبہ کے لیے اقامت خانوں کا کام دے رہے تھے، بڑے بڑے شہروں ہی کی حالت یہ نہ تھی بلکہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی چھوٹی سی کتاب مآثر الکرام میں جن بزرگوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور اُن کے جو حالات درج کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام، کوڑا، سہالی، گجند، قنوج، دیوہ، مسولی، خیرآباد وغیرہ جیسے قصبات میں بھی فری لاجنگ اور فری بورڈنگ کا یہ نظم قائم تھا اور اسی پر دلّی، لکھنؤ، سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہار، عظیم آباد، احمد آباد، بریلی وغیرہ شہروں کو قیاس کرنا چاہیے۔

یہ تو صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں مدارس کے قیام کا رواج مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں نہ تھا "ہندوستان کے اسلامی مدارس" کے عنوان سے میرے مرحوم دوست ابوالحسنات ندوی (رکن دار المصنفین) نے کافی مواد تاریخوں سے مدارس کے متعلق جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کا جو مطلب ہے اس کا جواب آپ کو آئندہ اوراق میں ملیگا۔

لیکن اس کے ساتھ یہی بات یہی ہے کہ زیادہ تر اس ملک میں مساجد اور شہروں یا قریٰ وقصبات میں امراء کی حویلیوں، اور ڈیوڑھیوں سے بھی مدرسہ کا کام عموماً لیا جاتا تھا۔ میر طفیل محمد بلگرامی جنہوں نے "قریب ہفتاد سال بر مسند تدریس و بہ احیاءِ علوم پرداختند" یعنی ستر سال تک بلگرام میں درس وتدریس کا بازار جنہوں نے پوری قوت کے ساتھ گرم رکھا تھا، بقول مولانا آزاد "طلبہ را از حضیض شاگردی بہ اوج اُستادی رسانیدند"

لیکن طلبہ کی ایک دنیا کو شاگردی کی پستی سے اُٹھا کر جو اُستادی کی بلندیوں تک پہنچا

Marfat.com

رہا تھا، کیا اس کے مدرسہ کی تعمیر کے لیے چندوں کی فہرست کھولی گئی تھی اور شہر شہر گاؤں گاؤں میں سفرا دوڑائے گئے تھے؟ مولانا آزاد جو کہ از تلامذہ میر طفیل محمد ہیں خود اپنی چشم دید گواہی ان الفاظ میں قلمبند فرماتے ہیں کہ۔

"بعد از تکمیل تحصیل در بلگرام طرح اقامت ریختند در اوائل بہ خانہ سید محمد فیض زمیندار کہ از اعیان سادات بلگرام است اقامت داشتند"

یعنی سید محمد فیض زمیندار کی ڈیوڑھی ان کا پہلا مدرسہ تھا، اور اس کے بعد۔

"قریب سی سال تا دم واپسیں در محلہ میدان پورہ در دیوان خانہ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل نور اللہ مرقدہ سکونت ورزیدند"

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ میر طفیل محمد صاحب گلستاں اور بوستاں کے پڑھانے والے میاں جی تھے، خود مولانا غلام علی کا بیان ہے۔

"کتب درسی از بدایت تا نہایت بہ جناب استاذ المحققین میر طفیل محمد رحمہ اللہ رو گذرانیدم"۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس کے حلقۂ درس میں حسان الہند مولانا غلام علی جیسے یگانہ و فرزانہ علامۂ دہر نے اول سے آخر تک درسی کتابیں تمام کی ہوں اس کے تعلیمی نصاب کا کیا پیمانہ ہو سکتا ہے لیکن یہ ستر سالہ مدرسہ کہاں قائم رہا۔ بلگرام کے ایک زمیندار، اور ایک رئیس عالم کے دیوان خانے میں میر صاحب کی علمی جلالت شان کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مولانا آزاد ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

لے کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ شہر یا قلعہ یا قصبہ یا موضع کا رئیس اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے کسی عالم کو ملازم رکھ لیتا تھا لیکن ان رئیس زادوں کے ساتھ دوسرے غربا کے بچے بھی مفت تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔ صاحب مشارق الانوار حسن لاہوری صغانی کے متعلق فوائد الفواد میں حضرت سلطان جی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ بیسروالی (علی گڈھ) را تعلیم کرے صد تنگہ بیافتے۔ ص ۱۰۴۔

"مجمع البحرین معقول و منقول و مطلع النیرین فروع و اصول"

بلکہ اپنی ساری کتاب میں مولانا آزاد نے استاذ المحققین کے لقب سے اُن کو ملقب کیا ہے شاگردوں کا تذکرہ تقریباً بیسیوں صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ میر صاحب کے اساتذہ میں قاضی علیم اللہ گجندوی اور سید قطب الدین شمس آبادی کا بھی نام ہے۔ سلم و مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری کے اُستاد بھی قطب الدین شمس آبادی ہیں۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ ملا محب اللہ بہاری اور میر طفیل محمد صاحب دونوں ایک ہی دسترخوان کے زلہ رباؤں میں ہیں۔

اساتذہ کا یہ گروہ جو ملک کے قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں میں پھیلا ہوا تھا، کیا کسی سے تنخواہ وغیرہ طے کرنے کے بعد کسی جگہ بیٹھا تھا، آج اُس کو کون باور کرسکتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے مولانا نور الحق تیسیر القاری بخاری کی جنہوں نے فارسی زبان میں شرح فرمائی ہے اور متعدد جلدوں میں نواب محمد علی مرحوم[1] (اسیر بنارس) رئیس ٹونک نے کثیر مصارف سے اسے طبع بھی کرایا تھا

ان ہی مولانا نور الحق کے ایک شاگرد سید محمد مبارک محدث بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مولانا آزاد نے ارقام فرمایا ہے کہ ان کے وہی استاد المحققین استاد یعنی مولانا طفیل محمد بلگرامی نے اپنا یہ چشم دید واقعہ مولانا آزاد سے بیان کیا۔

"روزے شرف خدمت حضرت میر (مبارک) دریافتم برائے تہیۂ وضو برخاستہ بود ناگاہ برزمین اُفتاد بہ سرعت تمام شتافتہ نزدیک رفتم بعد ساعتے افاقت آمد"

لیکن جانتے ہو، کہ یہ میر مبارک محدث بے ہوش ہو کر کیوں گر پڑے تھے، میر طفیل محمد ہی کی

[1] جیسا کہ معلوم ہے ٹونک کی ریاست سنبھل کے ایک پٹھان امیر خاں کی قائم کی ہوئی ہے۔ انہی امیر خان کے پوتے اور موجودہ والیٔ ریاست کے دادا محمد علی خاں مرحوم کو حکومت برطانیہ نے بنارس میں بجرم بغاوت نظر بند کر لیا تھا۔ نواب مرحوم کا مشغلہ اس زمانہ میں علمی ودینی رہ گیا تھا۔ ۱۲

زبانی اس کا افسانہ سُنیے "کیفیت استفسار کردم، بعد مبالغۂ بسیار فرمود" مبالغۂ بسیار کے بعد کیا فرمایا۔ "سہ روز است کہ مطلقاً از جنس غذا میسر نیامد" گویا تین دن سے کھیل اُڑ کر منہ میں میر صاحب کے نہیں پڑی تھی۔ پھر کیا اس فاقہ کے بعد انھوں نے چندہ کا اعلان کیا تھا۔ خود ہی فرماتے ہیں" دریں سہ روز با ہیچ کس لب بہ اظہار نہ کشود و دام نہ گرفت"

(قرض)

علم کی غیرت کا یہ حال ہے اور دین کی پاسداری کا قصہ اس سے بھی آگے بڑھا ہوا۔ میر طفیل محمد فرماتے ہیں کہ

مرا بسیار رقت دست داد فی الفور از آنجا بہ مکان خویش رفتم و طعام شیریں کہ مرغوب ایشاں

مہیا ساختہ حاضر آوردم اول بشاشتِ بسیار ظاہر نمود و دعا کرد"

مگر یہ تو اپنے سعادتمند شاگرد کی ہمت افزائی کے لیے بشاشت تھی، دینی ذمہ داریوں کا احساس اب بیدار ہوتا ہے اور فرماتے ہیں۔ تین دن کے بھوکے بیہوش ہو کر گرنے والے میر مبارک فرماتے ہیں۔ "سخنے گویم بشرطیکہ شما گران خاطر نہ شوید، گفتم حضرت بفرمائید"

دینی نکتہ نوازی سُنیے اپنے اسی شاگرد سے جس کی خاطر شکنی بھی منظور نہیں فرماتے ہیں "باصطلاح فقرا ایں را طعامِ اشراف گویند" یعنی نفس نے جس کی طرف لو لگائی تھی۔ یہ ایسا کھانا ہے۔ کیونکہ اظہار حال کے بعد اور میر طفیل محمد کے جانے کے بعد میر مبارک کے نفس نے ظاہر ہے کہ اس کھانے کی اُمید قائم کر لی تھی، اس کے بعد میر مبارک فرماتے ہیں

"ہر چند نزد فقہا اکل آں جائز است و در شرع بعد از سہ روز میتہ حلال، اما در طریقۂ فقرا اکل طعام اشراف جائز نیست"

(کھانا) (مردار ۱۲)

یعنی مخلوق سے توقع قائم کرنے کے بعد جو چیز سامنے آئے ان لوگوں کے لیے اس کا لینا جائز نہیں ہے جنھوں نے لامانع لما اعطیت ولا معطی نہیں روکنے والا ہے اس سے کوئی جسے تو دے اور نہ دینے والا ہے کوئی اُسے

لما منعت (دعا نبوی) جس کے لیے تو روک دے۔

پر کمر ہمت چست کی ہو اور جنہوں نے

ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا آدمی کے لیے اللہ جس رحمت کو کھول دیتا ہے پھر اس کا

ممسک لھا و ما یمسک فلا مرسل روکنے والا کوئی نہیں اور جسے روک دیتا ہے اس کا جاری

لہ من بعدہ۔ (القرآن العظیم) کرنے والا بھی اس کے بعد کوئی نہیں۔

ہی کے تجربہ کا نام "الحیوٰۃ الدنیا" قرار دے رکھا ہے۔ میر طفیل محمد استاد کے مذاق شناس تھے، بغیر کسی اصرار اور رد و کد کے کھانا سامنے سے اٹھایا اور چلے گئے، اوٹ میں جانے کے بعد پھر لوٹے اور اب کھانا پیش کر کے استاد سے پوچھتے ہیں "ہرگاہ بندہ طعام را برداشتہ بر حضرت را توقع بود کہ باز خواہم آورد" میر مبارک نے جواب دیا کہ "نے" نہیں، میر طفیل محمد نے عرض کیا "حالا ایں طعام بے توقع حضرت آوردہ ام طعام اشراف نماند" سعید شاگرد کے اس حسن تدبیر پر استاد خوش ہوئے اور بولے "شما عجب فراستے بکار بردید" اس منطق سے جو منطق نہیں واقعہ تھا، استاد کو شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور "طعام برغبت تمام تناول فرمود" مگر وہی جس نے

الیس اللہ بکاف عبدہ (القرآن) کیا اپنے بندے کے لیے اللہ کافی نہیں ہے

کے قرآنی سوال کے جواب میں

حسبنا اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ ہمارے لیے اللہ بس ہے، بڑا اچھا وکیل (پشت پناہ)

و نعم النصیر۔ کتنا اچھا آقا کیسا اچھا یاری فرما۔

کی چٹان سے اپنی زندگی کے جہاز کو باندھ دیا تھا۔ ابھی تو آپ نے دیکھا کہ جب تک وہ

زلزلوا زلزالاً شدیداً (القرآن) جھنجھوڑ دیے گئے اچھی طرح جھنجھوڑ کے ساتھ

کے مقام پر تھا تو بھوک کی شدت سے اسے بیہوش ہو ہو کر گرنا پڑتا تھا۔ مگر چند ہی دنوں کے بعد ان ہی

Marfat.com

میر مبارک محدث کو دیکھا جاتا ہے، اسی بلگرام میں دیکھا جاتا ہے کہ نصر اللہ کا ظہور ان کے سامنے بایں شکل ہو رہا تھا کہ "میر مبارک محدث، از محلہ سید واڑہ، عشیرۂ کنبہ، خود در میدانے اقامت گزید و رعایا آباد کرد و مسجد و منازل سکونت تعمیر نمود" صرف یہی نہیں کہ مسجد اور رہنے کے مکانات میر مبارک نے بنوائے اور مستقل ایک گاؤں رعایا کا اپنے مکان کے ارد گرد آباد کیا، بلکہ "گرد آبادی سورِ محکم از خشت پختہ کشید تا از آسیب دزدان و وحوش دسباع محفوظ باشد" گویا ایک مستقل گڑھی تیار ہو گئی لیکن ایک فقیر کو رعایا کی کیا ضرورت تھی کیسا عجیب مذاق تھا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اپنی اس گڑھی میں میر مبارک محدث نے جن رعایا کو بسایا تھا وہ "بیشتر از قوم حائک آباد کرد کہ اینہا اکثر دیندار و نماز خواں می باشد" جس سے صرف میر صاحب کے پارچہ باف
نصب العین ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس غلط خیال کی بھی تردید ہوتی ہے۔ جو سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے جس طبقہ نے ہندوستان میں علم پید اور دستکاری کے اس فن کو یعنی پارچہ بافی کو رزقِ حلال کا ذریعہ بنایا تھا، وہ اسلامی حکومت کے عہد میں دین وعلم کے زیور سے قطعاً خالی تھا اور اس نے اپنی دینداری، جوشِ اسلامی میں جو شہرت اس زمانہ میں حاصل کی ہے یہ سب برٹش راج کی برکت ہے۔
مولانا غلام علی آزاد نے یہ واقعہ گیارہویں صدی کا بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ کم از کم آج سے دو ڈھائی سو سال پیشتر بھی پارچہ بافوں کا یہ گروہ اپنی دینداری اور نماز خوانی میں امتیازی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور میرے نزدیک تو دین اور دین پر عمل یہی سارے علموں کی جان ہے۔

البتہ اس سلسلہ میں مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے کہ انہی پارچہ بافوں میں ایک شخص نماز میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ میر مبارک محدث نے بلا کر پوچھا کہ بھائی! تم جماعت میں کیوں نہیں آتے۔ اس نے جواب دیا کہ جماعت کی پابندی کی وجہ سے میری کمائی میں نقصان ہوتا ہے یعنی آنے جانے میں وقت لگ جاتا ہے۔ میر صاحب نے پوچھا کتنا نقصان ہوتا ہے، بولا ایک پیسہ کا نقصان روزانہ ہوتا ہے۔ میر صاحب نے فرمایا یہ ایک پیسہ مجھ سے لے لیا کرو جب

وعدہ روزانہ ایک پیسہ اس کو ملنے لگا۔

ایک دن میر مبارک نے دیکھا کہ بلا وضو وہ نماز میں شریک ہو گیا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ نماز را بے طہارت می خوانی؟ اُس نے جواب دیا کہ "بہ یک پیسہ دو کار نمی تواں کرد" یعنی ایک ہی پیسہ میں آپ نماز اور وضو دونوں کام لینا چاہتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" میر بے اختیار خندہ زد و پیسۂ دیگر برائے وضو، اضافہ کرد"

بہر حال آخر میں تو مولانا آزاد لکھتے ہیں" رفتہ رفتہ حائک را رغبت دلی در نماز بہم رسید واز تقاضائے اجرت درگذشت۔

فاقہ وفقر کی اس کیفیت کے بعد میر مبارک محدث پر فتح باب، ارسال رحمت اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کیسے ہوا؟ مولانا آزاد نے اس کو بھی لکھا ہے کہ نواب مکرم خاں بن نواب شیخ میر عالمگیری درخدمت میر اعتقاد عظیم داشت وخدمات شایستہ بہ تقدیم رسانید" اور یوں

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ اللہ کو جس نے وکیل بنالیا تو وہ اس کے لیے بس ہے

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا اللہ سے ڈر کر (بُری باتوں سے جوڑ کا) یعنی تقویٰ اختیار کرتا ہے

ویرزقہ من حیث لا یحتسب تو اللہ تعالیٰ اس کے خلاص کی راہ نکال دیتے ہیں اور روزی پہنچاتے ہیں، ایسی جگہ سے جہاں سے اُسے اُمید نہ ہو۔

کی تفسیر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہو رہی تھی حالانکہ خود میر مبارک محدث نے جس طرح تعلیم حاصل کی تھی جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد "از اول تا آخر ایام اقامت دہلی در خانہ شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق قدس اللہ اسرار ہما سکونت ورزیدہ وعلم حدیث از آنجناب اخذ کرد"۔

ظاہر ہے کہ خانۂ شیخ نور الحق میں میر صاحب کو کیا جگہ ملی ہو گی، کیا ان کے لیے باتھ روم اور ڈرائنگ روم کا نظم کیا گیا ہو گا، برقی قمقموں سے کمرہ جگمگاتا ہو گا بجلی کے پنکھے سر پر گردش میں ہوں گے۔

ان کے لیے سرونٹ، دھوبی، حجام، ریزر، صابن، کنگھا، آئینہ یا بناؤ سنگھار کے دیگر ساز و سامان مہیا کیے گئے ہونگے، توارث کے قانون کو پیشِ نظر رکھ کر پچھلوں کے حال پر اگلوں کا قیاس درست ہو سکتا ہے۔ نیز آئندہ آپ کے سامنے جو مواد پیش ہونگے ان کی بنیاد پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ خانۂ شیخ نور الحق میں میر مبارک کے لیے چٹائی کے فرش والے تنگ و تاریک حجرے کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ متاخرین علماءِ ہند میں مولانا محمد حسین الہ آبادی جو اپنی وفات کی خاص نوعیت کی وجہ سے یعنی بہ مقام اجمیر حالت سماع میں آپ کا انتقال ہوا اس واقعہ کی وجہ سے آپ کی شہرت علمی و دینی خواص سے گذر کر عوام کے دائروں تک پہنچی ہوئی ہے، ان کی سوانح عمری جسے ان کے خلف سعید و حفید رشید مولانا حافظ محمد الفاروقی (فاضلِ مصر) نے حال میں شائع کی ہے۔ اسی کتاب میں مولانا مرحوم کی طالب العلمی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا فاروقی رقمطراز ہیں۔ اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ مولانا کے والد کی مالی حالت اچھی تھی اس لیے مصارف کافی ملتے تھے مگر والد کے بھیجے ہوئے روپیے کتب فروشوں کے نذر ہو جاتے اور خود طالب علمی کی پوری زندگی لکھنؤ میں اُنہوں نے جو گذاری اُس کی تفصیل یہ ہے۔

زنگی محل کے پل کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو مسجد ملا مبین کے نام سے مشہور رہے اس مسجد میں ایک حجرہ ہے جو اتنا تنگ ہے کہ اس میں تین چار آدمی مشکل سے لیٹ سکتے ہیں جس کے دروازہ سے صرف چند گز کے فاصلہ پر پاخانہ بنا ہوا ہے اس کی کافی بدبو حجرہ میں رہتی ہے مسجد کے دروازہ پر ایک سائبان ہے جہاں نصف شب تک کباب والوں کی دکان کے چولھے کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ اس مسجد کی موجودہ حالت یہ ہے لیکن میں نے اپنے اساتذہ سے سُنا کہ مولانا مرحوم (مولانا محمد حسین) کی طالب العلمی کے زمانہ میں اس سے بھی کم راحت کے سامان کے ساتھ وہاں تھے اسی مسجد میں آپ نے طالب العلمی کا پورا زمانہ بسر فرمایا۔ (ص ۹

لیکن کیا طالب العلمی کی اس زندگی کا اثر آئندہ زندگی پر بھی مرتب ہوتا تھا؟ عجیب لوگ ہیں جن

چیزوں کو انسان کی فطرت خود چاہتی ہے بنگلوں اور گملوں میں کون نہیں رہنا چاہتا۔ موقعہ ملے تو باغ و چمن کی لذت گیریوں سے عموماً کون گریز کرتا ہے لیکن خدا جانے لوگوں کو اس زمانہ میں اس کا وسوسہ کیوں ہوتا ہے کہ اگر طلباء کو سادہ زندگی کا عادی بنا دیا جائیگا تو آئندہ رنگین زندگی کی ہوس ان کے اندر سے نکل جائیگی۔ فرض کیجیے کہ اس قسم کی خواہش اگر نکل بھی جائے تو اس میں انسانیت کا کیا نقصان ہے۔ تکلف کی زندگی سے تو سادہ زندگی بہرحال اگر باہر نہیں تو اندر کو مسرور رکھنے میں گونہ ممد ہوتی ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں مشہور محدث علامہ محمد بن نصر مروزی کے ترجمہ میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے اگرچہ اس قصہ کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے لیکن تعلیمی زندگی سے تو اس کا بہرحال ضرور تعلق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اُس کا ذکر یہاں کر دیا جائے۔

الخطیب لکھتے ہیں کہ محدث مروزی نے جب درس حدیث کا حلقہ قائم کیا اور ملک میں ان کے درس کا چرچا ہوا، جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا ابھی میر مبارک محدث کے قصہ میں گذرا کہ خدا نے میر صاحب کی خدمت کے لیے نواب مکرم خان کو آمادہ کر دیا تھا۔ محدث مروزی کے ساتھ ایک نہیں متعدد امراء کا یہ سلوک تھا یعنی۔

كان له من اسمعيل بن احمد والى خراسان	خراسان کے گورنر اسمٰعیل بن احمد سالانہ چار ہزار
يصله فى كل سنة باربعة الاف درهم	درہم اور اسمٰعیل کے بھائی اسحٰق بھی چار ہزار
ويصله اخوه اسحق باربعة الاف درهم	سمرقند کے باشندے بھی چار ہزار درہم سالانہ
ويصله اهل سمرقند باربعة الاف درهم	کے ساتھ محمد بن نصر مروزی کی خدمت کرتے تھے۔

لیکن بارہ ہزار کی مستقل سالانہ آمدنی کے باوجود محدث موصوف اتنے شاہ خرچ فراخ چشم واقع ہوئے تھے کہ آخر سال تک ان کے پاس ایک کوڑی بھی باقی نہیں رہتی تھی کہنے والوں نے علامہ سے ایک

دن کماکر۔

لوجمعت منہا لنائبۃ کیا اچھا ہوتا کہ کسی آڑے وقت کے لیے اس آمدنی سے آپ کچھ پس انداز کیا کریں۔

جواب میں اُنھوں نے جو بات کہی تھی اسی کا نقل کرنا مقصود ہے۔ فرمایا

یا سبحان اللہ انا بقیت بمصر	واہ سبحان اللہ میں مصر میں اتنے اتنے سال تک رہا (یعنی طالب
کذا وکذا سنۃ فکان قوتی و	العلمی کرتے رہے) اس زمانہ میں میری خوراک میرے کپڑے میرے
ثیابی وکاغذی وحبری و	کاغذ میری روشنائی اور جو کچھ بھی میرے مصارف سال بھر میں
جمیع ما انفقہ علی نفسی فی	ہوتے تھے کل بیس درم سب کے لیے کافی ہوتے تھے۔ پھر کیا
السنۃ عشرین درھما افتری	تم خیال کرتے ہو کہ اگر یہ بارہ ہزار سالانہ کی آمدنی جاتی بھی رہے
ان ذھب ھذا لا یبقی ذلک	تو بیس درہم کی سالانہ آمدنی بھی باقی نہ رہیگی (الخطیب ص ۳۱ ج ۲)

ایک حکیمانہ بات ہے جو محدث نے فرمائی، آدمی جب کم خرچ کی زندگی کا کسی زمانہ میں عادی ہوتا ہے پھر اگر خدا اُسے کسی وقت زیادہ بھی دے تو اس سے نفع اُٹھانے یا دوسروں کو نفع پہنچانے میں وہ تنگی نہیں محسوس کرتا۔ بقول مروزی جس نے بیس درم سالانہ کے اندر مصر میں برسوں گزارا ہو، اُس کی نگاہ میں بارہ ہزار سالانہ کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ ہوا تو خرچ کیا ورنہ بیس درم والی زندگی کا تجربہ تو موجود ہی ہے۔ پھر اسی حالت کی طرف واپس ہونے میں اُس کو خوف وخطر کیوں محسوس ہوگا جو اُن لوگوں کو ہو سکتا ہے جنہیں بیس درم والی زندگی سے کبھی سابقہ ہی نہ پڑا ہو۔ بہرحال ہندوستان کے باہر ہو یا اندر مسلمانوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد اُسی پر قائم کی تھی۔ طالب العلمی کے زمانہ میں خواہ مخواہ اِٹی کیٹ آموزی، صفائی اور خدا جانے کن کن ناموں کا پردہ ڈال کر آج طلباء کو جن تنعمات لایعنی کا عادی بنایا جاتا ہے، ہمارے اسلاف اس کو بالکل غیر ضروری سمجھتے تھے۔

تعلیم کے ایام تعلیم کے لیے ہیں نہ کہ بننے اور سنورنے، نوعروسی اور دولہا بننے کی مشق کا وہ

کوئی عہد ہو۔ باقی وہ وسوسہ کہ جو آج خرچ کا عادی نہیں بنایا جائیگا کل اس کے سینے میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آج جسے صفائی اور ستھرائی زیبائش و آرائش کی مشق نہ کرائی جائیگی تو کل بھی اپنے آپ کو وہ صاف ستھرا نہ رکھ سکیگا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ اس کا کیا جواب دے رہی ہے۔ بیس درم سالانہ سے زیادہ جس بیچارہ کو سالہا سال تک خرچ کرنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کتنی سیر چشمی سے بارہ ہزار سالانہ کو صرف کر رہا ہے۔ یہی میر مبارک محدث ہیں، ان کے مصارف کا حال بھی آپ پڑھ چکے، اب ان کی صفائی و پاکیزگی نظافت و لطافت کا حال بھی مولانا غلام علی کی عینی شہادت کی بموجب سُن لیجیے۔ کہاں تو ایک زمانہ دلّی میں گذرا کہ صرف شیخ نورالحق کے مکان کا ایک تنگ و تاریک حجرہ میر صاحب کے لیے کافی تھا لیکن جب عملی زندگی میں انھوں نے قدم رکھا بلگرام میں ان پر خدا نے فتوحات کے دروازے کھولے تو مولانا آزاد کا بیان ہے "معاش بر منع صفا و نزاکت می کرد"۔ صفا ہی نہیں بلکہ اُس میں نزاکت بھی شریک تھی کیسی نزاکت انہی سے تفصیل سُنیے، فرماتے ہیں "نشست گاہ خاص و پیش مسجد چناں مصفا و پاکیزہ می داشت کہ نمونہ سینہ صاف دلاں و دیدہ پاک بیناں باید گفت"

حضرت آزاد پر میر صاحب کی اس صاف ستھری دُھلی دُھلائی اور اجلی زندگی کا اتنا اثر تھا، کہ بے اختیار اس واقعہ کی تحریر کے وقت میر صاحب کی اس خصوصیت کا نقشہ نگاہوں میں پھر جاتا ہے اور اپنے ایک شعر کا محل ان ہی کی اس پاک زندگی کو قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ گویا راقم الحروف (آزاد) ایں بیت را از زبانِ میر گفتہ ؎

حباب خوش نشئم می زیم بہ وضع و صفا زآب صرف بنا کردہ اند منزل من

آج خبر سے آنکھیں بند کر کے مبتدا ہی میں جو اُلجھے ہوئے ہیں یا دوسروں کو الجھا رہے ہیں، ناعاقبت اندیشوں کے اس طبقہ کو کون سمجھا سکتا ہے کہ عنفوانِ شباب میں شقتوں صعوبتوں کو بہر حال آدمی جھیل لیتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شباب کی ان ہی گرمیوں کے بعد آئندہ زندگی کی سردیوں اور سہولتوں کا صحیح

Marfat.com

لطف حاصل ہوتا ہے سرد گرم چشیدہ زندگی اپنے اندر جو پختگی رکھتی ہے سیرت و کردار کی یہ استواری ان لوگوں میں تلاش کرنا فضول ہے جن کی پوری زندگی سرد ماحول میں گزری ہو۔

لیکن آج گنگا اُلٹی بہائی جا رہی ہے مشقت و صعوبت تحمل و برداشت کے جو دن ہمیں ان کو عوام کے چندوں پر نوابوں اور راجواڑوں کی خیراتی امدادوں کے بل بوتے پر ان سکولوں پر گزارا اور گزروایا جاتا ہے، جو نعمتوں اور سہولتوں کے پھولوں سے لدی ہوئی ہیں اور اس قسم کے مسرفانہ غیر ضروری مصارف کی عادی زندگی کی پیاس پیدا کر کے نوجوانوں کو جب ان کی نوجوانی ختم ہونے کو آتی ہے دار الاقاموں کی چند سالہ بہشت سے کشمکش حیات کی اس وادی پُر خار، بلکہ وادی نار کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جس میں سو پیاسوں میں سے بمشکل دس میں تشنہ کامان ملازمت و امیدواران خدمت کی سیرابی کی ایک حد تک گونہ صورت نکل سکتی ہے، لیکن نوے فیصدی بیچارے اسی جہنم کے شعلوں میں جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں جن کا بجھانے والا اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں نہ حکومت ان بہشتی حوروں کی خریدار اور نہ پبلک ان معاشی اجازت ناموں کی طلبگار۔

خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین۔ — برباد ہوئی دنیا اور آخرت کی زندگی، اور یہی ہے کھلا ہوا خسارہ۔

پیاس جھوٹی غیر فطری پیاس پیدا کرنے والے بے سوچے بے سمجھے بھوک میں بھوک، پیاس میں پیاس کا اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں لیکن ان میں کوئی نہیں جو یہ سوچتا ہو کہ ان بھوکوں کو روٹی اور ان پیاسوں کو پانی یعنی وہی روٹی وہی پانی جس کی صورت ایک دفعہ ان شاہی اقامت خانوں میں دکھا دی جاتی ہے، اور ایک دفعہ دیکھا ہے پھر اسی کے دیکھنے کی تمنا، وہی اگر نہ ملی تو پھر اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔

تعلیم سے جن کے دماغوں کو جگمگایا جا رہا ہے، تنور و وسعت نظر کا وعدہ کر کے باپوں سے جو

Marfat.com

بچے چھینے گئے تھے اب ان کے متعلق شکایت ہے کہ وہ سرکاری محکموں میں چھچھوری حرکتیں کرتے ہیں رشوتیں لیتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں، فریب و مکر سے حکومت کے خزانوں پر ایک طرف اور پبلک کی جیبوں پر دوسری طرف علانیہ ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ علم کی ڈگریوں فضیلت کے طیلسانوں کے مالک ہونے کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ان سے ایسے دنی اور سفیہانہ افعال صادر ہوتے ہیں۔

اور یہ حال تو اُن کا ہے، جنہیں کسی نہ کسی طرح حکومت نے شکار کی ٹیٹوں کے پیچھے چھپنے کا موقعہ دے دیا ہے لیکن جو سکین ان سرفرازیوں سے محروم ہیں وہ پھانسیوں میں لٹک رہے ہیں، اپنے آپ کو شوٹ کر رہے ہیں، یا مفسدوں اور انارکسٹوں کی جماعت میں شریک ہو رہے ہیں، ناواقف پبلک کے جذبات میں اشتعال پیدا کر کے ملک کے امن و امان کو غارت کر رہے ہیں، فردوسی ارالاقامون سے نکالی ہوئی آدم کی تعلیم یافتہ اولاد پر ہر طرف نقرے کسے جا رہے ہیں، طنز اور طعنوں کے تیروں سے بیچاروں کے دل و جگر کو چھلنی بنا دیا گیا ہے لیکن یہ قصور کس کا ہے خود اُن پیاسوں کا؟ یا مصنوعی غیر ضروری پیاس پیدا کرانے والوں کا، ولوج سے پہلے خروج اور آمد سے پہلے رفت کی راہوں سے جو بے پروائی برتتے ہیں اُن کا انجام آج کیا ہمیشہ یہی ہوا ہے، یہی ہوگا، المتقین، کے سوا حسن اللہ قیم کے جیتنے میں آخر کون کامیاب ہوا ہے۔

ہمیں تو سکھایا گیا تھا اور اس راہ میں قدم رکھتے وقت ہی پکارنے والے پکار رہے تھے۔

بقدر الکد تکتسب المعالی ومن طلب العلا سهر اللیالی

(برائیاں اور فضیلتیں مشقت کے حساب سے تقسیم ہوتی ہیں، جو بلندی و برتری کا طالب ہے اُسے راتوں کو جاگنا پڑیگا) (کتاب تعلیم المتعلم)

سمجھا دیا گیا تھا کہ ؎ دررہ منزل جاناں کہ خطرہاست بجاں :: شرط اول قدم ایں است کہ مجنوں باشی۔ جتا دیا گیا تھا ؎ جس کو ہو جان و دل عزیز، میری گلی میں آئے کیوں؟ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ منزل جاناں کے

راہروؤں کے سامنے آخر زندگی تک جو کچھ بھی پیش آتا تھا، زیادہ تر وہی ہوتا تھا جس کی پیش بینی پہلے ہی سے حاصل ہو چکی تھی تکلیف تو ہمیشہ خلاف توقع حادثوں سے ہوتی ہے، لیکن جس کے سامنے وہی حوادث پیش ہوں جن کا اسے منتظر بنایا گیا ہو وہ کیوں بھڑکیگا، کیوں کر ٹیٹیکیگا؟[1]

کہا جاتا ہے، ان کی طرف سے کہا جاتا ہے جن کے اندر ہی میں نہیں باہر میں بھی اپنا کچھ باقی نہیں ہے، چہرہ سے، پیشانی سے، گریبانوں سے ٹانگوں سے الغرض ہر اس جگہ سے جہاں اس کا

---

[1] یہاں ایک دلچسپ نفسیاتی لطیفہ کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ محقق طوسی کی رسائی جب ہولاکو خاں تاتاری بادشاہ کے دربار تک ہوئی تو ایک رصد خانہ کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا۔ ہولاکو خاں سے اپنے خیال کا اظہار کیا، خرچ ہوگا اس نے پوچھا۔ طوسی نے کروروں کا حساب بتایا، ہولاکو خاں بیچارا جاہل سردار علم کی اس کی نگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی تھی، مصارف کا حال سن کر اس نے کہا کہ اتنے روپے برباد کرنے کا کیا حاصل؟ طوسی بڑے جز بز ہوئے جاہل کے دل میں ہیئت و نجوم کے مسائل کی وقعت کیسے بٹھائی جائے۔ سوچ کر کہا کہ ستاروں کا حال اس رصد خانہ سے معلوم ہو سکتا ہے جس سے آئندہ واقعات کے متعلق صحیح پیشین گوئیوں میں مدد ملتی ہے۔ ہولاکو نے کہا کہ بالفرض کسی جنگ میں مجھے شکست ہونے والی ہو، اور نجوم کے ذریعہ سے اس کا علم قبل از وقت حاصل ہو جائے تو کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم اس شکست کو فتح سے بدلنے کی کوئی صورت نکالیں۔ طوسی نے کہا کہ یہ کس کے بس کی بات ہے جو واقعہ ہونے والا ہے وہ تو بہر حال ہو کر رہتا ہے۔ ہلاکو خاں نے کہا۔ پھر اس پیشین گوئی کا کیا فائدہ! محقق طوسی کے لیے یہ سوال بڑا سخت تھا، لیکن دل میں ایک بات آئی۔ بولے، آپ ایک طشت لے کر کسی کو چھت پر یہ حکم دے کر بھیجیے کہ جس وقت صحن میں اپنے درباریوں کے ساتھ آپ بیٹھے ہوں، وہ زور سے اس طشت کو چھت سے نیچے گرائے۔ آپ یہ کر لیجیے، تب جواب عرض کروں گا۔ ہولاکو خاں نے یہی کیا۔ طشت کے گرنے کا حال چونکہ ہولاکو خاں اور طوسی کو معلوم تھا اس لیے یہ دونوں جہاں تھے وہیں بیٹھے رہے، لیکن دربار کے دوسرے آدمی جو اس سے قطعاً ناواقف تھے طشت کے اچانک اس طرح زمین پر گرنے سے ان میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا، کوئی ادھر، کسی نے کچھ خیال کیا، کسی نے کچھ۔ الغرض طوفان بدتمیزی پیدا ہو گیا۔ طوسی نے ہولاکو کو خطاب کر کے اب پوچھا۔ فرمائیے ہم اور آپ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ لیکن دوسرے بدحواس ہو ہو کر ادھر ادھر کیوں بھاگے؟ ہولاکو نے کہا کہ ہم دونوں طشت کے گرنے سے واقف تھے، ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ بس نجوم سے آئندہ واقعات کا علم جن لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے وہ واقعات کو ٹال تو نہیں سکتے، لیکن اپنی جگہ اسی طرح مطمئن (بقیہ بر صفحہ ۳۴)

Marfat.com

اسکان تھا اپنی خودی کو پونچھ پونچھ کر دوسروں کو بھر اگیا ہے چپکایا گیا ہے۔ ان ہی کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اقامت خانوں کی موجودہ عصری زندگی میں خودداری (سلف ریسپکٹ) کی تعلیم دیجاتی ہے اور طلبہ کی اقامت کے قدیم طریقوں میں خودی اور خودداری مجروح ہوتی تھی۔

جس کی عمروں میں فانی زندگی اپنے دعوے کی خود تردید کر رہی ہو، میں اس بررونے تو کی دروغ بیانیوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں، لیکن ان ہی میر مبارک محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے، یعنی وہی جس کے طلب علم کی زندگی دوسرے کے گھر اور دوسرے کے باورچی خانہ کی روٹیوں پر گذری تھی، ان ہی میر مبارک محدث کی مجلس میں لکھنؤ کا گورنر (حاکم) غیرت خاں آتا ہے، مولانا آزاد فرماتے ہیں، "غیرت خاں حاکم لکھنؤ بر دراک شرف خدمت آمد" مگر جس لباس میں آتا ہے میر صاحب کے نزدیک مسلمان کی خودی پر اس سے چوٹ پڑتی تھی، وہ بلگرام میں ہے اور اسی بلگرام کے دارالخلافہ لکھنؤ کا وہ حاکم ہے مولانا فرماتے ہیں۔ "خان پائچہ زیر جامہ دراز شکن دار" "نامشروع" پوشیدہ"

کوٹ اور پتلون کے اس عہد میں اب کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ زیر جامہ کیا بلا تھی، اور اس کا پائچہ کیا تھا" دراز شکن" کی اصطلاح کا کیا مطلب ہے۔ تاہم آخری لفظ "نامشروع" سے وہی بات معلوم ہوتی ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کی خودی کی تعمیر جن ظاہری اور باطنی عناصر سے زمانی تھی ان میں سے کوئی عنصر غائب تھا اور بجائے اس کے کوئی اجنبی جز، اس میں شریک ہو گیا تھا میر مبارک محدث اپنے صوبہ کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کو اس حال میں پاتے ہیں، خاموشی کو ایمانی ضعف کی دلیل خیال کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں کہ غیرت خاں کے اس "نامشروع" لباس

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳) رہتے ہیں جیسے طشت گرنے کے وقت ہم اور آپ مطمئن رہے۔ طوسی نے رصد خانہ کی ضرورت اس تدبیر سے ہولاکو خاں کی ذہن نشین کی۔ ہولاکو کے دل کو بھی بات لگ گئی۔ رصد خانہ کی منظوری اس نے دیدی۔
(فوات الوفیات)

پر "میر اعتراض کرد"

آگے کے واقعہ کا تعلق میرؔ سے نہیں بلکہ غیرتؔ خاں کی غیور فطرت کی حیرت انگیز جسارت سے ہے۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ "میر اعتراض کرد" کے جواب میں غیرتؔ خاں نے تلوار کھینچ لی تھی اور میرؔ کا سر مبارک جسد سے جدا ہو کر زمین پر پڑا ہوا تھا، یا یہ نہیں تو کم از کم میرؔ پر تنگ نظری، کوتاہ خیالی کا الزام لگا کر ان کے اعتراض کو قہقہوں میں غیرتؔ خاں کی بے غیرتی نے اُڑا دیا تھا۔ آج مسلمانوں کے ان سادہ رخوں، سادہ دلوں کو کون سمجھائے جنہیں باور کرایا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ مسکینوں، عقل کے ان مسکینوں نے باور بھی کر لیا ہے کہ ہر وہ بات جس میں ان کی "خودی" کی ضمانت مستور ہے وہی چھوٹی بات اور ناقابل لحاظ ہے، بلکہ لحاظ کرنے والا ہی تنگ سینہ، تنگ چشم، تنگ دل، مذہبی مجنوں، مبتلائے فینے ٹیزم ہے، رجعت کا شکار ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہے صرف اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں خود اپنے آپ سے چھین لیا گیا ہے۔ اب ہم خود نہیں ہیں بلکہ وہی ہیں جو کچھ ہمیں دوسرے رکھنا اور بنانا چاہیں۔ کہنے والے نے کہا تھا اور سچ کہا تھا۔

ان ہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی
ان ہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

یہی افتاد ہے جس میں ہم گرفتار ہیں اور مولانا آزادؔ جس زمانہ کا قصہ سنا رہے ہیں، کچھ زیادہ دن کی بات نہیں ہے اور کسی دوسرے ملک کی نہیں اسی دیار مرحوم کی تھی، جس کے ہم بھی کبھی شہریار تھے، جب غیر تو ہمیں کیا چھینتے، ان ہی کو ان سے چھین کر اپنی خودی ان میں ہم ہی بھر رہے تھے، ہم دوسروں میں کیا جذب ہوتے دوسرے ہم میں مجذوب ہونے کو اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ غیرتؔ خاں کی غیرت بھی اسی عہد خودی کی پیداوار تھی جس میں مسلمان باطن میں ہو یا ظاہر میں

Marfat.com

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی اور اُن کی شریعت غرا کے سوا اپنے اندر کسی اور چیز کا پانا برداشت نہیں کرسکتا تھا، غلطی سے اگر کوئی اجنبی کانٹا کسی وجہ سے چُبھ بھی جاتا تھا تو اوّلاً خود ہی اُس کی چبھن محسوس کرتا تھا، ورنہ کسی معمولی تنبیہ سے ہوش میں آجاتا تھا، اور جہاں سے ہٹا تھا، بعجلت ممکنہ کانٹے کو نکال کر اسلامی توازن کے کانٹے کو سیدھا کرلیتا تھا۔ غیرت خاں کو میر مبارک نے چونکا دیا، وہ چونک گیا اور کیسی چونک مولانا آزاد راوی ہیں ؎ غیرت خاں احتساب میر را قبول کرو" اور صرف قبول کرو ہی نہیں بلکہ "ہماں وقت پاچہ را بہ دست خود قطع کرد"

چھوٹی بات تھی لیکن سامنے ہیں، پر اس چھوٹی بات کے پیچھے اسلامی غیرت کی جو بڑی آگ چھپی ہوئی تھی، کیا غیرت خاں کے بس میں تھا کہ اس کی تپش کے بھڑک اُٹھنے کے بعد سینہ سے لگائے رکھتا مولانا آزاد کا بیان ہے کہ "اُٹھنے سے پہلے اس اجنبی غیر اسلامی کانٹے کو بھسم کرکے اس نے رکھ دیا۔

اور یہ ہیں اس راہ کے نقوشِ پا کی دل چسپ کہیے یا دل سوز شوخیاں، جن پر ابھی اسی ملک میں اسی آسمان کے نیچے، اسی زمین پر کل ڈیڑھ دو صدی پہلے گزرنے والے گزر رہے تھے، تماشا اور عجب تماشا تھا پر

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

وہی راستہ ہے۔ ان ہی گزرنے والوں سے نکلنے والے اب بھی گزر رہے ہیں، مگر کس حال میں لیٹ رہے ہیں، لٹتے جارہے ہیں، کھورہے ہیں اور کھوتے جارہے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ لٹنے والوں کو یقین دلایا جارہا ہے کہ تم ہی لوٹ رہے ہو، کھونے والوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ تم ہی پارہے ہو، اف! متاع کارواں کی تاراجی شاید اتنی جاں گسل نہ ہوتی اگر تاراجی کے احساس کو بھی غارتگرِ تاراج نہ کرتے، لیکن متاع بھی لٹ گئی، لٹ رہی ہے اور متاعِ عزیز کے لٹنے کا جو احساس تھا

وہ بھی لوٹ لیا گیا۔ پہلی صورت میں تو لوٹنے کی اُمید بھی لیکن اس لوٹ کو لوٹ سے کون بدل سکتا ہے۔ آخر" ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند، در جہلِ مرکب ابدالدہر باند۔ انسانی فطرت کا پارینہ دستور ہے الا ان یاتی اللہ بامرہ۔

غیرت خاں کے اس واقعہ سے جہاں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقامت خانوں کے قدیم جاگیری و مسجدی نظاموں کی بے خودی میں جس ناقابلِ تسخیر خودی کی پرورش ہوتی تھی وہ کتنی عجیب طاقت تھی کہ ہر اس قوت سے وہ ٹکرانے کے لیے تیار رہتی تھی جس سے اسلامی خودی پر زد پڑتی تھی۔ وہیں اس کا پتہ چلتا ہے کہ میر مبارک محدث کے متعلق مولانا آزاد نے جو یہ سنایا تھا کہ نواب مکرم خاں عالمگیری امیر شیخ میر کے صاحبزادے میر صاحب کے ساتھ "اعتقاد عظیم داشت و خدمات شائستہ بہ تقدیم رسانید"

ان خدمات شائستہ کی نوعیت کیا ہوتی تھی، خدمت کرنے والے خدمت کرتے تھے یا ان سے خدمت لے کر خدمت کرنے والوں کو ممنون کیا جاتا تھا اپنے صوبہ کے مطلق العنان مغل گورنر کے سامنے جس کی زبان نہیں رکتی تھی، دل نہیں دیتا تھا ظاہر ہے کہ اس کے مناسب حال دوسری ہی صورت ہو سکتی ہے اور مولانا آزاد کے الفاظ "اعتقاد عظیم داشت" سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے آہ کہ آج کون باور کر سکتا ہے اور کون باور کرا سکتا ہے، کہ علم و دین کے جن نمائندوں کو "املاق" یا معاشی مشکلات کی دھمکیاں دی جارہی ہیں، چند دن پیشتر وہی ہر اُس شخص کو دھمکی دیتے تھے جسے معاشی فراغبالیوں پر ناز تھا، اُف، دُنیا میں ہمیشہ دینے والے محسن سمجھے جاتے ہیں لیکن اس دُنیا نے مدتوں یہ تماشا دیکھا ہے کہ محسنیت کا مقام ان ہی کو حاصل تھا، جو کسی سے خدمت لے کر اس کو اپنا احسانمند بنانے تھے اور

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

خیر درد کی یہ داستان طویل ہے، ذکر تو ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا تھا اور آپ نے دیکھا کہ کالج بلڈنگ بورڈنگ لاجنگ کے تمام مشکلات کو کتنی آسانیوں کے ساتھ حل کیا گیا تھا۔ (مجلّہ دارالعلوم کی نیت سے جو مضمون لکھا گیا تھا وہ بس یہاں ختم ہوگیا آگے اب ماضانہ ہے جس نے اس مضمون کو کتاب بنا دیا)

فراہمی کتب اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ سوال کتابوں کی فراہمی کا بھی ہے، مطابع اور پریس کے اس زمانہ میں کچھ ایسا خیال پھیلا ہوا ہے کہ ایک تو یوں ہی اُس زمانہ میں کتابوں کا مسئلہ پیچیدہ تھا خصوصاً ہندوستان کی تہی دامانی اور افلاس کے جو افسانے اس زمانے میں بیان کیے جاتے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں اس کی حالت سب سے زیادہ زبوں اور قابلِ رحم تھی، کسی صاحب کو کسی جگہ یہ واقعہ مل گیا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جب اپنی تفسیر فارسی فتح العزیز لکھنے بیٹھے تو امام رازی کی مشہور تفسیر کبیر بھی اُنہیں ہم دست نہ ہوسکی، بمشکل قلعہ معلّٰی کے شاہی کتب خانہ سے چند دن کے لیے عاریۃً ان کو یہ کتاب ملی تھی۔

لہ اس موقعہ پر ایک واقعہ یاد آگیا، جسے فقیر نے براہِ راست اپنے محسن کریم و مربی عظیم حضرت مولانا حبیب الرحمن مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ سے براہِ راست سُنا تھا۔ فرماتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مدت تک وہی جاگیری اور مسجدی نظام اقامت طلبہ کا جاری تھا، لیکن زمانہ اور ضرورت دونوں کے مطالبوں سے تنگ آکر اربابِ مدرسہ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سرپرست مدرسہ کی خدمت میں مطبخ کے جدید انتظام کو استمزاجاً پیش کیا، حضرت نے فرمایا کہ دل کی پوچھتے ہو تو میرے نزدیک ایام طلب کے ان چند دنوں میں طلبہ علم کا دوسروں کے در پر جاکر کھانا، دوسروں کے گھروں میں رہنا اپنے اندر ایک بڑے اصلاحی راز کو پوشیدہ رکھتا ہے فرمایا کہ علم بہرحال آدمی کو بلندی اپنی اپنی حیثیت سے عطا ہی کرتا ہے عوام پر امتیاز بخشتا ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب ہنگامِ طلب کی خواریاں بیداری اور تنبیہ کا کام دیتی ہیں، عوام کا مع مولوی کے ہاتھ چومنے کے لیے لوٹتا ہے، اس وقت مولوی کا یہ خیال کہ ابھی کچھ دن پہلے گلیوں کی ٹھوکریں اور دروازوں کی جھڑکیاں کھاتا پھرتا تھا، سیدھوں کو بے راہ روی سے باز رکھتی ہیں، مرض کے علاج کا کام دیتی ہیں۔ مولانا گنگوہی نے اس کے بعد فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مذاق ہے، اپنے دل کی بات ہے باقی جیسے زمانہ کا مطالبہ مطبخ کا ہو تو جیسی اختیار ہو، دارالسلام کا موجود

ممکن ہے کہ خاص کر تفسیر کبیر کے متعلق کوئی ایسی خاص صورت شاہ صاحب کو پیش آگئی ہو۔ لیکن اس جزئی واقعہ کو کلیہ بنالینا اور اسی بنیاد پر ہندوستان کے کتابی افلاس کا فیصلہ کردینا بالکل عجیب ہے۔ آخر کسی تاریخ میں اگر یہ جزئی واقعہ کسی کو ملا ہو تو کیا تاریخ ہی کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا نہ تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان تھا۔

علمے دیدام ویاد ہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ علم است (ملفوظات عزیزیہ ص ۳۶) یعنی جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور ان کو یاد بھی رکھتا ہوں اُن کی تعداد ڈیڑھ سو ہے

اگر حضرت شاہ صاحب کی طرف اس واقعہ کا انتساب صحیح ہے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اتنے علوم کیا کتابی سرمایہ کے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز کی کتابیں، تحفہ دبستان ان کے فتاوی، مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات رائقہ علی الخصوص ازالہ، حجۃ۔ انصاف کیا ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لیے اس جزئیہ سے جو کلیہ بنایا گیا ہے کوئی اُس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ شاہ صاحب اپنی کتابوں میں ابن حزم ابن تیمیہ اور اُن سے پیشتر کے بزرگوں کے اقوال براہ راست ان کی کتابوں سے جو نقل فرماتے ہیں قدیم فقہا، امام ابویوسف، امام شافعی وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کی کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں یہ حدیث کے جن نایاب متون سے آثار و احادیث نقل فرماتے ہیں اُن کو دیکھ کر تو شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ طباعت کے عام رواج کے باوجود آج بھی ہندوستان میں ان کتابوں میں سے بعضوں کا ملنا دشوار ہے جن پر شاہ صاحب اور ان جیسے علما کو دسترس حاصل تھی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ریاست ٹونک کے ایک امیر مرحوم عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں مصنف عبدالرزاق

لہ افسوس کہ باوجود تلاش کے مجھے ایک چیز نہیں ملی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شاہ عبدالعزیز کے کتب خانہ میں پندرہ بیس ہزار کتابیں تھیں شاہ صاحب نے ان سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن اس وقت حوالہ یاد نہ رہا۔ علوم کے بالا تر اعداد پر تعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ مسلمانوں نے علوم کی فروعی تقسیموں کو بہت پھیلا دیا تھا، صرف حدیث و متعلقات حدیث ہی کی تعداد اتنی سے متجاوز ہے وقس علی ہذا۔

متن حدیث کی نادر معتبر کتاب [1] کے ایک نسخہ کی نقل عرب سے خرید کر آئی تھی، اُس وقت کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ عرب میں مصنّف کا جو نسخہ ملا تھا وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کتب خانہ ہی سے منتقل ہو کر عرب پہنچا تھا، غالباً شاہ صاحب کی مہر یا دوسرے علامات اس پر موجود تھے، حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی جنہیں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بیہقی الہند کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے ان کی تفسیر مظہری جس نے دیکھی ہے، خصوصاً حدیث کے متون کا تذکرہ جس طریقہ سے اس میں کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کتابیں ان کے پاس تھیں۔

عالمگیری عہد کے مشہور عالم ملا محب اللہ [2] بہاری صاحب سلّم و مسلّم کی کتاب مسلّم الثبوت

[1] تذکرۂ رحمانیہ جو محدث پانی پتی حضرت قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہے اس میں لکھا ہے کہ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب حضرت شاہ اسحٰق صاحب اور ان کے بھائی شاہ یعقوب دونوں ہجرت کی نیت سے عرب روانہ ہونے لگے، تو کتب خانہ حضرت شاہ صاحب (شاہ اسحٰق رح) نے بوقت ہجرت اپنے ساتھ لیا اس کا وزن نو من تھا، اس کے علاوہ جو ذخیرہ باقی رہا اس کے متعلق مجھے (قاری عبدالرحمٰن پانی پتی رح) اور نواب قطب الدین خاں صاحب کو حکم دیا کہ یہ سب نیلام کر دیا جائے، چنانچہ ہم دونوں نے یہ خدمت انجام دی" ص ۵۱۔ یہ روایت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے حوالے سے منقول ہے جس سے معلوم ہوا کہ شاہ ولی اللہ کے کتب خانہ کا ایک حصہ عرب منتقل ہوا مصنف عبدالرزاق غالباً اسی ذریعہ سے مدینہ منورہ پہنچا۔

[2] جن اسماء و اعلام کا ذکر مری اس کتاب میں آیا ہے اگر سب پر تشریحی نوٹ دینے کا التزام کیا جاتا تو کتاب خدا جانے کتنی ضخیم ہو جاتی مگر بعض خاص معلومات کا جن سے تعلق ہے دل ان کے چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں۔ یہ مُلّا محب اللہ جو اپنی نسبت بہاری سے ظاہر ہے کہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں مولانا آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ کڑا نامی گاؤں جو محب علی پور پرگنہ سے صوبہ بہار میں تعلق رکھتا ہے پیدا ہوئے اور بہار کی ایک شریف قوم ملک جس کی اس زمانہ میں بھی اس صوبہ میں معقول تعداد ہے، اور دینی و دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں میں امتیاز رکھتی ہے، نہ صرف قدیم بلکہ جدید تعلیم یافتوں کا ایک بڑا طبقہ بہار میں ملک ہی قوم سے تعلق رکھتا ہے اپنی کتاب سلّم و مسلّم جو بقول مولانا شبلی درس نظامیہ کے نصف نصاب کو اپنے نیچے تقریباً دو سو سال اس نے دبائے رکھا، قاضی حمداللہ، مُلّا حسن، مُلّا مبین، شرح سلم بحر العلوم یہ نظامیہ درس کی مشہور کتابیں سلّم ہی سے تعلق رکھتی ہیں (دیکھیے مقالات شبلی مضمون درس نظامیہ) لیکن بظاہر اسی چیز نے مُلّا محب اللہ مرحوم کو محسود اقران بنا دیا۔ یوں تو اپنے زمانہ میں دنیاوی حیثیت سے ترقی کی اس آخری نقطہ پر پہنچ گئے تھے جو عالمگیری کے پیش کرنے والوں کی معراج کمال تھا یعنی شاہ عالم ابن اورنگ زیب (بقیہ پر صفحہ ۴۱)

Marfat.com

کا جو نسخہ مصر سے شائع ہوا ہے اس کے آخر میں ملا محب اللہ کی ایک خود نوشتہ عجیب یادداشت چھاپ دی گئی ہے، میں بجنسہ ناشر کتاب کے الفاظ کے ساتھ اسے نقل کرتا ہوں، ناشر نے یہ لکھ کر کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) نے بر سر حکومت آنے کے بعد ان کو بقول مولانا آزاد "صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان" کے منصب جمیل پر سرفراز کیا جو ہندوستان میں شیخ الاسلامی کے عہدہ کے مرادف تھا، یوں بھی وہ کبھی اودھ (لکھنو) اور دکن میں حیدرآباد کے قاضی رہے آخر میں اورنگ زیب نے اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم کے لیے شاہ عالم گورنر کابل کے ساتھ کابل بھی بھیج دیا تھا اس سے اس زمانہ کے مسلمانوں کی اولوالعزمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بہار میں پیدا ہوئے شمس آباد (قنوج) میں قطب الدین شمس آبادی سے تعلیم حاصل کی، ابھی لکھنو میں ہیں کل دکن میں، پرسوں کابل میں، بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے اسی چیز نے ملا کو محسود اقران بنا دیا اور ان کو بدنام کرنے کی یہ عجیب کوشش کی گئی کہ کسی صاحب نے منطق میں ایک رسالہ لکھا جس کے عام مسائل کی عبارتیں ہی نہیں بلکہ سُلّم کا مشہور معرکۃ الآراء دیباچہ سبحانہ ما اعظم شانہ سے ملا جلا خطبہ بھی مولانا محمود حسن ٹونکی کی قلمی کتاب معجم المصنفین میں کچھ الفاظ اس کے نقل بھی کیے ہیں۔ الحمد لمن هو عن الكلية والجزئية تعالى. وعن الجنس والفصل تبرى فلا يحد به نعم ينفصل بوجيهتا اور لطیفہ یہ گھڑا کہ مشہور معقولی و کلامی مصنف مرزا جان کی طرف اس کو منسوب کر دیا، مقصد یہ تھا کہ محب اللہ کی کتاب سرقہ ثابت ہو۔ تماشے کی بات یہ ہے کہ ایک ایرانی عالم کی کتاب روضات الجنات جس میں علما کے حالات ہیں خود مرزا جان اور ان کے معاصر ابو الحسن الکاشی کے متعلق لکھا ہے۔ کان منحلان من كثير الكتب الغير المتداولة "یعنی یہ دونوں غیر مشہور کتابوں سے چرایا کرتے تھے" لکھا ہے کہ زیادہ تر غیاث منصور کی کتابوں سے یہ دونوں حضرات سرقہ کیا کرتے تھے غالباً مرزا جان کی طرف منسوب کرنے کی وجہ بھی یہی ہوئی کہ وہ خود اس مسئلہ میں بدنام تھے واقعہ یہ ہے کہ سلم جیسی کتاب اگر مرزا جان صاحب کے قلم سے۔ پہلے ہی نکل چکی ہوتی تو جناں ان کی معمولی بیسیوں کتابیں علماء میں پھیلی ہوئی ہیں ایسا متن متین گوشہ گمنامی میں کیوں پڑ جاتا نیز ملا محب اللہ کی عبارت میں جو آمد ہے، اور اس جعلی کتاب میں جو آورد ہے خود دلیل ہے اس کے جعلی ہونے کی۔ محب اللہ ایک خاص طرز تعبیر کے موجد ہیں، سلم میں بھی ان کا یہی رنگ ہے لیکن مرزا جان کی کسی کتاب کی عبارت سلم کے طرز کی نہیں ہے۔

لہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان بلکہ اسلام کے مشرقی علاقوں کی تصنیفات کا رواج اسلام کے مغربی علاقوں مثلاً افریقہ یا اندلس میں کم ہوا خصوصاً پچھلی صدیوں میں جو کام مشرقی ممالک میں ہوا اس سے مغربی علاقوں کے علماء زیادہ واقف نہ تھے، ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں آٹھویں صدی کے مشرقی علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فلم ترلهم من بعد الامام ابن الخطيب ونصير الدين الطوسي كلاما يعول على نهايته فی الاصابة (۹، ۲) (بقیہ برص ۳۶)

وجد بآخر نسخة الاصلي مما هو من کلام المولف لبیان ما اطلع علیه من کتب الاصول عند تالیفه و تعلیق حواشیه ما نصه

مسلم الثبوت کے اصل نسخہ میں خود مولف کتاب کا بیان درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب اور اس کے حواشی کی تالیف کے وقت ان کے سامنے اصول فقہ کی کون کون سی کتابیں تھیں۔

پھر اصل عبارت درج کی گئی ہے۔ حمد و نعت کے بعد ملا محب اللہ نے لکھا ہے کہ اصل کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد میرے بعض دوستوں نے فرمائش کی کہ خود ہی اپنی اس کتاب کے مشکلات کی تشریح میں ایک حاشیہ لکھوں۔ بہرحال اصل متن اور اس کے حواشی لکھنے کے وقت جو کتابیں اُن کے سامنے تھیں ان کی فہرست خود ان ہی کے قلم سے یہ ہے:۔

واعلم انه قد جمع الله بفضله لدی حین تصنیفی لهذا الکتاب، من کتب الحنفیة کتاب البزدوی و اصول السرخسی و کشف البزدوی و کشف للنسفی و البدیع و شرحه الشراح و التوضیح و التلویح و التحریر لابن الهمام و التقریر و التیسیر مع شرحیه و من

معلوم ہونا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے پاس اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں حسب ذیل کتابوں کا ذخیرہ جمع کرا دیا تھا:۔ حنفیوں کے اصول فقہ کی کتابوں میں سے تو البزدوی اور اصول سرخسی، کشف بزدوی، کشف المنار اور البدیع نیز البدیع کے شارحوں نے جو اس کی شرحیں لکھی ہیں، توضیح و تلویح ابن ہمام کی تحریر اس کی شرح، التقریر اور التیسیر اپنے مختلف شروح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) مطلب یہ ہے کہ ابن الخطیب یعنی امام رازی اور طوسی کے بعد ابن خلدون کو مشرقی ممالک کے علماء کی کوئی قابلِ ذکر معتبر کتاب نہ مل سکی، پھر خود ہی لکھا ہے کہ بہ شکل قد دلنا علی ذلک کلام بعض علماء مصنفی تالیف وصلت الینا الی هذه البلاد وهو سعد الدین التفتازانی (؟) جس کا مطلب یہی ہوا کہ علامہ تفتازانی کی بعض کتابیں ابن خلدون تک پہنچی تھیں۔ حالاں کہ اسی زمانہ میں قطب الدین شیرازی، قطب الدین رازی، سید شریف جرجانی، سعد الدین دوانی جیسے ارباب تحقیق کا قلم ان ممالک میں جواہر پاشیوں اور درافشانیوں میں مصروف تھا۔

كتب الشافعية المحصول للامام و	کے ساتھ یوں ہی شافعیوں کی کتابوں میں سے المحصول
الاحكام للآمدي وشرح المختصر	امام رازی کی الاحکام الآمدی کی شرح مختصر قاضی کی،
للقاضي وتعليقاته مع حاشية	نیز اس کے تعلیقات سید شریف کے حواشی کے ساتھ،
السيد الشريف والابهري وشرح	الابہری کی شرح نیز تفتازانی کی شرح الشرح اور فاضل
الشرح للتفتازاني وحاشية الفاضل	میرزا جان کا حاشیہ الردود اور النقود نامی کتابیں بھی،
ميرزاجان، والردود والنقود و	قاضی بیضاوی کی منہاج اور انہوں نے اس کی جو شرح
المنهاج للبيضاوي وشرحه للاسنوي	لکھی ہے اور مالکیوں کی کتابوں میں ابن حاجب کی مختصر
ومن كتب المالكية المختصر والمنتهى	اور منتہی الاصول۔
لابن الحاجب.	

اہل علم جانتے ہیں کہ ملا محب اللہ نے اصولِ فقہ کی کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے کتنی جامع اور حاوی فہرست ہے۔ اس فن کی اہم کتابوں میں خود ہی غور کیجیے کہ آخر کونسی کتاب رہ گئی ہو، صرف احناف کے اصول کی کتابیں نہیں ہیں بلکہ شافعی مالکی اصول فقہ کی امہات کتب بھی جب اس ملک میں پائی جاتی تھیں اور اہل علم کے زیر مطالعہ تھیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتابی سرمایہ کی کمی کا جو عام پروپاگنڈہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے متعلق کیا گیا ہے، اس میں اصلیت کا کتنا حصہ ہے۔

کتنی عجیب بات ہے یہ سارے واقعات جن سے لوگ ناواقف نہیں ہیں، قطع نظر کر لیا گیا، اور ایک امام رازی کی تفسیر کے نہ ملنے کے قصہ کو اتنا اچھالا گیا کہ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند مکتبی اور درسی کتابوں کے سوا اس ملک میں اسلامی علوم کا شدید قحط تھا، عالمگیر کے عہد کی اصول فقہ کی فہرست آپ دیکھ چکے، میں کہتا ہوں کہ فتاوی عالمگیری پر کس عالم کی نظر نہیں پڑتی، انصاف شرط ہے، علم فقہ کی جن مشہور وغیر مشہور طویل ومختصر معتبر نامعتبر کتابوں کے بکثرت حوالے اس فتاوی میں

دیے گیے ہیں، کیا ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ شرح وقایہ، ہدایہ، کنز و قدوری اور اس کی معمولی شرحوں کے سوا ہندوستان میں فقہ کا ذخیرہ نہیں پایا جاتا تھا۔

ہندوستان کی کتابی بے مائگی کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر لوگوں کا اشارہ کن کتابوں اور کس قسم کی کتابوں کی طرف ہے، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے شاہ نورالحق جن کا ذکر میر مبارک محدث کے ذکر میں گزر چکا ان کی شرح بخاری کی فارسی میں موجود ہے، اس کے دیباچہ ہی پر یاروں کی نظر ہوتی تو شاید آج جن کتابوں پر ناز کیا جاتا ہے، وہ ناز باقی نہیں رہتا، ان کتابوں کا نام لیتے ہوئے جن سے شیخ نے اپنی شرح میں استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں

لہ اورنگ زیب عالمگیری کیا یہ تو اس زمانہ کی کتاب ہے جب ہندوستان اسلام کے قدیم اوطان میں ایک پرانا وطن بن چکا تھا، تتارخانیہ جو فیروز تغلق کے عہد میں مرتب ہوا، اسی کے دیباچہ کو کوئی پڑھ لیتا تو سمجھ سکتا تھا کہ ہندوستان کتابی حیثیت سے مغلوں ہی کے عہد میں نہیں بلکہ ان سے بھی پہلے اور بہت پہلے کتنا مالدار تھا، فقہ حنفی کے حاویات، مبسوطات، مجامع، مجموعہ اور فتاوی کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس کا تتارخانیہ کے دیباچہ میں یہ کہتے ہوئے ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ تدوین کتاب میں فلاں فلاں کتابیں زیر نظر تھیں۔ تتارخانیہ تو ایک ضخیم فتاوی ہے۔ فتاوی حمادیہ جو چھپ بھی چکا ہے نسبتاً ایک جلد میں چھوٹا سا فتاوی ہے، میں شاید مبالغہ نہیں کرونگا اگر یہ کہوں کہ کم از کم دو دو بھی تقطیع کے صفحات پر بھی ان کتابوں کی فہرست مشکل ہی سے سما سکتی ہے جن کے نام بحیثیت ماخذ اس کتاب کے دیباچہ میں درج ہیں، نہ صرف حنفی بلکہ فقہ شافعی کی کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ مؤلف کے پیش نظر تھا، مگر ان چیزوں کو کون دیکھتا ہے، جو کچھ غیروں نے کہہ دیا جب اسی پر ایمان لانے کا ارادہ کر لیا گیا ہو، تو اب جستجو کی حاجت کیا ہے۔ ہماری غفلتوں کا تو یہ حال ہے کہ اچھے لکھے پڑھے مولویوں میں بھی ننانوے فیصدی شاید ہی اس سے واقف ہونگے کہ فتاوی حمادیہ ہندوستان میں مدوّن ہوا ہے، حالاں کہ دیباچہ میں بھی مصنف بیچارے نے اپنا نام ابوالفتح رکن بن حسام المفتی الناگوری بتا بھی دیا ہے جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف ہی خود عالم تھے بلکہ ان کے والد حسام بھی المفتی تھے، اصلی وطن تو ان کا ناگور تھا، لیکن اسی میں لکھا ہے کہ نہروالہ (گجرات) کے دارالسلطنت میں یہ کتاب اس زمانہ کے مفتی اعظم علامہ قاضی حماد بن قاضی اکرم کے اشارہ سے لکھی گئی، یہ بھی اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے قاضی حماد کو نعمان الثانی کا خطاب بھی تھا، ابوالفتح رکن خود بھی عالم تھے، والد حسام بھی عالم اور لکھا ہے کہ ان کا بیٹا بھی اس کتاب کی تدوین میں شریک تھا جس کا نام تو نہیں بتایا گیا ہے لیکن اتنا تو معلوم ہوا کہ طبقۂ اہل علم سے ان کا بھی تعلق تھا۔ ہندوستان (جونپور) ہی میں فتاوی ابراہیم شاہی بھی مرتب ہوا تھا

لہ (بر صفحہ ۴۵)

Marfat.com

زبدہ وخلاصہ ایں چند شرح کرمانی، فتح الباری، عینی، سیوطی، شرح تراجم وقسطلانی کہ متداول علماء روزگار است۔ (تیسیر القاری ج ۱ ص ۳)

خط کشیدہ الفاظ قابلِ غور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کی یہ شروح علماء ہند میں عام طور پر عہد جہانگیری وشاہ جہاں میں متداول تھیں۔ جامعہ عثمانیہ میں چند سال ہوئے ایک امیر کا قلمی کتب خانہ آیا تھا۔ اس میں بھی فتح الباری قلمی، عینی قلمی موجود تھی، انتہا یہ ہے کہ کتاب الاسرار الوزید دبوسی بھی اس کتب خانہ میں تھی، واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف دلّی کی مرکزی حکومت بلکہ صوبوں کی طوائفی حکومتوں کی تاریخ پڑھئے۔ شادی آباد مانڈو (سی۔ پی)، احمد آباد (گجرات) لکھنوتی یا گور (بنگال)، کے سوا دکن کی چاروں حکومتوں میں علم وفن کے عشاق سلاطین جو گذرے ہیں، اور ان کے شاہی کتب خانوں میں دنیا جہان سے ہر فن کی جو کتابیں منگائی جاتی تھیں خود ہر ملک سے علماء اپنے ساتھ کتابیں لاتے تھے، اور تحفوں میں بادشاہوں کے پاس پیش کرتے تھے۔

دوسرے ممالک کے سلاطین ہندی بادشاہوں کے پاس مسلسل سفارتیں بھیجتے رہتی تھے، خود پایۂگاہ خلافت سے بھی خلعت اور سند حکومت اس ملک کے سلاطین کے نام وقتاً

(حاشیہ صفحہ ۴۴) تہ واقعہ یہ ہے کہ کشفاً خیال کیجیے یا ضرورۃً جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور اُن کے صاحبزادوں نے قرآن مجید کو فارسی اور اُردو کا لباس پہنا کر اس ملک ہندوستان پر احسان عظیم فرمایا ہے، اُسی طرح شیخ محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کا ترجمہ ضروری مطالب کے ساتھ اور اُن کے صاحبزادے شیخ نور الحق نے بخاری کا ترجمہ ضروری شرح کے ساتھ کر کے اس ملک پر اسی قسم کا احسان کیا تھا۔ شاہ صاحب کو تو اس ملک کی حالت دیکھ کر تقریباً دو سو سال بعد ترجمہ کے ذریعے سے دین کی عمومیت کا خیال آیا لیکن بجنسہ یہی خیال شیخ محدث کو بھی ہوا، فارسی میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اُنھوں نے خود کیا اور بخاری کا ترجمہ وشرح ان کے صاحبزادے نے ان ہی کے اشارے سے کیا جیسا کہ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ تذکرۂ علماء ہند کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوا ہے۔ مولانا نور الحق نے صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی تھی غالباً وہ بھی فارسی میں ہوگی شاہ عبد الحق ہی کے خاندان کے ایک بزرگ مولانا سلام اللہ کی ایک ضخیم شرح عربی زبان میں موطا امام مالک کی فقیر کی نظر سے ریاست ٹونک میں صاحبزادہ عبد الرحیم خاں

کے پاس نظر سے گذری تھی ۱۲

توقتاً جو آتی رہتی تھی، اگر ان تعلقات سے لوگوں کو واقفیت ہو تو ہندوستان کی کتابوں کے افلاس کا افسانہ ان کے لیے افسانہ بن کر رہ جائیگا، براہ خشکی اور براہ دریا[1] اسلامی ممالک سے آنے والوں کا جو تانتا اس ملک میں بندھا ہوا تھا، صرف ایک علی عادل شاہ فرماں روائے بیجاپور کے پاس محض شیراز سے جو لوگ آئے اور انعام و اکرام و وظائف لے کر واپس ہوئے ان کی تعداد خود ایک شیرازی رفیع الدین جو علی عادل شاہ کا خانساماں شاہی تھا دس ہزار بتاتا ہے، میں کسی دوسری جگہ ایک اور ضرورت سے اس کی عبارت بھی نقل کرونگا۔ ملا عبدالقادر بدائونی نے محمد تغلق کے حالات میں لکھا ہے :۔

در اں سال چنداں مردم از ولایت خراسان و عراق و سمرقند باُمید بخشش سلطان" ہند آمدند کہ دریں دیار بغیر از ایشاں طائفہ دیگر کم بنظر می آمد ص۲۳۲ (بدائونی ج ۱)

کچھ ایک اسی بادشاہ کے زمانہ کا یہ حال نہیں ہے، سکندر لودی جس کا ذکر عنقریب آرہا ہے شیخ محدث نے اس علم پرور معارف نواز بادشاہ کے متعلق لکھا ہے کہ

"از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ سابقۂ استدعا و طلب و بعضے بے آں در عہد دولت او تشریف آوردہ و توطن ایں دیار را اختیار کردند" ص۲۲۷ (اخبار الاخبار)

---

[1] ایک عام خیال لوگوں کا یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں دریا کا سفر لوگ کم کرتے تھے۔ خطرات کے خیال سے بھی اور مہینوں بلکہ برسوں آمد و رفت میں خرچ ہو جاتے تھے لیکن دونوں باتیں عدم علم پر مبنی ہیں مولانا سید سلیمان ندوی نے عربوں کی جہاز رانی پر جو مضمون لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاز سے اس زمانہ میں سفر کم نہیں کیا جاتا تھا، دکن کی ساحلی حکومتوں کی تاریخ میں تو اس کا مواد وافر ہے۔ رہا مدت سفر کی طوالت ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی ایسی سرعت رفتاری جہازوں میں کہاں تھی، لیکن شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں اپنے اُستاذ شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات میں لکھا ہے کہ عرب سے وہ ہندوستان آئے اور واپس ہوئے آمد و رفت کی کل مدت اتنی تھی "مدت آمدن کشتی از آنجانب پانزدہ شانزدہ روز بود و ازیں جانب چہل روز ص۲۴۷" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ دن میں اس زمانہ میں بھی بحر ہند اور عرب کو عبور کر کے آدمی حجاز پہنچتا تھا ۱۲

صرف دلی (پایۂ تخت) ہی کی یہ کیفیت نہ تھی، صوبوں میں جو مستقل حکومتیں مختلف زمانوں میں قائم ہوتی رہیں اُن کی قدر دانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، شادی آباد مانڈو (مالوہ) کے بادشاہ محمود خلجی کے ذکر میں مورخین لکھتے ہیں۔

زرہا اطراف عالم فرستاد و مستعداں را طلب داشت و بالجملہ بلاد مالوہ در زمان او یونان ثانی گشت۔ (مآثر رحیمی، ج ۱ ص ۱۲۵)

اور مغلیہ حکومت ہمایوں کے زمانہ میں جب زیر بار منت ایران ہوئی، تو اس وقت کا حال ظاہر ہی ہے بقول بداؤنی کتنے ایسے تھے کہ

پار بودم قطبک و امسال قطب الدین شدم گر بیایم سال دیگر قطب دین حیدر شوم

جب "قطبکوں" کی یہ کیفیت تھی، تو اسی سے اندازہ کیجیے کہ جو لوگ واقعی قطب الملۃ والدین تھے ہندوستان نے ان کے کھینچنے میں کیا کمی کی ہوگی، پھر کیا جوق در جوق علماء کا جو گروہ ہندوستان کھنچا چلا آرہا تھا، وہ خالی ہاتھ آتا تھا، مشہور تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو بلایا جاتا تھا، خود نہ آتے تو اپنی مصنفہ کتابیں ہندوستان بھیج دیتے تھے۔ بداؤنی میں بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد شہید صوبہ دار ملتان (پنجاب) کے ذکر میں ہے کہ

دو نوبت زر بسیار از ملتان بشیراز فرستادہ التماس قدوم شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نمود و شیخ بعذر پیری نیامد اما بہ تربیت میر خسرو سلطان را وصیت فرمود، و سفارش او فوق الحد نوشتہ وگلستاں و بوستاں و سفینۂ اشعار بخط خود ارسال داشت۔ (ج ۱ ص ۱۳۰)

اور اس قسم کے واقعات نادر نہیں ہیں، بنگال سے حافظ شیراز کی طلبی، یا دکن میں مولانا جامیؒ

۱؎ کسی موقعہ پر شمس الدین نامی محدث کا ذکر آئیگا، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے، لکھا ہے کہ چار سو صرف حدیث کی کتابیں ان کے ساتھ تھیں۔

Marfat.com

اور دوسرے علماء کی دعوت کے قصے زبان زدِ عام ہیں ہندوستان کتابوں کے مسئلہ میں کتنا چوکنا اور بیدار رہتا تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے یعنی قاضی عضد نے مواقف کا متن جب لکھا تو محمد تغلق نے اس کتاب کو اپنے نام معنون کرنے اور قاضی صاحب کو ہندوستان بلانے کے لیے ایک خاص عالم کو شیراز روانہ کیا، مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

آوردہ اند کہ سلطان محمد مولانا معین الدین را بہ ولایت فارس نزد قاضی عضد ایجی فرستاد والتماس نمود کہ بہ ہندوستان تشریف آرد ومتن مواقف را بنام او سازد۔ (مآثر۔ص ۱۸۵)

آج تو اس مُردہ قوم کے متعلق آپ جو چاہیں رائے قائم کریں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے جو ذوق تھا اُس کا اس وقت صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، چونکہ بحث صرف ہندی نظامِ تعلیم تک محدود ہے، ورنہ سفر میں اسلامی علماء کتابوں کی جو مقدار اپنے ساتھ رکھتے تھے سُن کر لوگوں کو حیرت ہوتی، چالیس چالیس، پچاس پچاس اونٹوں پر بعض علماء اپنے ساتھ کتابیں بھی ساتھ لیے پھرتے تھے، خود صاحب قاموس کا بھی یہی حال تھا، اسی ہیئت کے ساتھ وہ ہندوستان بھی پہنچے تھے، آخر آخر زمانہ تک اسی ہندوستان کے مولویوں کا کتابوں کے ساتھ یہ ربط تھا کہ ملا عبد النبی احمد نگری جو بارہویں صدی کے عالم ہیں اپنی کتاب دستور العلماء میں احمد نگر کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے بچپن کے زمانہ میں مرہٹوں نے ایک دفعہ احمد نگر کا محاصرہ کیا۔ فوجدار شہر جس کا نام ابراہیم خان تھا، مقابلہ نہ کرسکا، اور بھاگ کھڑا ہوا، مرہٹوں نے شہر میں آگ لگا دی، ملا صاحب لکھتے ہیں

لہ یہی متن مواقف اور اس کے مصنف قاضی عضد کے اسی قصہ میں یعنی محمد تغلق نے مولانا عراقی کو جب شیراز بھیجا چال جب شاہ ابو اسحاق جو اس زمانہ میں شیراز کا بادشاہ تھا معلوم ہوا، اور اس نے سُنا کہ شاہِ ہند مواقف کو اپنے نام معنون کرانا چاہتا ہے تو قاضی عضد کے پاس حاضر ہوا کہ بیوی کے سوا اب وہ سب کچھ جو میرے پاس ہے حتیٰ کہ حکومت بھی لے لیجیے لیکن آپ کو نہ ہندوستان جانے دیا جائیگا اور نہ یہ کتاب کسی دوسرے کے نام معنون ہوسکتی ہے شیخ محدث اور مولانا آزاد کی کتابوں میں آپ کو اس واقعہ کی تفصیل ملیگی۔

راقم الحروف دراں وقت بہ سن بلوغ نرسیدہ بود با والد ماجد مرحوم بعد نماز ظہر بقلعہ رفت

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے والد جو احمد نگر کے قاضی بزرگ تھے، انھوں نے اپنے نوکروں چاکروں کو حکم دیا کہ

"مستورات را بہر عنوان بقلعہ رسانند و اہتمام فرستادن کتب خانہ از ہمہ اسباب خانہ پیش تر دانند چنانچہ شیخ مذکور (خادم قاضی) را در جائے نماز ہائے مسجد جامع بستہ بر سر مزدوراں فرستاد" (ج ۳ ص ۴۱)

حالانکہ سارا شہر جل رہا تھا، مرہٹے گھروں میں گھس کر لوٹ مار مچائے ہوئے تھے، لیکن اس کتابی ذوق کو ملاحظہ فرمائے کہ ایسی حالت میں بھی قاضی صاحب کے سامنے سب سے زیادہ جو چیز اہم تھی، وہ کتابوں کا معاملہ تھا، ملا عبد النبی خود لکھتے ہیں کہ مستورات اور کتابوں کے سوا

"اثاث البیت و دوات کہ در خانہ ماندہ بود ہمہ بغارت رفت"

یہ اثاث البیت جن کو چھوڑ کر قاضی صاحب نے صرف کتابوں کے بچا لینے کو سب سے اہم خیال کیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی، ملا عبد الغنی نے ایک دیکھنے والے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں

از خانہ شریعت پناہ (قاضی صدر) دوازدہ شتر از ظروف و فروش وغیرہ متاع خانہ بار کردہ بردند"

بارہ اونٹوں کا ساز و سامان چھوڑ دیا گیا اور صرف کتابیں بچ گئیں، اسی کو قاضی صاحب نے غنیمت خیال کیا، یہ آخر زمانہ کی بات ہے جب مرہٹوں کا تسلط اس ملک پر ہو چکا تھا، اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمان آثار حیات سے لبریز تھے ان کا کیا حال ہوگا۔

ملا عبد القادر نے لکھا ہے کہ اکبر کے شاہی کتب خانہ سے ایک کتاب خرد افزا نامی گم ہو گئی تھی شاہزادی سلیمہ سلطان بیگم کو اس کتاب کی ضرورت ہوئی، کتب خانہ میں نہ ملی، شاہی کتب خانہ ایک زمانہ میں ملا عبد القادر کی نگرانی میں تھا لیکن ملازمت ترک کر کے وہ بداؤں چلے آئے تھے۔

Marfat.com

صرف اس کتاب کی تلاش میں شاہزادی نے کتنی دلچسپی لی، اس کا اندازہ ملا صاحب کے اس بیان سے کیجیے فرماتے ہیں کہ

بتقریب نامۂ خردافزا کہ از کتاب خانہ گم شدہ بود مخصیلے سلیمہ سلطان بیگم مرا چند مرتبہ یاد فرمودند، ہرچند قاصداں از یاراں بداؤں رفتند بہ تقریب موانع آمدن نشد آخر حکم کردند کہ مدد معاش او راموقوف دارند و خواہی نخواہی طلبند (ج ۳ ص ۳۷۷)

خیال تو کیجیے کہ ایک کتاب کی کیا حقیقت ہے لیکن شاہزادی کے علمی مذاق کا یہ حال ہے کہ بہر حال اس کا پتہ چلانا چاہیے، ملا کو جاگیر کی ضبطی کی دھمکی دی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کے ساتھ ہی بیرونی اسلامی ممالک سے آمد و رفت کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا حج کا قافلہ بھی خصوصاً مغلوں کے عہد میں لاکھوں لاکھ روپے کے ساتھ بھیجا جاتا تھا اس کا کام ایک کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی تھا، اکبر نے سب کچھ بند کردینے کے باوجود حج کے قافلہ کی روانگی کو بدستور جاری رکھا۔ نوادر علوم کی کتابوں کا اکبر[1] کتنا

---

[1] مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں سے ترجمہ کرانے کا کام اکبر کے زمانہ میں جو انجام دیا گیا ہے ایک مبسوط مفصل مضمون کا مواد ہے۔ دربار اکبری میں تھوڑی بہت تفصیل اس کی مولوی محمد حسین آزاد نے کی ہے اسی سلسلہ میں آزاد نے اکبری زمانہ کی ایک تصنیف "ثمرۃ الفلاسفہ" کا بھی تذکرہ کیا ہے، لکھا ہے کہ کسی مغربی زبان غالباً لاطینی سے فارسی میں اکبر کے حکم سے عبدالستار بن قاسم نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ ان ہی کا یہ بیان بھی ہے کہ خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے، کتاب کے دیباچہ سے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ مصنف عبدالستار نے چھ مہینے کے عرصہ میں زبان مذکور جس میں اصل کتاب تھی پادری جزوغوشہ پرسے سیکھ لی، یہ پادری جزو خوشوبران پرتگالی پادریوں میں تھا جو گوا بندر سے اکبر کی دعوت پر دربار میں پہنچے تھے۔ عبدالستار نے لکھا ہے کہ چھ مہینے میں اتنی قابلیت بہم پہنچالی تھی کہ بولنے کی قدرت تو نہیں پیدا ہوئی تھی، لیکن کتاب کا مطلب خاصہ نکال لیتا تھا۔ ابوالفضل نے بھی جہاں گوا بندر کے پادریوں کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ "یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان بہم پہنچا" غالباً اسی قسم کے کاروبار کی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال مغربی زبانوں سے ہندستان کا تعلق گویا اسی زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اور اگر یہ سوال ہو کہ یوروپین زبانوں کی کتابوں کا ہندوستان میں کب سے ترجمہ شروع ہوا تو غالباً اس فہرست میں پہلا نام اس ثمرۃ الفلاسفہ کا رکھا جائیگا۔ کاش! پنجاب کے کوئی بزرگ خلیفہ محمد حسین کے کتب خانہ سے اس پہلی مغربی زبان سے ترجمہ شدہ کتاب کا سراغ لگاتے اور اس کے مضامین سے عام لوگوں کو آگاہ کرتے۔

Marfat.com

شائق تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے پاس تحفے اور ہدیے میں عرب سے لوگ کتابیں بھیجا کرتے تھے۔ اسی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کہ نادر کتابیں اس کے پاس جمع ہو گئی تھیں۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حموی کی معجم البلدان جیسی ضخیم کتاب صرف یہی نہیں کہ اکبر کے کتبخانہ میں موجود تھی بلکہ ملا عبد القادر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ بھی اکبر نے کرایا تھا۔ اس کتاب کے ترجمہ میں جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا وہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں انسائیکلو پیڈیا وغیرہ جیسی کتابوں کی تالیف میں بجائے واحد شخص کے مصنفوں اور مؤلفوں کی ایک جماعت سے جو کام لیا جاتا ہے اکبر اپنے زمانہ میں اس پر عمل پیرا ہو چکا تھا، ملا عبد القادر نے لکھا ہے:-

"دوازدہ کس فاضل را جمع نمودہ چہ عراقی وچہ ہندی و آں را مجزی (جزو) تقسیم کردہ ساختہ تقسیم فرمودند مقدار دہ جز حصۂ فقیر رسید در عرض یک ماہ ترجمہ کردہ پیش تر از ہمہ گزرانیدہ وسیلہ التماس بجانب بداؤں ساختم وبدرجہ قبول پیوست۔ (ج ۳ ص ۷۰)

اجتماعی تالیف کا یہ طریقہ اکبر نے کچھ اسی ایک کتاب کے ترجمہ میں اختیار نہیں کیا تھا بلکہ مہابھارت اور تاریخ کشمیر کے ترجمہ میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی تھی، نیز اکبر نے تاریخ الفی جو اپنے زمانہ میں مرتب کرائی تھی سب کا یہی حال تھا۔

خود ہندوستان کا وہ سرمایۂ ناز فقہی کارنامہ یعنی فتاوی ہندیہ جو عام طور سے فتاوی عالمگیری کے نام سے مشہور ہے جس کے متعلق میں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقالہ میں ان ہی کی زبانی یہ شہادت نقل کی ہے کہ بادشاہ بہ نفس نفیس جو اس کتاب کی تدوین میں علانیہ شریک تھے، روزانہ جتنا کام ہو چکتا تھا بالالتزام لفظاً لفظاً اسے غور سے سنتے تھے، موقعہ موقعہ سے مناسب اصلاح و ترمیم بھی بادشاہ کی طرف سے عمل میں آتی تھی، شاید یہ خصوصیت ہندوستان ہی کی اس فقہی کتاب کو حاصل ہے کہ عالمگیر جیسا بادشاہ اس کے اراکین تدوین میں خود شریک تھا، خیر یہ

Marfat.com

توجملہ معترضہ تھا، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح اکبر ایک ایک کتاب کو بجائے شخص واحد کے چند آدمیوں سے مرتب کراتا تھا، عالمگیر نے بھی اپنے اس "فتاوٰی" کی تدوین کا کام علمار کی ایک کمیٹی کے سپرد کیا تھا، افسر اعلیٰ تو اس سررشتہ کے ملا نظام جو غالباً برہان پور کے رہنے والے ہیں، تھے لیکن ان کے سوا چار اور ارکین کے نام بھی تاریخوں میں لیے جاتے ہیں۔ تاریخ مراۃ عالم کے حوالے سے برہان پور کی تاریخ میں یہ فقرہ منقول ہے کہ علاوہ ملا نظام افسر تدوین کے

"یک* ربع مفوض بہ قاضی محمد حسین جون پوری محتسب عسکر، ویک ربع بہ سید علی اکبر سعد اللہ خانی ویک ربع بہ ملا حامد جون پوری تلمیذ میرزاہد ویک ربع محمد اکرام لاہوری معلم شاہزادہ کام بخش بود" (ص ۴۴)

کم از کم مجھے نہیں معلوم کہ تصنیفی کاروبار نے کسی دوسرے اسلامی ملک میں اتنی وسعت حاصل کی تھی کہ حکومت نے ایک ایک کتاب کی تالیف کے لیے علمار کی باضابطہ کمیٹیاں مقرر کی ہوں، اس سے اس ملک کے بادشاہوں کے علمی وکتابی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے، میرے سامنے چونکہ سلاطین ہند کا علمی پہلو نہیں ہے کہ وہ تو خود ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے، کاش کسی کو اس کے جمع کرنے کی توفیق ہو۔

میں صرف ان کی کتابی دلچسپیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں، ظاہر ہے کہ جس ملک کے بادشاہوں کو کتابوں کے جمع کرنے کا والہانہ شوق ہو، کیا اسی ملک کے متعلق کتابی قحط کا شکوہ صحیح ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ شاہی کتاب خانوں کی کتابیں بھی اور ان کتابوں کے ساتھ ان کی فہرستیں بھی انہی ممالک میں منتقل ہو گئیں جہاں ان کا خزانہ منتقل ہوا، جواہرات منتقل ہوئے۔ ورنہ

* تعجب ہے کہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں یہ کس ماخذ کی بنیاد پر لکھا ہے کہ ارکین تدوین میں بھی بہار کے بھی دو عالم شریک تھے جن میں ایک پھلواری شریف کے رہنے والے تھے۔ کسی صاحب کو ماخذ معلوم ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔

* میرے مرحوم دوست مولوی مظہر علیم سفیر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جن کا روزنامچہ کہیے یا سفرنامہ "سفرنامۂ مظہری" کے نام سے ان کے بھائی مولوی حلیم انصاری صاحب نے ان کی وفات کے بعد جمع کرکے شائع کر دیا ہے (بقیہ برصفحہ ۵۳)

ہوسکتا ہے کہ دلّی کے سلاطین ہوں یا صوبجات کے ملوک اپنے اپنے زمانہ میں علم کی کتنی بڑی دولت ان لوگوں نے جمع کی تھی، کبھی کبھی پُرانے کتب خانوں میں جواب بھی ہندوستان کے بعض مقامات میں بطور بقیۃ السیف کے رہ گئی ہیں، وہ کتابیں نظر آجاتی ہیں جن پر سلاطین کی مہریں یا اُن کے قلم سے کتاب کے متعلق کوئی یادداشت ثبت ہے، علی الخصوص عظیم آباد پٹنہ المعروف بہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں خدابخش مرحوم نے ایسی کتابوں کا ایک

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۲) اور بنگال بہار، دکن، کاٹھیاوار، گجرات، صوبجات متوسطہ وغیرہ کے دیہاتوں اور قریوں میں مسلمانوں کی جو حالت اس زمانہ میں ہے اُس کے متعلق بڑے دلچسپ ہی نہیں بلکہ دل دوز معلومات درج ہیں، بڑے بڑے امرا، نواب علماء، فقراء کی اولاد اس ملک کے گوشہ گوشہ میں کس طرح پھیلی ہوئی ہے اس کا حال آپ کو اس کتاب میں ملیگا، پُرانے خاندانوں میں شاہی وثائق یا پُرانی کتابیں جہاں کہیں نظر پڑی ہیں، اُن کا ذکر بھی کہیں کہیں کرتے چلے گئے ہیں، اسی سلسلہ میں کمیلا (مشرقی بنگال) کے ایک رئیس نواب حسام حیدر کا بھی تذکرہ درج کرتے ہوئے ایک موقعہ پر لکھتے ہیں کہ "نواب حسام حیدر صاحب نے ایک قرآن شریف قلمی مذہب مُطلاّ دکھایا، دبیز چکنے کاغذ پر خط ولایت لکھا ہوا تھا، بڑی تقطیع ہے، اُس کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں" یہاں تک تو خیر معمولی بات ہے جس چیز کی وجہ سے میں نے اس قصّہ کا ذکر کیا ہے وہ ان کے بیان کے یہ آخری دو فقرے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ قرآن "خاص داراشکوہ کی تلاوت کا مصحف ہے مہر اُس کی موجود ہے" صاحب قران ثانی (شاہ جہاں بادشاہ کے چہیتے لخت جگر کا قرآن ہے، اور کمیلا کے نواب صاحب کے پاس یہ پہنچا کس ذریعہ سے ان ہی سے سُنیئے لکھتے ہیں:-

"ایک یورومین لیڈی سے نواب صاحب نے لیا تھا" (سفرنامہ مظہری ص ۵۸)

شاہی کتب خانہ کس طرح لوٹا گیا اور کن کن ہاتھوں تک یہ جواہر پارے پہنچے اس کا اندازہ آپ کو اسی ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے، مرحوم نے اور اور مقامات کے نادر نسخوں کا ذکر کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ حکیم حبیب الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) کے پاس الذہبی کی "الکاشف" کا نسخہ خط کوفی میں دیکھا ۸۰۰ھ کی کتابت تھی۔ ایک نسخہ "منطق الشفا" ابن سینا ۱۰۹۰ھ کا مکتوبہ کتب خانہ عالمگیری کا نسخہ تھا (ص ۵۲) ازیں قبیل مختلف مقامات میں اس قسم کی نادر چیزیں ان کو نظر آئی ہیں۔

Marfat.com

اچھا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

اس زمانہ میں عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے زر کثیر صرف فرما کر جہاں جہاں سے ممکن ہوا ہے ان جواہر پاروں کا ایک قیمتی مجموعہ اپنے کتاب خانہ "حبیبیہ" میں جمع بھی کیا ہے اور یہ مشغلہ ابھی جاری ہے۔

اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایک صوبجاتی حکومت بیدر کے مشہور علم دوست وزیر خواجہ جہاں گیلانی مشہور بہ محمود گاواں کے کتب خانہ کے متعلق مولوی ابوالحسنات مرحوم نے ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں والی کتاب میں حدیقۃ الاقالیم کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

"پینتیس ہزار کتابیں مختلف علوم وفنون کی نکلیں" (ص ۶۰)

یہ بادشاہی کتاب خانہ نہیں بلکہ ایک وزیر کے کتب خانہ کی کتابوں کی تعداد ہے، شاہ نواز خاں نے مآثر الامراء میں نقل کیا ہے کہ جب مُلّا فیضی کا انتقال ہوا اور اکبر نے اُن کے ذاتی کتب خانہ کے ضبط کا فرمان نافذ کیا تو معلوم ہوا کہ

"نزد شیخ (فیضی) چہار ہزار وسہ صد کتب صحیح ونفیس داخل سرکار بادشاہ شد" (ج ۱ ص ۵۸۵)

خیال تو کیجیے ایک شخص جو نہ بادشاہ ہے اور نہ وزیر بلکہ عہد اکبری کا ایک عالم امیر ہے۔ اس کے کتب خانہ سے چار چار ہزار صحیح ونفیس کتابیں جس زمانہ میں برآمد ہوتی تھیں، کہا جاتا ہے اسی ملک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کتابوں کے لحاظ سے ہندوستان میں خاک اُڑتی تھی، اور یہ لوگ تو خیر گو حکومت سے تعلق بھی رکھتے تھے، مفتی آزردہ دہلی مولانا صدرالدین خاں صاحب (جو اُجڑی دلّی کے مفتی تھے) لیکن باوجود اس کے ان کے براہ راست شاگرد مولوی فقیر محمد صاحب نے اپنی کتاب "حدائق الحنفیہ" میں لکھا ہے کہ غدر کے مقدمہ میں مفتی صاحب کو جب رہائی حاصل ہوئی تو لاہور تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی گورٹ

میں نیلام ہوا تھا حضور لارڈ جان لارنس کے پاس جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دلّی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے مطالبہ کیا لیکن جائداد منقولہ کا واپس ہونا متعذر تھا اس لیے مطلب میں کامیاب نہ ہو سکے (حدائق صفحہ ۲-۴۳) تین لاکھ کی کتابوں کی تعداد کیا ہوگی خود سوچنا چاہیے۔

مولوی ابو الحسنات مرحوم نے ایک گمنام مولوی میر محمد علی کا ذکر کیا ہے جو نہایت جنگ کے زمانہ میں عظیم آباد سے مرشد آباد چلے گئے تھے۔ لکھا ہے کہ اکیلے اس مولوی کے پاس دو ہزار کتابوں کا کتب خانہ تھا۔ تلاش کیا جائے تو عہد اسلامی میں ایسے ذاتی کتب خانوں کا اور بھی پتہ چل سکتا ہے۔ سکندر لودی کے عہد کے ایک غیر مشہور عالم سید ابراہیم دہلوی کا تذکرہ فرماتے ہوئے شیخ محدث دہلوی نے اخبار میں لکھا ہے۔

چنداں کتب واکثر بخطا او از کتاب خانہ او برآمدہ کہ از حد و حصر خارج۔ (ص۔ ۲۵)

"اکثر بخط او" کے الفاظ قابلِ غور ہیں، سچی بات تو یہی ہے کہ جب خطاطی کا ہنر کسی صاحبِ ذوق کے اندر موجود ہو، وہ چاہے جتنی کتابیں بھی فراہم کر سکتا ہے۔ یہ چند سرسری واقعات ہیں جو میں نے اِدھر اُدھر سے بغیر کسی مزید کد و کاوش کے پیش کر دیے ہیں۔ ان واقعات کو ایک طرف رکھیے اور اس کے بعد اس لطیفے کی حقیقت پر غور کیجیے کہ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تفسیر کبیر بھی موجود نہ تھی، ہو سکتا ہے کہ نہ موجود ہو لیکن کسی عالم کے پاس اگر کوئی کتاب اتفاق سے نہ پائی جائے تو کیا اس کا یہ مطلب صحیح ہو سکتا ہے کہ ایسا ملک دنیا جہان کی ساری علمی کتابوں سے قطعًا خالی تھا آج جس ہندوستان میں شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق امام رازی کی تفسیر کا ایک حال یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کیا تماشا ہو کہ اسی ہندوستان کے متعلق مولانا غلام علی آزاد یہ واقعہ خود تفسیر کبیر رازی ہی کے متعلق نقل فرماتے ہیں کہ ان کے استاد یعنی استاذ المحققین میر طفیل محمد صاحب

Marfat.com

آغازِ شباب میں آگرہ تشریف لے گئے وہاں نواب فضائل خاں کے دربار تک ان کی رسائی ہوئی۔ نواب نے چند مولویوں کو سامنے پاکر مشہور قرآنی آیت "عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ"[1] کا ذکر چھیڑ دیا۔ عام توجیہ کہ بابِ افعال کی ایک خاصیت سلب مادہ بھی ہے، اس لیے مطلب یہ ہے کہ جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو، اس کا ذکر ہوا، اس پر میر طفیل محمد صاحب نے فرمایا کہ "ہمزۂ سلب در باب افعال سماعی ست نہ قیاسی" یعنی باب افعال کے ہر لفظ میں اس خاصیت کو مان لینا صحیح نہ ہوگا، جب تک خود لفظ اطاقت کے متعلق ائمۂ لغت سے اس کی تصریح نہ دکھادی جائے

---

[1] اہل علم تو اس آیت کے متعلقہ مباحث سے واقف ہی ہیں جو نہیں جانتے ہیں اُن کے لیے لکھا جاتا ہے کہ روزہ جب فرض کیا گیا تو اُس میں جہاں مسافروں اور مریضوں کو مہلت دی گئی کہ وہ بعد کو رکھ سکتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ جو روزے کی اطاقت رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کو کھانا بطور فدیہ کے کھلادیا کریں۔ اطاقت کے کیا معنی ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حنفی مذہب میں آدمیوں کو تین حصّوں میں بانٹا گیا ہے ایک وہ جنہیں کوئی عذر روزہ رکھنے میں مانع نہ ہو ظاہر ہے کہ ان پر تو مقررہ وقت یعنی رمضان میں روزہ رکھنا فرض ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو عذر رکھتے ہیں۔ عذر والوں کی بھی دو قسمیں ہیں، اسی لیے تیسری قسم پیدا ہوگئی، یعنی عذر ان کا ایسا ہے جس کے متعلق توقع کی جاسکتی ہے کہ مرنے سے پہلے ازالہ ہو جائیگا، مثلاً سفر سے مسافر گھر واپس آجائے یا بیماری سے اچھا ہو جائے۔ لیکن بعض لوگوں کا عذر ایسا بھی ہو سکتا ہے جس سے نجات عام حالات میں موت تک نہیں ہو سکتی مثلاً شیخ فانی کی جوانی واپس ہو، ناممکن ہے۔ بس ان معذوروں کے لیے جن کا عذر زوال پذیر ہے یہ حکم ہے کہ زوال عذر کے بعد روزوں کی قضا کریں۔ پر جن کا عذر زوال پذیر نہیں ہے، ان ہی کے لیے فدیہ کا حکم ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک یہ تینوں قسموں کا حکم نہ بیان کیا جاتا روزہ کا قانون مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہدایہ میں شیخ فانی وغیرہ کے حکم کو اسی آیت یطیقونہ سے نکالا گیا ہے جو دلیل ہے کہ فقہاء احناف نے اس لفظ کا ترجمہ یہی قرار دیا ہے کہ روزہ بہ مشقت رکھ سکتے ہوں یعنی رکھنے کی صلاحیت تو نہ ہو لیکن خواہ مخواہ رکھنا چاہتے ہوں۔ ان کے لیے فدیہ کا حکم ہے۔ لغت سے بھی اطاقت کے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور یطیقونہ کی قرأت بھی اسی کی مؤید ہے۔

اس آیت کی اور توجیہیں بھی ہیں، جن میں حضرت شاہ ولی اللہ والی تاویل یعنی صدقۂ فطر پر اس کو محمول کیا جائے۔ اس حنفی توجیہ کے بعد زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ انسانوں میں ایک تیسری قسم پیدا ہوتی ہے یعنی وہی لوگ جن کا عذر زوال پذیر نہ ہو تو ان کا حکم کہاں سے نکالا جائے، اگر اس آیت کا وہ مطلب نہ بیان کیا جائیگا جو صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے۔

کہ سلب مادہ کی حیثیت سے عربی زبان میں اطاقت کا لفظ بھی مستعمل ہے میر طفیل محمد کا بیان ہے کہ اتنی سی معمولی سی بات کے لیے

تفسیر کبیر امام رازی وکشاف وبیضاوی وتفاسیر دیگر، واز لغت کتب صحاح جوہری وقاموس وغیرہ ملاحظہ کردند (مآثر الکرام ص ۱۵۱)

مجھے اس وقت اصل مسئلہ سے بحث نہیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ معمولی معمولی مسئلوں کے لیے جس ملک میں تفسیر کبیر نکلا کرتی تھی، اُسی ملک کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں کہ محض ایک شاہ عبدالعزیز کے واقعہ کی وجہ سے اس پر فقدان کتب، یا کتابی افلاس کا الزام لگانا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے؟

بلکہ اگر آپ سچ پوچھتے ہیں تو میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ پریس اور مطابع کے اس عہد سے پہلے کم از کم کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بعض وجوہ سے نسبتاً زیادہ آسان تھا، شہروں اور قصبوں میں آبادی کا ایک خاص طبقہ تقریباً ہر جگہ پایا جاتا تھا جس کی گذر اوقات ہی "وراقیت" پر تھی، مولانا عبدالحیی فرنگی محلی مرحوم لفظ "وراق" کی تشریح کرتے ہوئے "فوائد بہیہ" میں لکھتے ہیں

الوراق ... اسم لمن یکتب المصاحف وکتب الحدیث وغیرھا وقد یقال لمن یبیع الورق وھو الکاغذ ذکرہ السمعانی (ص ۱۰)

وراق نام ہے اُن لوگوں کا جو قرآن مجید اور حدیث اور ان کے سوا دوسری کتابوں کے نقل کرنے کا کام کرتے ہیں، کبھی کاغذ فروش کو بھی وراق کہتے ہیں، سمعانی نے یونہی لکھا ہے۔

چونکہ ان لوگوں کی گذر اوقات کی یہی واحد شکل تھی اس لیے وہ اس کا پتہ چلائے رکھتے تھے کہ کون کون سی کتابیں شہر میں کس کس کے پاس پائی جاتی ہیں صرف فرمائش کی دیر ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ اس کتاب کی نقل حاصل کرکے طالب کو پہنچا دیتے تھے، ہندوستان میں انہی وراقوں کو نساخ بھی کہتے تھے، یہ لوگ گاہکوں کی تلاش میں کس طرح سرگرداں رہتے تھے اس کا

Marfat.com

اندازہ آپ کو دتی ہی کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل رحمۃ اللہ علیہ کو جامع الحکایات عوفی کی ضرورت تھی لیکن غریب آدمی تھے اتنے پیسے ہاتھ پر نہیں چڑھتے تھے کہ اُس کی نقل کا انتظام کریں۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ

روزے نساخے حمید لقب علیہ الرحمۃ بخدمت او (شیخ نجیب الدین) آمد، شیخ نجیب الدین گفت دیر بازست کہ ما می خواہیم کہ جامع الحکایات را بنویسانیم ہیچگونہ میسر نمی آید"

حمید نساخ نے اس کے بعد جو جواب دیا ہے، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتابوں کے مہیا کرنے میں ان نساخوں کا کیا حال تھا، سلطان جی نے اس کے بعد فرمایا کہ "حمید گفت حالے چہ موجود داری، شیخ (نجیب) گفت یک درم" حمید غریب کو یہ ایک درم بھی غنیمت معلوم ہوا "آں درم گرفتہ ازاں کاغذ خریدہ آورد و در کتابت شد"

آگے قصہ کا تتمہ یہ ہے کہ سلطان جی نے فرمایا "یک درم را چند کاغذ موجود شدہ باشد" چند کاغذ سے غالباً چند اجزاء مراد ہیں، جس سے گویا اس زمانہ میں کاغذ کی کچھ قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ملا عبد القادر بداؤنی نے مشہور شاعر عرفی شیرازی کے تذکرہ میں اس کے معاصر ثنائی شاعر کے دواوین کی عام مقبولیت کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اُن سے بھی اس زمانہ کی کتب فروشی کی کیفیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں "ہیچ کوچہ و بازارے نیست کہ کتاب فروشاں دیوان ایں دو کس (عرفی و ثنائی) را در سر راہ گرفتہ نایستند و عراقیاں و ہندوستانیاں نیز بہ تبرک می خرند[1]"

ہندوستان کے شہروں میں اگر واقعی کتب فروشی کا یہی حال تھا کہ ہر کوچہ بازار میں کتب فروش کتابیں لیے کھڑے رہتے تھے تو پریس کے اس عہد کو اس لحاظ سے کیا

[1] ج ۳ ص ۲۸۵۔

ترجیح حاصل ہو سکتی ہے۔

اس زمانہ کے وراقوں اور نساخوں کے ذریعہ سے کتابوں کے نسخے ملک میں کتنے وسیع پیمانہ پر پھیل جاتے تھے اس کا اندازہ بھی آپ کو ان ہی ملا عبدالقادر کی اسی تاریخ سے ہو سکتا ہے جس سے میں نے مندرجہ بالا عبارت نقل کی ہے، ملا صاحب نے جیسا کہ سب کو معلوم ہے اکبر اور اکبری دربار کا سارا کچا چٹھا کھول کر اس میں رکھ دیا تھا، اس لیے ملا صاحب نے زندگی بھر تو اس کتاب کو صیغۂ راز میں رکھا، اندیشہ تھا کہ ذرا سی بھی بھنک حکومت کو لگی تو ان کی ہی نہیں بلکہ ان کے آل اولاد خانماں کی خیر نہ تھی، لیکن جب وفات ہوئی تو نساخوں نے کسی طرح اس کی نقل حاصل کی، اور ملک میں اتنی سرعت کے ساتھ اس کے نسخے پھیلا دیے کہ جہانگیر جیسا مطلق العنان بادشاہ بھی ملا کی اس تاریخ کے نسخوں کو معدوم نہ کر سکا۔ اسی کتاب کی آخری جلد میں جو مقدمہ درج ہے، اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو ملا عبدالقادر "تا حیات خود مخفی داشتہ درزمان جہانگیر پادشاہ کہ خبر طبع ایشاں رسید" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ بگولا ہو گیا، ملا بیچارے سے انتقام لینے کی صورت کیا تھی! نزلہ ان کے خاندان پر ٹوٹا، لکھا ہے "اولاد او را دعبدالقادر را طلب داشتہ مورد اعتراض ساختند" واللہ اعلم کیا کچھ ان غریبوں کو سنایا گیا، بہر حال ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہوا "آں ہا گفتند ما خورد سال بودیم خبرے نداریم"

حالانکہ ظاہر کہ ملا کے "مخفی نسخہ" کو آخر نساخوں تک کس نے پہنچایا ہو گا۔ ملا صاحب کی اولاد یا ان کی بیوی ان کے سوا ملا بیچارے کے اس راز خونخوار سے اور کون واقف ہو سکتا ہے مگر خدا نے فضل کیا، جہانگیر کی سمجھ میں کچھ بات آگئی، تاہم اس کے بعد بھی شاہی فرمان ہوا کہ

ہمارے ہاں بھی اخبار ہند (مدراس) میں ایک خبر یہ شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۵۶ء میں چھپ چکی [illegible] کے شاہد ہیں مگر اب بھی چھاپے خانے بہت کم کھل سکے ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں سست رفتاری [illegible] یہ بھی کہ مشہور کتابوں کی نقل کے لیے خطاطوں کا انتظام مسلمانوں نے کر رکھا تھا۔ (اخبار ہند مدراس ۱۹۳۳ء)

Marfat.com

ملّا کی اولاد سے مچلکہ لیا جائے کہ اس کتاب کی اشاعت نہ ہونے پائے، ان بیچاروں نے مچلکہ دیا جیسا کہ لکھا ہے۔ "مچلکہ نوشتہ دادند کہ نزما ہم رسد سیاست کردنی باشیم" مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، ان لوگوں کے مچلکہ لینے سے کیا ہوتا۔ کتاب تو ملک میں پھیل چکی تھی، خیال کیا جاسکتا ہے کہ جہانگیر نے کوئی دقیقہ اس کتاب کے غائب اور مفقود کرانے میں اُٹھا چھوڑا ہوگا، لیکن اس زمانہ کی "وراقیت" اور "نساخیت" کا نظام اتنا وسیع پیمانہ پر پھیلا ہوا تھا کہ حکومت بھی اس تاریخ کے نسخوں کو معدوم نہ کرا سکی، اور ملّا کی وفات سے لے کر تا ایں دم ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مل سکتی ہے اور اب تو خیر چھپ ہی گئی ہے۔

حالانکہ اس زمانہ میں حکومتیں جب چاہتی ہیں تو مطبوعہ کتابوں کو ضبط کر کے چند ہی دنوں میں ان کو دنیا سے ناپید کر دیتی ہیں، لیکن جہانگیر کی حکومت قاہرہ ایک کتاب کو معدوم کرنے پر قادر نہ ہو سکی، وجہ ظاہر ہے کہ پریس کی وجہ سے نقل کتب کا رواج باقی نہ رہا۔ جن کتابوں کے چھاپنے کی ممانعت کر دی جائیگی ان کا ناپید ہو جانا ناگزیر ہے، لیکن اس زمانہ میں گلی گلی کوچہ کوچہ میں آپ کو نساخ مل سکتے تھے حکومت ان کی نگرانی کہاں تک کر سکتی تھی۔ آج ان چابک دستیوں کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے جو نساخیت اور وراقیت میں لوگوں کو اس زمانہ میں حاصل تھی بلکہ نقلِ کتب کے جن کمالات کا تذکرہ جستہ جستہ طور پر کتابوں میں پایا جاتا ہے، اگر آج اُن کو بیان کیا جائے تو مشکل ہی سے باور کیا جاسکتا ہے، وہی لوگ نہیں جو اس پیشہ کو معاشی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے تھے، بلکہ عام خوش باش لوگوں کی مہارت بھی عجیب تھی، بلگرام کے ایک عالم شاہ طیب قدس سرہٗ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے ارقام فرمایا ہے "شرح ملّا جامی را در یک ہفتہ من اولہ الی آخرہ نوشت" (مآثر ص ۴۳) شرح جامی کی ضخامت سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ہفتہ میں بڑی تقطیع پر چار پانسو صفحوں کی اس کتاب کا اوّل سے آخر تک نقل کر دینا اس زمانہ میں کیا قابل تصور بھی

Marfat.com

ہو سکتا ہے، اور یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ ان ہی میر طیب کے متعلق مولانا ہی لکھتے ہیں۔

"بہجۃ المحافل کہ کتابے ست ضخیم در سیر نبوی تصنیف یحییٰ بن ابی بکر العامری الیمنی در بست وسہ روز کتابت کرد"

اب یہ کتاب چھپ چکی ہے، ملتی ہے دیکھ لیجیے، اس کی ضخامت کو ملاحظہ فرمایئے اور تیئیس۲۳ دن کی مدت خیال کیجیے ظاہر ہے کہ اسی میں زندگی کے دوسرے ضروری اور دینی مشاغل بھی شریک ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ قلم کیا تھا، ہوائی جہاز تھا۔ میر طیب کی اسی سرعت کتابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں "کتب خانہ عظیمے از خط خوش نمط خود یادگار گذاشت"

اور یہی وہ بات تھی جس کا ذکر میں نے کیا تھا کہ نساخی اور کتابت کا ہنر جس کے ہاتھ میں ہو اس کے لیے کتابوں کی فراہمی اس زمانہ میں کچھ دشوار نہ تھی، جو ایک ایک ہفتہ میں پوری شرح جامی نقل کر کے رکھ دیتا ہو، سوچیے تو بڑی سے بڑی کتابوں کا نقل کر لینا اس کے لیے کیا دشوار ہو سکتا ہے۔

واللہ اعلم میر طیب کے کتاب خانہ میں کون کون سی کتابیں تھیں، لیکن بہجۃ المحافل جیسی کتاب جب ان کے کتب خانہ میں موجود تھی جس سے عوام تو عوام اس زمانہ کے عام علماء جنہیں فن سیرت سے زیادہ لگاؤ نہیں ہے، مشکل ہی سے واقف ہونگے، حالانکہ اس فن کی معتبر کتابوں میں اس کا شمار ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کو نوادر فن کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا، اور کچھ میر طیب کا یہ کوئی خصوصی مذاق نہ تھا، صرف مآثر الکرام میں آپ کو متعدد علماء ایسے نظر آئیں گے جن کے تراجم میں مولانا آزاد عموماً اس قسم کے الفاظ ارقام فرماتے ہیں مثلاً "خط شاں نسخ بہ پختگی وشیرینی می نوشت وکتب درسی بیروں از حصر در قید کتابت آورد (ص ۲۲۵) "کتب درسی" سے کیا کریما، مامقیماں مراد ہے۔ مولانا آزاد ہی ان کتب درسی کی تفصیل فرماتے ہیں "مطول وتلویح بہ خط شیریں نمط موجود ست" اور صرف نقل ہی پر کفایت نہیں کی جاتی، بلکہ "ہر یک کتاب را من اولہ الی آخرہ تحشیہ نمود" عموماً ان حاشیوں کی

حیثیت کیا ہوتی تھی، شیخ کمال ایک عالم کے ذکر میں مولانا آزاد نے لکھا ہے۔

"کتب درسی از صرف و نحو منطق و حکمت و معانی و بیان فقہ و اصول و تفسیر وغیرہا مجمع بدست مبارک کتابت کردہ ہر یک کتاب را من اولہ الی آخرہ محشی ساخت بہ حیثیتے کہ متن محتاج شرح و شرح محتاج حاشیہ نماند" (مآثر الکرام ص ۲۲۹)

بظاہر اس عبارت کا مطلب وہی معلوم ہوتا ہے کہ بین السطور کے حواشی اور ضمیروں پر ہندسے لگا کر متعلقات کو "ص" کے حرف سے نمایاں کر کے کلام کی تعقید اور پیچیدگیوں کے ازالہ کا جو عام دستور عہد قدیم میں تھا، اسی پر عمل کیا گیا تھا۔ اور صرف یہی نہیں کہ کتابیں نقل کی جاتی تھیں، ان کی خدمت کی جاتی تھی ان کو اس طرح حل کر کے رکھ دیا جاتا تھا کہ شروح و حواشی کی امداد کے بغیر مطلب سمجھ لیا جائے۔ بلکہ اسی کے ساتھ مولانا آزاد جیسے محتاط بزرگ کے یہ الفاظ ہیں "کہ در تمام کتاب یک نقطہ غلط نتواں یافت" اسی عجیب و غریب مشق اور چابک دستی کا نتیجہ تھا کہ ایک ایک آدمی صرف اپنے قلم سے مستقل کتب خانہ مہیا کر لیتا تھا، مشہور ابو الفضل و فیضی اکبر کے درباریوں کے والد شیخ مبارک ناگوری کے حالات میں مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ "پانصد مجلد ضخیم بدست خود تحریر نمود" (ص ۱۹۸)

اپنے ہاتھ سے پانسو صرف کتابیں نہیں بلکہ ضخیم کتابوں کا نقل کرنا اس زمانہ میں بلاشبہ ایک افسانہ سے زیادہ شاید نہ سمجھا جائے لیکن خدا نے انسان میں جو کمالات پوشیدہ کیے ہیں جب ان کمالات کو بروئے کار لانے پر کوئی قوم آمادہ ہو جاتی ہے تو وہ ہوا پر بھی اڑ سکتی ہے، سمندر کو گھر بنا سکتی ہے، اور جو کچھ کر سکتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن جن کے مردہ اخلاف کو دیکھ کر ان کے زندہ اسلاف کی طرف اس قسم کے عجائب کا انتساب محل غور و تامل بنا ہوا ہے، شاید قوموں کی موت و حیات کا قانون ان کے سامنے سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ آپ کو آج اسی پر تعجب ہو رہا ہے کہ ایک شخص (ملا مبارک) جن کا ظاہر ہے کہ کتابت ہی پیشہ نہ تھا بلکہ پچاس سال

تک آگرہ میں اپنے درس و تدریس کا غلغلہ بھی اُنہوں نے بلند کر رکھا تھا۔ اس شخص نے پانسو ضخیم مجلدات کو کس طریقہ سے نقل کیا تھا، لیکن شیخ محدث دہلوی نے تو اپنی کتاب اخبار الاخیار میں اسی "زود نویسی" اور مشق کتابت کے واقعات اس سے بھی عجیب تر نقل کیے ہیں حصار (مشرقی پنجاب) میں حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ جنید حصاری رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ محدث نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "سرعتِ کتابت او بحدے بود کہ آں را حمل جز بر خارق عادت نتواں نمود" پھر اس معجزانہ زود نویسی کی خود تفصیل فرماتے ہیں کہ "در سہ روز تمام قرآن مجید با اعراب می نوشت"[1]

تین دن میں قرآن کے تیسوں پاروں کا لکھنا اور صرف لکھنا ہی نہیں بلکہ اعراب یعنی زیر، زبر، پیش وغیرہ حرکات بھی ہر ہر حرف پر لگانا، واقعہ تو یہی ہے کہ شیخ جنید کی اسے کرامت ہی خیال کرنا چاہیے، مگر کیا کیجیے کہ واقعہ ایک نہیں ہے، یہ تو شیخ محدث کا شنیدہ ہے۔ برہان پور کے مشہور محدث حضرت عبدالوہاب المتقی جو صاحب کنز العمال شیخ علی المتقی کے ارشد تلامذہ و خلفاء میں ہیں اور ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حجاز پہنچ کر ان ہی سے زیادہ تر استفادہ فرمایا تھا، ان کے براہِ راست شاگرد ہیں، اپنے انہی اُستاد شیخ عبدالوہاب

---

[1] آج یہ باتیں محل حیرت ضرور ہیں لیکن جیسا کہ آگے آپ پڑھیں گے ہزار ہزار سطروں کا یومیہ لکھ لینا لوگوں کے لیے جب مشکل نہ تھا، تو تین دن میں پورا قرآن اگر لکھ لیا جاتا تھا تو کیا تعجب ہے۔ "تذکرہ خوشنویساں" نامی کتاب میں جو ایک معتبر کتاب ہے آئندہ بھی ممکن ہے اس کے حوالے آئیں۔ اسی کتاب میں "مولانا سیمی" کے زیر عنوان لکھا ہے "در پیشہ خط مہارت داشت در ہر فن سر دستعد و صاحب کمال، ول در خوشنویسی بود بعد ازاں بہ مشہد مقدس رضوی ساکن شد و در عہد علاء الدولہ شاہزادہ بن بالسنغر مولانا سیمی در یک شبانہ روز سہ ہزار بیت نظم کرد و بطور کتابت خوشنویسانہ نوشتہ" ص ۵۹ مشمورہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

غور کرنے کی بات ہے کہ تین ہزار اشعار اتنی قلیل مدت یعنی کل چوبیس گھنٹوں میں صرف منظوم ہی نہیں ہوئے بلکہ شاعر نے انہیں لکھ بھی لیا، صرف لکھا نہیں بلکہ خوشنویسانہ شان کے ساتھ لکھا، مسلمانوں نے جب مہارت کو اس نقطۂ کمال تک پہنچا دیا تھا، تو میں نہیں سمجھتا کہ محض اس لیے کہ اس زمانہ میں ایسے ماہرین چابکدست چونکہ نہیں پائے جاتے اس لیے باور کرنا چاہیے کہ کسی زمانہ میں بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ یہ کونسی منطق ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

کے متعلق اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ "ایشاں خط نستعلیق را بسیار خوب نوشتند" یہ اُس وقت کا حال ہے جب شروع شروع مکہ معظمہ گئے تھے اور شیخ علی المتقی کے حلقہ میں شریک ہوئے تھے۔ شیخ علی نے ان کو خط نسخ (عربی) کی مشق کا حکم دیا، چند ہی دنوں میں وہ صاف ہو گیا، حتیٰ کہ "در اندک مدت خط نسخ نیز حُسن صورت پذیرشد" محدث دہلوی نے پھر ان کی زود نویسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کتابے بود مواز نہ دوازدہ ہزار بیت" شیخ علی المتقی جو شیخ عبدالوہاب سے عموماً لکھوانے کا کام لیتے تھے، ان کو اسی بارہ ہزار بیت کی کتاب لکھوانے کی جلدی تھی، شیخ محدث فرماتے ہیں "در انکتابت و استنساخ آں استعجال می کردند" شیخ عبدالوہاب نے اپنے پیر کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اتنی طویل کتاب کو کتنے دن میں لکھا؟ محدث دہلوی کی اپنے استاد کے متعلق یہ شہادت ہے کہ "در دوازدہ شب تمام کردند" شب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں دن بھی شریک تھا خود شیخ محدث کی تصریح ہے "ہر شب ہزار بیت می نوشتند باکتِ بہلئے دیگر کہ در روز می کردند (ص ۲۶۹۔ اخبار)

پھر جب ایک رات میں ہزار بیت ایک شخص لکھ سکتا تھا، دن کے دوسرے لکھنے پڑھنے کے مشاغل کے ساتھ لکھ سکتا تھا، اور یہ شیخ ہی کے اُستاد کا قصہ ہے تو شیخ جُنید اگر تین دن میں قرآن کامل باعراب لکھ لیتے تھے۔ اس میں کیوں تعجب کیجیے۔ قومیں جب زندہ ہوتی ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے ابن جوزی، ابن عساکر، ابن حجر، السیوطی، الامام الرازی، الخطیب البغدادی، الذہبی وغیرہ علمائے اسلام نے علم کے جن ذخیروں کو مہذب اور مرتب کیا ہے، اُن کی تنقیح و تحقیق کی ہے، دنیا میں آج اُن کے کارناموں کا سرمایہ بحمداللہ موجود ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم جس چیز کو سوچ نہیں سکتے، وہی ان بزرگوں نے کرکے دکھایا ہے، ان میں کتنے ہیں جن کی پوری عمر کے حساب سے روزانہ تین چار جز، تصنیف کا اوسط پڑتا ہے۔

الخطیب نے ابن شاہینؒ محدث کے ذکر میں ان کی اُس روشنائی کا حساب جو حدیثوں کے لکھنے میں خرچ ہوئی ہے اگر اس کو جمع کیا جائے تو شاید منوں سے متجاوز ہوگی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ لوگ اس غریب ہندوستان کو گھر سمجھ کر شاید اس کی قدر نہیں پہچانتے ورنہ اسی ہندوستان کے تو آخر شیخ

ؒ (صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ ہو)

علی المتقی بھی تھے، جن کی ایک ہی کتاب کنزالعمال کی ضخامت کیا کم تھی، ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کتاب کے سوا لکھا ہے کہ "تو الیف وے از صغیر وکبیر و عربی و فارسی از صد متجاوز است[1]"

خود فیضی جس نے نسبتاً کم عمر پائی ہے ماثرالامراء میں لکھا ہے کہ "یک صد ویک کتاب تالیف شیخ است (مآثرالامراء ج ۱ ص ۵۸۵)

ہم ناخلف ہیں کہ اپنے بزرگوں کے متروکوں کی حفاظت نہ کرسکے ورنہ اسی ہندوستان میں خواجہ حسین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں ان کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ان کی ایک تفسیر "نور النبی" نامی ہے جس کی تیس جلدیں ہیں، شیخ فرماتے ہیں

او تفسیر دارد مسمّٰی نور النبی بہر جزوے از قرآن (یعنی ہر پارہ) مجلدے نوشتہ است در حل تراکیب و بیان معانی قرآن از انچہ در تفسیرہا می باشد تفصیل وتسہیل ہرچہ تمام تر بیان فرمود (ص ۱۸۲)

اور تیس جلدوں میں یہ تفسیر ان کی ایک ہی کتاب نہیں ہے۔ مفتاح العلوم سکاکی کی قسم ثالث پر بھی ان کی شرح ہے شیخ احمد غزالی جو امام غزالی کے بھائی ہیں ان کی مشہور سوانح پر بھی ان کا حاشیہ ہے۔ اس

---

[1] تاریخ بغداد میں ابن شاہین کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے "صنف ثلاثمائۃ مصنف وثلاثین مصنف (ابن شاہین نے تین سو تیس کتابیں تصنیف کی ہیں، اور کیسی کتابیں؟) احدہا التفسیر الکبیر الف جزء والمسند الف جزء وخمسمائۃ جزء والتاریخ مائۃ وخمسین جزء والزہد مائۃ جزء (یعنی ایک ہزار جزء میں ان کی تفسیر کبیر تھی، اور ایک ہزار پانسو جزء میں مسند، تاریخ ایک سو پچاس جزء، زہد کی کتاب سو جزء) الخطیب نے ان کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے۔ کتبت بار بعمائۃ رطل حبرا (میں نے چار سو رطل حبر (روشنائی) سے لکھا ہے) اسی کے بعد محمد بن عمر بن اسماعیل داؤدی کے واسطے سے یہ قول بھی منقول ہے داؤدی کہتے تھے۔ سمعت ابا حفص بن شاہین یقول حسبت یوما ما اشتریت بہ الحبر الی ہذا الوقت فکان سبعمائۃ درہم (یعنی میں نے لکھنے میں جتنا حبر (روشنائی) استعمال کی ہے اس کا ایک دن حساب کیا تو پانسو درہم ہوئے) آگے الداؤدی کا یہ اضافہ بھی ہے کہ "وکنا نشتری الحبر اربعۃ ارطال بدرہم (یعنی چار رطل روشنائی ہم ایک درہم میں خریدا کرتے تھے) رطل کو اگر آدھ سیر کے مساوی بھی مان لیا جائے تو اس حساب سے خود ہی غور کیجیے کہ ابن شاہین نے روشنائی کی کتنی مقدار خرچ کیا تھی، الخطیب نے دوسرے مقامات میں لکھا ہے کہ حبر اور مداد میں فرق تھا، مداد تو سیاہ روشنائی کو کہتے تھے اور حبر سرخ روشنائی کو۔ ایسی صورت میں گویا ابن شاہین کے متعلق اس حساب کا تعلق صرف سرخی سے رہ جاتا ہے۔ اللہ اعلم بالصواب۔ دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷

[2] یہ تو ان کی تصنیفات کی تعداد ہے، نقل کتب میں بھی شیخ کو کمال تھا۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی نے (بقیہ بر ص ۶۶)

سو ابھی چیزیں ہیں، یوں ہی دولت آبادی کی تفسیر بحر مواج ازیں قبیل متقدمین میں بھی متاخرین میں بھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ مولانا عبد الحیی فرنگی محلی کی تصنیفوں کی مقدار کیا کچھ کم ہے، خصوصاً مؤخر الذکر جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چالیس کے کچھ ہی بعد وفات پا گئے، ان کی عمر کو دیکھیے، اور تصنیف کے سوا تدریس و افتا کے کاروبار کو ملاحظہ فرمایئے۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ہم بے برکتوں کے وقت کا جو پیمانہ ہے اس پر ان بزرگوں کے اوقات کا قیاس کرنا کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ خود در زمانہ تست کے مصنفوں میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی کی تالیفات کی تعداد کماً اور کیفیۃً کیا ان ہی نوادر کی زندہ توثیق اپنے اندر نہیں رکھتیں؟[ل]

اللہ اللہ یہی ہندستان تھا جس میں ایسے مصنف بھی گذرے ہیں جو قوتِ بینائی سے محروم ہو چکے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری تھا اور کیسی تصنیف! گیارہویں صدی کے مشہور مصنف صاحب الحواشی المفیدہ سہارنپور کے رہنے والے مولانا عصمت اللہ کے متعلق

(بقیہ حاشیہ ص ۶۵) طبقات الصوفیہ الکبریٰ میں ان کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اطلعنی علی مصحف بخط کل سطر ربع حزب فی ورقۃ واحدۃ" (یعنی کل ایک ورق میں پورا قرآن انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا ایک سطر میں پاؤ پارہ ختم کر دیا گیا تھا)

ل بحمد اللہ ابھی اسلام کا یہ زندہ معجزہ ہم مسکینوں کے سر پر سایہ فگن ہے و متعنا اللہ بطول حیاتہ ۱۳۵۳ھ یعنی آج سے ۱۸ سال پہلے مجلس مبارک میں کتابوں کا ذکر آیا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی اپنے پیر کی دعا کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا تھا کہ اس وقت تک پانسو انتیس کتابیں حضرت تصنیف فرما چکے ہیں اور اس طرح شمار نہیں کیا کہ مثلاً بارہ جلدیں تفسیر کی ہیں وہ بارہ شمار کی گئی ہوں بلکہ ان کو ایک ہی کتاب قرار دے کر پانسو انتیس ہوتی ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ ان بارہ سالوں میں اور کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ ان سطروں کی کتابت کے بعد خدا کی یہ عظیم رحمت کی نعمت منتقل

خود شیخ محدث عبد الحق دہلوی کے متعلق تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے "میگویند کہ تصنیفاتش خورد و کلاں از صد متجاوز است۔" اسی کتاب میں یہ عجیب بات شیخ کے متعلق لکھی ہے کہ اشعار بہ شمار ابیات تقریباً پنج لک، می رسد (ص ۱۰۹ تذکرۂ علماء ہند) لیکن میرے نزدیک غالباً مصنف تذکرہ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ محدث کبھی کبھی شعر بھی موزوں فرما لیتے تھے۔ اخبار میں آپ کے اشعار کے نمونے موجود ہیں، ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ درج کرتے ہوئے آپ کے اشعار کا ذکر کیا ہے لیکن پانچ لاکھ اشعار کا انتساب شیخ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ غالباً بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہوا ہے کہ شیخ محدث کے قلم نے پانچ لاکھ ابیات لکھے، یہی بیت کا لفظ وجہ مغالطہ ہے۔ عموماً مراد اس سے شعر ہی لیا جاتا ہے، لیکن اس زمانہ میں ایک سطر کو بھی ایک بیت کہتے تھے۔ غالباً شیخ محدث نے جو کچھ لکھا ہے سطروں کے لحاظ سے اس کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچی ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اشعار کے لحاظ سے سب سے

Marfat.com

مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں۔

"از مشاہیر علماء ہند است اگرچہ مکفوف (نابینا) اند، اما بینایاں را راہ دانش و بینش می نمودند"

شرح جامی اور تصریح (ریاضی کی مشہور درسی کتاب) کے حواشی ملا عصمت اللہ مرحوم کی جس نے دیکھی ہو وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ سہارن پور کے بظاہر ان نابینا عالم کو خدا نے کیسی اندرونی بینائی عطا فرمائی تھی خصوصاً تصریح کی شرح جو چھپ بھی چکی ہے کم از کم اپنی طالب العلمی کے دنوں میں اس سے زیادہ سلجھی ہوئی کتاب مسائل تصریح کے حل کے سلسلہ میں مجھے نہیں ملی تھی۔

ملا مبارک ناگوری پدر ابوالفضل و فیضی کے حالات میں مولانا غلام علی نے لکھا ہے کہ

"در پایان عمر با آنکہ باصرہ از کار رفتہ بود بہ قوت حافظ تفسیرے بہ قید قلم آوردہ در چہار مجلد مسمی "منبع عیون المعانی"

مولانا نے ارقام فرمایا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف میں ملا مبارک نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ

"عبارت را مسلسل تقریر می کرد و دبیران (کاتباں) کسوت تحریر می پوشانیدند صہ ۱۹۰"۔

گویا ملا نے بہ طریق املاء یہ تفسیر لکھوائی تھی۔

بہرحال ملا مبارک اپنے اعمال و اطوار اخلاق و عادات، افکار و خیالات کے لحاظ سے کچھ ہی ہوں، لیکن معقولات و منقولات میں ان کا جو پایہ بیان کیا گیا ہے خصوصاً احمد آباد پہنچ کر الخطیب ابوالفضل الگازرونی سے استفادہ کا نادر موقعہ ان کو جو مل گیا تھا اور جیسا کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ملا کے متعلق لکھا ہے کہ الگازرونی سے

"اسالیب تصوف و اشراق برخواند و فراواں کتب نظر و تا آنکہ (الٰہیات) دیدہ شد خاصہ شیخ ابن عربی ابن فارض و صدر الدین قونوی"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عقلی علوم میں ملا مبارک کی حذاقت و مہارت غیر معمولی تھی۔ الگازرونی کوئی معمولی عالم نہ تھے، وہ علامہ جلال الدین دوانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ دوانی کا جو مقام عقلیات میں ہے اس سے اہل علم کے طبقہ میں کون ناواقف ہے، اور یہ حال

Marfat.com

تو ملا کا عقلی علوم میں تھا، حدیث ملا مبارک نے میر رفیع الدین الایجی الشیرازی سے آگرہ میں پڑھی تھی، اور میر رفیع الدین صاحب کے متعلق ابوالفضل ہی نے لکھا ہے۔

درجزیرۂ عرب انواع علوم نقلی از شیخ سخاوی مصری تاہری تلمیذ شیخ ابن حجر عسقلانی برگرفت (آئین اکبری ج ۳، ص ۲۰۵)

یعنی بدو واسطہ ملا مبارک ناگوری حافظ الدنیا علامہ ابن حجر العسقلانی کے شاگرد تھے، اس تعلق سے حدیث و سیر و رجال کا جو مذاق ملا میں پیدا ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔

اسی بنیاد پر باہمہ مالہ وما علیہ یہ توقع شاید غلط نہ ہو کہ ملا مبارک کی یہ املا کرائی ہوئی تفسیر اپنے اندر کچھ نہ کچھ خصوصیت ضرور رکھتی ہوگی، ضخامت بھی کم نہیں ہے۔ مولانا غلام علی نے ماثر الکرام میں تو "چار مجلد" میں اس تفسیر کو تبلایا ہے، اب خدا جانے کاتب کی غلطی ہو یا کیا ہے فیضی کی بے نقط تفسیر (جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئیگا) اس کے خاتمہ نگار واللہ اعلم کون صاحب ہیں یہ لکھا ہے کہ

"از تصانیف وے تفسیرے ست مثل تفسیر کبیر امام در چہار دہ مجلد کبار کہ فیضی در سواطع ذکرے کرد"

مگر سواطع میں مجھے اس چہار دہ مجلد کبار کا پتہ تو نہ چلا البتہ اتنا اشارہ اس کے دیباچہ میں ضرور ہے کہ میرے والد نے ایک تفسیر الامام کے طرز پر لکھی ہے جس سے ظاہر ہے امام رازی ہی مراد ہو سکتے ہیں اس خاتمہ نگار نے ملا مبارک کی اس تفسیر کا نام بھی ذرا بدل دیا ہے یعنی "منبع نفائس العیون" لیکن مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان تو کم از کم نام کی حد تک زیادہ قابل اعتماد ہونا چاہیے۔ البتہ جلدوں کی تعداد میں ممکن ہے کہ مولانا کی کتاب میں "دہ" کا لفظ چھوٹ گیا ہو۔

طبا طبائی بہار کے مشہور مورخ نے سیر المتاخرین میں بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے، مگر ایک عجیب

ف البداؤنی باوجودیکہ ملا کے بھی شاگرد ہیں لیکن اپنی تاریخ میں اکبری فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ایں ہمہ آتش از آگرہ (ملا مبارک کا تعلیمی مرکز) برخاست کہ خانماں اکابر و اصاغر ازاں سوخت ... بداؤنی نے سچ لکھا ہے

تو اے مرد سخن پیشہ کہ ہر چند نستے دوں ز دین حق بہ بندستی بہ نیروی سخن دانی
چہ سستی و بدی از سنت کہ رفتی سوئے بے دینا چہ تقصیر آمد از قرآں کہ گردی گرد الحانی

یہی خاندان تھا جو کل کو چھوڑ کر "الحان" کی لذتوں میں ڈوب گیا تھا۔ و شر الناس شرار العلماء سخن پیشوں نے ہمیشہ دنیا پر مصیبت نازل کی اور آج بھی "نیروی سخن دانی" ہی کے بل بوتے پر حدیث کا بھی انکار ہو رہا ہے۔ قرآن کا بھی مطلب بدلا جا رہا ہے

واقعہ کے ساتھ لکھا ہے کہ

"شیخ مبارک در زمانِ حیات خود تفسیرے برائے قرآن مجید درست تصنیف کردہ بود و شیخ (ابو الفضل) بعد رحلتِ پدر بے آنکہ موافق رسم دنیا عنوان کتاب بنام پادشاہ موشح گرداند نسخہ ہائے بسیار نویسانیدہ باکثر ولایاتِ اسلام فرستاد"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الفضل کو اپنے باپ کے اس کارنامہ پر اتنا ناز تھا کہ اظہار فضل کے لیے اسلامی ممالک میں اس کے نسخے بھیجے گئے، مگر صلہ نہ شد بلا شد" طبا طبائی کا بیان ہے کہ

"چوں این معنی (عدم ادخال نام پادشاہ) بعرض اکبر رسید از غرور بکہ داشت سخت برآشفت و شیخ ابو الفضل را مورد عتاب گردانید"

لکھا ہے کہ دربار میں آمد و رفت بند کر دی گئی، بڑی مشکل سے اُڑی ہوئی چڑیا پھر ہاتھ آئی، میرا خیال ہے اور طبا طبائی کی اسی عبارت سے ذہن منتقل ہوا کہ غالباً یہ تفسیر ممکن ہے اکبر ہی کے اشارہ سے لکھی گئی ہو اسی لیے ناراضی بھی زیادہ ہوئی وجہ اس کی یہ ہے کہ آئینِ اکبری میں ابو الفضل نے ایک مستقل باب اس کا باندھا ہے کہ اس میں اکبر کے اقوال جمع کیے جائیں می[1] فرمودند می فرمودند اس کا عنوان ہے ان ہی "می فرمودندوں" میں ایک می فرمودند اکبر کا یہ بھی ہے۔

نقرہ ۱۳۲ می فرمودند عجب است کہ در زمانِ پیغمبر ما[2] تغییر قرار نہ گرفت تا در گوشگی راہ نیافتے"

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں ملا عبد القادر کے حوالے سے اکبر کی جن فتنہ سامانیوں کا ذکر کیا ہے بعضوں کو اس پر اعتراض ہے کہ ملا کا بیان حجت نہیں ہے، حالانکہ میں نے ملا عبد القادر کا حلف نامہ بھی نقل کیا ہے لیکن پھر بھی لوگوں کو اعتبار نہ ہوا۔ ایسے حضرات کے لیے مناسب ہوگا کہ اس می فرمودند کا مطالعہ فرمائیں کہ اس میں وہ سب کچھ ہے جو عبد القادر نے لکھا ہے۔ دشمن کی شہادت اگر قابل اعتبار نہیں تو کیا دوست کی گواہیوں میں بھی شک کیا جائیگا۔

[2] آئین اکبری میں بھی پہلی اور غالباً آخری جگہ ہے جس میں "پیغمبر ما" کا لفظ اکبر کے منہ سے نکلا ہے، ورنہ وہ خود بھی اور ابو الفضل بھی اسلام کا ذکر ہمیشہ "کیش احمدی" سے کرتے ہیں گویا "دین محمدیم" اس زمانہ میں "احمدزم" بن چکا تھا تاہم اس نقرہ میں اس لفظ پر میری نظر جب پڑی تو خیال گذرا کہ "بہانہ جوئی" جس رحمت کا قانون ہے وہاں انتساب کون کہہ سکتا ہے کہ بے کار جائیگا اور سچ تو یہ ہے کہ اکبر بیچارہ تو دنیا سے چلا گیا اور اس کا دباتی بر صفحہ ۷۰)

"دگرگونگی" سے غالباً اکبر کی مُراد مفسرین کے مختلف اقوال کی طرف ہے اور یہی اختلاف کا ہتھکنڈا تھا جس سے علماءِ سوء اس کے دربار میں اپنے دوسرے معاصرین پر سبقت لیجانے کی کشمکش میں مصروف ہوئے جس کا قصہ "الف ثانی کی تجدید" کے ذیل میں بیان کر چکا ہوں۔ اور اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کسی اچھی تفسیر کا اکبر بھی آرزومند تھا، ممکن ہے کہ ملّا مبارک نے اسی آرزوئے شاہانہ کو پورا کیا ہو۔ عتاب کی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ بھی ہو کہ کتاب میں نے لکھوائی اور اس شخص نے مجھے الگ کر کے صرف اپنے باپ کی فضیلت کا علم بلند کر دیا۔

فیضی نے بھی جب اپنی تفسیر پوری کی، تو ملّا عبدالقادر کا بیان ہے کہ "چند جزو برائے انتشار در عراق فرستاد" (منتخب ص ۳۹۳)

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ فیضی کی اس تفسیر کا ایک خاص موقع پر ذرا تفصیل سے ذکر کرونگا، اور وہیں معلوم ہوگا کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اس وقت ابوالفضل نے اپنے والد کی تفسیر کے "نقول بسیار" جو اکثر اسلامی ممالک میں بھیجے اور فیضی نے اپنی تفسیروں کے بعض اجزا عراق روانہ کیے، اس سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ بعض وجوہ سے اس زمانہ میں کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ عہد پریس و مطابع سے بھی زیادہ آسان تھا، آج تو کسی کتاب کی اشاعت طباعت سے پہلے ناممکن ہے، لیکن اُس زمانہ میں کتابت کے معمولی مصارف سے نقول کا حصول چونکہ آسان تھا، یا مصنف خود بھی اپنی تصنیف کی چند نقلیں تیار کر سکتا تھا۔ اس لیے بآسانی ہر جگہ کتاب پہنچ جاتی تھی اور اس کے بعد نقل در نقل کا سلسلہ وراقوں کے ذریعہ سے شروع ہو جاتا تھا اور یوں تھوڑے دنوں میں کتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) معاملہ خدا کے ساتھ ہے بعضوں نے تو لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کی بھی توفیق ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مقالہ میں اکبر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے میرا اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو اس شخص کی ناسمجھی خامی عقل سے پیدا ہوا اور یہ واقعہ ہے کہ اکبری فتنہ کی تاریکی کا جسے علم نہ ہوگا، مجدد کی تجدید کی روشنی کا وہ کیا اندازہ کر سکتا ہے کہ "ولضدہا تتعرف الاشیاء"

Marfat.com

پورے اسلامی ممالک میں پھیل جاتی تھی۔

بہرحال گفتگو اس میں ہو رہی تھی کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں تعلیم کا جو نظام تھا اس میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ کیسے حل کیا گیا تھا؟ میں نے اسی کے متعلق بعض چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس عہد کے کتابی مذاق کا اندازہ اس زمانہ میں صحیح طور پر کیا بھی نہیں جا سکتا کتابوں کی اشاعت اور اس لیے کہ لکھنے لکھانے میں سہولت پیدا ہو گئی بعض علمار نے اپنی عبادت و ریاضت کا ایک جزء یہ بھی قرار دے رکھا تھا کہ طلبار میں کتابیں تقسیم کرتے تھے، قلم بانٹتے تھے اور حد یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے سیاہی بنا بنا کر اہل علم میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ فخر الہند حضرت شیخ علی متقی صاحب کنز العمال کے حال میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ علاوہ اس مشغلہ کے یعنی "در دادنِ کتب و اسباب کتب و اعانت دریں باب بجد بود" یعنی جہاں تک ممکن تھا لوگوں میں کتاب اور اسباب کتب تقسیم فرماتے تھے[۱]۔ انتہا یہ ہے کہ "بدست خود سیاہی درست می کردند و بطالب العلمان می دادند"

مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا احمد بن طاہر فتنی (پٹنی)، جو گجرات کے مشہور محدث عالم تھے اور غریب الحدیث میں مجمع البحار رجال میں مغنی ان کی متداول کتابیں ہیں ان کے حال میں مولانا نے لکھا ہے کہ سیاہی بنا کر اہل علم میں تقسیم کرنے کا ذوق ان پر اتنا غالب تھا کہ

"مداد برائے نسخہ نویساں علوم حل می کرد، بہ حدے کہ در وقت درس گفتن ہم بہ حل کردن مرکب مشغول می بود" روشانی

(مآثر الکرام ص ۱۹۵)

[۱] اور یہ مسلمانوں کا کسی زمانہ کا ایک عام دستور معلوم ہوتا ہے۔ خاکسار جب ٹونک میں پڑھتا تھا تو چند علمی گھرانے شہر میں ایسے تھے جن سے طلبہ اپنے پڑھنے کے لیے کتابیں مانگ کر لایا کرتے عموماً بے عذر دے دی جاتی تھیں۔ صاحب تذکرہ علمار ہند نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ جن دنوں مچھلی شہر میں وہ پڑھتے تھے وہاں مفتی علی کبیر صاحب کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔ کتابے کہ می طلبیدم ہموں ہیئت کہ داشت از الماری برآوردہ می داد، البتہ دیتے ہوئے مفتی صاحب ایک دلچسپ شعر ضرور پڑھتے تھے ؎ کتابم می بری لیکن بایں شرط ☆ کہ طبل و بوق و صندوقش نہ سازی۔ مطلب یہ تھا کہ طلبہ کتابوں کے استعمال میں بے احتیاطی کرتے ہیں کوئی صاحب تو طبلہ بنا کر بجاتے ہیں۔ کوئی ورقوں کا باجہ بناتے ہیں، کوئی ہر قسم کے کاغذ جلدوں کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں جس سے جلد ٹوٹ جاتی ہے بعض کتابوں سے تکیہ کا بھی کام لیتے ہیں مطلب یہ تھا کہ یہ حرکتیں نہ کرنی چاہئیں۔

Marfat.com

دست بکار، وزبان بگفتار آن واحد میں شیخ نے ان دونوں سعادتوں سے متمتع ہونے کا عجیب طریقہ نکالا تھا، اور اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں فراہمی کتب کے مسئلہ کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ زبان سے سبق بھی پڑھا رہے ہیں اور ہاتھ سے سیاہی بھی گھوٹی جا رہی ہے۔ بازار سے سولان اور واٹرمین کی دواتوں کی خریدنے والی نسلیں تو آج اس سے بھی ناواقف ہیں کہ سیاہی بھی گھر میں بنانے کی چیز ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے تک پرانے مکتبوں میں تھوڑا بہت رواج اس کا باقی تھا لیکن اب تو وہ بھی نابود ہو گیا۔ ملا عبدالنبی احمد نگری نے اپنی کتاب دستور العلماء میں سیاہی بنانے کے چند نسخے بھی درج کیے ہیں، لیکن اب ان کی نقل کرنے سے کیا فائدہ۔

ان محدثین کبار جن پر ہندوستان کو بجا طور پر ناز ہے، آج تو آپ شیخ علی متقی، اور ملا طاہر کا صرف نام سن رہے ہیں لیکن جس عہد میں یہ اکابر موجود تھے اس وقت ان کی عظمت وجلالت کا پھریرا جس بلندی پر اڑ رہا تھا، اس جلالت اور عظمت کے باوجود سیاہی گھونٹنے کا کام کرنا اور وہ بھی اپنی ذاتی ضرورتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ نسخہ نویسوں اور طلبہ علم میں تقسیم کرنے کے لیے ایسے معمولی ہلکے شغل میں مشغول ہونا بلا شبہ حیرت انگیز اور اس بلند معیار کو ظاہر کر رہا ہے جو علم اور دین کو اس زمانہ میں حاصل تھا۔

ملا احمد بن طاہر وہی بزرگ ہیں، جن کے متعلق مولانا آزاد اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ گجرات کے مہدوی فتنہ کے مقابلہ کا عزم کرتے ہوئے شیخ نے اپنی دستار سر سے اتار دی تھی اور فیصلہ کیا تھا کہ جب تک اس فتنہ کا استیصال کلی نہ ہو لیگا سر فضیلت کے اس عمامہ کو نہیں باندھوں گا شیخ اسی حال میں تھے کہ گجرات پر اکبر حملہ کرتا ہے، اور مملکہ محروسہ کا گجرات جزو بن جاتا ہے۔ اکبر کو شیخ اور شیخ کے اس مقدس عزم کی خبر ملتی ہے، اس وقت اکبر ملا عبدالقادر کا مقتدی اکبر تھا، فیضی اور ابوالفضل کا بظاہر پیر اور بہ باطن مرید نہیں ہوا تھا، سنتے ہیں اکبر نے کیا کیا۔ وہ شیخ احمد کے استانہ پر حاضر ہوتا ہے اور "پادشاہ دستار بدست خود بوسر شیخ احمد بن طاہر پیچیدہ اکبر اپنے ہاتھ سے ملا احمد کی اس ان سوئی یا اتاری ہوئی پگڑی کو باندھتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے۔" باعث ترک دستار بہ سمع، سید نصرت دین مبین بر رفت،

ارادہ شما بر ذمہ معدلت من لازم است" س ۱۹۵- یعنی پگڑی اُتارنے کا جو سبب ہے میرے کان تک بھی اس کی خبر پہنچی ہے، دین متین کی امداد و نصرت آپ کے ارادہ کے مطابق میرے جذبۂ عدل پر واجب ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ابو الفضل و فیضی کے ذکر میں میرا قلم قابو سے باہر ہو جاتا ہے مگر "دینِ متین کی نصرت کی اس عزیز قوت" کو جن قوتوں نے برباد کیا، برباد ہی نہیں کیا، بلکہ بجائے نصرت کے اسی قوت کو اسی دین کی تحقیر و اہانت بغض و عداوت میں لگا دیا، انصاف شرط ہے، کیا ان کے ذکر پر اسلامی و ایمانی جذبات اپنے تلاطم کو روک سکتے ہیں، اور یہ تھا ملا احمد کا مقام رفیع دنیا میں لیکن باوجود اس کے وہی جس کے سر پر اکبر بادشاہ پگڑی باندھتا تھا اُس کا ہاتھ "مدا د برائے نسخہ نویسانِ علوم حل می کرد" کے مشغلہ میں بھی مصروف تھا، رضی اللہ عنہ، یہی کیفیت شیخ علی المتقی کی تھی جو ملا احمد بن طاہر کے اُستاد تھے، محدث دہلوی شیخ عبد الحق نے اخبار میں لکھا ہے کہ گجراتی سلطان بہادر خاں مدت العمر اس آرزو میں رہا کہ شیخ متقی اس ملک کے شاہی محل سرا کو اپنے قدم میمنت لزوم سے سعادت اندوزی کا موقعہ دیں، لیکن آرزو پوری نہیں ہوتی تھی، وقت کے قاضی عبد اللہ المسندی کو بادشاہ نے تیار کیا کہ کسی طرح سمجھا بجھا کر ایک ہی دفعہ سہی شیخ کو شاہی کوشک میں لے آئیں، المسندی بڑی جد وجہد کے بعد کامیاب ہوئے مگر شیخ نے شرط کر دی تھی کہ بادشاہ کے ظاہر یا باطن میں اگر کوئی اجنبی غیر اسلامی عنصر نظر آئیگا تو میں خاموش نہیں رہ سکتا، بر سر دربار ٹوک دونگا۔ شرط منظور کر لی گئی۔ شیخ سے بادشاہ نے کہلا بھیجا "ملا زماں ہر چہ دانند بگویند و بکنند" شیخ تشریف لائے اور جو جی میں آیا، گجرات کے اس بادشاہ کے مُنہ پر فرماتے چلے گئے، محدث دہلوی نے لکھا ہے "نصیحتے کہ بالُست کرد" اور اُٹھ کر چلے آئے، اس کے بعد کیا ہوا، اس زمانہ کے مولوی کے سینے میں حوصلہ ہے جو یہ سُن سکتا ہے فرماتے ہیں لاکھ دو لاکھ نہیں "یک کرور تنکہ گجراتی فتوح فرستاد"

واللہ اعلم گجراتی تنکہ کی قیمت کیا تھی، تاہم وہ تنکہ ہی تھا، روپیہ سے کیا کم ہوگا۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ نہیں بلکہ میرے نزدیک تو ہم جیسوں کے لیے یہ دل ہلا دینے والا شرم

Marfat.com

سے گردنوں کو جھکا دینے والا واقعہ ہے کہ "آں مبلغ یک کرور تنکہ گجراتی را، بہ تمام بقاضی عبداللہ السندی مذکور دادند" دنیا کے بادشاہ نے جو کچھ بھی بھیجا تھا، دین کے بادشاہ نے اس کو پھر اسی کے ملازم کے حوالہ کر دیا، فرمایا کہ "ایں فتوح بہ توسل او آمدہ است پس مستحق او ہموں است" شیخ علی المتقی کی اس رفعت شان کو ملاحظہ فرمایئے اور اس کے ساتھ شیخ محدث کے الفاظ "بدست خود سیاہی راست می کردند" کے عمل پر غور کیجیے، سوچیے کہ علم کے خدمتگاروں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفاداروں نے چلنے والوں کے لیے کیسے عجیب وغریب نمونے چھوڑے ہیں۔ رزقنا اللہ اتباعھم

شیخ علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں تو اسی اشاعت ونشر کتب کے متعلق اس سے بھی زیادہ نادرہ کاریاں نظر آتی ہیں۔ اخبار الاخیار ہی میں ہے اور اس لیے یہ شہادت زیادہ قابل توجہ ہے کہ شیخ محدث نے اس واقعہ کو علی المتقی کے براہ راست تلمیذ وخلیفہ شیخ عبدالوہاب سے بگوش خود مکہ معظمہ میں سنا ہے۔ شیخ علی متقی کا عموماً دستور تھا کہ وہ ہند سے حجاز، حجاز سے ہند آتے جاتے رہتے تھے۔ گو آخر میں ان کا مستقل قیام مکہ معظمہ ہی میں ہو گیا تھا، عرب میں بیٹھ کر منجملہ دیگر تعلیمی وتدریسی، تصنیفی وتالیفی، ارشادی وتذکیری خدمات کے علم کی خدمت کی ایک صورت یہ بھی نکالی تھی کہ "کتابہا از دیار عرب مفید ونکیاب بہم می رسید نسخ متعددہ از واستکتاب فرمودہ بہر کس می دادند" یعنی نادر اور نکیاب مفید مخطوطات کو صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ یوں بھی ان کے متعدد نسخے نقل کرواتے اور جو بھی ضرورتمند ہوتا، اسے یہ چیز تحفۃً عطا فرماتے اور اس سے بھی عجیب تر ان کا یہ طرز عمل ہے کہ "دبہ بلاد دیگر کہ آں کتاب در انجا وجود نہ داشت می فرستادند"

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا ایک عالم ام القریٰ قبۃ الاسلام میں مستقل قیام کر کے اس کام کو انجام دیتا ہو کہ جن جن ملکوں میں جن مصنفین کی کتابیں نہیں پہنچی ہیں انہیں نقل کرواتا ہو، اور بغیر کسی معاوضہ کے وہاں ان کتابوں کو بھیجتا ہو کیا ایسی صورت میں شیخ اپنے وطن ہی کو بھول جاتے ہونگے، میرے نزدیک تو ہندوستان میں نوادر کی فراہمی کا بڑا ذریعہ حضرت شیخ کا

یہ طرز عمل بھی ہوگا، خدا نے عمر بھی کافی دی تھی۔ لکھتے ہیں کہ "نود سال زیست" ہر سال اسلامی ممالک سے حجاج کے قافلے عرب پہنچتے تھے اُن کی عظمت کا آفتاب اس وقت سمت الراس پر چمک رہا تھا، کنز العمال (احادیث نبویہ کا جو دائرۃ المعارف ہے) اس کی تالیف نے سارے دنیائے اسلام میں ان کا غلغلہ بلند کر دیا تھا، ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک سے "للسیوطی منۃ علی العالمین وللمتقی منۃ علیہ" (یعنی سیوطی کا احسان تو دنیا پر ہے اور سیوطی پر شیخ متقی کا احسان ہے) کی تاریخی سندان کو مل چکی تھی، اس لیے فتوحات بھی کافی ہوتے تھے، لیکن ان فتوحات کا ایک بڑا مصرف کتابوں کی نشر و اشاعت کا یہی ذوق تھا۔

نوادر کتب کی اشاعت اور ان کے افادہ کے دائرہ کو عام کرنے کا یہ نادر متقیانہ طریقہ اب بھی اگر سچ پوچھیے تو اس قابل ہے کہ ارباب توفیق اس پر عمل کر کے علم اور دین کی بڑی اہم اور قیمتی خدمت انجام دے سکتے ہیں، جنہیں خدا نے ثروت دی ہے وہ دوسروں سے نادر مخطوطات نقل کرا کے ان مقامات تک پہنچا سکتے ہیں جہاں وہ کتابیں نہ پہنچی ہوں، اور غیر مستطیع اہل علم جہاں بیسیوں مجاہدات و ریاضات میں اپنا وقت صرف فرماتے ہیں، اگر اپنے عزیز اوقات کا ایک حصہ اس کام کے لیے بھی مختص کر دیں تو وہ اپنے پیچھے ایک بہترین فاتحہ خواں کو دنیا میں چھوڑ کر راہی عالم آخرت ہو سکتے ہیں۔ علی الخصوص ہر سال سرزمین حجاز میں حاجیوں کا جو قافلہ جاتا ہے، اگر ان ہی حجاج میں اس کا بھی ذوق پیدا کیا جائے کہ جہاں لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ عرب سے خاکِ شفا، یورپ کی بنی ہوئی جانمازیں، تسبیحیں، کپڑے وغیرہ لاتے ہیں اگر اپنے ساتھ کسی نادر مخطوطہ

لہ یہ فقرہ علامہ ابوالحسن البکری کا ہے، جو عام طور سے اہل علم میں مشہور ہے یعنی تمام حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا خیال جلال الدین السیوطی کو پیدا ہوا، اور جمع الجوامع کے نام سے اُنہوں نے ایک کتاب تالیف بھی کی لیکن ترتیب کے اعتبار سے استفادہ اس کتاب سے آسان نہ تھا۔ شیخ متقی نے نئے سرے سے اس کام کو ایسی عمدہ ترتیب سے انجام دیا کہ سیوطی کی کتاب کی جگہ ان ہی کی کتاب نے لے لی۔ حیدرآباد کی ریاست کو فخر ہے کہ اسی کے مطبع دائرۃ المعارف نے سب سے پہلے اس کتاب کو شائع کیا۔ بعد کو مسند احمد کے حاشیہ پر اس کا خلاصہ مصر سے بھی شائع ہوا۔ علی متقی نے اس ضخیم کتاب کے سوا جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد سو کے قریب پہنچی ہے۔

Marfat.com

ی نقل بھی حجاز سے اپنے علاقہ کے علمار یا مدارس کے لیے لایا کریں، تو اس سے ایک طرف علم اور دین کے مہمات کی اشاعت میں یومًا فیومًا ترقی ہوگی، وہ تو بجائے خود ہے، دوسری طرف میرے نزدیک ساکنانِ حرم والذین عند رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان کی معاشی دشواریوں کے حل کی تدبیروں میں ایک مفید کارگر تدبیر کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں مرکزی مقامات ہیں باوجود ان تمام بربادیوں کے اب بھی ان مقامات کے سرکاری و غیر سرکاری کتب خانوں یا خانگی مکانوں میں ایسی عجیب چیزیں محفوظ ہیں جن کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔

ایک بڑا گروہ قاطنین حرمین ومہاجرین کا اب بھی ایسا ہے جو نقل کتب کے شریفانہ پیشہ کو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر انجام اپنے کو دستِ سوال کے دراز کرنے سے شاید بہتر خیال کریگا۔ بلکہ مخطوطات نادرہ کی نقل کا کام تو ایسا کام ہے کہ ہندستان کے اہل علم بھی اس سے نفع اٹھا سکتے ہیں، الحمد للہ اب بھی ہندوستان میں ایسے چند ادارے ہیں جہاں ان کتابوں کی اچھی قیمت مل جاتی ہے، صرف حکومت آصفیہ حرسہا اللہ تعالیٰ کا شاہی کتب خانہ آصفیہ سالانہ بیس ہزار روپیہ کی رقم ان مخطوطات کی خریداری پر صرف کرتا ہے، اور دوسرے امرار مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی بھی کافی رقم دے کر نادر کتابیں خریدا کرتے ہیں، ہندوستان میں فرض کیجیے کہ آپ کی کتاب نہ بھی فروخت ہو، تو امریکہ یورپ میں اسلامی مخطوطات کے خریدنے والے لوگ موجود ہیں اور اچھی قیمتیں دے کر کتابیں خریدتے ہیں۔

ایک ذیلی بحث عربی مدارس کے طلبہ کی معاشی دشواریوں کو دیکھ دیکھ کر عمومًا لوگوں کا خیال ادھر مائل ہو رہا ہے کہ کوئی ایسی چیز ان مدارس کے نصاب میں شریک کی جائے جس سے اس دشواری کے حل میں طلبہ کو آئندہ زندگی میں کچھ مدد مل سکے، بلکہ اب تو یہ سوال عربی مدارس سے زیادہ انگریزی کلیات وجوامع میں اہم بنا ہوا ہے، اس سلسلہ میں خاکسار ایک خاص خیال رکھتا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے صناعات اور دستکاریاں جن میں یورپ سے مقابلہ ہے مثلاً پارچہ بافی صابن سازی وغیرہ، اولًا ان چیزوں کے لیے ہزارہا ہزار روپوں کی مشتری کی ضرورت

ہو سیکھنے والے سیکھنے کے بعد بھی عموماً کسی کارخانے کی وہی ملازمت جس سے بھاگنا چاہتے تھے اسی کی تلاش میں طلبہ سرگرداں نظر آئیں گے، بلکہ نظر آرہے ہیں اور مشینوں کے بجائے اگر ان ہی چیزوں کو جنہیں غیر ممالک میں مشین سے بنایا جاتا ہو ہم ہاتھ سے بنائیں مثلاً سوت چرخے سے کاتیں کاٹج انڈسٹری کے اصول پر طلبہ کو پارچہ بافی سکھائیں تو یہ واقعہ ہو کہ مشین کے ذریعہ سے بنی ہوئی چیزوں کا مقابلہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں نہ لاگت میں کر سکتی ہیں، نہ وقت میں نہ قیمت میں۔ اور بازار میں یہ خیال کہ وطن اور قوم یا مذہب کے نام کے وعظ سے سودا بیچ لیا جائیگا میرے نزدیک تجربہ کے لحاظ سے تو غیر بازاری اور فکر کے لحاظ سے بازاری خیال ہو۔ بازار میں چیزوں کی عمدگی، نفاست، قیمت کی کمی وغیرہ ہی چیزیں وعظ کا کام کرتی ہیں۔

اسی لیے میرا خیال ہو کہ انگریزی مدارس وکلیات والے خواہ کچھ ہی کریں، وہاں تو سوچنے والے دماغ اور ہوتے ہیں اور کام کرنے والے اور غیر مکلفوں کے اس طبقہ کو سمجھانا سخت مشکل ہو لیکن عربی مدارس کے ارباب حل وعقد چاہیں تو غیر مقابلاتی صناعات جن میں یورپ جاپان وغیرہ والے مشینی ممالک مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ عموماً یہ صنعتیں مقامی ہی ہوتی ہیں، عربی مدارس میں انہیں اگر مروج کیا جائے تو اُمید ہوتی ہو کہ علاوہ معاشی منافع کے خود دین کا سر جو آج "چہ خورد بامداد فرزندم" کے بوجھ کے نیچے دب کر مجبور ہو کہ ہر جاہل کندہ ناتراش کے آگے جھکا رہے، شیروں کی ان روبہ مزاجیوں میں اس سے بہت کچھ تخفیف کی اُمید ہو سکتی ہو۔ اور ایسی دستکاریاں یا پیشے ایک نہیں متعدد ہیں۔ یہی استکتاب (نقل کتب) کا فن ہو اگر طلبہ میں خطاطی کا شوق پیدا کیا جائے صرف نقل کتب ہی نہیں، کاپی نویسی، مختصر نویسی، کمپوز کرنے کے کام، نامہ نگاری، وقائع نگاری اخبار نویسی یہ سب ایسے کام ہیں جو علم سے مناسبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ جاہلوں کے ہاتھ سے نکل کر اگر اس قسم کے پیشے اہل علم کے ہاتھ میں آجائینگے تو کام زیادہ بہتر صورت میں انجام پا سکتا ہو۔ ان پڑھ جاہل کاتبوں سے جن مصنفین کو پالا پڑا ہو، یہ واقعہ ہو کہ ان کو تو ہی مرزا صائب کا شعر

Marfat.com

ہر گز از چنگیز خاں بر عالم صورت نرفت　　آنچہ از دستِ کاتباں بر عالم معنی گذشت

پڑھ پڑھ کر بسا اوقات سرپیٹ لینا پڑتا ہے۔ اور علم سے اگر کسی پیشہ کو مناسبت نہ بھی ہو مثلاً زرگری، نجاری، آہنگری، خیاطی، معماری، طباخی، مرغبانی، مویشیوں کی پرورش، باغبانی، کاشتکاری زمینداروں کے دیہاتوں کا نظم، حساب وکتاب وغیرہ وغیرہ بیسوں ایسے کام ہیں جنہیں علم سے براہِ راست ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ سارے کاروبار چونکہ مقامی ہیں یورپ سے نہ زرگر آئینگے، نہ معمار نہ طباخ نہ حلوائی، اس لیے مشرقی ممالک سے مقابلہ کا ان پیشوں میں خوف بھی نہیں ہے۔ بلکہ علم دین کے پڑھنے والے طلبہ سے اُمید کی جاتی ہے کہ عموماً ان میں خدا کا خوف ذمہ داریوں کا احساس زیادہ ہوگا، آج جاہل بے دین پیشہ وروں سے دنیا چیخ اٹھی ہے۔ ایک تولہ خالص دودھ بھی آپ شہروں میں تلاش کیجیے، تو مشکل ہی سے مل سکتا ہے، یہی حال تمام پیشوں کا ہے نسلِ آدم ایمان دار دستکاروں اور ملازموں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بڑے بڑے زمیندار ہیں جنہیں اپنے ہر ہر گاؤں کے لیے منیجروں، تحصیلداروں کی خدمات کی ضرورت ہے، لیکن دیانت دار مولوی ان فنوں سے ناواقف اور جو ان چیزوں کو جانتے ہیں وہ دین و دیانت سے عاری، بحمداللہ پیشوں کے متعلق ذلت کے احساس کا مسئلہ مسلمانوں کی تاریخ ختم کر چکی ہے جس سے ہر کہ و مہ واقف ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

ہر چہ گیرد علتے علت شود　　کفر گیرد کاملے ملت شود

لہ کچھ زیادہ دن کی بات نہیں حضرت مولانا انوار اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ جو بعد کو اُستاذ السلاطین اور صدر المہام امور مذہبی کے عہدہ تک حکومت آصفیہ میں پہنچے ان کی سوانح عمری مطلع الانوار میں لکھا ہے کہ ابتداء میں مولانا محکمہ مالگذاری میں مختصر نویسی کی ملازمت پر بحال ہوئے لیکن اس ملازمت کو صرف اس بات پر چھوڑ دیا کہ "ایک سودی لین دین کی مسل کا خلاصہ لکھنا پڑتا تھا" مدا۔ پھر برسوں سخت معاشی پریشانیوں میں گرفتار رہے لیکن اس ملازمت کی طرف رجوع نہ ہوئے۔ سر سالار جنگ اور نواب خورشید جاہ نے چپ چاپ مولانا سے استفسار کیے بغیر اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کی تعلیم کے لیے آپ کا تقرر کر دیا۔ آپ کو جب خبر ہوئی تو مولانا جو اس زمانہ میں حسبۃً للہ مدرسہ نظامیہ کا کام کرتے تھے، یہ فرمایا کہ قومی خدمت کو چھوڑ کر میں اس ملازمت کو قبول نہیں کر سکتا۔ آخر بڑے رد و کد اور استخارہ کے بعد ان کو بہر حال وہ خدمت انجام دینی پڑی جس کے نتائج بحمداللہ آج تک لوگوں کے سامنے ہیں۔

Marfat.com

پیشے دراصل ذلیل نہیں ہیں، بلکہ ذلیلوں اور جاہلوں کے ہاتھ میں بیچارہ پیشہ جاکر ذلیل ہوگیا ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جس پیشے کو ہاتھ میں لیگا، اسی وقت اس میں عزت پیدا ہوجائیگی۔ آپ باہر کیوں جائیں اسی ہندوستان میں ایک عالم مولانا عثمان خیرآبادی۔ تھے فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالہ سے مولانا عثمان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کا پیشہ طباخی کا تھا، اور طباخی بھی کس چیز کی، سلطان المشائخ فرماتے ہیں

"سبزی (ترکاری) پختے از شلغم و چقندر و مانند آں و دیگ پختہ داں رامی فروختے" ص ۳۲

یہ نہ خیال کیجیے کہ یہ نام کے مولانا تھے، سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ "بس بزرگ کسے بود او را تفسیرے ہست" قرآن کا مفسر ہے اور شلغم چقندر پالک سب کو ملا کر ترکاری پکاتا ہے اور بیچتا ہے ظاہر ہے کہ پکنے کے بعد ان کی دیگ کو خالی ہونے میں کیا دیر لگتی ہوگی، اور یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان میں اسلام نے پہلی دفعہ قدم رکھا تھا، کیونکہ شیخ عثمان خیرآبادی کا زمانہ سلطان المشائخ سے بھی پہلے ہی، میرا تو چشم دید واقعہ کانپور کا ہے مشہور صاحب درس عالم محشی مثنوی مولانا روم مولانا احمد حسن کانپوری مرحوم کے منجھلے صاحبزادے جو خود عالم بھی تھے کانپور میں صرف غالباً امرتیاں یا اور بھی دو ایک قسم کی مٹھائی خاص طریقہ سے بناتے تھے، بناتے کیا تھے اپنی نگرانی میں بنواتے تھے، لیکن چونکہ ہر چیز مٹھائی میں دیانت داری سے دی جاتی تھی گھی بھی خالص ہوتا تھا، دوسرے اجزا بھی خالص، دھوکہ فریب جو عام جاہل حلوائیوں کا شیوہ ہے نہ تھا، آج کانپور میں سیکڑوں آدمی اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ بننے کے گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مٹھائی کا ملنا ناممکن تھا، خریدار گدھ کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے، بسا اوقات پیشگی دے کر اپنا حصہ آدمی کو محفوظ کرانا ہوتا تھا، حالانکہ اسی کانپور میں سیکڑوں حلوائی صبح سے شام تک بیٹھے دکانوں پر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہ طباخی کے پیشے سے حضرت مولانا عثمان خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی عزت پر حرف آیا یہی کیا کم ہے کہ سلطان المشائخ جیسی ہستی ایسے شاندار الفاظ میں ان کی توصیف کرتی ہے، آج چھ سو سال کے بعد ان کے ذکر پر اپنی کتاب میں میں مجبور ہوا ہوں، اور نہ مولانا احمد حسن مرحوم کے

Marfat.com

صاحبزادے کو کان پور نے کبھی تحقیر کی نگاہ سے دیکھا، مولانا کی مٹھائی سارے کانپور میں زبان زد عام تھی۔

آج عوام کے چندوں پر مولویوں کی گزر بسر کا جو دارومدار رہ گیا ہے اور اس کی وجہ سے ملک کے تاجروں، رئیسوں، خوش باشوں کے سینوں کے وہ بوجھ بنے ہوئے ہیں، اس دباؤ کے تحت بسا اوقات حق پوشی کے جرم کا مجرم بھی بننا پڑتا ہے، کیا ان دنیوی و دینی بے آبروئیوں سے بھی زیادہ کسی پیشہ کے اختیار کرنے میں بے آبروئی کا احتمال ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر مدرسہ میں اس قسم کی ہر دستکاری کو داخل کیا جائے بلکہ موقعہ مناسب خیال کر کے ایک ایک دو دو پیشوں کو داخل کر دینا کافی ہو سکتا ہے خصوصاً جس علاقہ میں مسلمان پیشہ وروں کی کمی محسوس ہوتی ہو، کہیں مسلمان خیاط نہیں ملتے، کہیں مسلمان مزین نہیں ملتے کہیں زرگری کا پورا کام غیر اقوام کے ہاتھ میں ہے، ان علاقوں کے عربی مدارس کو دیکھ بھال کر اپنے یہاں اسی قسم کی دستکاری یا ہنر کی تعلیم کا نظم طلبہ کے لیے کر سکتے ہیں۔

ایک ذیلی بات تھی، لیکن مدت سے دماغ میں موجزن تھی گوشہ نشینی موقعہ نہیں دیتی کہ لوگوں سے دل کی کہوں، مناسب مقام دیکھ کر خیالات کا اظہار کر دیا گیا "فذکر فان الذکر تنفع المومنین" شائد کسی کو میری کوئی بات پسند آ جائے

میں گفتگو تو شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عجیب و غریب طرز عمل پر کر رہا تھا کہ جہاں کتابیں نہیں ہوتی تھیں وہاں نقل کرا کے بھیجا کرتے تھے مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، باوجودیکہ مطابع نے بہتر سے بہتر کتابوں کو اہل علم تک پہنچا دیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جو کچھ چھپ چکا ہے اس سرمایہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی زیور طبع سے عاری ہے، علوم نادرہ ہی نہیں اسلام کے علوم عامہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف، رجال، تاریخ وغیرہ وغیرہ تک علوم کی بیسیوں ضروری کتابیں غیر مطبوع ہیں، جن کی کام کرنے والوں کو اب بھی ضرورت ہے۔ ضرورت کے اس تریاق کو مطابع کے عراق سے وابستہ کیے رہنا، مارگزیدوں کی تو نہیں لیکن علم گزیدہ

کی موت ہی، کاش استکتاب کے اس طریقہ کو جاری کر دیا جاتا تو بڑا کام نکلتا، پچھلے دنوں ہندوستان کے ایک جواں ہمت عالم مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اس سلسلہ میں بڑی دلیری اور جوانمردی کا کام کیا، صحاح کے سوا آٹھ نئی کتابوں کی حدیثوں کا ایک مجموعہ جمع الفوائد کا نشان ان کو حجاز سے واپسی کے وقت دمشق میں ملا، معلوم ہوا کہ شام کے گاؤں کفرسوسہ کے ایک عالم محمود بن رشید العطار کے پاس اس کا ایک نسخہ ہی۔ مولانا اس گاؤں تک گئے، علامہ محمود نے ان کے اس شوق کو دیکھ کر کتاب حوالہ کر دی۔ مولانا غالباً دمشق یا بیروت ہی سے اپنے ساتھ ٹائپ بھی خرید کر لائے اور صرف اس کتاب کی طباعت کے لیے ٹائپ کا یہ مطبع قائم کیا۔ ان کو دوسرا نسخہ سندھ میں پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں بھی مل گیا، دونوں کا مقابلہ کر کے آخر کتاب کو چھاپ کر علماء تک پہنچا ہی دی۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

مسلمانوں کو کتابوں کے لکھوانے تقسیم کرنے کا ذوق دراصل ایک مستقل داستان ہے، مشہور واعظ ملا معین ہروی جو اپنی کتاب معارج النبوۃ کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں، بلکہ ان ہی کے دیوان کو مطبع نول کشور نے حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہ کے نام سے شائع کر دیا ہی، ان کے پوتے جن کا نام بھی شیخ معین تھا، اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور لاہور کے قاضی مقرر ہوئے

لہ ان کے قضا کے قصے بھی بڑے دلچسپ ہیں، بداؤنی کا بیان ہی کہ جب تک قاضی رہی لوگوں کا بیان ہی کہ ہمیشہ مدعی و مدعی علیہ میں مصالحت ہی کرانے کی کوشش کی، اور کبھی خود کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا، لکھا ہی کہ "اگر مدعی بلحاج بر نیعل قضامی نمود او بالحاح و عجز و زاری می گفت کہ از برائے خدا شا بایک دگر صلح نمائند تا من دایں میاں ماخوذ نہ شوم و شرمندہ نہ باشم و نیزمی گفت کہ شما ہر دو دانائید و من تنہا نادان را با دو دانایاں کار افتادہ پس مرا شرمندہ درگاہ خدائے تعالیٰ مسازید" یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر زنے از غیبت شوہر طلب تفریق می کرد" (یعنی مفقود الخبر کی بیوی مالکی مذہب کے رو سے چار سال بعد اپنا نکاح دوسرے مرد سے کر سکتی ہے) اسی قانون کا نفاذ چاہتی تھی، چونکہ مسئلہ اختلافی تھا اس لیے قاضی معین بیچارے کفاف ازراہ خود می داد و گفت ایں قدر وجہ معیشت بہ گیر و انتظار شوہر ببر و از وے جدا مشو۔ اس سلسلہ میں عہد عثمانی کے ایک حاکم تقی یار جنگ کا خیال آتا ہی۔ سنتے ہیں کہ جب کسی کی سزا کا فیصلہ کرتے تو قلم سے فیصلہ لکھتے جاتے اور روتے جاتے۔ کہتے کہ دیکھیے فیصلہ کرنے والا ہمارے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہی۔ ان کی عادت بھی یہی تھی کہ حتی الوسع فریقین کو مصالحت پر آمادہ کرتے۔

Marfat.com

ملا عبد القادر بداؤنی نے ان کے متعلق منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ "مدد معاش خود را کہ کلی بود صرف کتابت می کرد تا کتب نفیس قیمتی می نویسانید و آں را مقابلہ می فرمود و مجلد ساختہ بہ طالب العلماں می بخشید و مدت العمر کار و بار پیشہ او ایں بود ہزاراں مجلد ازیں قبیل بمردم بخشیدہ باشد ص ۹۶ ج ۳ بداؤنی۔

بہر حال اس زمانہ کے مسلمانوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن ہمارے بزرگوں نے علم اور وہ بھی علم دین کی کتابت[1] کو دین ہی کا ایک جز قرار دیا تھا۔ عموماً چاہا جاتا تھا کہ دین کے اس کام میں اپنا حصہ بھی حسب استطاعت حاصل کیا جائے، علماء کی دوات کی روشنائی شہیدوں کے خون کے برابر ہوگی، یہ حدیث صحیح نہ بھی ہو، لیکن الم کے تین حرف کے تلفظ میں حدیث صحیح کے رو سے جب بحساب فی حرف دس نیکی، تیس نیکیاں ملتی ہیں تو ان ہی حروف کی مکتوبہ شکلوں کی تشکیل جو نطقی حالت سے یقیناً زیادہ پائدار ہے اور اس کے افادہ کا دائرہ زیادہ وسیع ہے، کہ اشخاص سے منتقل ہو کر نسلوں تک اس کے دور رس نتائج اپنے منافع کو پہنچاتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ اس پر بھی "مجازاۃ حسنی" کا یہ قانون کیوں منطبق نہ ہوگا، میں تو سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا اس کے متعلق ہمیشہ یہی خیال رہا[2]، یہی وجہ ہے

---

[1] اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات کا خیال آیا، خاکسار جب دار العلوم دیوبند کے ادنیٰ خدام میں تھا تو کسی جلسہ کے سلسلہ میں حصار جانا ہوا۔ حصار میں مدت ہوئی تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے چند پارے عجیب و غریب کاغذ پر چھپے تھے یعنی ظاہری شکل کاغذ کی بہت ہی ادنیٰ درجہ کی تھی تاہم علم پر چھاپنے والے نے احسان عظیم کیا تھا، کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ حصار جب پہنچا تو خیال گزرا کہ ناشر کتاب سے ملوں معلوم ہوا کہ انتقال ہوگیا۔ میں نے لوگوں سے کاغذ کی اس ربودگی کی وجہ پوچھی تو عجب بات معلوم ہوئی کہ ناشر صاحب کوئی صاحب دل آدمی تھے جب اس کتاب کی اشاعت کا عزم ہوا تو عام مطابع میں ظاہر ہے کہ پاک کاغذ پاک سیاہی، پاک پانی، پاک پتھر، باوضو کاتب و پریسمینوں کا نظم کون کر سکتا ہے، چونکہ کلام اللہ کی تفسیر کا معاملہ تھا، ان صاحب دل بزرگ نے باضابطہ حصار میں جس طرح بن پڑا کاغذ بنوایا اور طہارت کے تمام ضوابط کے ساتھ بنوایا، ان ہی ضوابط کے تحت اس تفسیر کو طبع کرا رہے تھے، پھر کیا عذر پیش آیا یا اجل مسمی آگیا چند پاروں پر کتاب ختم ہوگئی۔ حکومت آصفیہ نے مولوی محیی الاسلام پانی پتی کو چند سال ہوئے بیش قرار رقم اس کتاب کے چھاپنے کے لیے دی ہے۔ مگر افسوس چند پاروں ہی سامنے آگئے نہیں بڑھا

[2] دین کے سوا خود علم کی اشاعت کا جو ذوق مسلمانوں میں تھا اور اس اشاعت کے لیے جو تدبیریں ان کی سمجھ میں آئی تھیں ان میں ایک مشہور تاریخی واقعہ وہ ہے جس کا تعلق گو ہندوستان سے نہیں ہے لیکن مسلمانوں کی اشاعتی تدبیروں میں ایک خاص تدبیر کا اس سے پتہ چلتا ہے اس لیے اس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ میرا اشارہ خواجہ رشید الدین فضل اللہ (باقی بر ۸۳)

Marfat.com

کہ عوام تو عوام خود سرزمین ہند میں محی الملۃ والدین سلطان اورنگ زیب انار اللہ برہانہ ہی نہیں جن کے دست مبارک کے مصاحف آج بھی مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ دولت اسلامیہ ہندیہ کے ابتدائی عہد میں بھی ایسے سلاطین گذرے ہیں جنھوں نے کتابت قرآن ہی کو اپنی معاشی زندگی کے ساتھ معادی فلاح کا ذریعہ بنایا تھا کیا ان کے سامنے والحسنۃ بعشرۃ امثالہا کا قرآنی انعام کتابت مصاحف میں نہ تھا، تاریخوں میں حضرت سلطان ناصرالدین بن شمس الدین التمش کے حالات میں جہاں یہ لکھتے ہیں جس سے اسلامی حکومتوں کے بجٹ کے مدات کا بھی سرسری اندازہ ہوتا ہے۔

خراج وباج ممالک در مواجب سپاہ و نذور درویشاں خدا آگاہ و وظائف وادرار فضلا، وارباب استحقاق و دلجوئی مسکیناں وزیردستاں وعمارت ومساجد وخانقاہ ومہمان سرائے واجرائے انہار وغیر ذلک انچہ از انہار خیر واسباب ذکر جمیل تواند بود خرج کردے" (سیر المتاخرین ج ۱ ص ۱۰۹)

اسی کے ساتھ تقریباً مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ "درسالے دو مصحف بخط خود نوشتہ آزا قوت ساختے"، آخر اس بادشاہ دیں پناہ کے سامنے آخرت[1] کا ثواب نہ تھا تو اس واقعہ کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے کہ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲) المتوفی ۷۱۸ھ کی مشہور تاریخ "جامع التواریخ" کی طرف ہے جو جامع رشیدی کے نام سے بھی مشہور ہے، مؤلف تاتاری حکومت کے وزرا میں تھے اسی تعلق سے انھوں نے چار ضخیم جلدوں میں ترکوں اور تاتاریوں کی تاریخ لکھی ہے، کتاب عام طور سے مشہور ہے، مجھے کہنا یہ ہے کہ اس کتاب کو خواجہ رشید الدین نے فارسی میں لکھا تھا اور پھر اس کا ایک ترجمہ عربی میں بھی کیا، اس لیے کہ اُن کی تاریخ کے دونوں نسخے دنیا میں پھیلتے رہیں یہ خاص ترکیب کی کہ تبریز شہر کے باہر ایک چک جو "ربع رشیدی" کے نام سے موسوم تھا وقف کر دیا تھا، مقصد اس وقف کا یہ تھا کہ "ان تکتب فی کل سنۃ نسخۃ من المجموعۃ وترسل الی احدی بلاد الاسلام نسخۃ بالعربیہ ونسخۃ بالفارسیہ (تاریخ عراق ص ۲۰) (یعنی ہر سال اس مجموعے کے دو دو نسخے اس وقف کی آمدنی سے لکھوائے جائیں اور اسلامی ممالک میں سے کسی ملک میں بھیج دیے جائیں، ایک نسخہ عربی میں تیار کیا جائے اور ایک فارسی میں) جب تک یہ وقف موجود رہا یہ کام ہوتا رہا۔ میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ جہاں دیگر دینی علمی اغراض کے لیے اس زمانہ میں مسلمانوں کے ارباب ثروت اوقاف کرتے رہتے ہیں، کیا اچھا ہو کہ ہر صوبہ میں کچھ اوقاف کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی کیے جائیں، اس ذریعے علم کا ایک بڑا ذخیرہ جو اشاعت وطباعت سے محروم ہے شائع ہو جائیگا، اور واقفوں کو آخرت کے ثواب کے ساتھ دنیا میں بھی ایک نفع حاصل یہ ہوگا کہ بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں کے

[1] (صفحہ ۸۴ پر)

"نوبتے یکے از نوکران سرکار مصحف کہ بخط سلطان بود از روئے خوشامد بقیمت گراں خرید چوں ایں خبر گوش سلطان رسید منع کرد کہ آئندہ مصحف را بخط من اظہار نکنند بلکہ بطور اخفا کہ احدے بر تحریر من وقوف نیابد مغرد ختہ باشند"

(سیر المتاخرین ج ا ص ۱۰۹)

باون سال تک حضرت اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں اور اُنیس سال تک سلطان نصیر الدین نے یعنی اکہتر سال تک اسی ہندوستان نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ اورنگ حکومت اور چتر شاہی کے نیچے بھی قرآن لکھا جا رہا ہے۔ دنیا میں اور بھی ادیان و مذاہب ہیں ان میں سلاطین و فرمانروا گزرے ہیں، لیکن اس کی نظیر اور کہاں مل سکتی ہے۔ اسلامی سلاطین کے اسی عجیب و غریب ذوق کا نتیجہ تھا کہ شاہی خانوادہ کی خواتین مخدرات میں بھی ایسی خاتونیں ملتی ہیں جنہوں نے چند سورتیں نہیں بلکہ پورا قرآن اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ شاہجہاں نامہ میں سال ہشتم کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ امیر تیمور گورگان کی حقیقی پوتی ملک شاد خانم کے دست خاص کا لکھا ہوا مصحف بادشاہ کے سامنے پیش ہوا، اصل عبارت یہ ہے:۔

مصحفے بود بخط ملک شاد خانم بنت محمد سلطان میرزا بن جہانگیر میرزا بن صاحب قران امیر تیمور گورگان کہ بخط ریحان درکمال متانت نوشتہ در خاتمہ اسم و نسب خود بر تاریخ نگاشتہ۔ (منقول از سیر المتاخرین ۲۶۳)

اس واقعہ سے صرف مصحف نگاری کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ بھی کہ شاہی خاندان کی عصمتیان سراپردۂ عفت میں خطاطی کا فن کس کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آج تو ہم عام مسلمانوں کے لیے بھی خط ریحان اور خط رقاع کی اصطلاحات نامانوس ہو چکی ہیں، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تاریخ کے کشورکشاؤں

(حاشیہ صفحہ ۸۳) ؎ اس بادشاہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ گھر کی حاجت روائی کے لیے اپنی بیوی کے سوا کوئی ملازمہ وغیرہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ملکہ نے پریشان ہو کر کہا کہ آخر میں کب تک اس طرح کام کرتی رہوں کوئی تو ملازمہ دو سلطان نے فرمایا "صبر کن تا خدائے تعالیٰ در آخرت نتیجہ شائستہ دہد۔" (ص ۱۰۹ سیر)

(حاشیہ صفحہ ہذا) مسلمانوں نے خطاطی کے آرٹ کو جن جن شکلوں میں ترقی دی ہے اپنی مختلف نوعیتوں کی وجہ سے ان کے بیسیوں نام ہو گئے۔ ریحان اور رقاع خط ہی کی ایک قسم تھی۔ ان کے سوا خلفاء بنی امیہ و عباسیہ کے عہد میں قلم الجلیل، المسجلات، قلم الدیباج، قلم الطومار، قلم الثلثین، قلم الزنبور، قلم المفتح، قلم الحوم، قلم العہود، قلم القصص، قلم الخرفاج، قلم المرصع، قلم

میں جس فاتح اور کشور کشا کا نام آج بھی اپنی مثال بہ مشکل پیدا کر سکتا ہے، اسی امیر تیمور گورگان کی پوتی بھی قرآن صرف لکھتی نہیں بلکہ ایک خط ریحان کے التزام کے ساتھ بکمال متانت پورے قرآن کو ختم کرتی ہے۔ اور جس عہد کے سلاطین و شاہی خانداں، بلکہ شاہی خاندان کی خواتین کا یہ حال ہو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں عوام کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "خط بابری را بابر بادشاہ اختراع نمودہ مصحف بان نوشتہ بمکہ معظمہ فرستادہ" (ج ۳ ص ۲،۳) اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر عبدالحیی مشہدی وغیرہ نے اس خط کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی باتوں کا ملک میں عام طور سے عام مذاق پھیلا ہوا تھا، بعض بزرگوں کا ذکر تو پہلے بھی آیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک مرید شیخ فخرالدین مروزی بھی ہیں، یہ بھی اس وقت تک جب تک انگلیاں کام دیتی رہیں، آنکھوں میں قوت بینائی موجود تھی بقول محدث دہلوی "پیوستہ کتابت کلام مجید کردے" چونکہ حافظ بھی تھے، اس لیے لکھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ یہ کام کب تک کرتے رہے، شیخ نے لکھا ہے "چوں پیر معمر شد از کتابت باز ماند" حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے حوالے سے کتابت قرآن کے متعلق ان کی جو خصوصیت شیخ محدث نے نقل کی ہے۔ اس سے اس زمانہ میں کتابت کی عام اُجرت کا بھی چونکہ پتہ چلتا ہے اس لیے چراغ دہلوی کے اس بیان کو یہاں درج کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ "آنچہ فخرالدین مروزی روزے کتابت کرد از خلق پرسیدے این کتابت ارزد" یعنی لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس کتابت کی بازار میں کیا قیمت لگائی جا سکتی ہے لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ "شش گانی جزوے" یعنی فی جزو "شش گانی" بہ ظاہر مروجہ سکوں میں جو سب سے آخری سکہ بمنزلہ پیسے کے ہوتا تھا

ؔ جہانگیر کے مشہور شاہزادہ پرویز کے متعلق بھی لکھا ہے "در علم عربی و فارسی و نوشتن خطوط بغایت آراستہ و پیراستہ بود اکثر اوقات را بہ کتابت کلام اللہ صرف می نمود۔ تذکرہ خوشنویساں غلام محمد ہفت رقمی ص ۹۱۔ اور یہی ایک شاہزادہ نہیں اسی کتاب میں آپ کو شاہجہاں، جہانگیر، دارا شکوہ، اور جیسوں خانوادۂ شاہی کا نام خطاطوں کی اس فہرست میں ملیگا۔ اور یہ کہ ان میں ہر ایک فارسی کے ساتھ عربی کا بھی خطاط اور عالم ہوتا تھا، لیکن آج ان ہی کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ عربی سے ان کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ۱۲۔

جسے جیتل کہتے تھے وہی مراد ہے، کیونکہ آگے کا فقرہ اس کے بعد یہ ہے کہ مولانا فخر الدین لوگوں سے اس کے جواب میں کہتے کہ "اد گفتے من چہار جیتل بستانم زیادہ نستانم" یعنی بجائے چھ جیتل کے حضرت نے اپنی کتاب کا دام فی جزء چار جیتل ہی مقرر کر لیا تھا، اور اس سے زیادہ نہیں لیتے۔ حتیٰ کہ اگر کسے برائے تبرک زیادہ از چہار جیتل کردے نستدے"

لکھا ہے کہ بڑھاپے تک چار جیتل فی جزء کے حساب سے قرآن کی کتابت کا مشغلہ کرتے رہے، لیکن جب بالکل معذور ہو گئے تب قاضی حمید الدین ملک التجار نے سلطان علاء الدین خلجی سے سفارش کی کہ ان کی امداد شاہی خزانہ سے جاری فرمائی جائے۔ بادشاہ نے ایک تنکہ (غالباً نقروی روپیہ مروجہ) یومیہ مقرر فرمایا، لیکن ان کو اسی پر اصرار تھا کہ دن بھر کتابت کی مزدوری کی جو اُجرت میری ہوتی تھی وہی دی جائے "ہماں شش گانی بدہید بعد بجیل بسیار دو شش گانی قبول کرد"

اس سلسلہ میں غالباً اس کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ فی جزء ایک "شش گانی" تو عام بھاؤ تھا، لیکن اپنی کتابت کی خوبی نیز مطلا و مذہب اور دوسرے لوازم جو اس زمانہ میں خصوصاً قرآنی نسخوں میں اختیار کیے جاتے تھے، جیسا کہ ظاہر ہے قیمتیں مختلف ہوتی تھیں، شیخ محدث نے مولانا جلال الدین مانکپوری کے حالات میں لکھا ہے کہ

"خوردن او از وجہ کتابت بود مصحف می نوشت و بدہلی می فرستاد و پانصد تنکہ ہدیہ شدے" ص ۱۰۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک قرآن کا ہدیہ پان پان سو تنکہ بھی ہوتا تھا لیکن حضرت سلطان جی نظام الاولیاء کے حوالہ سے فوائد الفواد میں ایک واقعہ قاضی برہان الدین (دہلی) کا درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک تنکہ میں بھی قرآن عموماً مل جاتا تھا، قاضی برہان الدین کے اس قصہ میں ہے کہ "بہ یک تنکہ مصحف خرید" ص ۱۱۱۔ آج طباعت کے زمانے میں بھی قرآن مجید کا ہدیہ اس سے کم نہیں ہے۔

بہرحال ان واقعات سے مجھے تو اس زمانہ کے مسلمانوں کے ذوق کتابت کا اظہار مقصود تھا، مسلمانوں میں قرآن کی کتابت کو کتنی اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ ان واقعات سے بھی ہو سکتا ہے

Marfat.com

رجن سے کتابت کا کام بن نہیں پڑتا تھا تو وہ قرآنی نسخوں کی تصحیح میں وقت گذارنے کو زادِ آخرت بنانے تھے۔ مولانا آزاد نے مآثر الکرام میں میر محمد جان بلگرامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ آخر میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ اور مدینہ کی زندگی میں اُنہوں نے اپنا دینی مشغلہ یہ مقرر کیا تھا کہ

"از صبح تا شام در مسجد نبوی می نشست، مصاحف وقف روضۂ مقدسہ را بہ تصحیح می ساند

واوقات گرامی را دریں شغل شگرف صرف می ساخت۔" (مآثر ص ۲۸۰)

اس سلسلہ میں دلچسپ قصہ تو خود ملا عبدالقادر کا ہے۔ اکبر نے انہیں جب مہابھارت کے ترجمہ کا حکم دیا تو گو وہ خود بھی بھاشا سے واقف تھے لیکن مہابھارت کی سنسکرت عبارت کا براہ راست سمجھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے "دانایان ہند (پنڈتوں) را جمع کردہ حکم فرمودند کہ کتاب مہابھارت را تعبیر می کردہ باشند" جس کا بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ دانایان ہند سنسکرت کی عبارت کے مفہوم کو سمجھاتے ہونگے، اور یوں فارسی میں اس کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ سے کتاب کا ترجمہ ہو سکتا ہے یا نہیں ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ طریقہ کار کو اکبر نے خود سمجھایا۔ "چند شب بنفس نفیس معانی آں را بہ نقیب خاں (رفیق ترجمہ ملا) خاطر نشان ساختند تا ماحصل را بفارسی املا می کرد"

الغرض نقیب خاں کی معیت میں ملا عبدالقادر نے ترجمہ کے اسی خاص طریقے سے مہابھارت کو فارسی لباس پہنانا شروع کیا۔ ملا کا بیان ہے کہ "در مدت چہار ماہ از ہژدہ فن از مزخرفات لاطائل کہ ہژدہ عالم دراں متحیر است دو فن نوشتہ شد" اب واللہ اعلم ملا صاحب سے بات نہ بن پڑی، یا قصداً ان کی جانب سے کوتاہی ہوئی، کچھ بھی ہوا ہو، ملا صاحب موردِ عتاب شاہی ہوئے۔ خود ہی لکھتے ہیں کہ "چہ اعتراض کہ نشنید حرام خورم و شلغم خورم[1] ایں معنی درشت گویا نصیبۂ فقیر ازیں کتابہا ہمیں بود النصیب نصیب" (ص ۳۲۰)

---

[1] واللہ اعلم یہ گالی اکبر کی اپنی ایجاد تھی شاید شلغم سے نفرت ہوگی اس لیے حرام خور کے ساتھ شلغم خور کا بھی اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ یا شلغم کی ترکاری عام طور پر پسند نہ تھی، سعدی نے بھی "شلغم پختہ بہ از نقرہ خام" میں شلغم کی مذمت کی ہے ۱۲۔

Marfat.com

ملا بیچارے پر اکبر کا یہ غصہ اخیر وقت تک باقی رہا ایک اور موقعہ پر مہابھارت ہی کے ترجمہ کی کسریوں نکالی گئی جس کے ملا ہی ناقل ہیں کہ میں "جھروکہ کے درشن" کے سامنے دوسروں کے ساتھ کھڑا تھا،

"فقیر را پیش طلبیدند و خطاب بہ شیخ ابوالفضل فرمودند کہ ما فلانے را عبارت از فقیر باشد جوانے فانی صوفی مشرب خیال می کردیم اما او خود چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیرے رگ گردن تعصب اورا نتواند برید"

ابوالفضل نے عرض کیا کہ ان سے کیا حرکت سرزد ہوئی، جواب میں وہی مہابھارت کا قصہ نکالا۔

"فرمودند درہمیں رزم نامہ کہ عبارت از مہابھارت باشد دوش بریں معنی نقیب خاں را گواہ گرفتہ ام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا خیال یہی تھا کہ ملا نے قصداً مذہبی تعصب کی وجہ سے مہابھارت کے ترجمہ میں کوتاہیاں کی ہیں۔ بہرحال بیچارے ملا کو اس ترجمہ کا معاوضہ ان شکلوں میں جب ملا تو کفارہ کی جو شکل ان کی سمجھ میں آئی وہ یہی تھی کہ قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا جائے خود لکھتے ہیں۔

ہمدریں سال حق سبحانہ و تعالیٰ کاتب را توفیق کتابت کلام مجید رفیق گردانید تا بخط نسخ وروش دخوانا نوشتہ با تمام رسانیدہ و بلوح وجدول مکمل وقف روضۂ منورہ حضرت غوث الانامی مرشدی ملاذی میاں شیخ داؤد جہنی وال قدس سرہ ساختہ (ص ۳۹۴ البداؤنی ج ۳)

ملا صاحب کی اس فارسی عبارت میں لوح وجدول کے جو الفاظ آئے ہیں عہد مطابع کے پیدا شدوں کو شاید اس کی اہمیت کا علم نہ ہو واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے موسیقی کی چونکہ ہمت افزائی نہیں کی بلکہ اس کا عام رجحان اس کے خلاف ہی رہا جس کی بحث کچھ آئندہ صوفیۂ ہند کے سماع کے سلسلہ سے ان شاء اللہ آئندہ آئیگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ساری موسیقیت فن تجوید وقرات میں گم ہوگئی۔ وہی چیز جس کے ذریعہ سے خدا جانے شیطان کتنے گھرانوں کو اجاڑ چکا تھا۔ کتنے نوجوان اسی موسیقی کے بت پر جذبات سے بے قابو ہو کر بھینٹ چڑھ گئے اور کون جانتا ہے کہ

عصرِ حاضر کے سینماؤں اور تھیٹروں، میوزک ہالوں کے ہاتھوں کتنے جوانوں کی زندگیاں برباد ہو رہی ہیں، دلرباؤں سے لو لگانے میں شیطان کو جتنی مدد موسیقی سے ملی ہے اتنا کارگر حربہ مردم کش آلات کے بعد بنی آدم کی تباہی کا اسے شاید ہی ملا ہو، کتنی مائیں، کتنے باپ اپنے عشق نواز بچوں سے جو عموماً اسی میوزک کے میٹھے زہر کے مارے ہیں ہاتھ دھونا پڑا، لیکن یہ اسلام کا کمال ہے کہ امالہ کے قانون پر عمل کر کے کتنے بڑے شر سے بھی خیر کا کام نکال لیا گیا، ایک قاری جب اپنے خاص لحن سے قرآن پڑھتا ہے روحیں ان سے اپنے اندر جو بالیدگی اور رفعت محسوس کرتی ہیں، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جن میں فطرۃً حسنِ صوت سے متاثر ہونے کا مادّہ ودیعت کیا گیا ہو[۲]

[۱] یہ عجیب بات ہے کہ ہابیل کو قتل کر کے جب آدم علیہ السلام کا قاتل بیٹا قابیل عدن کے مشرق کی طرف نود کے علاقہ میں جا بسا۔ پھر اس کو عورت کہاں ملی جب کہ اس وقت نسلِ آدم پھیلی نہ تھی، الگ مسئلہ ہے۔ معارف میں ایک مضمون کے نوٹ میں خاکسار نے اپنا ایک خواب و خیال درج کیا ہے جس سے ڈارون کے نظریۂ "قردہ" پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ بہرحال اس وقت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تورات میں اس کے بعد ہے کہ قابیل سے اس کی بیوی حاملہ ہوئی اور ایک نسل قابیل کی اسی ذریعہ سے دنیا میں پھیلی، اسی نسل کے متعلق تورات ہی میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ "بین اور بانسری بجانے والے کا باپ" بھی ان ہی میں سے تھا، اور اسی نسل میں توبلقائن نامی شخص بھی تھا جو پیتل اور لوہے کے سب تیز ہتھیاروں کا بنانے والا تھا (پیدائش۔ باب۴۔ ۲۱-۲۲) غور کرنے کی بات ہے کہ آلاتِ موسیقی اور آلاتِ آدم کشی میں اس وقت تک دنیا کی کن قوموں کو خصوصیت حاصل ہے، بلکہ اگر تحلیل و تجزیہ سے کام لیا جائے تو ان قوموں کے سارے ایجادات کی تہ میں بالآخر یہی دونوں مقاصد کارفرما نظر آئیں گے۔ گزشتہ عبارت میں توبلقائن کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ مشرقی یورپ کا جو حصہ آج کل بلقان کے نام سے مشہور ہے، قائن آدم کے قاتل بیٹے کا نام ہے اور اسی کی تیسری پشت میں توبلقائن ہے۔ کیا یورپ میں جس راستہ سے بنی آدم کا داخلہ ہوا اس کو بلقان اسی وجہ سے کہتے ہیں، ایک قرینہ یہ بھی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یورپ کے باشندے آدم کے کس بیٹے کی نسل سے ہیں اور عرب میں ہبل نامی جو مشہور بت تھا کیا وہ ہابیل کے نام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آدم کی ظالم و مظلوم نسلوں کا کچھ سراغ ان اسماء کی مناسبتوں سے کیا مل سکتا ہے ۱۲۔

[۲] جیسا کہ میں نے عرض کیا ہندوستانی صوفیہ خصوصاً طریقہ چشتیہ کو سماع کے مسئلہ میں آج جتنا بدنام کیا جا رہا ہے، اس کی اصل تاریخی حقیقت تو آئندہ معلوم ہوگی لیکن اس موقعہ پر سلطان المشائخ کے ملفوظاتِ مبارکہ فوائد الفواد کے جامع امیر حسن علا سنجری کے ایک لطیفہ کا خیال آگیا، حضرت سلطان جی کی مجلس میں سماع کے جواز و عدمِ جواز کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں بعض علماء غیر مزامیری سماع کے مسئلہ میں بھی انتہائی شدت سے کام لے رہے تھے۔ (باقی برصفحہ ۹۰)

بہرحال کچھ امالہ کی یہی کیفیت ہمیں تصویر کشی کے مسئلہ میں نظر آتی ہے یعنی حیوانی مصوری کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) بات حکومت تک پہنچی جس کا نقصہ آگے آرہا ہے۔ حسن علاء نے حضرت سلطان جی سے عرض کیا۔

"بندہ ایں طائفہ را کہ منکر سماع اند نیکو می داند و بر مزاج ایشاں وقوفے تمام دارد غرض آنکہ ایشاں سماع نمی شنوند

ہم چنیں گویند کہ ما ازاں نمی شنوم کہ حرام است بندہ سوگند نمی خورد اما راست عرضداشت می دارد کہ اگر سماع

حلال بودے ہم ایشاں نہ شنیدندے"

سلطان جی یہ فقرہ سن کر مسکرانے لگے گفت ارے چوں ایشاں را ذوقے نیست چہ گونہ شنیدندے و بر چہ شنیدندے۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی ایک بات یاد آئی، بعض خشک مزاجوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ ساری چیزیں جن کا وعدہ اہل ایمان سے جنت میں کیا گیا ہے، یہ نہیں کہ شرعی ممانعت کی وجہ سے دنیا میں ان سے احتراز کرتے ہیں بلکہ خشکی کی مشق بڑھاتے ہیں اور اس حد تک اس مشق میں آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان چیزوں سے اپنے دل میں کراہت، نفرت، چڑ پیدا کر لیتے ہیں اور اسی کو دینی احساس کی بیداری کا کمال سمجھتے ہیں۔ لیکن میں تو خیال کرتا ہوں کہ جذبات کو مردہ کر کے شریعت پر عمل شائد اتنا باعث اجر نہ ہو، جتنا کہ جذبات کی بیداری کے ساتھ ان کو عقل کے قابو میں اور عقل کو ایمان کے قابو میں رکھا جائے۔ میں تو اکثر ایسے حضرات کے متعلق یہ کہا کرتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنے اندر جنت کی نفرت اور دوزخی چیزوں کی رغبت گویا پیدا کر لی ہے۔

لہ تعجب ہے کہ تصویروں کے مفاسد کا اعلان آج خود ان ہی تصویروں کی زبانوں سے ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف لعنیات ہی تک ان کی گمراہیاں محدود تھیں، اگرچہ انسانیت کو جو نقصان اصنامی نظام حیات سے پہنچا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے اُخروی خسران کے ساتھ ساتھ آدمی کی کمائی ہوئی آمدنیاں پانی کی طرح اصنامی اوہام پر ہزار ہا ہزار سال تک بہتی رہی ہیں، جن کا اس زندگی میں بھی قطعاً کسی قسم کا کوئی نفع انسان کو نہیں پہنچا۔ ایسا شرمناک فعل کہ خود کرنے والے بھی اب اس کے ارتکاب پر شرماتے ہیں اور جھوٹی طفل تسلیوں سے اپنی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بالآخر دیانند سرسوتی جی اور برہمو سماجی طبقوں کے ضبط سے بات باہر ہو گئی، اور طبع سازیوں کو چھوڑ کر ان بیچاروں کو اصنامی نظام کے خلاف شدت سے آواز بلند کرنی پڑی، لیکن یہ تو پرانے زمانہ کی بات ہے، آج عریاں پکچروں، سینمائی فواحش کی راہ سے شیطان کا جو بے پناہ حملہ نسل انسانی پر ہوا ہے کہ آدمی کے بچے جنسی جذبات کے سلسلہ میں خرنفیوں کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جن سے شاید اب تو گدھوں کو بھی شرم آتی ہو۔ اعصاب بشری پر صرف عورت سوار ہو گئی ہے۔ ہونٹے دل کے تازہ وارد نوجوانوں کی زندگی صرف سوزش اور جلن بن کر رہ گئی ہے۔ بلوغ سے پہلے نابالغوں کو بالغ بنا دیا جاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں کا یہی حال ہو گیا ہے، بتدریج ان بے راہ رویوں کے جو نتائج ان آئندہ نسلوں پر مرتب ہونے والے ہیں جن کی قوتوں اور توانائیوں کی موجودہ نسلیں امین ہیں، کون کہہ سکتا ہے ان غریب آنے والوں پر ان ہی تصویروں کے ذریعہ سے کیا ظلم توڑا جا رہا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ روحانی اطہار کی بات اگر جہیں مشنی جا رہی ہے تو جسمانی اطہار آخر کب تک آدم کے بچوں کے اس ذبح عام (باقی بر صفحہ ۹۱)

اسلام نے جو حرام قرار دیا، تو غالباً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسن کاری کے سارے رجحانات اور میلانات منجملہ دیگر مباح فنون لطیفہ کے قرآنی لوح اور جدول سازی کے متعلق نادرہ نمایوں کی طرف راجع ہو گئے، لوح یعنی کتاب کے ابتدائی ورق اور جس ورق سے کتاب شروع ہوتی تھی اس کی ناصیہ (پیشانی) پر جو گل کاریاں کی جاتی تھیں، نیز ہر ورق کے حوض کو لکیریں کھینچ کر جو دیدہ زیبی اور کتاب میں رعنائی پیدا کی جاتی تھی جس کی ابتدا جہاں تک میرا خیال ہے قرآن ہی سے ہوئی۔ اور قرآن سے پھر متجاوز ہو کر دوسری کتابوں میں اس عمل کا رواج ہوا، یہ بھی گویا جذبۂ مصوری کے امالہ کی ایک شکل ہے، مسلمانوں نے اس سلسلہ میں سونے چاندی، موتی، مختلف رنگیں جواہرات کو محلول اور سیال کر کے ان کے مختلف رنگوں سے جو کام لیا ہے اور اسی سلسلہ میں جلدوں کی صنعت میں جو ترقیاں کی ہیں حقیقت یہ ہے کہ بجائے خود ان کا ایک مستقل کارنامہ ہے، اس سے ان کے ذہنی اور علمی استغراق کا پتہ چلتا ہے، اگر ترقی بھی کی تو کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا تعلق قرآن اور علم ہی سے باقی رکھا، قدیم قلمی کتابوں کے کتب خانوں میں جن کا بڑا حصہ تو غیروں کے قبضہ میں چلا گیا ہے، لیکن تھوڑا بہت بچا کچھا جو ذخیرہ ابھی ملک کے بعض گوشوں میں باقی رہ گیا ہے خصوصاً حیدرآباد کے شاہی کتاب خانہ یا نواب صاحب رام پور کی لائبریری، خدا بخش خاں مرحوم بانکی پور (پٹنہ) کے مشرقی کتب خانے، سیدی مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ بہادر مد ظلہ العالی کے کتب خانہ حبیبیہ وغیرہا میں اب بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰) کا صبر کے ساتھ معائنہ کرتے رہینگے۔

زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھیگا، نبی عالم کی ایک ایک بات کی تصدیق پر سے مجبور ہونا پڑیگا، اور یہ تو تصویر سازی کا مضر پہلو ہے، اب اس پر اگر ہم غور کرتے ہیں کہ آخر اس کا کوئی مفید پہلو بھی پیدا ہو سکتا ہے، تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بڑے لوگوں کا نام سن کر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ ان کی صورت کیسی تھی اس کا بھی علم ہوتا۔ لیکن ایک وہمی خواہش سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے، ہم میں سے بڑے سے بڑا آدمی بھی ظاہر ہے کہ وہی دو آنکھیں دو ناکیں دو کان رکھتا ہے جن سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی محروم نہیں بلکہ شاید حیوانات بھی ان میں انسان کے ساتھی ہیں۔ بڑائی کا مدار باطنی سیرت و کمالات پر ہے جو تصویروں میں منتقل نہیں ہو سکتے اور جو چیز تصویر میں آتی ہے اس کو بڑائی سے دور کا بھی تعلق نہیں، رہا حسن کاری کے جذبہ کا استعمال تو اس کے لیے بیسیوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

Marfat.com

مسلمانوں کی ان حُسن کارانہ صناعیوں کا معائنہ کیا جا سکتا ہے اور اس مرحوم اُمت کے اس شغف بغرض کا سُراغ ملتا ہے جو کتابوں سے کسی زمانہ میں اسے پیدا ہو گیا تھا، بلا مبالغہ اس سلسلہ میں ایک ایک کتاب پر ہزار ہا ہزار روپیہ صرف کیے جاتے تھے۔ تاریخ حدیقۃ العالم میں لکھا ہے کہ ایران کے بادشاہ عباس صفوی کو شوق ہوا کہ فردوسی کے شاہنامہ کا ایک شاہی نسخہ تیار کرایا جائے۔ عماد کاتب اس کام کے لیے بلایا گیا۔ عماد نے شرط پیش کی کہ ایک خاموش باغ کے مکان میں جگہ دی جائے اور ساز و سامان کی جو ضرورت ہو وہ پوری کی جائے۔ بادشاہ نے وزیر کو بلا کر حکم دے دیا کہ عماد کی فرمائش پوری کی جائے باغ اور بنگلہ نوکر چاکر سب حاضر کر دیے گئے۔ طلا کاری و جواہر نگاری کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی، اس کی ابتدائی قسط کی فہرست وزیر کے پاس پیش ہوئی، اس کی بھی منظوری دے دی گئی، چند دنوں کے بعد عباس نے وزیر سے شاہنامہ کی کتابت کا حال پوچھا۔ وزیر نے رپورٹ کی کہ اب تک پچھتر شعر مثنوی کے لکھے گئے ہیں اور چالیس ہزار صرف ہو چکے ہیں، باوجود بادشاہ بلکہ کج کلاہ ایران ہونے کے اس کے ہوش اڑ گئے مصارف کا یہی معیار آخر تک باقی رہا تو پوری کتاب کی لاگت گویا کروڑوں ہی تک پہنچیگی، ہمت چھوٹ گئی اور عماد کو حکم دے دیا گیا کہ کام کو روک دیں۔ اس حکم نے عماد میں غصہ کی لہر دوڑا دی اسی وقت اپنے ایک شعر کو اس نے کاٹ کر وصلی کی شکل میں بدل دیا۔ سوار ہو، نقیب جو آگے آگے جا رہا تھا اُس کو حکم دیا کہ بازار میں آواز لگاتے جاؤ "عماد کاتب کے قطعات فی قطعہ ہزار روپے کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ اصفہان کے بازار کے اس سرے سے دوسرے سرے تک عماد کی سواری پہنچنے نہیں پائی تھی کہ پچھتروں شعر بک گئے۔ حکومت کے خزانے کے چالیس ہزار جو صرف ہوئے تھے عماد نے وزیر کے پاس اس کو بھیج دیا اور پینتیس ۳۵ ہزار کی رقم مزید بچ گئی[1]۔ میرے خیال میں اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اس زمانہ

[1] اسی قصہ کو مولوی غلام محمد ہفت قلمی نے اپنی کتاب تذکرہ خوشنویساں میں بھی دُہرایا ہے لیکن بعض اجزا میں کچھ اختلاف ہے۔ مثلاً غلام محمد نے لکھا ہے "میر ابیات مذکور را مقراض نمودہ بہ ہفتاد کس از شاگردان خود تقسیم کرد ہر یک یک تومان (ایرانی سکہ) حاضر کرد" (صفحہ ۹۲ کتاب مذکور) اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ عباس صفوی نے اسی قصہ میں میر عماد پر سنیت کا الزام لگا کر شہید کرا دیا۔ اسی کتاب میں یہ بھی ہے "در اول شاہجہاں ہر کہ خط میر عماد می گزرانید یک صدی منصب دہانی برے

بھی جب پُرانے قدر دانوں کو میں نے دیکھا ہے کہ عماد یا رشید کے قطعات کی قیمت تین تین سو چار چار سو دیتے ہیں تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ جب مسلمانوں میں آج کا ایک روپیہ ہزار روپیے کی مساوی قیمت رکھتا تھا، اس زمانہ میں ایک ایک قطعہ کو ہزار ہزار روپیے میں لینے والے اگر مل گئے ہوں تو کیا تعجب[۱] ہے۔ یہی ہندوستان جس میں لوگ شیرازہ بندی سے بھی واقف نہ تھے بلکہ ہر ورق دوسرے ورق سے الگ ہوتا تھا، جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس ملک کی کتابیں

بیش تر بر برگ تار[۲] و توز[۳] بغدادی قلم بر نوشته و امروز بر کاغذ در نوشتن از چپ آغاز ند و ورق باہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) می یافت" یعنی میر عماد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی سی چیز مثلاً کوئی قطعہ ہی کیوں نہ ہو ایک صدی منصب کا حقدار صرف اس لیے بنا دیتا تھا کہ دربار شاہی میں اس نے پیش کیا ہے۔ دوسرے مشہور خطاط آقا رشید دیلمی کے تذکرہ کا یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک شاعر نے مدحیہ قصیدہ رشید کی شان میں کہہ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ رشید نے اس قصیدہ کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے شاعر کو واپس کر دیا "شاعر محزوں برآمد" کہ صلہ کا اُمیدوار تھا، چاہتا تھا کہ رشید سے کوئی رقمی انعام ملیگا۔ لیکن "چوں طالبان خطش (خط رشید) شنیدند زیادہ از آنکہ توقع صلہ و انعام در خیال داشت یاد دادہ ان قصیدہ نوشتہ آقا را از وگرفتند و خیلے ممنون گشتند" ص ۱۰۰۔ ایک اور خطاط میر خلیل اللہ جو عادل شاہی حکومت بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل کے اُستاد تھے ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ایک شخص جو میر خلیل کے خط کے قدر دانوں میں تھا کسی کے پاس معلوم ہوا کہ ان کا کوئی مخطوطہ ہے "بہ ہفت صد روپیہ پیش آمد سود نہ کرد" بالآخر ایک قطعہ کی قیمت کیا دینی پڑی؟ "باسپ عربی مبادلہ نمود" علم و ہنر کی قدر شناسیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے؟

[۱] ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں اس مشہور داستان کا ذکر کرتے ہوئے جس کا اب تو اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے یعنی داستان امیر حمزہ۔ مطبع نول کشور نے تو خدا جانے اس داستان کو کہاں تک بڑھا دیا ہے، میرا تو خیال ہے کہ طلسم ہوش رُبا، ہفت پیکر، نور افشاں وغیرہ جن کے مطالعہ کا شرف اس فقیر کو بھی عہد طفولیت میں ملا تھا اب تو ان کی مجموعی مجلدات سَو سے متجاوز ہوں تو تعجب نہیں لیکن ملا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً فارسی زبان میں اس داستان کی سترہ جلدیں تھیں۔ واللہ اعلم یہ داستان کہاں لکھی گئی، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ملا عبدالقادر نے ان سترہ جلدوں اور شاہ نامہ کے متعلق لکھا ہے کہ اکبر نے "شاہ نامہ و قصہ امیر حمزہ را بہ ہفتدہ جلد در مدت پانزدہ سال نویسانیدند و زر بسیار در تصویراں خرچ شد" ص ۳۴۲ ج ۲۔ اسی کتاب کی تیسری جلد میں میر سید علی مصور تخلص جدائی کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا صاحب نے لکھا ہے "قصہ امیر حمزہ در شانزدہ جلد مصور باہتمام وے اتمام یافتہ ہر جلدے صندوقے و ہر ورقے یک ذرع در یک ذرع و در ہر صفحہ صورتے" ص ۲۱۱ ج ۳ جس کا یہی مطلب ہوا کہ سترہ اٹھارہ جلدوں کی یہ کتاب اس طرح لکھی گئی تھی کہ ایک ہاتھ چوڑا ایک ہاتھ لمبا ہر جلد کا ہر ورق تھا اور ہر ورق میں ایک تصویر بنائی گئی تھی ۱۲۔

[۲] حال میں ایک قدیم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں خرید گیا ہے جس میں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کا ایک کافی ذخیرہ ہے۔ کہتے یہ ہیں کہ لوہے کے قلم سے ان پتوں پر جو تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے ہونگے اور ان کے کناروں کو (باقی بر صفحہ ۹۴)

Marfat.com

پیوستہ نباشد و شیرازہ رسم نبود" (آئین اکبری ج ۳ ص ۳۰)

ابوالفضل نے امروز کا لفظ جو بڑھایا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کا رواج اس ملک میں مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳) تراش کر گول کر لیا جاتا تھا اس کے بعد لوہے کے قلم کی نوک سے صرف نشانات بنا دیے جاتے تھے پھر سنبھالو یا اسی قسم کے عرق دار پتوں کو ہاتھوں سے مل کر ان نشانات پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے نشانات نمایاں ہو جاتے تھے پرانے زمانہ میں عینکوں کے لیے جیسے خول ہوتے تھے ان ہی میں تیس تیس چالیس چالیس پتوں کا ایک مجموعہ ایک ڈوری سے نتھا ہوا ان خولوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ان پتوں کی کتابوں میں کس قسم کے مضامین ہیں اب تک ان کا پتہ نہیں چلا ہے، زیادہ تر تلنگی، کنڑی، مرہٹی زبانوں میں ہیں اور بعض سنسکرت میں بھی ہیں۔ جامعہ کے بعض ہندو پروفیسروں نے مجھ سے کہا کہ ان میں زیادہ تر پرانے زمانہ کے قصے کہانیاں یا جھاڑ پھونک وغیرہ جیسی چیزیں ہیں۔ ملا عبدالقادر نے بھی فیروز شاہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ جب کانگڑہ فتح ہوا تو اس کے مندروں سے بھی بہت سی کتابیں برآمد ہوئیں بادشاہ نے ان کتابوں کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ملا نے لکھا ہے کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں میں سے بعض کتابیں میری نظر سے بھی گزری ہیں۔

بعضے ازاں در علم پنگل یعنی فنون موسیقی و اقسام اکھاڑہ کہ آں را پاتری بازی گویند و بعضے در غیر آں واکثراں را بے ماحصل یافت" ص ۲۴۹

اکھاڑہ سے مراد وہ اکھاڑہ نہیں ہے جس میں کشتی گیری کا فن سکھایا جاتا ہے، بلکہ ملا نے پاتری بازی سے جس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہی مقصود ہے، ابوالفضل نے اپنی خاص زبان فارسی شدہ میں اسی اکھاڑہ کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "اکھاڑہ نشاط بزمے ست، در شبستان بزرگان ایں مرز و مرزمین، پیراستہ گردد" پھر اُس نے اپنی اسی زبان میں بتایا ہے کہ گھر کی چھوکریوں کو سازو نغمہ سکھایا جاتا ہے، اور چار عورتیں جو "نکورو" ہوتی ہیں "برقاصی در آئند" و "چار بسرائیدگی" الغرض یوں آٹھ چھوکریاں گاتی اور ناچتی ہیں اور "چہار بداں نمط تال نوازند" یعنی تالیاں بجاتی ہیں۔ اسی طرح سے مختلف قسم کے ڈھول جن کے مختلف نام ہوتے ہیں، وہ بجاتے جاتے ہیں۔ ہندوستان جب اپنا سب کچھ کھو چکا تھا، وام مارگی فرقوں نے عبادت کی ان شکلوں کو مندروں میں مروج کیا تھا، اور باضابطہ اس کو فن بنا دیا گیا تھا در اصل پچھلے زمانہ میں ہندوستان میں کتابیں جو لکھی گئیں ان کا تعلق اسی قسم کی باتوں سے تھا۔ ٹھیک آج جو حال یورپ کا ہے کہ فائن آرٹس (فنون لطیفہ) کے نام سے ہر نا کردنی کو کردنی بنا دیا گیا ہے۔ وہم یحسبون انھم یحسنون صنعاً۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے فن کاغذ سازی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تاڑ کے پتوں سے جو کام نکالا، اُس میں ذہانت سے ضرور کام لیا گیا ہے، لیکن اسی ملک میں مسلمانوں نے جب مسلم قرآن کو اتنی چھوٹی تقطیع میں لکھ کر دکھایا تھا جو انگوٹھیوں کے نگینے کی جگہ سما جاتا تھا، یا بازو بند بنا کر سلاطین و امرا بطور تعویذ کے استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ چنے کی ایک دال پر پوری قل ہو اللہ کی سورت تک لکھی جاتی تھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے شریف نامی شخص کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ پدرش (خواجہ عبدالصمد) دریک طرف دانہ خشخاش سورۂ اخلاص تمام درست و خوانا نوشتہ و طرف دیگر نیز ازیں مقولہ" خشخاش کے دانہ کی ایک طرف پر سورۂ قل ہو اللہ کو اس طور پر لکھنا کہ ہر شخص پڑھ سکتا ہو بظاہر عقل میں یہ بات نہیں آتی اور یہ تو باپ کا کمال تھا میاں شریف صاحبزادے بھی کم نہ تھے۔ ملا صاحب ہی نے لکھا ہے "پسرش دریک دانہ خشخاش می گویند کہ ہشت سوراخ باریک کردہ و تارہا دراں گزرانیدہ و در دانہ برنجے صورت سوارے مسلح و جلودارے در پیش مع دیگر خصوصیات از تیغ و سپر و چوگان وغیرہ آں نقش نمود (باقی بر صفحہ ۹۵)

کے عہد میں ہوا، میں نے حاشیہ میں روضۃ الصفا سے جو عبارت نقل کی ہے اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیجانگر میں اس وقت تک جس زمانہ میں اس رپورٹ کا لکھنے والا آیا ہے اور وہ ان دنوں میں آیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴) ص ۳۱۰ ج ۳۔ (برنجے) چاول کے ایک دانہ پر مسلح سوار کو ان چیزوں کے ساتھ مصور کرنا بلاشبہ عجب کمال تھا۔ اور اب بھی ان لکھنے والوں کی یادگاریں بعض پرانے خاندانوں میں موجود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں تاڑ کے پتوں پر لکھنا ظاہر ہے کہ کیا کمال کی بات ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک چیز غالباً ہندوستان میں لکھنے ہی کے متعلق ایسی تھی جس سے غالباً مسلمان واقف نہ تھے، روضۃ الصفا کے آخر میں دکن کی مشہور راجدھانی بیجانگر کے کچھ حالات بھی درج ہیں، غالباً قران السعدین سے ماخوذ ہیں، وہ لکھتا ہے کہ

کتابت ایشاں بر دو نوع ست یکے بقلم آہن کہ بر برگ جوز ہندی کہ دو گز طول برنگارند و ایں نوع کتابت کم بقا باشد دیگر بر جنس سیاہ سنگ نرم کہ آں را بساں قلم تراشند و چیزہا نولیسند و ازاں سنگ رنگ سفیدی بیں جنس سیاہ پدید آید و ایں کتابت دیر بماند"

جوز ہندی تو وہی تاڑ کے پتوں سے مُراد ہے، لیکن آخری چیز جو اس نے لکھی ہے بظاہر اس کا اشارہ سلیٹ اور پنسل جو پتھر ہی کی ہوتی ہے اس کی طرف ہے سلیٹ ہی پر جب لکھتے ہیں تو سیاہ پتھر سے سفید حروف نکل آتے ہیں، لیکن اجنبی مسافر ہونے کی وجہ سے اس کو غلطی لگی اور یہ لکھ دیا کہ ایں کتابت دیر بماند" حالانکہ الٹی بات ہے غالباً خود تجربہ نہیں کیا۔ پتھر پر کسی چیز کو لکھتے ہوئے رائے قائم کرلی کہ نقش جب حجر میں ہو رہا ہے تو النقش فی الحجر ہی ہوگا، اور یہی دلیل ہے کہ ہندستان میں جو مسلمان باہر سے آئے وہ سلیٹ والی ترکیب کتابت سے ناواقف تھے اور یہ کوئی خاص چیز اسی ملک کی ایجاد ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ جب اس ملک میں مسلمان متوطن ہو گئے تو ہندوؤں سے اس چیز کو انھوں نے اخذ کیا ہوگا، اسی لیے میں نے اس کا ذکر بھی کیا کہ ہندی نظام تعلیم کے ایک طریقہ کتابت کا اس سے پتہ چلتا ہے۔ عموماً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ پنسل سلیٹ والی ترکیب یہ اسکولوں کی پھیلائی ہوئی ہے صحیح نہیں ہے بعض عربی مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تاڑ کے پتوں کے سوا ہندوستان میں ریشمیں کپڑوں پر بھی لکھنے کا دستور تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

سے توز کیا چیز ہے؟ ہندستان ہی کی چیز ہے لیکن مختلف کتابوں میں اس کی جو شرح کی گئی تھی دل کو نہیں لگتی تھی لیکن البیرونی کی کتاب الہند میں اس کی تفصیل ملی انجمن ترقی اردو کے اُردو ترجمہ سے اس کی عبارت نقل کرتا ہوں وہ لکھتا ہے "وسط اور شمالی ہند میں درخت توز کی چھال (لکھنے کے لیے) استعمال کرتے ہیں، جس کی ایک قسم سے کتابوں کے غلاف بنائے جاتے ہیں اس کو بھوج پتر بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ لانبی اور پھیلی ہوئی انگلیوں کے برابر یا اس سے کم چوڑی ہوتی ہے۔ اس کو کسی طریقہ سے مثلاً تیل لگا کر اور صیقل کرکے سخت اور چکنا کر لیتے ہیں اور اُس پر لکھتے ہیں۔" (ص ۲۲۵ ترجمہ اُردو) لیکن اس سے بھی زیادہ تفصیل طبی کتاب محیط اعظم میں دی گئی ہے۔ لکھا ہے "واں پوست درخت ہندی کشمیری ذی طبقات کثیرہ مثل طبقات ابرک بود ہر طبقہ مثل کاغذ و خطوط مستقیم سرخ و سفید مثل الف براں کشیدہ و مردم کشمیر براں کتاب می نولیسند و درخت او بزرگ می شود و برگ او مثل برگ ... او نقطہ (ج ۱ ص ۳۸۲) (باقی برصفحہ ۹۶)

جب دکن کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا، صرف یہ علاقہ باقی تھا، معلوم ہوتا ہے کہ قدامت پرستی کی وجہ سے بیجانگر کی حکومت نے اس وقت تک کاغذ کا استعمال شروع نہیں کیا تھا اور ہندوستان کی تاریخ وغیرہ کے متعلق جو عام مواد کمیاب ہے، اس کی زیادہ وجہ غالباً یہی ہے کہ ان کے پاس کاغذ نہیں تھا، تاڑ کے پتوں پر چند مذہبی ضروری کتابیں لکھ لیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم میرا یہ خیال ہے، ممکن ہے ارباب تحقیق کی رائے کچھ اور ہو۔ بہرحال اگر کاغذ اس ملک میں مستعمل ہوگا بھی تو بہت کم۔ زیادہ تر کام وہی تاڑ کے پتوں یا سلیٹ کی تختیوں سے لیا جاتا تھا، یا زمین پر ملتانی مٹی سے بچوں کو حساب وغیرہ کی مشق لکھوا کر کرائی جاتی ہوگی جس کی یادگار اب تک پرانے پاٹھ شالوں میں ملتی ہے لیکن جب مسلمان اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ کاغذ لائے مختلف شہروں میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم تھے خصوصًا کالپی کا کاغذ بہت مشہور تھا، لیکن ماثر الکرام میں ایک واقعہ کے ذکر میں کالپی کے کاغذ کی یہ خاصیت بتائی گئی ہے کہ "کاغذ کالپی درآب زود متلاشی می گردد" (ص ۵۸) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالپی کا ساختہ کاغذ پانی میں بآسانی گل جاتا تھا۔ اسی کے مقابلہ میں جو کاغذ کشمیر میں بنتا تھا ملا عبد القادر نے اس کے متعلق اپنی کتاب میں ایک عبارت یہ نقل کی ہے "نقوش ال از کاغذ شستن چناں می رود کہ ہیچ اثرے از سیاہی نماند" (ص ۱۴۴ ج ۳)۔ جس سے معلوم ہوا کہ پانی سے دھونے کے بعد کاغذ پھر جیسا کا جیسا ہو جاتا تھا۔ اب بھی کشمیری کاغذ پر قرآن چھپا ہوا نظر آتا ہے تو بہت چکنا اور مضبوط معلوم ہوتا ہے، اتنا چکنا کاغذ کہ پانی سے حروف کو دھو دیجیے پھر جیسا تھا ویسا ہی ہو جائے شاید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) اسی میں یہ بھی ہے کہ مردم ہند بنچہ غلیاں (حقہ) بکار می برند" البیرونی نے لکھا ہے کہ ان اوراق کی ترتیب سلسل ہندسوں سے معلوم ہوتی ہے۔ پوری کتاب کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹی ہوئی دو تختیوں کے درمیان جو کتاب کے برابر ہوتی ہیں بندھی رہتی ہے اور ان کتابوں کا نام پوتھی ہے۔ محیط اعظم میں، دوسرے موقع پر توز کے تحت میں لکھا ہے "شجر عظیم ست چوں چوب آں را بر آتش نہند از آں روغن مشل روغن بلساں سائل شود و صمغ دگوند) آں کہربا ست" واللہ اعلم ہندستان میں رواج ہے کہ دال یا پلاؤ وغیرہ میں ایک قسم کے پتے بنام تیز پات ڈالتے ہیں۔ کیا تیز کا لفظ "توز" کی بگڑی ہوئی شکل ہے بھوج پتر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بھوج کے معنی ہندی میں کھانے کے ہیں۔ یعنی وہ پتہ جو کھانوں میں ڈالا جاتا ہے ممکن ہے کہ مصالحہ کے یہ پتے اسی درخت توز کے ہوں۔ بہرحال صاحب محیط اعظم کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تہ بہ تہ بالکل رول دیے ہوئے کاغذ کی مانند قدرتی طور پر یہ چھال درخت توز میں پیدا ہوتی ہے۔ کمان پر چڑھاتے ہیں اس سے معلوم

Marfat.com

اب بھی مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔

بہرحال معلوم نہیں کہ اور کہاں کہاں کاغذ کی صنعت مسلمانوں کے آنے کے بعد اس ملک میں جاری ہوئی، ابوالفضل نے آئین اکبری میں اکبری قلمرو کے ہر صوبہ کی دستکاریوں اور پیداوار کا ذکر کیا ہے لیکن کاغذ سازی کے سلسلہ میں اُس نے صرف بہار ہی کا نام لیا ہے، بہار میں بھی سرکار بہار جو اب ایک معمولی قصبہ اور سب ڈویزن ہے اس کے ذکر میں لکھتا ہے کہ

"در سرکار بہار نزدیک موضع راجگر کان سنگ مرمر ست از وزیور ہا بر سازند، و کاغذ خوب می شود"

سیر المتاخرین کے مصنف نے بھی حالانکہ تمام صوبوں کے کچھ نہ کچھ مصنوعات کا ذکر ہر صوبہ کے ذیل میں کیا ہے، زیادہ تر ابوالفضل ہی سے اس کا بیان ماخوذ ہے لیکن تقریباً دو سو سال بعد انھوں نے بھی صرف یہی لکھا کہ "و کاغذ در موضع اردل و بہار خوب بہم رسد" (ص ۱۹) گویا ابوالفضل کے بیان پر صرف اتنا اضافہ کیا کہ قصبہ بہار کے سوا اردل جو ضلع گیا میں قدیم شرفا کی ایک بستی سے زیادہ اب کوئی وقعت نہیں رکھتا، اس میں بھی "کاغذ خوب" کی بہم رسانی کی خبر دی ہے۔ آخر میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ان دونوں مقامات بہار و اردل میں

"اکنوں ہم می سازند اگر کار فرمائے بہم رسد و زرے خرچ کند شاند بہتر از آنکہ می سازند ساختہ آید"

مولوی مقبول احمد صمدنی نے میر عبدالجلیل بلگرامی کی سوانح عمری میں سرکاری گزیٹر سے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ "۱۸۰۰ء تک انگریزی کتابیں پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھیں (حیات جلیل ص ۴۹۰) لیکن تدریج آن قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ کار فرماؤں کا خاتمہ ہوگیا، اور زر بجائے حوصلہ افزائی کے حوصلہ شکنی میں صرف ہوا، تقریباً چالیس پچاس سال سے تو میں جانتا ہوں کہ ان مقامات کو اب کاغذ سازی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے، شاید بہار میں ایک محلہ جو اب اسٹیشن بھی ہے، کاغذی محلہ کے نام سے جو مشہور ہے کسی زمانہ میں اسی میں کاغذ بنتا ہو، ممالک[1] محروسہ سرکار عالی حضور نظام

---

[1] شائرل کی کتاب کے حوالہ سے اسلامی درسگاہوں کے مصنف نے یہ عبارت نقل کی ہے کہ "جنوبی ہند میں لڑکے نرکل سے چینی کاغذ پر لکھتے ہیں" یہ گول کنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کے زمانہ کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن میں کاغذ چین سے آتا تھا، گویا دکن میں کاغذ کی صنعت سلاطین آصفیہ کے زمانہ سے مروج ہوئی۔

Marfat.com

میں بھی اورنگ آباد میں قدیم طرز کے کاغذیوں کی ایک نسل پائی جاتی تھی جو دم توڑ رہی تھی[1]، نیز بعض دوسرے اضلاع مثلاً کریم نگر وغیرہ کے بعض قصبوں میں اس کے بنانے والے موجود ہیں، لیکن ادھر چند سالوں سے حکومت آصفیہ کے کارفرماؤں کی توجہ اس صنعت کے احیاء کی طرف مبذول ہوئی ہے، اور زر بھی خرچ کیا جا رہا ہے، بحمد اللہ ہر قسم کے کاغذ فراہم ہونے لگے ہیں، سرکاری دفاتر میں ان کا تھوڑا بہت رواج بھی ہو چلا ہے اور شاہی فرامین جس کا نام "جریدہ غیر معمولی" ہے وہ عموماً اسی کاغذ پر طبع ہوتا ہے، بعض کتابیں بھی اس پر چھپی ہیں۔

خیر یہ تو ایک ذیلی بحث تھی، نظر سے گذری ہوئی بات تھی موقع سے ذکر آ گیا، جی نہ چاہا کہ چپ چاپ گزر جاؤں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خواہ کاغذ کہیں بنتے ہوں لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد اس ملک میں کاغذ کی فراوانی تھی، صرف یہی نہیں کہ عام کاغذ لکھنے پڑھنے اور کتب نویسی کے ملتے تھے، بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو ظاہر ہے کہ ہندی اسلام کے قرون اول ہی میں شمار ہو سکتا ہے، اس زمانہ میں سادہ کاغذوں کی مجلد کاپیاں بھی مسودہ نگاری کے لیے ملتی تھیں اور وہ بھی سفید مَذلی۔ فوائد الفواد میں ایک موقع پر خود حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] جونپور کے پاس ہی پرانے زمانہ میں ایک بڑا مشہور شہر ظفر آباد تھا، جو قریب قریب اب کھنڈر ہو گیا ہے، پھر بھی تھوڑی بہت آبادی ابھی باقی ہے۔ ایک صاحب نے چراغ نور کے نام سے اس کی تاریخ لکھی ہے اس میں بیان کرتے ہیں کہ اس قصبہ میں پانچ سو دکانیں کاغذ بنانے کی تھیں، لفظ ہر دکان سے مراد کارخانے ہیں لکھا ہے کہ سال میں تین چار لاکھ روپیہ کی تجارت تھی واللہ اعلم بالصواب۔ ان کا بیان کچھ مبہم ہے، لیکن ایک مفید بات اس کتاب میں خوب ہی مل گئی، مصنف کتاب نے کاغذیوں کے خاندان والوں سے ان کاغذوں کی قسمیں اور نام پوچھ کر درج کر دیے ہیں، ان کے بیان کے مطابق ظفر آباد میں جو کاغذ بنتے تھے ان کی قسم اور نام یہ تھے (۱) اورنگ غالباً یہ تو وہی اورنگ بہار کے کاغذ کی نقل ہو گا (۲) کشمیری (۳) ہیرا نندی (۴) راسی (۵) سوٹھا (۶) پتنگی۔ غالباً پتنگ کا باریک کاغذ ہو گا (۷) چرکھونا (۸) سلم۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ٹاٹ اور سن اور سرکراسی کو کوٹ کر بھی کا کھار جسے کر پانی میں صاف کر کے یہ کاغذ بنائے جاتے تھے اب ظفر آباد کی آبادی کل ہزار بارہ سو گھروں پر مشتمل ہے، کاغذی شیوخ کہلاتے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے مقالات میں سے خانخاناں عبدالرحیم خان پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں ذکر کیا ہے کہ ابری کاغذ خاص ہندوستان میں خانخاناں کی ایجاد ہے، اور ایک کاغذ عکاسی کی ایجاد کا انتساب بھی خانخاناں کی طرف کیا ہے لیکن مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "کاغذ عکاسی" کا کیا مطلب ہے وہ میری سمجھ میں نہ آیا۔

Marfat.com

علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"مرد ے مراکا غذ ہا سپید داد یکجا جلد کردہ آں را بستدم فوائد شیخ ہم درآنجا ثبت کردم" ص ۱۰۱

جس ملک میں لوگ کتابوں کی جلد بندی سے بھی ناواقف تھے اور دو ورق بھی باہم پیوستہ نہ ہوتے تھے وہاں سادہ کاغذوں کی مجلد بیاضوں کا رواج ہو چکا تھا، اور یہی مجھے عرض کرنا تھا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوستان علمی وکتابی کاروبار اور اس کی مختلف نوعیتوں کے اسباب وادوات، آرائش و زیب و زینت کے لحاظ سے دوسرے اسلامی ممالک سے اگر بڑھا ہوا نہیں تو کم بھی نہ تھا، ملا عبدالقادر کی لوح وجدول نگاری، جلد بندی کے ذیل میں بے ساختہ قلم سے یہ چند زائد چیزیں نکل گئیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ہر جز کا تعلق "تعلیم و تعلم" اور اس کے سازوسامان ہی سے ہے۔

میں دراصل یہ بیان کر رہا تھا کہ مسلمان دینی کتابوں کی کتابت ان کی تصحیح و مقابلہ وغیرہ کے کام کو بھی دین ہی کا ایک جز سمجھتے تھے اور اسی سلسلہ میں ملا عبدالقادر کی قرآن نویسی کا بھی ذکر اس لیے کیا گیا تھا کہ ملا صاحب نے جس نقطہ نظر سے لکھا تھا ۔۔۔ عجب تھا در ۔۔ ن یہ ۔۔ کر یہاں مقصود تھا، اپنی مصحف نگاری کے مندرجہ بالا تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

اُمید کفارۂ کتابہائے گذشتہ کہ چوں اعمال بندہ سیاہ ست گردیدہ مونس ایام حیات و شفیع بعد ۔۔ت گردد وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ (منتخب ص ۳۹۴)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اکبر کے حکم سے جن مزخرفات کے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا کام محض ملازمت اور بادشاہ کے خوف سے ان کو کرنا پڑا تھا، اسی کے کفارہ کی ایک صورت ملا صاحب نے یہ نکالی تھی اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ مسلمان اس کام کو ایک اہم دینی خدمت سمجھتے تھے، ملا صاحب بیچارے نے اپنے اس کام سے کفارہ کے سوا اس کی بھی توقع کی ہے کہ زندگی میں اس سے انس حاصل کرونگا، اور اُمیدوار ہوئے ہیں کہ مرنے کے بعد ان ہی حروف قرآنی کی شفاعت اور سفارش سے ان کی نجات ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ صحیح حدیث کے رو سے قرآن کی تلاوت کا اثر یہ بتایا گیا ہے

کہ وہ میدانِ قیامت میں بادلوں کی شکل میں یا پرندوں کے پرے کی شکل میں پڑھنے والے کے سر پر سایہ فگن ہونگے، تو قرآن لکھنے والے اسی قسم کی توقع اپنے مکتوبہ حروف سے اگر قائم کریں تو کیا تعجب ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ اسلامی علوم کے مصنفین اپنی کتابوں میں قرآن کی آیتیں جو جا بجا استعمال کرتے ہیں، ان کے لیے بھی اس میں بشارت ہے وانما الاعمال بالنیات آپ دیکھ چکے کہ ہمارے اسلاف تو قرآن کی کتابت ہی نہیں صرف تصحیح کو بھی ایک مستقل عبادت کی حیثیت سے اختیار کرتے تھے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں قرآن کی بھی کوئی خصوصیت نہ تھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب المتقی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

کتابے کہ نادر الوقوع کثیر النفع می بود کہ بسبب عدم تداول از حلیہ صحت عاطل گشتہ اصول نسخ آں را حتی الوسع ہر جا الممکن بہم رسانیدہ صورت تصحیح می دادند۔ (ص ۲۷۲ - اخبار)

یعنی قرآن کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہر کتاب جو شیخ کے نقطۂ نظر سے نفع بخشی میں اہمیت رکھتی تھی، لیکن بے توجہی یا عدم استعمال کی وجہ سے صحت سے محروم ہو گئی تھی، ان کے "اصولِ نسخ" یعنی تلاش کر کے اصل نسخے شیخ بہم پہنچاتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا ان کی تصحیح میں کوشش کرتے تھے، گویا آج یورپ میں پرانی کتابوں کے ایڈٹ کرنے کا جو عام طریقہ جاری ہے، مختلف قدیم نسخے مہیا کیے جاتے ہیں، اور سب سے مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا جاتا ہے جس کے معاوضہ میں مصححین کافی معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو صرف اسی تصحیح و مقابلہ کے صلہ میں جو کسی پرانے نسخہ کے متعلق کوئی انجام دیتا ہے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لوگوں کو مل رہی ہیں۔ لیکن سُن رہے ہو مسلمان بغیر کسی معاوضہ کے محض حسبۃً للہ "نادر الوقوع کثیر المنافع" کتابوں کے ایڈٹ کرنے کے کام کو بھی دین ہی کا کام سمجھ کر کرتے تھے

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ شیخ عبدالوہاب متقی کا یہ کوئی ذاتی مذاق تھا۔ اسی ہندوستان کے ایک دوسرے بزرگ سید ابراہیم دہلوی جن کے کتب خانہ کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ بقول شیخ محدث "بیرون از حد حصر و ضبط بود" ان کا بھی مشغلہ جیسا کہ شیخ ہی نے لکھا ہے یہ تھا کہ

Marfat.com

مکتب بسیار از ہر علم مطالعہ کردہ و تصحیح فرمودہ و مشکلات را چناں حل کردہ کہ ہر کرا ادنی مناسبتے باشد نظر در کتاب او کافی ست و احتیاج استاد نیست" ص ۲۵۰۔

پہلے زمانہ میں اسی کام کا نام "کتاب بنانا" تھا، میں نے پہلے بھی کسی صاحب کا ذکر کیا ہے کہ ان کے کتب خانہ کی کتابیں سب بنائی ہوئی تھیں۔ لیکن بظاہر ان کا کام صرف درسی کتابوں تک محدود تھا، لیکن سید ابراہیم صاحب کے یہاں درسی وغیر درسی کی خصوصیت نہ تھی۔

کچھ یہ نہ خیال کیا جائے کہ عام اہل علم ہی تک یہ مذاق محدود تھا قرآن ہی نہیں حدیث کی ضخیم ضخیم کتابوں کی خدمت اس زمانہ کے نامی گرامی امراء وقت بھی سرمایۂ سعادت خیال کرتے تھے، مولانا آزاد نے ایک محمد شاہی امیر روح الامین خاں کے متعلق جو بلگرام کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کے معرکہ میں بالآخر وہ شہید بھی ہوئے، ان ہی کے ترجمہ میں یہ بتاتے ہوئے کہ "ہمیشہ صاحب با طبل و علم و خیل و حشم زیست و چندے بہ حکومت بست و دو محال عمدہ پنجاب کرسیالکوٹ و جالندھر جملہ است پرداخت" لیکن اس طبل و علم و خیل و حشم کے ساتھ، اور پنجاب کے ایک بڑے علاقہ کی گورنری کے مشغلوں کے باوجود انہوں نے نیکیوں اور سعادتوں کے سمیٹنے کا ایک ذریعہ یہ بھی بنا رکھا تھا، جیسا کہ مولانا آزاد ہی راوی ہیں۔

در پایانِ عمر کہ سن شریفش از ہفتاد تجاوز نمود صحیح بخاری و مسلم را بدست خود کتابت کردہ محشی ساخت ۲۸۸

روح الامین خاں بلگرام ہی کے رہنے والے ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کا یہ بیان ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے۔ ستر سال کی عمر ہے، اور بخاری و مسلم جیسی ضخیم کتابوں کی کتابت کرتے ہیں، صرف کتابت نہیں، بلکہ "محشی ساخت" دونوں پر حواشی بھی لکھتے ہیں۔ اور یہ تھی پیرانہ سروں کی جواں ہمتی، بوڑھاپے کی علمی اولوالعزمیاں اور اس پر کمال یہ ہے کہ اس عمر کے بعد درجہ شہادت سے بھی فائز ہوتے ہیں، اُن قوموں کو جب زندگی بخشی جاتی ہے، تو پھر ان سے کیسے کیسے آثار نمایاں ہوتے ہیں، اور جب موت طاری ہوتی ہے تو اس کی افسردگیاں بھی کتنی دردناک ہوتی ہیں۔

Marfat.com

اور روح الامین خاں کا واقعہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کے لکھنے لکھانے کا ایسا معلوم ہوتا ہے امراء کے عام طبقہ میں ایک عام ذوق پایا جاتا ہے۔ خود مولانا غلام علی آزاد کے حقیقی نانا میر عبدالجلیل بلگرامی جن کا شمار عالمگیری امراء میں تھا، مدت تک سندھ میں بھکر اور سیوستان کی وقائع نگاری[1] جیسی اہم خدمت ان کے سپرد رہی۔ فرخ سیر کے آغاز حکومت تک۔ مگر باوجود اس شوکت واُبہت امارت ودولت کے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میر عبدالجلیل صاحب نے صحیح بخاری کا ایک نسخہ اپنے لیے لکھوایا تھا لیکن ابھی اس نسخہ کی تصحیح ومقابلہ کا موقع نہ ملا تھا کہ اپنی خدمت سے وہ معزول ہو کر سندھ سے روانہ ہو کر دلی چلے۔ معزولی کی وجہ یہ تھی کہ سندھ میں نباتِ سعید کا مزہ رکھنے والے اولوں کے برسنے کی خبر انہوں نے بادشاہ کو دی تھی۔ وزیر کو بدگمانی ہوئی کہ بادشاہ کو صرف خوش کرنے کے لیے میر صاحب نے یہ واقعہ گھڑا ہے اسی لیے معزولی کا حکم بھیج دیا۔ بہرحال مجھے تو اس ذوق اور والہانہ تعلق کا ثبوت پیش کرنا ہے، جو مسلمانوں کو علم ودین کی کتابوں سے تھا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ سندھ سے چلے تھے اپنی چھوٹی ہوئی ملازمت اور وہ بھی کیسی ملازمت قریب قریب اس کی وہی حیثیت تھی جو آج کل ریاستوں میں رزیڈنٹوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی ملازمت پر دوبارہ بحالی کی کوشش کرنے کے لیے، لیکن بخاری کی تصحیح ومقابلہ کا کام رہ گیا ہے۔ اس کا خیال آیا، اور سندھ سے نکل کر نوشہرہ پہنچے تھے کہ وہیں محض بخاری کے اس کام کے لیے خیمہ زن ہو گئے۔ مولانا کے الفاظ

[1] شاہی عہد کا یہ ایک بڑا اہم عہدہ تھا، ہر علاقہ میں ایک خاص سررشتہ وقائع نگاری کا قائم تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ بادشاہ اپنے ملک کے ہر علاقہ کے حوادث وواقعات سے براہ راست واقفیت حاصل کر کے اپنے آپ کو پورے ملک کے ساتھ وابستہ رکھے، گویا وقائع نگار بادشاہ وقت کی آنکھیں ہوتے تھے جو ملک کے ہر واقعہ پر اسی ذریعہ سے ٹکٹکی باندھے رکھتی تھیں۔ چونکہ وقائع نگار روز روز کے واقعات کی رپورٹ بعینہ راز آستانۂ شاہی تک کیا کرتا تھا، اس لیے علاقہ کے تمام حکام وولاۃ وقضاۃ سب پر ان کی نگرانی قائم رہتی تھی، وہ کسی کا محکوم نہیں ہوتا تھا، لیکن دوسرے اپنے آپ کو ان کے دباؤ میں پاتے تھے، اسی لیے اس عہدہ کے لیے کسی ایسے آدمی کا انتخاب ہوتا تھا جو دل ودماغ عقل ودین دونوں میں کمال رکھتا ہو، علاقہ کے نوابوں جاگیرداروں حکام سے کوئی کمزوری سرزد ہوتی تھی، تو ان کا پہلا کام یہی تھا کہ وقائع نگار کو ہموار کیا جائے، ہزاروں اور لاکھوں کی رشوتیں پیش ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد بھی اپنے نانا کے ساتھ کبھی کبھی سندھ میں رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ احمد یار خاں زمیندار نے ایک شخص کو بلاوجہ قتل کر دیا تھا نانا صاحب کے پاس خطیر رقم لے کر حاضر ہوا کہ رپورٹ شاہی دربار میں اس واقعہ کی نہ کی جائے۔ لیکن اس عہدہ کے لیے (باقی بر صفحہ ۱۰۳)

یہ ہیں :-

"آں جناب بہ عزم شاہ جہاں آباد خیمہ را بہ نوشہرہ کہ موضعے ست در سواد بھکر برآوردند و محض برائے مقابلہ صحیح بخاری شش ماہ مکث کردند"
قیام ۱۲

اس ذوق کی کوئی انتہا ہے، دوسرا آدمی کہتا تو شاید اُسے مبالغہ خیال کیا جاتا، لیکن مولانا آزاد تو ان کے حقیقی نواسے ہیں، خود اس سفر میں ان کے ساتھ تھے ۔ اتنی بڑی اہم نوکری کا معاملہ ہے، چاہیے تو یہی تھا کہ ہانپتے کانپتے کسی طرح دار السلطنت پہنچ کر اپنے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے، لیکن ان بے نیازیوں کو دیکھتے ہو، جو دین اور علم نے ان بزرگوں میں پیدا کیا تھا۔ جانتے ہیں کہ وزیر اعظم مخالف ہے، اسی کے مشورہ سے بادشاہ نے معزول کیا ہے۔ ساری عزت و آبرو کا دار مدار اسی عہدہ پہ ہے، جس سے اچانک محروم ہونا پڑا ہے۔ تاخیر میں ہر طرح کے احتمالات قدرتی طور پر دماغ میں آتے ہونگے، لیکن دل کی ٹھنڈک سے ساری دماغی شورشوں کی تلافی ہو رہی تھی، نوشہرہ کے سواد میں اُتر جاتے ہیں، اس قصد سے اُتر جاتے ہیں کہ بخاری کی تصحیح و مقابلہ کا رُکا ہوا کام پورا ہولے، تب دیکھا جائیگا جو ہوگا، صرف یہی نہیں، بلکہ ظاہر ہے کہ وہ امیر کبیر تھے، کوئی غریب آدمی تو تھے نہیں کہ کسی مسجد میں اُتر گئے تھے، خیمہ خرگاہ اور اُس کے لوازم سب ساتھ تھے، مولانا آزاد رقمطراز ہیں :-

"چوں توابع و لواحق بسیار در رکاب بود مبالغ الوف بہ صرف در آمد"
نوکر چاکر ۱۲ — ہزار ہا ہزار ۱۲

خدم و حشم، پیادوں، دوندوں کے ساتھ ایک اجنبی مقام میں چھ چھ ماہ تک رئیسانہ نوابی زندگی پر جو خرچ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اس والہانہ اور عاشقانہ کیفیت میں علم کے سوا دینی جذبہ کا بھی کافی اثر ہمیں ماننا چاہیے تھا، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر صاحب کے سامنے یہ یک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲) ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا۔ اگر ان نقرئی و طلائی زنجیروں سے ان کا ہاتھ باندھا جا سکتا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں وقتی طور پر میر صاحب کو وزیر اعظم نے اس لیے معزول کر دیا تھا کہ سندھ میں اولے برسے تھے چکھنے والوں نے چکھا تو بالکل نبات سفید کا مزہ تھا، واقعہ تھا لکھا گیا۔ وزیر کو اس خبر پر اعتبار نہیں ہوا اور اُس نے محض اس ایک خبر کی وجہ سے معزولی کا فرمان بھجوا دیا۔ اس سے اس عہدہ کی نزاکت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۱۲۔

Marfat.com

کرشمہ دو کار کا بھی نکتہ ہو، اس لیے کہ مسلمانوں میں سلفاً عن خلفٍ ایک تجربہ کی بات یہ رہی ہے کہ حل مشکلات میں بخاری شریف کے ختم کو بالخاصیت دخل ہے۔

دوسرے مورخین نیز حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بستان المحدثین میں لکھا ہے کہ تاتار کا وہ فتنۂ ہائلہ جس نے اسلامی ممالک کو ساتویں صدی میں اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روند ڈالا تھا، فتنہ کا یہ سیلاب ترکستان، خوارزم، بخارا، ایران و عراق حتیٰ کہ پایۂ تختِ خلافت دارالسلام بغداد کو برباد کر چکا تھا، عباسی خلیفہ مستعصم ہولاگو کے ہاتھوں شہید ہو چکا تھا جب اسی سیلاب نے شام کی طرف رُخ کیا تو اُس وقت جیسا کہ شاہ صاحب ارقام فرماتے ہیں۔

"چوں ہنگامۂ تتار رعد اد و افواج ستم امواج آں اشقیاء بدیار شام توجہ نمود حکم سلطانی نفاذ یافت کہ علماء جمع شدہ ختم صحیح بخاری بخوانند" (بستان المحدثین ص ۲۷)

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ابھی ختم میں ایک دن باقی تھا کہ مشہور محدث امام حضرت علامہ تقی الدین ابن دقیق العید[1] جامع مسجد تشریف لائے، اور ختم کرنے والے علماء سے پوچھا کہ بخاری کیا ختم ہو گئی، عرض کیا گیا کہ "یک میعاد باقیست" لیکن ختم بخاری کے نسخہ کا مسلمانوں کو جو ہمیشہ سے تجربہ تھا آج بھی وہی سامنے تھا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ نے کشفاً اعلان کیا:۔ "مقدمہ فیصل شد دی روز وقت عصر فوج تتار شکست فاحش خوردہ برگشت و مسلمانان در فلاں صحرا متصل فلاں بکمال خوشی و خرمی مقام کردند"

دراصل معرکہ کا میدان دمشق سے سیکڑوں میل دور تھا، شامی فوج آگے بڑھ کر دشمنوں کو روکنے کے لیے بھیجی گئی تھی، شیخ کا یہ ایک کشفی بیان تھا، لوگوں نے عرض کیا "ایں خبر را شائع بکنیم" شیخ

[1] یہ شیخ ابن دقیق العید ان چند استثنائی ہستیوں میں ہیں جن میں عقل کے ساتھ علم، اور علم کے ساتھ دین اور دین کے ساتھ اخلاص یہ سارے صفات جمع ہو گئے تھے۔ علامہ ذہبی جو ان کے دیکھنے والوں میں ہیں "تذکرۃ الحفاظ" میں ان کا بسیط تذکرہ درج کیا ہے خود اپنی رائے بھی قلم بند کی ہے۔ "کان من اذکیاء زمانہ واسع العلم کثیر الکتب مدیما للسہر مکبا علی الاشتغال ساکنا وقورا ورعا قل ان تری العیون مثلہ" اپنے وقت کے بڑے ذکی آدمیوں میں تھے علم ان کا وسیع تھا، کتابوں کا کافی ذخیرہ اپنے پاس رکھتے تھے، شب بیداری کے پابند تھے، ہمیشہ مشغول ہی رہتے تھے۔ بھاری بھرکم مطمئن دل والے تھے، بڑے پرہیزگار، آنکھوں نے ان جیسی ہستیوں کو کم ہی دیکھا ہی (باقی برصفحہ ۱۰۵)

Marfat.com

نے اجازت دے دی، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "بعد چند روز مطابق در برید (ڈاک) سلطانی رسید" ص ۳۹۔

حقیقت یہ ہے کہ بخاری کے ختم کا یہ ایسا تجربہ ہے، جس کا مشاہدہ خود مجھے بھی اپنے ایک دوست کے سلسلہ میں ہوا، عقلی طور پر ایک ایسا کام جو بہ ظاہر ناممکن تھا، میرے سامنے اس کا ظہور ہوا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ان کے والد جو ایک صاحب دل عالم تھے اُنہوں نے بخاری شریف کا ختم کیا تھا۔ پس کیا تعجب ہے کہ میر عبد الجلیل صاحب کے سامنے یہ بات بھی رہی ہو اور ہوا بھی یہی کہ دِلّی پہنچنے کے ساتھ ہی بغیر مزید کدوکاوش کے غلط فہمی رفع ہو گئی، اپنے منصب پر بحالی کا فرمان ان کو مل گیا۔

خیر اس واقعہ میں تو آپ کو علم سے زیادہ دین کا دباؤ نظر آتا ہے، گو میرے نزدیک حقیقی علم ہی کا نام دین ہے اور سچے دین ہی کی تعبیر علم صادق سے کی جاتی ہے، مگر اسی زمانہ میں اسی ہندوستان میں ہم نوشہرہ کے سواد میں مغل دربار کے اگر ایک امیر کبیر کو تصحیح و مقابلہ بخاری میں مشغول پاتے ہیں، تو ٹھیک انہی دنوں میں مرشد آباد بنگال میں دریائے بھاگیرتی کے کنارے ایک شاہی محل میں ایک امیر عالم کو پاتے ہیں کہ وہ فلسفہ و حکمت کی سب سے نادر کتاب جو میرے نزدیک تو شفا و اشارات شرح حکمۃ الاشراق جیسی اساسی کتابوں سے بھی زیادہ اہمیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴) اور قطب الدین الحلبی کے حوالے سے بھی ان کی رائے یہ نقل کی ہے "لم یر فی عصرہ مثلہ" (اپنے وقت میں ان کے جوڑ کا آدمی نہ دیکھا گیا) ۶۲۵؁ھ ہجری میں بہ مقام ینبع (حجاز) میں پیدا ہوئے، اپنے عہد کے اساتذہ سے علوم دینیہ خصوصاً حدیث و فقہ و اصول حاصل کیا، مصری حکومت اصرار کر کے مصر کے قضاء القضاء (چیف جسٹس) کے عہدہ پر مقرر کرتی رہی، لیکن ہر چند سال کے بعد استعفا داخل کرتے تھے عموماً یہ اس صورت میں ہوتا تھا جب حکومت دین کے معاملہ میں کچھ مداہنت سے کام لینا چاہتی تھی۔ ارض فرعون (مصر) کے سلاطین پر اتنا اثر تھا کہ شیخ جب کسی ضرورت سے بادشاہ کے پاس جاتے تعظیم کے لیے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنی جگہ چھوڑ دیتا تھا، شیخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ لکھی ہے کہ "کان کثیر الشفقۃ علی المشتغلین کثیر البر لہم" (یعنی اپنے شاگردوں پر بڑے مہربان تھے، ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے) ۷۰۲؁ھ میں ستتر کی عمر پا کر وفات پائی۔ شیخ نے اگرچہ کم کتابیں لکھی ہیں۔ اور جو کچھ لکھا ہے ان میں بعض کی تکمیل نہ ہو سکی تاہم ان کی کتاب "الالمام فی الاحکام" جو غیر مکمل ہے اس سے ان کی جلالت شان اور اجتہادی نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے عجیب بات ہے کہ لوگ ان کو "المالکی الشافعی" دونوں نسبتوں کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۳۶۲)

Marfat.com

رکھتی ہو یعنی مجلس اخوان الصفا کے فلسفیانہ رسائل کے ساتھ بجنسہ اسی خدمت میں مصروف ہے جو بخاری شریف کی میر عبد الجلیل صاحب فرما رہے تھے۔ طباطبائی نے سیر المتاخرین میں ایک شیعی عالم میر سید محمد علی کا ذکر کیا ہے، یہ اورنگ آباد دکن کے مولود تھے مگر نسلاً ایرانی تھے۔ ہندوستان سے ایران جا کر اجتہاد کی سند لائے تھے، دکن کی آب و ہوا، اور یہاں کا اُس وقت کا ماحول ظاہر ہے کہ ان کے مناسب حال نہ تھا، اس لیے مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے، بالآخر وہ اس زمانہ کے مشہور ناظم بنگالہ علی وردی خاں مہابت جنگ کے شیعی دربار میں پہنچ گئے۔ جیسا کہ چاہیے تھا، وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی علی وردی خاں جو ناظم کیا بنگال و بہار و اُڑیسہ کا مطلق العنان فرمانروا تھا اس نے ان کے لیے بیش قرار وظیفہ جاری کر دیا، اور دریائے بھاگیرتی مرشد آباد جس کے ساحل پر ہے لب دریا ان کو عالی شان شاہی محل رہنے کے لیے عطا ہوا، مہابت جنگ روزانہ کافی "(شیعہ حدیث) کی کتاب کا درس بھی ان سے لیتا تھا۔

لہ طباطبائی نے لکھا ہو کہ سید محمد علی جب ایران سے اورنگ آباد پہنچے تو "ناصر جنگ ناظم دکن (یعنی آصف جاہ ثانی شہید رحمۃ اللہ علیہ) تکلیف ماندن کرد لیکن بربنا فساد وضاع او قبول نکرد و از آنجا بحیدر آباد و در آنجا چندے قیام کردہ از راہ سیکاکول بہ بنگالہ" (ج ۳ ص ۶۱۰) افسوس ہو کہ سلاطین آصفیہ کے ساتھ سیر المتاخرین کا مصنف محض مذہبی تعصب کی بنیاد پر موقعہ بے موقعہ چوٹ کرنے سے نہیں چوکتا، کبھی حضرت آصف جاہ انار اللہ برہانہ کو دنیادار زمانہ شناس اور خدا جانے کن کن الفاظ سے یاد کرتا ہو، یہاں بھی ناصر جنگ شہید جن کے حالات مولانا آزاد نے اپنی چشم دید گواہیوں سے جو لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ ایک معارف نواز، دین پرور بادشاہ تھے۔ غالباً اُن کے تسنن کی تعبیر طباطبائی نے "فساد اوضاع" سے کی ہو۔ حالانکہ خود اقرار کرتا ہو کہ میر محمد علی جو ایک شیعہ عالم تھے مگر باوجود شیعہ ہونے کے صرف علمی قدردانی تھی ناصر جنگ کی، کہ قیام اورنگ آباد پر مصر تھے مگر پھر بھی یہ متعصب مورخ ان کی طرف فساد اوضاع کا انتساب کرتا ہو۔

لہ مغل حکومت کا چراغ سحری جس وقت بجھنے کے لیے جھلملا رہا تھا، اُس وقت اس چراغ حکومت کی چند خاص جاندار کڑوں میں یہ مہابت جنگ، ناظم بنگالہ بھی تھے۔ صاحب سیر المتاخرین مہابت جنگ کے درباریوں میں بھی تھے، اس لیے اپنی کتاب میں ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ بہادری اور استقامت کا ایک دلچسپ واقعہ مہابت جنگ کے متعلق یہ بھی نقل کیا ہو کہ شکار کے لیے اُڑیسہ کی طرف غالباً گئے ہوئے تھے، فوج جو ساتھ تھی پانچ چھ سو سے زیادہ نہ تھی، اچانک معلوم ہوا کہ مرہٹوں کی برگی نے حملہ کر دیا ہو، مہابت جنگ خیمہ میں تھے حکم دیا کہ ہاتھی کس کر لایا جائے، لوگوں پر بدحواسی طاری تھی لیکن مہابت جنگ اطمینان سے مقابلہ کے لیے تیار ہوئے، ہاتھی آگیا۔ سیڑھی لگائی گئی، (باقی بر صفحہ ۱۰۷)

گر فلسفہ و منطق ہی سہی، بخاری نہ سہی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ باایں ہمہ عیش و عشرت، دولت و امارت میر محمد علی کے جو مشاغل مرشد آباد میں تھے اس کا اندازہ آپ کو طباطبائی ہی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔

کتاب اخوان الصفا و خلان الوفا کہ در حکمت است چندیں نسخہ فراہم آوردہ باکمال تنقیح و تحقیق مقابلہ نمودہ جابجا اکثر عبارات نامناسب و نامفہوم را بعبارت مناسب و قریب الفہم تغیر دادہ من حیث اللفظ والمعنی تسہیل و تصحیح فرمود و چند رسالہ کثیر النفع بر آں افزودہ می تواں گفت کہ تصنیفیست جدید [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) لیکن عجلت میں نواب کی جوتیاں نہیں مل رہی تھیں، لوگ تقاضا کر رہے تھے کہ حضور سوار ہو جائیں۔ مرہٹے بالکل سر پر پہنچ گئے، مگر نواب ٹہلتے رہے جب تک جوتیاں نہ ملیں سوار نہ ہوئے۔ بہرحال مقابلہ ہوا اور حسب دستور مرہٹے بھاگے۔ بعد کو جب پوچھا گیا کہ اس پریشانی کی حالت میں جوتیوں کے پہننے پر کیوں اصرار فرمایا جا رہا تھا تو بولے کہ "بعد تے نے شما خواہید گفت کہ مہابت جنگ از فرط اضطراب کفش پا گزاشتہ بدر رفت" (ج ۲ ص ۵۰۳) یہ چیز بھی مہابت جنگ کے متعلق غالباً قابلِ ذکر ہی ہو کہ اپنے عہد میں اسے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں میں ایک لیڈر خیال کیجیے یا کسی علاقہ کا حاکم۔ بہرحال مہابت جنگ کے متعلق اس کے دربار کے مورخ کی یہ چشم دید گواہیاں ہیں کہ "اغلب دو ساعت بحوثی می بود کہ بر میخواست و از تخلی طہارت فراغت نمودہ شروع بہ نوافل و ادا می فرمود اول صبح نماز واجب ادا کردہ ...." پھر کار دبار حکومت میں مشغول ہوتا۔ "دار آنجا بر آمدہ وضو می نمود و نماز ظہر خواندہ یک جز تلاوتِ کلام الہی کردہ نماز عصر می خواند۔ ص ۶۰۹" خلاصہ یہ ہے کہ فرائض پنجگانہ کے ساتھ تہجد اور تلاوت تک کا پابند تھا۔ کیا مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں اور مسلمان حکام کے لیے اس میں عبرت نہیں ہے۔

[1] میر محمد علی صاحب کا یہ کام علمی حیثیت سے یقیناً قابل قدر ہے خصوصاً چند در رسائل کا اضافہ ان کے کمال کی دلیل ہے واللہ اعلم دنیا میں اب یہ نسخہ پایا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ کس فن کی تکمیل انہوں نے کی ہے اس لیے کہ حکمت و فلسفہ کی تو شاید ہی کوئی ایسی شاخ باقی ہو جس پر کوئی رسالہ اس مجموعہ میں موجود نہ ہو۔ مدرسوں میں اس کے چند اوراق علم الحیوان کے ادبی حیثیت سے رکھے گئے ہیں، طلبہ عام طور سے اسی کو اخوان الصفا سمجھتے ہیں لیکن اصل واقعہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ طبیعیات، الٰہیات، ہیئت، ہندسہ حتی کہ موسیقی تک ہر ایک فن پر مستقل رسالہ اس مجموعہ میں شریک ہے۔ بمبئی میں مدت ہوئی اس کا ایک مجموعہ چھپا تھا لیکن شاید اب وہ بھی نایاب ہے میں نے ایک قلمی نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا تو اس مطبوعہ مجموعہ میں نظر آیا کہ بہت سے رسائل نہیں ہیں۔ مذہبی حیثیت سے ان رسائل کے متعلق لوگوں کا جو خیال بھی ہو، اور اس میں شک نہیں کہ بڑی چالاکی سے اس میں دین کو فلسفہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں میں اس کی حقیقت کھول دی گئی ہے مگر مجھے میر محمد علی کے اس طرز عمل پر تعجب ہے کہ کسی دوسرے کی کتاب میں کسی نامناسب عبارت کو پاکر بجائے اس کی تردید یا نوٹ وغیرہ لکھنے کے (باقی بر صفحہ ۱۰۸)

Marfat.com

عربی زبان میں عقلی علوم کا جو ذخیرہ ہے اس ذخیرہ میں اخوان الصفا کے ان رسائل کے بعد بھی کیا کوئی ایسی کتاب رہ جاتی ہے جسے ان رسالوں پر مزیت حاصل ہو۔ غریب علماء کا نہیں بلکہ اہل علم کے امیر طبقوں میں جب ایک طرف بخاری اور دوسری طرف فلسفہ وحکمت کی چوٹی کی اس کتاب کے ساتھ دلچسپیوں کا یہ حال ہو، سوچنا چاہیے کہ آخر ہندوستان کے اسلامی عہد میں کس قسم کے علوم کی گرم بازاری کی توقع کی جاتی ہے اور ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے، آگے آگے دیکھیے سُنتے ہیں کیا، یہی میر عبدالجلیل صاحب بلگرامی ہیں۔ کچھ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ان کا ذوق علمی صرف بخاری کی حد تک محدود تھا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

کتاب خانہ عظیمے در زمرۂ باقیات صالحات گذاشتہ اند" (ماثر الکرام ص ۲۶۵)

علم بھی ہو، شوق بھی ہو، پھر کتابوں کی فراہمی میں کیا دشواری پیش آسکتی تھی، خصوصاً اسی کے ساتھ جب ہمارے سامنے مولانا آزاد اس شہادت کو بھی پیش کرتے ہیں کہ "اکثر ایں کتب را بدست مبارک خود اصلاح ومقابلہ نمودہ اند" اور صرف یہی نہیں بلکہ "ونسخ بسیار بہ خط خاص خود نوشتہ اند" ذرا "نسخ بسیار" کے الفاظ پر غور کیجیے، وقائع نگاری کی خدمت جلیلہ کے ساتھ نقل کتب کا مشغلہ اس زمانہ میں کیا قابل تصور بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل صاحب غیر معمولی علم وفضل کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے بہترین خطاط بھی تھے، خاکسار نے ان کے خط کے بعض نمونے حیدرآباد میں ایک صاحب کے پاس دیکھے ہیں، کیا پاکیزہ خط تھا۔ خط نستعلیق میں تو ایک خاص طرز کے گویا موجد تھے، خطاطی کے متعلق اپنے ایک شعر میں انہوں نے ایک شاعرانہ دعویٰ بھی کیا ہے فرماتے ہیں:-

دانی کہ خوشنویسی باز از برائے چیست
مائیم واسطی وقلم نیز واسطی

نوشتن کے اس قرن میں اس غریب واسطی قلم کو کون پہچان سکتا ہے، لیکن بجنسہ اپنی اسی خوبی کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۷) اصل کتاب کی عبارت ہی کو بدل دینا بالکل عجیب ہے مسلمانوں کے بعض فرقوں پر یہ الزام ہے کہ وہ دوسروں کی کتابوں میں رد وبدل کر دیتے ہیں۔ اس واقعہ سے تو اس الزام کی کچھ تصدیق ہوتی ہے خصوصاً جب ان کے شدید معتقد کی یہ شہادت ہو، واللہ اعلم ۱۲۔

Marfat.com

وجہ سے جس کی وجہ سے فونٹن قلموں کی قیمت بڑھتے ہوئے چالیس پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے، یعنی نوک کا نہ گھسنا، اسی لیے نوک کے بنانے میں قیمتی چیزیں خرچ کی جاتی ہیں اور قلم کا دام بڑھتا چلا جاتا ہے، مگر مسلمانوں نے خدا جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھا نڈھ کے کلک کی ایک خاص قسم ایجاد کی تھی جسے واسطی قلم کہتے تھے۔ نر انگشت کے برابر تو وہ موٹا ہوتا تھا، اور رنگ گویا ٹھیک چوکلیٹ کا بیچ بیچ میں اس کے پھول جیسی چیزیں قدرتی طور پر نمایاں ہو جاتی تھیں۔ اس قلم کی خوبی یہی تھی، ایک دفعہ بنا لیا گیا پھر اسی قط پر برسوں لکھتے چلے جائیے، کیا مجال ہے کہ حروف میں کچھ تفاوت پیدا ہو۔ بعض خاندانوں میں یہ قلم اب تک تبرک[1] کے طور پر پایا جاتا ہے۔

عجب زمانہ تھا، مسلمانوں نے اس فن کتابت کے ذوق کو کتنا اعزاز بخشا تھا کہ سلاطین وقت بھی خطاطی میں کمال پیدا کرنا اپنی عزت خیال کرتے تھے، پرانی کتابوں پر بعض مشہور بادشاہوں کے قلم کی لکھی ہوئی سطریں نظر پڑتی ہیں تو آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، بیجاپور کی عادل شاہی حکومت

[1] خاکسار کے جد امجد مرحوم مولانا محمد احسن گیلانی بھی بڑے خطاط تھے، نسخ، نستعلیق، شفیعہ، شکست ان چار خطوں میں ان کو کمال تھا، ان کی لکھی ہوئی بعض وصلیاں میرے پاس موجود ہیں، ان ہی کے ترکہ میں واسطی قلم بھی ہے عجیب عجیب قسم کے مسطر، قط زن کی ہڈیاں، دیگر لوازم کتابت واقعہ یہ ہے کہ عہد اسلامی کے کاغذ، روشنائی، دوات، جدول، لوح، جلد بندی ہر ایک ایک مستقل عنوان کا مضمون ہے، دواتوں کے سلسلہ میں پڑھیے، تاریخوں میں ملیگا کہ بادشاہوں کی طرف سے لوگوں کو سنگ لیشب کی دواتیں انعام میں ملتی تھیں۔ غلام محمد ہفت قلمی نے اپنے تذکرہ خوش نویساں میں سید محمد امیر رضوی کا ذکر کرتے ہوئے کتابت کے متعلق ان کی مختلف دستکاریوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "نقاشی ولوح وجدول وصحافی وعلاقہ بندی وسنگتراشی وغیرہ دستگاہے کمال داشت" (ص ۱)، بجز سنگتراشی کے جتنے الفاظ ہیں سب کا تعلق کچھ نوشت وخواند کے متعلقات سے ہے۔ اور سنگ تراشی کا ایک شعبہ مہرکنی وحکاکی وعقیق سازی بھی اسی زمرہ کے ہنر تھے جن کے ارباب کمال اسلامی عہد میں ہر شہر اور قصبہ میں پائے جاتے تھے، میر محمد رضوی کے ذکر میں ایک اور چیز عجب ہاتھ آئی خلاصہ یہ ہے کہ میر اپنی خطاطی میں آقا رشید دیلمی کے متبع تھے، آقا رشید سے آخر میں ان کی عقیدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ساہ زان کا عرس بھی دلی میں انھوں نے قائم کیا تھا، لیکن عرس کیا تھا سنیے "از چند سال عرس آقا عبد الرشید در ماہ محرم مقررہ نمودہ۔ اکثر اساتذہ وخطاطان وغیرہ شاہجہان آباد در مجلس مذکور حاضری شوند وملاقات بیک دیگر مسرور وشادکام می گردند ودرتذکار خطاو خطاطان می گزرانند" ص ۲۰ کتاب مذکور۔ گویا یہ عرس مشرقی نہیں بلکہ Death anniversary (برسی کی تقریب) منائی جاتی تھی۔ عرس کو آج جو کچھ سمجھا جا رہا ہے کیا اس تاریخی اشارہ سے ہم اُسے کچھ ادھی سمجھ سکتے ہیں؟

Marfat.com

کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ جو اپنے خاندانی روایات کے خلاف سُنّی ہو گیا تھا، جس کی قبر کا قبہ اپنی عظمت و جلالت اور حسن کاری کی خصوصیتوں کی وجہ سے بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ اُسی ابراہیم عادل شاہ کے حالات میں لکھا ہے کہ

"اگرچہ درآں زماں خوش نویساں جمع آمدہ بودند لکن بادشاہ بادشاہِ قلمہا بود ثلث و نسخ و نستعلیق وغیرہ را باں درجہ حسن متانت رسانیدہ بود کہ بخط خوش غلماں عصر قلم نسخ کشیدہ (بستان السلاطین۔ ص ۲۰۵)

غالباً سرسری طور پر اِدھر اُدھر سے چنتے۔ یہ معلومات آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، کیا ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد انصافاً اب بھی ہندوستان سے عہد اسلامی کو کتابوں کے لحاظ سے مفلس ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

تعلیمی مضامین

اب میں چاہتا ہوں کہ اس عہد کے ان مضامین کے متعلق بھی تھوڑا بہت تذکرہ کروں جن کی اس زمانہ میں تعلیم دی جاتی تھی، اگرچہ یہ ایک بڑی طویل بحث ہے، لیکن جب اس وادیِ پُرخار میں پاؤں رکھ ہی دیا گیا ہے تو جو شکستہ گسستہ معلومات ہیں ان ہیں پیش کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم سے سردست بحث نہیں ہے بلکہ پیشِ نظر اعلیٰ التعلیم کے مضامین ہیں۔ جہاں

لہ تذکرہ خوش نویسان ہند جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا ہے اس میں میر خلیل اللہ خطاط جو ابراہیم عادل شاہ کے خطاطی میں استاد تھے، لکھا ہے کہ "کتاب نورس تصنیف زمان ابراہیم عادل شاہ میرہ کو ... بادشاہ نیلے محظوظ شدہ مخاطب بہ "بادشاہ قلم" ساخت۔ لیکن کیا صرف خشک خطاب ہی پر قصہ ختم ہو گیا ... کے قدرشناسوں کا حال سُنیے۔ مصنف کتاب لکھتے ہیں" و بر تخت خولشانیدہ و وزراء و سائر ... دست بہ دانش وادہ بخانہ اش رسانیدند۔ (ص ...) گویا خطاب صرف بادشاہی کا دیا گیا تھا تو تھوڑی دیر ہی کے لئے ہی، طریب ... کو واقعی بادشاہ بھی بادشاہ کے بنادیا۔ تخت پر بٹھایا، وزراء، امراء کو ساتھ کیا کہ اس شان کے ساتھ ... تک پہنچا آئیں۔ اللہ اللہ کیا دن تھے۔ ابواسحاق شاہ شیرازی بیوی کے سوا حکومت اور علامت کے ساتھ ... قاضی عضد کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ عہد تغلق نے ہندوستان سے ان کو بلایا تھا اور مواقف کے متن کو چاہا تھا کہ میرے نام معنون کریں۔ علم کا اقبال فن کا عروج کیا اس سے بھی زیادہ بلندی کسی زمانہ میں حاصل کر سکا ہو۔

Marfat.com

تک میرا خیال ہے کہ ہندوستان ہو یا ہندوستان سے باہر اور آج ہو یا کل، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر قابل ذکر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں قرآن (تفسیر) حدیث، فقہ، عقائد کی علمی تعلیم صحبت و بیعت کے ذریعہ سے ہوائے دل کے تازہ واردوں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور سب سے بڑی چیز یعنی للہیت یا اخلاص باللہ میں رسوخ کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں کی گئی ہے، ان پانچ چیزوں سے کسی زمانہ میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام کبھی خالی نہیں رہا[ا]، گویا ان مضامین کی حیثیت موجودہ نصابی اصطلاح کے رو سے لازمی مضامین کی تھی، یہ اور بات ہے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کسی امر کو کسی ملک میں کسی خاص زمانہ میں خاص اسباب و وجوہ کے تحت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہو، مثلاً ہندوستان میں مسلمان جب شروع شروع میں آئے ہیں تو فقہ اور اصول فقہ کے ساتھ تصوف (یعنی وہی صحبت و بیعت کے ذریعہ سے سیرت و کردار کی استواری، عقائد میں استحکام و اخلاص) کا ملکہ پیدا کیا جاتا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس ملک میں ان دو مضامین کے سوا اور دوسرے مضامین مثلاً قرآن و حدیث وغیرہ سے ہندوستان ناآشنا تھا، ناواقفوں سے تو بحث نہیں، لیکن پڑھے لکھوں کی زبان و قلم سے کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جن سے عام مغالطہ پھیلا ہوا ہے، خصوصاً بعض مورخین نے خدا ان پر رحم کرے حضرت نظام الدین سلطان جی کے متعلق کہیں یہ قصہ نقل کر دیا ہے کہ سماع کے مسئلہ میں مولویوں سے بحث ہوئی، اور امام غزالی کے مشہور قول "یجوز لاھلہ ولا یجوز لغیر اھلہ" کو حدیث قرار دے کر مجلس مناظرہ میں پیش کیا گیا، گویا یہی واقعہ اس کی دلیل ہے کہ ہمارا یہ ملک فن حدیث سے بالکل ناواقف تھا۔

[ا] البتہ بعض نادر مثالیں اس زمانہ میں کبھی کبھی ایسی بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس زمانہ میں بھی یک فنی ہوتے تھے، یعنی اس خاص فن کے سوا دوسرا کوئی فن انہیں آتا ہی نہ تھا سلطان المشائخ کی زبانی فوائد الفواد میں منقول ہے کہ دلی میں " دانشمندے (ملا) بود ضیاء الدین لقب در زیر پایہ منارہ درس کردے" ان ہی ضیاء الدین صاحب سے سلطان جی راوی ہیں، کہتے ہیں کہ فن از فقہ و نحو و علوم دیگر ہیچ خبر نداشتم ہمیں علم خلافی (اصول فقہ) آموختہ بود م۔ (ص ۸۸) ۱۲۔

Marfat.com

اِس قصہ میں کس حد تک اصلیت ہے اس کا پتہ تو آپ کو خود آئندہ میرے پیش کردہ واقعات سے چل جائیگا، مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ الزام ہند و علماء ہند کی طرف جو منسوب کیا جاتا ہے، اُس کا تعلق کس زمانہ سے ہے، یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہمارا یہ ملک دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں گونہ نو مسلم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے وطن بنا کر اسلام اس ملک میں چھٹی سو سال بعد غوری انار اللہ برہانہ، کے حملوں اور کامیابیوں کے بعد داخل ہوا. گویا اس حساب سے ساتویں صدی ہجری جو غوری کے غلام قطب الدین ایبک کی بادشاہی کی صدی ہے، یہی اس ملک میں اسلام کی پہلی صدی ہے، ایبک کی تخت نشینی ۶۰۳ھ میں ہوئی. اب کھلی ہوئی بات ہے کہ پچھلی صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تو فن حدیث میں ہندوستان نے وہ مقام حاصل کر لیا جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مقالہ میں کر چکا ہوں، کہ علامہ رشید رضا مصری کو یہ تسلیم کرنا پڑا -

لولا عنایة اخواننا علماء الهند بعلوم	اگر علوم حدیث کے ساتھ ہمارے ہندوستانی بھائیوں کے
الحدیث فی هذا العصر لقضی علیها	علماء کی توجہ اس زمانہ میں مبذول نہ ہوتی تو اسلام
بالزوال من امصار الشرق، فقد	کے مشرقی علاقوں میں اس علم کا خاتمہ ہو جاتا، کیونکہ
ضعفت فی مصر والشام والعراق	مصر، شام، عراق، حجاز سب ہی میں دسویں صدی
والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة	ہجری سے چودھویں تک تو ضعف کمال کو پہنچ گیا تھا
حتی بلغت منتهی الضعف فی اوائل	
القرن الرابع عشر ؎ (مقدمہ مفتاح کنوز السنة)	

رہا شاہ صاحب سے پہلے، تو آپ ہی انصاف کیجیے کہ جس ملک نے اسلام کی آمد کی پہلی صدی

؎ عام اسلامی ممالک کی بے تعلقی فن حدیث سے کس حد تک پہنچ گئی تھی اس کا ایک افسوسناک ثبوت یہ ہے کہ اور تو اور صحاح ستہ کی کتابوں میں سے بھی بعض کتابیں مثلاً ابن ماجہ اور شاید سنن ابی داؤد بھی ہندوستان کے سوا جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی اور اسلامی ملک میں نہیں چھپ سکی ہے اور اس پر بھی ہندوستان ہی حدیث سے بیگانہ ٹھہرایا جاتا ہے ۱۲

کے آغاز ہی میں ایک نہیں متعدد معتبر کتابیں فن حدیث میں پیش کی ہوں، جن میں ایک بخاری کی شرح بھی ہے، اور ایک بخاری کی شرح ہی نہیں، مصباح الدجیٰ، مشارق الانوار[۱]، معرفۃ الصحابہ میں درۃ السحابہ یہ چار کتابیں دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی ہوں کیا اسی ملک پر الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے زمانہ تک تعلق نہیں رکھا، آخر میں نے جن کتابوں کا نام اوپر درج کیا ہے کیا اہل علم نہیں جانتے کہ ان کے مصنف علامہ رضی الدین ابو الفضائل الشہور بہ حسن الصغانی الهندی ہیں، گھر کی مرغی کو آپ جو بھی سمجھ لیں لیکن السیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں لکھا ہے کہ

کان الیہ المنتہی فی اللغۃ — اپنے زمانہ میں لغت کے فن کی انتہا ان ہی پر ہوئی تھی

آج ساری دنیائے اسلام بلکہ یورپ کے مستشرقین کے ہاتھوں میں عربی لغت کی کتاب قاموس جو متداول ہے، کیا واقعی یہ مجد الدین الفیروز آبادی[۲] کا کام ہے۔ اس فن کی کتابوں سے جو واقف ہیں

---

[۱] آہ! غریب مشارق الانوار کو اس کے وطن نے بھلا دیا، قدامت آدمی کو تھکا دیتی ہے، نئی چیز میں لذت ہوتی ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ متن حدیث پڑھانے کے لیے اس سے اچھا مجموعہ منقطوع الاسناد حدیثوں کا شاید ہی پیش کرنا دشوار ہی ہے، اس میں صحیحین سے (۲۲۴۶) دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثوں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا گیا ہے حسن صغانی ہندوستان سے سفارت پر بغداد گئے تھے مستنصر باللہ عباسی خلیفہ کا عہد تھا اسی خلیفہ کے حکم سے حدیثوں کا یہ مجموعہ انہوں نے مرتب کیا جس کا ذکر بھی دیباچہ میں کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ نے یہ کتاب شیخ سے پڑھی تھی۔ خدا نے اس کتاب کو غیر معمولی حسن قبول عطا فرمایا قاسم بن قطلوبغا فیروز آبادی صاحب قاموس، اکمل الدین، بابرتی، ابن الملک کرمانی جیسے علما اس کے شارح ہیں بعض شرحیں چار چار ضخیم جلدوں میں ہیں کشف الظنون میں تفصیل دیکھیے ۱۲۔

[۲] الفیروز آبادی کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے پہلے یہ اپنے نسب کو مشہور امام الاساتذہ ابو اسحاق شیرازی کے نسب سے ملاتے تھے، لیکن لوگوں نے اس انتساب کا اس لیے انکار کیا کہ الاستاذ کی نسل منقطع ہو چکی تھی، لیکن لکھا ہے "وکان لایبالی من ذلک (یعنی لوگوں کے اس طعن کی پروا نہیں کرتے تھے) اور اپنا نسب نامہ ابو اسحاق شیرازی سے ہی ملاتے رہے مگر جب یمن میں ان کو قضا کا عہدہ مل گیا تو" ثم ارتقی فادعی بعد ذلک انہ من ذریۃ ابی بکر الصدیق (یعنی حضرت ابو بکر صدیق کی اولاد سے اپنے کو شمار کرنے لگے۔ وکتب بخطہ الصدیقی (اور اپنے دستخط میں الصدیقی لکھنے لگے۔ ہو سکتا ہے الشیرازی صدیقی ہوں، لیکن معلوم نہیں ابن حجر نے اخیر میں یہ کیوں لکھا " ان النفس تابی قبول ذلک (یعنی دل نہیں مانتا) واللہ اعلم۔ یہ فیروز آبادی بڑے سیاح عالم ہیں اونٹوں پر کتابیں لاد کر ایک اسلامی ملک سے دوسرے ملک میں آتے جاتے رہتے تھے اور وہاں کے سلاطین سے انعام و جوائز حاصل کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آئے تھے۔ بڑی آؤ بھگت یہاں بھی ہوئی، تیمور لنگ نے پانچ ہزار اشرفی نذر پیش کی، بایزید یلدرم کے دربار میں بھی پہنچے تھے وہاں (بقیہ برصفحہ ۱۱۴)

Marfat.com

وہ جانتے ہیں کہ اسی ہندوستانی عالم رضی الدین العلامہ نے "العباب" کے نام سے جو کتاب لغت میں لکھنی شروع کی تھی اُسی کا اور المحکم کا خلاصہ فیروز آبادی نے کر دیا ہے بیچارے ہندی عالم کا کام ناتکمل رہ گیا، یعنی "میم" تک پہنچتے پہنچتے ممات ہوگئی، صرف چند حروف رہ گئے تھے، بس اسی کو ابن سیدہ کی المحکم سے لے کر صاحب قاموس نے خلاصہ کر دیا، صغانی کی کتاب رہ گئی، اور فیروز آبادی کا کام چل نکلا، اور اسی لیے السیوطی کے اس دعوے کا تعلق کسی خاص ملک اور زمانہ سے نہیں بلکہ ساری دنیائے اسلام سے ہے۔ عربی زبان کے اس ہندی لغوی کے بعد جس نے جہاں کہیں بھی عربی لغت پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ایک لحاظ سے صغانی ہی کا زلہ رُبا ہے، ان ہی کی محنت و تلاش، تبحر و اجتہاد کا رہین منت ہے۔

حدیث میں بھی علامہ رضی الدین حسن صغانی کا جو مذاق تھا اُس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے جو مولانا عبدالحیی فرنگی محلی مرحوم نے اپنے طبقات حنفیہ میں حدیث ہی کے متعلق ان کی دو تالیفات کو ان الفاظ میں روشناس کراتے ہوئے یعنی

ومن تصانیفہ رسالتان فیہما الاحادیث الموضوعۃ — ان کی تصنیفات میں دو رسالے اور ہیں جن میں موضوع حدیثوں کو اُنھوں نے جمع کیا ہے۔

لکھا ہے۔

ادرج فیہما کثیراً من الاحادیث الموضوعۃ فعدّ ذلک من المتشددین — اس میں اُنھوں نے بہت سی حدیثوں کو موضوع احادیث کے زیل میں درج کر دیا ہے اسی لیے ان کا شمار سخت گیروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ آخر میں یمن کے قاضی ہو کر وہیں انتقال فرمایا۔ یمن کے بادشاہ الملک الاشرف اسماعیل کے پاس ایک کتاب اپنی ایک طبق میں بھر کر پیش کی، اس نے اس کو چاندی سے بھر کر واپس کیا۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ دو سو سطریں یاد کئے بغیر میں سوتا نہیں۔ ابن سیدہ کی محکم اور صغانی کی عباب دونوں کو ملا کر ساٹھ جلدوں میں لغت لکھی تھی، اسی کا خلاصہ قاموس ہے۔ پھر ایک ہندی عالم علامہ مرتضیٰ نے ۱۰ جلدوں میں تاج العروس کی شرح تاج لکھی۔ گویا قاموس کا یہ کام ہندوستان ہی میں شروع ہوا اور اسی خاک پاک کے ایک فرزند کے ہاتھ سے عربی لغت کی یہ مشہور و معروف کتاب ختم ہوئی اور پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عربی کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ۱۲

کا ابن الجوزی   میں ہے جو ابن جوزی کا حال ہے کہ بخاری تک میں ۲ حدیثوں پر ان کو وضع کا شبہ ہے،
علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں بھی ان کی دونوں کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی تنقید میں ان کا معیار بہت سخت تھا۔ آخر تشدد میں جسے ابن جوزی کا مماثل خیال کیا جاتا ہو جنہوں نے بیچارے امام بخاری کو نہیں بخشا ہے اس کی تنقید کی معیاری بلندی کیا کم ہوسکتی ہے۔ بہرحال رضی الدین صغانی تو اسلامی ممالک میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ان کی کتاب مشارق عام اسلامی ممالک میں مدت تک زیرِ درس رہی، لیکن دلّی میں یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اس وقت وہی ایک ممتاز عالم تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا، جن کا زمانہ صغانی کے قریب ہی قریب ہے بلکہ لقاء ثابت نہ ہو تو معاصرت یقینی ہے، دلّی کے علمی ماحول کی صغانی کے زمانہ میں کیا حالت تھی فرماتے ہیں کہ

دراں ایام در حضرت دہلی علماء کبار بودند باہمہ (صغانی) در علوم متساوی بود اما در علم حدیث از ہمہ ممتاز و ہیچ کس مقابل او نبود (فوائد الفواد ص۱۰۱)

ان دنوں میں بڑے بڑے علماء دلی میں تھے جو علوم میں صغانی کے مساوی تھے، لیکن صغانی کو علم حدیث میں سب پر امتیاز حاصل تھا، اس علم میں ان کا مقابل کوئی دوسرا نہ تھا۔

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ لغت و ادب میں صغانی کے جوڑ کے لوگ دلّی میں موجود تھے، بلکہ یہی کہ حدیث سے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ بیگانہ تھے، یہ صحیح نہیں ہے، البتہ صغانی کا ہم پلّہ محدث کوئی نہ تھا۔

اور یہ رپورٹ تو ہندوستان میں اسلام کی پہلی صدی کے نصف کی ہے یعنی سنہ ۶۵۰ھ جو صغانی کی وفات کا زمانہ ہے۔ اسی کے بعد حضرت نظام الاولیاءؒ کی عجیب و غریب خانقاہ قائم ہوتی ہے، جس

۱؎ چونکہ صغانی کی وفات سنہ ۶۵۰ھ میں بمقام بغداد ہوئی جب وہ دلّی دربار کی طرف سے سفیر بن کر بغداد گئے، اس لیے یقینی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا زمانہ پایا ہوگا۔ کیونکہ آپ کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی، غالباً لقاء ثابت نہیں۔ بہرحال فوائد الفواد میں آپ نے شاید اپنے اساتذہ ہی سے یہ بات سنی ہوگی جو نقل فرمایا ہے کہ "اگر حدیثے برا و مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را در خواب دیدے و صحیح کردے" (ص۱۰۳) ممکن ہے کہ الصغانی کی شکایت جن لوگوں نے تشدد کی ہے اس میں کچھ اس واقعہ کو بھی دخل ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلطان المشائخ نے ۲؎

۲؎ صغانی کی کتاب مشارق مولانا کمال الدین زاہد سے پڑھی تھی۔ اور مولانا کمال الدین الزاہد نے مولانا برہان الدین بلخی سے بلخی نے خود صغانی مصنف کتاب سے، گویا سلطان المشائخ اور صغانی کے درمیان صرف ۲ واسطے ہیں۔

Marfat.com

ہیں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا اجتماع ہو جاتا ہے، مجلسِ سماع کا ایک معمول واقعہ تو وہ ہے جو عوام میں کیا افسوس ہے کہ خواص میں بھی کلّی نتائج کا ذمہ دار ہے لیکن ہم آپ کے سامنے ایک چشم دید شہادت اس عہد کی پیش کرتے ہیں۔ سیر الاولیا حضرت سلطان جی کے حالات میں ایک معتبر کتاب ہے۔ اس کے مصنف امیر خورد کرمانی ہیں جنہوں نے خانقاہ نظامیہ کے علماء کی نگرانی میں تربیت و تعلیم حاصل کی ہے، اس لیے حضرت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے قریب قریب دیکھ کر لکھا ہے، اسی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ میر خورد نے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کی خانقاہ معارف پناہ میں جن علماء کا اس زمانہ میں اجتماع ہو گیا تھا، ان میں ایک مشہور عالم حضرت مولانا فخر الدین زرادی بھی ہیں، مدرسوں میں صرف کی ایک کتاب زرادی انہی کی طرف منسوب ہے، میر خورد کہتے ہیں کہ

"والد کاتب ایں حروف رحمۃ اللہ علیہ نزدیک خانہ سلطان المشائخ بکرایہ ستدہ بود و درس ساختہ و متعلمان خوب طبع را جمع گردانیدہ تا کاتب حروف چیزے بخواند" (سیر الاولیا ص ۲۰۸)

گویا میر خورد کے والد نے حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ سے متصل ایک چھوٹا سا مدرسہ ہی قائم کر دیا تھا، اس مدرسہ میں خانقاہ کے علماء مختلف اوقات میں ایسا معلوم ہوتا ہے آکر درس دیا کرتے تھے، امیر خورد کہتے ہیں کہ چاشت کی نماز کے بعد مولانا فخر الدین ہدایہ کا درس دیا کرتے تھے ایک

---

[1] یوں تو خدا جانے دلّی کی علم خیز معارف بیز خانقاہ میں کتنے علماء جمع ہو گئے تھے لیکن جن کے تراجم کتابوں میں ملتے ہیں ان میں شمس الدین یحییٰ، مولانا حسام الدین ملتانی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہ الدین یوسف کلاکھری، مولانا سراج الدین عثمان، مولانا وجیہ الدین پائلی، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا فصیح الدین، مولانا فخر الدین مروزی، مولانا جمال الدین، مولانا جلال الدین اودھی، خواجہ کریم الدین سمرقندی، قاضی شرف الدین فردؔ، مولانا بہاء الدین ادہمی، مولانا ضیاء الدین شیرازی وغیرہم حضرات اپنے وقت کے غیر معمولی علم و عمل کے نمونے تھے ان بزرگوں میں سے بعضوں نے ہندوستان کے بعض صوبوں میں اسلام کی مستقل تاریخ پیدا کی ہے۔ مگر ہندوستان جاہل تھا اس لیے کہ اسلام یہاں براہِ عرب نہیں بلکہ براہ خراسان آیا تھا۔ گویا بخاری، ترمذی، ابو داؤد سجستانی، امام مسلم نیشاپوری صحاح ستہ کے یہ سارے مصنفین عربی ممالک کے حضرات تھے؟ یورپ ایک نظریہ گھڑتا ہے، کسی نہ کسی راہ سے مسلمانوں میں اسے پھیلا دیتا ہے، پھر نسلیں گزرتی جاتی ہیں جو کچھ یورپ نے پھیلا دیا اس میں شک کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی۔

Marfat.com

دن کا واقعہ جو خود ان کی آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے درج کرتے ہیں کہ مولانا حسب دستور ہدایہ پڑھا رہے تھے کہ

"روزے ان عالم ربانی مولانا کمال الدین سامانی کہ از مشاہیر علمائے شہر بود بدین سلطان المشائخ آمد چوں از خدمت سلطان المشائخ بازگشت سبب فرط اتحاد یکہ بخدمت مولانا فخر الدین داشت دریں مجلس حاضر شد" (سیر الاولیاء ص ۲۶۸)

یعنی کمال الدین سامانی کوئی غیر حنفی عالم تھے یا کیا قصہ تھا؟ اس لیے کہ اس زمانہ میں علماء احناف کے سوا اس ملک میں شوافع وغیرہ بھی موجود تھے۔ سلطان المشائخ کے زمانہ میں اودھ کے شیخ الاسلام مولانا فریدالدین نامی بھی شافعی المذہب مشہور عالم تھے، علاء الدین نیلی ان ہی کے شاگرد تھے، اخبار الاخیار میں نیلی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

پیش مولانا فریدالدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود کشاف خواند (ص ۹۳)

صاحب سیر الاولیاء نے بھی ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ "در حیات سلطان المشائخ دانشمندے (عالمے) بغدادی مالکی مذہب در غیاث پور (دلی) رسید" (سیر الاولیاء ص ۲۹۶) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفی علماء کے سوا دوسرے مذاہب کے علماء سے ہندوستان بالکلیہ خالی نہ تھا، بہرحال کوئی وجہ ہوئی ہو، مولانا کمال الدین کو دیکھ کر ہدایہ پڑھانے کا طریقہ مولانا فخر الدین نے عجیب طریقہ سے بدل دیا، میر خورد لکھتے ہیں کہ

"چوں خدمت مولانا کمال الدین دید احادیث تمسکات ہدایہ را ترک دادہ" (سیر ص ۹۳)

یعنی حنفی مذہب کے مسائل کی تائید میں صاحب ہدایہ جن حدیثوں کو عموماً پیش کرتے ہیں مولانا فخر الدین نے ان حدیثوں سے استدلال کرنا ترک کر دیا، پھر کیا کرنے لگے جس ملک کو خود اسی ملک کے رہنے والے آج جہل و نادانی کے الزام سے رسوا کر رہے ہیں، اسی ملک میں آج سے چھ سو سال پہلے یہ تماشا دیکھا جا رہا تھا کہ "تمسکات ہدایہ ترک دادہ باحادیث صحیحین تمسک می داد" سمجھ رہے ہیں، مولانا فخر الدین نے بغیر کسی سابقہ تیاری کے اچانک ایک مقام سے جہاں سبق ہو رہا تھا یہ رنگ بدلا کہ صاحب ہدایہ کی پیش کردہ دلیلوں کو چھوڑ کر حنفی نقطۂ نظر کی تائید میں صحیحین کی حدیثیں پیش کرنی شروع کر دیں۔ آج کہا جاتا ہے کہ ہدایہ کی جن حدیثوں کے نیچے ارباب حاشیہ "غریب جدًا" "نادر جدًا" کے الفاظ لکھ دیا کرتے ہیں،

یہ غرابت وندرت صرف لفظی حد تک ہے۔ ورنہ اگر الفاظ سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان ہی حدیثوں کے مفہوم اور مفاد کو اکثر و بیشتر صحاح کی حدیثوں کے الفاظ سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثری حیثیت سے یہ دعویٰ صحیح ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ اس وقت بھی ہندستان کے مدعیانِ حدیث دانی میں کوئی ہستی ایسی ہوگی جس کے سامنے ہدایہ پیش کیا جائے اور بغیر کسی سابقہ تیاری کے وہ ہدایہ کے الفاظ کو چھوڑ کر اس کے مفاد کو صحاح کی حدیثوں سے ثابت کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ الا ماشاء اللہ۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی کے نصف اول میں اگر حسن صغانی نے دلی میں حدیث کے بازار کو رونق دے رکھی تھی، تو اسی صدی کے دوسرے نصف میں مولانا فخرالدین زرادی جیسے محدث جلیل یہاں موجود تھے، اسی سماع کی مجلس مناظرہ کے قصہ کو میر خورد نے بھی بیان کیا ہے۔ لیکن کیا بیان کیا ہے؟ کیا یہ کہ امام غزالی کے قول کو ہندوستانی مولویوں کا معصوم گروہ حدیث قرار دے کر جواز سماع پر اس سے استدلال کر رہا تھا اور جو حرمت کے قائل تھے ان میں بھی کسی کے پاس اتنا علم بھی موجود نہ تھا کہ اس قول کے حدیث ہونے کی غلطی کا ازالہ کر سکے، بلکہ جواب میں کہا تو یہ کہا کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ اصل قصہ کی تفصیل تو آئندہ معلوم ہوگی مجھے صرف مولانا فخرالدین کے اس تبحر اور وسعت نظر کا ثبوت پیش کرنا ہے جو علم حدیث میں انہیں حاصل تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ بحث کی ابتدا کرتے ہوئے

"روئے مبارک بجانب علماء شہر کردہ ایں سخن گفت کہ شما از دو جنبہ یک جنبہ گیرید اگر جنبہ حرمت گیرید حل ثابت کنم، و اگر جنبہ حل گیرید حرمت ثابت کنم" ص ۲۶۸

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مولانا کے پاس دعوے کے دونوں پہلوؤں (حلت و حرمت) کے متعلق دلائل کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں نیز ان کے وسیع مباحث کا جن لوگوں کو صحیح علم ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا فخرالدین جو کچھ فرما رہے تھے یقیناً ایک متبحر عالم ہی یہ کر سکتا ہے کیونکہ گفتگو مطلق سماع میں ہو رہی تھی نہ کہ مزامیر کے ساتھ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا اس کے مخالف تو سلطان المشائخ

Marfat.com

خود ہی تھے۔

اب نہ جاننے والوں سے کیا کہا جائے۔ خود سلطان المشائخ جن کے متعلق یجوز لاہلہٖ والالطیف مشہور کیا گیا ہے گو ظاہر ہے کہ ان کا مشغلہ نہ درس و تدریس کا تھا اور نہ تصنیف و تالیف کا، لیکن میر خورد جوان کے دیکھنے والے ہیں ان ہی کا بیان ہے کہ حدیث کا وہی مجموعہ جس میں دو ہزار دو سو چھیالیس بحذف اسناد علامہ صغانی نے صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیثیں جمع کی ہیں، یہ مجموعہ حضرت نظام الاولیاء نے صرف پڑھا نہیں تھا، بلکہ "مشارق الانوار را یاد گرفت" (سیر الاولیاء ص ۱۰۱) یعنی سلطان جی کو بخاری و مسلم کی دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کا کوئی ممتاز محدث یا عالم پایا جاتا ہوگا جسے بخاری و مسلم کی اتنی حدیثیں زبانی یاد ہونگی صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اس مجموعہ کو یاد کیا تھا، بلکہ ان کی سند بھی میر خورد نے نقل کی ہے۔ ان کے استاد مولانا کمال الدین سند میں یہ ارقام فرمانے کے بعد

بان قرء ھذا الاصل المستخرج من الصحیحین علی ساطر ھذہ السطور

صحیحین (بخاری و مسلم) سے حدیثوں کا یہ مجموعہ جو اکٹھا کیا گیا ہے اس کو (سلطان جی) نے ان سطروں کے لکھنے والے کو پڑھا

یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ

قراۃ بحث واتقان وتنقیح معانیہ وتنقیر مبانیہ

یہ پڑھائی ان کو اس طریقہ سے ہوئی کہ کامل بحث و تحقیق، استواری و اتقان کی پابندی کی گئی حدیثوں کے معانی کی تنقیح کی گئی اور ان کی بنیادوں کو کھود کھود کر ظاہر کیا گیا

علم حدیث کے ساتھ ہندی اسلام کی پہلی صدی میں دلی کے علمی حلقوں کی دلچسپیوں کا جو حال تھا اس کا اندازہ ان چند نمونوں سے بآسانی ہو سکتا ہے اور یہ میں نے چند اجمالی اشارے کیے ہیں ورنہ اس صدی کے متعلقہ معلومات جو ادھر ادھر کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں اگر انہیں سمیٹا جائے تو اچھا خاصہ رسالہ بن جائے۔ میں نے قصداً حضرت سلطان المشائخ ہی کے متعلق بعض چیزوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ ان ہی کی مبارک ذات کو اکثر دیکھتا ہوں کہ "نام نیکو رفتگاں" کی بربادی

Marfat.com

کے جو درپے ہیں عموماً اس سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں، مغالطہ کی وجہ شاید حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ بھی ہے جو فوائد الفواد کے نام سے مشہور ہے۔ گویا لوگ اس کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ کسی نے قصد و ارادہ کے ساتھ تصنیف کے لیے قلم اُٹھایا ہو، حالانکہ اپنی مجلسوں میں آئندہ روند کے سامنے مختلف اوقات میں جو آپ گفتگو فرماتے تھے امیر حسن علا سنجری نے ان ہی کو قلمبند کر لیا ہے، ظاہر ہے کہ آدمی اس قسم کی گفتگو میں ہر طرح کی باتیں کرتا ہے، فضائل اعمال وغیرہ جن کے متعلق آج ہی نہیں ہمیشہ سے محدثین کو شکایت ہے کہ لوگوں میں ضعیف روایتیں مروج ہو گئی ہیں، اس قسم کی حدیثوں کا تذکرہ ان کی مجلس میں آجاتا تھا، بسا اوقات آپ ٹوک بھی دیتے تھے، اور فرماتے کہ "این قول مشائخ ست" یعنی حدیث نہیں بزرگوں کا قول ہے۔ فوائد الفواد میں ہی اس قسم کے الفاظ متعدد مقامات میں ملیں گے۔ کبھی پوچھنے والوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ "ایں حدیث درکتب احادیث کہ مشہور است ومعتبر نیامدہ (فوائد ص۲۳۳) حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہوتا تو آپ فرماتے "آنچہ در صحیحین است آں صحیح باشد" ص۱۰

ایک اور مسئلہ اس سلسلہ میں یعنی اس قسم کے اکابر کے کلام میں جو حدیثیں پائی جاتی ہیں اُن کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ باضابطہ فن اصولِ حدیث کی اُنہوں نے تنقیح فرمائی تھی، ان کے مشاغل کے لحاظ سے غالباً صحیح بھی نہ ہوگا، بسا اوقات یہ صورت پیش آئی ہے کہ معتبر عالم مثلاً اپنے کسی اُستاد سے اُنہوں نے طالب العلمی میں کوئی حدیث سُنی، اُستاد جب صاحب کمال ہو تو قدرتاً آدمی اس پر اعتماد کرتا ہے اور اسی اعتماد کی بنیاد پر ان کی کہی ہوئی باتوں کا گفتگو میں ذکر کر دیتا ہے، مثلاً سلطان المشائخ ہی کو دیکھیے، ایک دفعہ اپنی مجلس میں ایک حدیث کا آپ نے ذکر کیا، کسی پوچھنے والے نے حدیث کی صحت وضعف کے متعلق سوال کیا، اس وقت آپ نے جواب میں فرمایا۔

من ایں درکتابے ندیدہ ام از مولانا علاء الدین اصولی کہ اُستاد من بود در بداؤں شنیدم فوائد ص۱۶۵

مولانا علاء الدین ایک صاحب تقویٰ صاحب علم و دیانت بزرگ تھے، ظاہر ہے کہ ایسے اُستادوں

Marfat.com

کی بات اگر عام گفتگو میں کوئی نقل کردے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے نقل کرنے والے کے متعلق اس قسم کی رائیں قائم کی جائیں، جن کا تماشا اس زمانہ میں ہم کر رہے ہیں، بلکہ میں تو اس قسم کی حدیثوں کا الزام خود محدثین کے ایک طبقہ پر عائد کرتا ہوں، حالانکہ ان کا پیشہ ہی زندگی بھر علم حدیث کی خدمت ہی تھا، مگر باوجود اس کے تیسری اور چوتھی صدی میں محدثین کا ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے انتہائی بے احتیاطیوں سے کام لے کر اپنی کتابوں میں رطب و یابس ہر قسم کی حدیثیں بھر دیں۔ بیچارے امام غزالی اور اسی قسم کے بعض ائمہ کو ان ہی متاخرین محدثین کی وجہ سے بدنام ہونا پڑا۔ اور دوسروں نے یہ دیکھ کر کہ امام حجۃ الاسلام کی کتاب میں یہ حدیث موجود ہے، ان پر بھروسہ کر کے تذکرہ میں یا خطوط میں اُسے نقل کر دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکابر صوفیہ کے کلام میں ایسی حدیثیں اگر کبھی نظر آئیں تو میرے نزدیک اس باب میں ان کو مطعون ٹھہرانے میں عجلت نہ کرنی چاہیے، ان کی معذوریوں کو بھی سامنے رکھ کر رائے قائم کر لینا چاہیے، بلکہ اسی کے ساتھ مجھے تو اس زمانہ کے لوگوں کی یہ عام عادت کہ ادھر کان میں حدیث پڑی اور ذرا سی غرابت یا اجنبیت اس میں محسوس ہوئی، بے تحاشا قہقہے لگا کر غلط ہے، بے اصل ہے، موضوع ہے، قصاصوں کی روایتیں ہیں، یہ طریقہ علمی سنجیدگی سے بھی بعید ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ حدیثوں پر قطعی وضع و اختلاق کا حکم لگانا قریب قریب اسی قدر دشوار ہے، جتنا کہ کسی حدیث کی صحت کی قطعیت کا فیصلہ۔

ایسی حدیثیں جو عام متداول کتابوں میں نہ ملتی ہوں، یا ان میں موجود ہوں لیکن آپ کے حافظہ میں موجود نہ ہوں یا لفظاً نہیں بلکہ مفاداً موجود ہوں اور آپ کی نظر اس مفاد یا نتیجہ پر نہ پہنچی ہو، جب آئے دن حدیثوں کے متعلق یہ تجربات ہوتے رہتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ایسی صورت میں ایک سنجیدہ رائے ایسی حدیثوں کے سُننے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتی ہے جیسا کہ سلطان المشائخ نے ایک دن فرمایا۔

حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت کہ ایں حدیث رسول نیست، اما ایں تواں گفت کہ در کتبے

Marfat.com

کہ ایں احادیث جمع کردہ اند و اعتبار یافتہ اند بیا مدہ (ص ۳۳ فوائد)

بلکہ بسا اوقات اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ حدیث صحاح ہی میں موجود تھی، لیکن روایت کرنے والے نے جو مطلب اس سے پیدا کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنے الفاظ میں منسوب کیا تھا، اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں گیا تھا۔

ابھی ہدایہ کی حدیثوں کا ذکر گذر چکا کہ ہدایہ کی جن حدیثوں پر لوگوں نے ندرت اور غرابت کا حکم لگایا ہے، لفظاً یہ حکم صحیح ہو تو ہو، لیکن معناً قاطبۃً یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو سلطان المشائخ کی یہ محتاط اور سنجیدہ رائے اب بھی ان لوگوں کے لیے قابلِ غور ہے، جنہوں نے اپنے لفظی شقشقوں اور لقلقوں سے کانوں کو گھائل کر رکھا ہے، ان ہی بے احتیاطیوں اور ذمہ داریوں کے احساس کی کمی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بالآخر بے ادبوں بے باکوں کا ایک گروہ ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ان بیچارے صوفیہ ہی کیا خود بخاری و مسلم کی حدیثوں کے مقابلہ میں العیاذ باللہ خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور کیا کہیے شقاوتیں اور بدبختیاں تو اب آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی ہیں، پیغمبر کے کلام کو پیغمبر ہی کا کلام مان کر مدعیان اسلام کا ایک گروہ اس کی تعمیل اپنے لیے غیر ضروری ٹھہرا رہا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جب واقعی علم و معرفت والوں کی طرف سے نیم بضبہ کی ستم رائی روا رکھی جائیگی تو مسکینوں کے جس گروہ کی ساری پونجی اُردو ترجموں کی وہ کتابیں ہیں جن کی سو باتوں میں سے بمشکل دس باتیں وہ سمجھ سکتا ہے، وہ اپنی اس عداوت میں اندھا ہو کر جو قدرتاً جہل کو علم کے ساتھ ہے "ہزار مرغ بہ سیخ" پر جری نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا، عالم کا علم بہرحال حقیقت سے دور ہونے میں علم سے مزاحمت کرتا ہے، لیکن جن کی باگ صرف جہل کے ہاتھوں میں ہو، ان بیچاروں کو کون تھام سکتا ہے۔

بہرحال اس زمانہ میں لوگ دین کی مصلحت جس چیز میں بھی سمجھیں، لیکن علم اور دین جن سے منتقل ہو کر ہم تک وراثۃً پہنچا ہے، ان بزرگوں کو تو ہم پاتے ہیں کہ موضوع سے موضوع جعلی

حدیث جس کا جعلی ہونا اجلی البدیہیات میں ہونا تھا، یونہی آدمی یقین کر سکتا ہے کہ وہ قطعاً بے بنیاد ہے
ملاحظہ فرمایئے حضرت سلطان المشائخ اس کو بھی موضوع ہی قرار دیتے ہیں، مگر کس لب و لہجہ میں
ایک شخص مجلس مبارک میں حاضر ہوتا ہے، پوچھتا ہے

"از بعضے علویاں (شیعہ) شنیدہ شدہ است کہ حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم خطے نوشتہ بود کہ فرزندان من بعد از من مسلمانان را اگر خواہند بفروشند ابوبکر یا عمر خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پارہ کردند۔ ایں راست است؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اپنے فرزندوں (جن کی برہمنیت توڑنے کے لیے حضور نے آل ہاشم پر بھکشا اور دان یعنی صدقہ حرام فرما دیا ہے) ان ہی فرزندوں کو برہمنیت کبریٰ کا یہ مقام عطا کرنا کہ مسلمانوں کو بیچ کر چاہیں تو اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں، جس قسم کی بات ہو سکتی ہے ظاہر ہے، غالباً خود علماء شیعہ بھی اس کو موضوع ہی سمجھتے ہوں گے[1]۔ اتنی کھلی ہوئی واضح موضوع حدیث ہی مگر سلطان المشائخ سائل کو جواب دیتے ہیں۔

"خیر ایں معنی در ہیچ کتابے نیامدہ است اما عزیز داشتن ایشاں و گرامی داشتن فرزندان رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم واجب است" (ص۳)

بہر حال اس زمانہ میں حدیثوں پر حکم لگانے کا جو طریقہ تھا اس کی مثال پیش کرنی تھی۔

خیال گزرتا ہے کہ شاید ان بزرگوں کی نظر ان چیزوں پر نہ تھی، جن کی بنیاد پر آج لمبے چوڑے دعوے کیے جاتے ہیں، میں سلطان المشائخ کی سوانح عمری اس وقت نہیں بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ دکھاتا کہ حدیث اور فقہ کے جوہری اور اساسی حقائق پر ان کی کتنی گہری نظر تھی، خصوصاً حنفی فقہ

---

[1] کیونکہ قرطاس کا جو واقعہ شیعوں میں مشہور ہے اس کے متعلق تو کہتے ہیں کہ اس میں خلافت کا فیصلہ لکھا جانے والا تھا، میں کہتا ہوں کہ بالفرض یہی ہو لیکن کس کی خلافت کا فیصلہ اس کا جو دین اور نماز میں نائب بنایا گیا تھا، ظاہر ہے کہ ہونا تو شاید اسی کے لیے ہوتا، ابن عباس نے اس کو رزیہ (مصیبت) جو قرار دیا تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اگر خلافت صدیقی تحریر میں آجاتی تو جھگڑا نہ ہوتا، یعنی بجائے، اقتضاء کے نص صریح ان کی خلافت کے لیے مہیا ہو جاتی۔

کا حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو تعلق ہے، اور ابن مسعود کا جو خاص طریقہ روایت کرنے میں تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے وہ بہت کم حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، مرسل اور متصل کی صحت اور عدم صحت کے عالمانہ مباحث اس سلسلہ میں جو پائے جاتے ہیں، اسی عام مجلس میں باتوں ہی باتوں میں ان امور کی طرف وہ عمیق اور گہرے اشارے کرتے چلے گئے ہیں، حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ نہ ان کا پیشہ تھا اور نہ ان کا کاروبار، خدا نے ان کو جس کام کے لیے پیدا کیا تھا، وہی کام اتنا اہم تھا جس کی مشغولیت ان کو ان ذہنی اور علمی مباحث میں مشتغل ہونے کا وقت ہی کب دیتی تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ عالم ہونا محدث ہونا مفسر ہونا تو آسان ہے اور بکثرت تھوڑی بہت محنت سے لوگ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہو ہی رہے ہیں، یورپ نے تو ان علوم کی مہارت کے لیے اسلام کی بھی شرط باقی نہیں رکھی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علم کا تعلق راست مطالعہ سے ہے۔ دین و بے دینی کو اس میں چنداں دخل نہیں لیکن عالم نہیں، عالم گر، فقیہ نہیں فقیہ ساز ہونا آسان نہیں ہے۔ ایسے نفوس طیبہ لاکھوں اور کروڑوں میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جنہیں خدا ولی ہی نہیں ولی ساز بنا کر پیدا کرتا ہے، ان کی صحبت میں حیوان انسان بنتے تھے اور انسانیت سے بھی اعلیٰ مقام حاصل کرتے تھے، بشرطیکہ انسانیت سے کوئی اونچا مقام ہو بھی، ہم میں آج کتنے ہیں جنہیں خود اپنے آپ کو بھی واقعی مسلم اور مومن بنانے میں کامیابی ہوئی ہے، عمر گذرتی چلی جاتی ہے، معلومات کا ذخیرہ دماغ میں بھرا چلا جاتا ہے، لیکن بجائے دماغ کے ہمارے دلوں کا آپریشن کیا جائے تب پتہ چل سکتا ہے کہ اس میں شکوک و شبہات و وساوس و اوہام کی کتنی چنگاریاں چھپی ہیں کیسی چنگاریاں جنہیں موقع ملتا ہے تو العیاذ باللہ آن کی آن میں ایمانی زندگی کے سارے سرمایہ کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہیں، خیال کرنے کی بات ہے، ان لوگوں کا مقابلہ ان بزرگوں سے کوئی معنی رکھتا ہے جن کے ایک ایک خادم نے زمین کے بڑے بڑے علاقوں کو ایمان و اسلام ایقان و سکینت کی دولت سے بھر دیا ہے، آج دریائے تاپتی کے کنارے مسلمانوں کا وہ عظیم مرکزی شہر برہان پور جس کے درو دیوار شکستہ اس کے کھنڈر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ حضرت نظام الاولیاء کے صف

بنگال سے اُٹھنے والے ایک بزرگ حضرت برہان الدین غریب نے اسی اُجڑے ہوئے مقام کو سرزمین دکن میں ایمان کی روشنی پھیلانے کا مرکز بنایا تھا، خود اس شہر کا نام "بُرہان پور" ان ہی کے اسم گرامی کی یادگار ہے۔ شیخ محدث لکھتے ہیں۔

وایں بُرہان پور کہ شہرے مشہور است بنام شیخ آبادان ست (اخبار الاخیار ص۹۴)

آج بنگال کے تین کرور مسلمانوں پر مسلمانوں کو ناز ہے، ناز ہے کہ اتنی بڑی آبادی کسی خالص اسلامی واحد ملک کی بھی نہیں ہے لیکن غریب الدیار اسلام نے اس ملک میں جب قدم رکھا تھا، تو لوگوں کو کیا معلوم کہ اس کی پالکی کو کندھا دینے والے کون کون لوگ تھے، ایک لڑکا

ہنوز موئے ریش آغاز نہ شدہ بود در حلقہ ارادت شیخ درآمدہ بود، ودر سلک خدمتگاراں پرورش یافتہ (اخبار ص ۸۶)

سلک خدمتگاروں میں اسی پرورش پانے والے لڑکے کا نام بعد کو اخی سراج الدین عثمان ہوا جس نے نظام الاولیا کی خانقاہ سے نکل کر سارے بنگال میں آگ لگادی۔ ایمان وعرفان کا چراغ روشن کردیا۔ پنڈوہ کے علاء الحق والدین جن کا آج سارا بنگال معتقد ہے ان ہی اخی سراج عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے تراشیدہ ہیں، اُف جس ذاتِ ہمایونی نے اپنی ایک ذات قدسی صفات سے ایسے ایسے "مردان راہ" پیدا کیے جن سے خدا ہی جانتا ہے کہ نسل انسانی کی کتنی تعداد جو اپنے مالک سے بچھڑی ہوئی تھی، پھر اسی کے استانہ پر پہنچ گئی۔ میرا دماغ ان لوگوں پر کھولنے لگتا ہے جو شاید خود اپنی ایک ذات کو بھی مسلمان بنانے میں جیسا کہ چاہیے کامیاب نہیں ہوئے ہیں جس کا احساس دوسروں سے زیادہ خود ان ہی کو ہوگا، آج اُنھی کی دراززبانیں ان بزرگوں پر کھل رہی ہیں، ان کے قلم کی تیز نوک ان کی پاکیوں کو مجروح کررہی ہے، جن کے طفیل میں خدا ہی جانتا ہے کتنوں کو پاکی میسر آئی، ایک سلطان المشائخ ہی کی ذات ہے۔ بنگال اور دکن کے سوا آئینِ اکبری کی گویا شاہی رپورٹ ان کے متعلق جو درج ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں میں سے ایک ایک آدمی نے کیا کیا کیا ہے اور اپنے محبوب رسول علیہ السلام کے پیغام اور دین کو دنیا کے کن کن گوشوں تک پہنچانے

میں وہ کامیاب ہوا ہی سلطان للشائخ کے نمائندے سرزمینِ ہند کے کن کن علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں :۔

"شیخ نصیرالدین چراغ دہلی، امیر خسرو، شیخ علاءالحق، شیخ اخی سراج الدین در بنگالہ، شیخ وجیہ الدین یوسف در چندیری، شیخ یعقوب و شیخ کمال در مالوہ، مولانا غیاث در دھار، مولانا مغیث در اجین شیخ حسام در گجرات، شیخ برہان الدین غریب، شیخ منتجب، خواجہ حسن در دکھن (آئینِ اکبری ج۲)"

دیکھ رہے ہیں، دین کے اس نیر تاباں کی کرنوں کو دیکھ رہے ہیں، دلی کے اُفق سے طلوع ہوکر اس نے اپنی روح پرور اور جاں آفریں شعاعیں کہاں کہاں پہنچائیں، واقعہ یہ ہے کہ بزرگوں کا یہ گروہ جن جن علاقوں میں پہنچا ہی اپنے ساتھ وہ علم کی دولت کو بھی لے گیا ہی۔ ان میں ہر بزرگ اس کا مستحق ہی کہ ان کے دینی خدمات اور علمی مجاہدات پر الگ الگ کتابیں لکھی جائیں، میری بحث دراصل علم حدیث کے متعلق ہو رہی تھی، حدیثوں کے متعلق ہندوستان کے بزرگوں کا جو طرزِ عمل تھا اس کی چند مثالیں پیش کر رہا تھا۔

بہرحال سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں کی طرف سے ہندوستان پر علم حدیث کے متعلق آج الزام لگایا جا رہا ہی، وہ چاہتے کیا ہیں؟ کیا ہندوستان جہاں صحیح معنوں میں اسلام ساتویں صدی کے آغاز میں داخل ہوا، وہ چاہتے ہیں کہ زہری اور امام مالک، امام بخاری، ترمذی وغیرہ کی طرح حدیث کی تدوین میں حصہ لیتا؟ اسماء الرجال کا فن مرتب کرتا، خیال کرنے کی بات ہی کہ اس کام کی تو نوعیت ہی ایسی تھی کہ بجز ان ملکوں کے جہاں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہنچ گیا، دوسرے ممالک جو صدیوں بعد اسلام کے وطن بنے ان کو حصہ لینے کا موقع ہی کیا تھا، یہ سعادت تو انہی بزرگوں کے لیے مخصوص تھی جو اسلام کے قدیم اوطان میں پیدا ہوئے۔ البتہ اس کے بعد حدیث میں کام کرنے کی جو راہ باقی رہ گئی تھی یا اب بھی کھلی ہوئی ہی وہ اس علم کی تعلیم و تدریس، تشریح و تنقیح، نشر و اشاعت ہی کا کام ہو سکتا ہی۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیے تو کس زمانہ میں ہندوستان کا قدم پیچھے رہا ہی۔ اسلام کی پہلی صدی جو ہندوستان میں تھی۔ اس میں گذر چکا کہ ہندوستان ہی کے

Marfat.com

ایک عالم نے پایۂ تخت خلافت میں درس کے لیے صحیحین کی حدیثوں کا وہ مجموعہ پیش کیا جو صدیوں تقریباً اکثر اسلامی ممالک میں درسی نصاب میں شریک رہا، میری مراد حسن صغانی کی مشارق سے ہے جس کا تفصیلی ذکر گذر چکا، یہی وجہ ہے کہ ایران، ترکی، مصر، شام ہر جگہ کے علماء کو ہم دیکھتے ہیں کہ مشارق کی شرح لکھ رہے ہیں۔ جب ہندوستان کی ان ہی صدیوں میں اس مجموعہ کے زبانی یاد کرنے کا رواج تھا تو اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ ہندوستان میں صحیحین کی دو دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پائے جاتے تھے، گذر چکا کہ سلطان المشائخ کا بھی شمار ان ہی حفاظ میں ہے۔ یاد آیا میں مولانا عبدالحیی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء[1] نے نقل فرمایا ہے کہ اسی ہندوستان میں مولانا عبدالملک عباسی تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔

کان حافظاً للقرآن وصحیح البخاری لفظاً ومعناً وکان یدرس عن ظھر قلبہ۔ — وہ قرآن کے حافظ تھے اور صحیح بخاری ان کو زبانی یاد تھی الفاظ بھی اور اس کے مطالب بھی اور صحیح بخاری کا درس زبانی دیتے تھے۔

آپ سن چکے کہ ان ہی پرانے دنوں میں مولانا فخرالدین زرادی جیسے محدثین اس ملک میں موجود تھے جن کی فنی مہارت کا یہ حال تھا کہ سابقہ تیاری کے بغیر ہدایہ کی حدیثوں کی جگہ صحیحین کی حدیثوں سے حنفی مذہب کے مسائل کو ثابت کر سکتے تھے۔

ان ہی دنوں میں جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان فن حدیث سے بیگانہ تھا۔ صحاح ستہ کا وہ ضخیم مجموعہ مشکوٰۃ جس میں صحاح کے سوا حدیث کی دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی جمع ہیں زبانی یاد کرنے والے لوگ موجود تھے تذکرہ علماء ہند میں بابا داؤد مشکوتی کے ذکر میں ہے۔

"در فقہ وحدیث وتفسیر وحکمت ومعانی یدِ طولیٰ داشت وحافظ مشکوٰۃ المصابیح بود بدیں وجہ ادرا

---

[1] مولانا مرحوم ہندوستان کے ان مخلص علماء میں تھے جنہوں نے نام پیدا کرنے سے زیادہ بہت زیادہ کام کیا ہو، عربی زبان میں ہندوستان کی سیاسی علمی جغرافیائی ضخیم تاریخیں آپ نے لکھی ہیں لیکن بجز ایک مختصر نقطہ کے ان کی محنتوں کا یہ سارا ذخیرہ زیور طبع سے محروم ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کس کے لیے مقدر ہے۔

Marfat.com

شکوتی می گفتند" ص ٦٠

صاحب الیانع الجنی نے حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ محمد فرخ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے

کان یحفظ سبعین الف حدیث ان کو ستر ہزار حدیثیں متن اور سند کے ساتھ اس طور پر

متناً واسناداً اجرحاً وتعدیلاً یاد تھیں کہ ہر ایک سند کے رواۃ کے متعلق جرح و تعدیل

کے اعتبار سے جو مباحث ہیں وہ بھی زبانی یاد تھے۔ (ص ٦٦)

تیرہویں صدی کے آخر میں مولانا رحمت اللہ الہ آبادی ایک محدث تھے جن کے متعلق لکھا ہے

"کتب صحاح ستہ برزبان داشت" تذکرہ علماء ص ٦٢) اور مولانا قادر بخش سہسرامی کے دیکھنے والے تو شاید اب بھی موجود ہونگے جو صحاح کے ورق کے ورق زبانی سناتے چلے جاتے تھے، بخاری کی حدیثیں سند کے ساتھ بیان کر کے فتح الباری عینی وغیرہ شروح کی عبارتیں تک مولانا زبانی سُناتے تھے۔

الغرض اول سے لے کر آخر تک ایک طبقہ ہندوستان میں ہمیشہ پایا گیا جسے ہم حفاظ حدیث میں شمار کر سکتے ہیں۔

حدیث کی خدمت کی ایک شکل درس و تدریس کی ہو سکتی تھی، سو اس کا حال یہ ہے کہ دلی کو جن دنوں اسلامی حکومت کے پایۂ تخت ہونے کی سعادت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی، یعنی پانچویں صدی کی ابتدا تھی آپ کو لاہور میں شیخ اسماعیل محدث نشر حدیث میں مشغول نظر آئینگے۔ تذکرہ میں یہ لکھنے کے بعد کہ "شیخ اسماعیل از عظمائے محدثین و مفسرین بود" لکھا ہے کہ "در اول کسے کہ علم حدیث و تفسیر بہ لاہور آوردہ" شیخ اسماعیل کا ایک بڑا کام یہ بھی تھا کہ "ہزارہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف باسلام شدند" جانتے ہیں ان کی وفات کس سنہ میں ہوئی ہے" در سال چہار صد و چہل وہشت ہجری در لاہور درگذشت (ص ٢٣)

حدیث کے ایسے مدرسین بھی اسی سرزمینِ ہند میں موجود تھے کہ "سی و شش مرتبہ مذاکرہ صحیح بخاری از اول تا آخر نمود" (تذکرہ علماء ہند) ان کا نام ملا عنایت اللہ کشمیری تھا سنہ ۱۱۲۵ھ میں وفات پائی، چھتیس چھتیس دفعہ بخاری کو مذاکرے کے ساتھ ختم کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

Marfat.com

ان ہی مُلّا عنایت سے پہلے اکبری عہد میں مولانا محمد مفتی نامی بزرگ تھے یہ لاہور میں افتا، کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ لکھا ہے کہ "ہر بارے کہ ختم صحیح بخاری و مشکوٰۃ المصابیح می کرد مجلسے عظیم ترتیب دادے و طبخ بعز احلویات می فرمود و بعلما و صلحا رخورانیدے۔ (ص ۲۱۳ تذکرہ ومنتخب)

اکبر ہی کے زمانہ میں ایک اور محدث شیخ بہلول دہلوی تھے جن کے متعلق اسی کتاب تذکرہ علماء ہند میں ہے کہ "علم حدیث راخوب ورزیدہ" (ص ۳۲) اور صرف بالائی ہند پنجاب وکشمیر، دلی وغیرہ ہی کا یہ حال نہ تھا، نویں صدی کے عالم شیخ بھکاری کاکوروی تھے جن کی اصول حدیث میں ایک کتاب منبع کے نام سے ہے۔ مشہور مداح النبی حضرت محسن کاکوروی آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔

انتہا یہ ہے کہ نو مسلم ہندوؤں میں سے بعضوں نے فنِ حدیث میں کمال پیدا کیا تھا، جوہر ناتھ کشمیری ان ہی نو مسلم محدثین میں ہیں لکھا ہے کہ حج کے لیے حجاز تشریف لے گئے اور "از ملا علی قاری ہروی وابن حجر مکّی اجازت حدیث بسند معنعن یافتہ" (تذکرہ ص ۴۴)

ان ہی ابن حجر مکّی کے ایک اور شاگرد مشہور میر سید شریف جرجانی کے پوتے مولانا میر مرتضیٰ شریفی ہیں بداونی میں ہے۔

"در علوم ریاضی واقسام حکمت ومنطق وکلام فائق بر جمیع علمائے ایام بود از شیراز بمکہ رفتہ علم حدیث در ملازمت شیخ ابن حجر اخذ کردہ اجازت تدریس یافت"

مکہ معظمہ سے میر صاحب آگرہ آئے اور بقول بداونی "بر اکثرے علماء وفضلاء سابق ولاحق تقدیم یافت و بدرس علوم وحکم اشتغال داشت" (ص ۳۲۱ ج ۳) اکبر کے عہد میں وفات پائی حافظ دراز پشاوری قاضی مبارک کے حاشیہ کی وجہ سے ارباب درس میں خاص شہرت رکھتے ہیں لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک طرف ان کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ "در فقہ و حدیث واصول یگانہ روزگار"۔ اور دوسری طرف یہ بھی ہم ان ہی کے ترجمہ میں پڑھتے ہیں کہ

"اکثر علوم از والدۂ ماجدہ خود کہ عالمۂ فاضلہ بود تحصیل نمودہ وبر مسندِ افادت را فاضت

متمکن شد و تمام عمر گرامی بدرس طلبہ و تالیف صرف کرد"

جس کا یہی مطلب ہے کہ ان کی والدہ صاحبہ بھی محدثہ تھیں، ان پر حدیث کا فن اتنا غالب تھا کہ بخاری کی ایک شرح فارسی زبان میں لکھی تھی، تذکرہ میں ان کی تالیفات میں "منہج الباری شرح فارسی بخاری" (ص ۶۰) کا نام خاص طور پر لیا گیا ہے۔

مجھے استیعاب مقصود نہیں ہے بلکہ ابتداء عہد اسلامی سے آخر تک اس ملک میں علم حدیث کے درس و تدریس کا رواج جو رہا ہے اس کے چند نمونے پیش کر رہا ہوں۔ خدمت حدیث کی تیسری صورت تالیف و تصنیف ہو سکتی تھی، یہ دعویٰ کہ ہندوستان نے لے دے کر صرف مشارق کا مجموعہ دنیائے اسلام کو دیا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ صرف یہی کارنامہ جیسا کہ گزر چکا ہندوستان کی طرف سے کافی ہو سکتا تھا لیکن قطع نظر ان چند مشہور تالیفات کے جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ مثلاً شیخ عبدالحق اور ان کے خانوادے کا کام یا شیخ علی متقی کا سارے جہان اسلامی پر کنز العمال کے ذریعہ سے لعمان لیکن بات محض انہی کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ ابھی حافظ دراز پشاوری کے تذکرے میں بخاری کی فارسی شرح کا ذکر گزر چکا ہے۔ شیخ بہلول کے رسالہ منہج فی اصول الحدیث کا ذکر بھی آپ سُن چکے ہیں۔

اب سُنیے دسویں صدی ہجری میں زید پور جو جون پور کا ایک قصبہ ہے یعنی گجرات و سندھ کا کوئی شہر نہیں ہے، شمالی ہندوستان کے مشرقی علاقہ کا یہ قصبہ ہے، یہاں کے مولانا عبدالاول زید پوری ایک محدث جن کی وفات ۹۶۸ھ ہجری میں ہوئی ان کی تالیفات میں "فیض الباری شرح صحیح بخاری" (ص ۱۰۶) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ہندی عالم شیخ نورالدین احمد آبادی ہیں جن کی ایک سو ستر کتابوں میں ہم ایک کتاب "نور القاری شرح بخاری" (تذکرہ ص ۲۴۸) بھی پاتے ہیں۔ خود مولانا آزاد غلام علی بلگرامی کی کتابوں میں بھی ہے "ضوء الدراری شرح صحیح بخاری" تا کتاب الذکر (تذکرہ ص ۲۵) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

یہی حال تراجم کا بھی ہے۔ شیخ محدث دہلوی کے ترجمہ مشکوٰۃ یا ان کی شرح لمعات اسی طرح

Marfat.com

ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق کی تیسیر القاری ترجمہ بخاری و ترجمہ صحیح مسلم کا ذکر گزر چکا ہے۔ شاہ صاحب کے خاندان کے ایک عالم مولانا سلام اللہ گزرے ہیں جن کی ایک شرح موطا المحلیٰ ٹونک کے کتب خانہ میں حسن الخط کی کئی جلدوں میں موجود ہے۔ انہی مولانا سلام اللہ کے والد جن کا نام ہی شیخ الاسلام تھا، تذکرۂ علماء ہند میں لکھا ہے کہ "مصنف شرح فارسی صحیح بخاری ست (ص ۶) اور ان کے دادا حافظ فخرالدین کی "شرح فارسی صحیح مسلم" (تذکرہ) موجود ہے، اسی طرح مشکوٰۃ المصابیح پر ہندوستان کے مختلف علماء نے حواشی و شروح لکھے۔ شیخ محدث کے سوا حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے شیخ محمد سعید الملقب بخازن الرحمۃ کے تالیفات ہیں"۔ حاشیہ بر مشکوٰۃ المصابیح نوشتہ" (تذکرہ ص ۱۹۰) اور جس طرح ہندوستان میں بخاری کی متعدد شروح مختلف علماء کے قلم سے پائے جاتے ہیں، مشکوٰۃ کے حواشی و شروح کی تعداد تو ان سے کہیں زیادہ ہے۔ آخر میں دنیائے اسلام کی وہ نادر مثال کتاب جس کا نام حجۃ اللہ البالغہ ہے بظاہر وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کوئی مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے لیکن اپنے تجربہ و تتبع کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے مشکوٰۃ ہی کو سامنے رکھ کر ہر باب کی حدیثوں کو مجموعی نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح مرتب فرمادیا ہے کہ اسلام ایک فلسفہ کی شکل میں بدل گیا ہے۔ ایسا فلسفہ جس کی طرف نہ رہنمائی پہلوں کو میسر آئی اور نہ پچھلوں کو اسی لیے میں حجۃ اللہ البالغہ کو عموماً مشکوٰۃ ہی کی ایک خاص شرح قرار دیتا ہوں۔ حضرت شاہ صاحب نے علاوہ اس بے نظیر کتاب کے موطا کی فارسی و عربی شرحوں میں جن مجتہدانہ نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کے سوا آپ نے چھوٹے چھوٹے رسالے علم حدیث اور حدیث کا جو تعلق فقہ سے ہے، اس پر جو کتابیں لکھی ہیں یا معرفۃ الصحابہ میں آپ کی فقید المثال کتاب ازالۃ الخفاء، قرۃ العینین وغیرہ ہندوستان کا وہ سرمایہ ہے جس پر ہمارا یہ نیم مسلم ملک ناز اور بجا ناز کرسکتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ترمذی کی شرح مبارک پوری کی؛ اور ابوداؤد کی شرح عظیم آبادی کی، صحیح مسلم کی شرح علامہ عثمانی مولانا شبیر احمد کی، بخاری کی املائی شرح علامہ امام کشمیری کی، اسی طرح آثار السنن علامہ نیموی کی، اعلاء السنن علامہ تھانوی کی، نیز ترمذی کی املائی شرح علامہ کشمیری و

Marfat.com

ومولانا رشید احمد گنگوہی کی، اور ابوداؤد کا حاشیہ مولانا خلیل احمد کا، موطا کا حاشیہ مولانا زکریا سہارنپوری کا، مفتی عبداللطیف رحمانی کی شرح غیر مطبوعہ ترمذی کی، موطا امام محمد کی شرح مولانا عبدالحیی فرنگی محلی کی، اور ازیں قبیل چھوٹی بڑی کتابوں کی ایک بڑی تعداد اس سلسلہ میں لکھی گئی فن حدیث کے خدمات میں جس ملک کے پاس اتنا بڑا عظیم سرمایہ ہو میں نہیں سمجھتا کہ کس بنیاد پر اس کو اسی فن کے متعلق لاپروائی کے ساتھ متہم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تعلیقات حدیث میں غریب الحدیث رجال معرفۃ الصحابہ وغیرہ میں بھی ہندوستان نے ہر زمانہ میں کام کیا ہے۔ حسن صغانی اور احمد بن طاہر فتنی کی کتابوں کے سوا بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی، مقدمہ صحیح مسلم علامہ عثمانی کی، نخبۃ الفکر کی شرح ملا وجیہ گجراتی کی،

میں تفصیل کے درپے نہیں ہوں بلکہ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کسی زمانہ میں علم حدیث سے بیگانہ نہیں رہا۔ پانچویں صدی کی ابتداء سے علامہ اسماعیل محدث نے حدیث کو ہندوستان میں جب سے پہنچایا، شمالی ہند ہو یا جنوبی، مغربی علاقے اس ملک کے ہوں یا مشرقی سب ہی جگہ اس ملک کے خدام نظر آتے ہیں جنہوں نے درساً وتالیفاً وحفظاً اس فن کی خدمت انجام دی اور اب تک دے رہے ہیں بلکہ دن بدن ہندوستان کا تعلق علم حدیث سے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ خیال کہ حدیث میں ہمارا جو مستقبل شاندار نظر آتا ہے اس کی تعمیر میں ماضی کی تاریخ کو کوئی دخل نہیں ہے، قطعاً غلط ہے۔ میرے نزدیک تو بزرگوں کا موروثی مذاق ہی تھا جو بتدریج حسب اقتضاء زمانہ کے بڑھتا رہا۔ پچھلے دنوں چونکہ عمل بالحدیث کا دعویٰ کرکے ایک فرقہ اس ملک میں اٹھا اور اسلام طویل الذیل ابواب بیوع، وصایا، معاقل، شفعہ، دیات، مساقاۃ، مہایاۃ، دعویٰ، اقرار، شہادت سیر، جہاد، حج وصوم، زکوٰۃ، صلوٰۃ میں سے صرف صلوٰۃ کے باب سے اس نے کل تین یا چار مسئلوں (قراءۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع الیدین، وضع الیدین علی السرہ) کا انتخاب کرکے چھیڑنا شروع کیا کہ اس ملک کے مسلمانوں کو حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان چار مسئلوں میں ان کا طریقہ عمل حدیث کے خلاف ہے۔ حالانکہ ان مسائل چہارگانہ میں سے تین مسئلوں کے متعلق جو مطالبہ

تھا وہ صرف اولیٰ اور بہتر ہونے کا تھا، یعنی بہتر یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں میں جو طریقہ مروج ہے اس کو چھوڑ کر ان عاملین بالحدیث کے مشورہ کو قبول کیا جائے۔ اتنی شدت سے اس کا غلغلہ بلند کیا گیا کہ علماء ہند کو مجبوراً اپنی حدیث دانی کی مہارت کا اظہار کرنا پڑا، بلاشبہ ایک شر تھا جس سے خیر پیدا ہوا، یعنی علم حدیث کی طرف توجہ نسبتاً علماء ہند کی بڑھ گئی اور اب تو حال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تصنیفی و تالیفی کاروبار کے سوا علم حدیث کی مستقل شاخ فن اسماء الرجال کی کتابوں کی اشاعت میں ہندوستان کو ایسی خصوصیت حاصل ہوگئی ہے کہ اب ساری دنیائے اسلام اس فن کی کتابوں میں ہندوستان کی محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا عظیم کارنامہ حکومتِ اسلامیہ ہندیہ آصفیہ کے مطبع دائرۃ المعارف کا ہے، بارہ بارہ جلدوں تک کی کتابیں اس فن کی اسی مطبع نے شائع کیں، اور ایک نہیں تقریباً ایک درجن کتابیں اسماء الرجال کی دائرۃ المعارف کی نشریات مخصوصہ میں ہیں۔ ان کے سوا متن حدیث میں مسند طیالسی و مستدرک اور شرح حدیث میں سنن بیہقی کی دس ضخیم جلدیں شائع کر کے اسلامی جہان کو اس مطبع نے ششدر کر دیا ہے۔ اسی مطبع نے ہندوستان کے اس کام کو یعنی کنز العمال کو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے چھاپ کر شائع کیا نیز رجال کی بعض مختصر نادر کتابیں مطبع احمدیہ الہ آباد سے بھی شائع ہوئیں۔ اور ڈابھیل کی نومود مجلس علمی نے اپنی عمر کے اسی قلیل عرصہ میں نصب الرایہ زیلعی اور فیض الباری امام کشمیری کی املائی شرح بخاری چھاپ کر ہمارے سامنے بڑے بڑے توقعات قائم کر دیے ہیں۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اسلامی سلطنت آصفیہ نے آثار نبوت کی نشر و اشاعت میں جتنا بڑا کام کیا ہے، مشکل ہی سے کسی دوسرے اسلامی ملک کی اسلامی حکومت اس کی نظیر پیش کر سکتی ہو۔ یہ اکثر حضرات کو معلوم نہ ہوگا کہ مسند امام احمد حنبل مع منتخب العمال جو مصر میں چھپا ہے اس کے مصارف بھی آصف سادس نواب سر محبوب علی خاں مرحوم والیِ حیدرآباد دکن نے ادا کیے ہیں مگر تاکید تھی کہ کسی کو پتہ نہ چلے واللہ مخرج ما کنتم تکتمون۔ اللہ آج میرے ذریعہ یہ ظاہر کرتا ہے۔ اور ہندوستان میں سلاطین اسلامی کا فنِ حدیث سے یہ تعلق کوئی نئی بات نہیں ہے

Marfat.com

اسی جنوبی ہند میں جہاں آج دائرۃ المعارف اپنے طلائی کارناموں کو تاریخ کے اوراق پر ثبت کر رہا ہے آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے سلطان محمود شاہ بن حسن بہمنی المتوفی ۷۹۹ھ کے ترجمہ میں منجملہ اور باتوں کے ہم یہ بھی پاتے ہیں۔

جعل الارزاق السنیۃ للمحدثین	محدثین کی اس بادشاہ نے بڑی بڑی تنخواہیں جاری کر رکھی تھیں
لیشتغلوا بالحدیث بجمع الہمۃ	تاکہ باطمینان قلب کامل توجہ کے ساتھ علم حدیث کی اشاعت
والفراغ الخاطر و کان یعظمہم	میں معروف رہیں یہ بادشاہ محدثین کی بڑی عظمت کرتا تھا
غایۃ التعظیم (نزہۃ الخواطر ص۱۵۷)	

اسی دکن کی دوسری اسلامی حکومت بیجاپور میں جب ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا جس نے اہل سنت کا مذہب اختیار کیا تھا، اور آثار شریف، نیز مسجد جامع میں اُس نے درس حدیث کے لیے خاص کرکے علما مقرر کیے تھے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئیگا۔ گویا سب سے پہلے سرزمین ہند میں دارالحدیث قائم کرنے کا فخر ہند کے جنوبی حصہ ہی کو حاصل ہے۔

اب نہ سوچنے والوں کو کیسے سمجھایا جائے ورنہ اسی پر لوگوں کی نظر ہوتی کہ ہندوستان میں جس وقت امن و امان کا دور دورہ تھا، یہی وہ زمانہ ہے جب تاتاری فتنہ نے وسط ایشیا خراسان، ایران، عراقِ عرب، عراقِ عجم یعنی ان تمام علاقوں کو جہنم کدہ بنا رکھا تھا، جہاں اسلامی علوم کے مراکز قائم تھے ایسی صورت میں سلاطین ہند کی عام علمی قدر دانیوں کا حال سُن کر ہر قسم کے علمار کا ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا ایک قدرتی بات تھی، نیز ہندوستان سے ہر سال حجاج کا قافلہ عرب آجا رہا تھا، حرمین میں حدیث کے حلقوں کا دستور نایا دگار زمانہ سے جاری تھا، کیا یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے علمار حجاز جائیں اور اتنی سہولت سے ان کو حدیث کی سند ان مقامات میں مل رہی ہو، اس سے وہ مستفید نہ ہوں ہندوستان کے صوفیوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ ملک کی فضا چونکہ انہی کے زیر اثر تھی اس لیے انہوں نے زیادہ تر تصوف اور تصوف کی کتابوں کو ہندوستان میں مروج کیا، حالانکہ اگر واقعات کا یہ مطالعہ کرتے تو ان کو نظر آتا کہ ہندوستان کے اکابر صوفیہ ہی پر حدیث کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا تھا مشہور بات ہے کہ

Marfat.com

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا، حدیث ہی سے متاثر ہو کر باوجود سخت حنفی ہونے کے قرأۃ خلف الامام کرتے تھے، ایسٹی اودھ کے ایک مرکزی بزرگ صوفی شیخ فیاض جن کا شاید آئندہ بھی ذکر آئیگا بداؤنی نے ان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے۔ بجنسہ یہی بات ہندی تصوف کے دوسرے رکن رکین حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ بھی حدیث ہی کے زیر اثر فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے تھے[1]۔ ان ہی مخدوم بہاری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ دیوہ کے ایک بزرگ مولانا زین الدین دیوی جب بہار حضرت سے ملنے گئے تو ان کی خدمت میں جو تحفہ انہوں نے پیش کیا تھا وہ کوئی تصوف کی کتاب نہیں بلکہ

اھدی الیہ صحیح مسلم بن الحجاج النیساپوری (نزہۃ الخواطر۔ ص ۴۴) — تحفہ میں ان کے سامنے انہوں نے صحیح مسلم بن الحجاج النیشاپوری پیش کی تھی۔

یہ تھا ہندوستان کا رنگ آٹھویں صدی میں اور یہ رنگ بتدریج پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔ حافظ ابن حجر کے خلیفہ اکبر علامہ سخاوی کے ایک نہیں متعدد شاگردوں نے ہندوستان کو وطن بنایا اور جیتے جی اس ملک میں حدیث کا درس دیتے رہے، جن میں مولانا رفیع الدین الایجی الشیرازی اور مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا راجح کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ساحلی شہر احمد آباد کے محدث تھے۔ لیکن سخاوی کے دوسرے شاگرد مولانا رفیع الدین تو شمالی ہند کے مرکزی شہر آگرہ میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے، تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے کہ

در معقولات شاگرد مولانا جلال الدین دوانی و در حدیث شاگرد شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن السخاوی الحافظ المصری ست۔ (ص ۶۵)

شیخ محدث نے اخبار میں لکھا ہے:

---

[1] اس سے بحث نہیں کہ ان بزرگوں کا یہ خیال ترک قراہ خلاف سنت ہے کہاں تک صحیح ہے۔ جب امام شافعی جیسے ائمہ اس کے قائل ہیں تو پھر ان بزرگوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو یہ دکھانا ہے کہ جن کو فقہ حدیث کے باب میں بدنام کیا گیا ہے ان کا

Marfat.com

بشافہتہ حدیث را از وے (سخاوی) شنید و مدت مدید تلمذ نمود۔ ص ۲۵۲۔

سکندر لودی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا، آگرہ میں اسی بادشاہ کی خواہش سے آپ نے قیام فرمایا اور حدیث کا حلقہ قائم کیا۔

کیا تماشا ہے کسی صاحب کو ایک بے سند قصہ ہاتھ آگیا شمس الدین ترک نامی کوئی صاحب تھے جو چار سو کتابیں حدیث کی لے کر ہندوستان کی طرف چلے لیکن ملتان ہی میں خبر ملی، کہ ہندوستان کا بادشاہ علاء الدین خلجی نماز پنجگانہ کا پابند نہیں ہے اس لیے رنجیدہ ہوئے اور اُلٹے پاؤں لوٹ گئے۔ گویا ان ترک صاحب کا لوٹ جانا علم حدیث سے ہندوستان کی محرومی کا سبب بن گیا ورنہ خدا جانے کیا واقعہ پیش آجاتا، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوٹ کر کہاں تشریف لے گئے، خلجی کے زمانہ میں تو وسط ایشیا، خراسان و ایران تاتاری کفار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، کیا اسی فتنہ کی طرف لوٹ گئے، اور اگر کسی اسلامی حکومت ہی کی طرف اُلٹے پاؤں لوٹے تو ان کو دنیا کے کس خطہ میں ایسا بادشاہ مل گیا ہوگا جو اپنے وقت کا قطب تھا، یہاں بادشاہوں پر تنقید ہو رہی ہے، اور حال تو یہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے فرمانروا جو خلفاء کے نام سے موسوم ہیں ان کی زندگی دینی معیار پر کتنی درست تھی بلکہ ایک بڑی تعداد ان کی جیسی تھی وہ معمولی تاریخ پڑھنے والوں پر بھی مخفی نہیں، پھر کیا ان خلفاء کے زمانہ میں دمشق و بغداد کو چھوڑ کر محدثین بھاگ گئے تھے، ہو سکتا ہے کہ کسی صاحب کا کوئی خاص حال ہو، ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ سلاطین بلکہ خلفاء کے ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود علماء اپنے فرائض میں مشغول رہے، زیادہ سے زیادہ اگر کسی نے کچھ زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے تو یہی کیا ہے کہ فاسق امراء سے امداد یعنی اُنھوں نے منظور نہیں کی[1]۔

ایک طرف تو شمس الدین صاحب ترک کا یہ حال لوگ سناتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم

[1] ہماری علمی تاریخوں میں علماء سلف کے متعلق عموماً یہ الفاظ ملیں گے کہ فلاں صاحب نہ سلطان سے جوائز لیتے تھے نہ اخوان سے۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ۔ بعض سلطان سے نہیں لیتے تھے لیکن اخوان سے لیتے تھے جیسے سفیان ثوری۔ اخوان سے مراد عام مسلمان جو ان سے عقیدت رکھتے ہوں۔ بعض سلطان اور اخوان دونوں سے لیتے تھے جیسے ابراہیم نخعی امام اوزاعی وغیرہ

دیکھتے ہیں کہ علاء الدین خلجی نہیں بلکہ ہندوستان کا وہ خونیں بادشاہ محمد تغلق جس کے مظالم کی داستان کی گونج اس وقت تک ختم نہیں ہوئی ہے اور آئندہ اپنے اپنے موقع پر کچھ حالات اس کے اس کتاب میں بھی ملینگے، بہرحال علاء الدین خلجی جیسا کچھ بھی تھا لیکن محمد تغلق کے مقابلہ میں تو شاید اس کو فرشتہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اسی تغلق کے عہد میں شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال عالم نہیں، بلکہ علامہ جمال الدین مزی، حافظ شمس الدین ذہبی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلمیذ رشید مولانا عبد العزیز اردبیلی دلی تشریف لاتے ہیں اور محمد تغلق کے دربار میں باریاب ہوتے ہیں، نزہۃ الخواطر میں مولانا عبد العزیز کے تذکرہ میں یہ الفاظ درج ہیں۔

قرء بدمشق علی شیخ الاسلام تقی	دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین بن تیمیہ حرانی اور
الدین ابن تیمیۃ الحرانی وبرھان	برہان الدین برکج وجمال الدین مزی وشمس الدین
الدین البرکج وجمال الدین المزی و	ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی تھی، پھر ہندوستان
شمس الدین الذھبی وعلی غیرہم من	آئے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے
العلماء ثم قدم الھند وتقرب الی محمد	بادشاہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور بڑی
شاہ تغلق فاحسن الیہ واکرمہ ص۹۹	عزت کی۔

ابن بطوطہ کے حوالہ سے صاحب نزہۃ نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ مولانا عبد العزیز اردبیلی نے محمد تغلق کو ایک دن ایک حدیث سنائی جو بادشاہ کو بے حد پسند آئی، بہت خوش ہوا، اتنا خوش کہ جوشِ مسرت میں

قبل قدمی الفقیہ وامران یوتی	اس عالم (عبد العزیز اردبیلی) کے بادشاہ نے قدم چوم
بصینیۃ ذھب فیھا الفا تنکۃ	لیے اور حکم دیا کہ سونے کی سینی میں دو ہزار تنکے لائے
فصبھا علیہ بیدہ وقال لک مع	جائیں خود بادشاہ نے اٹھ کر مولانا پر ان تنکوں کو نچھاور کیا
الصینیۃ (نزہت ص۶۵)	اور کہا کہ سینی کے ساتھ یہ تنکے آپ کے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ شمس الدین ترک جیسے گمنام مولوی سے جب آج یہ نتیجہ نکالا جارہا ہے کہ علم حدیث کا جو دریائے بے کراں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، وہ خلجی کی بے دینی کی وجہ سے

Marfat.com

لے کر واپس ہو گئے، اور اسی لیے ہمارا ہندوستان علم حدیث سے بیگانہ ہو کر رہ گیا لیکن ابن بطوطہ کی اس چشم دید شہادت سے میں کیا نتیجہ نکالوں۔ سخاوی، ملا علی قاری، ابن حجر مکی وغیرہ کے تلامذہ کے سوا ابن تیمیہ، ذہبی، مزی جیسے کبار محدثین کے براہ راست شاگرد جس ملک میں آئے اور قیام کیا، ایسی زبردست قدر افزائیاں جن کی ہوئی ہوں کہ سر پر تنکے نچھاور کیے جاتے ہوں، وہاں علم حدیث کے چرچے کی کیا نوعیت ہو سکتی ہے۔ سو آپ کے سامنے محض سرسری طور پر صرف تذکرہ علماء ہند جیسی عام کتابوں سے جو فہرست محدثین کی اور ان کے خدمات کی آپ کے سامنے نکال کر میں نے رکھ دی ہے، کیا وہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے کافی نہیں جو اس زمانہ میں پھیلائی جا رہی ہیں کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اس سے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی قیمت پیدا کرنی مقصود ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ سعدی کا مطلب کچھ اس کے سوا ہے یعنی برطانوی عہد میں عمل بالحدیث کے نام سے مسئلہ چہارگانہ کا جو فتنہ اٹھایا گیا اور ان ہی چار مسئلوں کی اشاعت کا نام حدیث کی اشاعت رکھا گیا ہے، درپردہ ہندوستان کی حدیث کی سرگرمیوں کو اسی فتنہ کی طرف منسوب کرنا مقصود ہے، اب حدیث کی بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے ہندی نصاب تعلیم کے متعلق جو دوسری مشہور تنقید ہے، ذرا اس کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔

معقولات کا اِلزام

جو کچھ آج ہے یہی کل بھی تھا جن دماغوں کی یہ منطق ہے ان کی طرف سے ایک بڑا الزام ہندوستانی مولویوں پر یہ بھی ہے کہ ان کے نصاب کا بڑا حصہ ان لفظی گورکھ دھندوں اور ذہنی موشگافیوں بلکہ عقلی کج بحثیوں میں گم ہو گیا ہے۔ جن کی تعبیر عموماً "معقولات" کے لفظ سے کی جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ

لے ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت میں کیا کچھ کیا گیا ہے اس کی تفصیل پڑھنی ہو تو مولانا سید سلیمان ندوی کے مضامین کے اس سلسلہ کو پڑھنا چاہیے جو مدت ہوئی اسی عنوان سے معارف میں شائع ہوا ہے۔ اس وقت وہ مضمون میرے سامنے نہیں ہے، ورنہ شاید اور اضافہ کرتا، مولانا نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب ہی گویا لکھ دی ہے۔

اسلامی حکومت نے جس وقت اس ملک میں دم توڑا اور اپنی آخری سانس پوری کی ہے اس وقت عربی تعلیم گاہوں میں جو نصاب مروج تھا اُس کا یہی حال تھا، متن، متن کے ساتھ شرح، شرح کے ساتھ حاشیہ، حاشیوں کے حاشیوں کا ایک بے پایاں سلسلہ تھا جو پڑھایا جاتا تھا، اور قدیم درسگاہوں میں شاید اب بھی پڑھایا جاتا ہے[1]۔

لیکن معقولات کی بھرمار کا یہ قصہ کیا ہمیشہ سے ہے؟ میں اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، گویا یہ اس کی اجمالی تاریخ ہوگی۔ اس ملک کے تعلیمی نصاب کو جن انقلابات سے گزرنا پڑا ہو ظاہر ہے کہ ساتویں صدی یعنی باضابطہ وطن بنا کر مسلمان اس ملک میں جب آباد ہوئے تو اُس وقت عربی زبان عقلی علوم کی کتابوں سے معمور ہو چکی تھی، اس لیے ہمارا وہ حال تو ہو نہیں سکتا تھا، جو ان اسلامی ممالک کا ہے جہاں پہلی صدی ہی میں اسلام پہنچ چکا تھا، ان ممالک میں مدت تک مسلمانوں کے تعلیمی نصاب میں نہ منطق تھی نہ فلسفہ، نہ یہ چیزیں تھیں نہ رہ سکتی تھیں، لیکن جس زمانہ میں ہم اس ملک میں آئے ہیں، اس وقت اگرچہ سب کچھ ہو سکتا تھا، لیکن جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے مسلمانوں نے اس ملک میں پہنچ کر تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا، اس میں بچوں کو حسب دستور پہلے قرآن ناظرہ پڑھا لیا جاتا تھا۔ قرآن پڑھانے والے معلموں کو عموماً مقری کہتے تھے، آج ان مقریوں کی جو بھی حالت ہو لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے دنوں میں اس مسئلہ کو اتنی کس مپرسی میں نہیں ڈال دیا گیا تھا، جس میں وہ ہمارے عہد مرگ میں مبتلا ہے، حضرت نظام الاولیا سلطان جی سے فوائد الفواد میں یہ بیان منقول ہے کہ بداؤں جو حضرت کا مولد پاک ہے، وہاں جس شخص سے اپنے بچپن میں قرآن پڑھا تھا وہ ایک غلام ہندو تھا حضرت والا ہی کی زبانی اس "غلام ہندو" مقری کی تعلیم کا حال سُنیے فرماتے ہیں۔

[1] خاکسار نے مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے "سبحث علم" کا رسالہ قطبیہ اس طریقہ سے پڑھا تھا، قطبیہ، قطبیہ کی شرح میر زاہد کی۔ میر زاہد کا منہیہ پھر دونوں کے حواشی غلام یحییٰ بہاری کے، پھر مولانا عبدالعلی بحر العلوم کا حاشیہ، اور ان سب پر مولانا عبدالحق خیرآبادی کا حاشیہ۔ بیچ بیچ میں خود مولانا بھی اپنے ان حواشی کو پڑھاتے تھے جو اپنے اُستاذ کے حاشیہ پر انھوں نے لکھے تھے یعنی مولانا عبدالحق کے حاشیہ پر حاشیہ ۱۲

Marfat.com

"غلام ہندو بود و را شادی مقری گفتندے، یک کرامت او آں بود کہ ہر کہ یک تختہ قرآن
پیش او خواندے خدائے تعالیٰ او را تمام قرآن روزی کردے۔ (فوائد الفواد ص ۱۵۴)

ظاہر ہے کہ اس لفظ "ہندو" سے یہ مُراد نہیں ہو کہ وہ ہندو مذہب رکھتے تھے، بلکہ مطلب یہی ہے
کہ نسلاً ہندو تھے، مسلمان ہونے کے بعد ان کا نام شادی رکھ دیا گیا تھا، یہ لاہور کے رہنے والے
کسی صاحب کے غلام تھے، جن کا پیشہ بھی یہی بچوں کو قرآن پڑھانا تھا، اسی ملفوظ میں اس کا
بھی ذکر ہو کہ ان کے آقا لہاور (لاہور) میں رہتے تھے، غالباً مسلمان ہونے کے بعد اپنے آقا
ہی سے قرآن پڑھا، اُنھوں نے آزاد کر دیا، بداؤں میں آکر آقا ہی کے پیشہ کو اختیار کر لیا، بہر
حال باوجود نسلاً ہندو ہونے کے سُنیے بچوں کو قرآن پڑھانے والے اس زمانہ میں کس قابلیت
کے لوگ ہوتے تھے، سلطان جی ہی کی شہادت ہو کہ "قرآن بہ ہفت قرأت یاد داشت" (فوائد ص ۱۵۴)
یعنی سبعہ کے قاری تھے، یہ تو علم کا حال تھا، قال کے ساتھ جو حال تھا اُس کا اندازہ تو حضرت
ہی کے اسی بیان سے ہو سکتا ہو جس کی تعبیر آپ ہی نے کرامت سے فرمائی ہو۔ اس کے سوا
ان کی بعض اور کرامتوں کا بھی اس کتاب میں ذکر ہے، اس سے مسلمانوں کی اس نسلی تعصبی
کا بھی اندازہ ہوتا ہو جس کا تحفہ ہر جگہ مسلمان تقسیم کرتے پھرتے تھے، اللہ اللہ شودروں کو ملچھ اور
ناپاک سمجھنے والا، وید کی آیت اگر ان کے کان میں پڑ جائے تو پگھلے ہوئے رانگے سے اس کان
اور کان والے کو ختم کر دینا جس ملک کا مذہبی عقیدہ اور دھرم تھا، کیسا عجب تماشا تھا کہ اسی مُلک
کے ایک غلام کو قرآن پڑھایا جاتا ہو، قرآن کی ساتوں قرأتوں کا ماہر بنایا جاتا ہو، اور درسِ قرآن
کی مسند پر اُسے جگہ دی جاتی ہو، قریشی اور ہاشمی سادات شاگرد بن کر اس کے آگے زانوئے ادب
تہ کرتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہو کہ مقری یعنی
بچوں کو قرآن پڑھانے کا کام وہی لوگ کرتے تھے جو باضابطہ فنِ قرأت سے واقف ہوتے تھے،
علاء الدین خلجی کے عہد میں دلی کے ایک مقری کا ذکر صاحب نزہۃ الخواطر ان الفاظ میں فرماتے ہیں

الشیخ الفاضل علاء الدین المقری الدھلوی احد العلماء المبرزین فی القرأة والتجوید کان یدرس و یفید بدھلی۔ (ص ۸۵)	شیخ فاضل علاء الدین مقری دہلوی ان لوگوں میں سے ایک آدمی ہیں جو قراۃ و تجوید میں سرآمد روزگار تھے دلی میں لوگوں کو پڑھاتے اور فائدہ پہنچاتے تھے۔

جستہ جستہ کتابوں میں اس زمانہ کے مقریوں کا جو ذکر ملتا ہے، اگر جمع کیا جائے تو ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔

قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں میر خورد لکھتے ہیں

والدہ درمکتب فرستاد کلام اللہ بخواند و تمام کرد و کتابہا خواندن گرفت۔ (ص ۹۵)

ان کتابہائے سے فارسی ہی کی کتابیں مراد ہیں، جو عموماً اس زمانہ میں مکاتب میں پڑھائی جاتی تھیں کہ وہی حکومت کی زبان بلکہ مسلمانوں کی زبان بھی، فارسی اور فارسی کتابوں کا مذاق مسلمانوں پر کتنا غالب تھا۔ اس تاریخی لطیفہ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے، طباطبائی صاحب سیر المتاخرین نے بنگالہ کے بازیگروں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ دلی میں آکر جو تماشے ان بازیگروں نے دکھائے ان میں ایک دلچسپ تماشہ یہ تھا۔

کلیات سعدی شیرازی آوردند بکیسہ گزاشتہ چو برآوردند دیوان حافظ برآمد آں را چوں بکیسہ بردند دیوان سلمان ساوجی برآمد، بازچوں کیسہ نمودند دیوان انوری ہم چناں چند مرتبہ کتاب را درکیسہ کردند و ہر مرتبہ کتاب دیگر برآوردند۔ (سیر المتاخرین ص ۲۴۵ ج ۱)

سوچا جا سکتا ہے جس دور میں بازیگر بھی بازیگری میں سعدی و حافظ سلمان ساوجی انوری کے دواوین و کلیات ہی دکھایا کرتے تھے۔ اس وقت عام پبلک پر فارسی کی ان کتابوں کا کیا اثر ہوگا انگریزی کی عمر بھی ہندوستان میں قریب قریب سو ڈیڑھ سو سال کے ہو چکی ہے لیکن کیا اس تماشے میں ہندوستانیوں کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس میں شکسپیر، ٹنی سن، ورڈسورتھ، ملٹن وغیرہ کی نظموں

Marfat.com

کی کتابیں دکھائی جائیں۔

بہر حال تعلیم کی ایک منزل تو فارسی ہی کی کتابوں پر ختم ہو جاتی تھی، اگرچہ مجھے اس میں شک ہے کہ فارسی تک پڑھنے والے طلبہ بھی عربی میں کچھ شُد بُد پیدا کر لیتے تھے یا نہیں، چونکہ باوجود تلاش کے اب تک کوئی صریح شہادت اس سلسلہ میں مجھے نہیں ملی ہے، اس لیے دعویٰ تو نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانہ کے لکھے پڑھے آدمیوں کا جہاں کہیں تذکرہ ملتا ہے، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی بہت عربی اتنی عربی جس سے قرآنی آیتوں کا مطلب عام مشہور حدیثوں کا ترجمہ سمجھ لیتے ہوں، سب ہی سیکھ لیتے تھے۔ اسی لیے اس زمانہ کے لوگ بے تحاشا اپنے مراسلات وخطوط کتابوں میں قرآنی آیات اور حدیثوں کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ دانشمندوں (یعنی باضابطہ عربی زبان کے جاننے والوں) میں ان کا شمار نہیں ہوتا تھا۔

کچھ بھی ہو تعلیم کی ایک منزل ایسی ضرور تھی، جس کے ختم کرنے والے دانشمند، یا مولوی یا مُلّا مولانا وغیرہ الفاظ کے مستحق نہیں قرار پاتے تھے، اس کے بعد دوسری منزل شروع ہوتی تھی، یعنی باضابطہ عربی زبان میں عربی اور اسلامی علوم کے سیکھنے کا مرحلہ پیش آتا تھا، جہاں تک تلاش و تتبع سے معلوم ہوتا ہے تعلیم کا یہ حصہ بھی دو منزلوں میں منقسم تھا، میر خورد نے سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

چوں در علم فقہ واصول فقہ استحضارے حاصل کرد، شروع در علم فضل کرد" (ص ۱۰۱)

"شروع در علم فضل کرد" اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجہ تو فاضل کا تھا، جو علوم اور کتابیں اس درجہ میں پڑھائی جاتی تھیں ان ہی کا نام علم فضل تھا۔ اور اس سے پہلے گویا جو کچھ پڑھایا جاتا تھا فضل کے مقابلہ میں ہم اس کو "علم ضروری" کا درجہ قرار دے سکتے ہیں، یعنی اس کو ختم کیے بغیر کوئی مولوی (جسے اُس زمانہ میں دانشمند کہتے تھے) کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ دانشمندی کے اس درجہ کے لیے کن کن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا، اس کا پتہ حضرت عثمان سراج صاحب بنگال کے اس واقعہ سے چلتا ہے، میں کسی جگہ ذکر کر چکا ہوں کہ بنگال سے بالکل نو عمری میں یہ حضرت

نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں آکر شریک ہو گئے تھے، اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم کا شوق رکھتے تھے، کیونکہ میر خورد ہی نے لکھا ہے جب بنگال سے یہ دلی پہنچے تو

"کاغذ و کتاب خود کہ جز آں دیگر رختے (سامان ۱۲) نداشت" (ص ۲۸۸)

یعنی کاغذ کتاب کے سوا کوئی دوسرا سرمایہ اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، لیکن خانقاہ میں پہنچ کر واردین و صادرین کی خدمت میں کچھ اس طرح مشغول ہوئے کہ لکھنے پڑھنے کا موقعہ نہ مل سکا میر خورد لکھتے ہیں کہ جس وقت ہندوستان کے مختلف اقطار و جہات میں حضرت نے چاہا کہ اپنے نمائندوں کو روانہ کریں تو قدرتاً بنگال کے لیے ان ہی کی طرف خیال جا سکتا تھا کہ ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو لیکن اس کی قوم کی زبان کے ساتھ) قرآنی اصول کا اقتضا بھی یہی تھا لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ دانشمندی کے ضروری درجہ کی بھی تکمیل انہوں نے نہیں کی ہے، تو فرمایا۔

"اول درجہ دریں کار علم ست" (ص ۲۸۸)

حضرت مولانا فخر الدین بھی مجلس میں تشریف فرما تھے، انہوں نے سلطان جی سے عرض کیا۔

"در شش ماہ اورا دانشمند (مولوی) می کنم"

اور اسی کے بعد "دانشمندی" کے ضروری درجہ کی تعلیم حضرت عثمان سراج کی شروع ہو گئی، ان کو جو کتابیں پڑھائی گئی تھیں میر خورد بھی ان کتابوں میں حضرت عثمان سراج کے شریک تھے، انہوں نے ان کتابوں کی فہرست دی ہے، لکھا ہے

"الغرض خدمت مولانا سراج الدین در کبر سن تعلیم کرد، و برابر کاتب حروف (میر خورد)
در آغاز تعلیم میزان و تصریف و قواعد مقدمات او تحقق کرد" (ص ۲۸۹)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ شروع میں جیسا کہ اب بھی دستور ہے، صرف کی تعلیم سے ابتداء کی گئی، اس وقت بھی معلوم ہوتا ہے کہ میزان ہی سے عربی زبان شروع ہوتی تھی۔[1] آگے کتابوں کا نام

[1]: عبدالقادر بداؤنی اپنی تاریخ کے متعدد مقامات پر اس قسم کی عبارت لکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ وجیہ الدین (بقیہ ۱۴۴)

نہیں ہے، بلکہ صرف میں جو جو چیزیں سکھائی جاتی ہیں، مثلاً تصریف (گردان)، قواعد (تعلیل وغیرہ کے قاعدے) ان کو یاد کرائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان کی سادہ گردانوں کے بعد صرف کے متعلق جو دوسری چیزیں ہیں کسی خاص کتاب کا پڑھانا شاید ضروری نہ تھا خصوصاً سراج عثمان کے ساتھ مولانا فخرالدین کا جو وعدہ شش ماہ کا تھا اس کے لیے بھی غالباً ان کو خود اس کے لیے کام کرنا پڑا، میر خورد نے لکھا ہے کہ

مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ بجہت او تصریفے مختصر و مفصل تصنیف کرد و او را عثمانی نام نہاد۔[۲۹]

غالباً یہ وہی کتاب ہے جو عربی مدارس میں اس وقت تک زرادی کے نام سے مشہور ہے، خلاصہ یہ ہے کہ صرف کی تعلیم کے بعد دانشمندی یا مولویت کے درجہ ضروری ہیں ان کو جو کتابیں پڑھائی گئیں وہ یہ ہیں جیسا کہ میر خورد ہی رقمطراز ہیں کہ حضرت عثمان سراج نے مولانا فخرالدین سے صرف کی تعلیم پانے کے بعد

پیش مولانا رکن الدین اندپتی برابر کاتب حروف کافیہ و مفصل و قدوری و مجمع البحرین تحقیق کرد و بمرتبہ افادت رسید" (ص ۲۸۹)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کے سوا نحو میں کافیہ و مفصل اور فقہ میں قدوری و مجمع البحرین یہ دونوں کتابیں دانشمندی کے ضروری درجہ کے لیے کافی سمجھی جاتی تھیں، کافیہ تو نصاب میں اب بھی شریک ہی ہے، البتہ مفصل اب ایک زمانہ سے خارج از درس ہو چکی ہے، اسی کی قائم مقامی شرح ملا جامی کرتی ہے، اسی طرح فقہ میں قدوری بھی نصاب میں اس وقت تک شریک ہے، البتہ مجمع البحرین نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہ مجمع البحرین شرح وقایہ کی قائم مقام تھی، عام طور سے علماء اب مجمع البحرین سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ابن الساعاتی کی مشہور کتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳) گجراتی کے متعلق ہے کہ از صرف ہوائی تا قانون شفا و مفتاح یعنی صرف ہوائی سے لے کر ان بڑی بڑی کتابوں جیسے قانون و شفا ابن سینا مفتاح سکاکی پر ان کے حواشی ہیں جس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء ہند میں فلسفہ و طب و بلاغت کی یہ اعلیٰ کتابیں مروج تھیں، ان ہی کے ساتھ "صرف ہوائی" نامی کوئی کتاب بھی اس زمانہ میں ابتدائی کتاب صرف کی تھی۔

ہے۔ قدوری اور النسفی کے فقہی منظومہ دونوں کے مسائل کو پیشِ نظر رکھ کر ابن الساعاتی نے یہ متن مرتب کیا تھا، اور بڑا جامع مفید متن تھا، اس کی جگہ شرح وقایہ کب سے مروج ہوئی صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن ملا عبدالقادر نے شیخ احمدی فیاض[1] امیٹھوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

فقیر در صحبت شریف ایشاں رسیدہ زمانیکہ شرح وقایہ می گفتند۔ (ص ۸۴)

بہرحال میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں دانشمندی کے لیے علم کا جتنا حصہ ضروری خیال کیا جاتا تھا، اُس زمانہ کے حساب سے ہم اس کو شرح جامی اور شرح وقایہ تک کی تعلیم کے مساوی قرار دے سکتے ہیں، آگے میر خورد ہی نے لکھا ہے "بہ مرتبہ افادت رسید" یعنی عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے جتنے علم کی ضرورت اس زمانہ میں کافی سمجھی جاتی تھی چونکہ اتنا علم فراہم ہو چکا تھا اس لیے حضرت سلطان جی نے ان کو افادہ کے مقام پر سرفراز فرمایا۔

بہرحال اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے کہ فضل کے مقابلہ میں علم کا جو ضروری درجہ تھا اُس میں بس یہی صرف و نحو اور فقہ کی دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس درجہ تک ہمارے نصاب میں اس زمانہ کی حد تک نہ منطق کی کوئی کتاب داخل تھی اور نہ فلسفہ کی۔

ہاں! اس کے بعد فضل کا درجہ شروع ہوتا تھا، کبھی کبھی ملا عبدالقادر وغیرہ اس درجہ کی کتابوں کو "کتب منتہیانہ" بھی کہتے ہیں۔

درجہ فضل کی کتابیں

بالکل یقینی طور پر تو نہیں بتایا جا سکتا لیکن جستہ جستہ جو چیزیں مجھے ملی ہیں، مثلاً مولنا

---

[1] ملا صاحب نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ تفسیر حدیث و سیر تاریخ خوب می دانست۔ حدیث ہی کا غالباً اثر تھا کہ در قرأت فاتحہ عقب امام نسبت بہ میاں می گفت" یعنی ان کی طرف منسوب ہے کہ قراۃ خلف الامام کے قائل تھے (دیکھو ص ۸۴ ج ۳ بدایونی)

تاہم جو سلطان جی کے خواہر زادہ ہیں ان کی تفسیر لطائف التفسیر کے حوالہ سے میر خورد نے نقل کیا ہے کہ مولانا جمال الدین دہلوی سے انہوں نے

بشرف اجازت ہدایہ و بزدوی و کشاف و مشارق و مصابیح مشرف کردند۔

اور ایک اور سندھی عالم جلال الدین نامی ہی کے ذکر میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:۔

بدیم اشتغاله بالهدایه والبزدوی و المشارق والمصابیح والعوارف وغیرها (صـ۲۵ نزہۃ)

ہمیشہ ہدایہ، بزدوی، مشارق، مصابیح، عوارف وغیرہ کتابوں میں مشغول رہتے تھے۔ (یعنی درس و تدریس میں ان کتابوں کے لگے رہتے تھے)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ فضل یا جن کا نام "کتب منتہیانہ" تھا، وہ صرف یہی تھیں۔ یعنی فقہ میں ہدایہ اگرچہ ممکن ہے کہ ہدایہ کے ساتھ بعض دوسرے متون علاوہ قدوری و مجمع البحرین کے پڑھائے جاتے ہوں، کیونکہ محمد تغلق کے عہد کے مشہور عالم مولانا معین الدین عمرانی جنہیں تغلق نے شیراز قاضی عضد الدین صاحب مواقف کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، ان کے تصنیفات میں ہم کنز الدقائق کی شرح کا نام بھی پاتے ہیں، صاحب نزہۃ لکھتے ہیں

وللعمرانی مصنفات جلیلة منها شروح وتعلیقات علی کنز الدقائق والحسامی ومفتاح العلوم صـ۱۶۵

عمرانی کی چند بلند پایہ کتابیں ہیں جن میں کنز الدقائق حسامی و مفتاح العلوم کے شروح و تعلیقات بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ درس میں اگر یہ کتاب کنز نہ تھی تو شرح لکھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہو سکتی تھی، اسی طرح اصول فقہ میں اصول بزدوی آخری کتاب معلوم ہوتی ہے، اور اس کا چرچا ہم ہندوستانی تعلیم کے ابتدائی عہد میں بہت زیادہ پاتے ہیں، لیکن جیسے فقہ میں ہدایہ کے ساتھ کچھ اور ذیلی متون کا پتہ چلتا ہے، گذشتہ بالا عبارت نیز اس کے سوا دوسرے قرائن و تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول فقہ میں الحسامی اور اس کی شرح تحقیق بھی اس زمانہ میں پڑھائی جاتی تھی، ملا عبد القادر نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ شیخ عبد اللہ بداؤنی سے

زمانیکہ شرح صحائف در کلام وتحقیق در اصول فقہ بمازمتش می خواندم صـ۵۶ بداؤنی

جس سے معلوم ہوا کہ اکبری عہد سے پہلے حسامی کی شرح غایۃ التحقیق یہاں زیر درس تھی، کنز کے متعلق بھی ملا عبدالقادر نے لکھا ہی کہ بیاں حاتم سنبھلی سے

از کتاب کنز فقہ حنفی نیز سبقے چند تیمناً وتبرکاً خواند (صـ۲ ج ۳)

جو دلیل ہے کہ کنز بھی نصاب میں شریک تھی۔

اسی طرح ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیان دلّی کے عالم مولانا سعدالدین محمود بن محمد کا تذکرہ ہم کتابوں میں پاتے ہیں، جن کے تالیفات میں منار کی ایک شرح افاضۃ الانوار کا ذکر کیا جاتا ہی، جس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہندی نصاب میں اصول فقہ کا یہ مشہور متن یعنی المنار نسفی بھی داخل تھا، بعد کو اسی کی بہترین شرح ملاجیون ہندی نے نورالانوار کے نام سے لکھی جو مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔

تفسیر میں عموماً کشاف کا ذکر کیا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانہ میں کشاف سی ہندوستانی علماء کو خاص دلچسپی تھی، آٹھویں صدی کے ایک ہندی عالم مولانا مخلص بن عبداللہ نے کشف الکشاف کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اور ملا علی قاری نے آثار حنفیہ میں کیا ہی، حضرت سلطان جی نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ تعلیمی وتدریسی کاروبار سے بے تعلق ہو چکے تھے لیکن کشاف سے آپ کو بھی خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہی۔ فوائدالفواد میں مختلف مواقع پر اس کا ذکر ملتا ہے، میر خورد نے بھی حضرت والا کے ایک مرید مولانا رکن الدین جیغمر کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

درخط بے مثال زمانہ، بیشترے کتب معتبر چنانکہ کشاف ومفصل وجز آں بجہت حضرت سلطان المشائخ کتابت کردہ رسانید (ص ۲۱۰)

الغرض تفسیر میں معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانہ میں اس کو خاص اہمیت حاصل تھی، اگرچہ بعض علماء کے تذکروں میں مدارک کا بھی ذکر ملتا ہے۔ شیخ محدث نے اخبارالاخیار میں مولانا محمد شیبانی

Marfat.com

جن کا ذکر آگے بھی آرہا ہے ان کے حالات میں لکھا ہے۔

"تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے" (ص ۱۸۶)

تفسیر ہی میں دو اور کتابوں ایجاز اور عمدہ کا بھی ذکر کتابوں میں ملتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ علماءِ ہند کا ان کے ساتھ بھی استغال رہتا تھا، فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالے سے ایک قصہ کے سلسلہ میں یہ بیان منقول ہے۔

ازمولانا صدرالدین کولی شنیدم کہ اوگفت من وقتے بر مولانا نجم الدین سنامی بودیم اوازمن پرسید بچہ مشغول باشی گفتم بمطالعہ تفسیر اپرسید کدام تفسیر گفتم کشاف و ایجاز و عمدہ (ص ۱۰۹)

یوں ہی تفسیر نیشاپوری[1]، تفسیر عرائس البیان، تفسیر ناصری، تفسیر زاہدی یہ سب کتابیں بکثرت علماء کے زیر نظر تھیں اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جس عہد میں علماء اور مشائخ ہی نہیں بلکہ اس ملک کے وزراء و امراء بھی قرآن کی تفسیر لکھا کرتے تھے تو پھر اسی سے قیاس کرنا چاہیے کہ اس فن کے ساتھ دوسروں کی دلچسپیوں کا کیا حال ہوگا، تغلقیوں کے عہد کے مشہور امیر کبیر تاتار خاں[2] ہیں،

---

[1] تفسیر نیشاپوری کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان ہی میں بہ مقام دولت آباد دکن لکھا گیا ہے خود اسی کتاب میں سورۃ النساء کے خاتمہ پر مصنف ہی نے لکھا ہے۔ علقہ الحسن بن محمد المشتہر بنظام النیشاپوری ببلاد الہند فی دار مملکتہا المدعو بدولت آباد فی اوائل صفر ۷۳۰ھ دیکھو تفسیر مذکور برحاشیہ جریر طبری ج ۶ ص ۳۹ یعنی ۷۳۰ہجری میں بہ مقام دولت آباد کتاب کا یہ حصہ لکھا گیا اور یہ وہی زمانہ ہے جب دلی کو اجاڑ کر محمد تغلق نے دولت آباد کو بسانا چاہا تھا۔ بظاہر مصنف کتاب بھی دلی سے دولت آباد تمام مہاجرین کے ساتھ آئے۔ آٹھویں صدی کے آغاز کی غالباً یہ پہلی تفسیر ہے جس میں معنوی خصوصیات کے ساتھ بڑی خصوصیت ترجمہ کی ہے۔ ایران میں جو نسخہ اس کا چھپا ہے اور بعض قلمی نسخے اس کے فقیر کی نظر سے جو گذرے ہیں سب میں بالالتزام بزبان فارسی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ درج ہے۔ کیا تعجب ہے کہ محمد تغلق ہی کے اشارہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہو۔ ۱۲

[2] امیر تاتار خاں کی شخصیت بھی اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق کو اپنے فتوحات کے سلسلہ میں ایک پڑا ہوا بچہ ملا جس کے متعلق معلوم ہوا کہ آج ہی کا پیدا شدہ ہے، بے رحم ماں باپ اس بچہ کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے بادشاہ کو بچہ پر ترس آیا اور حکم دیا کہ شاہی نگرانی میں اس بچہ کو لے لیا جائے۔ یوں تاتار خاں کی پرورش شاہی محل میں ہونے لگی، خدا کی شان جب جوان ہوئے تو غیر معمولی دل و دماغ کا ثبوت پیش کرنے لگے۔ غیاث الدین نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی اور خاص لوگوں میں ان کو داخل کر لیا۔ (بقیہ برص ۱۴۹)

Marfat.com

جن کے حکم سے فتاوی تتارخانیہ مدون ہوا، ان کے حالات میں صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے۔

صنف کتابا فی التفسیر وسماہ التاتارخانی وھو اجمع ما فی الباب

انہوں نے ایک کتاب تفسیر میں لکھی جس کا نام تاتارخانی ہے اور اپنے موضوع میں وہ ایک جامع کتاب ہے۔

خیر فصل کے درجہ کی لازمی درسی کتاب کشاف ہی معلوم ہوتی ہے، حدیث میں مشارق الانوار کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ مصابیح بھی پڑھائی جاتی تھی۔

یہ تو دینیات کی کتابوں کی کیفیت تھی باقی نحو وصرف کے سوا علوم آلیہ میں معانی وبیان بدیع، عروض وقوافی کی کتابوں کے ساتھ ادب کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں عام طور پر ان کو علوم عربیت یا لغت ہی کہتے تھے۔ میر خورد نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ

"بقدر دوازدہ سالہ کم وبیش لغت می خواندم"

سلطان المشائخ ہی کے ایک مرید مولانا شمس الدین دہلوی کے ذکر میں صاحب نزہۃ نے نقل کیا ہے

کان فاضلاً بارعاً فی العروض والقوافی والشعر والانشاء وکثیر من العلوم والفنون (۵۶)

یہ فن عروض وقوافی شعر وانشا وغیرہ علوم میں ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے۔

افسوس ہے کہ ان علوم کی کتابیں جو اس عہد میں زیر درس تھیں تفصیل سے ان کا پتہ نہیں چلتا البتہ مولانا معین الدین عمرانی کے ذکر میں گذر چکا کہ انہوں نے سکاکی کی مفتاح العلوم پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸) محمد تغلق کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی بڑے بڑے جلیل عہدوں کے فرائض انجام دیے فیروز کے عہد میں بھی وزارت کے منصب پر مدتوں قابض رہے، علم سے خاص دلچسپی تھی، تاتارخاں کے حکم سے مولانا عالم نے چار ضخیم جلدوں میں فقہ حنفی کا فتاویٰ مرتب کیا جس نے تمام اسلامی ممالک میں خاصی شہرت حاصل کی حلب کے ایک عالم ابراہیم بن محمد نے اس فتاویٰ کی ایک تلخیص بھی تیار کی ہے، کشف الظنون میں اس فتاوی کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے اکثر علماء کو بھی نہیں معلوم ہے کہ یہ فتاویٰ کہاں تیار ہوا، عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ تاتاریوں میں سے کسی مسلمان بادشاہ کی مرتب کرائی ہوئی کوئی چیز ہے، کتابوں میں بکثرت اس کے حوالے آتے ہیں۔ اور ایک یہی کیا "فتاویٰ حمادیہ" حنفی فقہ کا کتنا مشہور فتاویٰ ہے، لیکن کون جانتا ہے یہ کتاب بھی ہندوستان ہی میں لکھی گئی؟

Marfat.com

شرح لکھی تھی۔ بہ ظاہر قیاس یہی ہوتا ہے کہ یہی کتاب معانی بیان وبدیع میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ تفتازانی کی دونوں کتابیں مختصر ومطول بعد کو ہندوستان پہنچیں اسی طرح ادب میں صرف مقامات حریری کا پتہ چلتا ہے سلطان المشائخ نے تو حریری زبانی یاد کی تھی، شیخ محدث دہلوی کے اس بیان سے کہ "مقامات حریری پیش شمس الملک کہ صدر ولایت بود تلمذ کردو یاد گرفت" (ص ۵۵) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید پوری حریری حضرت نے یاد فرمائی تھی، لیکن میر خورد نے لکھا ہے کہ

شمس الملۃ والدین کہ در علم وفضل درعصر خود مستثنیٰ بود وبیشترے استادان شہر شاگرد او بود ایں علم بحث کرد وچہل مقالہ حریری یاد گرفت (سیر الاولیا ص ۱۰۱)

جس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ صرف حریری ہی آپ نے شمس الملک سے نہیں پڑھی تھی بلکہ "ایں علم بحث کرد" یعنی علم ادب کی تعلیم ان سے حاصل کی تھی، دوسری بات یہ ہے کہ کامل حریری نہیں بلکہ اس کے چالیس مقامے یاد کیے تھے۔

بہرحال اس زمانہ کے ضروری اور نصاب فضل دونوں کے متعلق جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر وحدیث، فقہ، اصول فقہ کی دینیات میں اور نحو وصرف، ادب، معانی، بیان وغیرہ کی عربیت کے سلسلہ میں تعلیم ہوتی تھی، ابھی اس سے بحث نہیں کہ یہ تعلیم کس حد تک کافی ہوسکتی تھی، اس کا ذکر تو انشاء اللہ آگے آئیگا۔ میں بالفعل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معقولات کے جس الزام سے ہندی نظامِ تعلیم کو بدنام کیا جارہا ہے اس کا ان صدیوں میں یعنی ساتویں اور آٹھویں میں پتہ بھی نہیں چلتا، انتہا یہ ہے کہ منطق وفلسفہ، ریاضی وغیرہ تو دور کی چیزیں، علم کلام تک کی کتابوں کا ذکر عام علماء کے تدریسی نظام میں نہیں ملتا، البتہ آٹھویں صدی جب ختم ہورہی تھی، اور دلی میں لودیوں کے انھی پنجوں نے پھر ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، تو اس خاندان کے دوسرے بادشاہ سلطان سکندر لودی کے عہد میں جو ایک خاص تعلیمی انقلاب ہوا جس کا ذکر ابھی آرہا ہے، اس وقت کتابوں میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے، ملا عبدالقادر بدایونی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از منطق و کلام در ہند شائع نہ بود (بداؤنی ج ۱ ص ۳۲۳)

سکندر لودی ۸۹۴ھ میں تخت نشین ہوا، یعنی نویں صدی گویا گذر رہی تھی، اس وقت تک یہاں کے نصاب میں منطق اور کلام دونوں علوم کا سرمایہ لے دے کر قطبی اور شرح صحائف پر ختم ہو جاتا تھا، قطبی کو تو خیر سب ہی جانتے ہیں، لیکن یہ شرح صحائف کوئی اتنی ہی معمولی کتاب ہے کہ طاش کبری زادہ نے اس کی شرح کا تو ذکر ہی نہیں کیا ہے، صحائف کے متن کے متعلق لکھا ہے۔

الصحائف للسمرقندی لہ اقفہ علی — صحائف سمرقندی کی کتاب ہے، میں سمرقندی کے

ترجمتہ (ص ۳۹) — حالات سے مطلع نہ ہو سکا۔

بہر حال شرح شمسیہ یعنی قطبی کے ساتھ ممکن ہے کہ منطق کے بعض چھوٹے رسائل ایساغوجی وغیرہ بھی پڑھائے جاتے ہوں، بلکہ کلام کی حالت تو اس سے بھی زبوں تر معلوم ہوتی ہے، فتاوی تاتار خانیہ میں کلام اور کلامی مباحث کے متعلق یہ عجیب فقرے پائے جاتے ہیں، جسے خصوصیت کے ساتھ دولت ترکیہ عثمانیہ کے ایک عالم نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ہندوستان کے علماء کا جو خیال اس زمانہ تک علم کے متعلق تھا چونکہ اس کا پتہ چلتا ہے میں بھی نقل کرتا ہوں، فتاوی تاتار خانیہ میں علم کلام کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے

انہا تودی الی اثارۃ الفتن والبدع — علم کلام کے مسائل سے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور

وتشویش العقائد او یکون — نئی باتیں بدعات کو گویا برانگیختہ کرتا ہے۔ عقائد میں ان سے

الناظر فیہ قلیل الفہم او طالبا — پراگندگی اور پریشانی پھیلتی ہے۔ یا کلامی مسائل سے دلچسپی

للغلبۃ لا للحق — لینے والے عموماً کم سمجھ ہوتے ہیں یا ان کا مقصود تلاش حق

(منقول از مفتاح السعادہ) — نہیں بلکہ صرف دوسروں کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے

آج ممکن ہے کہ قدیم علمائے ہند کے اس فیصلہ کو تنگ نظری پر محمول کیا جائے لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ کلامی مباحث جس زمانہ میں بھی کسی ملک میں چھیڑے ہیں، بجز فتنوں کی پیدائش اور نئے نئے خیالات نئی نئی موشگافیوں کے اس کا حاصل کسی زمانہ میں بھی کچھ نکلا ہے؟

Marfat.com

"غیبی حقائق" یعنی جن سے عموماً علم کلام میں بحث کی جاتی ہے مثلاً عذاب قبر حشر و نشر الجنۃ والنار، معادیات کے سلسلہ میں یا حق تعالیٰ کی صفات و ذات کے مسائل مبدء میں، ان کے متعلق صاف اور سیدھا راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کو سچا مان کر پھر جو کچھ پیغمبران غیر محسوس غیبات کے متعلق علم عطا کرتے چلے جائیں، بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے آدمی مانتا چلا جائے جو صحابہ کا حال تھا، ورنہ دوسری راہ یہ ہے کہ سرے سے پیغمبر کے دعوئے نبوت ہی کا انکار کر دیا جائے لیکن پیغمبر کو سچا بھی مانتے چلے جانا، اور ہر وہ علم جو پیغمبر عطا کرتے ہوں اس میں شک اندازی بھی کرتے رہنا، سوچنے کی بات ہے کہ بلادت فہم، قلتِ عقل کے سوا اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے یا پھر یہی بات ہوتی ہے کہ بعض ناپاک و نجس اغراض کو سامنے رکھ کر لوگ ان مباحث میں اس لیے اُلجھتے ہیں تاکہ اپنی ذہانت کی داد لیں، انشا، کا زور دکھا کر عوام کو احمق بنائیں جس کا تماشا آج ہم ان رسائل و اخبارات میں دیکھ رہے ہیں، جنھوں نے اس قسم کے مذہبی مسائل کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا ہے، کبھی جنت کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے، کبھی ملائکہ کا، کبھی عرش کا، کبھی کرسی کا، کیا اپنے تفوق کے سوا ان لوگوں کے سامنے تلاشِ حق کا واقعی کوئی جذبہ ہو سکتا ہے۔

میں تو خیال کرتا ہوں کہ صرف یہی چند فقرے ان تازہ دم زندہ مسلمانوں کی صحتِ فہم، سلامت ذہن کا کافی ثبوت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں، زندہ قوموں کی زندگی کی پہلی علامت یہی ہوتی ہے کہ قدرت ان کے فہم عمومی کو سلجھا دیتی ہے اس کا کتنا کھلا ثبوت ہیں ان مسلمانوں کی اس رائے میں مل رہا ہے جو پردیس میں آباد ہونے اور اپنا دین پھیلانے کے لیے اس ملک میں حاکمانہ قوتوں کے ساتھ آئے تھے۔

خیر اس وقت میری بحث کا دائرہ صرف ایک تاریخی مسئلہ تک محدود ہے کہنا یہی چاہتا تھا کہ معقولات کا جو الزام ہندوستان کے اسلامی نصاب پر لگایا جاتا ہے اس کی ابتدائی تاریخ تو یہ تھی کہ دو سو سال یعنی سکندر لودی کے زمانہ تک معقولات کا جتنا حصہ ہمارے نصاب میں پایا جاتا تھا، وہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا۔

Marfat.com

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اتنے دنوں تک ہندوستان ان عقلی علوم سے ناآشنا رہا، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مسئلہ تو نصاب کا ہے، نصاب کی حد تک تو میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف ضروری بلکہ فرض کے درجوں میں بھی معقولات کا عنصر صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، یعنی لازمی طور پر اس نصاب کے ختم کرنے والوں کو معقولات کی جن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا وہ صرف یہ تھیں، لیکن جو لوگ کسی خاص فن یا شعبۂ زندگی میں ترقی کرنا چاہتے تھے ان کے لیے راستہ بند نہ تھا۔

اسی زمانہ میں جس وقت اس ملک میں مذکورہ بالا نصاب نافذ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ عوام ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سلاطین وملوک کے متعلق کتابوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً محمد تغلق ہی کے متعلق آپ کو عام تاریخوں میں یہ فقرہ ملیگا۔

در اکثر علوم خصوص تاریخ ومعقولات ونظم وانشا، وغیرہم مہارت تام داشت (سیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۳۴)

ظاہر ہے کہ جن فنون میں محمد تغلق کی خصوصی مہارت کا ذکر کیا گیا ہے ان میں تاریخ تو ایسا علم اس زمانہ میں نہیں سمجھا جاتا تھا جس میں وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے آدمی استاد کا محتاج ہو، میں جہاں تک خیال کرتا ہوں عہد حاضر سے پہلے کسی ملک اور قوم نے تاریخ کو تدریسی مضمون نہیں قرار دیا تھا، بلکہ ہمیشہ اس فن کا شمار ان فنون میں تھا، جن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کافی سمجھا جاتا تھا، صرف مسلمانوں نے اپنے عہد میں تاریخ کے اس حصہ کو جس کا تعلق نبوت وعہد نبوت وصحابہ سے تھا، چونکہ دین کی بنیاد اس پر قائم تھی اس لیے حدیث وسیر کے نام سے ایک خاص فن مرتب کر کے انھوں نے درس میں داخل کیا، جہاں تک میرا خیال ہے یورپ نے اپنے نشاۃ جدیدہ میں حدیث ہی کی جگہ اپنے اسلاف یونان وروما کی تاریخوں کو تعلیمی نصاب میں داخل کیا۔ بتدریج پھر بھی ذوق اتنا غالب آیا

Marfat.com

کہ یونانیوں اور رومیوں سے آگے بڑھ کر ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ جدید یونیورسٹیوں میں شریک نصاب ہوگئی، اور گو عام طور سے اس زمانہ میں مشہور کردیا گیا ہے کہ تاریخی واقعات کی تنقیح و تنقید کے اصول کو ابتداً یورپ نے مشہور اسلامی مورخ ابن خلدون سے سیکھا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابن خلدون نے اصول حدیث ہی کی روشنی میں بجائے خاص روایات کے عام تاریخی حوادث و واقعات پر بھی ان کو منطبق کرنا چاہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یوں بھی اسلامی مورخین کے ایک بڑے طبقہ کی نگاہوں سے تحقیق و تنقید کے یہ قاعدے اوجھل نہیں تھے، البرنی نے ایک ہندوستانی مورخ مولانا کبیر الدین دہلوی کے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں میں اُن کا ترجمہ نزہۃ الخواطر سے نقل کرتا ہوں، آپ ان پر غور کیجیے۔ البرنی مولانا کبیر الدین دہلوی کو ان الفاظ میں روشناس کرتے ہیں:-

احد العلماء البارعین فی السیر و التاریخ لم یکن لہ نظیر فی عصرہ فی الانشاء والترسل والبلاغۃ لانشاء بلیغ بالعربیۃ والفارسیۃ ومصنفات عدیدۃ فی التاریخ۔	ان علماء میں تھے جنہیں سیر و تاریخ میں خاص امتیاز حاصل تھا، انشاء اور فن ترسل و بلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، عربی و فارسی میں ان کے بلیغ انشاء کے نمونے موجود ہیں ان کی متعدد کتابیں تاریخ میں بھی ہیں۔

ان مدحی الفاظ کے بعد سُنیے وہی لکھتے ہیں:-

صنف کتبا فی فتوح السلطان علاء الدین محمد شاہ الخلجی ولکنہ بالغ فیہا فی المدح والاطراء و التانق فی العبارۃ خلافاً لآداب المؤرخین من ایراد الخیر والشر والحسن والقبیح والمناقب	انہوں نے علاء الدین خلجی کی فتوحات کے متعلق چند کتابیں لکھیں لیکن اپنی ان کتابوں میں بادشاہ کی مدح سرائی میں مبالغہ کیا اور عبارت میں زبردستی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی جو مورخین کے طریقے کے خلاف ہے یعنی مورخ کا فرض تو یہ ہے کہ بھلی بُری تعریف کی ہو یا مذمت کی سب ہی طرح کی باتیں جو واقع ہوئی ہوں

Marfat.com

المعائب۔ (نزہۃ ص ۱۱۵) انہیں بیان کرے۔

گو چند مختصر فقرے ہیں لیکن اسی سے آپ کو اسلامی مورخین کے اس نقطۂ نظر کا سُراغ مل سکتا ہے جو تاریخی واقعات کے اندراج میں ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

بلکہ سچ یہ ہے کہ اس زمانہ کی تاریخوں کی ثقاہت و اعتماد کا خواہ جتنا بھی جی چاہے ڈھنڈورا پیٹا جائے اور اس کے مقابلہ میں اسلامی مورخین کی تحمیق و تجہیل میں جتنا بھی مبالغہ کیا جائے۔ لیکن جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اُس کا کیسے انکار کیا جائے۔ آج بجائے تاریخ نگاری کے تاریخ سازی کا جو کام ہر قوم انجام دے رہی ہے، رائی سے پربت بنانے کی جو کوششیں مسلسل جاری ہیں، مقصد پہلے طے کر لیا جاتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے واقعات جمع کئے جاتے ہیں، ان میں پیشہ ورانہ چابکدستیوں سے رنگ بھرا جا رہا ہے اور ان ہی بنیادوں پر ایسی گمنام کس مپرس قومیں جو چند صدیوں پہلے کسی شمار و قطار میں بھی نہ تھیں، انتہائی دیدہ دلیریوں کے ساتھ ان کی تہذیب و تمدن کا افسانہ اونچے سروں میں گایا جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس و میکانکی ترقیوں کا موجودہ عہد بھی ان کے سامنے بے حقیقت تھا، ایک طرف تو یہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف تحقیق و تنقید کے ان مدعیوں کو دیکھا جا رہا ہے کہ گزشتہ واقعات ہی نہیں، بلکہ جن حوادث سے دنیا اس وقت گزر رہی ہے، اُن ہی کی تعبیر ہر قوم کے مورخین ایسے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کے بیان کو صحیح مانا جائے تو دوسرے کے بیان کو قطعی جھوٹ قرار دینے پر انسانی منطق مجبور ہو جاتی ہے۔ ابھی ابھی چند سال پیشتر جنگ عظیم کے حادثہ ہائلہ سے یورپ نکلا ہے جنگ کے مختلف فریقوں نے دن کی روشنی کے اس واقعہ کو جن شکلوں میں پیش کیا ہے کیا ان سے حقیقت تک پہنچنا آسان ہے؟ لیکن آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ اسلامی مورخین کے ابو الآباء علامہ ابن جریر طبری المولود ۲۲۴ھ نے آج سے تقریباً ہزار سال پیشتر اپنی مشہور تاریخ کے دیباچہ میں حسب ذیل رائے تاریخی واقعات کے اندراج میں قلم بند کی ہے۔

Marfat.com

ولیعلم الناظر فی کتابنا ھذا ان اعتمادی فی کل ما احضرت ذکرہ فیہ ما شرطت انی راسمہ فیہ انما ھو علی ما رویت من الاخبار اللتی انا ذاکرھا والآثار اللتی انا مسندھا الی رواتہا دون ما ادرک بحجج العقول واستنبط بفکر النفوس الا الیسیر القلیل منہ۔

میری کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کتاب میں جن واقعات کے ذکر کا میں نے ارادہ کیا ہے اور جن کی نگارش کا میں نے بیڑا اٹھایا ہے، ان کے متعلق میرا بھروسہ صرف ان خبروں پر ہوگا جن کا میں اس کتاب میں ذکر کرونگا اور جن کی سند ان واقعات کے بیان کرنے والوں تک میں پہنچاؤنگا لیکن عقلی استدلال اور ذہنی قیاس سے جو نتائج پیدا کیے جاسکتے ہیں میں ان کا ذکر نہیں کرونگا، مگر بہت تھوڑی نادر چیزیں۔

اس کے بعد علامہ اپنے اس طرز عمل اور التزام کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اذا کان العلم بما کان من اخبار الماضیین وما ھو کائن من انباء الحادثین غیر واصل الی من لم یشاھدھم ولم یدرک زمانھم الا باخبار المخبرین ونقل الناقلین دون الاستخراج بالعقول والاستنباط بفکر النفوس (ص ۵ ج ۱۔ الطبری)

کیونکہ گذرے ہوئے لوگوں کے واقعات اور جو حوادث گذر چکے ہیں ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا ہے ان تک ان کی خبریں براہ راست نہیں پہنچی ہیں، اور نہ انھوں نے ان کا زمانہ پایا ہے ان حوادث کے متعلق نقل کرنے والوں نے جو نقل کیا ہو ان کے علم کی یہی صورت ہے نہ کہ عقلی قیاس آرایوں اور فکری جولانیوں کی راہ سے ان کا علم حاصل کیا جائے۔

ذمہ داری کا یہی صحیح احساس اسلامی مورخین میں اس وقت تک بیدار رہتا تھا جب وہ واقعات کو اپنی کتابوں میں درج کرتے تھے، اسی لیے ہر قسم کی جذبہ داریوں سے الگ ہو کر ایک مورخ کا جو فرض ہوسکتا ہے وہ ادا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کبیر الدین دہلوی کی تاریخ ناقابل اعتبار ٹھہرائی گئی، ان پر الزام یہی لگایا گیا ہے کہ خیر کے ساتھ شر کا، اچھی باتوں کے ساتھ بری باتوں کا،

Marfat.com

حُسن کے ساتھ قبح کا، مناقب و محامد کے ساتھ معائب و مثالب کا ذکر انھوں نے نہیں کیا، جو مورخ کے فرض منصبی کے قطعاً خلاف ہے لیکن کیا کیجیے کہ تنقید و تحقیق، تبصّر و تفتیش کے ان بلند بانگ دعووں کے ساتھ جن کے چرچوں سے کان بہرے ہوگئے ہیں عملاً اس زمانہ کا محقق مورخ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ یہی کر رہا ہے۔

میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا جب کبھی فیصلہ کے لیے آمادہ ہوگی تو اُس کے سامنے کچھ قومیں تو ایسی نظر آئینگی جن کے حال کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی ان کی کوئی قومی تاریخ ہی نہیں ہے، زیادہ تر اقوام عالم کا یہی حال ہے اور عصر جدید کی روشنی میں قومیں جو اپنی تاریخیں بنا رہی ہیں، چونکہ یہ تاریخیں لکھی نہیں گئی ہیں بلکہ بنائی گئی ہیں اس لیے ان پر اعتماد کی کوئی امکانی صورت آنے والوں کے سامنے باقی نہ رہیگی، لے دے کر تاریخ کا جو حصہ بھی استناد کا درجہ حاصل کریگا، وہ اسلامی مورخین کی یہی غیر جانبدارانہ تاریخیں ان شاء اللہ ثابت ہونگی، مگر دنیا کبھی انصاف کے لیے آمادہ ہوگی، اس کی توقع مشکل ہے۔

یہ تو ایک ذیلی بات تھی جس کا ذکر کر دیا گیا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ محمد تغلق کے متعلق جب کہا جاتا ہے کہ معقولات میں مہارت تامہ رکھتا تھا تو اس مہارت کا کیا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اس نے عام مروجہ نصاب کے مطابق صرف قطبی اور صحائف تک علوم عقلیہ کی تعلیم ختم کر دی تھی، اور باوجود اس کے بھی اس کا شمار فنون عقلیہ کے ماہرین میں تھا یا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ ورنہ تو اس کی تعلیم عقلی علوم کی ان ہی کتابوں تک محدود تھی۔ آئندہ اُس نے صرف مطالعہ کے زور سے اپنی قابلیت بڑھائی تھی۔

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ قطبی صرف منطق کی ایک کتاب ہے، فلسفہ کے کسی مسئلہ سے اس کتاب کو دور کا بھی تعلق نہیں، رہی صحائف وہ تو عقائد کی ایک مختصر کتاب تھی، بھلا اس کے پڑھنے والے کی نظر الٰہیات، طبیعیات و ریاضیات وغیرہ کے فلسفیانہ ابواب تک کیسے پہنچ سکتی ہے، اور نہ ان کتابوں کو پڑھ کر بذاتِ خود کوئی شفا اشارات، مجسطی وغیرہ کا مطالعہ کر سکتا ہے اور ہم محمد تغلق

کو دیکھتے ہیں کہ وہ زیادہ شائق انہی کتابوں کا تھا، البدر الطالع شوکانی کے حوالے سے صاحب نزہت نے محمد تغلق کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

اهدی الیہ رجل عجمی الشفاء لابن سینا بخط یاقوت فی مجلد واحد فاجازہ بمال عظیم یقال انہ قدرہ مائتا الف مثقال او اکثر (ص ۱۳۵)	ایک ایرانی شخص نے محمد تغلق کے دربار میں ابن سینا کی شفار کا ایک نسخہ پیش کیا جو یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور ایک جلد میں تھا، تغلق اس سے اتنا خوش ہوا کہ پیش کرنے والے کو اس نے بڑا انعام دیا جس کا اندازہ کیا گیا تو دو لاکھ مثقال یا اس سے زیادہ ہوگا۔

اس کی تصریح شوکانی نے نہیں کی ہے کہ مثقال سے کیا مراد ہے چاندی کی یہ مقدار تھی یا سونے کی، صبح الاعشیٰ میں بھی قلقشندی نے ابن الحکیم الطیاری کے حوالہ سے تغلق ہی کا یہ قصہ نقل کیا ہے

ان شخصاً قدم لہ کتباً فی لحیثہ من جوھر کان بین یدیہ قیمتہا عشرون الفا مثقال من الذھب (ص ۹۵ ج ۵)	ایک آدمی نے محمد تغلق کے سامنے چند کتابیں پیش کیں، تو بادشاہ نے جواہرات جو اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے دونو ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے حوالہ کیے، ان جواہرات کی قیمت سونے کے سکہ کے لحاظ سے بیس ہزار مثقال تھی۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں بھی عقلیات ہی کی تھیں، بہرحال محمد تغلق کے اس اعلیٰ فلسفیانہ مذاق کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ کسی استاد سے پڑھے بغیر اتنی بصیرت ان علوم میں اس نے پیدا کر لی تھی، آخر فلسفہ تاریخ نہیں ہے جس میں مزاولت اور کثرت مطالعہ سے آدمی چاہے تو تبحر پیدا کر لے سکتا ہے۔ پھر جب تاریخ ہمیں بتلاتی بھی ہے کہ مولانا عضد الدین جن کے متعلق نزہۃ الخواطر میں ہے۔

احد العلماء المبرزین فی المنطق والحکمۃ	منطق و فلسفہ کے سربرآوردہ علماء میں سے ایک ہیں۔

اور یہی مولانا عضد الدین تغلق کے استاد تھے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے کہ

قرأ علیہ شاہ محمد تغلق	محمد تغلق شاہ نے انہی مولانا عضد الدین سے تعلیم پائی تھی

Marfat.com

ان کی تعلیم سے محمد تغلق کس حد تک متاثر تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو اسی کتاب میں ہے۔

اعطاہ اربعہ مائۃ الاف تنکہ یوم ولی الملک	چار لاکھ تنکے اس نے مولانا کو اس دن عطا کیے جس دن وہ ملک کا والی ہوا یعنی تخت نشین ہوا۔

میرا خیال ہے کہ تغلق نے ان ہی مولانا عضد الدین سے فلسفہ اور معقولات کی کتابیں پڑھی تھیں اب ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ کا رجحان ان علوم کی طرف ہو ناممکن ہے کہ ملک کے عام باشندوں پر اس کا اثر نہ پڑے، بھلا جس زمانہ میں منطق و فلسفہ کے اساتذہ کو چار چار لاکھ روپیہ وقت واحد میں بطور انعام بخشا جاتا ہو، فلسفہ کی ایک ایک کتاب کے معاوضہ میں پیش کرنے والے کو دو دو لاکھ مثقال مل رہے ہوں، اس زمانہ میں لوگوں کا جتنا رجحان بھی ان علوم کی طرف زیادہ ہو گیا ہو، محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں جب "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے عام کلیہ کا ممالک پر زیادہ اثر ہو۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے علما جو منطق و فلسفہ، ریاضی ہیئت ہندسہ میں کافی مہارت رکھتے ہیں، دلی میں ان کی معقول تعداد پائی جاتی ہے، وہی مولانا معین الدین عمرانی جو شیراز قاضی عضد کو لانے کے لیے بھیجے گئے تھے علاوہ علوم دینیہ کے لکھا ہے کہ

کان ذاقوۃ فی النظر وممارسۃ جیدۃ فی المنطق والکلام (ص ۱۶۵)	ان کی نظری قوت بڑی دقیق تھی، منطق اور کلام میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔

محمد تغلق ہی کے درباریوں میں ایک مولانا علم الدین بھی تھے، البرنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ معقولات کے تمام فنون میں یگانہ روزگار تھے، صاحب نزہۃ نے بھی لکھا ہے۔

احد العلماء المبرزین فی العلوم الحکمیۃ ... کان یدرس و یفید بدلھی	علوم حکمیہ (فلسفیانہ علوم) میں ان کا شمار سربرآوردہ لوگوں میں تھا یہ دلی میں درس دیتے تھے اور لوگوں کو علمی فوائد پہنچاتے تھے

Marfat.com

آگے یہ بھی لکھا ہو کہ

جعلہ محمد شاہ تغلق ندیمالہ و — محمد شاہ تغلق نے ان کو اپنا مصاحب بنالیا تھا، بادشاہ کے مقربین

کان یقربہ ویذاکرہ فی العلوم (ص) — میں تھے محمد شاہ ان سے علمی مسائل میں بحث و مباحثہ کرتا تھا۔

اور کچھ ایک محمد تغلق کی خصوصیت نہیں ہو، تغلق سے پہلے اور تغلق کے بعد جن جن خاندانوں کے سلاطین دلّی میں یا دوسری صوبہ واری حکومتوں میں تھے تقریبًا ہر ایک کے زمانہ میں ان علوم کے ماہرین کا ایک گروہ پایا جاتا ہو، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ حکومت ان کو اسی لیے وظائف جاگیر وغیرہ دے کر بٹھا دیتی تھی کہ ملک میں نصابی علوم کی تعلیم کے بعد کسی خاص فن کا اگر کسی کو ذوق ہو تو اپنی اس علمی پیاس کو ان لوگوں سے بجھا سکتا ہے۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں مولانا عبدالعزیز دہلوی ایک مشہور عالم تھے جن کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہو "احد العلماء المبرزین فی العلوم الحکمیہ" یعنی فلسفیانہ علوم میں اپنے وقت کے سر برآوردہ لوگوں میں تھے، صاحب نزہۃ نے لکھا ہو کہ ان ہی مولانا عبدالعزیز نے سنسکرت کی ایک کتاب جس کا نام "باراہی سنگھتا لاپتل بہت بن مارہ مہر" بتایا ہو اُس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے، لکھا ہو کہ

ترجم منہا احکام الکسوف والخسوف — اسی کتاب سے مولانا عبدالعزیز نے چند گرہیں، سورج گرہن

وکاشنات الجو وعلامات المطر و — اور فضائی حوادث (ابر و باد وغیرہ) بارش کی علامتیں، علم

علم القیافۃ والفال وغیرہا ص — قیافہ اور فال وغیرہ کا ترجمہ کیا۔

نزہۃ الخواطر سے ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس فارسی کتاب کا ایک نسخہ عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مدظلہ العالی کے کتب خانہ میں موجود ہو۔

فیروز شاہ ہی کے عہد میں مولانا جلال الدین کرمانی ایک عالم تھے لکھا ہو کہ

کان عالما بارعًا فی المعقول والمنقول ص — عقلی اور نقلی علوم میں ماہر تھے۔

میں صرف چند نظائر پیش کرنا چاہتا ہوں، استیعاب مقصود نہیں ہو، بتانا صرف یہ ہو کہ جس زمانہ میں ہندوستان کا عام تعلیمی نصاب معقولات میں صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود

تھا، ان ہی دنوں میں عقلی علوم کے ان ماہرین کی ایک بڑی جماعت اس ملک میں درس و تدریس میں مصروف تھی، جن لوگوں کو ان علوم کا شوق ہوتا تھا، وہ بطور اختیاری مضامین کے عام نصاب کی تکمیل کے بعد ان علوم کو پڑھا کرتے تھے، لوگوں کو معلوم نہیں ہے ورنہ جب کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ منطق و فلسفہ کے مشہور امام علامہ قطب الدین الرازی[ؒ] التحتانی کے براہ راست شاگرد بھی ہندوستان پہنچ کر فنونِ عقلیہ کی تعلیم دے رہے تھے، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ان علوم کے متعلق کون کون سی کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہونگی، میرا مطلب یہ ہے کہ فیروز تغلق نے علاء الدین خلجی کے بنائے ہوئے تالاب کے بند پر جو ایک خوبصورت عمارت تیار کی تھی جس کے متعلق برنی کے حوالہ سے صاحب نزہتہ نے نقل کیا ہے۔

کان بنائها طویل العماد متسع الساحة کثیر القباب والصحون لم یعمر مثلها قبلها ولا بعدها (نزہتہ ص ۲۲)	اس کی عمارت لمبے لمبے اونچے ستونوں پر قائم تھی اور ایک وسیع میدان میں تھی، عمارت پر بکثرت قبے بنے ہوئے تھے، نیز بکثرت درمیان درمیان میں صحن تھے، ایسی عمارت مدرسہ کی نہ اس سے پہلے بنی نہ بعد۔

البرنی نے تو یہاں تک اس عمارت کے متعلق مبالغہ کیا ہے کہ

انها من عجائب الدنیا فی ضخامتها وسعة ممرها وطیب مائها وهوائها ما ابتغی من دخلها عنها حولا (ص ۲۳)	اپنی جسامت اور عظمت نیز وسیع گذرگاہوں پاکیزہ آب و ہوا کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہونا چاہئے جو اس میں داخل ہو جاتا ہے پھر اس سے نکلنا نہیں چاہتا۔

---

[۱] صاحب مفتاح السعادہ نے لکھا ہے کہ قطب الدین رازی مصنف قطبی اور قطب الدین شیرازی شارح حکمۃ الاشراق و مصنف درۃ التاج وغیرہ یہ دونوں ہم نام وہم عصر عالم ایک ہی زمانہ میں شیراز کے ایک مدرسہ میں اُستاذ مقرر ہوئے، بالائی منزل پر شیرازی پڑھاتے تھے اس لیے ان کو قطب الدین فوقانی اور نچلی منزل میں قطب الدین رازی درس دیتے تھے اس لیے ان کو قطب الدین تحتانی کہتے تھے۔

Marfat.com

عمارت جب تیار ہوگئی تو اس دانش پژوہ معارف پرور بادشاہ نے اس کا مصرف یہ لیا کہ علامہ قطب الدین رازی کے تلمیذ رشید مولانا جلال الدین دوانی جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ کو اسی عمارت میں ٹھہرایا گیا، اور مولانا نے اس عمارت کو اپنا مدرسہ بنالیا، نزہۃ الخواطر میں ان ہی مولانا جلال الدین کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

احد العلماء المشهورین بالدرس والافادة قرء العلم علی المشیخ قطب الدین الرازی شارح الشمسیه وقدم الهند (ص ۲۳)	درس و افادہ میں جو علماء مشہور رہیں ان میں یہ ایک سربرآوردہ عالم آپ کی ذات بھی ہے آپ نے علم شمسیہ کے شارح شیخ قطب الدین رازی سے حاصل کیا اور ہندوستان تشریف لائے۔

آگے اسی بالائے بند کی عمارت میں مولانا کے درس و تدریس کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاص فن (معقولات) کے سوا مولانا اس مدرسہ میں حدیث و تفسیر کا بھی درس دیتے تھے لکھا ہے۔

کان یدرس الفقه والحدیث والتفسیر وغیرها من العلوم النافعة۔	وہ فقہ حدیث و تفسیر اور دوسرے نفع بخش علوم کی وہاں تعلیم دیتے تھے۔

صاحب نزہۃ نے اس کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وانتفع به ناس کثیر و اخذوا عنه (ص ۲۲)	ان سے لوگوں کو بہت نفع پہنچا اور بکثرت لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا۔

اور صرف قطب الدین رازی ہی نہیں بلکہ اہل تاریخ خصوصاً دکن کی تاریخ کے جاننے والوں پر مخفی نہیں کہ بہمنی حکومت کا مشہور علم دوست اور خود عالم متبحر حکیم بادشاہ سلطان فیروز شاہ بہمنی نے مولانا فضل اللہ اینجو سے تعلیم حاصل کی تھی، مولانا غلام علی آزاد نے مولانا اینجو کے متعلق لکھا ہے کہ۔

فضل اللہ اینجو شاگرد رشید علامہ تفتازانی (روضۃ الاولیاء ص)	یعنی فضل اللہ اینجو علامہ تفتازانی کے شاگرد رشید ہیں۔

Marfat.com

صرف یہی نہیں بلکہ علامہ تفتازانی کے معاصر و ہم چشم علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کے براہِ راست پوتے میر مرتضیٰ شریفی نے بھی ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا، ملا عبدالقادر نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

نبیرہ میر سید شریف جرجانی ست قدس سرہ در علوم ریاضی و اقسام حکمت و منطق وکلام فائق بر جمیع علمائے ایام بود۔

یہ (میر مرتضیٰ) میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں، ریاضی اور فلسفہ کے تمام شعبے منطق اور کلام میں اپنے عہد کے تمام علماء پر ان کو برتری حاصل تھی۔

اور یہ چیزیں تو خیر ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں، بڑا امتیاز ان کا یہ تھا کہ

در مکہ معظمہ رفتہ علم حدیث در ملازمت شیخ ابن حجر اخذ کردہ اجازت تدریس یافت (ص ۳۲۰ ج ۳)

مکہ معظمہ جاکر علم حدیث انہوں نے شیخ ابن حجر سے حاصل کیا اور اس کے پڑھانے کی اجازت حاصل کی۔

یعنی وہی علم جس کے متعلق باور کرایا گیا ہے کہ اس میں ہندوستان کی بضاعت مزجاۃ ہے حرم کے مسند الوقت سے اس کی تعلیم اور سند حاصل کر کے میر صاحب نے ہندوستان میں اپنے فیض کا دریا جاری کیا تھا، بدائونی نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ سے میر صاحب

بدکن آمد، از دکن بہ آگرہ آمدہ بر اکثرے از علماء سابق ولاحق تقدیم یافت و بدرس علوم و حکم اشتغال داشت تا در سنہ اربع وسبعین وتسعمائۃ (۹۷۴ھ) بروضہ رضوان خرامید (ص ۳۲۱)

پہلے دکن تشریف لائے اور دکن سے آگرہ (اکبر بادشاہ کے زمانہ میں) آئے، یہاں پہنچ کر ان کو اگلے پچھلے علماء سب پر تقدم حاصل ہوا، میر صاحب کا شغل علوم اور حکمت کا پڑھنا پڑھانا تھا ۱۲

اب جو قطب رازی یا تفتازانی و جرجانی کے علمی بلند پائگی سے ناواقف ہیں، ان کو اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن اہل علم کا جو گروہ ان بزرگوں کے کمالات و فضائل سے واقف ہے، خصوصاً عقلی علوم میں جو مقام ان لوگوں کا تھا، وہ کیا ایک لمحہ کے لیے یہ مان سکتا ہے کہ ہندوستان عقلی علوم و فنون جن کا اس زمانہ میں رواج تھا، ان سے بیگانہ رہ سکتا تھا، افسوس ہے کہ کوئی مفصل فہرست مجھ ان کتابوں کی نہ مل سکی جو ہندوستان میں منطق و فلسفہ، کلام، ریاضی، ہندسہ و ہیئت وغیرہ کی پڑھائی

Marfat.com

جاتی تھیں، یوں بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب ان بزرگوں کے یعنی رازی وتفتازانی کے براہ راست تلامذہ اور میر سید شریف کے سگے پوتے اس ملک میں اپنے حلقہائے درس قائم کیے ہوئے تھے، تو متداول کتابوں میں کونسی کتاب ہوگی جو نہ پڑھائی جاتی ہوگی۔ آج بھی جن کتابوں پر ہمارے یہاں کے علوم عقلیہ کی انتہا ہوتی ہے، مثلاً شرح مطالع منطق میں، محاکمات فلسفہ میں، شرح مواقف، شرح مقاصد کلام میں، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ساری کتابیں ان ہی بزرگوں کے رشحات قلم کے نتائج ہیں۔

اور کچھ یہ حال صرف منطق وفلسفہ ہی کا نہیں تھا ہر عہد میں ابتدا سے آپ کو ہندوستان کے عام مرکزی شہروں میں ایسے جلیل القدر اطبا نظر آئینگے جو علاج ومعالجہ کے ساتھ ساتھ طبی کتابوں کے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیتے تھے، نزہۃ الخواطر میں علاء الدین خلجی کے زمانہ کے مشہور طبیب مولانا صدر الدین الحکیم کے ترجمہ میں لکھا ہے۔

لہ ید بیضا فی علوم الالٰہیۃ والعالیۃ کان یتطیب ویدرس فی دار الملک دھلی۔ (ص ۶۱ نزہۃ)

ان کو ان علوم میں جن سے دوسرے فنوں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے یعنی علوم آلیہ اور بلند پایہ علوم (علوم عالیہ) میں زبردست دستگاہ حاصل تھی وہ طبابت بھی کرتے تھے اور پایہ تخت دہلی میں درس بھی دیتے تھے۔

خلجی ہی کے عہد میں حکیم بدر الدین بھی تھے، جن کی تشخیص وغیرہ کے قصے عجیب ہیں، نزہۃ ہی میں ان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے۔

انتھت الیہ رئاسۃ التدریس وصناعۃ الطب (ص ۱۶)

ان پر تدریس (یعنی علوم طبیہ کی تدریس) کی ریاست ختم ہوتی ہے اور فن طب کی۔

اسی طرح آپ کو اس ملک میں ان ہی علماء کے اندر اسٹرانومی (ہیئت) انجوم، اقلیدس وغیرہ کے ماہرین کا ایک گروہ نظر آئیگا جو پڑھنے والوں کو ان علوم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حسن گنگو بہمنی کے دربار میں صدر شریف کا شمار ان لوگوں میں ہے جو علوم ہندسیہ میں اپنے وقت کے امام تھے، نزہۃ الخواطر میں ہے کہ

Marfat.com

احد العلماء المبرزین فی الھیئۃ والھندسۃ و النجوم (ص ۶۳)	ہیئت، ہندسہ، نجوم میں سرآمد روزگار لوگوں میں سے تھے۔

اسی دکن میں مشہور ہیئت داں ملا طاہر تھے، جن کا پہلے تو خواجہ جہاں کے دربار سے تعلق تھا، لیکن بعد کو احمد نگر کے بادشاہ برہان نظام شاہ کے اصرار پر ملا طاہر کو خواجہ جہاں نے احمد نگر بھیجدیا ملا پیر محمد شروانی نے ان ہی سے مجسطی پڑھی تھی، اور ان کا یہی پڑھنا احمد نگر کے دربار سے تعلق کا ذریعہ بنا، ملا عبد النبی احمد نگری نے مذکورہ بالا واقعات کو اپنی مشہور کتاب دستور العلماء میں درج کرنے کے بعد لکھا ہو کہ برہان نظام شاہ ملا طاہر سے خود پڑھتا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

در ہفتہ دو روز بدرس علمائے پایہ تخت در آں مدرسہ (جواب جامع احمد نگر ہے) مشغول می گشت و کتب تحصیلی مذکور می شد، و در آں درس سید جعفر برادر شاہ طاہر شاہ حسن الجواد، و ملا محمد شیبا پوری، و ملا حیدر استر آبادی و ملا ولی محمد و ملا رستم جرجانی، و ملا علی مازندرانی، و ابو البرکۃ، و ملا عزیز اللہ گیلانی و ملا محمد استر آبادی و قاضی زین العابدین و قاضی لشکر ظفر بیگ، و سید عبد الحق کتابدار پرگنہ انبرا و شیخ جعفر و مولانا عبد الاول و قاضی محمد نور المخاطب بافضل خاں و شیخ عبد اللہ قاضی و دیگر فضلاء و طلبہ حاضر می شدند، و برہان نظام شاہ بااستاد خود ملا پیر محمد شروانی از شروع درس تا اختتام بدو زانوے ادب می نشست و خود ہم رد و قدح سوال و جواب می نمودہ (ضمیمہ دستور العلماء ص ۲۵)

ملا پیر محمد شروانی اکبر کے ساتھ دکن آتے ہوئے دریائے نربدا میں ڈوب مرے۔ ملا پیر محمد سے مجسطی پڑھنے کے بعد جس کا موقع ان کو دکن کے مشہور قلعہ پرینڈا میں ملا تھا، ملا طاہر کے متعلق برہان شاہ کے پاس یہ رباعی لکھ کر پیش کی تھی۔

در وصف کمالش عقلا حیرانند	بقراط حکیم و بو علی نادانند
با ایں ہمہ علم و فضل و کمال	در مکتب او الف می خوانند

اور ملا طاہر سے تو خیر دکن کا ایک بادشاہ پڑھتا تھا، حیرت ہوتی ہو کہ اسی سرزمین دکن میں ایسے بادشاہ بھی تھے جو دوسرے علوم کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ فن ریاضی کا درس دیتے تھے، فیروز شاہ بہمنی

Marfat.com

کے متعلق مولانا آزاد نیز دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ "درہفتہ روز شنبہ و دوشنبہ و چہارشنبہ درس می گفت" جس میں ایک دن یعنی ہفتہ کے پہلے دن شنبہ کو بادشاہ صرف "زاہدی شرح تذکرہ درہیئت و اقلیدس درہندسہ (روضۃ الاولیاء ص ۲۲) پڑھاتا تھا۔

فیروز شاہ کو علم ہیئت میں اتنا غلو پیدا ہو گیا تھا کہ آخر میں اُس نے طے کر لیا تھا کہ "در دولت آباد رصد بندد" بادشاہ نے اپنی امداد کے لیے اس فن کے چند ماہرین فن کو بیرون ہند سے بلایا بھی تھا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے حکم سے

حکیم حسن گیلانی، و سید محمد گازرونی باتفاق علماء دیگر باین کار مشغول شدند لیکن بنا بر بعضے امور کہ ازانجملہ فوت حکیم حسن علی بود کار رصد ناتمام ماند" (ص ۲۲)

انتہا تو یہ ہے کہ انہی علماء میں ایسے لوگ بھی تھے، جو موسیقی کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شیخ ضیاء الدین بخشی جو دراصل بداؤں کے باشندے تھے، عام علوم دینیہ کے سوا طب میں کمال رکھنے کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ

کانت لہ ید بیضاء فی الطب و الموسیقی ۱۰۶ ان کو طب اور موسیقی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی

ابن سینا کی طبی کتاب "کلیات قانون" کے مقابلہ میں آپ نے ایک کتاب "الکلیات و الجزئیات" نامی لکھی ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانی دواؤں کے ساتھ ساتھ خاص اُن دواؤں کا تذکرہ بھی التزام کے ساتھ کیا گیا ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں ہر جگہ ان دواؤں کے نام کو درج کیا ہے، جس نام سے وہ ہندوستان میں مشہور ہیں، حضرت ضیاء بخشی سلطان المشائخ کے معاصر ہیں، شیخ محدث نے ہی ان کا ترجمہ لکھا ہے یہ لطیفہ اسی میں ہے کہ

درزمان شیخ نظام الدین اولیاء سہ ضیاء بودند ضیاء سنامی کہ منکر شیخ بود، ضیاء برنی کہ معتقد و مرید او بود و ضیاء بخشی کہ نہ منکر بود نہ مرید[1] (ص ۱۰۵)

---

[1] مولانا ضیاء الدین سنامی اور سلطان المشائخ میں جو تعلق تھا اس کا ذکر شیخ محدث نے اخبار میں ان الفاظ میں کیا ہے "معاصر شیخ نظام الاولیاء بود و دائم بشیخ الدیست سماع اجتناب کردے" لیکن شیخ المشائخ نے (باقی بر صفحہ ۲۰۰)

اسی زمانہ میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جن کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں، صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے۔

اشہر مشاہیر الشعراء فی الھند لم یکن لہ نظیر فی العلم والمعرفۃ والشعر والموسیقی وفنون اخر قبلہ ولا بعدہ (ص ۳۸)

ہندی شعراء کی مشہور ترین ہستی جن کی نظیر علم و معرفت شعر اور موسیقی نیز دوسرے فنون میں نہ ان سے پہلے اس ملک میں پائی گئی اور نہ بعد کو۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ملا عبد القادر بدایونی باوجود ملا ہونے اور کیسی ملائیت کہ اکبر کا فتویٰ خود اپنے متعلق ملا صاحب نے یہ نقل کیا ہے کہ

چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیرے رگ گردن تعصب او را نتواند برید (بداونی ص ۳۹۹)

مگر اسی متعصب فقیہ کے متعلق مولانا آزاد نے لکھا ہے: — بین نوازی ہم بقدرے دانست[1] (مآثر الکرام)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) اس اجتناب کے متعلق جو آپ کرتے تھے لکھا ہے: "شیخ جز معذرت و انقیاد پیش نیامدے و در تعلیم مولانا دقیقۂ نامرعی نہ گذاشتے"

یہ قصہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ مولانا سنامی جب مرض الموت میں بیمار تھے، سلطان المشائخ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ وہی جو عمر بھر شیخ سے اجتناب کرتے تھے سنتے ہیں آج کیا کر رہے ہیں: "مولانا دستار چہ خود را بپائے انداز شیخ انداخت"، اپنی پگڑی حضرت کے قدموں کے نیچے بچھوائی تاکہ اسی پر چل کر بستر علالت تک آئیں، لیکن سلطان المشائخ نے کیا کیا۔ "شیخ دستار چہ برچید برچشم نہاد" حضرت نے مولانا کی پگڑی اٹھا کر آنکھوں سے لگائی، یہ قصہ اس زمانہ میں بزرگوں کے تعلقات قصہ اسی لفظ پر ختم نہیں ہوا، سلطان المشائخ جب سامنے آکر بیٹھے تو مولانا نے آنکھیں حضرت سے برابر نہ کیں، جوں ہی اٹھ کر مکان سے باہر ہوئے آواز آئی "مولانا برخاست" مولانا ختم ہو گئے، سلطان المشائخ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ایک ذات حامی شریعت بود حیف آں نیز نماند" (ص ۱۰۹)

یہ تھے محمدؐ کے غلاموں کے قلوب کی لاگ ڈانٹیں، آنکھیں الگ ہیں لیکن دل ہر ایک دوسرے کے ساتھ اٹکا ہوا ہے، آج آنکھیں ملی ہوئی ہیں، اور دل ٹوٹے ہوئے ۱۲۔

[1] جہاں تک ملا صاحب ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ان کا یہ ذوق دراصل "در عہد جوانی چنانکہ افتد دانی" ہی کے زیر اثر تھا، اپنی تاریخ میں ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے "دریں سال فقیر را نتائج قوارع مصائب و تازیانہائے مصائب گوش زد حق تعالیٰ از بعضے ملاہی و مناہی کہ بآں مبتلا بود تو بہ کرامت فرمودہ آگاہی بر زشتی اعمال و قبائح افعال بخشید ع "آہ اگر من چنیں بمانم آہ" ملا صاحب نے اس کے بعد چند شعر اور بھی لکھے ہیں جن کا ایک مصرع ہے ع بشنو از ناظم آواز بربط و طنبور" جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اس فعل کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے ایک کمزوری

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

اور اُس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، علم کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ان چیزوں کی گنجائش بھی نکل آئی تھی، ملّا عبد القادر تو خیر اکبر کے دربار کے ملّا تھے اپنی کمزوریوں کا انہیں خود اعتراف ہو، لیکن حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ تک کے متعلق مستند ذرائع سے یہ بات نقل کی جاتی ہو کہ فنی حیثیت سے آپ کا شمار موسیقی کے ماہرین میں تھا جس کی تصدیق ملفوظات عزیزیہ کے مختلف مقام سے بھی ہوتی ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں موسیقی بھی فلسفہ کی ایک مستقل شاخ سمجھی جاتی تھی، نہ صرف یونانی فلاسفر بلکہ حکمار کا جو گروہ مسلمانوں میں پیدا ہوا، عموماً اس فن پر بھی ان کی کتابیں پائی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اشراقی فلسفہ میں چونکہ علوم نیرنجات و طلسمات کو بھی داخل کر دیا گیا تھا، اس لیے باہر ہی میں نہیں ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو ان علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ملّا فتح اللہ شیرازی جو اکبری دربار کے مشہور عالم ہیں جن کا ذکر آگے بھی آرہا ہو ملّا عبد القادر نے ان کے متعلق لکھا ہو۔

دروادی الٰہیات و ریاضیات و طبیعیات وسائر اقسام علوم عقلی و نقلی و طلسمات و

نیرنجات و جرّ اثقال نظیر خود در عصر نداشت (بداؤنی، ص ۳۱۵)

"طلسمات و نیرنجات" دراصل اشراقی فلسفہ کی شاخ تھی، فلسفہ میں کمال حاصل کرنے والے ان فنون میں بھی مہارت حاصل کرتے تھے، خود شیخ مقتول شہاب الدین سہروردی کے متعلق کتابوں میں لکھا ہو کہ کبھی کبھی وہ اس قسم کے تماشے بھی لوگوں کو دکھاتے تھے[۱] مسلمان حکما ہیں

---

[۱] شائی لکھتے ہیں کہ دمشق سے نکلتے ہوئے راستہ میں شیخ الاشراق کا جھگڑا ایک گڈریے سے ہو گیا، گڈریے نے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، ایسا معلوم ہوا کہ مونڈھے سے شیخ کا ہاتھ اکھڑ کر گڈریے کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس حال کو دیکھتے ہی بیچارہ گڈریا تو ہاتھ پھینک کر بھاگ گیا، شیخ نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا، اور اپنے ساتھیوں سے آکر مل گئے، بجائے ہاتھ کے دیکھا گیا تو رومال تھا، امام اوزاعی سے ایک یہودی اشراقی کا قصہ اسی قسم کا منقول ہو کہ یہودی نے ایک مینڈک پکڑا، امام اوزاعی بھی سفر میں ساتھ تھے، عیسائیوں کے ایک گاؤں میں اس مینڈک کو جب بیچنے لگا تو دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ سور ہو، کسی غریب عیسائی نے سور سمجھ کر خرید لیا، جب یہودی دام لے کر گاؤں سے باہر ہوا تو پھر مینڈک اصلی صورت پر واپس آگیا، گاؤں والوں نے یہودی کا پیچھا کیا، امام اوزاعی کہتے ہیں کہ جونہی وہ لوگ قریب ہوئے یہودی کی گردن سے ایسا معلوم ہوا کہ سر الگ

Marfat.com

یہ چیزیں اشراقی فلسفہ کی راہ سے آئی تھیں، اور خواص ہوں یا عوام سب جانتے تھے کہ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فتح اللہ شیرازی جن علوم میں مہارت رکھتے تھے اس میں آپ "علم جرِ اثقال" کو بھی پا رہے ہیں یہ فن بھی "حکمت" کا ایک جزء تھا، نہ صرف بیرونِ ہند بلکہ ہر زمانہ میں وہی لوگ جو فلسفہ و منطق میں غلو رکھتے تھے حکمت کی اس شاخ سے بھی واقفیت رکھتے تھے، اسی فن اور علم الحیل کی مدد سے حکیم علی نے وہ مشہور تالاب بنایا تھا جس میں غوطہ مارنے کے بعد آدمی کو سیڑھیاں ملتی تھیں، ان سیڑھیوں سے نیچے اُترنے کے بعد ایک فرش و فروش کے سجے سجائے کمرہ میں آدمی داخل ہو جاتا تھا جس میں وہ دوازدہ (دس بارہ) آدمی کے اُٹھنے بیٹھنے کی گنجائش تھی، دسترخوان چنا ہوا ہے، طاقوں میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں، حکیم علی کے اس طلسمی تالاب میں اکبر بادشاہ بھی گیا تھا اور جہانگیر بھی تزک میں جہانگیر نے خود اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ پیش کیا ہے، حکیم علی کا چراغ بھی مشہور ہے، جس سے حمام چوبیس گھنٹے گرم رہتا تھا اور چراغ نہیں بجھتا تھا، مآثر الامراء وغیرہ میں ان ہی حکیم علی کے متعلق لکھا ہے کہ اکبر جب اطلاق بطن کے مرض میں مبتلا ہوا، دست کسی ترکیب سے نہیں رُکتے تھے، تو حکیم علی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) ہو کر زمین پر لوٹنے لگا، گاؤں والے یہ تماشا دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگے، اور وہی سر جو دھڑ سے الگ پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا اوزاعی سے پوچھ رہا تھا "یا ابا عمر این ذہبوا (ابو عمر کیا گاؤں والے بھاگے) انہوں نے کہا ہاں! تو اچھل کر پھر گردن پر قائم ہو گیا۔ اتحاف میں ان اشراقی تماشوں کا ذکر طاش کبری زادہ نے کیا ہے، مشہور مصنف علامہ سکاکی کے متعلق یہی لکھتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ مفتاح العلوم جیسی کتاب لکھتے تھے اور دوسری طرف اسی قسم کے علوم کے ذریعہ سے عجب تماشے دکھاتے تھے، روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ وزیر بغداد سے ان سے ایک دفعہ جھگڑا ہو گیا سکاکی نے عمل کے زور سے سارے بغداد کی آگ باندھ دی، کسی کے گھر کا چولھا روشن نہیں ہوتا تھا۔ تین دن کے بعد خلیفہ کو معلوم ہوا کہ سکاکی کی یہ شرارت ہے، لجاجت سے کہلا بھیجا کہ مخلوق مصیبت میں ہے اب اپنے عمل کو اٹھالیں، سکاکی نے کہلا بھیجا کہ "تا وزیر بر کون سگ من بوسہ ندہد چناں نہ کنم"۔ واللہ اعلم پھر کیا ہوا۔ یہ قصے ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ اس زمانہ کے علماء کا جو مذاق تھا اس پر ان سے روشنی پڑتی ہے۔ سکاکی کے متعلق روضۃ الصفا میں اور بھی قصے نقل کیے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایسے مولوی پائے جاتے تھے، شیخ علاء الدین کنتوری کا قصہ مشہور ہے شیخ احمد شرعی کی تسبیح کا قصہ بھی اخبار الاخیار میں پڑھیے عارف حسینی کے قصے بداؤنی نے لکھے ہیں ۱۲۔

بلا کر بہت غصہ ہوا، حکیم نے کیسہ سے دوا نکالی" درکوزہ آب انداخت فوراً بستہ شدہ (ص ۱، ۵ مآثر الامراء، ج ۱) یعنی دوا ڈالنے کے ساتھ ہی پانی برف بن کر جم گیا حکیم نے بادشاہ کو دکھایا کہ دوائیں تو ہمارے پاس ایسی ہیں لیکن آپ پر اثر نہ کریں تو میں کیا کروں، بادشاہ نے حکم دیا کہ یہی دوا مجھے دی جائے حکیم نے انکار کیا لیکن ضدی بادشاہ نے نہ مانا، اسی کو استعمال کیا، دست تو رُک گئے لیکن اب ایسا قبض و نفخ ہوا کہ اس کی اذیت بھی ناقابل برداشت تھی، پھر اطلاق و اسہال کی دوا دی گئی" اطلاق زیادتی کرد تا در گذشت (ص ۱، ۵) گویا اکبر کا یہی بیجا اصرار جان لیوا ہوا، واللہ اعلم بالصواب۔

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ تھی کہ اس زمانہ کے اہل علم ان علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، فتح اللہ شیرازی کے متعلق خود ان کے دیکھنے والے ملا عبدالقادر بداؤنی کی شہادت ہے کہ

در علوم عربیت و حدیث و تفسیر و کلام نیز نسبت او مساوی ست و تصانیف خوب دارد (بداؤنی ج ۳ ص ۱۵۳)

اور دوسری طرف تذکرہ علمار ہند میں اسی حدیث و تفسیر و کلام کے عالم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

"از مصنوعات او اشیائے بود کہ خود حرکت می کرد و آرد سائیدہ می شد و آئینہ کہ از دور و نزدیک اشکال غریبہ درو مرئی می گشت و بندوقے کہ بہ یک گردش دوازدہ آواز می داد" (ص ۱۶۰)

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب دربار اکبری میں بھی میر فتح اللہ کی تفسیر خلاصۃ المنہج و منہج الصادقین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ میر صاحب نے حسب ذیل چیزیں ایجاد کی تھیں۔

باد آسیا یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے، آئینہ حیرت نزدیک و دور کے عجائب و غرائب تماشے دکھاتا ہے توپ ہے کہ تخت پر چڑھی ہے، قلعہ شکن توپ ہے، پہاڑ سامنے آجائے تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ، ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر چڑھ جاؤ۔ (دربار اکبری ص ۶۸۱)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد ہی میں کیا کیا چیزیں یہی مدرسے کے ملا حاشیہ نویس ایجاد کر چکے تھے پانی کو روک کر اس کے نیچے مکان بناتے تھے برف جمانے تھے ایسی کوئی حرارت پیدا کر سکتے تھے جو بجھ نہیں سکتی تھی، حیوانی قوتوں کی امداد کے بغیر حرکت پیدا کرتے تھے اور ایسی تیز حرکت کر جس سے

Marfat.com

آتا پس جاتا تھا، پورٹ ایبل توپ جس وقت جس بلندی پر چاہیں اُسے چڑھا کر وہاں سے فیر کرسکتے تھے، اور سب سے عجیب تر بندوق وہ تھی جس سے ایک گردش میں دس آوازیں ہوتی تھیں گویا ایک قسم کی مشین گن تھی۔

اور کچھ اکبر کے زمانہ کی خصوصیت نہ تھی، اس سے پہلے بھی اہلِ علم کا طبقہ ہندوستان میں اپنے علمی کمالات کی نمائش مختلف شکلوں میں کرچکا تھا۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں لکھا ہے کہ ایک گھڑی ہندوستان میں ایجاد ہوئی تھی جس کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے۔

یخرج فی کل ساعۃ منہا صوت عجیب یترنم بھذا البیت ؎ — اس گھڑی سے ہر گھنٹہ پر ایک آواز پیدا ہوتی ہے یعنی نغمہ کے ساتھ یہ شعر گھڑی سے سنائی دیتا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

برساعتے کہ بردرشاہ طاس می زنند — "بادشاہ کے دروازہ پر ہر گھنٹہ میں جو گھڑیال بجاتے ہیں،

نقصان عمر می شود آں یاد می دہند — یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصّہ ختم ہوگیا۔"

واللہ اعلم اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ گھڑی ہونے کے سوا گویا ایک قسم کا گراموفون بھی تھا، کوئی ایسی ترکیب کی گئی تھی کہ بجائے بے معنی آواز کے اس سے یہ مسلّم شعر پیدا ہوتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اسلامی سلاطین کا کوئی ساز مانہ ہو، نہروں، تالابوں، سڑکوں، پل وغیرہ کے ذریعہ سے جو حیرت انگیز کام انجام دیے گئے، تعمیرات کا جو سلسلہ ان بادشاہوں کے عہد میں نظر آتا ہے، یا غبانی اور کاشتکاری کے متعلق جو اصلاحات مسلمانوں نے اپنے قرن میں ہندوستان میں جاری کیے شاید ان کی نظیر اس زمانہ میں بھی پیش نہیں ہوسکتی[1]، نزہۃ الخواطر میں صرف فیروز تغلق کے متعلق لکھا ہے کہ:

---

[1] اگرچہ نہ کسی اور کتاب میں دیکھا گیا ہے اور نہ روایۃً اس کا ذکر کسی سے سننے میں آیا ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سی تاریخ ہند فارسی میں ہے جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس کتاب میں بنگال کے بادشاہ غیاث الدین جسے حافظ کی غزل نے شہرت دوام بخشی ہے اس بادشاہ کے تذکرہ میں شیخ محدث لکھتے ہیں۔ در انجا د بنگال میں کسی جگہ) پلے بستہ است بقدر دہ روزہ راہ (ص ۹۰) اتنا بڑا پل جس پر دس دن تک لوگ مسلسل چلتے رہیں، میں نہیں جانتا کہ بنگال میں کہاں تھا یا کہاں ہے؟ یا واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے ۱۲۔

Marfat.com

انه حفر خمسين نهرًا وبنى اربعين مسجدًا و	اس بادشاہ نے پچاس نہریں کھدوائیں، چالیس
عشرين زاوية ومأته قصر وخمسين مارستانا	مسجدیں، بیس خانقاہیں، سو محلات اور پچاس
ومأته مقبرة وعشر حمامات ومأته جسر و	شفاخانے، سو مقبرے، دس حمام اور سو پل ڈیڑھ
مأته وخمسين بئرًا ص۱۱۱	سو کوئیں بنوائے۔

ظاہر ہے کہ باضابطہ انجنیری کے ماہروں کے بغیر ایسے کام کا انجام پانا ناممکن ہے، اسی کتاب میں ہے۔

اما الحدائق فانها اسس الفا ومائتي	(فیروز کے زمانہ میں) جو باغات لگے اس کی تفصیل یہ ہے
حديقة بناحية دهلى وثمانين حديقة	کہ اس شخص نے دو ہزار باغوں کی بنیاد قائم کی جن
بناحية شاه دراو اربعين حديقة بناحية	میں ۱۲ سو باغ تو دلی کے نواح میں تھے اور اسی باغ
چتور كانت فيها سبعة اقسام العنب[1]	شاہ درا کے نواح میں اور چالیس باغ چتور کے اطراف
(ص ۱۱۱)	میں ان باغوں میں صرف انگور سات قسم کے ہوتے تھے

کیا باغبانی کا یہ عظیم کاروبار نباتات میں علمی مہارت پیدا کیے بغیر جاری ہو سکتا ہے جس ملک میں کھٹے انگور بھی نہ مل سکتے ہوں، سات سات قسم کے شیریں انگور کیا محض ہندوستان کے جاہل مالی پیدا کر سکتے تھے، واقعہ وہی ہے کہ اس زمانہ کے اختیاری علوم وفنون میں سب ہی طرح کے علم تھے، اپنے اپنے ذوق کے مطابق جس علم میں جو چاہتا تھا کمال پیدا کرتا تھا[1] اور جو حال علوم کا تھا وہی زبانوں کا بھی تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مثلاً عربی زبان ہی کو لیجیے، عربی زبان کے الفاظ ومحاورات کا ایک ذخیرہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی آسمانی کتاب، پیغمبر کے ملفوظات اور ان کی زندگی یعنی حدیث اور مذہبی علوم مثلاً فقہ اصول فقہ، کلام وتصوف وغیرہ ہیں اتنی عربی کا سیکھنا تو ہر اس شخص کے لیے لازمی

[1] ملا نور الدین ہمایوں کے دربار کے ملا تھے۔ "در علوم ریاضی وہندسہ ونجوم وحکمت ممتاز" (ص ۱۹۰) بداؤنی۔ سرہند کے قریب سفیدون کا پرگنہ جاگیر میں ملا تھا، ملا عبد القادر بداونی نے لکھا ہے کہ "از آب جو دریائے جمنا جوئے کندہ تا بنجا آوردہ راہ بجانب کرنال واز آنجا پیش تر براہ کہ می رود واز آں آب زراعت بسیار کردہ باعث ترفیہ رعایا گردید" ص۱۹۰ یہ تھے اس زمانہ کے ملاؤں کے کارنامے۔

تھا جو دانشمند یا ملا مولوی بننا چاہتا تھا۔

باقی عربی زبان کا وہ حصہ جس میں نظم ونثر کا اعلیٰ ادب محفوظ ہے، اور جاہلیت و ایام جاہلیت کی چیزیں عربی کے جس حصہ میں پائی جاتی ہیں اس حصہ کی تعلیم اگرچہ لازمی تو نہ تھی، بلکہ اختیاری مضامین جیسے بہت سے تھے، ان ہی میں ادب عربی کا یہ حصہ بھی تھا، جن لوگوں کا میلان اس کی طرف ہوتا تھا، وہ اس میں خصوصی کمال پیدا کرتے تھے، ہر زمانہ میں آپ کو ایک گروہ اس قسم کے ادیبوں کا ہندوستان میں بھی نظر آئیگا، اس زمانہ میں جب سے انگریزی جامعات میں حکومت اپنی حاکمانہ ضرورتوں سے انگریزی ادب ہی کی تحصیل کو اصل قرار دیے ہوئے ہے، باقی علوم وفنون کی تعلیم بطور نمک چشی کے ہوتی ہے، تھوڑی بہت مشق اگر کرائی جاتی ہے تو حساب وکتاب کی، کہ اچھے کلرکوں کے لیے دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنے حکام عالی مقام کے مقاصد کو صحیح طور پر سمجھ کر اس کی تعبیر کر سکیں، اور اپنا مطلب ان کو سمجھا سکیں جس کے لیے انگریزی میں بول چال کی مشق ضروری ہے، اور دوسری ضرورت دفتریوں کے لیے یہ ہے کہ سرکاری حساب وکتاب کو درست رکھیں۔ ساری یونیورسٹیاں، ہندوستان کے کالج سب کا واحد مقصد صرف یہی ہے، لیکن سائنس وآرٹس ان کی مختلف شاخوں کے خوبصورت ناموں کا لبادہ اڑھا کر مقصد میں کامیابی حاصل کی جا رہی ہے جو کلرک بن رہا ہے، دفتری اور صرف کسی دفتر کا دفتری بنایا جا رہا ہے وہ مسکین سمجھ رہا ہے کہ میں مورخ بن رہا ہوں اور حکیم، ادیب بن رہا ہوں اور فلسفی۔

خیر مغربی جامعات کی تقلید میں عربی مدارس کے طلبہ سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ تم عربی زبان میں بولنے چالنے کی مہارت کیوں نہیں حاصل کرتے علماء کی قیمت جن فرضی اتہامات کی بنیاد پر گھٹائی جا رہی ہے یا ان کی جہالت کے چرچوں سے آسمانوں کو سر پر اٹھا لیا گیا ہے اس کی سب سے قوی تر دلیل یہ ہے کہ مولوی جب عربی میں تقریر وگفتگو پر قادر نہیں ہے، تو کیسے سمجھا جائے کہ وہ عربی داں ہے، حالانکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مولویوں کے لیے جس عربی کا جاننا ضروری ہے وہ صرف وہی عربی ہے جس میں ان کا دین ہے، باقی بازار میں خرید وفروخت کی عربی، یا اپنے حاکموں اور سرکاری

فسروں سے خطاب کرنے کے لیے جس زبان کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ اس عربی کی ضرورت ان ہی لوگوں کو ہوسکتی ہے جو عربی ممالک کے باشندے ہوں، لیکن جس ملک کی مادری زبان عربی نہیں ہے، وہاں کا حال تو یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ کی سیدھی سادی عربی جس کے اسی پچاسی فیصدی الفاظ سے ہندوستان کے مسلمان عموماً واقف ہوتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اسی حلقہ سے جس سے ایک طرف مولویوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے، کہ جب تک عربی زبان میں بات چیت کی مہارت تم حاصل نہ کرلوگے ہم تمہیں مولوی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان ہی کی طرف سے مسلسل اس کا تقاضا بھی پیش ہورہا ہے کہ خطبہ کی زبان بدلی جائے مسلمانوں کو بھینس بناکر کب تک یہ مولوی بین سناتے رہینگے۔

مجھے کہنا یہ ہے کہ عربی زبان میں بات چیت تقریر وخطابت کا مطالبہ بالکل ایک جدید مطالبہ ہے ورنہ مسلمانوں میں عقل کی کبھی اتنی کمی نہیں ہوئی کہ جس زبان کو وہ خود نہ سمجھتے ہوں اسی زبان میں وعظ وتقریر کرنے پر مولویوں کو اُنھوں نے مجبور کیا ہو، بلکہ ہر ملک میں علماء نے وہاں کے عوام کو عموماً اسی زبان میں خطاب کرنے کی کوشش کی ہے، جسے وہاں کے باشندے سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ عربی میں تقریر وبیان کے مسئلہ کو علماء نے ان ممالک میں جہاں کی مادری زبان عربی نہیں ہے کبھی اہمیت نہیں دی، لیکن اس کا یہ مطلب کبھی نہیں تھا کہ عربی زبان کے اسلامی ذخیرہ کے سوا عربی ادب کی عام نظم ونثر میں کمال پیدا کرنے یا اس زبان میں تقریر وتحریر کی قوت حاصل کرنے کا جنھیں شوق تھا، اس شوق کی تکمیل سے ان کو روکا گیا، عربیت کی عموماً کمزور ہونے کی شکایت سب سے زیادہ ہندوستان میں کی گئی ہے، لیکن ساتویں صدی سے اس وقت تک بتایا جائے کیا کوئی زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا ہے کہ بطور اختیاری مضمون کے اس ملک کے بعض اہل علم نے عربیت میں کمال نہ پیدا کیا ہو، آخری صدیوں کو تو جانے دیجیے، جن میں ملا محمود جونپوری، مولانا غلام علی آزاد حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہم جیسے نامی گرامی ادبا، اس ملک میں پیدا ہوتے رہے۔ میں قدوری اور بزودی والے دور کو لیتا ہوں، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے

کہ یہاں کے مولوی چند فقہی متون کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے آپ علامہ رضی الدین حسن صغانی کا ذکر سن چکے جو ہندوستان سے سفیر بن کر بارگاہِ خلافت بغداد بھیجے گئے تھے۔ ان ہی کی کتاب عباب سے فیروزآبادی نے قاموس تیار کی ہے۔ آپ یہ بھی سن چکے کہ خود سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کو حریری کے چالیس مقالے زبانی یاد تھے۔ فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر سواطع میں جس کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئیگا، عربی لغت میں اپنی جس دستگاہ اور تبحر کا ثبوت پیش کیا ہے، کیا اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے۔ خود حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ ارشد حضرت نصیر چراغ دہلوی کی صحبت کی ہم عجیب تاثیر پاتے ہیں، آپ کے مریدوں میں ایک نہیں متعدد حضرات مثلاً قاضی عبد المقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری، مولانا خواجگی وغیرہ کا ادب عربی سے خصوصی تعلق ہے، شیخ احمد تھانیسری اور قاضی عبد المقتدر کے عربی قصائد تو عام کتابوں میں نقل کیے جاتے ہیں، خصوصاً آخر الذکر کا لامیہ جس کا مشہور مطلع ہے

یاسائق الظعن فی الاسحار والاصل ۔۔۔ سلم علی دار سلمیٰ وابک ثم سل

یا شیخ احمد کا قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

اطار لبی حنین الطائر الغراد ۔۔۔ وھاج لوعۃ قلبی النائح الکمد

میں خود تو ادیب نہیں ہوں لیکن ارباب علم و معرفت سے سنا ہے کہ دونوں قصیدے ان بزرگوں کی اس مہارت اور قدرت کو ثابت کرتے ہیں جو عربی ادب میں انہیں حاصل تھی۔

مولانا خواجگی کی جلالتِ شان کے لیے یہی کافی ہے کہ علامہ شہاب الدین دولت آبادی ان ہی کے ساختہ و پرداختہ ہیں قصیدہ بانت سعاد کی جو شرح مصدق الفضل کے نام سے انھوں نے لکھی ہے اور ہر شعر کے متعلق صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض و قوافی ان سات

لہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشہور عربی قصائد جیسے کعب بن زہیر والا قصیدہ بانت سعاد، قصیدہ تائیہ ابن فارض قصیدہ بردہ وغیرہ کو عموماً لوگ زبانی یاد کرتے تھے۔ ملا مبارک ناگوری کے حال میں ملا عبد القادر نے لکھا ہے۔

قصیدۂ فارضیہ تائیہ کہ ہفتصد بیت ست و قصیدہ بردہ و قصیدہ کعب بن زہیر و دیگر قصائد محفوظ (ص ۷۲)

ادبی علوم سے بالالتزام بحث کرتے ہیں، وہی ان کی قابلیت کی کافی شہادت ہوسکتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کا یہ عہد یعنی سلطان المشائخ اور ان کے خلیفہ خاص حضرت چراغ دہلوی کا زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں ان بزرگوں کے ادبی ذوق نے دوسروں پر کافی اثر ڈالا ہے۔ یہ ایک مستقل مقالہ کا مضمون ہے۔ اس وقت میرے لیے صرف یہی اشارہ کافی ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے جس ملک میں قاموس کے حافظ ایک نہیں متعدد پائے جاتے ہوں، اسی کے متعلق باور کرایا جاتا ہے کہ چند نقلی متون کی عربی سے زیادہ ادب عربی کی قابلیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، برہان پور کے بزرگ شیخ عبدالوہاب جو آخر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں رہ گئے تھے جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، براہ راست شیخ محدث ان کے شاگرد ہیں، ان کی شہادت ہے۔ "قاموس لغت بے مبالغہ می تواں گفت کہ گویا ہمہ یادداشت ص ۲۷۲ (اخبار) مولانا غلام علی آزاد نے خود اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، لکھا ہے کہ قاموس اللغۃ من اولہ الی آخرہ؛ زبر داشتند (ماثر ص ۲۵۰) بلگرام کے ایک بزرگ شیخ عبدالکریم کے ترجمہ میں میر صاحب ہی نے لکھا ہے "مقامات حریری تمام بر نوک زبان داشت (ص)

اور بات کچھ کتابوں ہی یا نظم و نثر تک محدود نہ تھی، عربی میں تقریر و بیان کا جو مطالبہ آج مولویوں سے کیا جارہا ہے آپ کو اسی ہندوستان میں ایک سے زائد مثالیں ایسے علماء کی ملینگی جنہوں نے ہندوستان ہی میں تعلیم پائی، اور یہاں سے ایک دن کے لیے باہر نہیں گئے لیکن بے محابا عربی میں تقریر کرتے تھے، اجمیر شریف کے علماء میں ایک بزرگ شیخ محمد شیبانی ہیں، شیخ محدث نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے، بزبان عربی و فارسی تقریر کردے (ص ۱۸۴)

مالوہ کے اسلامی دارالملک شادی آباد مانڈو کے ایک بزرگ شیخ جلال الدین قریشی ہیں، شیخ محدث ہی ان کے متعلق بھی تصریح فرماتے ہیں بزبان عربی و فارسی و ہندی سخن کردے[۲۴۹]

اور یہ حضرات تو خیر طبقہ اہل علم سے تعلق رکھتے ہیں حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ جس ہندوستان کے متعلق "جاء الحکیم ورای النفس"[۱] کا لطیفہ بازاروں میں پھیلایا گیا ہے، اسی نیک نامی کے لیے زرگر

[۱] ملاحظہ ہو ص ۱۷۷

کو بدنام کیا جارہا ہے، اسی ملک کے بعض سلاطین ایسے تھے جو عربی زبان کے بہترین مقررین میں شمار ہوتے تھے، دکن کے بادشاہ سلطان محمود شاہ بہمنی انار اللہ برہانہ کے ترجمہ میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں۔

کان من خیار السلاطین عادلا باذلا کریما فاضلا عا۔ فا با اللغۃ العربیہ والفارسیۃ یتکلم بہما فی غایۃ الطلاقۃ (ص ۱۵۷)

نیک ترین بادشاہوں میں تھے عدل والے انصاف والے خیر و خیرات کرنے والے صاحب علم و فضل تھے عربی اور فارسی کے ماہر تھے دونوں زبانوں میں انتہائی فصاحت و زبان آوری کے ساتھ گفتگو کرتے تھے

اور یہ چند جستہ جستہ مثالیں ہیں اس بات کی کہ ہر صدی میں ایک طبقہ اس ملک میں ایسے لوگوں کا پایا جاتا تھا جس نے عربی کے سوا جسے میں خالص اسلامی عربی کہتا ہوں ادبی عربی کی بھی معیاری قابلیت رکھتا تھا جس کا سیکھنا ہر دانشمند یا مولوی کے لیے اگرچہ غیر ضروری تھا لیکن جن کو ادب کا فطری مذاق تھا ان کے لیے ساز و سامان کی اس ملک میں کبھی کمی نہیں رہی اور یہ کیفیت کچھ عربی ہی کی نہیں تھی، ہندی علما میں مجھے ایسے متعدد افراد نظر آتے ہیں جنہوں نے عربی کے تعلیمی مروجہ نصاب کو ختم کر کے ہندوستان کی خاص علمی زبان سنسکرت میں بھی کمال پیدا کیا ہے، نزہۃ الخواطر کے مؤلف نے شیخ علی حیدری کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

الشیخ الفاضل علی الحیدری احد القادمین الی بلاد الھند دخل الگجرات وسکن بمدینۃ کھمبائت ولازم احبار الھنود واخذ عنھم علوم اھل الھند وتعلم لغتھم وصحبھم مدۃ

فاضل شیخ حیدری ان علما میں ہیں جو باہر کے ہندوستان میں آئے اور کھمبائت میں قیام کیا، ہندو پنڈتوں کے گروہ سے انہوں نے اہل ہند کے علوم سیکھے ان کی زبان سیکھی اور مدت تک ان کے ساتھ رہے

(حاشیہ صفحہ ۱۷۷): واللہ اعلم واقعہ سے اس کا کس حد تک تعلق ہے کہ ایک ہندی مولوی کو ضرورت ہوئی اردو کے اس جملہ کی عربی بنانے کی بیٹی حکیم آیا اور اس نے نبض دیکھی تو اس اردو فقرہ کا مذکورہ بالا الفاظ میں اس نے جو ترجمہ کیا ہو ظاہر ہے کہ کایستھوں کی فارسی یا اس زمانہ کے عام ہندستانیوں کی سنتو ہیں کہ انگریزی پڑھ کر انگریز عموماً لکھتے ہیں؟

من الزمان واظهر علیہ حقیقۃ الاسلام　پھر جو پنڈت ان کا استاد تھا اس پر اسلام پیش کیا،
فمن اللہ تعالیٰ علیہ بالملۃ الحنیفیۃ　خدا نے پنڈت پر احسان کیا اور وہ مسلمان ہوگیا
البیضاء اسلم بسببہ خلق کثیر من اھل　اس کی وجہ سے گجرات میں لوگ بکثرت اسلام
گجرات لمن کانوا یعرفون فضلہ وکمالہ ص۹۶　میں داخل ہوئے۔

اور علی حیدر تو خیر باہر سے آکر ہندوستان میں متوطن ہوگئے تھے، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے بلگرام کے ایک عالم شیخ عنایت اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ "درجمیع فنون عربی وفارسی" میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ "ہندی (سنسکرت) وبھاکا وموسیقی ہندی اقتدارے بہم رسانند" ص ۲۲۲) اس وقت کے علماء کے متعلق جو رائے بھی قائم کی جائے لیکن مسلمانوں کے عہد حیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری جیسے فاضل یگانہ کی ایک طرف تو یہ کیفیت ہو کہ ایک طرف "شمس بازغہ درحکمت وفرائد درفن بلاغت املا کرد" کے سلسلہ میں ان کا قلم جولانی دکھارہا تھا، شاہ جہاں کو اس پر آمادہ کر رہے ہیں کہ سلاطین پیشین نے اپنے اپنے ممالک میں مختلف زمانوں میں رصد خانے تیار کیے ہیں ہندوستان میں آپ بھی ایک رصد خانہ تعمیر کیجیے، لکھا ہے کہ ملا صاحب نے رصد خانہ کے لیے مقام کا بھی انتخاب کرلیا تھا، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ

> زمینے کہ برائے رصد تجویز کردہ بود بعد چندے ظاہر شد کہ یکے از حکماء پیشیں آں محل برائے رصد اختیار کردہ بود۔ (مآثر ص ۲۰۳)

جس سے فن ہیئت ونجوم میں ان کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جس کا دماغ فلسفہ ریاضی بلاغت وادب عربی میں اس طرح کام کر رہا تھا۔ ان ہی ملا محمود کو ہم ہندوستان کے خاص فن "نائکا بھید" کے مطالعہ میں بھی مصروف پاتے ہیں، نائکا بھید کس چیز کا نام تھا، مولانا آزاد اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

؎ باوجود شاہی منظوری کے ہندوستان کا یہ رصد خانہ نہ بن سکا لکھا ہے کہ بلخ کی مہم پیش آگئی وزیر نے ایسے وقت میں رصد خانہ کے مصارف کو غیر ضروری قرار دے کہ تجویز کو ملتوی کرادیا ۱۲۔

"آں چناں ست کہ ہندیاں معشوقہ را بہ اعتبار اداد انداز و درجات عمر و مراتب الفت و بے الفتی وغیر ذالک چندں قسم گفتہ اند و ہر قسم را نامے معین ساختہ و اشعار آبدار در ہر قسم نظم آوردہ"

یعنی وام مارگیت کا ہندوستان میں جب شباب تھا، مذہب تک اس زمانہ میں صرف مردوں اور عورتوں کے باہمی اجتماع میں منحصر ہو کر رہ گیا تھا، اسی زمانہ میں ہندوؤں نے نت نئے قسم کے علوم و فنون جو ایجاد کیے تھے جن میں اکھاڑہ اور پاتر بازی کا ذکر پہلے آچکا ہی، یہ نائکا بھید بھی اسی جنس کا ایک فن تھا، گویا موجودہ اصطلاح میں ہم اسے سکسولوجی (جنسیات) کہہ سکتے ہیں، ملّا محمود نے اس فن کا بھی مطالعہ کیا اور اس پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ اختیاری مضامین کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

دانشمندی یا ملائیت کے لیے جن علوم کا پڑھنا ضروری تھا ان کی تحصیل کے بعد اور کبھی کبھی اس کے ساتھ بھی بطور اختیاری مضامین کے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق علوم (سائنس) فنون و صناعات (آرٹس) زبانوں (لنگویجز) میں سے جن چیزوں کے پڑھنے کی ضرورت تھی ان کے ماہرین سے عموماً لوگ پڑھتے تھے، اور جن کے لیے صرف علمی مشق یا مطالعہ مزاولت یا ممارست کی حاجت تھی، لوگ اس میں مشغول ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کا میلان تصوف کی طرف ہوتا، تو وہ بھی ایک طرف مجاہدات و ریاضات، اربعینات ذکر و شغل میں مصروف ہوتے تو دوسری طرف کم از کم اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہو کہ اس فن کی کتابیں بھی اپنے شیوخ سے پڑھا کرتے تھے، سلطان المشائخ کے ذکر میں آپ کو ملیگا کہ نصابی علوم کی تکمیل کے بعد جب اس راہ کی طلب آپ میں پیدا ہوئی اور حضرت بابا شیخ فریدالدین شکر گنج فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آپ حاضر ہوئے تو بابا صاحب نے اور جن مشاغل میں ان کو لگایا ہو اس کا ذکر تو کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خاص چیز کے ساتھ جسے میں سلسلہ چشتیہ کی اہم خصوصیت سمجھتا ہوں، ان شاء اللہ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئیگا اس کے سوا باضابطہ آپ نے بابا صاحب سے تصوف کی چند کتابیں پڑھیں، بلکہ عجیب بات

یہ ہے کہ تصوف کے ساتھ عقائد کی ایک خاص لیکن اہم کتاب تمہید[1] ابوالشکور سالمی بھی اس سلسلہ میں آپ کو پڑھائی گئی، سیرالاولیار اور فوائدالفواد دونوں میں آپ سے یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ اپنے شیخ کے سامنے

سہ کتاب در یکے قاری بودم و دو سماع وانستم و شش باب از عوارف پیش شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید شکر گنج، گذراندم۔ تمہید ابوالشکور سالمی تمام پیش شیخ شیوخ العالم خواندم۔

(سیرالاولیار ص ۱۰۶)

اور اس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، ارباب طریقت عموماً اپنے مریدوں کو عملی مجاہدات کے ساتھ علمی تعلیم بھی دیا کرتے تھے حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے ملفوظات میں بھی آپ کو مختلف مقامات میں ایسی عبارتیں مسلسل ملتی چلی جائینگی کہ

مولانا نصیرالدین امام و قاضی صفی رالمخص احیار العلوم می گذشت (ص ۴۵)

کہیں نظر آئیگا، "قاضی منہاج الدین درون حصاری را وصیت شیخ الشیوخ می گذشت" (ص ۴۰) کہیں ملیگا، "بیچارہ (جامع ملفوظات) را مع قاضی حمیدالدین ناگوری می گذشت" (ص ۵۰)

الغرض یوں ہی آپ کو ان مختلف کتابوں کا ذکر ملیگا جو اس زمانہ میں حضرات صوفیہ اپنے ارادتمندوں کو پڑھایا کرتے تھے۔

ان ہی علمار میں ایک معقول تعداد ایسوں کی بھی ملیگی جنہوں نے فن تذکیر و وعظ کی مشق بہم پہنچائی، بہ ظاہر لوگوں کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمار ہند میں وعظ گوئی کا رواج کوئی نئی بات ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے اسلامی دور کا کوئی قرن بحمداللہ ان بزرگوں سے

---

[1] میں اس کتاب سے پہلے ناواقف تھا مولوی امداد امام اثر نے اپنی کتاب روضۃ الحکمار جس میں جدید مغربی فلاسفہ اور ان کے نظریات کا تذکرہ اردو زبان میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں تمہید کی تعریف پڑھی، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں اس کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ ہاتھ آیا۔ پڑھنا شروع کیا تو اتنی دلچسپ سلجھی ہوئی کتاب معلوم ہوئی کہ ختم ہی کرنا پڑا، اب تک اس کا پتہ نہ چلا کہ اس کتاب کے مصنف ابوالشکور کہاں کے تھے۔ حصار کے ایک مولوی صاحب نے ان کا وطن حصار کے اطراف میں بتایا تھا ۱۲۔

خالی نہیں رہا ہے جنھوں نے اپنی سحر بیانیوں سے عام مسلمانوں کے ایمانی جذبات کو بیدار رکھنے کی کامیاب کوششیں نہ کی ہوں، آج تقریروں کا زور ہے، بیانوں کا طوفان برپا ہے لیکن کیا اس کی نظیر ہم اس زمانہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ محمد تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ مشہور اندلسی سیاح ہندوستان آیا ہے۔ اپنے سفرنامہ میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک تربیت یافتہ عالم مولانا علاء الدین اودھی جو عام طور پر نیلی کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، ان کے متعلق ابن بطوطہ کی بچشم دید گواہی ہے، وہ آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وهو يعظ الناس في كل جمعة فيتوب كثير منهم بين يديه ويحلقون رؤسهم ويتواجدون ويغشى على بعضهم شاهدته وهو يعظ فقرء قارى بين يديه يا ايها الناس اتقوا ربكم ان زلزلة الساعة شيء عظيم (الاية) ثم كررها الفقيه علاء الدين فصاح احد الفقراء من ناحية المسجد صيحة عظيمة فاعاد الشيخ الاية فصاح الفقير ثانيا ووقع ميتا كنت ممن صلى عليه وحضر جنازته (ص ۱۲)

ہر جمعہ کو علاء الدین نیلی وعظ کہتے ہیں ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں کو توبہ نصیب ہوتی ہے، ان کے وعظ میں لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں اور بیچ بیچ میں سننے والوں پر وجد طاری ہوتا ہے بعضوں پر تو غشی طاری ہو جاتی ہے ایک دن ایک شخص میرے سامنے بیہوش ہوا جس وقت شیخ وعظ کہہ رہے تھے، قاری نے آیۃ پڑھی جس کا ترجمہ ہے، لوگو! ڈرو اپنے رب سے اس گھڑی کی بھونچال سخت ہے یعنی قیامت کی، مولانا نیلی نے اس آیت کو چند بار دہرایا اتنے میں فقیروں میں سے ایک آدمی چیخ اٹھا جو مسجد کے کسی حصہ میں تھا، ایک چیخ ماری شیخ نے آیت کو پھر دہرایا اس نے پھر چیخ ماری اور بے جان ہو کر گر پڑا میں بھی ان لوگوں میں تھا جنھوں نے اس شخص کے جنازہ کی نماز پڑھی اور اس کے جنازہ میں حاضر ہوئے۔

سلطان المشائخ ہی کے زمانہ میں صاحب کتاب "نصاب الاحتساب" مولانا ضیاء الدین سنامی تھے جن کا ذکر گذر چکا ہے، ان کے معاصر ضیاء الدین برنی نے اختلاف مسلک کے باوجود

اپنی تاریخ میں یہ شہادت ادا کی ہے۔

لشناحی الیدالبیضاء فی تفسیر القرآن الکریم وکشف حقائقہ یذکر فی کل اسبوع ویحضر مجلسہ ثلاثۃ آلاف من الناس من کل صنف ویتاثرون بمواعظہ حتی انھم یجدون حلاوتھا الی الاسبوع الآخر

قرآن کی تفسیر میں ان کو کمال ہے، وہ ہفتہ میں ایک دفعہ وعظ کہتے ہیں، ان کے وعظ میں تین تین ہزار آدمیوں کا مجمع ہوجاتا ہے جن میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے وعظ سے متاثر ہوتے ہیں، اتنا اثر لیتے ہیں کہ دوسرے ہفتہ تک اس کی حلاوت اپنے اندر پاتے ہیں۔

نویں صدی میں مولانا شعیب نامی عالم دلی میں تھے۔ شیخ محدث نے ان کے متعلق لکھا ہے

درزمانے کہ او وعظ گفتے وقرآن خواندے ہیچ کس را مجال عبور ازاں راہ نبودے اگرچہ خود بارگراں برسر داشتے (اخبار، ص ۲۵۵)

ہندوستان کے اس دور میں اسلامی مذکرین وخطبار کی کتنی قدر و منزلت کیجاتی تھی اس کا اندازہ ابن بطوطہ کے اس بیان سے ہوتا ہے، جو محمد تغلق کے متعلق اس نے لکھا ہے

امران یہیأ لہ منبر من الصندل الابیض القامری وجعلت مسامیرہ وصفائحہ من الذھب الصق باعلاہ حجر یاقوت عظیم وخلع علی ناصرالدین خلعۃ مرصعۃ بالجوھر ونصب لہ المنبر فوعظ وذکر فلما نزل قام السلطان الیہ وعانقہ وارکبہ علی فیل وضربت لہ سراجۃ من الحریر الملون وصیوانھا

تغلق نے واعظ کے متعلق حکم دیا کہ سفید صندل کا منبران کے لیے تیار کیا جائے جس میں کیلیں اور پتر سونے کے لگائے گئے تھے، اور منبر کے اعلیٰ حصہ میں ایک بڑا یاقوت جڑا گیا، واعظ جن کا نام ناصرالدین تھا ان کو ایک مرصع خلعت عطا ہوئی جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، وہی منبران کے لیے بچھایا گیا، مولانا ناصرالدین اس پر چڑھے وعظ بیان کیا، بادشاہ اس کے بعد کھڑا ہوا اور ان سے بغل گیر ہوا اور ہاتھی پر سوار کیا،

من الحریر وخباتها ایضًا کذلک مجلس الواعظ فیها وکان بجانبها اوانی الذھب واعطاہ السلطان ایاھا وذلک تنور کبیر بحیث یسع فی جوفه الرجل القاعد وقدران وصحاف وکل ذلک من الذھب وکان اعطاہ عند قدومه مأته الف دینار (نزہتہ الخواطر۔ ص ۲۱)

اور ان کے لیے ایک خیمہ جو رنگین حریر کا بنا ہوا تھا نصب کیا گیا۔ اس خیمہ کے اندر کا کمرہ بھی حریر ہی کا تھا، اسی میں واعظ بیٹھے۔ ان کے اردگرد سونے کے برتن تھے جسے بادشاہ نے سب انہی کو دے دیا۔ وہ ایک بڑا تنور تھا جس کے اندر ایک بیٹھا ہوا آدمی غائب ہو سکتا تھا دو ہانڈیاں اور پیالے تھے سب سونے کے جس وقت واعظ ہندوستان آئے تھے تو بادشاہ نے ان کو ایک لاکھ اشرفی دی تھی۔

ہندوستان کو باضابطہ دارالاسلام بنا کر مسلمانوں نے ابتدا میں جب ملک کو وطن بنایا تو گو وہ زبان جس نے آئندہ ترقی پا کر اُردو کی شکل اختیار کی، اس کی آمیزش کی داغ بیل پڑ چکی تھی، لیکن پھر بھی عموماً وعظ وتذکیر کی زبان فارسی ہی تھی، لیکن اس ملک کی مقامی ضروریات کا اندازہ کرکے واعظینِ اسلام میں سے بعض حضرات اپنے مواعظ میں نثر نہیں تو نظم کی حد تک ہندی زبان کے اشعار بے محابا استعمال کرتے تھے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے حضرت مخدوم شیخ تقی الدین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "چنداین" نامی ہندی مثنوی کہ

"در بیان عشق لورک وچاندا عاشق ومعشوق واقع خیلے حالت بخش است مولانا داؤد بنام او نظم کردہ"

واللہ اعلم یہ کونسی کتاب ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے والوں کی نظر اس مثنوی پر پڑی ہے یا نہیں، بداؤنی نے تو لکھا ہے "از نہایت شہرت دریں دیار احتیاج بہ تعریف ندارد" (ص ۲۵۰)۔

بہرحال ایک عالم مسلمان کی یہ ہندی مثنوی اگر کہیں اب بھی مل سکتی ہو تو اُردو زبان

لہ بداؤنی نے لکھا ہے۔ فیروز تغلق کے وزیر خان جہاں کے بیٹے جوناشہ جو باپ کے مرنے کے بعد خان جہاں کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اسی جوناشہ کے نام مولانا داؤد نے یہ مثنوی معنون کی تھی جس کے معنی یہی ہوئے کہ فیروز تغلق کے عہد کی یہ کتاب ہے

ی پہلی باضابطہ بنیادی کتاب شاید بھی قرار پاسکتی ہے، خیر یہ الگ مسئلہ ہے، میں یہ عرض کررہا تھا کہ مخدوم شیخ تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بداؤنی نے لکھا ہے کہ

"مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضے ابیات تقریبی او را بر منبر می خواند مردم را از استماع آں حالت غریبہ می داد"

آگے لکھتے ہیں کہ

"چوں بعض افاضل آں عہد شیخ (مخدوم تقی الدین) را پرسیدند کہ سبب اختیار ایں مثنوی ہندوی چیست"

مخدوم نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"تمام آں حقائق و معانی ذوقیست و موافق بوجدان اہل ذوق عشق و مطابق بہ تفسیر بعضے از آیات قرآنی" ص ۲۵

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معارف و حقائق کو علماء نے اسی زمانہ میں ہندوستان کی مقامی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا، بداؤنی نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ

"خوش آوازان ہند حالا ہم بسواد خانی آں صید دلہا می نمائند"

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مثنوی سے میں ذاتی طور پر خود واقف نہیں ہوں، اور نہ بداؤنی کے سوا کہیں دوسری جگہ اس کا ذکر ملا ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ جس زبان کو "ہندی زبان" سے بداؤنی موسوم کر رہے ہیں، اس کے الفاظ کس نوعیت کے تھے، اتنا تو یقینی ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جنہیں فیروز تغلق کے عہد ہی میں مسلمان عام طور پر سمجھ سکتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس کے سننے سے عام مسلمانوں پر "حالت غریبہ" کیسے طاری ہو سکتی تھی میرا خیال ہے کہ جب یہ مثنوی اکبر کے عہد تک عام طور سے سنی سنائی جاتی تھی، اور خوش آوازان ہند بسواد خوانی او "صید دلہا" کرتے تھے تو غالب قرینہ یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں اس کے نسخے ضرور پائے جاتے ہوں گے، کاش! اس مثنوی کا "انجمن ترقی اردو" پتہ چلاتی، ممکن ہے کہ انجمن نے اس کا نسخہ مہیا کر لیا ہو، لیکن

لہ بعد کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو سے اس مثنوی کا ذکر آیا تو اس سے وہ واقف نہ تھے، مقالہ کے پڑھنے والوں میں کسی صاحب کو اس مثنوی کا علم ہو، تو انجمن ترقی اردو کو چاہیے کہ وہ مطلع فرما دیں۔

Marfat.com

مجھے اس کا علم نہ ہو، اگر ایسا ہو تو یہ مثنوی اس کی مستحق ہو کہ اس پر مستقلاً کام کیا جائے۔

خلاصہ یہ ہو کہ تذکیر و وعظ میں مہارت و مشق پیدا کرنے والوں کا ایک گروہ ہر عہد میں پایا گیا ہو، میں نے بطور نمونے کے یہ چند قدیم مثالیں پیش کی ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں متعدد واعظوں کا پتہ چلتا ہو، جن کے مواعظ سلطان جی نے عہد طفولیت میں سُنے تھے، خصوصاً شیخ نظام الدین ابو المؤید جو بلبنی عہد کے مشہور علماء میں ہیں ان کے وعظ کا تذکرہ عموماً فرماتے شیخ محدث نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہو، چونکہ بڑی موثر چیز ہے "اخبار" ہی سے نقل کرتا ہوں سلطان المشائخ فرماتے ہیں :-

"دراں ایام کو دکے بودم در لب معانی چنداں براو نبوده است رونهے در تذکیرا و آمدم

آگے ان کی دوگانہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ

بالائے منبر رفت۔ مقری بود او را قاسم گفتندے خوش خواں روایتے بخواند بعد ازاں

شیخ نظام الدین ابو المؤید رحمۃ اللہ علیہ آغاز کرد کہ "بخط ہائے خود نوشتہ دیدہ ام"

حضرت کا بیان ہو کہ صرف ان الفاظ کا سامعین پر اتنا اثر پڑا کہ "ہمہ در گریہ شدند" اس کے بعد اس رباعی کا جسے حضرت نظام الدین ابو المؤید نے اپنے والد کے ہاتھ کا نوشتہ پایا تھا، پہلا شعر پڑھا۔

بر عشق تو و بر تو نظر خواہم کرد جاں در غم تو زیر و زبر خواہم کرد

فرماتے ہیں کہ شعر کا پڑھنا تھا کہ "نعرہا از خلق برآمد" بار بار اسی شعر کو دہراتے جاتے تھے اور اہلِ محفل میں شور برپا تھا، ایسی حالت طاری ہوئی کہ دوسرا شعر رباعی کا یاد نہیں آتا تھا یہ فرما کر "اے مسلمانان دو مصرع دیگر یادمی آید چہ کنم" کہتے ہیں کہ کچھ ایسے لہجہ میں یہ بات آپ نے فرمائی کہ مجمع اس پر بھی برہم ہو گیا، آخر اسی مقری قاسم نے یاد دلایا، دوسرا شعر رباعی کا یہ تھا

پُر درد دلے بخاک در خواہم شد بے عشق سرے ز گور بر خواہم کرد

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس دن کا وعظ صرف ان ہی دو مصرعوں پر ختم ہو گیا۔

اس سے اس زمانہ کے وعظ کا جو طریقہ ہندستان میں جاری تھا اس کا بھی پتہ چلتا ہے

Marfat.com

یعنی کوئی خوش الحان مقری (قاری) پہلے قرآن کی کوئی آیت پڑھتا، واعظ اسی آیت کو عنوان بنا کر تقریر شروع کر دیتا تھا یہی طریقہ اس زمانہ میں بیرون ہند کے اسلامی ممالک میں مروج تھا نیز مواعظ میں اثر آفرینی کے لیے اشعار کا استعمال معلوم ہوتا ہے کہ علماء کی قدیم سنت ہے، جب مخدوم شیخ تقی الدین جیسی جلیل القدر ہستی جن کا تذکرہ سلطان المشائخ مخدوم شاہ شرف الدین یحییٰ منیری جیسے اکابر شاندار الفاظ میں فرماتے ہیں۔ فارسی اور عربی سے آگے بڑھ کر "لورک اور چاندا" کی ہندوی مثنوی کے اشعار تک اپنے وعظوں میں استعمال فرماتے تھے۔ تو اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا مل سکتا ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ گو خطابت بھی ایک قسم کا آرٹ اور مشقی چیز ہے تاہم تاثیر کے لیے کچھ اور باتوں کی بھی ضرورت ہے، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں مولانا کریم الدین دہلی کے ایک واعظ تھے البرنی کے حوالے سے صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کے متعلق یہ بیان نقل کیا ہے:-

کان ینشد فی مواعظہ کثیرا من الاشعار من انشائہ ویسجع الکلام ولذالک لم یعجب الناس ولا یاخذ بمجامع القلوب فلا یحضر فی مجلسہ الا قلیل من الناس۔ (ص)	اپنے وعظوں میں خود تصنیف اشعار پڑھنے کی ان کو عادت تھی، اور مقفیٰ گفتگو کرتے تھے۔ اسی لیے لوگ ان کے وعظ کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ دلوں پر اثر ہوتا تھا، ان کی مجلس وعظ میں اسی وجہ سے کم آدمی شریک ہوتے تھے۔

حالانکہ البرنی ہی کی یہ بھی شہادت ہے کہ

لہ انشاء یدل علی قدرتہ علی البیان نظماً و نثراً (ر ر)	ان کی انشاء اچھی ہے نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔

بہرحال اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ نصابی کتابوں سے لوگوں کو مغالطہ نہ کھانا چاہیے، بلکہ گرد و پیش کے دوسرے واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر رائے قائم کرنی زیادہ قرینِ صواب ہوگا۔

لہ دیکھیے اخبار الاخیار، فوائد الفواد، معدن المعانی وغیرہ ۱۲۔

Marfat.com

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں، یعنی ہمارے تعلیمی نصاب میں صدیوں معقولات کا حصہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، تو پھر آئندہ کیا واقعات پیش آئے جن کا آخری نتیجہ وہ ہوا کہ خالص اسلامی علوم کی کتابوں کے مقابلہ میں معقولات کا پلہ اتنا جھک گیا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عربی مدارس میں منطق و فلسفہ و کلام کے سوا گویا دوسرے فنون کی کتابیں پڑھائی ہی نہیں جاتی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آخر زمانہ میں ہمارا جو نصاب درس نظامیہ کے نام سے مشہور رہا اس میں حدیث کی ایک کتاب مشکوٰۃ اور تفسیر میں جلالین بیضاوی کی صرف ایک سورہ بقرہ کے بعد شرح وقایہ کی اولین، اور ہدایہ کی آخرین یعنی معناوہ فقہ کی ایک ہی کتاب ہوئی، گویا بیضاوی کی ایک سورہ کا اگر لحاظ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت والے نصاب میں نہیں بلکہ نصاب فضل میں بھی خالص دینیات کی کل تین کتابیں جلالین، مشکوٰۃ، شرح وقایہ و ہدایہ کے سوا کنز و قدوری کے مختصر فقہی متون کے بعد تقریباً چالیس[1] پچاس کتابیں جو پڑھائی جاتی تھیں وہ خالص عقلیات کی کتابیں ہیں یا ایسی کتابیں ہیں جن کا بظاہر تعلق تو کسی دوسرے فن سے ہے لیکن درحقیقت ان کا طرز بیان اول سے آخر تک وہی معقولات کی کتابوں کا سا ہے، انتہا یہ ہے کہ شرح ملا جامی بہ ظاہر نحو کی کتاب ہے لیکن جاننے والوں سے مخفی نہیں ہے کہ نحوی مباحث کو بھی اس میں عقلیت کا رنگ دیا گیا ہے اور جب نحو کی کتاب کا یہ حال ہے تو پھر اصول فقہ یا کلام کی جو کتابیں ہیں ان میں منطقیت اور عقلیت کی جس حد تک گنجائش پیدا ہو سکتی تھی ظاہر ہے، آج ہی نہیں ابتدا سے علماء کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اصول فقہ کو فقہ سے وہی نسبت ہے جو منطق کو فلسفہ سے

---

[1] درس نظامیہ کے نصاب فضل یا انتہائی کتابوں کے نصاب میں دینیات کی صحیح معنوں میں کل تین کتابیں داخل ہیں، ان کے سوا جو کچھ ہے وہ خالص عقلیات یا نیم عقلیات ہی کی کتابیں ہیں جن کی تعداد چالیس پچاس سے متجاوز ہے ممکن ہے کہ جنہوں نے غور نہیں کیا ہو، انہیں کچھ اچنبھا سا ہو، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی ایک اجمالی فہرست ہی دیدی جائے۔ جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ مع شرح وقایہ معلوم ہو چکا کہ درحقیقت اس کورس میں حقیقی دینیات کی یہی تین کتابیں ہیں، اب سنیے اول سے آخر تک اس نصاب میں کیا پڑھایا جاتا ہے:۔ (باقی بر صفحہ ۱۸۸)

ہو (دیکھیے مسلم الثبوت) باقی علم کلام کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا وہ ایک فلسفہ ہے، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جب عنصریات کائنات الجو تک کے مباحث کلامی کتابوں کے اجزا بنا دیے گئے ہیں، تو اس کے فلسفہ ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے، یہی حال ان کتابوں کا ہے جو عربیت کے نام سے پڑھائی جاتی ہیں، یعنی معانی، بیاں، بدیع کی دونوں نصابی کتابیں مختصر المعانی اور مطول پڑھنے والوں کو ان کتابوں میں جتنی ذہنی لذت ملتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اسی حد تک وہ ان علوم کے مسائل کا حقیقی مذاق بھی اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے جس کا نہایت صفائی کے ساتھ ہمیں اقرار کرنا چاہیے، میں اب چاہتا ہوں کہ مندرجہ ذیل دو سوالوں سے بحث کروں۔

(۱) مدت تک جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ہندوستان کے تعلیمی نصاب میں منطق و کلام کی تعلیم صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھی۔ پھر کیا صورتیں پیش آئیں کہ ہمارا نصاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۷) صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تال، قول، میزان منطق، بدیع المیزان، مرقاۃ، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، بعض مقامات میں شرح سلم بحر العلوم، شرح مطالع خاص منطق میں۔ ہدیہ سعیدیہ، میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔ بعض مقامات میں شرح ہدایۃ الحکمۃ خیرآبادی، شرح اشارات شفا، فلسفہ میں توضیحیہ، تصریح، شرح چغمنی۔ بعض مقامات میں تذکرہ، بست باب۔ ہیئت میں۔ اقلیدس، مبادی الحساب (ریاضی میں) ان کے سوا میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال۔ میر زاہد امور عامہ اکثر مقامات میں میر زاہد رسالہ و ملا جلال کے ساتھ بحر العلوم۔ یہ کتابیں کچھ خاص طریقہ کی ہیں جنہیں بجز معقولات کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، اب اصول فقہ میں اصول شاشی، حسامی، نور الانوار، توضیح مع تلویح، مسلم کلام میں۔ شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی۔ اور بعض مقامات میں شرح تجرید قوشجی، شرح تجرید کے حواشی قدیمہ و جدیدہ امیر باقر کی الافق المبین جس کا شمار امور عامہ کے مباحث ہی میں ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا تھا مختصر المعانی اور مطول کا شمار بھی اسی سلسلہ میں ہونا چاہیے اور شرح جامی کو بھی میں اسی قبیلہ کی کتاب قرار دیتا ہوں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ میں نے اس سلسلہ میں عموماً ان ہی کتابوں کا شمار کرایا ہے جو درس نظامیہ پڑھانے والی تعلیم گاہوں میں آج سے چالیس پچاس برس پیشتر تقریباً رواجی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھیں، ان کے سوا بھی مرزا جان خوانساری، میر باقر، صدر شیرازی، شریف جرجانی کے حواشی، عبد الحکیم سیالکوٹی کے حواشی، خیرآبادیوں میں مولانا فضل حق، مولوی عبد الحق کے حواشی ہیئت و ہندسہ میں کر وغیرہ کی کتابیں مروج رہی تھیں، اگر ان کو بھی شمار کر لیا جائے تو شاید تعداد پچاس سے آگے بڑھ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کتابوں کا نام مستحضر نہ رہا ہو۔

عقلیات کی ان لامحدود کتابوں سے معمور ہوگیا؟

(۲) اگرچہ اس زمانہ میں سلف کے اس طرزِ عمل کا عموماً مضحکہ اڑایا جاتا ہے، اور یہ بھی یہی بات کہ خالص دینیات و اسلامیات کی کل تین کتابوں پر قناعت کر کے اس بری طرح اسلامی نصاب کو عقلیات سے پاٹ دینا بہ ظاہر تعجب خیز ہی نہیں، بلکہ شاید ایک مسلمان کے لیے غصہ انگیز بھی ہو، اور غیظ و غضب کا یہی جذبہ مضحکہ کی صورت اختیار کرلے، مگر آج میں چاہتا ہوں کہ الفاظ کے ہنگاموں سے الگ ہو کر غور کروں کہ واقعی بزرگوں کا یہ طرزِ عمل کیا اسی درجہ قابلِ نفرین و ملامت ہے جس کا آج اسے مستحق قرار دیا جا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلا سوال ایک تاریخی سوال ہے، میں بتا چکا ہوں کہ نویں صدی جب گذر رہی تھی، یعنی سکندر لودی کی تخت نشینی (۸۹۴ھ) تک تقریباً دو سو سال تک منطق و کلام کی مقدار ہمارے نصاب میں دہی قطبی و شرح صحائف کی حد تک تھی لیکن دلّی کے تخت پر جب سکندر لودی پہنچا تو گو ہماری عام تاریخوں میں اس کے عہد کا تذکرہ کچھ زیادہ اہمیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا، لیکن یہ تو سیاسی تاریخوں کا حال ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جہان گیری جہاں داری کے لحاظ سے سکندری عہد کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن علمی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری مختلف حیثیتوں سے سکندر کا عہد عہد آفریں قرار پانے کا مستحق ہے، شیخ محدث اخبار الاخیار میں ارقام فرماتے ہیں: "داں دولت سکندر زمان صلاح، تقویٰ و دیانت و امانت و علم و وقار بود" اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ "ادرا با علماء و صلحاء و اکابر و اشراف میلے عظیم شد"

ایک مطلق العنان بادشاہ میں جب کسی چیز کا "میل عظیم" پیدا ہو جائے تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ شیخ محدث ہی فرماتے ہیں۔

"لہذا از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ سابقہ استدعاء، و طلب، و بعضے بے آں در عہد دولت او تشریف آوردہ توطن ایں دیار اختیار کردند" ص ۲۲۷

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گر اس سے پیشتر کے بادشاہوں کے عہد میں بیرونِ ہند سے آنے والوں کا

Marfat.com

ایک سلسلہ اس ملک میں جاری تھا۔ مگر عموماً انعام و اکرام لے کر پھر یہ حضرات اپنے اصلی اوطان کی طرف لوٹ جاتے تھے سکندر ہی شاید پہلا ہندی بادشاہ ہے جس نے ان بزرگوں کو بھی جنہیں خود دعوت بھیج کر اس نے ہندوستان بلایا، جیسا کہ "سابقہ استدعا" سے ظاہر ہے یا جو خود اس کی قدردانیوں کا حال سن کر اس ملک میں آئے سب کو باصرار ہندوستان ہی میں رہنے اور اس کو وطن بنانے پر اس نے اصرار کیا، شیخ نے اس کے بعد اس عہد کے بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، لکھا ہے:۔ "چنانچہ اکثر بزرگان دریں طبقہ کہ مذکور می شوند ازاں قبیل اند"

شیخ محدث پر عہد سکندری کے غیر معمولی امتیازات کا جو اثر تھا۔ اس کا اظہار آخر میں بایں الفاظ فرماتے ہیں۔ "بالحقیقۃ محامد زماں سلطنت آن سلطان سعادت نشان از حد تقریر و تحریر خارج است" ظاہر ہے کہ یہ کسی شاعر کا مبالغہ آمیز دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک عالم و محدث کی تاریخی شہادت ہے آخر میں سعدی کے اس مشہور شعر

اگر ایں جملہ را سعدی املا کند — مگر دفترے دیگر انشا کند

پر عہدِ سکندری کے محامد و خصوصیات کے ذکر کو حضرت نے ختم فرمایا ہے، کاش! ان کے قلم سے "دفترے دیگر" عہدِ سکندری کے متعلق انشا پذیر ہو جاتا، تو علمی اور دینی تاریخ میں ہندوستان کے ایک اہم اور قیمتی مواد کا اضافہ ہو جاتا، اگرچہ مختلف تاریخوں میں جو بکھرے بکھرے واقعات ملتے ہیں، کوئی چاہے تو ان کو سمیٹ کر اس زمانہ کی انقلابی خصوصیتوں اور نئے اقدامات کو اجاگر کر سکتا ہے، اس بادشاہ کو حکومت کا وقت بھی کافی ملا ہے یعنی موجودہ زمانہ میں عموماً سرکاری خدمات کی جو انتہائی مدت ہے اس سے زیادہ ہی زمانہ ہے، تقریباً تیس سال اس نے بادشاہی کی ہے سمجھا جا سکتا ہے کہ اتنی طویل مدت میں کسی بادشاہ کا "میل عظیم"، کن چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے

کچھ قدرتی بات یہ بھی ہے کہ جس زمانہ میں جس قسم کے بادشاہ ہوتے ہیں، اسی قسم کا مذاق عوام میں بھی پھیل جاتا ہے۔ علم و فن کی جو قدردانیاں سکندری حکومت کی طرف سے مسلسل ہو رہی تھیں ان کے سوا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف عہد سکندری کے مشہور امیر کبیر ملک زین الدین

ــــــ
ہ صفحہ ۱۰۵

اور ان کے بھائی زبرالدین کا حال جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے۔

"بعلاقہ صلاح وتقویٰ وخدمتگاری، اکثر علما و مشائخ وقت را بایشاں مجتمع ورجوع آمد" ص۲۲۶

اخبار ہی میں یہ بھی ہے کہ دلی کے نواح میں عموماً جو سیر حاصل شاداب گاؤں اور مواضع تھے ملک زین الدین نے بادشاہ سے انہیں جاگیر میں حاصل کر لیا تھا، ان کے بھائی زبرالدین جو حکومت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، عموماً ان ہی دیہاتوں اور سیرگاہوں میں "علما و صلحا و صوفیاں ہمہ در صحبت او خوش می گذرانیدند (ص ۲۲۶) گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ علما و صلحاء کے یہ دونوں بھائی اس زمانہ میں شاہی میزبان تھے۔ اسی طرح اسی زمانہ میں ایک خوش باش شخص شیخ جمالی دلی میں تھے خود بھی صاحب علم و بصیرت تھے لکھا ہے کہ

بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ و مولانا عبد الرحمٰن جامی و جلال الدین محمد دوانی را علیہ الرحمۃ دریافتہ (اخبار الاخیار ص۲۲۸)

ان ہی شیخ جمالی کے صاحبزادے میاں عبد الحیی تھے جنہیں "مبلغ کثیر از ترکہ پدر رسیدہ بود" لیکن ان کا بھی یہی دستور تھا،

"در زمان افغانان ہر کہ از جنس طالب علم یا شاعر یا قلندر از ولایت بایں جانب می افتاد

لہ دراصل یہ لوگ بذات خود تو خاص کسی دولت و ثروت کے مالک نہیں تھے بلکہ شاہی خاندان کے ایک رکن رکین خانجہاں نامی کی طرف سے شاہی دربار میں وکیل تھے اور خاں جہاں اس وقت دہ ہزاری منصب پر سرفراز تھے، سکندر کو کچھ خان جہاں سے سوء مزاجی پیدا ہو گئی تھی، لیکن اپنی ناراضی کو وہ خان جہاں پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہتے ہیں اس نے در پردہ خاں جہاں کی ساری جاگیر کے متعلق ملک زین الدین کو یہ خفیہ فرمان لکھ دیا تھا۔ "ہر چہ از اسماں و املاک خاں جہاں باشد تصرف نماید و ہر نوع کہ داند خرچ کند بنوعے کہ خان جہاں را بریں معنی اطلاع نباشد" آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ از زین الدین حساب گرفتہ نشود ہیچ کس را با او کارے نیست" (اخبار الاخیار ص۲۲۶)

گویا در پردہ ملک زین الدین ہی کو خاں جہاں کی جاگیر سلطان نے حوالہ کر دی تھی اور خاں جہاں نام نہاد مالک تھے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ملک زین الدین نے اس دولت سے ناجائز نفع نہیں اٹھایا بلکہ "ہمہ را بمصارف خیر و محال ثواب رسانید"

درمنزل او بود و بر ہر یک مہربانیہا و خدمتہا می کرد۔[1]

شیخ محدث نے لکھا ہی، کہ باپ کا سارا متروکہ "در مدتے از عمر خود صرف اوقات یاراں کرد (ص ۲۲۱)

بہر حال ان چند مثالوں سے اس چہل پہل کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہی، جو دلی میں اس وقت تعلیم و تعلم علم و فن کے متعلق قائم ہو گئی تھی،

سکندر کے زمانہ میں اور کن کن پہلوؤں سے کیا کیا نئی باتیں پیدا ہوئیں، کن کن چیزوں میں کیا کیا انقلابات ہوئے، اس وقت ان کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہی، بلکہ صرف "تعلیمی نصاب" میں جو انقلاب پیدا ہوا صرف اسی کو ظاہر کرنا ہی، اس قصہ کا ذکر مولانا غلام علی آزاد شیخ محدث اور ان سے پہلے ملا عبد القادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں کیا ہی، واقعہ یہ ہی کہ دلی میں ارباب علم و فضل کا عہد سکندری میں جو غیر معمولی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، ان ہی میں دو بھائی شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ بھی تھے، دراصل یہ دونوں حضرات ملتان کے علاقہ میں تلمبن نامی کسی قصبہ کے رہنے والے تھے، جو شاید اب کوئی غیر معروف گاؤں ہی، ان دونوں حضرات کو فن تدریس میں کمال حاصل تھا، شیخ عبد اللہ کو تو سکندر نے دلی ہی میں رکھ لیا، اور مولانا عزیز اللہ سنبھل (مراد آباد) روانہ کر دیے گئے، جو اس زمانہ میں اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، سلطان سکندر شیخ عبد اللہ کے طریقۂ درس و تعلیم کا گویا عاشق تھا، بداؤنی نے لکھا ہی کہ "می گویند کہ سلطان سکندر در وقتِ درس شیخ عبد اللہ مذکور می آمد (ص ۳۲۳) اور آ کر کیا کرتا تھا، لکھتے ہیں کہ "در گوشۂ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیکم گفتہ بایک دگر صحبت می داشتند (بداؤنی ج ۱ ص ۳۲۳)

ایک مطلق العنان بادشاہ کا حلقۂ درس میں یوں دبے پاؤں آنا، اور درس کا سننا، اس وقت تک سنتے رہنا جب تک کہ درس ختم نہ ہو لے۔ بظاہر شاید معمولی بات معلوم ہو، لیکن

---

[1] قریب قریب ان کا حال وہی تھا جو ان دنوں سرکار آصفیہ کے پایۂ تخت (حیدر آباد دکن) میں مخدوم و محترم جناب مولوی فیض الدین صاحب وکیل کی حالت ہی۔ تقریباً بیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ممالک اسلامیہ خصوصاً عرب کے باشندے اس ملک میں جب آتے ہیں تو بغیر کسی اجازت و طلب کے مطلق وکیل صاحب کے مہمان ہو جاتے ہیں، علما کا قیام بھی زیادہ تر

تاہی رعب و دبدبہ کا حال جنہیں معلوم ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، خود تاریخوں میں اس کا نقل ہونا اس کی اہمیت کی دلیل ہے، مولانا عبد اللہ ایک بہترین مدرس ہونے کے سوا بلا کے پڑھانے والے تھے، بدائونی نے لکھا ہے کہ

"از استادان شنیدہ شد کہ زیادہ از چہل عالم تحریر تبحر از پائے دامن شیخ عبداللہ

"مثل میاں لادن وجمال خاں[1] دہلوی و میاں شیخ گوالیاری و میراں سید جلال بدائونی

و دیگراں برخاستہ اند" (ص ۴۳۲)

چالیس سے زیادہ معمولی نہیں تحریر و تبحر علما جس کے حلقۂ درس سے اُٹھے ہوں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے کتنوں کو پڑھایا ہوگا۔ آج بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور کلیات و جوامع سے بھی سالہاسال گذر جانے کے بعد بمشکل چند ہی آدمی ایسے نکلتے ہیں جن کا علم و فضل قابل ذکر ہو، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیخ عبد اللہ کے درس کی کیا نوعیت تھی۔

ان کے بھائی مولانا عزیز اللہ کے متعلق بھی بدائونی ہی نے لکھا ہے کہ

"استحضارے عجیب داشتند کہ مشکلات متفطن ہر طور کتابے مشکل غتہیانہ را می خواند و بے مطالعہ درس می گفتند"

یاد داد ملفوظات حاضرہ ۱۲

اسلامی علوم کی کتابوں کے درس و تدریس کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا استحضار یعنی درس کی انتہائی کتابوں کا مطالعہ کے بغیر پڑھانے والے ہزاروں میں کوئی ایک دو ہی عالم ہوتے ہیں۔ خاکسار خود اپنے تیس چالیس سالہ تعلیمی تجربات کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے کہ گو اس عرصہ میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے علما، سے پڑھنے پڑھانے کا موقع ملتا رہا جن میں بعض اپنے عصر کے امام اور شیخ الکل تھے لیکن ایک حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] ملا عبد القادر بدائونی نے لکھا ہے کہ میاں لادن اور جمال خاں حقیقی بھائی ہیں، جمال خاں کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں:۔ "اعلم علمائے زماں خود بود، در علوم عقلیہ و نقلیہ خصوصاً فقہ و کلام و عربیت و تفسیر بے نظیر بود بر شرحین مفتاح محاکمہ کردہ و عضدی را کہ کتاب غتہیانہ ست می گویند چہار بار از اول تا آخر درس گفتہ" (بدائونی ص ۴۴۶) نوے سال عمر پائی ۹۸۴ھ میں

کے سوا اس قسم کے استحضار کا تجربہ کسی کے متعلق نہیں ہوا، مُلّا عبدالقادر ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا عزیز اللہ کے علم کی پختگی اور ذہن کی تیزی کا یہ حال تھا کہ طلبہ

بارہا بامتحان پیش آمدہ اسولہ لا مدفع لہا می آوردند شیخ مشارٌ الیہ در وقت افادہ مغاحل ساختہ (۔،)

بسا اوقات بطور جانچ کے طلبہ شیخ عزیز اللہ کے سامنے ایسے سوالات پیش کرتے جن کا جواب نہ ہوتا لیکن شیخ عین درس و افادہ کے وقت ان کو اسی وقت حل کر دیتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد سکندری کے انہی دونوں بزرگوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہوتا تھا، مولانا آزاد نے عبداللہ تلبنی کے ذکر میں لکھا ہے۔

برچار بالش افادہ نشست و شش جہت را بہ نشر لوامع علوم منور ساخت (ص ۱۹۱)

ہدایہ کے ہندوستانی شارحین میں مولانا الہداد جونپوری کی خاص شہرت ہے، مولانا آزاد کا بیان ہے کہ وہ "تلمیذ مولانا عبداللہ تلبنی نور اللہ ضریحہ ..... است" (ص ۱۹۲) اسی طرح شیخ عزیز اللہ نے جن شاگردوں کو پیدا کیا، ان میں مشہور و معروف صاحب درس عالم مولانا حاتم سنبھلی بھی ہیں، یہ اُستاد ہی کا رنگ تھا کہ ان کے درس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے مُلّا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے:۔

در مدت عمر می گویند کہ از سی بار متجاوز شرح مفتاح را و از چہل مرتبہ پیش تر مطول را از بائے بسم اللہ تا تائے تمت درس گفتہ (ص ۳۲۴)

لہ مگر بداؤنی کے بیان سے کچھ اور ہی بات ثابت ہوتی ہے، عہد سکندری کے علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، صاحب تصنیفات لائقہ و کتب فائقہ شیخ الہدیہ جونپوری است کہ بر ہدایہ فقہ شرحے مشتمل بر چند جلد نوشتہ" اگرچہ بجائے الہداد کے مطبوعہ نسخہ میں الہدیہ کا لفظ چھپا ہوا ہے لیکن یہ وہی الہداد ہیں جنہیں مولانا آزاد تلبنی کا شاگرد بتاتے ہیں، مگر بداؤنی نے اس کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ "سکندر لودی علماء دیار خود جمع کردہ بہ یک جانب شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ و جانب دیگر شیخ الہدیہ و پسر او را در بحث معارض ساخت" (ص ۳۲۵) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہدیہ یا الہداد کو تلبنی سے تلمذ کا تعلق نہ تھا کیونکہ اُستاد کے مقابلہ میں شاگرد کا میدان میں اُترنا کم از کم اس زمانہ کے اصول کے خلاف تھا، واللہ اعلم ۱۲۔

Marfat.com

ملا عبدالقادر نے لکھا ہو کہ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ میاں حاتم سنبھلی کی قدم بوسی سے سرفراز ہوا تھا، ان کی خانقاہ میں قصیدۂ بردہ زبانی یاد کیا اور "کنز" کے ابتدائی اوراق تبرکاً ان سے پڑھے تھے، میاں صاحب نے ملا کو کلاہ و شجرہ بھی دیا تھا، درس و تدریس کے بعد جب درویشی رنگ میاں حاتم پر چڑھا تو

دہ سال در صحرائے نواحی سنبھل وامروہہ سر و پا برہنہ می گشت دریں مدت سر او بابالین و بستر نرسید (منتخب ج ۳ ص ۲)

اب تک جو کچھ کہا گیا ہو، اس سے ان دونوں ملتانی مدرسوں (شیخ عبداللہ و شیخ عزیزاللہ) کی اس حیثیت اور مقام کا اندازہ ہو سکتا ہے جو ہندوستان کے تدریسی و تعلیمی حلقوں میں ان کا قائم ہو گیا تھا اب سُنیے بالاتفاق ہمارے تعلیمی مورخین کا یہ بیان ہو کہ

"ایں ہر دو عزیز (شیخ عبداللہ و عزیزاللہ) ہنگام خرابی ملتان در ہندوستان آمدہ علم معقول را دریں دیار رواج دادند" (بداؤنی ص ۳۲۳)

مولانا غلام علی آزاد نے بھی اسی کی تصدیق کی ہو۔ فرماتے ہیں۔

از خرابی ملتان او و شیخ عزیزاللہ نبنی رخت بدار الخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول را دریں دیار مُروج ساختند۔ (مآثر ص ۱۹)

ورنہ اس سے پیشتر جیسا کہ عرض کرتا چلا آ رہا ہوں ان ہی مورخین کی یہ اتفاقی شہادت ہو کہ۔

قبل ازیں (یعنی ملتان کے ان دو کہنہ مشق عہد سکندری کے مدرسوں سے پہلے) بغیر از شرح شمسیہ (یعنی قطبی) و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود (بداؤنی ص ۳۲۴۔ مآثر ص ۱۹)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ "علم معقول" کی کتابوں کی زیادتی کا دور دورہ اسی زمانہ کے بعد

؎ ان عبارتوں پر نظر پڑنے کے بعد مجھے خوشی ہوئی جب مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب ہندستان کی اسلامی درسگاہوں سے یہ معلوم ہوا کہ اسلامی ہند کے سب سے بڑے مورخ خصوصاً علمی تاریخ کے یعنی مولانا عبدالحیی مرحوم سابق ناظم ندوہ بھی معقولات کے متعلق پہلے انقلابی اقدام کا زمانہ سکندری عہد ہی کو خیال کرتے تھے اور انہی دونوں ملتانی عالموں کو اس انقلاب کا بانی تصور کرتے تھے۔

Marfat.com

شروع ہوا، رہا یہ سوال کہ عہد سکندری کے تعلیمی نصاب میں معقولات کی کن کن کتابوں کا اضافہ ہوا، کوئی مفصل فہرست تو اس کی اب تک نہیں مل سکی ہے، لیکن جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے، اسی قرن میں ملتان کے اندر ہم ایک مشہور معقولی عالم کو پاتے ہیں، جن کا نام مولانا سماء الدین تھا شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ یہ مولانا سماء الدین .

جامع بود میان علوم رسمی وحقیقی .... وگویند پیش مولانا سماء الدین کہ از شاگردان میر سید شریف جرجانی بود تلمذ کردہ (ص ۲۱۱)

شیخ ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملتان ہی کے رہنے والے تھے، اور وہیں زمانہ دراز تک افادہ واستفادہ کی مجلسیں ان کے دم سے گرم تھیں، مگر ملتان کی بربادی کے بعد یہ بھی اس شہر کو چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے تھے شیخ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"از ملتان بہ سبب بعضے وقائع کہ در آں دیار واقع شد برآمد" (ص ۲۱۱)

مولانا عبد اللہ دعزیز اللہ کے متعلق بھی جیسا کہ گذر چکا یہی لکھا جاتا ہے کہ ملتان کی تباہی نے ان کو ہندوستان کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا، اور یہی قصہ مولانا سماء الدین کا بھی بیان کیا جاتا ہے، بجائے دلی کے یہ رن تھنبور[1] اور بیانہ کی طرف چلے گئے تھے گو آخری عمر دلی ہی میں گذری، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ "سن کبیر واشت" ۹۰۱ھ میں وفات ہوئی، یعنی سکندری دور حکومت میں ان کا انتقال

---

[1] یہ رنتھنبور ہندوستان کے ان مشہور قلعوں میں تھا جو استحکام ومضبوطی کے سوا اپنی مقامی خصوصیت میں بے نظیر تھا، مولوی محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ رن پہاڑ کو کہتے ہیں، اور تھنبور کے معنی "جوشن پوش" جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ دراصل وہ پہاڑ رن اور تھنبور برابر چلے گئے ہیں، قلعہ تھنبور پر ہے، علاء الدین خلجی نے رائے پتھر دیو سے اس قلعہ کو فتح کیا، اکبر کے زمانہ میں اس پر راجہ سرجن کا قبضہ پھر ہو گیا تھا، اکبری اقبال نے ایک مہینہ بارہ دن میں اس کی قلعہ کشائی کی، لکھا ہے کہ ساٹھ ساٹھ من کی توپیں ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھادی گئی تھیں، ایک ایک توپ کو دو دو سو بیل اور سات سات سو آٹھ آٹھ سو کہاروں نے کھینچا، ایک ایک توپ سات سات من کا گولہ منہ سے اگلتی تھی، چند ہی فیر کے بعد راجہ نے اطاعت قبول کرلی قلعہ اکبر کے حوالہ کر دیا، مولانا محمود حسن ٹونکی جنہوں نے ابتداء اسلام سے اس وقت تک کے ان مصنفین اسلام کی جنہوں نے عربی زبان میں کتابیں لکھی ہیں ایک ضخیم تاریخ عربی میں معجم المصنفین نامی لکھی ہے اور حکومت آصفیہ نے اس عجیب وغریب کتاب کی تدوین وترتیب پر ہزارہا ہزار روپے خرچ کیے ہیں، اسی کتاب میں ایک موقع پر یہ عجیب اطلاع دی ہے کہ سوائی مادھو پور جو

بھی ہوا۔

کوئی خاص تصریح تو نہ ملی، لیکن غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ شیخ عبد اللہ و شیخ عزیز اللہ نے ممکن ہے معقولات کا علم ان ہی مولانا سماء الدین سے حاصل کیا ہو، جب وہ یعنی مولانا سماء الدین بہ یک واسطہ میر سید شریف جرجانی کے شاگرد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان عقلی فنون کا ان پر جتنا غلبہ ہو کم ہے، اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ شرح مطالع، شرح حکمۃ العین، شرح مواقف جیسی کتابیں جن میں آخر الذکر دو کتابیں خود میر سید شریف اور اول الذکر ان کے استاذ قطب الدین رازی کی کتابیں ہیں، یہاں کے نصاب میں شریک ہوئی ہونگی، خصوصاً شرح مطالع پر جب میر صاحب کا معرکۃ الآرا حاشیہ بھی موجود ہے، بلکہ میر جرجانی کے ساتھ ساتھ علامہ تفتازانی کی کتابیں بھی اسی زمانہ میں شریک درس ہوئی ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے، تفتازانی کی کتاب مطول کا نام سب سے پہلے مجھے شیخ عزیز اللہ کے شاگرد رشید میاں حاتم سنبھلی کے تذکرہ میں ملتا ہے، بداؤنی کے حوالہ سے گذر چکا کہ چالیس مرتبہ سے زیادہ اس کتاب کو اول سے آخر تک اُنہوں نے پڑھایا تھا، خیر معقولاتی کتابوں کے اضافہ کا یہ تو پہلا دور تھا، اس کے بعد لودیوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے، بابر مغل حکومت قائم کرتے ہیں، اتنا تو ہر اسکول کا بچہ بھی جانتا ہے کہ بابر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہمایوں عقلی علوم کا حد سے زیادہ دلدادہ تھا[1]، مشہور ہی ہے کہ اس کی موت ہی یوں واقع ہوئی کہ اپنے کتب خانہ کی سیڑھیوں سے وہ اُس وقت گرا، جب سیارۂ زہرہ کے طلوع مسائی کا افق پر انتظار کر رہا تھا، تاہم تعلیمی حلقوں میں کسی خاص انقلاب کا اثر اس کے زمانہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ ہمایوں کے بعد دور اکبری شروع ہوا، مختلف دینی اور عقلی قلابازیوں سے گذرتے ہوئے اکبر کا دربار صرف فلسفہ اور حکمت کا دربار بن گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شیراز کے ایک معقولی عالم غیاث منصور کے تفلسف اور تمنطق کا شہرہ ایران سے گذر کر ہندوستان پہنچ چکا تھا، اکبر تک یہ خبر پہنچائی گئی تھی کہ آج کل ایران میں ایک فلسفی ہے جو

"بہ نماز و عبادات و دیگر چند لائے مقید نیست۔" (بداؤنی ص ۳۱۵)

[1] شیخ محدث نے اپنی اس فارسی تاریخ میں جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، ہمایوں کے متعلق لکھا ہے "با علوم ریاضی و اقسام فلسفہ از ہیئت و ہندسہ و نجوم میلے تمام داشت (ص ۲۰۳، تاریخ حقی)

جس خبط میں اکبر اس زمانہ میں مبتلا ہو چکا تھا، اُس کا اقتضا، تھا کہ جہاں تک ممکن ہو، اسی قسم کے لوگ دربار میں جمع کیے جائیں، ملّا عبد القادر نے لکھا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تلاش اکبر کو اس لیے رہتی تھی "مگر در سخناں مذہب و دین با ایں شاں ماشاء خواہد کرد" اتفاقاً اکبر کو خبر ملی کہ غیاث منصور کا ایک "شاگرد بے واسطہ" ان دنوں بیجاپور آیا ہوا ہے، یہ وہی ملا فتح اللہ شیرازی ہیں جن کا کچھ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ

"در وادی الہیات و ریاضیات و طبعیات و سائر اقسام علوم عقلی و نقلی ... نظیر خود نداشت"

ملّا عبد القادر نے لکھا ہے: "برحسب فرماں طلب از پیش عادل خاں دکھنی (والی بیجاپور) بفتح پور رسید ۹۹۱ھ" اگرچہ دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ میر فتح اللہ کے متعلق اکبر کے جو توقعات تھے وہ غلط ثابت ہوئے میر امامیہ مشرب کے پیرو تھے، ملّا بداؤنی کا بیان ہے کہ فلسفہ و حکمت میں اس استغراق کے باوجود

"در وادی مذہب خود استقامت تمام ورزیدہ... و دقیقہ از دقائق تعصب در دین فرو نگذاشت"

انتہا یہ ہے کہ

"در عین دیوانخانہ کہ ہیچ کس یارائے آں نداشت کہ علانیہ ادائے صلوٰۃ کند نماز بفراغ بال و جمعیت خاطر بمذہب امامیہ میگذارد"

لکھا ہے کہ "اینچہ ماپنداشتیم" کی اس غلطی پر اکبر "مطلع شد و او را از زمرۂ ارباب تقلید شمردہ ازاں وادی اغماض نمود" اور "بجہت رعایت علم و حکمت و تدبیر و مصلحت در تربیت او دقیقہ فرو گذاشت نرفت"

مولانا غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

"بکم تر فرصت بدولت مصاحبت فائز و قامت امتیاز بخلعت صدارت کل آراست" (مآثر)

یعنی "صدر جہانی" کے عہدہ پر میر فتح اللہ سرفراز ہوئے۔ اکبری دربار کے امیر مظفر خاں تربتی کو حکم دیا گیا کہ ان کی چھوٹی لڑکی میر فتح اللہ کے ازدواج میں دی جائے، بتدریج میر کا اقتدار بڑھتا ہوئے یہاں تک پہنچا کہ "گویند بر منصب سہ ہزاری رسیدہ بود" (مآثر) اور آخر میں تو راجہ ٹوڈرمل وزیر اعظم کی وزارت میں بھی میر فتح اللہ کو شریک کر دیا گیا، بلکہ ملّا عبد القادر کا بیان تو یہ ہے کہ

Marfat.com

"در منصب وزارت با راجہ ٹوڈرمل شریک ساختند اما دیرانہ در کاروبار با راجہ درآمدہ دار و مداری می نمود" ص ۳۱۶

میر کو اکبر کے دربار سے امین الملک عضد الدولہ کے خطابات بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے، اکبر پر میر اور ان کی مختلف الجہات قابلیتوں کا کتنا اثر تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سفر کشمیر سے واپسی کے موقعہ پر شہر ماندوجان میں جب میر فتح اللہ چند روزہ بیماری کے بعد راہی ملک عدم ہوئے تو اکبر روتا جاتا تھا اور یہ الفاظ بے ساختہ زبان پر جاری تھے۔

"میر وکیل و حکیم و طبیب و منجم ما بود اندازہ سوگواری کہ تواند شناخت اگر بدست فرنگ افتادے و سائر محاصل حکومت و خزائن دربرابر خواستے دریں سودا فراواں سودے کردمے" (مآثر ص ۲۳۰)

فیضی نے اکبر کی اسی سوگواری کی طرف اپنے مرثیہ میر میں اشارہ کیا ہے۔

شہنشاہ جہاں را در وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطون عالم شد

بہرحال گذشتہ بالا معلومات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میر فتح اللہ کی ہستی اکبری عہد میں کتنی وزندار و مؤثر ہستی تھی، اب اس کے بعد تعلیمی مورخین کا یہ بیان سنیئے مولانا غلام علی آزاد فرماتے ہیں:۔

"تصانیف علمار متاخرین ولایت (ایران و خراسان وغیرہ) مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث منصور و مرزا جان میر (فتح اللہ شیرازی) در ہندوستان آورد"

صرف یہی نہیں کہ ان ولایتی مشہور معقولیوں کی کتابیں وہ ہندوستان لائے کہ کتابوں کے لانے اور لیجانے کا کاروبار تو برابر ہی جاری تھا، اصل چیز جو قابلِ غور ہے وہ مولانا آزاد کا یہ فقرہ ہے کہ ان ہی میر فتح اللہ نے ان مصنفین کی کتابوں کو "در حلقۂ درس انداخت" (ص ۲۳۰)

شاید اس زمانہ میں اس کا سمجھنا دشوار ہو کہ ایک طرف تو میر فتح اللہ وزارت عظمیٰ کے کاروبار میں دار و مداری کرتے تھے، اکبر کے عظیم المرتبت ہندوستان کا بجٹ (موازنہ) تیار کرتے تھے، مولانا آزاد نے لکھا ہے:۔

"میر فیصلے چند متضمن کفایت سرکار، و رفاہ رعایا از نظر گذرانید مدحِ استحسان یافت" (مآثر ص ۲۳۰)

Marfat.com

بلکہ اکبری عہد میں فینانس (مالیات) کی تنظیم کا مسئلہ خاص شہرت رکھتا ہے گو بہ ظاہر اس کارنامہ کو ٹوڈرمل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن کتابوں میں ہم جب ٹوڈرمل کے متعلق یہ پڑھتے ہیں کہ

"پیش ازو در ممالک ہند متصدیاں بقانون ہنود دفتر می نوشتند راجہ[1] ٹوڈرمل از نویسندگان ایران اخذ ضوابط نمودہ دفتر ابطور ولائت (ایران) درست کرد" (سیر المتاخرین ص ۲۰۰)

تو یہ باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جن ایرانی نویسندگان سے ٹوڈرمل نے دفتر کے ان ضوابط کو اخذ کیا تھا، ان میں سب سے بڑا ہاتھ ٹوڈرمل کے شریک وزارت عظمیٰ میر فتح اللہ شیرازی ہی کا ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب ایک طرف تو مہمات سلطنت میں مصروف نظر آتے ہیں، اور قلم ہی کی حد تک نہیں، ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ فوجی کوچ میں میر کی ٹھاٹھ یہ ہوتی تھی۔

"تفنگ (بندوق ۱۲) بر دوش وکیسہ دارو (بارود ۱۲) بر میان بستہ چوں قاصداں بصحرا در رکاب (اکبر) دوید" ص ۳۱۶

جب ٹوٹ جانے والی توپ اور ایک گردش میں گیارہ فیر والی بندوق کے موجد میر صاحب ہی تھے تو ان کے اس ٹھاٹھ پر تعجب کیوں کیجیے، مولانا غلام علی نے لکھا ہے کہ خاندیس کے حاکم راجہ علی خاں سے جو فوجی مقابلہ پیش آیا اس کی کمان میر فتح اللہ ہی کرتے تھے۔

ایک طرف ان کی کشوری اور فوجی مشغولیتوں کا یہ حال ہے لیکن دوسری طرف ہم دن کو مدرسی کتابوں کی حاشیہ نگاری میں مصروف پاتے ہیں، مولانا آزاد کا بیان ہے:۔

---

[1] اگر کوئی بیچارا مسلمان ہندوؤں کے قدیم طریقہ کو ناقص ٹھہرا کر جدید ضابطہ کو نافذ کرتا تو بے چارا اس پر تعصب کا تیر چلا دیا جاتا، لیکن شکر ہے کہ یہ انقلاب ایک ہندو وزیر کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا۔ مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) سچ کہتے ہیں کہ اردو زبان ہندوؤں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انہی نے اپنی دیسی زبانوں میں فارسی عربی الفاظ ملا کر ایک نئی بولی کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ موجودہ شکل تک پہنچ گئی، اور فارسی چھوڑ کر ہندوؤں کی اس بولی کو مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا، آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ انگریز اپنی زبان میں ہندوستانی الفاظ نہیں ملاتے لیکن ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی جس زبان کو آج بول رہا ہے انگریزی الفاظ کی اس میں کتنی بھرمار ہوتی ہے۔

Marfat.com

از مصنفات او تکملہ حاشیہ علامہ دوانی و ملا جلال بر تہذیب المنطق و حاشیہ بر حاشیہ مذکور متداول ست (ص ۲۳۸)

اور یہی نہیں کہ فرصت کے اوقات میں اکبر کے دربار کا یہ وزیر باتدبیر کبھی کبھی اپنی مدرسی زندگی کو ان علمی شغلوں سے تازہ کیا کرتا تھا، بلکہ علم کا زہر اس علم گزیدہ شخص پر کچھ اس بری طرح چڑھا ہوا تھا کہ کبھی کبھی تفکاہی طور پر نہیں بلکہ باضابطہ جیسا کہ بداؤنی کا چشم دید مشاہدہ ہے کہ "بہ تعلیم اطفال امرا مقید بود" (ص ۳۱۶) خدا ہی جانتا ہے کہ ان کو فرصت کیسے میسر آتی تھی کہ "ہر روز بمنازل مقربان رفتہ" درس تدریس کے مشغلہ کو جاری کیے ہوئے تھے، صرف اعلیٰ درجوں کی انتہائی کتابوں ہی تک ان کا درس محدود نہ تھا بلکہ ملا بداؤنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ اور لوگوں کے "امرا زادہائے دیگر ہفت وہشت سالہ بلکہ خورد تر آں را علم صبیانی می کرد" (ص ۳۱۶)

ایک طرف یہ تو آپ سن ہی چکے کہ دوانی، صدر شیرازی، مرزا جان کی کتابوں کو وہ ہندوستان میں پھیلا رہے تھے، شرح ملا جلال پر حاشیہ لکھتے تھے، قرآن کی تفسیر میں کتابیں تصنیف کر رہے تھے، اور دوسری طرف ان کے تدریسی اور تعلیمی ذوق کی یہ انتہا تھی کہ ان سات آٹھ بلکہ ان سے بھی خورد سال امیرزادوں کو وہ بقول بداؤنی "تعلیم نقط وخط و دائرہ بلکہ ابجد ہم می داد (ص ۳۱۶) اور یہی چیز تھی جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس زمانہ میں اس کا باور کرنا دشوار ہے۔ اب خیال کیجیے کہ ملتان سے شیخ عبداللہ و عزیز اللہ معقولات کا جو ذخیرہ لائے تھے

لے ابن خلدون کے مقدمہ کا مشہور فقرہ "العلماء ابعد الناس عن السیاسۃ" (یعنی علماء سیاسیات میں کورے ہوتے ہیں) اگرچہ یہاں علماء سے وہ اصطلاحی علماء مراد نہیں ہیں جنہیں اس زمانہ میں مولوی ملا وغیرہ کہتے ہیں، بلکہ عام علمی طبقہ مراد ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے جہانگیری کی حد تک ابن خلدون کا یہ نظریہ صحیح ہو کہ علمی افکار والے میدان جنگ میں عموماً صرف احتمال آفرینیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بالکل وہی لیجا تا ہے جو "نہ آرسی جانتا ہو نہ فارسی" جس کا کچھ تجربہ اس زمانہ میں بھی ہو رہا ہے، لیکن سیاست کا دوسرا حصہ جسے ہم "جہانداری" کہہ سکتے ہیں، کم از کم ہندوستان میں تو ابن خلدون کا نظریہ غلط ثابت ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسلامی بادشاہان ہند میں بہترین شاداب عہد شاہجہاں کا ہے۔ کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے (باقی بر صفحہ ۲۰۲)

Marfat.com

وسکندری حکومت کی سرپرستی انہیں بھی حاصل تھی اور اسی لیے جس حد تک ان علوم کو ان دونوں نے رواج دینا چاہا اُس حد تک وہ مروج بھی ہو گئے، لیکن ایران سے عقلیت کے جس طوفان کو میر فتح اللہ ہندوستان لائے اُسے تو سلطنت کی صرف پشتیبانی ہی نہیں حاصل تھی، بلکہ حکومت کے اساطین و اراکین کے گھر گھر میں ایک ایک بچہ کو میر صاحب یہ فیر ازی شراب دے انہماک و توجہ سے پلا رہے تھے، سوچنے کی بات ہے ملک کے تعلیمی ماحول پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا تھا، یقیناً یہی اس کا نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہی ہو کر رہا، جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے۔

"ازاں عہد (از عہد فتح اللہ شیرازی) معقولات را رواجے دیگر پیدا شد" (ص ۲۳۸)

مولانا غلام علی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس "رواج دیگر" کا بڑا موثر سبب یہی تھا کہ میر صاحب نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کر دیے "جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند" خصوصاً جب میر کی محفل کے حاشیہ والوں میں عوام ہی نہیں، امراء زادگانِ حکومت ہوں،

اور یہ تھا ہمارے تعلیمی نصاب کا دوسرا انقلابی دور، یقیناً اسی زمانہ میں شرح تجرید قوشجی کے حواشی قدیمہ و جدیدہ و اجد کا رواج اس ملک کے ارباب تعلیم میں ہوا، اور اسی زمانہ میں مرزا جان

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) کہ شاہ جہانی دور کے اس امتیاز میں شاہ جہاں کے ملّا وزیر اعظم ملا سعد اللہ کی دماغی صلاحیتوں کو دخل نہ تھا۔ افسوس ہے کہ ملا سعد اللہ کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی، ورنہ نظام الملک طوسی جیسے وزراء میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندی بادشاہوں میں کچھ بھی ہو، اسے حکومت کی کتنی ہی قلیل مدت ملی ہو، لیکن شیر شاہ کے جہانگیرانہ اور جہانداریانہ دونوں کارنامے قطعاً غیر معمولی ہیں، ارباب خبرت و بصیرت جانتے ہیں کہ اکبری عہد کے اصلاحات کا بڑا حصہ آئین شیر شاہی سے ماخوذ ہے۔ شیر شاہی قدیم سڑکیں اب بھی ہندوستان کے طول و عرض میں اس بادشاہ کی بیداری و اولو العزمی کا گیت گا رہی ہیں، لیکن ان شیر شاہی کارناموں میں اگر مجھے جونپور کے مدرسوں کی وہ تعلیم نظر آتی ہے جو رغبتے بتحصیل عربیت نمود (سیر المتاخرین ص ۱۵۸) کے بعد شیر شاہ کو حاصل ہوئی اس خیال سے مجھے کیوں ہٹایا جا سکتا ہے۔ والتفصیل یجز الی التطویل۔

نغستن اور برنیر نے ملا سعد اللہ شاہجہانی وزیر کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں: "سرزمین ہند میں سعد اللہ خاں سے بڑھ کر کوئی مدبر کوئی قابل کوئی راستباز وزیر پیدا نہیں ہوا، اس کی ذات پر ہندوستان جتنا ناز کرے بجا ہے" (بات جمیل صفحہ ۲۸) اور میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کی تعلیم کا ملایانہ نظام جتنا چاہے ملا پر فخر کر سکتا ہے۔

Marfat.com

کے حواشی محاکمات و عضدیہ وقدیہ وغیرہ نے یہاں مقبولیت حاصل کی، دوانیؒ کی دونوں درسی کتابیں حسال تک نصاب میں شریک تھیں، اور پرانے مدرسوں میں اب بھی ہیں۔ یعنی مُلّا جلال اور عقائد جلالی اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں، ملا فتح اللہ شیرازی کے بعد ہندوستان میں معقولات کی جو کتابیں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں عجیب بات ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ ہمیں ایک ایسے شخص کے ذکر میں ملتا ہے جو مسلمان تو نہیں تھا، لیکن اس زمانہ کی درسی کتابیں آگرہ میں پڑھایا کرتا تھا، اس کا نام کامراں تھا اور حکیم کامراں کے نام سے مشہور تھا، دبستان المذاہب میں

لہ یہ دوان نامی قریہ کی طرف نسبت ہے، ہمارے مدارس میں عموماً اس لفظ کا تلفظ واو کی تشدید کے ساتھ کیا جاتا ہے، لیکن خود ایک ایرانی مورخ اس کے متعلق لکھتا ہے: دوان علی وزن ہوان۔ دوسری کتابوں میں بھی ضبط اعراب کرتے ہوئے یہی لکھا گیا ہے، اسی کتاب میں ہے کہ گازرون کا یہ ایک قریہ ہے۔ اسی میں ہے کہ علامہ دوانی نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر منزل عالی بنوائی تھی جو دشت ارژن کی طرف مشرف تھی یہ دشت ارژن وہی ہے جس کی قدیم ایرانی جغرافیہ نویسوں نے بڑی تعریف بیان کی ہے، سرسبز وسیع مرغزار موسم برسات میں ایک جھیل تیس میل لمبی پیدا ہو جاتی تھی جس میں مچھلیاں بھی بکثرت ہوتی تھیں وارژن نغ بادام کو کہتے ہیں غالباً اس کا جنگل کبھی وہاں تھا۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے اپنے مطالعہ کے لیے یہ محل تعمیر کیا تھا۔ روضات الجنات جس کتاب سے یہ مضمون لیا گیا ہے اس کے مصنف نے لکھا ہے کہ "ہو الی الآن باقٍ یری من بعید" (ص ۲۰۲) یعنی علامہ کی یہ پہاڑی کوٹھی اب بھی موجود ہے دور سے نظر آتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وسعت و استحکام دونوں لحاظ سے یہ عمارت غیر معمولی ہوگی اس سلسلہ میں اس کا ذکر بیجا نہ ہوگا مدارس والے تو واقف ہیں لیکن عوام نہ جانتے ہوں اور عوام کیا اب تو خواص بھی مشکل سے واقف ہونگے کہ قدیمہ جدیدہ اجد کیا چیز ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے محقق طوسی نے علم کلام میں تجرید نامی متن لکھا تھا علامہ علی قوشجی نے اس کی شرح لکھی شرح پر دوانی نے حاشیہ لکھا، ان کے معاصر امیر صدر الدین الاشتکی نے بھی شرح تجرید پر حاشیہ لکھا جس میں دوانی پر جرحیں کی گئی تھیں، دوانی نے اس کا جواب لکھا، الاشتکی نے پھر اس کا جواب لکھا، دوانی نے جواب الجواب تحریر کیا، یوں دوانی کے تین حاشیے قدیمہ جدیدہ اجد ہو گئے۔ صدر الدین مر گئے تھے ان کے بیٹے امیر غیاث منصور جو غیاث الحکما کے نام سے مشہور ہیں والد کی طرف سے جواب لکھا، اب ادھر بھی وہی تین قدیمہ جدیدہ اجد ہو گئے۔ ذہنی زور آزمائیوں کا ان کتابوں میں طوفان اُبلتا تھا، علماء نے درس میں داخل کیا ان پر حواشی مرزا جان آقا حسین خوانساری نے لکھے اور اب حفظت الہدایۃ متنھا و مقاصدھا خاکسار کے خاندانی کتب خانہ میں یہ سارے حواشی قلمی موجود تھے جن کا کچھ حصہ نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ حبیبیہ میں محفوظ کرا دیا گیا کہ اب نہ ان کا کوئی پڑھنے والا ہے نہ پڑھانے والا مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ ایک ایک گاؤں میں علم کا سرمایہ کتنا محفوظ تھا ۱۲۔

لہ (بر صفحہ ۲۰۴)

Marfat.com

اس شخص کا تذکرہ تفصیل سے پایا جاتا ہے، لکھا ہے کہ "حکیم کامران شیرازی او نیز

"حکیم کامران شیرازی او نیزرہ سپر کیش مشائین ست علوم عقلی و نقلی رانیکو مستحضر بود"

یعنی بجائے کسی دین کے فلسفہ مشائیہ ہی کو اُس نے اپنا کیش اور مذہب بنا لیا تھا، یہ بھی لکھا ہے کہ

"بعد از کسب کمال بگووہ کہ از بنادر فرنگ است افتاد و بہ مجالست ایشاں رغبت نمودہ بہ کیش نصاریٰ

جلوہ گرآمد، لاجرم انجیل رانیکو آموخت و از علوم ایشاں مایہا اندوخت و بعد ازیں بہ ہند آمدو بار اجہا

آشنا شد و بہ کیش ایشاں گام زدو شاستر ہندوی یعنی علوم ایشاں نزد براہمہ فاضل بخواند و دراں نیز

سرآمد دانایان ہند شد"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کے مروجہ علوم و فنون کے علاوہ حکیم کامراں نے یورپین

پادریوں اور ہندی پنڈتوں سے بھی ان کے علوم سیکھے تھے، اسی کتاب میں لکھا ہے :۔

(حاشیہ صفحہ ۲۰۳) ۵ دبستان المذاہب ایک دلچسپ کتاب ہے، اس کا مصنف کون ہے صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا، بعض لوگ اس کو داراشکوہ کی کتاب بتاتے ہیں بعضے ملا محسن فانی کشمیری کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مآثر الامراء میں ہے "ذوالفقار اردستانی موبد تخلص در دبستان خود کہ حاوی اکثر اعتقادات اہل ہنود و مجوس و مذاہب مروجہ اہل اسلام است" (ج ۲ ص ۳۹۲) جس سے معلوم ہوا کہ اس کا مصنف یہی ذوالفقار اردستانی ہے، لیکن خود کتاب کی اندرونی شہادتوں سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف کوئی مسلمان نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ ذوالفقار کسی مسلمان ہی کا نام ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہٰذ) ۵ لیکن یہ واقعہ ہے کہ حکیم کامراں کسی مذہب کا پابند نہ تھا، بہ ظاہر پارسی النسل آدمی معلوم ہوتا ہے، ایرانی علماء سے عربی و فارسی کی تحصیل کی تھی، فلسفہ میں غلو تھا اور فلسفہ ہی کو اس احمق نے اپنا مذہب بنا لیا تھا، دبستان المذاہب والے نے لکھا ہے کہ "موسیٰ را جادوگر دانستے و ربی موسیٰ خواندے، و عیسیٰ را طبیب شمردے و حکیم عیسیٰ بن یوسف نجار گفتے" العیاذ باللہ۔ یوں ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی شان میں وہی پرانا قول "شاعر و مجنون" کو ان الفاظ میں دہراتا۔ "محمد رسول اللہ را ملک الشعرائے عرب نامیدے" اور اس حد تک تو غنیمت ہے، بیچارے کرشن جی مہاراج کو کہتا "و کشن اوتار را چھنال یعنی شہوت پرست و زانی خواندے" اگرچہ اس میں کامراں کی شرارت کے سوا خود ان بیہودہ روایتوں کو بھی دخل ہے جنہیں ہندو کرشن جی کے بارے میں پھیلاتے رہتے ہیں، اشارہ وہی گوپیوں کے قصے کی طرف کر رہا ہے۔ کامراں نے اپنا مذہب فلسفہ قرار دیا تھا جب مر رہا تھا تو صاحب دبستاں نے لکھا ہے: "پیوستہ بقرات الٰہیات شفا و زبجہ اثولوجیا مشغول و شاداں می سرود" یہ بھی کہتا تھا کہ "بہ نہاد فلاسفہ ایمان دارم و از ادیان و مذاہب بیزارم"، و در ہنگام گذشتن رجب دم نکل رہا تھا) (باقی بر صفحہ ۲۰۵)

"درہزار و پنجاہ ۱۰۵۰ء در سرائے فرخ نزدیک بہ اکبرآباد سپہر بنیاد تجرد گزید"

یعنی ایک ہزار پچاس ہجری میں آگرہ کے نزدیک سرائے فرخ نامی مقام میں اس کا انتقال ہوگیا چونکہ عمراو از صد سال گذشتہ بود" اس لیے ضرور ہے کہ ہندوستان میں اس نے اکبر جہاں گیر کے زمانہ کے سوا شاہ جہاں کا عہد بھی کچھ پایا تھا، صاحب دبستاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ تو اس کا تجارت تھا، جیسا کہ عموماً پارسیوں کا مذاق ہے لیکن اسی کے ساتھ درس بھی دیتا تھا، منجملہ بہت سے شاگردوں کے کامراں کا ایک شاگرد کوئی عبدالرسول نامی شخص بھی تھا، دبستاں میں ہے کہ کامراں نے اسی عبدالرسول کو خود پڑھایا تھا، چونکہ اس بیان سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ملا فتح اللہ کے بعد ہندوستان میں معقولات کی کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے بجنسہ صاحب دبستاں کے الفاظ میں ان کتابوں کے نام اور ان کے درس کی جو ترتیب تھی نقل کرتا ہوں لکھا ہے کہ

"بعد از صرف و نحو شرح شمسیہ (قطبی) آں گاہ طبیعیات شرح ہدایت حکمت حسین بن معین الدین میبذی، وپس امور عامہ شرح حکمۃ العین و بعد ازاں شرح تجرید با حواشی و بعد ازاں طبیعیات شرح اشارات و پس الٰہیات شفا تعلیم کرد"

شرح تجرید با حواشی کا مطلب وہی ہے کہ صدر معاصر اور دوانی کے مناظرانہ حواشی جو قدیمہ، جدیدہ، اجد کے نام سے مشہور ہیں۔ نیز مرزا جان کے جو حواشی ان پر ہیں، ان کی تعلیم بھی اس زمانہ میں مروج تھی، حکیم کامراں علاوہ فلسفہ کے ریاضی کی کتابیں بھی پڑھاتا تھا، دبستاں ہی میں ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴) نام واجب الوجود و عقول و نفوس و کواکب می گفت۔ وصیت کی تھی کہ دفن کرنے کی میرے یہ صورت ہو: "مرا سر بہ مشرق و پا بہ مغرب دفن کنید کہ جمیع بزرگاں چوں ارسطو و افلاطوں چنیں خوابیدہ اند"
اس کا ایک غلام یا نوکر ہوشیار تھا صاحب وصیت "بر سر قبرش تا یک ہفتہ ہر روز و شب بخوران کواکب کہ آں روز و شب بدو تعلق دارد بیفروخت و آں خورد و پوش کہ منسوب بداں کوکب است بہ براہمہ و مستحقاں رساند"
کامران کے مزاج میں ظرافت بھی تھی اس سے پوچھا گیا کہ خلاصہ عقیدہ سنی و شیعہ بیان کن۔ جواب داد کہ عقیدہ سنی ایں است بعد حمد اللہ تعالیٰ و نعت رسول صلوٰۃ اللہ و رحمۃ اللہ علی جمیع الفاسقین والفاسقات والفاجرین والفاجرات، و عقیدہ شیعہ ایں ست بعد حمد اللہ تعالیٰ و نعت رسول صلوٰۃ اللہ لعنۃ اللہ علی جمیع المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات "عجیب نحو

"ملا یعقوب[1] نزد او تحریر اقلیدس و شرح تذکرہ خواند"

واللہ اعلم بالصواب دبستاں کی یہ روایت کہاں تک درست ہے کہ "میر شریف مطول و تفسیر بیضاوی خواندہ" یہ میر سید شریف جرجانی نہیں بلکہ دوسرے میر شریف ہیں اسی میں یہ بھی ہے کہ "ملا عصام پیش او تفسیر بیضاوی خواندہ ..... و توضیح و تلویح کہ در اصول فقہ حنفی ست خواندہ" ص ۳۱

خدا جانے یہ ملا عصام کون ہیں اور حکیم کامراں سے پڑھنے کا موقع ان کو ہندوستان میں ملا یا ہندوستان سے باہر کیونکہ ملا عصام جو مشہور ہیں وہ تو غالباً ہندوستان نہیں آئے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، اس سے ایک طرف اس زمانہ کی درسی کتابوں[2] کا حال اگر معلوم ہوتا ہے، تو اسی کے ساتھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں بھی تھے، لیکن چونکہ پڑھنے پڑھاتے تھے ان ہی علوم و فنون کو جو مسلمانوں کے یہاں مروج تھے، اس لیے علاوہ معقولات کے دینیات

---

[1] غالباً یہ وہی ملا یعقوب ہیں جو ملا یعقوب کشمیری کے نام سے مشہور ہیں، صرفی تخلص کرتے تھے بداونی نے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے کہ "بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ، و سند حدیث از شیخ ابن حجر داشتہ" ملا صاحب کے ملنے والوں میں تھے ان کے نام خطوط بھی ہیں جو اسی تاریخ میں منقول ہیں، ملا یعقوب کے متعلق بداونی کی شہادت ہے "در جمیع علوم عربیت از تفسیر و حدیث و تصوف مشارٌ الیہ و معتمد علیہ و سند امام ست" (ص ۱۴۲) ملا عبدالقادر نے یہ بھی لکھا ہے: "تفسیرے در آخر عمر چوں تفسیر کبیر می خواست کہ بنویسد و پارہ مسودہ کردہ ناگاہ سر نوشت ازل پیش آمد" یعنی مر گئے۔

یہ بھی اسی میں ہے کہ پادشاہ مغفرت پناہ (ہمایوں) و ہم شاہنشاہی (اکبر) را نسبت بوئے اعتقاد غریب بود، شرفِ صحبت اختصاص یافتہ و منظورِ نظر شفقت اثر گشتہ و معزز و مکرم و محترم بود" آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں علم حدیث کے جاننے والے کیسے کیسے لوگ ہیں لیکن بعض لوگ ہیں کہ ایک صغانی پر قصہ ختم کر دیتے ہیں، صرف منتخب التواریخ سے بیسیوں آدمیوں کے نام منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

[2] حکیم کامراں کے تذکرے سے جہاں درسی کتابوں کا سراغ ملتا ہے وہیں اس کا بھی کہ ہندوستان میں شفا، اشارات حکمۃ العین، شرح تجرید، شرح تذکرہ وغیرہ کتابیں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ اتولوجیا جو مسلمانوں میں ارسطو کی کتاب سمجھی جاتی ہے، اگرچہ اس کی نہیں بلکہ نیو افلاطون اسکندرانی کی اشراقی کتاب ہے، لیکن بہر حال فلسفہ کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، آپ سن چکے وہ بھی موجود تھی، دبستاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صد سالہ بڈھے کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔

کتابہائے حکما را بہ ہشیار نامی پسر دہشیار در آگرہ کتابہائے او را بخش کردہ بیار اق فرستاد (ص ۳۰)

یا نیم دینیات کی کتابوں کا بھی وہ درس دیتے تھے، اور مسلمان طلبہ ان سے پڑھتے تھے۔ آپ کو حکیم کامراں کے قصہ سے اس کا بھی اندازہ ہوا ہو گا کہ عقلی علوم کے کیسے کیسے ماہرین اس ملک میں آ آ کر اکٹھے ہو رہے تھے، اسی قسم کے مشرب و مسلک کا ایک آدمی دستور نامی بھی تھا، جو بلخ میں پیدا ہوا تھا اور "در سال ہزار و پنجاہ و چہار" یعنی حکیم کامراں کے مرنے کے چار سال بعد "بلاہور آمد" صاحب دبستان نے لکھا ہے کہ

"در خدمت شاگرد ملا میرزا جان تحصیل حکمت نمود پس بایران خرامیدہ و با میر محمد باقر داماد و شیخ بہاء الدین محمد و ابو القاسم فندرسکی و فضلائے دیگر و علمائے شیراز صحبت داشتہ با نہا اندوخت" (دبستان ص ۲۰۶)

ایک اور پارسی عالم ہیربد کو بھی صاحب دبستان نے بایں الفاظ روشناس کیا ہے "حکیم الٰہی ہیربد کہ در لاہور نامہ نگار (مصنف کتاب) بدو رسید" اس کے بعد لکھتا ہے: "او مردے بود از نژاد زردشت وخشور یزداں در دانش پارسی رسا" جس سے معلوم ہوا کہ وہ پارسیوں کا کوئی موبد تھا، لیکن اس زمانہ میں ان لوگوں کا کیا حال تھا، لکھا ہے کہ

"تحصیل عربیت و حکمیات در شیراز نمودہ با فرہنگیاں فرنگ صحبت داشتہ انجام بہند پیوست"

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغربی علوم و فنون سے پارسیوں کی دلچسپی بہت قدیم ہے، اور یہ تو خیر غیر مسلم لوگ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی، فتح اللہ شیرازی کے بعد اکبر اور اکبر کے بعد بھی مسلمان معقولیوں کا ہندوستان میں تانتا بندھ گیا تھا، فارغی شیرازی جس کا میں نے کہیں پہلے بھی ذکر کیا ہے، ملا عبد القادر نے لکھا ہے کہ "برادر شاہ فتح اللہ ست" اسی فارغی شیرازی کے صاحبزادے میر تقی کے متعلق ملا عبد القادر کی شہادت ہے کہ "در علم ہیئت و نجوم قائم مقام

لہ پارسیوں کا خیال ہے کہ ہم مسلمان لوگ رسول اور نبی کے لفظ سے جو مراد لیتے ہیں وہی معنی پارسی میں "وخشور" کے ہیں حکیم کامراں سے اسی دبستان میں مختلف اقوام کے ہداۃ اور ان زبانوں میں ان کے جو نام ہیں، نقل کیا ہے، بعض چیزیں اس میں بالکل نئی ہیں "پیغمبران فارس کہ آباد، و زردشت و امثال آنند ایشاں را وخشور گویند و رسولاں یونان و روم کہ اغاثاذیموس، و ہرمس و امثال ایشانند ایشاں را صاحب ناموس خوانند و انبیاء ہند کہ رام و کشن و مانند ایشانند ایشاں را اوتار نامند پیغمبران اتراک افیریت و اغور خاں و ایشاں را بولماس سرخوانند و پیغمبران اسلامیہ کہ از آدم صفی تا محمد ایشاں را رسل گویند ص ۳۰۴"

شاہ فتح اللہ بود" ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے "کہ فقیر پارۂ از بست باب ..... پیش او گذرانید"

میر فتح اللہ کا حال اور ان علوم میں جو ان کا پایہ تھا، خصوصاً ریاضیات کے متعلق ملا عبد القادر نے لکھا ہے: "دریں فن آں قدر حالت داشت کہ اگر بادشاہ متوجہ می شد ندر رصد می توانست بست" (ج ۳ ص ۱۵۵) جو رصد بندی کی قدرت رکھتا ہو، اُس کی قائم مقامی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اکبری کے زمانہ میں علامہ جلال الدین دوانی کے گھرانے کے ایک عالم عین الملک جن کا خطاب تھا ہندوستان آئے، اگرچہ ملازم تو وہ شعبۂ طبابت میں تھے خصوصاً امراض چشم اور کحالی قدح زنی میں کمال تھا، لیکن جب یہ معلوم ہے کہ "از جانب والدہ از فرزندان علامہ جلال الدین دوانی" (ص ۲۳۰) تو ان کی معقولیت جس پیمانہ پر ہوگی ظاہر ہے، اکبری کے زمانہ میں ملا نور اللہ شستری بھی ایران سے آئے اور لاہور کے قاضی ہوئے، قاضی نور اللہ کا مذہب جو کچھ بھی ہو لیکن علوم عقلیہ بلکہ شاید نقلیہ[1] میں بھی جو دستگاہ ان کو حاصل تھی، اُس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، شرح تجرید کے الٰہیات پر شرح چغمنی پر قدیمہ پر ان کے حواشی ان علوم کے ماہرین کے حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

عہدِ اکبری میں عقلیات کی جو کتابیں عام طور پر درس و تدریس میں زیر استعمال تھیں ان

[1] میں نے نقلیہ اس لیے لکھا کہ شیعی دینیات کے سوا ہم تاریخوں میں پاتے ہیں کہ ابن حزم کی محلّی کا خلاصہ بھی انہوں نے لکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ محلّی جیسی ضخیم کتاب تین جلدوں میں ہندوستان آچکی تھی، اس کتاب کے خلاصہ کرنے کی وجہ باوجود شیعی ہونے کے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکبر کے سامنے لاہور میں جب وہاں کے قاضی ضعف پیری کی وجہ سے گر پڑے تو اکبر نے حکم دیا ان کی جگہ دوسرے عالم کا تقرر کیا جائے، اب ان بڑے میاں سے کام نہ چلیگا، حکیم ابو الفتح نے نور اللہ شوستری کو پیش کر دیا۔ بظاہر انہوں نے تقیہ سے کام لیا اور اپنا مذہب ظاہر نہ کیا، صرف بادشاہ سے یہ اجازت چاہی کہ اہل سنت کے مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے مطابق اگر فیصلہ کروں تو مجھے اس کی اجازت دی جائے۔ اکبر نے اجازت دے دی، قاضی صاحب ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہر مسئلہ میں کوئی ایسی صورت نکالتے جو امامیہ مذہب کے مطابق ہو جاتا اور کہہ دیتے کہ فلاں امام کے یہاں بھی یہ روایت ہے، غالباً اسی غرض سے محلّی کا مطالعہ کرتے ہونگے اور اپنے کاروبار کے لیے اس کا خلاصہ کیا ہوگا، لیکن بات چھپی نہ رہی جہانگیر کے زمانہ میں ان کی ایک کتاب مجالس المؤمنین پکڑی گئی جو تبرّا سے بھری ہوئی تھی، جہانگیر نے خاردار دُرّے سے حد لگانے کا حکم دیا، کہتے ہیں کہ نور جہاں جو جہانگیر کی پشت پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی تھی لاکھ دہائی دی کہ ایسا نہ کرو، لیکن اس وقت اس کا حال او رتھا، "اے جاناں بہ تو جان دادہ ام ایمان نہ دادہ ام" کہتا جاتا تھا۔ قاضی نور اللہ دُرّہ کی مار سے مر گئے، شیعوں میں اسی لیے شہید ثالث کے نام سے موسوم ہیں، دیکھیے نجوم السماء تاریخ علماء شیعہ۔

کا کچھ پتہ ملا عالم کابلی کے اس طرزِ عمل سے بھی ہوتا ہے جس کا تذکرہ ملا عبد القادر نے بایں الفاظ کیا ہے۔

"دریاض خود تقریبے در بحث شرح مقاصد نوشتہ و اشعارے کردہ کہ ایں عبارت از کتاب تصد است کہ از جملہ مصنفات کاتب است وہم چنیں تجدید در مقابل شرح تجرید ویک دو حاشیہ بر مطول نوشتہ و گفتہ کہ ایں تقریر نقل از کتاب طوّل است کہ در برابر مطول و اطول ست" (ج ۳ ص ۲۷)

مطلب یہ ہے کہ ملا عالم کے مزاج میں ظرافت و خوش طبعی کا فطری مادہ تھا، واقعہ میں ان کی کوئی تصنیف تو تھی نہیں لیکن تصد اور تجدید، طوّل یہ اپنی فرضی کتابوں کا نام رکھ دیا تھا، ملا صاحب نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن میں اپنی ان فرضی کتابوں کا نام بھی لیا ہے اور اس زمانہ کی مشہور کتابوں مثلاً شرح مواقف شرح حکمۃ العین وغیرہ سے مقابلہ کیا ہے، بعض اشعار یہ ہیں۔

دیدہ بودی نسخۂ تجدید ۔ کہ مجدد رسید فیض جدید

کاندر و صد مواقف است نہاں ۔ وز بیانش مقاصد ست عیاں

متن تجرید پیش او لنگ است ۔ گلشن از قحط آب بیرنگ ست

لمعہ اش بے تکلف و اغراق ۔ حکمت عین و حکمت اشراق

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح مواقف، شرح مقاصد، شرح تجرید، شرح حکمت العین، حکمۃ الاشراق وغیرہ کتابوں کا اس زمانہ میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں عام چرچا تھا۔

لیکن باوجود اس کے پھر بھی جہاں تک واقعات سے اندازہ ہوتا ہے ملک کے عام تعلیمی نصاب میں معقولات کی ان کتابوں کی حیثیت لازمی اجزاء و عناصر کی نہ تھی کیونکہ اکبر اور اکبر کے بعد ہم جہاں تک مستقبل کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں ہندوستان کے عام اہل علم پر معقول کا رنگ نظر آتا ہے کہ زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا ہے، اور خود سیدنا الامام حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہ نے حالانکہ جو کچھ لکھا ہے عقلیت کے اسی رنگ کو پھاڑنے کے لیے لکھا ہے لیکن عقلیت کے خلاف ان کا سارا کلام جیسا کہ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں سراسر عقلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی حال

Marfat.com

حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کا ہے کہ نشانہ سب کا وہی غلط عقلیت ہے جس میں لوگ مذہب کے باب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عقلیت کی تردید جب تک خود اسی عقلیت کی راہ سے نہیں کی گئی ہو ایسی تردیدوں کو اپنے زمانہ میں کبھی پذیرائی میسر نہیں آئی، مجدد صاحب کی تجدید کا گر ہی یہ ہے کہ قرآنی اصول۔ مآ ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو لیکن اس کی قوم کی زبان میں) اکے زیر اثر انہوں نے کام کیا۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ منطق وفلسفہ کے اس دور دورے کے باوجود جہاں تک واقعات کا اقتضا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان عقلی مضامین کی حیثیت مدت تک اختیاری مضامین کی رہی جہانگیری عہد کے عالم حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی ہیں، اخبار الاخیار کے آخر میں اپنے حالات شیخ نے خود لکھے ہیں، جن میں اپنی تعلیم کا بھی ذکر فرمایا ہے، اس سلسلہ میں جو کتابیں آپ نے پڑھی ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ "سیزدہ سالہ بودم کہ شرح شمسیہ و شرح عقائد می خواندم" شرح شمسیہ سے تو وہی قطبی مراد ہے، اور شرح عقائد سے شاید شرح عقائد نسفی مقصود ہو، شرح صحائف کی جگہ غالباً شیخ نے یہی کتاب عقائد میں پڑھی تھی جو اب تک درس نظامیہ کے نصاب میں شریک ہے۔ آگے لکھا ہے کہ" در پانزدہ وشانزدہ مختصر ومطول راگذراندم" گذر چکا کہ علامہ تفتازانی کی ان دونوں کتابوں کا اضافہ شیخ عبد اللہ وعزیز اللہ کے ذریعہ سے سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا، اس کے بعد شیخ محدث فرماتے ہیں

"ہیش تر یا پس تر بہ یک سال از عددے کہ ظرف در شمار عمر از ذکر آں ملاحظہ کنند از علوم عقلی ونقلی علوم آنچہ ور افادہ واستفادہ از صورت ومادہ کافی ووافی باشد تمام کردم"

عبارت میں کچھ اغلاق ہے، یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے، حاصل یہی ہے کہ وہی پندرہ سولہ کی عمر کے ایک سال آگے یا پیچھے عقلی ونقلی علوم سے شیخ فارغ ہو گئے، جہاں تک میرا خیال ہے معقولات میں مذکورہ بالا کتابوں سے آگے شیخ نے شاید اس فن کے ساتھ زیادہ اشتغال نہیں رکھا، اپنے والد سے خود اپنے متعلق یہ مشورہ بھی شیخ نے نقل کیا ہے کہ "تو یک مختصر از ہر علم بخواں ترابسندہ ست" (ص ۳۰۱)

ایسی صورت میں والد کی رائے سے اختلاف کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے، خود ان کی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقلیات سے شیخ کا تعلق بہت معمولی ہے۔ شیخ نے ایک موقعہ پر اگرچہ یہ بھی لکھا ہے کہ فاتحہ فراغ کے بعد "ملازمت درس بعضے از دانشمندانِ ماوراء النہر بطورے نمودہ شد" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراء النہر[1] کے بعض تازہ وارد علماء سے بعد کو بھی شیخ نے کچھ پڑھا تھا لیکن ان علماء کا ماوراء النہری ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ شیخ نے ان سے فقہ یا اصول فقہ جیسے علوم کی کوئی کتاب پڑھی ہوگی، ہاں ایران کے کسی عالم کا ذکر کرتے تو اس وقت یہ سمجھنا شاید بعید نہ ہوتا کہ منطق یا فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھی ہوگی۔

بہرحال اسی قسم کے مختلف قرائن و اسباب سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دانشمندی کی سند کے لیے معقولات کی ان کتابوں کا پڑھنا ہر اس شخص کے لیے ضروری نہیں تھا جن کا رواج

---

[1] عجیب بات ہے کہ بعض لوگ جنہیں بخارا اور سمرقند یعنی جس کی دوسری تعبیر ماوراء النہر سے کرتے ہیں، چونکہ ان شہروں کے علمی ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہے اس لیے ہندوستان کی معقولیت کا الزام ان ہی بیچارے علماء پر ڈال دیتے ہیں جو ماوراء النہر سے ہندوستان آئے۔ حالانکہ تاتاری فتنہ کے بعد جب اس ملک میں پھر علم کا رواج ہوا تو اس میں زیادہ تر فقہ و اصول فقہ جیسے علوم تھے منطق و فلسفہ سے ان کا تعلق بہت معمولی تھا، عبداللہ ازبک کے عہد میں جو اس زمانہ میں بادشاہ توران کہلاتا تھا ملا عصام اسفرائنی کے ذریعہ سے اس علاقہ میں جب منطق کا کچھ زور بندھا تو جیسا کہ ملا عبدالقادر بداؤنی نے قاضی ابوالمعالی کے ذکر میں یہ لکھ کر کہ "در فقاہت چناں بود کہ اگر بالفرض والتقدیر جمیع کتب فقہ حنفی از عالم برافتادے او می توانست کہ از سر نوشت" یہ لکھا ہے کہ ان ہی قاضی ابوالمعالی نے ملا عصام اسفرائنی مع خبائث طلبہ از ماوراء النہر خارج نمودہ" وجہ یہ لکھی ہے کہ چوں ایں علم (منطق و فلسفہ) در بخارا و سمرقند شائع شد خبائث و شریر بر جاملے سلیم الطبع را می دیدند و می گفتند کہ ایں حمارست (یعنی گدھا ہے) چرا کہ لاحیوان او مسلوب است و چوں انتفائے عام مستلزم انتفائے خاص است سلب انسانیت نیز لازم می آید" گویا اس طریقے سے ہر اچھے بھلے انس آدمی کو ثابت کر دیا جاتا تھا کہ وہ گدھا ہے۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اس حال کو دیکھ کر عبداللہ خاں شاہ توران را تحریص و ترغیب اخراج ایں جماعت نمود و نامشروعیت تعلیم و تعلم منطق و فلسفہ بدلائل ثابت کرد" صرف یہی نہیں بلکہ روایتے نمود کہ اگر بجا غذے کہ منطق دراں نوشتہ باشد استنجا نمائند باکے نیست" یہ عبارت فقہ کی کتاب "جامع الرموز" کی ہے کہ یجوز الاستنجاء باوراق المنطق (منطق کے اوراق سے استنجاء جائز ہے) عبداللہ ازبک نے قاضی ابوالمعالی کے مشورہ کو مان لیا اور ملا عصام نیز ان کے طلبہ کو اسی جرم میں ملک سے بدر کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ماوراء النہر بخارا و سمرقند پر ہندوستان کی معقولیت کا الزام جو قائم کیا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ قاضی ابوالمعالی کا فتاویٰ حال میں کتب خانہ آصفیہ نے خریدا ہے ۱۲۔

فتح اللہ شیرازی کے بعد اس ملک میں ہوا، بلکہ بات وہی تھی جس کا جی چاہتا تھا پڑھتا تھا اور اس حد تک پڑھتا تھا، جن کا ذکر میں نے حکیم کامراں کے تذکرہ میں کیا ہے۔

لیکن اس دور کے بعد جو مدت تک قائم رہا ہے ملک کے تعلیمی حلقوں پر ایک اور افتاد نازل ہوئی، اور اسی افتاد کا یہ اثر ہے کہ بتدریج معقولات کی کتابوں نے وہ اہمیت حاصل کی جس کا نظارہ درس نظامیہ کے مدارس حال حال تک کیا جا رہا تھا بلکہ کہیں کہیں ابھی وہی حالت باقی ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کہاں اسی ہندوستان کا وہ حال تھا کہ پوری تعلیمی زندگی میں طلبہ کو ایک شمسیہ اور شرح صحائف پڑھنا پڑتا تھا اور کہاں اب یہ صورت پیدا ہوگئی کہ معقولی رنگ کی کتابوں کی تعداد چالیس پچاس سے بھی زیادہ متجاوز ہوگئی، نصاب میں لزوم کی وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ سب کچھ پڑھ جائے لیکن ان تمام مقررہ کتابوں اکتابوں کے منہیات، حواشی شروح و تعلیقات کا اگر ایک ورق پڑھنے سے رہ گیا ہے تو اہل علم کے گروہ میں ایسے آدمی کا علم علم نہیں سمجھا جاتا تھا، اساتذہ سند دینے سے گریز کرتے تھے، عذر یہی پیش کیا جاتا تھا کہ گو تم نے حدیث و تفسیر فقہ وغیرہ دینی علوم کی سب کتابیں پڑھ لی ہیں لیکن معقولات کی فلاں فلاں کتاب تمہاری باقی رہ گئی ہے، ان کے پڑھے بغیر مولوی ہونے کی سند تمہیں کیسے دی جا سکتی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ مولویت کے دائرہ میں امتیاز کا معیار یہ واقعہ ہے کہ اسی ہندوستان میں تقریباً دو سو سال تک یہ رہا ہے کہ معقولات کی ان نصابی کتابوں پر اس مولوی نے کوئی حاشیہ یا شرح لکھ کر ملک میں پیش کیا ہو۔

اس دو سو سال کا جو تصنیفی ذخیرہ عام علماء ہند کا ہے بجز چند استثنائی صورتوں کے زیادہ تر اس کا تعلق زواہد ثلثہ سلم اور شروح سلم، صدرا، شمس بازغہ کی حاشیہ نگاری سے ہے، ایک ایک مولوی بعض اوقات ایک ہی کتاب پر تین تین قسم کے حاشیے لکھ کر فضیلت کی داد دیتا تھا، مولوی عالم علی سندیلی کے ذکر میں لکھا ہے کہ " ۔ حاشیہ بر صدرا صغیر و کبیر و اکبر دارد " دور کیوں جایئے علمائے فرنگی محل کے حالات اٹھا کر پڑھیے مشکل ہی سے کوئی عالم اس علمی

خانوادہ میں ایسا مل سکتا ہے جس کے قلم نے معقولات کی مندرجہ بالا کتابوں میں سے سب پر یا چند پر کوئی حاشیہ یا شرح نہ لکھی ہو[1]، بلکہ اس مسئلہ پر ذرا اور توجہ و تعمق سے نظر ڈالی جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ گو نصاب میں معقولات کا اضافہ سکندری دور میں ہو یا اکبری میں ظاہر ہے کہ دلی ہی میں ہوا، لیکن معقولاتی علوم کیسے یا حاشیہ نگاری کا جتنا زور ہم ان علاقوں میں پاتے ہیں جن کی تعبیر مولانا آزاد کی اصطلاح میں "الفورب" ہے اور جہاں کے علماء ان کی زبان میں "الفوار بہ" کے نام سے موسوم ہیں۔ یعنی اودھ، الہ آباد، بہار، اتنا زور اتنی ہما ہمی ان علوم کی خود دلی اور دلی کے نواح و اطراف میں محسوس نہیں ہوتی، حتیٰ کہ پنجاب میں بھی نہیں، اور تقریباً یہی حال جنوبی ہند کا ہے۔

مثالاً ہم دلی کے اس سربرآوردہ علمی خاندان کو پیش کر سکتے ہیں، جو پچھلے دنوں یعنی فرخ سیر، محمد شاہ وغیرہ کے زمانہ میں علم کا سب سے بڑا خانوادہ تھا، میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان سے ہے، شاہ صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم حالانکہ براہ راست خود میر زاہد کے شاگرد ہیں لیکن الفوار بہ میں مرزا زاہد کے جن زواہد ثلثہ نے وہ اہمیت حاصل کی تھی کہ کسی مولوی کو اپنے اقران میں امتیاز اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہو سکتا تھا، جب تک کہ تبرکاً ہی سہی، اعلم ان العلم المتجدد کے دو لفظوں ہی پر سہی اس

[1] ایک دلچسپ بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ پچھلے دنوں ارباب مطابع نے فرنگی محل کے ان مولویوں سے جو آج کل موجود ہیں یا جن کا حال ہی میں انتقال ہوا، معقولات کی نصابی کتابوں پر اگر کوئی حاشیہ لکھوایا تو مولوی صاحب نے عموماً اپنے خاندان کے بزرگوں کا کوئی حاشیہ اٹھا کر کتاب پر چڑھا دیا ہے اور ہر حاشیہ کی ابتدا عموماً ان الفاظ سے ہوتی ہے قال جد جد جدی (یعنی میرے دادا کے دادا کے دادا نے یوں فرمایا) یا کبھی قال جد جد جد امی (میرے دادا کے دادا کی والدہ کے بیٹے نے یوں فرمایا) یا قال جد جد جد عمی الی غیر ذلک من الصلات بالنسبیہ والصہریہ۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علماء فرنگی محل کا کوئی خاندان ایسا نہیں ہے جس نے حاشیہ نگاری کی اس مہم میں اپنا حصہ نہ ادا کیا ہو۔ مشہور ہے کہ مولانا محمد حسن کانپوری میر زاہد کے تیس تیس حاشیوں کو سامنے رکھ کر پڑھایا کرتے تھے، زواہد ثلثہ سے مراد میر زاہد کی تینوں کتابیں میر زاہد رسالہ، ملا جلال، امور عامہ کے حواشی ہیں۔

Marfat.com

نے چند حروف بنام حاشیہ منقوش نہ کر دیے ہوں، لیکن ہمارے سامنے خود حضرت شاہ ولی اللہ کا اپنا ذاتی تعلیمی نصاب ہے جس کی تقریباً کل کتابیں آپ نے اپنے والد یعنی میرزاہد کے شاگرد ہی سے پڑھی ہیں، لیکن معقولات کا جتنا حصہ اس ولی اللہی نصاب میں ہے، وہ کر وہ حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے، خود انفاس العارفین کے آخر میں لکھتے ہیں

"از منطق شرح شمسیہ (قطبی) و طرفے از شرح مطالع.... و از حکمت شرح ہدایت الحکمۃ و از حساب و ہندسہ بعض رسائل مختصرہ" ص ۱۹۵

کہاں الفوارہ کے نصاب کی وہ تیس چالیس معقولاتی کتابوں کا انبار، اور کہاں گنتی کی یہ چند کتابیں جن میں چھوٹی بڑی ملا کر بمشکل پانچ کتابیں ہو سکتی ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دلی میں معقولات کی ان عام نصابی کتابوں کا سرے سے رواج ہی نہ تھا، آخر شاہ صاحب کے صاحبزادوں یعنی شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما نے زواہد پر نیز صدرا پر اور دوسری قولی کتابوں پر حواشی کیوں لکھے اگر دلی کے درس میں یہ کتابیں داخل نہ تھیں، بلکہ وہی مطلب ہے کہ دلی اور اس کے اطراف و اکناف بلکہ پنجاب تک میں ان معقولی کتابوں نے لزوم کی وہ شکل نہیں اختیار کی تھی، جو حیثیت ان کی الفوارہ میں ہو گئی تھی۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا یہ دل چسپ لیکن مستحق توجہ مسئلہ ہے، مدت تک میری سمجھ میں اس کی کوئی صحیح توجیہ نہیں آئی تھی، تا آنکہ اس راز کو بھی خدا جزا خیر دے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ نے کھولا، آپ نے اپنی کتاب مآثر الکرام میں جہاں مذکورہ بالا دو تعلیمی انقلابوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہیں آپ کے قلم نے ایسے مواد فراہم کیے ہیں کہ ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد شاید بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے، مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پہلے کہ میں اسے درج کروں ایک فاجعہ کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ واقعات کے سمجھنے میں اس سے مدد ملیگی۔

Marfat.com

قصہ یہ ہے کہ محمد شاہ بادشاہ جو رنگیلے کے نام سے مشہور ہیں، ان کے دربار میں نیشا پور کا ایک سپاہی پیشہ آدمی سعادت خاں نامی داخل ہوا، ترقی پاتے ہوئے یہی سعادت خاں نیشاپوری برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا[1] ارباب تاریخ کے لیے اگرچہ یہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے، لیکن عام پڑھنے والوں کو یہ بتانا ضرور ہے کہ دلّی کے قتل عام والا نادر شاہ جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور بانی سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ اوّل قدس سرہ وانار اللہ برہانہٗ کے ساتھ محمد شاہ دلّی سے باہر نکل کر نادر شاہ کو روکنے کے لیے آگے بڑھے، دونوں طرف فوجیں صف آرا تھیں، لیکن حملہ کس وقت کیا جائے حضرت آصف جاہ کی رائے تھی کہ آج اس مسئلہ کو ملتوی رکھا جائے۔ اس وقت یہی سعادت خاں برہان الملک تھے جنہوں نے آصف جاہ کے مشورہ کی قصداً خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی تیاری کے بغیر نادر شاہی فوج کی طرف اقدام کر دیا اور اچانک کسی معمولی مقابلہ کے بغیر جیسا کہ ان کے سب سے بڑے طرفدار ہم مذہب مورخ طبا طبائی صاحب سیر المتاخرین کی شہادت ہے کہ برہان الملک اپنے ہاتھی پر نادر شاہ کی فوج کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے کہ ان کے وطن نیشاپوری کا ایک نادر شاہی فوجی کہ "یکے از نوخاستہ اتراک نیشاپور بود" وہ برہان الملک کے سامنے گھوڑا بڑھا کر آتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہی "نوخاستہ ترک نیشاپوری" پکارتا ہے:۔

"محمد امین! دیوانہ شدہٗ باکہ می جنگی وبکدام فوج اعتماد داری"

یہ کہتا ہے، اور گھوڑے کی پشت سے اُچک کر برہان الملک کے ہاتھی کی عماری میں داخل ہو جاتا ہے، طبا طبائی صاحب اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں:۔

"برہان الملک کہ از ضابطہ ایران واقف بود موافق آداب[2] انجا اطاعت نمودہ اسیر پنجۂ تقدیر گردید۔

---

[1] برہان الملک کا اپنے وطن میں اصلی نام محمد امین تھا، ہندوستان پہنچ کر سعادت خاں نام رکھا، آخر میں برہان الملک بن گیا اتفاق تو دیکھیے کہ ان کے ہم وطن نوخاستہ ترک سپاہی کا نام بھی امین ہی تھا ۱۲۔

[2] "موافق آداب ایران" بنے آپ کو قید کرا دیا گیا عمدہ توجیہ ہے، تیاری کے بغیر حضرت آصف جاہ کی رائے کے خلاف حملہ کر دینا بھی ایران ہی کا کوئی ضابطہ ہوگا۔

Marfat.com

ہمراہ قزلباش (یعنی نو خاستہ نیشاپوری) بحضور نادر شاہ رسید، عفو تقصیرات او فرمودہ مورد الطاف وعنایات ساخت (سیر المتاخرین ص ۴۸۳)

اب اس کے بعد دلّی اور دلّی کے باشندوں پر، مسلمانوں پر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت مرحومہ پر جو کچھ گذری، تاریخوں میں پڑھیے، بلکہ اس کے لیے تو تاریخ پڑھنے کی بھی ضرورت کیا ہے، ہندوستان کے حافظہ سے نادری قتل عام کا ہولناک نظارہ کیا کبھی نکل سکتا ہے؟

بہر حال یہی محمد امین نیشاپوری پھر سعادت خاں پھر برہان الملک کے متعلق مولانا آزاد دوسروں کی نہیں اپنی آنکھوں دیکھی یہ شہادت قلم بند فرماتے ہیں کہ

"چوں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، واکثر بلاد عمدہ صوبہ الٰہ آباد و نیز دار الخیور جونپور و بنارس و غازی پور و کٹرہ مانک پور و کوڑہ جہاں آباد وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید"

دلّی اور دلّی کے اطراف وجوانب کے باشندے تو نادر شاہ کے ہاتھوں وہ سب کچھ بھگت چکے تھے، جو ان کے مقدر میں تھا، دلّی سے جو دور تھے غالبًا یہ بھی "ضابطہ ایران" و "آداب اینجا" کی ایک شکل تھی کہ مولانا فرماتے ہیں، فرماتے کیا ہیں گواہی دیتے ہیں کہ جن پر مصیبت ٹوٹی تھی ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھے، یعنی بُرہان الملک نے ان علاقوں کے گورنر ہونے کے ساتھ ہی یہ کیا کہ

"وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یک قلم ضبط شد و کار شرفاء و نجباء بہ پریشانی کشید"

اور ابھی بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے "ادب ایران" کے ضوابط کی تکمیل باقی تھی، مطلب یہ کہ ان برہان الملک سعادت خاں کے ایک بھانجے بھی ساتھ تھے جن کی شادی بھی بُرہان الملک کی لڑکی سے ہوئی تھی، یعنی خواہر زادہ و داماد دونوں تھے۔ محمد شاہی دربار سے ان کو بھی ابو المنصور صفدر جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ

"بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ او ابو المنصور صفدر جنگ رسید وظائف و اقطاعات بدستور زیر ضبط ماند، و در اواخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمہ وظائف آں صوبہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط آمد"

لیجیے جو کچھ بچا کھچا سرمایہ الہ آباد کے علاقہ کے شرفا کے ہاتھ میں رہ گیا تھا، وہ بھی ختم ہوگیا، لیکن صفدر جنگ ابو المنصور صاحب کی صفدری ختم نہیں ہوئی، محمد شاہ کے بعد جب احمد شاہ تخت نشین ہوئے تو "در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود"

مولانا نے تو مختصر الفاظ میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، اور تفصیل ہے بھی بہت طویل، تاہم اتنا تو ہر شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ مغل دربار میں بادشاہوں کا اقتدار جوں جوں گھٹ رہا تھا، یہ عجیب بات ہے کہ ارباب حل و عقد میں ان عناصر کا اضافہ ہو رہا تھا جنہیں اس زمانہ کی اصطلاح میں "ایرانیت" سے تعبیر کرتے تھے، ایرانیت کے مقابلہ میں ایک دوسرا عنصر بھی تھا جس کی تعبیر "تورانیت" سے کی جاتی تھی اور سچ پوچھیے تو ان دونوں لفظوں کے پیچھے "شیعیت" اور "سنیت" کی حقیقتیں پوشیدہ تھیں، محمد شاہ بادشاہ مرحوم ہی کے زمانہ میں اکثر صوبہ داریوں پر ایرانی عناصر کا قبضہ ہو چکا تھا، تورانیوں کے تنہا نمائندہ لیکن شوکت و ابہت، جلال و جاہ تدبیر و سیاست، شجاعت و دلیری میں سب پر تفوق رکھنے والے امیر مغل حکومت میں صرف حضرت آصف جاہ اول بانی دولت آصفیہ انار اللہ برہانہ تھے، محمد شاہ کی وفات کے بعد جب احمد شاہ تخت نشین ہوئے تو اس وقت باوجودیکہ حضرت آصف جاہ دکن میں تھے، اور صفدر جنگ ابو المنصور والی اودھ احمد شاہ کے ساتھ دلی پہنچے، طبا طبائی صاحب سیر المتاخرین اپنے والد کے ساتھ دلی جا رہے تھے، لکھتے ہیں کہ راستہ میں محمد شاہ بادشاہ کی موت کے ساتھ

(ص ۲۸۶ ج ۳)
"آمدن صفدر جنگ ہمعناں احمد شاہ و جلوس او بر تخت سلطنت در باغ شالامار باغ دہلی مسموع شد"

ظاہر ہے کہ دلی کا میدان اس وقت خالی تھا، صفدر جنگ کی وزارت عظمیٰ کا مغتنم موقعہ اس سے

بہتر کیا ہو سکتا تھا لیکن طبا طبائی ہی کا بیان ہے کہ

"تجویز تعیین وزارت بنام صفدر جنگ باوجود اقتدار و لیاقت او بپاس رضا داشت آصف جاہ در حیز تعویق و تاخیر افتادہ" (ص ۸۶۹)

اور اس سے حضرت آصف جاہ اوّل کے اس خدا داد رعب و دبدبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی نہ بادشاہ کی ہمت ہوتی تھی کہ صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ کی سند عطا کر دیں، اور نہ خود صفدر جنگ آصف جاہ کے مقابلہ میں قلمدانِ وزارت کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کر سکتا تھا، مگر اہل سنّت کے اقبال کا آفتاب گہن میں آچکا تھا، دکن مراسلات روانہ کیے گئے۔ حضرت آصف جاہ کی دلجوئی کے لیے بادشاہ نے بھی متعدد فرامین ان کی طلبی کے روانہ کیے، لیکن جواب میں "عذر پیری و اظہار عدم رجوع خود بدار الخلافت نگاشت" ص ۸۶۹ اور تقدیر بھی یونہی ظاہر ہوئی کہ اس معذرت نامہ کے چند ہی دن بعد حضرت آصف جاہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس ملک میں بے یار و مددگار چھوڑ کر راہی باغ جناں ہوئے۔ دلّی جب یہ خبر پہنچی ہے صفدر جنگ ابو المنصور اچھل پڑا، طبا طبائی جو ان کے ہم مشرب و ہم مذہب آدمی ہیں ان ہی کا بیان ہے۔

"خبر رسید کہ چہارم جمادی الاخری سال مرقوم الصدر آصف جاہ در سواد برہان پور وداع عالم عنصری نمودہ راہ سفر آخرت نمود.... آں زماں صفدر جنگ بہ خاطر جمع قامت قابلیت خود را بخلعت وزارت بیاراست"

ورنہ اس سے پہلے معذرت نامہ کے وصول ہو جانے کے بعد بھی

"صفدر جنگ جرأت بہ پوشیدن خلعت وزارت نہ نمود (ج ۳ ص ۸۶۹)

احمد شاہ بادشاہ کی طرف سے صفدر جنگ

روز دوشنبہ چہارم رجب بعنایت خلعت ہفت پارچہ مع چار قب وزارت و جواہر سرفراز و بخطاب جملۃ الملک، مدار المہام وزیر الممالک، برہان الملک ابو المنصور خاں صفدر جنگ سپہ سالار مخاطب گشت (ج ۳ ص ۸۶۹)

Marfat.com

دباؤ اُٹھ چکا تھا، جس کا خوف تھا وہ سواد برہان پور میں جان جاں آفریں کو سپرد کر چکا تھا، اب تک تو صرف اودھ اور الٰہ آباد کی صوبہ داری کا زور تھا، اب تو جملۃ الملک وزیر الممالک کی قوت کے ساتھ ابو المنصور خاں سریر آرائے مسند وزارت تھے۔

مولانا غلام علی آزاد اس وقت زندہ ہیں، جو کچھ گذر رہا تھا دیکھ رہے تھے، مختلف الفاظ کے ساتھ اس فاجعہ کا ذکر اپنی مختلف کتابوں میں فرمایا ہے۔ میں مآثر الکرام سے ان شہادتوں کو نقل کر رہا ہوں۔ اس "داہیۂ کبریٰ" یعنی صفدر جنگ کی وزارت عظمیٰ کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں: "نائب صوبہ کار برار باب وظائف تنگ گرفت" کہ ہندی مثل "سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا" اسی موقعہ پر کہنے والے نے کہا تھا۔[1]

یا لک قنبرۃ بمعمر خلا لک الجو فبیضی واصفری

(یعنی فضا ہر دیکھنے والی آنکھ سے خالی ہو چکی تھی، آزادی سے جس چڑیا کا جی چاہے، اب انڈے بچے دے، گائے اور چہچہائے)

مغلیہ حکومت کا وہ باز اشہب اُڑ چکا تھا پیرانہ سالی میں بھی جس کی قہرمانی نگاہیں یہ اثر رکھتی تھیں کہ وہ دکن میں تھا اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ دلّی میں بھی قبائے وزارت کو اس وقت تک چھو بھی نہیں سکتے تھے جب تک کہ اس کی جانب سے کلی اطمینان نہ حاصل ہو گیا۔

حکومت سے جن لوگوں کی امداد صرف اس لیے ہو رہی تھی کہ وہ علم اور دین کی خدمت میں مصروف تھے، ایک ایک کر کے سب کو ان امدادوں سے محروم کر دیا گیا جو کل تک جاگیر والے تھے، اب ان کے لیے رہنے کی جگہ کا ملنا بھی دشوار تھا، آسمان پر تھے زمین پر پٹک دیے گئے، مولانا آزاد درد کی اس داستان کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

"وتا حین تحریر این کتاب (مآثر الکرام) این دیار (پورب) پامال حوادث روزگار است وبعل

[1] کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہی شعر عبد اللہ بن زبیر کو سنایا گیا، طبری میں تفصیل دیکھیے ... [illegible] ... ۱۸۱ ، ۲۰۲

Marfat.com

اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا" (مآثر ص ۲۲۳)

اس معاشی انقلاب کا نتیجہ

یہ صحیح ہے کہ اسلام کی تعلیمی اور دینی تاریخ کے ایوان نے بحمد اللہ حکومت کی پشتیبانیوں کو صرف قیام و بقا ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی رفعت و بلندی کے لیے بھی ہمیشہ غیر ضروری ٹھہرایا ہے، ہماری پست ہمتیاں آج جن حیلہ تراشیوں کی آڑ میں پناہ ڈھونڈھیں اپنی تن آسانی و کاہلی کی توجیہ ہم جن سیاسی کمزوریوں کے ذریعہ سے کریں، لیکن اسی زمانہ میں جب سب کچھ ہمارا تھا، لندن و برلین نہیں بلکہ دمشق و بغداد عالم سیاست کے مرکز بنے ہوئے تھے، ابوحنیفہ امام الائمہ نے زہر کا پیالہ پی کر، دار الہجرت کے امام نے مونڈھوں سے اپنے ہاتھ اتروا کر، احمد بن حنبل نے لہو میں نہا کر، بویطی الامام تلمیذ الشافعی نے جیل میں جان دے کر، خرتنگ جیسے کوردہ گاؤں کی نظر بندی میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخری سانس پوری کر کے، بتایا جائے کہ اس کے سوا، اور کس چیز کا ثبوت پیش کیا تھا کہ اسلامی علوم کا قصر رفیع اونچا ہو گا، اونچا ہوتا چلا جائیگا خواہ حکومتیں اس کی تعمیر میں کوئی حصہ لیں یا نہ لیں، نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ اسلام کی تیرہ صدیوں میں شاید ہی کوئی صدی اس تجربہ اور مشاہدہ سے تہی دامن ہو گی، خود ہندوستان میں بلند نظریوں کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں مختلف ابواب کے ذیل میں تھوڑا بہت ان کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اور آئندہ بھی موقعہ موقعہ سے اپنے اپنے مقام پر ان کا تذکرہ کیا جائیگا، لیکن ظاہر ہے کہ الحرب کے لیے سب پیدا نہیں کیے جاتے، بڑے گرو کو تو القصعہ (پیالہ) ہی کی تلاش میں سرگرداں پایا گیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر سب ہی "الحرب" والے بن جاتے تو بڑوں کی بڑائیاں بے معنی ہو جاتیں۔

بار مسیحانہ کشد ہر خرے

جام و سنداں کی بازیگری ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے۔

Marfat.com

بہر حال اکثریت کے اعمال و افعال کے متعلق یہ کلیہ تو غلط ہے کہ معاشی محرکات کے سوا ان کی تہ میں اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشی اسباب کو بھی ان میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے، شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے اخبار الاخیار میں اپنے بچپن کے ایک مذاکرہ کا ذکر فرمایا ہے جو ان کے ساتھی طلبہ کے درمیان ہوا تھا جس میں وہ خود بھی شریک تھے، فرماتے ہیں:۔

"یک بار طالب العلمان نشستہ از احوال یک دیگر تفحص می نمودند کہ نیت در تحصیل علم چیست بعضے طریق تکلف و تصنع بیمودہ می گفتند کہ مقصود ما طلب معرفت الٰہی ست، بعضے براہ سادگی و راستی رفتہ می نمودند کہ غرض تحصیل حطام دنیا ویست" (اخبار۔ ص ۳۱۲)

جن لوگوں نے اپنی تعلیم کا نصب العین "معرفت الٰہی" قرار دیا تھا، شیخ کی ان پر یہ تنقید کہ ان کا یہ دعویٰ صرف تکلف و تصنع پر مبنی تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بھی وہی بات تھی جس کا براہ سادگی و راستی دوسروں نے اظہار کر دیا تھا صرف اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ "پرسیدند بارے تو بگو کہ در تحصیل علم چہ نیت داری و نظر ہمت و قصد بر چہ می گماری" شیخ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بھی جو بات تھی، میں نے بھی صاف صاف وہی کہہ دیا یعنی

"من اصلاً ندانم کہ بر تحصیل علم معرفت الٰہی مترتب شود یا اسباب ملاہی، مرا بالفعل خود شوق ایں است کہ بارے بدانم کہ چندیں عقلاء و علماء گذشتہ اند چہ گفتہ اند و در کشف حقیقت معلومات و مسائل چہ در سفتہ اند"

گویا طلبہ کی اس ساری جماعت میں صرف شیخ کا نفس عالی تھا جس کے سامنے علم کی تحصیل کا مقصد صرف علم تھا، ورنہ ان کے بیان سے جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سب ہی کے سامنے وہی "حطام دنیا" المعروف بہ "روٹی" ہی کا مسئلہ تھا، سادہ دلوں نے تو کھلے بندوں اس کا اقرار کر لیا، اور جنھوں نے اس اقرار سے گریز کیا اُن کے متعلق شیخ کے بیان سے معلوم ہوا کہ ان کی گفتگو صرف گفتگو تھی "اکل" ہی کی وہ بھی ایک "شکل" تھی، اس

Marfat.com

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ آج ہی نہیں بلکہ عموماً بڑا طبقہ ان ہی لوگوں کا رہا ہے جن کی تعلیمی جد جہد کے محرکات میں "معاشی وجہ" کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے، پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے۔ اور دنیا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ ندی کے کنارے جانے والے جاتے تو اسی نیت سے ہیں کہ پانی لائیں گے، لیکن کبھی کبھی "آب جو آمد و غلام بہ برد" کا قصہ پیش آجاتا ہے، یہی حال علم کا ہے، جس نے ابھی کچھ نہیں پڑھا ہے اُس بیچارے سے کسی بلند نظری کی آپ توقع ہی کیوں قائم کرتے ہیں، پڑھنے کے بعد بلاشبہ دیکھا جاتا ہے کہ کس نے اپنے علم کو "تن" پر مارا اور کس نے "علم" کی زد "جان" پر لگائی، مولانا روم کا شعر

علم را بر "تن" زنی مارے شود — علم را بر "جاں" زنی یارے شود

ظاہر ہے کہ علم کے استعمال کی ان دونوں غلط اور صحیح صورتوں کا موقع تو حصول علم کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے کہتے ہیں کہ الحاکم الصدر الشہید[1] کا جب حکومت سے کسی مسئلہ میں مقابلہ ہوگیا، بادشاہ وقت نے ان کے قتل کرنے کا اور انہوں نے قتل ہو جانے کا فیصلہ فرمایا تو اُس وقت اُن کی زبان پر یہ جاری تھا۔

تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم ان یکون الا للہ (مفتاح السعادۃ۔ ص ۱۴) — یعنی ہم نے علم کو خدا کے لیے نہیں سیکھا تھا، لیکن خود علم نے انکار کیا اور وہ خدا ہی کے لیے ہو کر رہا۔

پس یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا "علم" غیر خدا کے لیے ہونے سے انکار کر جائے، لیکن پہلے علم حاصل تو ہو لے۔

[1] یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور حنفی امام ہیں، پہلے بخارا کے قاضی ہوئے اس کے بعد خراسان کے سامانی امیر الحمید نے وزارت کے منصب پر سرفراز کیا، کچھ دن کے بعد کسی مسئلہ میں امیر نے ایسے فیصلہ پر مجبور کرنا چاہا جس میں دین اور علم کی صراحۃً خلاف ورزی لازم آتی تھی، انہوں نے انکار کیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ دو درختوں کی شاخوں میں باندھ کر شاخوں کو پھر اس طرح کھولا جائے کہ ان کی لاش کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ الحاکم کو اس کی خبر ملی، غسل کیا، حنوط ملا، کفن گلے میں ڈالا اور مذکورۂ بالا فقرہ کہتے ہوئے، اپنے آپ کو جلاد کے حوالے کر دیا لاش اسی شکل کے ساتھ چیر دی گئی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

Marfat.com

بہر حال قصہ یہ ہو رہا تھا کہ معقولات کی کتابوں کی بھرمار ہمارے نصاب میں جو ہوئی خصوصاً ان علاقوں میں جنہیں پورب کہتے ہیں، اس کے اسباب کیا تھے؟ اسی کے جواب میں آپ کے سامنے اس تاریخی حادثہ کو پیش کیا گیا جس کے شکار مشرقی ہند کے ارباب فضل و کمال ہوئے۔ ابو المنصور صفدر جنگ والی اودھ کی وزارت کے بعد جہاں کہیں وظائف و جاگیروں کا تسمہ بھی لگا ہوا تھا، اُسے بھی کاٹ دیا گیا، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بیچاروں پر کیا گذری ہوگی اور ان کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے، میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں جب مشرق اور مشرق کے سارے علمی مجاہدات کو یورپ کی کتابوں کی ایک الماری کے برابر ماننے سے بھی انکار کیا گیا تھا، اسی بنیاد پر قدیم تعلیم کا سارا نظام اچانک بدل دیا گیا۔ اور ہم جاہلوں کو تہذیب و تمدن کی روشنی میں لانے کے لیے کلیات و جوامع کے جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیے گئے۔ اس کے بعد

واذا راوا تجارۃ او لھوا انفضوا   اور جب دیکھا انہوں نے تجارت یا کھیل کود کو تو
الیھا وترکوک قائما   چل پڑے اُسی کی طرف اور چھوڑ دیا تجھے (اے پیغمبر) (الجمعہ)

کا جو تماشا ہمارے سامنے ہونے لگا، اور ہو رہا ہے اس کے دیکھنے والوں کے لیے ان گذرے ہوئے بزرگوں کے حال کا اندازہ لگانا کیا دشوار ہے ادھر تعلیم کا نظام بدلا اور معمولی کشمکش کے بعد بڑے بڑے علماء، فضلاء، مشائخ اور صوفیاء کے گھرانوں کی اولاد کالجوں میں جا کر بھر گئی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن اور ان کی حدیث کو علم و فضل کے ان ہی خانوادوں نے صرف اس لیے تنہا چھوڑ دیا کہ مسلمانوں کے پس ماندہ غریب خاندان کے بچے ان کو پڑھ پڑھا لینگے۔ اور یہ تو میں کہتا ہوں ورنہ سادات کرام و شیوخ عظام کے ان تعلیم یافتہ صاحبزادوں کے سامنے تو یہ بھی نہیں ہے، عموماً قوم کی ایک بڑی تعداد ان کے نزدیک عربی مدارس کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر قومی توانائیوں کے عظیم ذخیرہ کو برباد کر رہی ہے۔

بس جو کچھ آج دیکھا جا رہا ہے اگر مولانا غلام علی آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دو سو سال

Marfat.com

پہلے بھی یہی صورت پیش آگئی کہ

کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل باں درجہ نہ ماند و مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد اِنَّا لِلّٰہ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ص ۲۲۲

تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی "معاش کا اضطرار" خواص کے لیے نہ سہی لیکن عوام کے لیے یقیناً اضطرار کی بدترین صورت ہے، خصوصاً کھاتے پیتے، خوش حال خوش باش گھرانوں کے لیے یہ مصیبت دوہری مصیبت بن جاتی ہے، جس زندگی کے پشتہا پشت سے آبائی رسم و رواج کے زیر اثر وہ عادی ہوتے ہیں، اچانک اس سے جدا ہو جانا ان کے لیے گویا موت ہوتی ہے، انگریزی تعلیم کے رواج کے بعد بجائے غربا، کے مسلمانوں کے متوسط طبقات کا رجحان جو اس تعلیم کی طرف زیادہ بڑھا اس کی یہی وجہ تھی، عربی مدارس کی تعلیم اس زندگی کو واپس نہیں دے سکتی تھی جس کے وہ متلاشی تھے، ملی یا نہیں ملی لیکن اسی زندگی کی توقع میں مسلمانوں کا یہ طبقہ کالجوں میں پل پڑا۔ اس وقت اُمت کے وہ غربا کام آگئے جن کے لیے عربی مدارس کی تعلیم آج معاشی اور جاہی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، کم از کم موجودہ معاشی سطح سے تو یہ تعلیم ان کو اوپر کھینچ لیتی ہے۔

خیر میں اس انقلاب کا ذکر کر رہا تھا، جو مولانا غلام علی کے سامنے "تعلیمی حلقہ" میں رونما ہوا۔ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اضطرار نے لوگوں کو فوج کی طرف دھکیل دیا، کہ اس زمانہ میں خصوصاً ملک کے چپہ چپہ پر مرکزی حکومت کی کمزوری سے نفع اٹھا کر حکومت کے دعویداروں کا ایک غول اُبل پڑا تھا، اور ہر ایک دوسرے کو مغلوب کر کے چاہتا تھا کہ ملک پر وہی قابض و متصرف ہو جائے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ان مدعیوں کے فوجی مراکز قائم تھے، لوگ اُسی میں جا جا کر اسی طرح بھرتی ہونے لگے جس طرح آج اسکولوں اور کالجوں میں بھرے چلے جاتے ہیں، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اس زمانہ کی

ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ خواہ کسی طبقہ کا آدمی ہو، لیکن فن سپاہ گری اور اس کے لوازم سے گونہ واقفیت تقریبًا ہر ایک لیے ضروری تھا، آج علم و عرفان کے لیے جسمانی ضعف اور کمزوری سرمایۂ افتخار ہے، لیکن یہ عہد مرگ کا قصہ ہے۔ ورنہ ہم میں جب جان باقی تھی۔ عالم ہو یا صوفی قلم کے ساتھ تلوار کا دھنی ہونا بھی قریب قریب اس کے لیے ضروری تھا۔[1]

امیر الروایات میں حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ اور اس زمانہ کے ایک شخص کا مکالمہ درج ہے۔ شاہ صاحب نے اُس سے پوچھا "آپ نے قرآن بھی پڑھا ہے؟" اُس نے کہا ہاں، شاہ صاحب نے پوچھا کہ کچھ فارسی بھی پڑھی ہے، بولا ہاں، پوچھا گیا کچھ عربی بھی پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ "جی ہاں میر قطبی تک پڑھی ہے"

میر قطبی تک پڑھنے والے طالب العلم سے آگے دریافت کیا جاتا ہے۔ گھوڑے کی سواری

---

[1] عہد نبوت و صحابہ کو تو جانے دیجیے کہ اس زمانہ کا تو رسول بھی زرہ اور خود اور تلوار و تیر و ترکش کے ساتھ میدان میں اُترتا تھا، اس کے بعد بھی آپ کو ہر زمانہ کے ائمہ محدثین و فقہا میں اس خصوصیت کی جھلک نظر آئیگی اور بعضوں کو تو اس میں اتنا کمال حاصل تھا کہ پیشہ وروں کو بھی ان کی اُستادی تسلیم کرنی پڑتی تھی امام المحدثین حضرت امام بخاری کی تیراندازی، شیخ الصوفیہ امام ابو القاسم کی نیزہ بازی کے تذکرے خصوصیت کے ساتھ کتابوں میں پائے جاتے ہیں، خود ہمارے ہندوستان کے علماء و صوفیہ کا بھی یہی حال تھا، مولانا غلام علی آزاد ہی کے متعلق کسی جگہ میں ذکر کرونگا کہ موقعہ آیا تو قلم پھینک کر مرہٹوں کے مقابلہ میں ذو الفقار حیدری کھینچ کر کھڑے ہوگئے، شیخ محدث نے مولانا احمد شرعی کے حالات میں لکھا ہے۔ "ایشاں در تیراندازی نظیر نداشتند" ان ہی جامع العلوم نقلیہ و عقلیہ و رسمیہ و حقیقیہ" کی تیراندازی کے کمال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے شاگرد شیخ عبد الغنی سونی پتی بیان کرتے تھے کہ شیخ کی عمر جب ۹۶ سال کی تھی ایک" تیرمی انداختند تیرے بہ نشانہ رسیدہ بود گفتند اگر بگویند ہر تیر کہ بیندازم درسوفار تیر دیگر بندکنم دو سہ تیر بہ ہمیں روش انداختند بعد ازاں گفتند کہ تیرہا ضائع می رود و اسراف می شود و گرنہ تیر یک دگر بندکنم" (اخبار ص ۲۲۰) اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بندوق کا بہترین نشانہ لگاتے تھے اور یہی حال تقریبًا اپنے اپنے عہد میں عام علماء کا تھا عربی مدارس میں ورزش اور جسمانی ریاضت کی طرف سے غفلت جو برتی جارہی ہے، جو بالکل نئی بات ہے، شکر ہے کہ اب پھر لوگوں کو ادھر توجہ ہونے لگی ہے۔ مگر خدا کرے کہ وہ مسرفانہ مغربی ملاعب ہمارے مدارس میں داخل نہ ہوں جن کے ایک ایک رکیٹ کی قیمت ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپیہ ادا کرنی پڑتی ہے، آپ نے دیکھا کہ شیخ احمد شرعی اتنے قدر انداز ہونے کے باوجود اسراف کو اس شکل میں بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مطلع الانوار جو مولانا انوار اللہ خاں مرحوم حیدرآبادی استاذ السلطان کی سوانح عمری جس کا ذکر آئندہ بھی انشاء اللہ آئیگا اس میں لکھا ہے کہ مولانا انوار اللہ خاں ان کا معمول تھا کہ نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد تلاوت کرتے اور اس کے بعد ورزش۔ ورزش کا سلسلہ مرض الموت تک رہا۔ بعد ازاں ناشتہ ۱۲۔ (ص ۳)

Marfat.com

بھی سیکھی ہے؟ اُس نے کہا۔ ہاں، پھر پوچھا کہ فنون سپہ گری بھی سیکھے ہیں، اُس نے کہا۔ جی ہاں "پھکیتی بکیتی اور تیر اندازی وغیرہ سب سیکھے ہیں" (امیر الروایات)

یہی وجہ ہے کہ جب علم و فضل کی راہوں سے معاش کے جو ذرائع مہیا ہوتے تھے وہ مسدود ہو گئے تو لوگوں کے لیے پیشہ سپہ گری کا اختیار کرنا نسبتاً آسان معلوم ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ جن کے یہاں پشتہا پشت سے پڑھنے پڑھانے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہے، ان کے سارے خاندانوں کا بالکلیہ علم سے ٹوٹ کر ایک ایسے پیشہ کو اختیار کر لینا علم سے جس کو دور کا بھی تعلق نہیں، آسان نہ تھا، مولانا غلام علی کے الفاظ "رواج تدریس و تحصیل باں درجہ نہ ماند" سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ تدریس و تحصیل کی گرم بازاری جس رنگ میں پہلے تھی، وہ باقی نہ رہی، بلکہ آج بھی جو حال ہے کہ گو اکثریت انگریزی تعلیم کی طرف جھک پڑی ہے لیکن غربا مسلمین کے عام طبقہ کے سوا، اب بھی پرانے خاندانوں کے علماء و مشائخ کسی نہ کسی طرح پرانی تعلیم کی گاڑی گھسیٹے لیے جا رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ کچھ یہی صورت اس وقت بھی پیش آئی تھی خود مولانا آزاد نے بھی غم کی اس روئداد کو ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے۔

"باوجود ایں خرابیہا رواج علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجاست (یعنی در پورب است) در قلمروئے ہندوستان ہیچ جا نیست" (ص ۲۲۳)

جس سے معلوم ہوا کہ گو بڑی تعداد تو اس حادثہ کے بعد "پیشہ سپہ گری" میں مبتلا ہو گئی، لیکن پھر بھی ایک طبقہ علم والوں کا موجود تھا جو معقولات ہی کے رنگ میں سہی لیکن اپنے آبائی شیوۂ تعلیم و تعلم درس تدریس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔

واقعات جو بکھرے ہوئے تھے ایک خاص سلسلہ کے ساتھ وہ آپ کے سامنے پیش کر دیے گئے غالباً نتیجہ تک پہنچنا اس کے بعد دشوار نہ ہوگا، بہرحال میں نتیجہ تک جن مقدمات کی راہنمائی میں پہنچا ہوں، گذشتہ بالا تاریخی مواد سے ان مقدمات کو مرتب کر کے خود ہی پیش کیے دیتا ہوں۔ یاد ہوگا کہ تلبن (ملتان) کے مولویوں شیخ عبداللہ و عزیز اللہ کے بعد معقولات

اور اس فن کی کتابوں کی دوسری کھیپ ہمارے ملک میں میر فتح اللہ شیرازی کے ہاتھوں پہنچی، مولانا غلام علی کا بیان میں نے نقل کیا تھا کہ میر فتح اللہ کے بعد ہندوستان میں "معقولات را رواجے دیگر پیدا شد"

اس وقت میں صرف اس اجمالی بیان کا ذکر کر کے آگے بڑھ گیا تھا، مگر اب بتانا چاہتا ہوں کہ "رواج دیگر" کے تفصیلی اسباب کیا تھے؟ اگرچہ فتح اللہ شیرازی کے متعلق ملا عبدالقادر نے اپنی تاریخ کی تیسری جلد میں یہ عجیب خصوصیت لکھی ہے، یعنی ایک طرف تو ان کا یہ حال تھا کہ امیروں کے گھروں میں خود جا جا کر بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، لیکن دوسری طرف

"میر موصوف اگرچہ در مجالس بغایت خلیق و متواضع نیک نفس بود لیکن نعوذ باللہ ازاں ساعت کہ بدرس اشتغال داشتے بشاگرداں غیر از فحش والفاظ رکیکہ و ہجو بر زبانش نہ رفتے"۔ (ص ۱۵۵)

خیر یہاں تک تو شاید ان لوگوں کو تعجب نہ ہو، جو پرانی طرز تعلیم کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں، بعض اہل کمال سے کمال کے نشہ میں اس قسم کی باتیں سرزد ہو جاتی تھیں، خصوصاً معقولات وغیرہ جیسے علوم کی کتابوں کے پڑھانے والوں میں یہ بات کبھی کبھی پائی گئی ہے کہ جو کتاب پڑھا رہے ہیں، کچھ اس کے مصنف کے نام کچھ شارح اور محشی کے نام اور کچھ اپنے ہم عصر اساتذہ کے نام جن کا نام اس فن میں مشہور ہو، صلواتیں سنایا کرتے تھے، مقصود اس سے خود اپنے فضل و کمال کا اظہار ہوتا تھا؎۔ ملا عبدالقادر نے اس کے بعد لکھا ہے کہ میر فتح اللہ کی اس عادت بد کا

؎ عظیم آباد پٹنہ کے مشہور طبیب حکیم عبدالحمید مرحوم جو مشہور علمی خانوادے صادق پور سے تعلق رکھتے تھے، ان کے متعلق مشہور تھا کہ پڑھانے کے وقت ان پر بھی یہی حال طاری ہو جاتا تھا میرے عم مرحوم مولانا حکیم ابو النصر رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ کتاب قانون شیخ میں نے بھی حکیم صاحب سے شروع کی تھی، لیکن پہلا سبق ہوا، کتاب کے مطلب سے پہلے حکیم صاحب نے ابن سینا کے نام وہ بے نقطی شروع کی کہ میں پریشان ہو گیا، دو تین دن تک صبر کیا آخر میں پڑھنا چھوڑ دیا، حالانکہ حکیم عبدالحمید بھی قابلیت کے لحاظ سے بھی اپنے وقت کے ممتاز طبیبوں میں تھے، متعدد مواقع ایسے پیش آئے جن میں بڑے بڑے سول سرجنوں کو ان کے سامنے ذک اٹھانی پڑی، فارسی میں ان کا قصیدہ حسن البیان نامی کتاب کے دیباچہ میں چھپا ہوا ہے جو مولوی شبلی کے اس قصیدہ کے جواب میں ہے جسے اپنی کتاب سیرۃ النعمان کا انہوں نے دیباچہ بنایا تھا۔ حکیم صاحب کی قابلیت کے ثبوت کے لیے یہی قصیدہ کافی ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

نتیجہ یہ ہوا کہ "ازیں جہت کم مردم بدرس او می رفتند" مگر اس کے بعد مُلّا صاحب کا یہ بیان کہ "د شاگردے رشید ہم از و بر نخاستہ" یہ میرے خیال میں صحیح نہیں ہے جس کی وجہ میں آئندہ بیان کرونگا، لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میر کے پاس عام طلبہ اس لیے کم جاتے ہوں کہ ان کی صلواتوں میں اضاعت وقت کا ان کو اندیشہ ہوتا ہوگا۔

بہر حال اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ "کم مردم بدرس او می رفتند" تو پھر مولانا آزاد کا یہ بیان کہ ہندوستان میں معقولات کا رواج دیگر میر فتح اللہ کی توجہ و تعلیم کا رہینِ منت ہے، قابلِ غور ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میر فتح اللہ سے حکومت کے جن مہمات کا تعلق تھا، یوں بھی عام درس کی توقع ان سے مشکل ہے، وہ تو کہیے زمانہ ہی دوسرا تھا کہ لوگ جج بھی کرتے تھے اور درس بھی دیتے تھے، وزارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور بچوں کو بھی پڑھاتے تھے، ورنہ اس زمانہ میں کہہ چکا ہوں کہ میر فتح اللہ تو خیر بڑے آدمی تھے، حکومت کے کسی ادنی معمولی عہدہ دار سے تدریسی و تعلیمی مشاغل کی بھلا کوئی اُمید کر سکتا ہے، اس لیے اب خواہ ان کی بدزبانیوں کا نتیجہ ہو یا سرکاری مہمات میں انہماک ہو یہ سبب ہو، عام لوگوں نے اگر ان سے کم نفع اُٹھایا ہو

ے اس موقع پر ایک مشہور واقعہ کا بار بار خیال آ رہا ہے اگرچہ خاک کے سامنے عالم پاک کا تذکرہ خلاف ادب ہے لیکن قدیم علماء کی بعض خاص خصوصیتوں کا اس سے پتہ چلتا ہے اس لیے دل عدم ذکر پر راضی نہیں ہے۔ مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سُنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ جس خداداد ذکاوت کے مالک تھے اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، کہتے ہیں کہ مولوی عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب دہلی) شروع شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی، مولوی عبد العلی صاحب نے سبق کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو، میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو، پھر ان کی سمجھنا، مولوی عبد العلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد دبے پاؤں گھر روانہ ہو گئے۔ مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا، شاید ان کے گھر پہنچے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی، مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں، مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا، کتاب ہی پڑھاؤنگا، تب پھر واپس ہوئے ۱۲۔

Marfat.com

تو یہ کچھ تعجب نہیں ہے۔

لیکن میر صاحب کو اپنے علمی مذاق کے عام کرنے میں جس راہ سے کامیابیاں ہوئیں اس کا سب سے بڑا اہم رازان کی وہ خاص ترکیب ہے جس کا تذکرہ ملا عبدالقادر بداؤنی ہی کے حوالہ سے گذر چکا، یاد ہوگا کہ ملا صاحب نے خود اپنی چشم دید گواہی میر فتح اللہ کے متعلق یہ دی تھی "بہ تعلیم اطفالِ امرا، مقید بود وہر روز بمنازل مقربان رفتہ" دربار کے امیروں کے بچوں کو وہ پابندی کے ساتھ باضابطہ شکل میں پڑھایا کرتے تھے، اور اپنے فلسفیانہ اور منطقیانہ مذاق کو بجائے عوام کے اس ملک کے خواص اور امیرزادوں میں اُنہوں نے پھیلا دیا۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقات پر جہاں تک میرے معلومات کا تعلق ہے، فارسی ادب کی نظم و نثر کا زیادہ اثر تھا، ان کا علمی مذاق دواوین وکلیات اور فارسی کے محاضرات وقصص وحکایات تاریخی روایات کے مطالعہ تک محدود تھا، ان کے درباروں میں علمی حیثیت سے اب تک اسی کا چرچا تھا، لیکن میر فتح اللہ نے ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ معقولات کا چسکا بھی ان امیروں کو لگا دیا، اور قاعدہ ہے کہ کسی طبقہ میں ہو، جب کسی چیز کا رواج ہوجاتا ہے، تو پھر قانون توارث کے زیر اثر ایک قرن سے دوسرے قرن، دوسرے سے تیسرے قرن تک الا ماشاء اللہ وہ بات منتقل ہوتی چلی آتی ہے، طبقۂ اعلیٰ کو معقولات کا چاشنی گیر تو میر فتح اللہ نے اکبر کے عہد میں بنایا، لیکن بات وہاں سے منتقل ہوئی، چلی، چلتی آئی، تا آنکہ یہ واقعہ ہے کہ حال حال میں قدیم امیروں کا دور جب منقرض ہوا ہے، اس وقت تک یہ مذاق ان میں پایا جاتا تھا، رامپور کے موجودہ فرماں روا کے والد نواب حامد علی خاں بہادر اپنے اندر بہت سی قدیم امیرانہ خصوصیتوں کو زندہ رکھے ہوئے تھے، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زیادہ دن نہیں ہوئے، شاید بیس بائیس سال کی مدت گذری ہوگی انگریزیت کے اس عالم شباب میں حامد علی خاں کے دربار میں مناظرہ کی ایک مجلس گرم، اور بحث کا موضوع کیا تھا؟ سُن کر تعجب ہوگا "جسم کے انفصال جوہری" کا مسئلہ جس سے عوام تو خیر اس زمانہ کے شاید اکثر مولوی بھی ناواقف ہوں گے۔

کہ یہ آخر ہے کیا بلا، لیکن ہندی امیروں میں جو بات نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی تھی اسی کا اثر تھا کہ نواب مرحوم نے باضابطہ اپنے سامنے اس مسئلہ پر مولویوں کی دو متخالف جماعتوں میں مناظرہ کرایا، ایک طرف بہار کے مشہور منطقی مولوی عبدالوہاب بہاری تھے اور فریق ثانی کے سرگروہ ہمارے حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ بحث کا نتیجہ کیا ہوا، اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ مہینوں دونوں طرف سے اشتہارات اور پوسٹروں کا سلسلہ شائع ہوتا رہا، جس میں ہر فریق اپنے غلبہ کا اعلان کرتا تھا۔ مولانا برکات احمد کے متعدد تلامذہ نے اس مسئلہ پر مستقل رسالے لکھے، اسی معقولی مذاق کا اثر تھا کہ حامد علی خاں ہمیشہ کسی منطقی مولوی کو اپنے یہاں اس لیے ملازم رکھتے تھے کہ جب کبھی معقولاتی ذوق کا غلبہ ہو تو اس مولوی کی باتوں سے وہ تسکین حاصل کریں، مدت تک لکھنؤ کے منطقی عالم مولوی عبدالعزیز صاحب مرحوم کو غالباً دو سو روپے ماہوار صرف اسی کام کے لیے وہ دیتے رہے، گویا دربار کے لوازم میں جہاں شاعروں کا وجود ضروری تھا، جہاں تک میرا خیال ہے، میر فتح اللہ کی اس ترکیب کے بعد ایک اور عنصر (یعنی معقولیوں) کا بھی متوسل دربار ہونا امارت کی ایک شان بن گئی، کلب علی خاں مرحوم بھی ہمیشہ اسی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر مولانا عبدالحق خیرآبادی کو بڑے اعزاز و احترام سے رکھا،

اور یہ تو پچھلے زمانہ کی باتیں ہیں اُس وقت تک کی جب رسی جل چکی تھی، صرف اس کی اینٹھن باقی تھی، ورنہ کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے مشکل ہی سے کسی مسلمان امیر ہی نہیں اس زمانہ کے ہندو راجہ کا دربار بھی معقولی مولویوں سے خالی نظر آئیگا، مہاراجہ الور، پٹیالہ، جے پور، کشمیر سب ہی کے یہاں شعرا، وغیرہ کے ساتھ ایک مد ان مولویوں کی بھی تھی، اور جب خالص ہندی امیروں پر یہ اثر مرتب ہوا تو امیروں کا جو خاندان نسلاً ایران سے تعلق رکھتا تھا مثلاً یہی برہان الملک اور صفدر جنگ بانیانِ حکومت اودھ، کہ یہ ایران سے ہندوستان اس وقت آئے ہیں جب ایران میں ملا باقر داماد، صدر الدین شیرازی، غیاث الحکما، غیاث منصور وغیرہ کی

Marfat.com

عقلیت و فلسفیت کا آفتاب سمت الراس پر چمک رہا تھا، سارا ایران بلکہ ایران کے ساتھ ہندستان بھی اس زمانہ میں ان لوگوں کی علمی عظمت کے چرچوں سے گونج رہا تھا۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب صفدر جنگ کے عہد اقتدار میں علم و فضل کے پرانے خانوادوں کو اچانک آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا، رزق و معاش کے دروازے ان پر بند کردیے گئے تو ان میں جو سپہ گری سے مناسبت رکھتے تھے وہ تو خیر بقول مولانا آزاد فوجوں میں بھرتی ہوگئے لیکن جو کسی وجہ سے بھی علم و فضل کے دامن سے لپٹے رہے، ان کے لیے معاشی مشکلات کے حل کی راہ اس کے سوا اور کیا باقی رہ گئی تھی کہ اہل ثروت و نعمت کا قرب ان ذرائع سے تلاش کیا جائے جن سے وہ خوش ہوتے تھے، نظائر و اشباہ مثالیں اور نمونے ان کے سامنے تھے، یہی ابوالمنصور صفدر جنگ جنگی گردش قلم نے اودھ الہ آباد اور اس کے متعلقات کے علمی گھرانوں کو اُجاڑ دیا، ان ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہدایہ اور بیضاوی وغیرہ پڑھنے پڑھانے والے مولویوں پر رزق کا دروازہ تیزی سے بند کر رہے ہیں، اور دوسری طرف مشہور معقولی مولوی حمداللہ سندیلوی جن کی شرح سلّم تصدیقات اس وقت تک ہمارے نصاب میں "حمداللہ" ہی کے نام سے شریک ہے، ان کے ساتھ صفدر جنگ کے تعلقات کی جو نوعیت تھی صاحب تذکرہ علمار ہند اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"نواب ابوالمنصور خاں صوبہ دار اودھ بود سے دستار بدل برادرانہ داشت"

آپ سمجھے اس کا مطلب، دستور تھا کہ جو واقع میں بھائی نہ ہوتا تھا، اس کو کوئی بھائی بنانا چاہتا تو اپنی پگڑی یا ٹوپی اس کے سر پر اور اس کی پگڑی یا ٹوپی اپنے سر پر رکھتا، اسی کا نام "دستار بدل برادرانہ" تھا، اخوت کا جو تعلق اس رسم کے بعد قائم ہوتا تھا، وہ رشتہ کے تعلقات سے بھی آگے بڑھ جاتا تھا۔ آخر دم تک لوگوں کو اس کا لحاظ و پاس کرنا پڑتا تھا۔ غور کرنے کی بات ہے، کہ کہاں علم و کمال کی وہ بے قدری کہ بیک گردش قلم خاندان کے خاندان تباہ و برباد کردیے گئے، اور پھر وہی علم جب "معقولیت" کے رنگ میں پیش ہوا تو اس کی یہ قدردانی

کہ جملۃ الملک وزیر الممالک المغلیہ" اپنی دستار ایک معمولی قصباتی مولوی کے سر پر رکھ کر ان کو اپنا بھائی بناتا ہے، واللہ اعلم صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مولوی حمداللہ کس اعتقاد کے آدمی تھے، کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے زیادہ تر اپنے اسی خاص فن معقولات ہی کے متعلق لکھا ہے، حمداللہ شرح تصدیقات سلم کے علاوہ "حاشیہ بر شمس بازغہ و حاشیہ بر صدرا" (تذکرہ ص ۵۳) ان کے مشہور تصنیفات ہیں، اس لیے مذہبی اعتقاد کا پتہ چلنا آسان نہیں ہے، نسلاً تو یہ صدیقی ہیں، اور شاگرد بھی یہ ایک سُنی عالم ملا نظام الدین سہالی کے ہیں، لیکن حمداللہ میر باقر داماد کے متعلق عموماً "خیر اللحقہ بالمهرۃ" کا خطاب التزاماً چونکہ استعمال کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فرقہ امامیہ کے عالم بہاء الدین عاملی کی کتاب زبدۃ الاصول (جو غالباً شیعی اصول فقہ کی کتاب ہے) اس کی بھی شرح لکھی ہے، اس لیے لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی طور پر شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا، ممکن ہے کہ اس خیال میں کچھ واقعہ بھی ہو، لیکن سچ پوچھیے تو صفدر جنگ کی نگاہ میں ان کی جو غیر معمولی وقعت تھی، وہ دراصل ان کی معقولیت ہی تھی، لکھا ہے کہ اسی نواب نے دلی دربار سے "فضل اللہ خاں" کا خطاب بھی دلوا دیا تھا اور دیہ ہے "چند دیہ از پیشگاہ بادشاہ وقت معاف یافتہ" (ص ۵۲)

اور مان بھی لیا جائے کہ ملا حمداللہ سے صفدر جنگ کے غیر معمولی تعلقات کی وجہ ان کا تشیع اور تبدیلی مذہب ہو، لیکن جن علماء کا ضمیر محض معاشی فراغبالی کے لیے تبدیل مذہب پر آمادہ نہ ہوتا تھا، خود ہی سوچیے کہ حکومت اودھ کی ان دراز دستیوں کے ان کے لیے چارہ کار ہی کیا رہ گیا تھا، خود ان کے مذہب کی فقہ، ان کی حدیث، ان کی تفسیر کی کوئی قیمت صفدر جنگ کے شیعی دربار میں نہ تھی۔ اب اس سے یا اس کے شیعی امراء سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ان مولویوں کے پاس اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ جس چیز کو امیروں کا یہ گروہ علم سمجھتا تھا اسی میں کمال پیدا کر کے اپنے آپ کو نمایاں کریں، تجربہ بتا رہا تھا کہ جن لوگوں نے اپنا مذہب نہیں بھی بدلا تھا لیکن معقولات میں دستگاہ پیدا کر کے شہرت حاصل کی تھی، اودھ کے اس

دربار میں ان کی قدر افزائی ہوتی تھی، فرنگی محل کے قریب قریب دو ہمنام مولوی جن میں ایک تو مولوی ظہور الحق اور دوسرے مولوی ظہور اللہ کے نام سے مشہور تھے، ان میں آخر الذکر صاحب کے تصنیفات کی فہرست حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے۔

"تعلیقات حاشیہ زاہدیہ بر شرح تہذیب المنطق و حاشیہ بر دوحہ شمس بازغہ"

یعنی کل کی کل معقولاتی کتابوں سے ان کے حواشی کا تعلق ہے، صاحب تذکرہ نے لکھا ہے کہ "در عصر خود نامے برآورد" لیکن ظاہر ہے کہ یہ نام ان کا ان ہی عقلی فنون میں روشن ہوا ہوگا لکھا ہے کہ "در عہد یمین الملک سعادت علی خاں لکھنو بہ عہدہ افتا مباہی گشت" (ص ۱۰۰) مگر ان کے دوسرے ہم اسمی مولوی ظہور الحق بیچارے بھی اسی فرنگی محل کے علماء میں ہیں لیکن۔

قرآن مجید حفظ کردہ اشتغال بقرأت آں و تفسیر بیضی و مطالعہ کتب حدیث می داشت

و توجہ بہ معقولات ہرگز نمی کرد"

اس جرم کی سزا ان کو یہ ملی "تمام عمر بہ تنگی بسر کرد" (ص ۹۹)

بہرحال علماء اہل سنت کی ان خانہ بربادیوں میں خواہ کسی چیز کو بھی دخل ہو لیکن یہ واقعہ خواہ کسی وجہ سے جب ہو ہی چکا تو ان لوگوں کے لیے جو بہرحال اپنے خاندانی علمی وقار کو باقی رکھنا چاہتے تھے اُن کے لیے چارۂ کار ہی اس کے سوا کیا تھا کہ ان علوم میں کمال پیدا کریں، جن کی موجودہ حکومت قدردان تھی اور اسی کو میں ایک بڑا موثر سبب اس نصابی انقلاب کا قرار دیتا ہوں جو ہندوستان میں عموماً اور پورب میں خصوصاً پیش آیا، ماسوا اس کے ایک چیز اور بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر اور مستحق توجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے درباری

لے آخر یہ کیسے کہہ سکتا ہوں برہان الملک نے جس شان کے ساتھ نادر شاہ کے حوالہ اپنے آپ کو پانی پت کے میدان میں کیا، جس کی توجیہ طباطبائی نے اداب ایران سے کی، خود یہی واقعہ جس کا ذکر کر چکا ہوں، اس گہری سازش کا پتہ دے رہا ہے اور اس راز سے پردہ اٹھا رہا ہے کہ نادر شاہ اچانک ایران کی سرزمین سے اچک کر کابل و قندھار کے علاقوں کو پامال کرتا ہوا ہندوستان کیسے پہنچا، اس وقت حکومت کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جنہوں نے اس پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں کیا تھا، وہ تو خوش قسمتی سے ایک تورانی سردار (باقی بر صفحہ ۲۳۴

امراء کے بچوں میں اپنے علمی مذاق کو عام کرکے جہاں "معقولیت" کے غلبہ کی راہ کھولی تھی وہیں ایک واقعہ اور ہے، ملا عبدالقادر بدایونی نے تو لکھا ہے کہ میر فتح اللہ اپنی زبان کی کرختگی کی وجہ سے کسی شاگرد رشید کے پیدا کرنے میں ناکام ہوئے، مگر میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ کلیۃً ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، تذکرہ علماء ہند میں اپنے عہد کے مشہور مرکزی مدرس مولانا عبدالسلام لاہوری کو "شاگرد میر فتح اللہ شیرازی" کے الفاظ سے روشناس کرایا گیا ہے، مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا عبدالسلام کے متعلق "معدن عقلیات ونقلیات بود" لکھ کر ان کے اساتذہ میں صرف میر فتح اللہ شیرازی کا ذکر کیا ہے، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالسلام کے ممتاز استادوں میں میر فتح اللہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے، اور یہ کہ وہ براہِ راست میر فتح اللہ ہی کے ساختہ پرداختہ ہیں، ملا عبدالسلام کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان فرمائی ہے کہ "قریب شصت سال درس گفت وجمعے کثیر را بپایۂ فضیلت رسانید.... نود سال عمر یافت" (ماثر ص ۲۳۶) میرے نزدیک تو میر فتح اللہ کے صرف یہی ایک شاگرد دوسروں کے بیسیوں شاگردوں کے مقابلہ میں بالکل کافی ہیں، ساٹھ ساٹھ سال تک مسلسل درس دینا آسان نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جمع کثیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۳) حضرت آصف جاہ اول رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے کہ مغلئی حکومت موت کے پنجہ سے اس وقت نکل گئی۔ ورنہ جو بعد کو ہوا وہ شاید اسی دن ہو جاتا۔ محمد شاہ کے بعد جب مغل بادشاہ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ کے جلیل عہدہ سے سرفراز کیا، تاریخ اٹھا کر پڑھیے اسی کے ساتھ صفدر جنگ نے کیا برتاؤ کیا، سب جانتے ہیں کہ صفدر جنگ کھلم کھلا باغی ہو کر علانیہ بادشاہ سے جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ اس وقت دلی کے مسلمانوں کا جو احساس تھا طباطبائی نے جو غالباً دلی ہی میں تھے اس احساس کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے چونکہ صفدر جنگ کے ہم عقیدہ، ہم مذہب مورخ کا بیان ہے اس لیے شاید زیادہ قابل وزن ہو سکتا ہے، لکھتے ہیں :-

کشامرہ و پنجابیان علم محمدی برپا کردند ندا دادند کہ صفدر جنگ رافضی است جنگ با او کہ بر خلیفۂ زماں خروج نمودہ جہاد ست ہزاراں نفر از عوام زیر علم جمع گردیدہ شور و ہنگامہ دم چار یار گرم داشتند" (ج ۳ ص ۸۹۲)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفدر جنگ کا مذہبی تعصب کچھ پوشیدہ نہ تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ اودھ ہی کی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے ہندوستان میں جمعہ اور جماعات کا رواج فرقہ امامیہ میں کرایا۔ دیکھیے تذکرہ مولوی اللہ دار علی وملا محمد علی کشمیری در کتاب نجوم السماء تذکرہ علماء شیعہ ہیں۔ ایسی صورت میں اس حکومت اور اس کے حکمرانوں کے متعلق عدم تعصب کا دعویٰ ظاہر ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

ان کے علم سے مستفید ہوا، اب سُنیئے کہ اس جمع کثیر میں جس شخص نے ملا عبدالسلام کے شاگردوں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا، عجیب اتفاق ہے کہ ان کا نام بھی عبدالسلام ہی ہے، فرق یہ ہے کہ اُستاد عبدالسلام لاہوری ہیں اور شاگرد عبدالسلام اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ دیوہ کے تھے۔ گو آخر عُمر ان کی بھی لاہور ہی میں گذری، اب تو خیر ان بیچاروں کا کون تذکرہ کرتا ہے، لیکن درس کے قدیم حلقوں میں ملّا عبدالسلام دیوی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا، توضیح وتلویح اور بیضاوی پر ان کے معرکۃ الآرا حواشی ہیں، خصوصاً تلویح کا حاشیہ تو سمجھا جاتا ہے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتا، شاہ جہاں بادشاہ کی طرف سے عساکر قاہرہ شاہی کے یہ مدتوں مفتی کے عہدے پر سرفراز رہے بادشاہ ان کی بیحد عزت کرتا تھا تذکرۂ علماء ہند کے مصنف نے "درس نظامیہ" کے بانی اول ملّا نظام الدین (فرنگی محل) کے والد ملّا قطب الدین سہالی[۱] کے ترجمہ میں ان الفاظ سے ان کا تعارف کراتے ہوئے۔

"ملا قطب الدین سہالی صاحب ترجمہ امام الاساتذہ و مقدم الجہابذہ معدن علوم عقلیہ و مخزنِ فنونِ نقلیہ بود"

آگے یہ لکھا ہے کہ "اخذ علوم از ملا دانیال چوراسی شاگرد ملّا عبدالسلام ساکن دیوہ" (ص ۱۶۸)

یہی بیان مولانا غلام علی آزاد کا بھی ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ آج جس نصاب کا نام نصاب نظامیہ ہے اور اسی کے متعلق معقولاتی کتابوں کی کثرت کی عام شکایت ہے اس نصاب کے بانی کا تعلیمی سلسلہ دراصل ملا فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ملا نظام الدین صاحبِ نصاب نظامیہ کو خود اپنے والد ملّا قطب الدین سہالی سے استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہیے تھا نہ مل سکا

تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت والدِ ماجد خود از حافظ امان اللہ بنارسی و مولوی قطب الدین

---

[۱] واقعہ ملا صاحب کی شہادت کا مشہور ہے کہ سہالی گاؤں میں عثمانی شیوخ بھی رہتے تھے۔ آب پاشی میں جھگڑا ہوا عثمانیوں نے رات کے وقت بیچارے انصاری ملّا کو شہید کر دیا، ملّا صاحب نے چار صاحبزادے اپنے بعد چھوڑے۔ عثمانیوں نے ملا صاحب کے گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ سلطان اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی صلہ میں (باقی بر صفحہ ۲۳۶)

شمس آبادی نخودہ ۔ (ص ۲۴۱)

اور بنارسی شمس آبادی یہ دونوں حضرات ان کے والد ملا قطب الدین سہالی کے فیض یافتوں اور شاگردوں میں ہیں۔ گویا علمی شجرہ اگر بنایا جائے تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے:-

میر فتح اللہ شیرازی
|
ملا عبد السلام لاہوری
|
عبد السلام دیوی
|
ملا دانیال چوراسی
|
قطب الدین سہالی

ملا قطب الدین شمس آبادی — امان اللہ بنارسی

ملا نظام الدین صاحب درس نظامیہ

جس کا یہی مطلب ہوا کہ میر فتح اللہ کا تعلیمی اثر صرف امیرزادوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ ہندوستان کے عام علمی خانوادے بھی ان کی تعلیم سے متاثر ہوئے، خصوصاً درس نظامیہ کے نصاب کی ترتیب جس ذات گرامی کی طرف منسوب ہے چند واسطوں سے میر فتح اللہ شیرازی پر ان کی تعلیم کا سر رشتہ بھی منتہی ہوتا ہے۔

اب اس زمانہ میں اودھ کی حکومت کا نجبا و شرفا کے ساتھ جو برتاؤ ہوا، اس کو اور ہندی امیرزادوں کو میر فتح اللہ کی تعلیم نے عقلیت کا جو چسکا لگا دیا اُس کو پھر خود ہندوستان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۵) لکھنؤ کے خالی مکان کو جس میں کبھی فرنگی تاجر رہتے تھے ملا شہید کے پس ماندوں کے حوالے کر دیا ہندوستان کا تنہا یہی علمی خاندان ہے جس میں تقریباً دو صدی تک علم موروثی طریقہ سے منتقل ہوتا رہا، بلا مبالغہ سیکڑوں علما اسی خاندان سے اٹھے اور تعلیمی طور پر تو شاید ہندوستان کے ہر صوبہ میں اس خاندان کے فیض یافتوں کی کثیر تعداد ہر زمانہ میں پائی جاتی ہے شمس آباد قنوج کے پاس ایک قصبہ کا نام ہے قطب الدین شمس آبادی نے نصف صدی تک درس دیا، امان اللہ بنارسی شمس آبادی کے تلامذہ میں ہیں ۱۲۔

Marfat.com

نظامیہ نصاب جس نے مرتب کیا، سر فتح اللہ سے ان کا جو تعلیمی رشتہ اور تعلق ہے اس کو ان ساری باتوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس کا جواب بآسانی مل جاتا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے تعلیمی نصاب پر معقولی کتابوں کا وزن زیادہ کیوں پڑ گیا اس واقعہ کی تاریخی تحلیل و تجزیہ کے بعد جو صورت پیدا ہوتی تھی وہ تو یہ ہے، آگے اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جن وجوہ سے متاثر ہو کر اپنے نصاب میں اس تغیر کو جو قبول کر لیا، یہ کہاں تک درست تھا۔

بات یہ ہے کہ واقعہ کی جو نوعیت تھی، تاریخی شہادتوں کی روشنی میں وہ آپ کے سامنے گذر چکی، حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت نصاب کی جو کچھ بھی ہو گئی تھی، وہ زمانہ کے انقلاب کا نتیجہ تھا جس سے ملک گزر رہا تھا، قریب قریب وہی صورت اس وقت بھی پیش آگئی تھی جو آج ہمارے سامنے ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ آج تو تعلیم کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک کا نام دینی علوم اور دوسرے کا دنیاوی علوم نام رکھا گیا ہے۔ دونوں کی تعلیم گاہیں الگ الگ ہیں دونوں کا نصاب جُدا جُدا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصاب کے پڑھنے والے اس نصاب اور اس کے آثار و نتائج سے قطعاً بے گانہ ہیں جسے انہوں نے نہیں پڑھا ہے، ملک میں پڑھے لکھے طبقہ کی دو مستقل جماعتیں قائم ہو گئی ہیں، امتیاز کے لیے ایک نام "علماء" دوسرے کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں، دونوں کا دعویٰ ہے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا استحقاق ان ہی کو حاصل ہے اور ہے بھی یہی بات کہ جہل کی پناہ گاہ ہمیشہ علم ہی بنا رہا ہے، چونکہ دونوں کے پاس علم ہے، علم نے دونوں کے دل و دماغ کو منور کیا ہے، اس لیے عوام بیچارے جو علم سے تعلق نہیں رکھتے محتاج ہیں کہ جاننے والوں کے مشوروں اور آراء پر چلیں، مسئلہ یہاں تک تو درست ہے لیکن سوال آگے پیدا ہوتا ہے کہ اب علم کے نمائندے بجائے ایک کے دو طبقے ہیں، عوام پریشان ہیں کہ کس کے پیچھے جائیں کس کی سُنیں اور کس کی نہ سُنیں حالت تو یہ ہے کہ ان دونوں علمی گروہ میں سے جو بھی میدان خالی پاتا ہے، ہر ایک کو بجائے ایک کام کے مسلسل دو کام کرنے پڑتے ہیں یعنی عوام کو اپنے سوا علم کے دوسرے طبقہ سے متنفر کرنا، ایک مستقل کام یہ ہے، اس کے

Marfat.com

بعد پھر ان کے سامنے اپنی تجویزوں کو رکھنا، وقت کی زیادہ مقدار عموماً پہلے کام میں خرچ ہو جاتی ہے، مسٹر اور مولانا، یا لیڈر اور علماء، تعلیم یافتہ یا مولوی، بتدریج ان دونوں الفاظ میں کشمکش بڑھتی چلی جا رہی ہے، ہر ایک دوسرے کے وجود سے بے زار ہے، فسق، الحاد، بے دینی کا الزام علماء تعلیم یافتوں پر عائد کر رہے ہیں تاریک خیالی، ابلہی، ناواقفیت کی تہمتیں علماء پر تعلیم یافتوں کی طرف سے جوڑی جا رہی ہیں، اور جو کچھ بھی اس کشمکش میں ایک کا رویہ دوسرے کے ساتھ آج چالیس پچاس سال سے ہے وہ ہمارے سامنے ہے، دن بدن یہ کشمکش بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج جس حال میں اس ملک کے بلکہ سارے جہان کے مسلمان تعلیمی نصاب کی اس دوعملی کی وجہ سے گرفتار ہیں، کیا یہ کوئی خوش گوار صورت ہے اور اس کی مستحق ہے کہ اس کو باقی رکھا جائے۔ کیا عوام کو علماء اور تعلیم یافتوں یا لیڈر اور ملانوں کے قدموں کی ٹھوکر میں اسی طرح ڈالے رکھنا کسی اچھے انجام کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے کشمکش کی یہ ناگوار صورت اگر اس قابل ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کو ختم کیا جائے، تو پھر لوگوں نے ان بزرگوں کی کیوں قیمت نہیں پہچانی جنہوں نے تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں علم کی اس دوعملی اور تقسیم کو شدت کے ساتھ رد کیے رکھا، لوگ سوچتے نہیں ہیں، ورنہ میں مسلمانوں کے چند اہم کارناموں میں ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی نصاب کی وحدت کو بھی سمجھتا ہوں، تیرہ سو سال کی تاریخ ان کی گواہ ہے۔ کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ بھی تھے جو علماء کہلاتے تھے، اور وہی علماء تھے جنہیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے فلسفی بھی پیدا ہو رہے تھے، اور ریاضی داں بھی، حکیم بھی مہندس بھی، محدث بھی، مفسر بھی، طبیب بھی، فقیہ بھی، شاعر بھی، ادیب بھی، صوفی بھی لیکن یہ کیسی عجیب بات تھی کہ تعلیم کا ایک ہی نظام تھا جس سے یہ ساری مختلف پیداوار یں نکل رہی تھیں، مسلمانوں کے سب سے بڑے فیلسوف ابن سینا ہی کے حالات اٹھا کر پڑھیے ابن خلکان سے نقل کر رہا ہوں۔

اشتغل بالعلوم وحصل الفنون ولما — تحصیل علم میں مشغول ہوا اور فنون حاصل کیے اور جب

بلغ عشر سنین من عمرہ کان اتقن علم القرآن العزیز والادب وحفظ اشیاء من اصول الدین وحساب الھند والجبر والمقابلۃ (ج ۱ ص ۱۵۲)

دس سال کی عمر تھی تو اس شخص نے قرآن عزیز کے علم کو پختہ کیا، اور ادب کا علم حاصل کیا، نیز دین کے اصولی مسائل (عقائد وغیرہ) کو یاد کیا، اور اسی کے ساتھ حساب الھند وجبر و مقابلہ کے فن کو بھی سیکھا۔

یہ ابن سینا کی عام تعلیم کا تذکرہ تھا، اس کے بعد جب اختصاص کا ارادہ ہوا تو ابو عبد اللہ ناتلی الحکیم کا ذکر کرنے کے بعد قاضی ابن خلکان راوی ہیں:۔

فابتدء ابو علی یقرء علیہ ایساغوجی واحکم علیہ علم المنطق واقلیدس والمجسطی.... وکان مع ذلک یختلف فی الفقۃ الی اسماعیل الزاھد یقرء ویبحث ویناظر (ص ۱۵۲)

تب ابو علی نے ابو عبد اللہ ناتلی سے ایساغوجی پڑھی اور منطق کے علم کو مستحکم کیا، نیز اقلیدس اور مجسطی بھی ان ہی سے پڑھی لیکن ان فلسفیانہ علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسی زمانہ میں وہ اسماعیل زاہد کے پاس علم فقہ کی تحصیل کے لیے آمد و رفت رکھتے تھے، فقہ ان سے پڑھتے تھے اور اس فن پر بحث و مناظرہ کرتے

یہ ہے اسلامی عہد کے سب سے بڑے تعلیم یافتہ کی تعلیمی رپورٹ، یہی بات سوچنے کی تھی جسے کسی نے نہیں سوچا، حالانکہ اس کے سوا جو کچھ تھا سب کچھ سوچا گیا۔

ہندوستان کے قدیم نصاب پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں حدیث کی تعلیم کے لیے صرف ایک کتاب تھی، تفسیر میں صرف جلالین پڑھائی جاتی تھی، اور مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ فقہ میں اگرچہ چند کتابوں (قدوری، کنز، شرح وقایہ، ہدایہ) کا نام لیا جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ضروری نصاب میں فقہ صرف قدوری تک اور اعلیٰ تکمیلی نصاب میں کنز چند ورقی متن[1] کے علاوہ معناً

---

[1] اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، بظاہر کنز وغیرہ متون کی کتابیں موٹے موٹے حروف اور طویل الذیل حواشی کے ساتھ جس طرح چھاپی جا رہی ہیں، دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی بڑی کتاب ہے، لیکن جن حروف میں آج کل اخبارات و جرائد یومیہ وغیرہ شائع ہوتے ہیں ان ہی حروف میں مثلاً کنز کو اگر لکھا جائے (باقی بر صفحہ ۲۴۰)

صرف ایک ہی کتاب فقہ کی پڑھائی جاتی تھی یعنی شرح وقایہ کے عبادات، اور ہدایہ کے معاملات جس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ دو کتابیں نہیں ہیں، بلکہ مسائل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فقہ کی ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی تھی۔

لیکن کیا ان چند گنی چنی کتابوں کا درس ان علوم میں تبحر اور وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے کافی نہ تھا؟ گو کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے لیکن ع کب تک روکوں دل میں آہ، میرا اس باب میں جو ذاتی خیال ہے اس کا اظہار اپنا ایک ایمانی فرض سمجھتا ہوں، فیصلہ کرنے والے اس کے بعد جو چاہیں فیصلہ کریں۔ پس

چل مرے خامے بسم اللہ

درسِ حدیث کی اصلاح

آج نصاب کے اصلاحی دائروں کا ایک بڑا کارنامہ جس کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر پہلوں کو مطعون اور ملام بنایا جا رہا ہے، وہ حدیث کا درس ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ایک بڑا نقص تھا پرانے نصاب یا یوں کہیے کہ مشارق و مصابیح یا مشکوٰۃ والے نصاب کا جس کی اصلاح جدید نصاب میں صحاح ستہ کی کتابوں کے اضافہ سے کی گئی کسی دوسرے کو نہیں بلکہ ایسی ہستی کو میں اس باب میں شہادت کے لیے پیش کرتا ہوں، جن کی طرف درسِ حدیث کے اس اصطلاحی کارنامے کو منسوب کیا جا رہا ہے، میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۹) تو بلا مبالغہ کسی معمولی سی نوٹ بک میں پوری کتاب سما سکتی ہے، ان متون کی نوعیت میرے خیال میں اُن یادداشتوں کی ہے جو لکچر وغیرہ دینے کے لیے لوگ نوٹ کر لیتے ہیں، اور ان ہی کو دیکھ کر تقریر کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے علماء نے اس کی عجیب مشق بہم پہنچائی تھی، دس دس صفحات میں جس کی تفصیل آسکتی ہے اسی مضمون کو وہ سطر دو سطر میں اس طرح بند کر سکتے تھے کہ سارے مفصل مضمون پر وہ عبارت حاوی ہو سکتی تھی۔ یہ ایک کمال تھا جسے اب نقص ٹھہرایا گیا ہے، قضاء، افتاء کے کام کرنے والے حضرات ان یادداشتوں کو زبانی یاد کر لیتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ فقہ کے سارے ابواب و مضمون کے عنوان انہیں محفوظ رہتے تھے ۱۲

Marfat.com

اللہ علیہ سے ہے، اپنی کتاب انفاس العارفین میں درسِ حدیث کے ان طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے جو حرمین میں مروج تھے، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

بایددانست کہ درس حدیث را نزدیک علماء حرمین سہ طریق است یکے طریق سرد کہ شیخ یا قاری وے تلاوت کتاب کند، بے تعرض مباحث لغویہ و فقہیہ و اسماء رجال وغیر آن و دیگر طریق بحث و حل کہ بعد تلاوت یک حدیث بر حفظ غریب و ترکیب عویص، و بر قلیل الوقوع از اسماء اسناد و سوال ظاہر الورود و مسئلہ منصوص علیہا توقف کند و آں را بہ کلام متوسط حل نماید و آنگاہ پیش رود و علی ہذا القیاس، سوم طریقہ امعان و تعمق کہ بر ہر کلمہ مالہا و ما علیہا و ما یتعلق بہا بسیار ذکر کند، مثلاً در کلمہ غریبہ و ترکیب عویص، شواہد آں از کلام شعراء و اخوات آں کلمہ در اشتقاق و محال استعمال وے ذکر کند و در اسماء الرجال احوال ایں قوم و سیرت ایشاں بیان نماید و مسائل فقہیہ را براں مسئلہ منصوص علیہا تخریج نماید و بادنی مناسبت قصص عجیبہ و حکایات غریبہ بگوئید

(ص ۱۸۷)

معلوم ہونا چاہیے کہ علماء حرمین میں حدیث کے پڑھانے کے تین طریقے ہیں، ایک طریقہ کا نام سرد (ردا وردی) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُستاذ یا پڑھنے والا کتاب کو پڑھتا چلا جائے، اس طور پر کہ لغوی مباحث اور فقہی جھگڑوں، یا اسماء الرجال وغیرہ کی باتوں سے تعرض نہ کرے، اور دوسرے طریقہ کا نام بحث و حل کا طریقہ ہے یعنی کسی حدیث کے پڑھنے کے بعد اس کے اجنبی اور نادر الفاظ یا کوئی ترکیبی دشواری ہو، اس پر یا ایسے اسماء سند کے جو غیر معروف ہوں اور ان کا ذکر کم آتا ہو اسی طرح ایسے اعتراضات جو کھلے کھلے طریقہ سے وارد ہوتے ہیں، یا جن مسائل کا اس حدیث میں صراحۃً تذکرہ کیا گیا ہو، اُن پر اُستاد ٹھہرے اور متوسط طریقہ کی گفتگو ان پر کر کے ان کو حل کرے، اس کے بعد آگے بڑھتا چلا جائے تیسرا طریقہ درس کا وہ ہے جس کا نام امعان و تعمق کا طریقہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کے ہر ہر لفظ اس کے سارے متعلقات مالہا و ما علیہا پر بحث کی جائے اور خوب بحث کی جائے مثلاً جہاں کوئی ذرا اجنبی لفظ آیا، یا کوئی مشکل ترکیب سامنے آئی اُس کے حل میں شعراء کے کلام سے شہادت پیش کرنا شروع کرے اور اُس کے مماثل کلمات ان کے مواد

Marfat.com

اشتقاق اور استعمال کے مقامات کو واضح کیا جائے۔ اسی طرح رجال کے اسماء، جہاں جہاں آئیں اُن پر بحث کرنا شروع کردے ان کے حالات ان کی سیرت بیان کی جائے اور جس مسئلہ کا اس حدیث میں صراحۃً ذکر آیا ہو، اُس پر قیاس کر کے جو مسائل غیر منصوصہ پیدا ہوتے ہوں، فقہ کی کتابوں کے ان مسائل کا تذکرہ کیا جائے۔ اسی طرح ذرا ذرا سی مناسبت اور حیلے سے عجیب و غریب قصے اور نادر حکایات کا دریا بہا دیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب نے درسِ حدیث کے ان تین طریقوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد ہر طریقے کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے تیسرا طریقہ یعنی جس میں ہر غریب اجنبی لغت کے آتے ہی استاذ شعراء کے اشعار سنانا شروع کردے، اور اس کے ہم معنی ہم شباہت الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے، ہر لفظ کی سوانح عمری یعنی ابتداءً یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا، پھر بتدریج عہد بعہد مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہوئے اب کس معنی میں استعمال ہوتا ہے، ہر استعمال کے محل کو ظاہر کرتے ہوئے کلام عرب سے اس کی شہادت پیش کی جائے، یوں ہی سند کے ہر راوی کے متعلق رجال کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اُس کا مسلسل ذکر کرنا فقہی مسائل اور ان کے تمام جزئیات قریبہ بعیدہ جن کا اس حدیث سے خواہ دور ہی کا تعلق کیوں نہ ہو، ان کو بھی بیان کرتا چلا جائے۔ ساتھ ہی معمولی معمولی مناسبتوں کو آڑ بنا کر اپنے معلومات جن کا کسی فن سے بھی تعلق ہو، اظہار کیا جائے۔ درس حدیث کے اس طریقہ کے متعلق شاہ صاحب کی رائے ہے کہ یہ طریقہ

طریقہ قصاص است کہ قصد از اں اظہار فضیلت وعلم است یا غیر آں واللہ اعلم نہ روایت و تحصیل علم۔	یہ واعظوں اور قصہ خوانوں کا طریقہ ہے، اور مقصود اس قسم کے پڑھانے والوں کا محض اپنی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے یا اس کے سوا کوئی اور غرض واللہ اعلم، بہرحال یہ نہ روایت حدیث کا طریقہ ہے، اور علم حاصل کرنے کا ذریعہ

Marfat.com

صرف یہی نہیں بلکہ درس حدیث کے متعلق آج مختلف دائروں میں جن امور پر لوگوں کو ناز ہے، سُنیے شاہ صاحب ہی سے سُنیے فرماتے ہیں :۔

باید دانست کہ اشتغال محدث باحوال رجال سند بعد تصحیح اسماء انہا و معرفت وثوق شاں خصوصاً در صحیحین و غیر آں

معلوم ہونا چاہیے کہ محدث کا سند کے رجال سے ان لوگوں کے نام کی تصحیح کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ ان کا شمار ثقات میں ہے خصوصاً صحیحین کے رجال ہوں یا ان کے سوا صحاح کی کتابوں یعنی صحاح کی موجودہ کتابوں کے متعلق رجالی مباحث۔

یا اشتغال بفروع فقیہ بیان اختلاف مذاہب فقہاء و توفیق در اختلاف روایات و ترجیح بعض احادیث بر بعض

فقہی جزئیات کے ساتھ مشغول ہونا، اور فقہا کے مذاہب کو بیان کرنا اور ان روایتوں میں تطبیق دینا، روایتوں کے اختلاف کو بیان کرنا، ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دینا۔

دونوں ہی کے متعلق اُستاذ الکل نے الکل مجدد درس حدیث فی الہند کا فیصلہ ہے کہ یہ ساری باتیں۔

از امعان و تعمق ست و اوائل اُمت مرحومہ بدیں امور مشغول نہ بودند۔

یہ سب لاحاصل، فکر و غور اور جزرسی ہے۔ اُمت کے ابتدائی طبقات کے لوگ ان امور میں مشغول نہ تھے

لیجیے جب یہ ساری باتیں "امعان و تعمق" ہیں تو پھر جن لوگوں نے اپنے تعلیمی نصاب میں مشارق و مصابیح یا مشکوٰۃ ہی کو درس حدیث کے لیے کافی قرار دیا تھا، ان پر اعتراض کرنے کا حق کیا ان لوگوں کو باقی رہ جاتا ہے جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ اور ان کے طریقہ تعلیم کا وارث سمجھتے ہیں شاہ صاحب نے درسِ حدیث کے اور دو طریقوں یعنی سرد والا طریقہ اور بحث و حل والا طریقہ ان دونوں کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ بحث و حل کا طریقہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے، جنہوں نے حدیث شروع کی ہو، مثلاً مشکوٰۃ یا مشارق ان کو شروع کرائی گئی ہو، فرماتے ہیں۔

بہ نسبت مبتدین اہل توسط طریقہ بحث و حل

مبتدیوں اور متوسط استعداد والوں کے لیے بحث و حل کا طریقہ مفید

اور یہی کیا بھی جاتا تھا کہ مشکوٰۃ وغیرہ جیسی کتاب کے ذریعہ سے لوگوں کو حدیث کے ان لغوی الفاظ

جن میں غرابت وندرت ہوتی تھی ان کے معانی بتادیے جاتے تھے، جہاں کہیں کوئی نحوی ترکیب کے لحاظ سے کوئی دقت ہوئی اُسے سُلجھا دیا گیا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ مبتدیوں اور اہل توسط کو پڑھا دینے کے بعد ان کے مشائخ حرمین میں سے شیخ ابوطاہر جو گویا ان کے سب سے بڑے شیخ فی الحدیث ہیں ان کا طریقہ وہی سرد کا تھا، یعنی صحاح کی بطور تلاوت کے ان کے سامنے گذار دی جاتی تھیں، فائدہ اس کا یہ بتایا ہے۔

تا زود سماع حدیث وسلسلہ روائیت درست کنند۔	تاکہ حدیث کے سننے کا قصہ جلد ختم ہو اور روایت کا سلسلہ لوگ درست کرلیں۔

باقی تفصیلی بحث کے لیے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

باقی مباحث بر شروح حوالہ می کردند زیرا کہ ضبط حدیث امروز مدار آں بر تتبع شروح است۔	باقی مباحث جو حدیث کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں (ان کے اُستاد) ان مباحث کے لیے کہہ دیتے تھے کہ حدیث کی شرحوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اب حدیثوں کے معانی و مطالب کو ضبط وگرفت میں لانا اس کا دار مدار

جس کا یہی مطلب ہوا کہ مشکوٰۃ جیسی کسی متن حدیث کی کتاب کو مل وبحث کے طریقے سے پڑھنے کے بعد آگے صحاح کی کتابوں کے پڑھانے کا مطلب بطور تبرک سمجھیے یا سلسلہ روایت کی درستگی سمجھیے، اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا تھا، جو یوں بھی مناولہ[1] وغیرہ کے طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کتابوں کی تدوین کے بعد "اسناد کی درستگی" کا مسئلہ بھی تبرک کے سوا اور کیا رہ گیا ہے، امام بخاری تک مثلاً ان کی کتاب اب تواتر کے ساتھ منسوب ہے، کسی متواتر چیز کے اسناد کی حاجت ہی کیا باقی رہتی ہے، سند کی اہمیت جو کچھ بھی تدوین کتب سے پہلے تھی یہی چیز ہمارے قدیم علما، اور پرانے نصاب والوں کے پیش نظر تھی۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے

---

[1] یہ محدثین کا ایک طریقہ تھا کہ جس کی قابلیت پر اعتماد ہوتا تھا پڑھائے بغیر کتابوں کی روایت کرنے کی اجازت عطا فرماتے تھے جس کے مختلف طریقے تھے۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھیے ۱۲

Marfat.com

کران پر نکتہ چینیوں کا جو سلسلہ آج پچاس سال سے جاری ہے اس کی بنیاد کیا ہے، دیدہ دلیری یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کا نام لے کر ان نکتہ چینیوں میں زور پہنچایا جاتا ہے، مگر آپ دیکھ چکے کہ خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذاتی خیال اس معاملہ میں کیا ہے، حدیث میں درسًا جس چیز کو پڑھانے کی حاجت ہے، وہ مشارق ہو یا مصابیح یا مشکوٰۃ وغیرہ کتابوں میں سے کسی ایک کتاب سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے بعد سردًا یا مناولۃً صحاح ستہ وغیرہ کی اجازت سو پہلے بھی لوگ یہی کرتے تھے کہ ہندوستان ہی کے کسی صاحبِ سند محدث سے اجازت لے لیتے تھے، یا حج وغیرہ کی تقریب سے جب حرمین جاتے تھے تو وہاں سے سند لے آتے تھے، علماء کے تذکرے پڑھیے عمومًا آپ پائینگے کہ اس قسم کی سند کے حاصل کرنے کا رواج ان میں بھی تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اوروں کا تو میں نہیں کہتا، دار العلوم دیوبند، یا اس کے سلسلہ کے جو مدارس یا علماء ہیں عمومًا صحاح ستہ کے درس بطریقہ سرد ہی کا ان میں رواج ہے، پچھلے دنوں اخباروں میں ناواقفوں کی طرف سے جب یہ شائع کرایا گیا کہ دیوبند میں بخاری کے چالیس چالیس پچاس پچاس ورق ایک دن میں ہو جاتے ہیں، حضرت مولانا حسین احمد متع اللہ المسلمین بطول بقائہ پر الزام لگایا گیا کہ سال بھر تک وہ سیاسی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں، اور ختم سال پر اسی طریقہ سے کتابوں کا عبور کرا دیتے ہیں، تو درس حدیث کے راز سے جو ناآشنا ہیں اُنھوں نے تعجب کے ساتھ ان خبروں کو پڑھا، حالانکہ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حدیث کے پڑھانے کا صحیح طریقہ یہی ہے ورنہ اس راہ کو چھوڑ کر جو لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں، آپ سن چکے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ اسے "طریقۂ قصاص" قرار دیتے ہیں، اور بجز ایک بیجا طریقہ اظہارِ فضل و علم کے اس کا حاصل ان کے نزدیک عالم حالات میں اور کچھ نہیں ہے، جو چیز مطالعہ اور مزاولت سے اُستاد کی تعلیم کے بغیر آسکتی ہے، سچی بات تو یہی ہے کہ اس کو پڑھانے کی حاجت کیا ہے، نصف صدی گذشتہ میں غیر مقلدیت کا طوفان جب ہندوستان میں اُٹھا تو اس طوفان کے مقابلہ کے لیے احناف کی طرف سے جو لوگ کھڑے ہوئے ظاہر ہے کہ ان بیچاروں نے حدیث

وہی مشارقی و مشکوٰتی طریقہ سے پڑھی تھی لیکن آستینیں چڑھا کر جب یہی لوگ میدان میں اُترے تو کون نہیں جانتا کہ ان ہی میں مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے لوگ تھے، اور ان بزرگوں کے متعلق تو شاید کچھ کہا بھی جا سکتا ہے لیکن بالکلیہ جنہوں نے صرف درس نظامیہ والی حدیث سے زیادہ اور کوئی چیز اس فن میں استادوں سے نہیں پڑھی تھی مثلاً صاحب آثار السنن مولانا شوق نیموی[1] وغیرہ ان بزرگوں نے فنِ رجال، تنقید احادیث میں جن دقیقہ سنجیوں کی عملی شہادتیں پیش کی ہیں، کیا اس کے بعد بھی اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ یہ چیز درس کی نہیں بلکہ مطالعہ و مزاولت سے تعلق رکھتی ہے۔

قدیم نظامی نصاب میں اصلاح کا دوسرا دعویٰ ان علمی دائروں کی طرف سے پیش ہوا یا ہو رہا ہے، جن میں ادب عربی کو اہمیت دی گئی۔ شور برپا کیا گیا کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب عربی میں ہے، پیغمبر کے ملفوظات اور پیغمبر کی سیرت عربی میں ہے، مسلمانوں کا قانون اور اُن کا اعتقادی و عملی دستور حیات عربی میں ہے، ان کی تاریخ، ان کے سارے علمی کارنامے عربی میں ہیں لیکن قدیم نصاب میں اس کی اہمیت گھٹا دی گئی۔ باور کرایا گیا کہ جدید ادبی نصاب میں جو کتابیں نظم و نثر یا متعلقہ فنون ادبیہ کی رکھی گئی ہیں، ان کی تعلیم حاصل کیے بغیر نہ کوئی قرآن سمجھ سکتا ہے نہ حدیث، نہ فقہ، نہ تصوف، نہ کلام و عقائد۔ تقریباً پچاس ساٹھ سال سے اس کا بھی ہنگامہ برپا ہے لیکن کیا یہی واقعہ ہے؟

[1] آپ کا اسم گرامی مولانا ظہیر احسن اور تخلص شوق تھا۔ حدیث خصوصاً نقد رجال میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کی دقتِ نظر کے مداحوں میں تھے، آپ نیمی (بہار) میں پیدا ہوئے، اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے درس نظامیہ کی تکمیل کر کے پٹنہ میں مطب کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا کاروبار شروع کیا۔ آثار السنن کے چند ابتدائی حصے ملک میں شائع ہوئے کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی لیکن افسوس عمر کم پائی، کتاب ناتمام رہی، پھر بھی جتنا حصہ شائع ہو چکا ہے حنفی مدارس میں بعضوں نے اس کو نصاب کا جز قرار دیا ہے۔ یہ کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں محدثانہ اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ علامہ نذاتوی نے اس کا تکملہ بھی کرایا ہے۔ مولانا شوق اُردو زبان کے بڑے نامور شعراء میں تھے۔ جلال لکھنوی سے زبان کے مسئلہ میں تحریری مناظرہ بھی کیا تھا جس میں مولانا ہی کی جیت ہوئی تھی۔ ایک بڑی دردناک مثنوی اُردو میں لکھی ہے، اور بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ سنا ہے ان کے صاحبزادے چاہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کو پھر شائع کریں۔ وفقہ اللہ لما یحب ویرضیٰ ۱۲۔

Marfat.com

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر اپنے اس دعوے کو دہراتا ہوں کہ عربی زبان اسلام کے بعد دو مستقل حصّوں میں تقسیم ہوگئی ہے، ایک حصہ اس کا وہ ہے جس میں قرآن، حدیث اور اسلامی ادبیات محفوظ ہیں، اور دوسرا وہ ہے جس میں جاہلی شعراء، یا عہد اسلامی کے انشاپردازوں یا شعر کہنے والوں کا کلام ہے، واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان کے سابق الذکر سرمایہ کی یہ حالت ہے کہ عموماً مسلمانوں کی وہی مادری زبان ہے، اور جہاں یہ ممکن نہ ہو سکا وہاں کی مقامی زبانوں میں عربی زبان کے اس حصہ کا ایک بڑا ذخیرہ کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ تھوڑی بہت بھی عربیت سے مناسبت پیدا کر لینے کے بعد لوگ قرآن و حدیث یا اسلامی ادبیات والی عربی کو سمجھنے لگتے ہیں، پھر جیسے جیسے مشق و مزاولت بڑھتی ہے عربی زبان کے اس حصہ پر ان کو پورا قابو حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس حصہ پر باضابطہ قابو یافتہ ہونے کے بعد بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ عربی زبان کا وہ دوسرا حصہ یعنی وہی جاہلیت کے کلام یا دواوین، محاضرات و مسامرات کی انشائی کتابوں والی عربی سے بھی ان کو پوری مناسبت پیدا ہو، کیونکہ عموماً اس حصہ میں ایسے الفاظ ایسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں جو اسلامی ادبیات والی عربی کے مقابلہ میں کچھ اجنبی سی محسوس ہوتی ہے محض قرآن و حدیث، فقہ و کلام و تصوف والی عربی سے اس جاہلی عربی کو قابو میں لانا تقریباً ناممکن ہے قریب قریب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ فارسی زبان سیکھ کر جیسے پشتو زبان کوئی نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ یہ دونوں دو مستقل جداگانہ چیزیں ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کے سیکھنے سے دوسری کا علم حاصل نہیں ہو سکتا، اور یوں بھی ان میں سے کسی ایک کی عربی دوسری کی عربی پر موقوف نہیں ہے بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جاہلیت کے اشعار میں سے کسی ایک شعر کا مطلب بھی آپ سے نہ بیان کر سکے، لیکن اسی پر قرآن کی جس آیت حدیث کے جس ٹکڑے، فقہ کی جس عبارت کو آپ پیش کریں گے بغیر کسی دقت کے اس کے معانی و مطالب کو آپ کے سامنے بیان کرتا چلا جائیگا واقعہ تو یہی ہے شعوری یا غیر شعوری حیثیت سے یہی بات بزرگوں کے پیش نظر تھی، اس لیے لازمی نصاب میں انھوں نے جاہلی عربی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی جتنی کہ اس زمانہ میں دی گئی، یا دی

جاری ہے۔ لیکن واقعہ بہر حال واقعہ تھا، اس غیر اسلامی عربی کی ضرورت جب قرآن و حدیث فقہ وغیرہ کی عبارتوں کے حل کرنے میں بہ ظاہر لوگوں کو محسوس نہیں ہوتی تو دیکھا جاتا ہے کہ زبردستی وہی بات جو شاہ صاحب نے لکھی ہے کہ

درکلمہ غریبہ و ترکیب عویص شواہد آں از کلام شعراء داخوت کلمہ در اشتقاق و محال استعمال وے۔

کسی اجنبی لفظ مشکل ترکیب کے متعلق شہادت میں شعراء کا کلام اشتقاق کے مواد اور طریقہ استعمال کے مواقع

بغیر کسی ضرورت کے درسوں میں یا کتابوں میں ٹھونستے چلے جاتے ہیں، اور اتفاق سے ہزار ہا ہزار الفاظ کے بعد کہیں کسی ایک آدھ لفظ کے ترجمہ میں یا کسی ترکیب کے سلجھانے میں اپنی اس عربی سے ان کو کوئی ایسی بات ہاتھ آجاتی ہے جو نسبتاً اس مقام کے لیے زیادہ موزوں ہو تو پھر کیا ہے۔ اپنی عربیت و ادبیت کی شان میں قصیدہ خوانی کا وہی اسٹیشن قرار پاتا ہے، اُمت کے پچھلوں کی لعنتیں اگلوں پر موسلا دھار بارش بن کر برسنے لگتی ہیں، حالانکہ صاف بات یہ تھی کہ عربی زبان کا یہ حصہ بجائے خود ایک قیمتی اور قابل قدر چیز ہے، لیکن نصاب میں اس کی حیثیت لازمی مضامین کی نہیں تھی۔ اس لیے جیسا کہ بزرگوں کا طریقہ تھا کہ اختیاری مضمون کی حیثیت سے اگر کوئی اس عربی کو پڑھنا چاہتا تھا، تو اس کے لیے درس و مطالعہ دونوں ہی کی راہیں کھُلی ہوئی تھیں، لیکن بلا وجہ لفظی مغالطوں سے لوگوں کو متاثر کر کے سارے قرآن و حدیث فقہ و کلام کو اسی عربی دانی پر موقوف کر دینا، اور نصاب میں سب سے زیادہ اسی کو اہمیت دے کر لازمی مضامین سے بھی زیادہ اس پر زور دینا، کسی کو اس سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن ہر طالب العلم پر اس کے پڑھنے پڑھانے اور مشق و مزاولت کو فرض عین قرار دینا، غالباً صرف ایک زبردستی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اس طبقہ کی یہ زبردستی کب ختم ہوگی

جہاں تک میں سمجھتا ہوں قدیم نظامی نصاب کے متعلق اس زمانہ میں جو اصلاحی قدم اٹھایا گیا ہے زیادہ تر اس کا تعلق ان ہی دو چیزوں سے ہے، تیسری بات جس کا مطالبہ تو مدتوں سے جاری ہے، لیکن عملی حیثیت سے اب تک لوگوں کی توجہ اس کی طرف جیسی کہ چاہیے نہیں ہوئی ہے،

Marfat.com

وہ جلالین بیچاری کا لطیفہ ہے، کہا جاتا ہے کہ قرآن کے متعلق اس نصاب میں صرف یہی ایک کتاب داخل ہے جس کے الفاظ قریب قریب قرآنی الفاظ کے ہم عدد ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اگر یہ مطلب ہے کہ اس کے الفاظ کے معانی اور جملوں کا سادہ مطلب لوگوں کی سمجھ میں آجائے، تو اس کے لیے جلالین کیا میرے نزدیک تو صرف قرآن کا سادہ ترجمہ بھی کافی ہے، بلکہ جلالین دراصل قرآن کے عربی ترجمہ ہی کی ایک شکل ہے مشکل الفاظ مشکل ترکیبوں کو اس میں حل کردیا گیا ہے، کہیں کہیں کوئی تقتہ طلب بات ہوتی ہے تو اجمالاً اس کا بھی ذکر کردیا جاتا ہے، اس حد تک یقیناً جلالین کافی ہے۔

لیکن اگر قرآن فہمی سے مقصود قرآنی حقائق و معارف تک رسائی ہے تو یوں کہنے کے لیے جس کے جو جی میں آئے کہہ سکتا ہے مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس کی د حد ہے نہ انتہا، تیرہ سو سال سے قرآن پڑھا جا رہا ہے، کوشش اس کے سمجھنے کی جاری ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اب تک کتابوں میں بیان کیا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے، جو ابھی نہیں بیان کیا گیا ہے، وہ ایک بے تھاہ کتاب ہے جس کا نہ اور ہے نہ چھور، ایسی صورت میں مناسب تو یہی ہے کہ سیدھے سادے معانی اور قرآن کا جو ظاہر مطلب ہو سکتا ہے، بس طلبہ کو درشا یہ پڑھا دیا جائے اس کے بعد چھوڑ دیا جائے بندے کو اور اس کے خدا کو اپنے اپنے ظرف کے حساب سے جس کے لیے جتنا مقدر ہے وہ علم کے اس سرچشمہ سے قیامت تک پیتا چلا جائیگا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قرآن کے متعلق مشہور روایت کے الفاظ

لا یخلق علی کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہ (ترمذی وغیرہ)	قرآن بار بار دہرانے سے پرانا نہیں ہوتا اس کے عجائبات ختم نہیں ہونگے۔

ایک ایسا تجربہ ہے جس کی توثیق تجربہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے، آج کیا عہد صحابہ ہی سے یہ بات چلی آتی ہے، بخاری ہی میں ہے کہ عبداللہ ابن عباس یہ فرماتے تھے۔

کان عمر یدخلنی مع اشیاخ بدر	حضرت عمر مجھے بے کہن سال صحابیوں کے ساتھ اپنی

Marfat.com

فکان بعضهم وجد فی نفسه
فقال لم تدخل هذا معنا
ولنا ابناء مثله فقال عمر
انه من علمتم فدعاه ذات
یوم فادخله معهم فما رئیت
انه دعانی یومئذ الا لیریهم
فقال ما تقولون فی قول
الله تعالی اذا جاء نصر الله
والفتح، فقال بعضهم امرنا
ان نحمد الله ونستغفره اذا
نصرنا وفتح علینا وسکت
بعضهم فلم یقل شیئا فقال
لی کذلک تقول یا ابن عباس
فقلت لا قال فما تقول قلت
هو اجل رسول الله صلی
الله علیه وسلم اعلمه له قال
اذا جاء نصر الله والفتح
فذلک علامة اجلک فسبح
بحمد ربک واستغفره
انه کان توابا فقال عمر ما
اعلم منها الا ما تقول.

مجلس میں جگہ دیتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا بعضوں کو احساس ہوا، اور بولے کہ لڑکا ہم لوگوں کے ساتھ کیوں شریک مجلس کیا جاتا ہے، حالانکہ اس عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں حضرت عمر نے فرمایا کہ ابنِ عباس کے متعلق تم جانتے ہو کہ وہ کن میں سے ہے، بہرحال ایک دن ابن عباس کو خاص کر حضرت عمر نے بلوایا اور ان ہی بزرگ صحابیوں کی مجلس میں ان کو شریک کیا (ابن عباس کہتے ہیں کہ جس وقت مجھے اس طریقہ سے بلایا گیا اسی وقت میں سمجھ گیا کہ حضرت عمر نے آج مجھے اسی لیے بلایا ہے تاکہ میں ان لوگوں کو کچھ دکھلاؤں (ابن عباس حسب الحکم حاضر ہوئے حضرت عمر نے مجلس کو مخاطب کر کے پوچھا) خدا کا قول "اذا جاء نصر اللہ والفتح" جو قرآن میں ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ جواب میں بعضوں نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہم حمد کریں اور اپنے گناہوں کی مغفرت اس سے چاہیں، جب خدا کی مدد آگئی اور ہمارے منشاء کے مطابق (مکہ) فتح ہوگیا۔ یہ تو بعضوں نے کہا اور بعضوں نے سکوت اختیار کیا، کچھ نہ بولے، اب حضرت عمر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم بھی ابن عباس یہی کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی نہیں حضرت عمر نے کہا تو پھر تم کیا کہتے ہو، میں نے عرض کیا۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے، خدا نے حضور کو اس سے مطلع کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی مدد آگئی اور (مکہ) فتح ہوگیا تو یہ تمہاری وفات کی نشانی ہے، اس لیے چاہیے کہ اللہ

Marfat.com

کی تعریفوں کی پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت چاہو، کیونکہ اللہ توبہ
قبول کرنے والا ہے۔ تب حضرت عمرؓ نے کہا میں بھی اس آیت کے متعلق
نہیں جانتا لیکن وہی بات جو تم نے کہی۔

حالانکہ جن بزرگوں نے سکوت فرمایا اور کچھ نہ کہا، یا جنہوں نے جو سیدھا سادہ مطلب تھا وہ بیان کیا، یہ سب کے سب "اشیاخ بدر" ہی معلوم ہوتے ہیں، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان سے چھوٹے ہیں مگر جہاں

مثل امتی کالمطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ (صحاح)

میری اُمت کی حالت بارش کی ہے، کچھ نہیں بتایا جا سکتا کہ مفید بارش کا پہلا حصہ ہوگا یا آخر کا۔

کا قانون ہو، وہاں اس میں کیا حرج ہے کہ کسی چھوٹے کی نگاہ وہاں پہنچ جائے، جہاں بڑے کی نہ پہنچی ہو، اور یوں بھی قریب ہو، بابلندی کے مدارج کا ان کا مدار تو اخلاص و صداقت پر ہے، یہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن کا مطلب ایک مولوی خوب طرارے سے بیان کرتا ہو، لیکن خدا کے پاس اس کی کوئی وقعت نہ ہو، اور ایک جاہل ناخواندہ مخلص مومن حق تعالیٰ کی نگاہ میں اپنے باطنی اخلاص کی بنیاد پر مدارج عالیہ کا مستحق ہو، آخر جن بزرگوں کی نظر سورۂ اذاجاء کے اس پہلو پر نہ تھی، جس کی طرف ابن عباس نے اشارہ کیا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس کی تصدیق فرمائی، کیا محض اس وجہ سے ان کا جو کام بدری صحابی ہونے کی وجہ سے تھا، اس میں کوئی کمی پیدا ہو جائیگی، دراصل ابن عباس کے اس اثر سے جو بخاری میں ہے اب بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے، جو قرآن فہمی کی مختلف صورتوں میں عام لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، قرآن کے بینات سے ایک بات ایک شخص کی سمجھ میں آرہی ہے مگر اس کو روکا جاتا ہے کہ جو بات پہلوں نے اس آیت سے نہیں سمجھی تمہاری سمجھ میں اگر وہ آبھی رہی ہو تو نہ سمجھو

خیر یہ ایک جداگانہ بحث ہی میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن فہمی کی جو یہ دوسری صورت ہے درس کے ذریعہ سے اس کا احاطہ ناممکن ہے، اور سیدھے سادے مطلب کے لیے کوئی سی

Marfat.com

چھوٹی موٹی تفسیر جلالین، مدارک، بیضاوی کافی ہی، سو آپ سن چکے ہیں کہ اسلامی ہندوستان کے ابتدائی عہد میں تو یہاں کشاف ہی پڑھائی جاتی تھی، لیکن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہی کہ جب معقولات کی کتابوں کا بوجھ زیادہ بڑھ گیا، تو بجائے کشاف کے جلالین رکھ دی گئی اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے بیضاوی کے سورۂ بقرہ کو کافی خیال کیا گیا۔ اس لحاظ سے جہاں تک میرا خیال ہی، ہی بھی یہ کافی، رہا تفسیروں کا وہ سلسلہ جس میں قصص و حکایات یا اسرائیلیات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہی، پہلی بات تو یہی ہی کہ حدیث پڑھنے والوں کے لیے ان روایتوں کا سمجھنا ظاہر ہی کہ کچھ دشوار نہیں ہی، علاوہ اس کے بیس تیس، چالیس چالیس جلدوں والی تفسیروں کا درس یوں بھی کب ممکن ہی، تجربہ بھی بتا رہا ہی کہ جلالین و بیضاوی پڑھنے والوں کو ان تفسیروں کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی، پھر جو چیزیں یوں ہی اُستاد کی اعانت کے بغیر لوگوں کی سمجھ میں آہی رہی ہو، اُس کو خواہ مخواہ اُستادوں سے پڑھنے کی کیا حاجت ہی۔

خلاصہ یہ ہی کہ جہاں تک پچیس تیس سال کے غور و فکر سے میں نصاب کے مسئلہ میں جس نتیجہ تک پہنچا ہوں، وہ یہی ہی کہ تبحر و احاطہ مطالعہ و وسعت معلومات کے لیے نہیں بلکہ اُستاد سے پڑھنے اور درس کی حد تک چند مختصر فقہی متون کے سوا بزرگوں نے دینیات (یعنی حدیث تفسیر، فقہ) کے لیے اگر ان تین کتابوں (جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ و شرح وقایہ) کو کافی خیال فرمایا تھا، تو اس میں اُنہوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، بلکہ اس ذریعہ سے اُنہوں نے تعلیمی نظام کی وحدت کو قائم رکھنے کی جو راہ نکالی وہ ایسی عجیب و غریب بات ہی کہ ہر زمانہ میں اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہی، وہ لعنت جس میں مختلف تعلیمی نظامات کے نفاذ سے کوئی قوم مبتلا ہو جاتی ہی اس سے جب چاہا جائے نجات حاصل کرنے والے نجات حاصل کر سکتے ہیں، میرا مطلب یہ ہی کہ جب تک علوم دینیہ کا اقتدار باقی تھا، اس وقت تک تو دینیات کی جتنی کتابیں چاہیں ہم پڑھا سکتے تھے، لیکن جب زمانہ نے رنگ بدلا، مثلاً وہی حادثہ جو برہان الملک اور صفدر جنگ وغیرہ کے زمانہ میں پیش آیا، یا اس سے بھی زیادہ بدترین حالت

ہیں ہم جو اس وقت گرفتار ہیں، حکومت اور سوسائٹی دونوں میں صرف ان علوم وفنون کی وقعت ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، ایسی حالت میں بآسانی بجائے اس علمی فتنہ کے جس کا تماشا دور حاضر میں ہم کر رہے ہیں، کہ تعلیم کے دو مستقل سلسلے ایک ساتھ ملک میں جاری ہیں ایک طرف جوامع وکلیات یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعلیم اور اُن کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں، اور دوسری طرف دینی مدارس ومکاتب اور اُن کے پڑھے ہوئے علماء وفضلا رہیں، ہر ایک دوسرے کے علم دوسرے کے نقطہ نظر سے ناواقف ہے اور ان کو ناواقف بنا کر رکھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ علم کا دعویٰ دونوں کو ہے، عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہوئے ہیں، ایک نختم ہونے والی کشمکش ہے، جو جاری ہے، ایک صماء بکماء عمیاء فتنہ ہے جس کے مفاسد دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں، ان ہی خانہ جنگیوں میں مسلمانوں کا دین بھی برباد ہو رہا ہے اور دنیا بھی عوام پریشان ہیں کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں، مولوی جب ان کے پاس آتے ہیں تو تعلیم یافتوں کی مغرب زدگیوں، دینی بے باکیوں، غلامانہ ذہنیتوں کا ماتم کرتے ہیں، ان کی منڈی ہوئی داڑھیوں، بود وباش کے یوروپین طریقوں کو شہادت میں پیش کر کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے دلوں میں ان کی نفرت کا بیج بوتے ہیں، ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، بھری مجلسوں میں اُنہیں منبر ومحراب سے رسوا کرتے ہیں اور یہی حال تعلیم یافتوں کا ہے کہ مولویوں کی قدامت پرستیوں، تنگ نظریوں، غربت کی وجہ سے ان کی پست زندگی کے نمونوں پر فقرے کستے ہیں، ان پر چھچھوری حرکتوں کا الزام لگاتے ہیں، مسلمانوں کو معمولی جزئی غیر منصوص مسائل پر طیش دلا دلا کر لڑانے کا انہیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔

ایک طبقہ عوام کی گردنیں پکڑ کر آگے کی طرف ڈھکیل رہا ہے، دوسرا ان ہی بیچاروں کا دامن پکڑ کر پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ علم کے دونوں نمائندے گھر کی اس منحوس لڑائی میں ذلیل ورسوا ہو رہے ہیں، نہ ان کا اثر قائم ہوتا ہے، نہ ان کی بات چلتی ہے مسلمانوں کو

Marfat.com

نہ دین پر عمل کرنے کا موقعہ ملتا ہے، نہ دنیا میں آگے بڑھنے کی توفیق میسر آتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا اگر مسلمانوں کی برباد بھی ہو جائے تو اس سے تسلی مل سکتی تھی کہ دین تو ان کا باقی ہے، لیکن آج تعلیم کے ان دو مختلف الجہت نظام کے مختلف نتائج نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اُس کا آخری انجام یہ دیکھا جا رہا ہے کہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے اندر العیاذ باللہ دین کی نفرت پرورش پا رہی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ جن لوگوں کی رسائی خود بھی دین کے اصلی سرچشموں تک نہیں ہے، اور جن کی رسائی ہے جب ان ہی کا اقتدار عوام کے قلوب سے مٹ رہا ہے، تو کیا بات صرف ان ہی لوگوں تک محدود ہو کر رہیگی، دین کے عالموں کی رسوائی یقین مانئے کہ خدانخواستہ اگر اس کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو لا قدر اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں خود دین کی رسوائی پر اس ناپاک تحریک کا خاتمہ نہ ہو، خاکم بدہن خدانخواستہ اگر ایسا ہوا، اور جو حالات ہیں ان کے دیکھتے ہوئے کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے، تو اس کا الزام کیا صرف کسی ایک ہی طبقہ پر ہوگا،

مصیبت کا احساس سب کو ہے لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ کیا اسکولوں اور کالجوں کے نام نہاد[1] دینیات کے کورس کے اضافہ سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائیگا، یا پھر عربی

---

[1] نام نہاد ہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں زبردستی دینیات کے نام سے کچھ دنوں سے جو مضمون پڑھایا جاتا ہے اُس کا اتنا نفع تو ضرور ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں میں مولویوں کے لیے کچھ نئی جائدادیں قائم ہو گئی ہیں لیکن طلبہ پر اس کا کیا اثر مرتب ہو رہا ہے، یہ افسانہ خود اس مضمون کے پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں سے سُنا جا سکتا ہے، عموماً ان اسکولوں اور کالجوں کے دینیات کے گھنٹے لڑکوں کی تفریح کے گھنٹے بنے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کے اُستادوں کا استعمال ان جدید تعلیم گاہوں میں مفرحات کی حیثیت سے کیا جاتا ہے الا ماشاء اللہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی اور مرکزی مضامین کے ساتھ دینیات کی یہ طفیلی جبری تعلیم بچوں میں عموماً اُلٹا اثر پیدا کر رہی ہے، بجائے اعزاز و اکرام کے دین کی اہانت، تحقیر کا ذریعہ دینیات کی یہ تعلیم بنی ہوئی ہے، رہی انگریزی اور مولویانہ سائنس جن عربی مدارس میں داخل ہوئی ہے اس کے تجربات بھی آپ کے سامنے ہیں، اصلاح نصاب کے سب سے بڑے علمبردار مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے متعلق مختلف ذرائع سے مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ زمانہ اور ماحول کا اثر کہ طلبہ میں تو ان کا باقی نہیں رہتا انگریزی کی شدبد کے بعد دینیات کے طلبہ میں خود اپنے مضامین اپنی موضوعات سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، مذہبی علماء کے مشاغل مثلاً امامت، خطابت وغیرہ کے (باقی بر صفحہ ۲۵۵)

تعلیم گاہوں میں انگریزی کی چند ریڈریں یا روشن خیال مولویوں کے نزدیک جس چیز کا نام سائنس ہے اس مولویانہ سائنس کی تعلیم کا دینی مدارس میں اجرا، اس مرض کا علاج ہے، میں اس کے متعلق "وفی الشمس ما یغنیك عن زحل" کے سوا اور کیا پڑھ سکتا ہوں، عیاں راچہ بیاں، جس سوراخ میں بار بار ہاتھ دینے کے بعد بچھوؤں کے ڈنک کے سوا اور کسی چیز کا تجربہ نہ ہوا اسی سوراخ میں بار بار مسلسل ہاتھ دیے چلا جانا اور تب نہیں تو اب کی جھوٹی اُمیدوں میں تسلی ڈھونڈنا، کیا ایمانی عقل اس پر راضی ہو سکتی ہے ۔ من جرب المجرب حلت به الندامة کے سوا آزمائی ہوئی تدبیروں کے آزمانے کا آخری نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے، مرض کے اسباب کی غلط تشخیص اور اسی غلط تشخیص کی بنیاد پر مریض کا جو غلط علاج ہو رہا ہے اہل بصیرت اس تماشے کو تقریباً پون صدی سے دیکھ رہے ہیں، اور دل ہی دل میں پڑھ رہے ہیں۔

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے   کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

میرے نزدیک تو ان ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہو سکتا ہے، ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ بزرگوں کے سیکڑوں بلکہ اب تو ہزار سال بھی کہا جا سکتا ہے۔ الغرض اپنے طویل تجربوں کے بعد تعلیم کی جو راہ بنا دی تھی اگر اسی راہ پر پھر غور کیا جاتا تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ مشکلات کے حل کی راہ اسی سے پیدا ہو سکتی تھی

یہی بات کہ قدیم نصاب میں دینیات کے مضامین (قرآن، حدیث، فقہ) کو محوری اور اساسی مضمون قرار دے کر درس کے لیے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس جامع حادی، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے دینیات کے لیے پورے نصاب میں جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا، اور اس کے بعد پڑھنے والوں کے لیے ایک وسیع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۴) کام کو مولویوں کا یہ گروہ باوجود مولوی ہونے کے، اپنی شان سے گری ہوئی بات تصور کرتا ہے، میرے خیال میں تو لعنت کی یہ آخری شکل ہے کہ خود اپنے آپ پر آدمی لعنت بھیجنے لگے، وہ خود جو کچھ ہے وہی اُسے

(اسان العصر)

ضرورت نظم نصاب ۱۲

میدان چھوڑ دیا گیا، جس میں جب ضرورت تھی تو فارسی کے نظم و نثر کی بیسیوں کتابوں کی مکتبی زندگی میں اور منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، اصول کلام، ادب عربی کی تقریباً ساٹھ ستر کتابوں کی اعلیٰ عربی تعلیم میں کافی گنجائش نکل آئی، پھر جب تک موقعہ تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی، اور جیسے جیسے زمانہ کا مطالبہ بڑھتا گیا ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی، انہیں لازم قرار دے دیا گیا اور یوں ہی مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی ملاّ، فلسفی ملاّ، مہندس ملا، ادیب ملاّ، شاعر ملاّ، الغرض باوجود ملا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن بن کر نکلتے رہے

کیا بہ سہولت تمام آج بھی بزرگوں کے اسی تعلیمی منہاج کو سامنے رکھ کر ہم حقیقی اور خالص دینیات کے ان اساسی مضامین کی ان ہی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے وہی فارسی جو کچھ دن پہلے ہندوستان کی حکومت کی زبان بھی، اور وہی معقولات جن کی مغل دربار میں قیمت ملتی تھی، بجائے ان غیر دینیاتی مضامین کے عصر حاضر میں حکومت کی جو زبان ہے اور موجودہ حکومت جن علوم و فنون کے پڑھنے والوں کا اپنی ضرورتوں کے لیے مطالبہ کر رہی ہے، ہم زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر، اپنے نصاب میں ان جدید مضامین کو شریک کر کے بجائے فلسفی ملاّ کے سائنسٹسٹ ملا اور بجائے منطقی ملاّ کے سائکولجسٹ ملاّ وغیرہ ملاؤں کی مختلف قسم نہیں پیدا کر سکتے۔

ملائیت کہیے یا دینی علوم ان کے لیے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں، تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لیے یا ایک دینی عالم ہونے کے لیے یہی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہونگی۔

میں نہیں سمجھتا کہ اگر اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی جو مدت اس وقت مقرر ہے یعنی بی اے ہونے کے لیے کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے، اس چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوٰۃ، ہدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی۔

Marfat.com

اور بالفرض ضروری غیر ضروری مضامین کی اسکولوں اور کالجوں میں جو کثرت ہے یعنی وہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جو استاد کے بغیر طلبہ کو نہیں آسکتے، اور ان مضمونوں کو بھی پڑھایا جاتا ہے جنہیں استادوں کے بغیر یوں ہی ہر پڑھا لکھا آدمی پڑھ سکتا ہے اور پڑھتا ہے اگر بدتمیزی کے اس طوفان میں ان تین کتابوں کے لیے جگہ نہ نکل سکتی ہو تو کیوں نہیں ہم اپنے سارے دینی اور دنیوی تعلیمی نظامات کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں، اور اپنا الصاب خود بنائیں، تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہے یعنی دینیات کی کل تین کتابوں کے سوا ملائیت کے نصاب کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا جو محسوس ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر بآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لیے پوری قوت اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں، مثلاً میں نے آپ کے سامنے ابن سینا کے تعلیمی نصاب کا ایک حصہ ابن خلکان سے نقل کیا تھا۔ اگر اسی نمونہ کو سامنے رکھ لیا جائے اور ابتدائی تعلیم کی بنیاد اسی نمونہ پر رکھی جائے ابن خلکان نے لکھا تھا کہ

"دس سال کی عمر تک ابن سینا نے قرآن عزیز اور ادب پڑھا، کچھ عقائد کے مسائل یاد کیے اور حساب الہند و جبر و مقابلہ سیکھا"

حساب الہند سے وہی ہندوستان کے حساب کا قدیم طریقہ مراد ہے جس میں پہاڑے وغیرہ یاد کرا کے آئندہ جمع تفریق تقسیم اور اس کی مختلف قسمیں سکھائی جاتی ہیں، آج کل جس کا نام "میتھمیٹکس" ہے، ممکن ہے ان سارے مضامین کے لیے دس سال کی عمر آج ناکافی ہو، اور یہی بھی یہی بات کہ ابن سینا پر ہر بچہ کو قیاس کرنا بھی غلط ہے، اب بجائے اس کے دس سال کی عمر لکھیے، جو آج میٹرک پاس کر کے کی ابتدائی عمر ہے یعنی اس عمر سے کم سن بچوں کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔

ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ

کیا سولہ سال کی اس مدت میں ابتدائی تین سالوں تک بچوں کو ناظرہ قرآن، اُردو اور حساب و تختی نویسی میں لگائے رکھا جائے اور اس کے بعد اُردو کی جگہ فارسی کی چند کتابیں اُردو ہی کو قوی کرنے کے لیے سال دو سال پڑھائی جائے، اور اس کے بعد بجائے فارسی کے عربی زبان کی تعلیم قرآنی پاروں اور حدیث کے مختصر متن (مثلاً منہیات عسقلانی بلوغ المرام وغیرہ) کسی فقہی متن (مثلاً قدوری) کے ساتھ دی جائے اور اس کو ایک سلسلہ فرض کیا جائے۔ دوسرا سلسلہ حساب کا بدستور باقی رکھا جائے۔ اور تیسرا سلسلہ انگریزی ادب کا شروع کر دیا جائے۔ اگر سات سال سے بھی فرض کیا جائے کہ بچے نے ابجد شروع کی ہے، تو سولہ[۱۶] سال تک پہنچنے کے لیے نو[۹] سال کی مدت ملتی ہے، کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ اس کافی طویل مدت میں حساب اور انگریزی کی قابلیت میٹرک والوں کے برابر نہ پیدا ہو جائیگی۔ اور اسی کے ساتھ قرآن ناظرہ بھی ختم ہو جاتا ہے، چونکہ اُردو فارسی، عربی تینوں زبانوں کی یکے بعد دیگرے تعلیم ہوگی، اور تجربہ شاہد ہے کہ اُردو میں مسلسل اُردو ہی کی کتابوں کے پڑھتے چلے جانے سے چنداں کوئی نفع نہیں ہوتا، پانی میں گویا پانی کو ملانا ہے جس سے کسی نئے مزے اور رنگ کی توقع نہیں ہوسکتی، لیکن اُردو ہی میں قوت پہنچانے کے لیے آپ اُردو کی چند ریڈروں کے بعد بجائے اُردو کی کتابوں کے فارسی کی چند ریڈروں کی تعلیم دیجیے، اور فارسی کو قوی کرنے کے لیے اسی کے بعد فوراً عربی شروع کرا دیجیے، عربی میں بلی چوہے کے قصوں کی جگہ مسلمانوں کے دینی معلومات والی کتابیں یعنی قرآنی پارے فقہی متون میں سے کوئی متن، حدیث کے مجموعوں میں سے کوئی مختصر مجموعہ ان ہی کو عربی ادب سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال کی اس طویل مدت میں ان کاموں کی گنجائش

Marfat.com

کیوں نکل آئیگی۔

یہ صحیح ہے کہ اسلامی عربی (یعنی جس میں مسلمانوں کے دینی علوم ہیں) اس کے لیے بھی نحو و صرف کے قواعد و مسائل کا جاننا ضرور ہے لیکن کسی معمولی مختصر رسالے سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، (حال میں معلم عربی کے نام سے ایک اچھی جامع کتاب اُردو میں شائع ہو چکی ہے) جو کافی ہے، اس کے لیے شرح جامی و عبدالغفور تحریر سنبٹ والی منطقی نحو اور اشتقاق کبیر یا فیلالوجی والے وہ طویل صرفی مباحث جو بچوں کو اس وقت سکھائے جاتے ہیں، جب صغیر صرف کا بھی سمجھنا اور اس کے قاعدوں پر حاوی ہونا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا، قطعاً غیر ضروری ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں اگر حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔

(۱) صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو اُستادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جا سکتیں

(۲) اُردو میں ترقی کرنے کے لیے اُردو ہی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھائے چلا جانا کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کرتا، بلکہ اُردو میں قوت پیدا کرنے کے لیے فارسی اور فارسی میں بچوں کو قوی کرنے کے لیے عربی کا سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

(۳) عربی زبان کے صرف اُسی حصہ کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کے دینی معلومات ہیں، باقی عربی کے دوسرے حصہ کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین کے چاہا جائے تو رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے اختصاصی علما بھی اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کیے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہے لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہے، وہ صرف اسلامی ادبیات ہی والی عربی ہے۔

(۴) اس عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں کے ذریعہ سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعہ سے سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہے کہ یہ یک کرشمہ دو کار ہے

(۵) اسلامی ادبیات والی عربی کے لیے نحوی و صرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں

Marfat.com

کی حاجت نہیں، جو کسی زمانہ میں دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ کے لیے پڑھائے جاتے تھے۔

ان پنجگانہ اصول کو پیشِ نظر رکھ کر اگر نصاب بنایا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال میں میٹرک تک کی انگریزی وحساب کے ساتھ بچوں کے اندر اس کی صلاحیت کیوں نہ پیدا ہو جائیگی کہ آئندہ کلیاتی تعلیم کے نصاب میں قرآن وحدیث وفقہ کی ان تین کتابوں کو بی اے تک کے چار سال میں دوسرے اختیاری ومتناسب مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں جو قدیم درس نظامیہ میں دینیات کی آخری درسی کتابیں ہیں۔ تجربہ بتائیگا کہ انگریزی ادب اور جدید علوم میں سے متناسب علوم کا کوئی گروپ (طائفہ) درس نظامیہ کے ان تین دینیاتی کتابوں کے ساتھ بخوشی جمع ہو سکتے ہیں، پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا، بی اے کے بعد ایم اے کے اختصاصی درجہ میں اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے طلبہ جس فن میں خصوصیت پیدا کرنا چاہیں پیدا کر سکتے ہیں ان خصوصی فنون میں جہاں جدید علوم وفنون میں سے کسی فن وعلم یا زبان وغیرہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے وہیں بآسانی فقہ وحدیث، تفسیر، ادب عربی بلکہ جی چاہے تو کوئی قدیم معقولات (منطق کلام، فلسفہ، اصول) وغیرہ کے مضامین بھی اختیار کر سکتا ہے، یہ ایسا نصاب ہوگا جو طلبہ کے لیے قدیم وجدید علوم والسنہ میں سے ہر ایک کے اندر خصوصیت پیدا کرنے کا ذریعہ فراہم کرتا ہے، اور سب سے اہم اصولی نفع نظامِ تعلیم کی اس وحدت کا یہی ہے کہ ملا ومسٹر، علماء ولیڈر کی باہمی کشمکش کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے، اب جو بھی ملک میں پڑھا لکھا یا صاحب علم وفضل ہوگا، وہ پہلے ملا ہوگا اس کے بعد پھر جس مضمون کو اس نے اختیار کیا ہوگا اُس کا ماہر قرار پائیگا۔ انشاء اللہ اس کے بعد ملا ہی مسٹر ہونگے اور مسٹر ہی ملا ہونگے، علماء ہی لیڈر ہونگے اور لیڈر ہی علماء ہونگے، جیسا کہ بارہ سال کے بارہ سو سال تک یعنی نظامِ تعلیم کی ثنویت (دوئی) سے پہلے مسلمانوں میں عموماً یہی ہوتا رہا۔ ابن رشد ارسطو کی کتابوں کی شرح بھی کرتا تھا، اور اسی کے قلم کی علم فقہ میں وہ قیمتی یادگار ہے جس کا نام "بدایۃ المجتہد" ہے، فقہ کے ہر باب میں ائمہ امصار ومجتہدین امام ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کے مسالک پر قرآن وحدیث وآثار صحابہ کی روشنی میں اتنی اچھی بحثیں کی ہیں کہ مشکل سے

Marfat.com

اس جوڑ کی کوئی کتاب فقہ جامع میں مل سکتی ہے، امام رازی ابن سینا کے فلسفہ کی تشریح بھی کرتے تھے اور وہی قرآن کی وہ معرکۃ الآراء تفسیر بھی کرتے ہیں جو تفسیر کبیر کے نام سے اُمت میں مشہور ہے نہ صرف علماء اہل سنت بلکہ شیعی علماء کا بھی یہی حال ہے، میر باقر داماد فلسفہ کے میدان کا یکہ تاز سمجھا جاتا ہے، لیکن کوئی باور کرسکتا ہے کہ جس نے "الافق المبین" جیسی پیچیدہ الٰہیاتی کتاب لکھی ہو، وہی شارع النجاۃ نامی کتاب فقہ شیعی کی بھی لکھ سکتا ہے، وہی شیعوں کی حدیث کی مشہور کتاب الکافی پر حاشیہ نگاری کا کام کرسکتا ہے، مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں دینی اور دنیوی علوم کے مرکب نصاب کو جاری کرکے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کردی تھی کہ اسی ہندوستان میں ایک زمانہ وہ بھی گذرا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی بھی پڑھنا چاہتا تھا، تو اسے بھی اسی نصاب کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں، اس سے پیشتر حکیم کامراں، دستور، ہمر بد وغیرہ کا ذکر گزر چکا ہے جنہوں نے اسلامی علماء سے درسی کتابیں پڑھی تھیں، حکیم کامراں ان کتابوں کا درس بھی دیتا تھا، ان کے سوا اس ملک کے ہندو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عربی نصاب کو ختم کرتے تھے بداؤنی نے عہد سکندری کے ایک برہمن کا ذکر کیا ہے۔

(ج ۱، ص ۳۲۳)

"یکے از شعراء عہد سکندر لودی برہمن بودمی گویند کہ باوجود کفر کتب علوم رسمی را درس می گفت"

حالانکہ گذر چکا کہ سکندری عہد میں گو دینیاتی کتابوں کے ساتھ معقولاتی عناصر کا اضافہ ہونا شروع ہوچکا تھا، لیکن پھر بھی اتنا اضافہ تو قطعاً نہ ہوا تھا جتنا کہ فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ہوا، خیال کرنے کی بات ہے کہ اس زمانہ میں "علوم رسمی" کی کتابیں جو پڑھاتا ہوگا، کیا وہ بزودی اور ہدایہ وغیرہ نہ پڑھاتا ہوگا، آخر جب حکیم کامراں سے مسلمان طلبہ تفسیر بیضاوی پڑھتے تھے تو کیا تعجب ہے کہ مسلمانوں کے علوم رسمیہ کا یہ پڑھانے والا برہمن ان کتابوں کو نہ پڑھاتا ہو، خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں سے دینیات کا جو کورس بطور متروکہ کے ہم تک پہنچا ہے وہ اتنا مختصر اور چند گنی چنی کتابوں پر مشتمل ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانہ کے تعلیمی نظام میں اس عہد کے مروجہ علوم و فنون کی کتابوں کو ہم ان کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں، اور ایک ہزار سے زیادہ مدت تک ہم نے ان کو غیر دینی علوم کے

ساتھ جوڑے رکھا، اسی بنیاد پر میرے نزدیک دین کی تعلیم کے لیے کسی مستقل جداگانہ نظام کو قائم کر کے مسلمانوں میں علمی انتشار اور دو عملی پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، دینیات کے اسی نصاب کے ساتھ جب مغلئی عہد کے درباری علوم و فنون منطق و فلسفہ، ریاضی، فارسی ادب کے نثر و نظم وغیرہ کی کتابوں کو جوڑ کر ہم نے تعلیمی نظام کی وحدت کو پوری قوت کے ساتھ باقی رکھا، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ آج دینیات کے اسی مختصر کورس کو محور بنا کر عہد حاضر کے ٹکسالی علوم و فنون یا زبانوں کی تعلیم کو اس کے گرد ہم گردش نہیں دے سکتے، جوں ہی کہ زمانہ بدلتا تھا، بزرگوں کے اسی نمونہ کو پیشِ نظر رکھ کر دینیات کے محور کو قائم رکھتے ہوئے ذیلی مضامین کو اگر بدل دیا جاتا یا یہ نہ بھی کیا جاتا، تو مغلیات کو بھی اختیاری مضامین کا ایک گروپ قرار دے کر عصریاتی علوم کا بھی نصاب میں اضافہ کر دیا جاتا، کاش ایسا ہو جاتا تو آج بدتمیزی کے جس طوفان میں مسلمان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، غالباً یہ صورت نہ پیش آتی، ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون۔

لیکن وقت اب بھی اصلاح کا باقی ہے تعلیم کی اس (ثنویت) اور دو عملی کو اب بھی توڑا جا سکتا ہے، اور توحیدی نظام کو اب بھی اس کی جگہ جاری کیا جا سکتا ہے[1] میں تو سمجھتا ہوں

[1] لوگ مصارف کے سوال کو درمیان میں لاتے ہیں، حالانکہ اولاً یہ حکومت ہی کا فرض تھا، جہاں دنیوی علوم و فنون پر وہ کروڑ ہا کروڑ صرف کر رہی ہے، ہر صوبہ میں تھوڑی رقم دینی علوم کے معلمین کی تنخواہوں کے لیے بھی منظور کر سکتی ہے، اور اب تو تقریباً تمام صوبوں میں مشرقی علوم کی تعلیم و امتحان کے نام سے سرکاری مصارف سے ادارے جاری ہو چکے ہیں۔ اور فرض کیجیے کہ حکومت اگر اس پر بھی راضی ہو تو مسلمان اسی رقم کو جو آج وہ ان تعلیم گاہوں پر صرف کر رہے ہیں جن میں ان کے دینیات کے ساتھ مغلی عہد کے السنہ و علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، اسی رقم کو حکومت کے جامعات دیونیورسٹیوں کے حوالہ کر کے اپنی تعلیم میں وحدت پیدا کر سکتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر ہر صوبہ میں مسلمانوں کے جو اوقاف ہیں، حکومت اگر چاہے یا مسلمان حکومت پر زور دے کر اس چاہنے پر اس کو مجبور کریں کہ اوقاف کی اسی مد سے وہ اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کے قدیم نصاب کو جاری کر کے ثنویت کی اس لعنت سے مسلمانوں کو نجات دے تو کیا یہ مطالبہ اس مطالبہ سے بھی زیادہ نا قابل سماعت ہے، جو آج اسی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا ہے یعنی (ا)۔۔ کی حکومت کا چارج ملک والوں کو سپرد کر کے خود بہ یک بینی و دو گوش یہاں سے (باقی بر صفحہ ۲۶۳)

کہ صرف اسلامی فرقے[ف] مثلاً شیعہ وغیرہ ہی نہیں، غیر مذہب کے لوگوں سے اس معاملہ میں مصالحت کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے، مطلب یہ ہے کہ صرف دینیات کی حد تک شیعہ اپنی کتابیں پڑھیں اور دنیوی علوم والسنہ میں ہمارے ان کے اشتراک ہو جیسا کہ قدیم نصاب میں یہی تھا بھی، جس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ بآسانی چل سکتا ہے، پھر کیا یہی طریقہ ہندو بھی نہیں اختیار کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنا ایک مختصر سا مذہبی کورس بنا لیں، اس میں ہم سے الگ رہیں، لیکن دوسرے علوم والسنہ میں ہمارے ساتھ پڑھیں۔ زیادہ سے زیادہ ہندو اگر ہٹ دھرمی ہی سے کام لینگے تو مکتبی اور اسکولی تعلیم میں بجائے اردو، فارسی کے بھاشا، اور بجائے عربی کے سنسکرت کو لے سکتے ہیں، لیکن یہ سارا نظم صرف ایک ہی نظام کے تحت یقیناً بغیر کسی دشواری کے چل سکتا ہے، خود ہندوؤں میں پنڈتوں اور تعلیم یافتوں میں وہی رنگ برپا ہے۔ اس جنگ کے مٹانے کے لیے خود ان کو بھی ضرورت ہے کہ اس دوعملی کے ختم کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔

اب رہا یہ سوال کہ محض یہ بات کہ دینیات کا یہ مختصر کورس (یعنی ہدایہ، وقایہ، جلالین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲) آئی تھی وہاں چلی جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کبھی تو اس مطالبہ کی تکمیل کی بھی امیدیں قائم کی جاتی ہیں اور کبھی اتنی ناامیدی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ تعلیمی نظام کی اصلاح بھی نہیں ہو سکتی ۱۲۔

[ف] چند عامۃ الورود مغالطوں میں ایک بڑا مغالطہ مسلمانوں کی فرقہ بندی کا بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چالیس پچاس کروڑ مسلمانوں میں اہل السنت والجماعت کی اکثریت کبریٰ کے بعد بمشکل صرف ایک فرقہ شیعوں کا ایسا اسلام میں پایا جاتا ہے جس پر الگ فرقہ ہونے کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے، ورنہ اہل السنت عقائد و خیالات مسلمات میں باہم متفق ہیں۔ حنفی، شافعی مکاتب خیال فقہی مکاتب ہیں، جن کی بنیاد پر فرقہ بندی پیدا نہیں ہوتی حنفی و شافعی مالکی و حنبلی مسلمانوں کا سب سے بڑا روحانی پیشوا یعنی شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جب حنبلی ہیں اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ان اختلافات کی کیا نوعیت ہے۔ واقعۃً خود حنفی مسلک میں ابو یوسف، امام محمد وغیرہما ائمہ کے اختلافات سے الگ فرقے پیدا نہیں ہوتے اسی طرح مالکیت شافعیت سے بھی الگ فرقے نہیں بنتے۔ اسلام کا میرے خیال میں یہ معجزہ ہے کہ پچاس ساٹھ کروڑ انسانوں کی برادری میں اس نے ایسی ہمرنگی پیدا کی ہے کہ شیعوں کو الگ کرنے کے بعد سب ایک ہو جاتے ہیں، اور شیعوں کی تعداد بمشکل سو میں ایک ہوگی، ایسی اقلیت کس حد تک قابل توجہ۔

Marfat.com

ومشکوٰۃ) والا نصاب چونکہ بزرگوں کا متروکہ ہے اور صدیوں کم ازکم ہندوستان کی حد تک دینیات کے نصاب میں ان ہی کتابوں یا ان جیسی دوسری کتابوں کو دینیات کے درجہ ضروری کے لیے نہیں بلکہ درجہ فضل کے لیے کافی سمجھا گیا، کیا اس کی دلیل ہوسکتی ہے کہ صرف ان چند کتابوں کو پڑھا دینا اور پڑھ لینا آئندہ دینیاتی علوم میں مہارت و تجرید اکرنے کے لیے کافی ہے؟ بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے جواب میں دو باتیں پیش کی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ نتائج سے کفایت و عدم کفایت کا فیصلہ کیا جائے۔ یا یوں کہیے کہ پھل سے درخت کو پہچانا جائے قطع نظر اس سے کہ ہندوستان میں سو ڈیڑھ سو سال نہیں بلکہ تقریباً چھ سات سو سال تک دین کا سارا کاروبار دینیات کے اسی مختصر نصاب کے پڑھنے والوں نے انجام دیا ہے قضا و افتار، صدارت جیسی تمام مذہبی خدمات کو یہی لوگ قطب الدین ایبک کے زمانہ سے بہادر شاہ کے زمانہ تک بلکہ جب تک انگریزی حکومت کے محکمے مسلمان قاضیوں اور صدور کے ہاتھوں میں رہے، اس وقت تک یہی لوگ انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں حدیث کا تفسیر کا، فقہ کا جتنا کام ہوا، اسی مختصر نصاب کے پڑھنے والوں کے ہاتھوں ہوا جس کی تھوڑی بہت تفصیل گذر چکی ہے، لیکن ان گذرے ہوئے ہندی علماء کے متعلق تو شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں جب ان علماء کے مقابلہ میں کوئی دوسرا تھا ہی نہیں تو کیا کہا جاتا اپنے وقت کے رازی اور غزالی ان ہی کو سمجھا گیا، اس لیے اس بحث میں پڑنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا کہ اسی مختصر دینی نصاب کے پڑھنے والوں نے ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک جہاں کا ثنا جاتا ہے کہ دینی نصاب عریض بھی ہے اور طویل بھی ہے، ان ہی ممالک میں ان ہندی علماء نے مختلف قرون اور صدیوں میں اپنے آپ کو جو کچھ ثابت کیا ہے اس کی چند تاریخی شہادتیں پیش کردوں۔

یہاں میں پھر یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندی نظام تعلیم میں نصاب کی حد تک رد و بدل جو کچھ ہوا اور ہوتا رہا ہے اس کا زیادہ تر تعلق غیر دینی علوم سے ہے، ورنہ بہ تفصیل بتایا جاچکا ہے کہ دینیات

کی حد تک کتابوں کا معیار تقریباً ہر زمانہ میں مساوی رہا ہے، نصاب کے اس حصہ میں کچھ تغیر اگر ہوا ہے تو صرف کتابوں کی حد تک محدود ہے، مثلاً فقہ میں پہلے ابن الساعاتی کی مجمع البحرین تھی، بعد کو بجائے مجمع البحرین کے شرح وقایہ شریک ہوئی، اسی طرح حدیث میں پہلے مشارق ومصابیح تھی ان ہی جگہ مشکوٰۃ نے لی، جاننے والے جانتے ہیں کہ مضامین کی حد تک معیار پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑا، البتہ تفسیر میں پہلے درجہ فضل کی کتاب "کشاف" تھی، بعد کو "کشاف" عمومی نصاب سے خارج ہوگئی اور اس کی جگہ جلالین کامل وبیضاوی سورۂ بقرہ نے لے لی، جس کے یہ معنی ہوئے کہ پچھلے زمانہ کے اعتبار سے تفسیر کے درس کا معیار کچھ گھٹ گیا، لیکن نتائج کا جہاں تک تعلق ہے، قرآن کے باب میں ہندوستان کی پچھلی صدیوں کا کام اگلی صدیوں سے یقیناً بہتر ہے۔ رہا ہدایہ سو اول سے آخر تک آج چھ ساڑھے چھ سو سال سے ایک حال میں قائم ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دینیاتی حصہ میں نصاب کا یہ تغیر کتنا معمولی تغیر ہے، قریب قریب کتابوں کی تعداد بھی دینیات میں برابر برابر ہی رہی، اور معیار بھی برابر ہی رہا ہے، اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ کے سامنے ان چند ہندوستانی مولویوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان سے باہر نکل کر اسلامی ممالک میں پہنچے ہیں، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا، کہ دینیات کے اسی مختصر نصاب کے نتائج کتنے عجیب اور حیرت انگیز بلکہ شاید مدہش ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر ان لوگوں کا تذکرہ تو بے محل ہی ہوگا جو نسلاً یا وطناً ہندوستانی تھے لیکن ان کی تعلیم بیرونی ممالک میں ہوئی، بلکہ ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہ کرونگا، جن کی تعلیم کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تکمیل ہوئی، ہندوستان میں یا ہندوستان سے باہر؟[1] بلکہ

[1] مثلاً سندھ کے علماء شیخ حیات سندھی شیخ عابد سندی، یا ہندوستان کے علماء جیسے علامہ مرتضیٰ زبیدی شارح قاموس وغیرہم اسی قسم کے حضرات ہیں، علی الخصوص علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی جو عموماً زبید کی طرف غلطی سے منسوب ہیں، گو ان کے متعلق عام کتابوں میں بھی لکھا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باہر پڑھا جو کچھ پڑھا، لیکن بعض (بقیہ بر صفحہ ۲۶۶)

Marfat.com

اس موقعہ پر صرف ان ہی بزرگوں کو شہادت میں پیش کرونگا جن کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہو کہ اُنھوں نے جو کچھ پڑھا، ہندوستان ہی میں پڑھا۔ آئیے، اور تاریخ اس باب میں جو کچھ کہتی ہو اُس کا تماشہ کیجیے، ساتویں صدی کا زمانہ ہو، یہ مصر ہو، یہاں اسلام کی عمر چھ سات سو سال سے زیادہ گذر چکی ہو، کابرًا عن کابر نامی گرامی علماء اس ملک میں مسلسل پیدا ہوتے رہے ہیں، خصوصًا جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ وقت ہو کہ سارے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں مصر کے متعلق مشہور مورخ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

ولا اوفر الیوم فی الحضارۃ من مصر فہی ام العالم وایوان الاسلام وینبوع العلم والصنائع

آج (یعنی ساتویں اور آٹھویں کے درمیانی زمانہ میں) مصر سے زیادہ حضارت (اسلامی کلچر) کا سرمایہ دار کوئی نہیں ہو، مصر ہی اس زمانہ میں مادر جہاں ہو، وہی اسلام کا ایوان ہو، علم اور صنائع کا آج وہی سرچشمہ ہو۔

(مقدمہ ص۳۴۹ مطبوعہ مصر)

اور آخری بات یہ ہو کہ یہیں ازہر کا مشہور بین العالمی اسلامی جامعہ ہو، اسی قدیم اسلامی ملک میں ہندوستان کا ایک عالم پہنچتا ہو اس کا نام سراج ہندی ہو جس کی تعلیم اسی نومسلم ملک ہندوستان میں پوری ہوئی ہو، علامہ طاش کبری زادہ مفتاح السعادہ میں لکھتے ہیں۔

تفقہ ببلادہ علی الوجیہ الرازی و السراج الثقفی والرکن البدایونی

سراج ہندی نے خود اپنے وطن (ہندوستان) میں علم وجیہ رازی اور سراج ثقفی رکن بداؤنی وغیرہ ہندی علماء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵) کتابوں سے معلوم ہوتا ہو کہ علامہ مرتضیٰ الہ آباد کے مشہور عالم مولانا فاخر اور حضرت شاہ ولی اللہ کو پڑھنے کے بعد یمن وغیرہ گئے، مدت ہوئی ایک مستقل مقالہ مولانا کے متعلق معارف اعظم گڈھ میں فقیر نے لکھا تھا، مولانا کو جو علمی امتیاز آخر زمانہ میں ممالک اسلامیہ خصوصًا حجاز، یمن اور بالآخر مصر میں حاصل ہوا، خود ان ممالک کے علماء میں اس کی نظیر مشکل سے پیش ہو سکتی ہو، بڑے بڑے سلاطین حتیٰ کہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں انار اللہ برہانہ اور ان کے وزیر صدر اعظم محمد پاشا نے تبرکًا ان سے حدیث کی سند حاصل کی، ان کی کتابوں کے نقول بڑے بڑے بادشاہوں نے منگوائے، مصر میں حدیث کا حلقہ ان کا خوب بڑا ہوتا تھا، اور جس شان کے ساتھ ہوتا تھا کہتے ہیں کہ چشم فلک نے اس تماشے کو مصر میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

Marfat.com

وغیرھم من علماء الھند (مفتاح ص۵۹) سے حاصل کیا۔

حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے۔

کان قدومہ بالقاھرۃ قبل الاربعین[1] وھو متاھل للعلم (درر کامنہ ج ۲ ص ۱۵۴)

قاہرہ میں ان کی تشریف آوری چالیس سے پہلے اس وقت ہوئی جب وہ علم والے ہو چکے تھے،

جس کا یہی مطلب ہوا کہ "اہل علم" بن کر مصر پہنچے تھے۔ اب سُنیے ہندوستان کے اس مختصر دینی نصاب کو پڑھ کر مصر پہنچنے والا ہندی عالم اپنے علمی کمال کی بدولت کہاں پہنچتا ہے حافظ ابن حجر ان کے عام عالمی مناصب کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

ولی قضاء العسکر وناب فی القضاء عن جمال الدین ابن الترکمانی مدۃ طویلۃ

عسکر کے قاضی ہوئے اور جمال الدین بن ترکمانی کی طرف سے نائب قاضی کا کام ایک زمانہ تک انجام دیا

مگر بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ

ثم ولی القضاء استقلالاً فی شعبان سنۃ ۷۶۹ بعد موت ابن الترکمانی

پھر سنہ ۷۶۹ھ شعبان میں قضا کے اس عہدہ پر مستقل طریقہ سے مقرر کیے گئے جب ترکمانی کا انتقال ہو گیا۔

یعنی حنفیوں کے مستقل قاضی القضاۃ ہو گئے، اور کیسے قاضی القضاۃ؟ مصر پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے شافعی علماء کا اقتدار قائم رہا اور بتدریج یہ اقتدار بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ایک خاص قسم کا امتیازی نشان جس کا الطرحہ (غالباً ٹوپی یا دستار میں کوئی پھندنا ہوتا تھا) نام تھا، صرف شافعی قاضی کے لیے مختص تھا، اسی کے ساتھ یہ اختصاص بھی شافعیوں نے حاصل کر لیا تھا کہ پایۂ تخت قاہرہ تک تو حنفی قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوتا تھا لیکن اضلاع اور مفصلات میں قاضی القضاۃ کی طرف سے قاضیوں کا تقرر صرف شافعی قاضی القضاۃ شافعی علماء کو کر سکتا

[1] اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ آٹھویں صدی کے چالیسویں سال سے پہلے آئے لیکن طاش کبری زادہ نے مصر میں ان کے داخلہ کا سنہ ۷۰۰ھ لکھا ہے اسی لیے میں حافظ کے کلام کا یہ مطلب لیتا ہوں کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے وہ مصر پہنچے سراج ہندی کی ولادت ۷۰۴ھ میں ہوئی جس کا حاصل یہ نکلا کہ چھبیس سال کی عمر ہوگی جب وہ مصر میں داخل ہوئے۔

تھا، حنفیوں کو اضلاع میں قاضیوں کے تقرر کرنے کا حق نہ تھا، نیز یتیموں کے مال کی نگرانی کا حق بھی صرف ان ہی شافعی قاضیوں کو حاصل تھا، خواہ وہ یتیم حنفی خاندان سے ہی تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، صدیوں کا یہ قائم شدہ رواج ایسا تھا کہ شافعی قضاۃ کے ان مسلّمہ حقوق میں دست اندازی کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن پہلا حنفی عالم جس نے ان سارے ناواجب حقوق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے حنفی علماء کو ان کے چھینے ہوئے حق تک پہنچایا، وہ ہندوستان کا یہی عالم تھا جس کے علمی رعب داب کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑا، اور ملک کے اتنے قدیم رواج کو توڑنا پڑا، حافظ ابن حجر جو خود بھی شافعی اور اچھے خاصے متعصب شافعی ہیں اپنی کتاب دُرر کامنہ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

وکان قد تکلم اهل الدولة واستنجز	سراج ہندی نے ارباب حکومت کو توجہ دلائی اور فرمان
توقیعاً ان یلبس الطرحة نظیر القاضی	حاصل کیا کہ شافعی قاضی کی طرح وہ بھی الطرحہ[1] پہن سکتے
الشافعی و ان یستنیب فی البلاد المصریة	ہیں، اور مصری بلاد میں اپنے نائب کا تقرر کر سکتے ہیں
ویجعل له موجاً علا یتام الحنفیة	اور حنفی خاندان کے یتیموں کی جائداد کی نگرانی بھی ان
(درر، ج ۳ ص ۱۵۵)	کے سپرد ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس حنفی عالم نے مصر میں ایک زلزلہ برپا کر دیا، حافظ نے لکھا ہے کہ اس شخص نے صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہ کی بلکہ

وتکلم فی نظر جامع ابن طولون و	ابن طولون کی جامع کی نگرانی کے متعلق بھی حکام سے انہوں
استعاد الوقف الطرحی من نقیب	نے گفتگو کی، اور نقیب الاشراف سے وقف طرحی کی تولیت
الاشراف (ج ۳ ص ۱۵۵)	واپس کرائی۔

اسی قسم کے کتنے معرکۃ الآراء اقدامات سراج ہندی کی طرف سے عمل میں آئے ہیں، ان کی فہرست بہت

---

[1] الطرحہ غالباً ایک قسم کی چادر کا نام تھا جو عالمانہ لباس کا ایک جز تھا ۱۲۔

طویل ہو، حافظ نے ان کی علمی جلالت شان کا تذکرہ کرتے ہوئے باوجود اس دل گرفتگی کے جو طبعاً ہونی چاہیے اقرار کیا ہو۔

کان مستحضرا لفروع مذھبہ — اپنے مذہب کے جزئیات ان کو مستحضر تھے۔

یہ حال تو خیر اپنی فقہ حنفی کے متعلق تھا، مصر جیسے منبوع العلوم اور ایوان اسلام میں اسی مختصر دینیاتی نصاب کے تعلیم یافتہ عالم نے مصر کی مرکزی مسجد جامع ابن طولون میں مدتوں قرآن کا درس دیا، حافظ نے بھی تصریح کی ہو کہ۔

اضیف الیہ تدریس التفسیر بالجامع الطولونی لما مات البسطامی فی سنۃ ۷۷۰ھ — یعنی بسطامی کا جب ۷۷۰ھ میں انتقال ہوگیا تو جامع طولونی کے درس تفسیر کا بھی حکومت نے ان ہی سے تعلق کر دیا۔

باوجود ہندی ہونے کے عربی زبان کی بول چال پر ایسی قدرت تھی کہ اس کا تذکرہ امتیازاً کیا گیا، حافظ نے سراج ہندی کی اخلاقی جرأت جو علمی کمال کا عموماً نتیجہ ہوتا ہو، ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو۔

کان شھما مقداما فصیحا لہ خطوۃ عند الامراء۔ — وہ بڑے جری آگے آگے رہنے والے فصیح بلیغ آدمی تھے، امراء دولت کی نگاہوں میں ان کی بڑی عزت تھی،

ایسا معلوم ہوتا ہو کہ مصر میں کوئی زبردست حویلی یا کوٹھی بھی انہوں نے بنوائی تھی، کوئی معمولی مکان ہوتا تو اس کے ذکر کی کیا حاجت ہو، درر میں ہو ا۔

وعمر دارہ التی بوجھۃ العید — عیدگاہ کے میدان میں دار (محل) تیار کیا

سراج ہندی کے متعلق یہ شہادتیں تو خیر تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں، لیکن ان کے سوا بھی ان کی علمی رفعت شان، خصوصاً اسلامی علوم میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا، اس کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہو سکتا ہو جن کے متعلق حافظ ہی نے لکھا ہو۔

صنف التصانیف المبسوطۃ — بڑی بڑی طویل کتابوں کے مصنف ہیں

خصوصاً ہدایہ کی شرح توشیح نامی ان کی طویل کتاب ہو، حافظ اس شرح کا تذکرہ فرماتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ

وھو مطول ولہ یکمل — یہ بڑی طویل شرح اگرچہ مکمل نہ ہوسکی۔

طاش کبری زادہ نے اس شرح کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ

وھو علی طریق الجدل — اس میں جدل وبحث، کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی استدلالی شرح ہے۔ اس کے سوا بھی ان کی بیسیوں کتابیں فقہ و اصول فقہ، خلافیات، جدلیات میں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام محمد بن حسن الشیبانی کی زیادات نیز جامع صغیر و کبیر کی بھی انہوں نے شرحیں لکھی ہیں، حالانکہ قدماء کی ان کتابوں سے عام علماء کا کم تعلق رہ گیا ہے، ایک مستقل کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں بھی انہوں نے لکھی ہے جس کا نام "العزۃ المنیفہ فی تائید مذہب ابی حنیفہ" ہے۔ بہ ظاہر میرا تو خیال ہے کہ آٹھویں صدی کا زمانہ مصر میں وہ زمانہ ہے جس میں ہم حنفی علماء میں ایک خاص انقلاب پاتے ہیں، اسی زمانہ میں وہاں سے "الجوہر النقی" کے مصنف علاء الدین الترکمانی اٹھتے ہیں، اور اسی زمانہ سے بالکل متصل مصر ہی میں ابن ہمام پیدا ہوتے ہیں، جنہوں نے حنفیوں میں حدیث کا مذاق پیدا کیا۔ آج علماء احناف کا بڑا سرمایہ ابن ہمام کی شرح ہدایہ ہے، کاش! اس پر کام کرنے والے کام کرتے تو شاید اس کی سراغ یابی میں دشواری نہ ہوتی کہ مذاق کے اس انقلاب کے پیچھے کیا اسی ہندی عالم کا ہاتھ کام کر رہا ہے، صاحب جوہر النقی اور ان کے خاندان سے تو ان کا تعلق بالکل بدیہی ہے۔ اسی کے ساتھ ہندوستان سے جو خاص تحفہ مصر سراج ہندی لے گئے ہیں، وہ تصوف کا مذاق خصوصاً وحدت الوجود کے نظریہ کی تشریح ہے، تصوف کے متعلق ان کی مستقل کتاب بھی ہے۔ طاش کبری زادہ نے سراج ہندی کے متعلق یہ لکھ کر

کان واسع العلم کثیر الاقدام و المھابۃ — ان کا علم بہت وسیع تھا، پیش قدمی میں جری تھے۔ جلال و ہیبت والے تھے۔

ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

کان یتعصب للصوفیہ — وحدت الوجود والے صوفیوں کی بڑی سخت
الملاحدۃ — حمایت کرتے تھے۔

بلکہ یہ بھی لکھا ہو کہ ابن جملہ کوئی مصری عالم تھا، سراج ہندی نے
عزرہ لکلامہ فی ابن — اس کو سزا اس لیے دی کہ ابن الفارض کے
الفارض — کلام پر اس نے اعتراض کیا تھا۔

غالباً ابن فارض کے قصیدہ تائیہ کی شرح کا تعلق کچھ اسی واقعہ سے ہو، مُلا علی قاری نے ان کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہو جس کا نام لوائح الانوار ہو۔ اس کتاب میں ان لوگوں کی شدت کے ساتھ تردید ہو جو صوفیہ پر منھ آتے ہیں ۷۷۳ھ میں مصر ہی میں وفات پائی، وہیں مدفون ہیں۔ بہرحال ہندوستانی نصاب میں دینیات کے جس حصہ کو قامت میں کہتر خیال کیا گیا ہو، اس کی قیمت کی ان بہتریوں کو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ امتحان تو اس نصاب کا ایوان الاسلام اور ینبوع العلم والصنائع میں ہوا۔

آئیے، اب چلیے، اسلامی علوم و فنون کا دوسرا گہوارہ ان ہی صدیوں میں دمشق ہو، تاتاریوں کے فتنہ سے ماوراء النہر توران ایران عراق کے علمی مراکز برباد ہو چکے ہیں، جن ممالک تک تاتاریوں کا اثر نہ پہنچا ہو، ان میں شام اور مصر بھی ہیں، اس زمانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ علامہ تقی الدین سبکی، شمس الدین الذہبی، ابن قیم جیسے کبار جہابذہ سے دمشق کا دار العلوم معمور ہو۔ ہر طرف علم ہی علم کا چرچا ہو، اسی دمشق میں دینیات کی وہی تین کتابوں کے نصاب کا پڑھنے والا ایک غریب الوطن ہندی داخل ہوتا ہو، ان کا نام شیخ صفی الدین ہو۔ ۶۴۴ھ میں پیدا ہوئے بالاتفاق علماء کا بیان ہو کہ ہندوستان ہی میں

اخذ عن جدہ لامہ — اپنے نانا صاحب سے انھوں نے تعلیم پائی

۲۳ سال کی عمر تھی جب ہندوستان سے باہر نکلے، اور یمن پہنچے، اس وقت یمن میں الملک المظفر کی حکومت تھی، لیکن اس تیئیس سالہ ہندی نوجوان عالم کے دل و دماغ علم و استعداد سے اتنا متاثر ہوا کہ

اکرمہ واعطاہ تسع مائۃ دینار	(جواہر مضیئہ، ج ۱)	اس نے ان کا بڑا اکرام کیا، اور نو سو اشرفیاں پیش کیں۔

طبیعت میں سیر و سیاحت کا شوق تھا، یمن سے مکہ پہنچے، مکہ میں کچھ دن قیام کر کے قاہرہ قاہرہ سے اناطولیہ کے شہروں مثلاً قونیہ، سیواس، قیصریہ وغیرہ میں گھومتے رہے بالآخر اس طویل سیاحت اور ہر ملک کے علماء سے ملنے جلنے کے بعد جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وقدم دمشق فاستوطنھا	دمشق آئے اور اسی کو وطن بنالیا۔

دمشق جن علماء سے اس وقت بھرا ہوا تھا، اس کا ذکر آپ سن چکے، ان ہی علماء کے سامنے اسی مختصر دینیاتی نصاب کا عالم بیٹھتا ہے، اور

عقد حلقۃ الاشتغال بالجامع ودرس بالرواجیہ والاتابکیہ والظاھریہ الجوانیہ وغیرھا (درر، ج ۴)	بنی امیہ کی جامع میں درس کا حلقہ قائم کیا اس کے سوا رواجیہ۔ اتابکیہ ظاہریہ جوانیہ وغیرہ مدارس میں بھی درس دیتے رہے۔

یعنی دمشق کی مشہور جامع اموی میں درس کا حلقہ قائم کر دیا، جو اس زمانہ کے لحاظ سے معمولی بات نہیں ہے، اور ایک جامع اموی ہی نہیں، اور بھی دمشق کے متعدد مدارس میں پڑھاتے رہے، تاج الدین سبکی نے طبقات میں ان کے متعلق یہ لکھ کر

اعلم الناس بمذھب ابی الحسن وادراھم باسرارہ متضلعا بالاصلین	امام ابوالحسن اشعری کے مذہب کے (اس زمانہ میں) سب سے بڑے عالم تھے، اور دونوں اصول یعنی اصول فقہ و کلام سے سیراب تھے۔

Marfat.com

یہ سبکی کی اپنی چشم دید گواہی ہے۔ بہر حال اس کے بعد لکھا ہے کہ دمشق میں اس شخص نے

شغل الناس بالعلم — لوگوں کو علم میں مشغول کر دیا۔

تدریس کے ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سبکی ہی کا بیان ہے،

ومن تصانيفه فى علم الكلام الزبدة وفى اصول الفقه النهاية والفائق والرسالة السبعية وكل مصنفاته حسنة جامعة لاسيما النهاية

ان کے تالیفات میں سے ایک کتاب زبدہ نامی علم کلام میں ہے، اور النہایہ وفائق اصول فقہ میں ہے، رسالہ سبعیہ بھی ان کی ایک کتاب ہے بہر حال ان کی ساری کتابیں بہت اچھی اور جامع ہیں، خصوصًا النہایہ

دمشق کے علماء اس ہندی کے علم کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اولًا تو اس کے لیے یہی بات کافی ہو سکتی ہے، جیسا کہ سبکی ہی نے لکھا ہے۔

روى عنه شيخنا الذهبى — ہمارے استاد الذہبی ان سے روایت کرتے ہیں۔

یعنی ذہبی جیسے امام علامہ ان کے شاگرد ہیں، مگر میں نے جس مقصد کے لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، یعنی ہندی نظام تعلیم کے نتائج کو دکھانا چاہتا ہوں، کہ گھر کی مرغی خواہ جس نظر سے دیکھی جاتی ہو، دال اور دال سے بھی بدتر لیکن اسی دمشق میں اسلامی تاریخ کا ایک اہم علمی واقعہ پیش آیا، اُس وقت پتہ چلا، کہ ہندوستان کے نصاب میں کیا کرامت پوشیدہ ہے، اس واقعہ کا ذکر تقریبًا عام تاریخوں میں ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ان ہی دنوں میں جب یہ ہندی عالم دمشق میں مقیم تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنے تبحر اور علم کے غیر معمولی بحران میں ایک خاص قسم کا طوفان اُٹھائے ہوئے تھے، گویا سمجھنا چاہیے کہ ان کے علمی ہنگاموں سے سارا عالم اسلام متزلزل تھا۔ بلکہ ایک حد تک تو اب تک ہے، ان کی چوکھی بے پناہ تلوار اس طرح چل رہی تھی کہ معاصر علماء چیخ اُٹھے، بیسیوں نئے نئے

مسائل[1] پیدا کر کے اہل علم کی محفلوں میں وہ ہلچل ڈالتے رہتے تھے، ان ہی مسائل میں ایک مسئلہ ہے جو مسئلہ حمویہ کے نام سے مشہور ہے۔ تنگ آ کر دمشق کے علماء نے آخر حکومت کو دست اندازی پر مجبور کیا۔ لیکن کسی معمولی شخصیت کا سوال نہ تھا۔ ابن تیمیہ بہر حال ابن تیمیہ ہی تھے، مسلمانوں کے شیخ الاسلام تھے، اسلامی علوم وفنون خصوصاً حدیث و رجال و قرآن میں یہ واقعہ ہے کہ اسی زمانہ میں نہیں ان کے بعد بھی مشکل ہی سے کسی کو ان کا حریف قرار دیا جا سکتا ہے۔ دمشق کا امیر اس زمانہ میں امیر تنکر تھا۔ خاص دار الحکومت میں جس کا نام دار السعادت تھا، اس نے اپنے سامنے شیخ الاسلام سے مناظرہ کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس طلب کی، ابن تیمیہ بھی بلائے گئے۔ السبکی نے لکھا ہے کہ

جمعت العلماء واشاروا بان الشیخ الھندی یحضر فحضر	علماء نے جمع ہو کر بالاتفاق فیصلہ کیا کہ شیخ ہندی کو بلایا جائے۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ابن تیمیہ کے مقابلہ میں دمشق کے جو علماء بلائے گئے تھے، کسی نے اپنے اندر ان سے گفتگو کرنے کی صلاحیت نہیں محسوس کی فیصلہ کیا گیا کہ "شیخ ہندی" کو بلایا جائے۔ امیر نے اسی بنیاد پر ان کو طلب کیا، سبکی نے یہ بھی لکھا ہے۔

وکان الامیر تنکر یعظم الھندی ویعتقدہ	امیر تنکر ہندی کی بڑی عزت کرتا تھا اور ان کا بڑا معتقد تھا۔

بہر حال "شیخ ہندی" بھی مجلس میں آ کر شریک ہوئے لکھا ہے کہ مناظرہ کی اس تاریخی مجلس میں

کان الھندی شیخ الحاضرین کلھم (طبقات کبری)	ہندی ہی ان تمام علماء شام کا شیخ اور سردار تھا، جو اس مجلس میں موجود تھے۔

---

[1] مثلاً طلاق ثلاثہ یعنی تین طلاق تین ہے۔ آئمہ اربعہ کے اس مسلک کے خلاف تین ایک ہی کا نظریہ قائم کیا۔ مدینہ منورہ اس نیت سے جانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت کریں گے، حرام ہے۔ اسی طرح مسئلہ صفات میں بھی قریب قریب مجسمہ کی سی باتیں کرتے تھے یوں بھی ان کے متفردات کی ایک طویل فہرست ہے ۱۲

جس سے کلام کی جرأت کسی کو نہیں ہو رہی تھی، شیخ ہندی نے بے محابا، ان ہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو مخاطب کیا۔ غالباً السبکی بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ بہرحال ان کا بیان ہے۔ اس وقت شیخ ہندی کی جو حالت تھی گویا اس کی تصویر ہے۔

کان الهندی طویل النفس فی	تقریر میں ہندی بہت دراز نفس واقع ہوئے تھے
التقریر اذا شرع فی وجه یقرره	کسی پہلو پر جب تقریر شروع کرتے تو کچھ اس طرح
لایدع شبهة ولا اعتراضا الا	اس کو بیان کرتے کہ جتنے شبہات یا اعتراضات
اشار الیه فی التقریر بحیث لا یتم	کا امکان ہو سکتا تھا اپنی تقریر ہی میں اس کی طرف
التقریر الا وقد بعد علی	اشارہ کر جاتے تھے۔ حتی کہ جب تقریر ختم ہوتی تھی تو
المعترض مقاومته	اعتراض کرنے والے کے لیے اس کا جواب سخت ہو جاتا تھا۔

یہ تو شیخ ہندی کا حال تھا، اس کے مقابلہ میں شیخ الاسلام پر شیخ ہندی کے اس طرزِ تقریر کا کیا اثر مرتب ہوا۔ السبکی ہی سے وہ بھی سن لیجیے۔

اخذ ابن تیمیه یعجل علیه	ابن تیمیہ نے جلد بازی سے کام لینا شروع کیا
علی عادته وقد یخرج من شیء	جیسا کہ ان کی عادت ہے۔ اور ایک بات کو چھوڑ کر
الی شیء	دوسری کی طرف نکل گئے (یہ کیفیت ان پر طاری ہوگئی)

گویا اپنے معلومات کی وسعت، اور ذہنی انتقال کی قوت سے ہندی کو وہ مرعوب کرنا چاہتے تھے، اور کوئی شبہ نہیں ہے کہ ابن تیمیہ کے معلومات جو درحقیقت بحر ذخار ہیں۔ ان کو آج بھی ان کی کتابوں میں پڑھ کر آدمی کچھ مبہوت سا ہو جاتا ہے۔ بات میں بات ان کو یاد آتی چلی جاتی ہے۔ دماغ معلومات کا خزانہ ہے، ایک کے بعد ایک چیز گویا اُبلتی چلی جاتی ہے۔ مگر ہندی شیخ بھی ہندی تھا۔ ہندوستان کے اس درس کا اس کو تجربہ تھا، جس میں سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا ہے، کہ اصل حقیقت لفظوں کے گورکھ دھندوں میں نگاہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ابن تیمیہ کے اس انداز کو دیکھ کر شیخ صفی الدین سے نہ رہا گیا۔ اور باوجود ان کی جلالتِ شان کے

شیخ کو کہنا پڑا

ما اراك یا ابن تیمیہ الا کالعصفور تنزط من ھنا الی ھنا۔ — ابن تیمیہ میں تمھیں نہیں پارہا ہوں لیکن اس چڑیا کی طرح جو ادھر سے پھدک کر اُدھر جاتی ہو اور اُدھر سے ادھر

ابن حجر نے دُرر میں شوکانی نے بدر میں، شیخ ہندی کی طرف ان ہی الفاظ کو منسوب کیا ہو۔ لیکن السبکی جن کا بیان سب سے زیادہ قابل وثوق ہو، اُنھوں نے لکھا کہ شیخ نے کہا۔

ما اراك یا ابن تیمیہ الا کالعصفور حیث اردت ان اقبضه من مکان فر الی مکان آخر۔ — ابن تیمیہ میں تمھیں چڑیا کے مانند پاتا ہوں، جہاں چاہتا ہوں کہ پکڑوں، تو وہاں سے بھاگ کر دُوسری جگہ چلے جاتے ہو۔

جس سے معلوم ہوتا ہو کہ شیخ الاسلام پر پُھدکنے والی چڑیا کی کیفیت جو طاری ہوگئی تھی، وہ شیخ ہندی کی ان گرفتوں کا نتیجہ تھا، جس سے تڑپ کر وہ دوسری شاخ پر بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے، شیخ وہاں بھی ان کو چین نہیں لینے دیتے، یوں ہی "کود" "پھاند" "اچھل" اور "پھدک" کا ایک سلسلہ تھا، جو جاری تھا۔

واللہ اعلم حاصل کیا نکلا، شیخ الاسلام شیخ ہندی کے پنجوں میں گرفتار بھی ہوئے یا یوں ہی پُھدکتے ہی رہے تاہم امیر تنکر نے جو یہ فیصلہ کیا، جیسا کہ السبکی نے لکھا ہے،

نودی علیه فی البلاد وعلی اصحابه وعزلوا عن وظائفهم — حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں کے متعلق سارے ملک میں اعلان کرادیا گیا اور حکومت کے عہدوں سے سب معزول کردیے گئے۔

یہ بھی لکھا ہو کہ

وحبس ابن تیمیه بسبب تلك المسئلة — اس مسئلہ کی وجہ سے ابن تیمیہ کو جیل دے دیا گیا۔

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہو، کہ شیخ ہندی نے آخر مضبوط پنجہ ڈالا، جس سے کم از کم امیر

Marfat.com

تنگر اور مجلس والوں کا یہی فیصلہ ہوا کہ اس سے وہ نہ نکل سکے۔ واللہ اعلم۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ واقعی اس مسئلہ میں جس میں مناظرہ ہوا تھا، حق پر کون تھا، اور نہ اس غلط فہمی میں کسی کو مبتلا ہونا چاہیے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی علمی عظمت وجلالت سے مجھے انکار ہے، بلکہ اس وقت تو صرف یہ دکھانا تھا کہ ہمارے ملک کے اس چھوٹے موٹے نصاب نے اپنے نتائج کی قیمت کہاں جاکر حاصل کی۔ اتنا تو کم از کم سب ہی کو ماننا پڑے گا کہ اس مسئلہ یا بحث کی حد تک دمشق کے سارے علماء نے اس ہندوستانی عالم کے سامنے اپنی اپنی سپر ڈال دی۔

حالاں کہ لطف یہ ہے کہ سراج ہندی میں جو طلاقت لسانی تھی، بیچارے شیخ صفی الدین اس صفت سے محروم تھے، ابن حجر وغیرہ سبھوں نے لکھا ہے کہ

کانت فی لسانہ عجمۃ الهنود صفی ہندی کی زبان میں ہندوستانی زبان کی خصوصیت

باقیۃ الی ان مات (ص ۱۵ ج ۴) آخر وقت تک باقی تھی حتی کہ وہ مر گئے۔

یعنی بیچارے کچھ بولنے میں سراج الہندی کے مانند طرار و فرار بھی نہ تھے، لیکن وہی بات جیساکہ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگی، ہندی طریقۂ درس کی جو خصوصیت ہے، گرفت کا ملکہ ان میں غیر معمولی تھا، دماغ اتنا مانجا اور تیز کیا ہوا تھا کہ نازک سی نازک بات بھی ان سے بچ کر نکل نہیں سکتی تھی، جیساکہ سبکی کی زبانی آپ سن چکے، ایوان اسلام مصر، اور خطیرۃ الابدال شام میں ہندوستانی نظام تعلیم نے اپنے جن نتائج کا اظہار کیا، اس کا تماشا آپ دیکھ چکے۔ اب آیئے قبلۃ الاسلام وکعبۃ الایمان تشریف لائیے۔ یہ سرزمین عرب ہے، اور یہ اس کے دونوں مقدس شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہیں۔ مختلف قرون واعصار میں مسلمانوں کے ان مرکزی شہروں میں ہندی فضل وکمال کو جو سراہا گیا ہے اس کی پوری تفصیل کے لیے یہ مبالغہ نہیں کہ ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب المتقی، ان دونوں حضرات کا ذکر تو شاید اپنے موقعوں پر آ بھی چکا ہے شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ جن کے حوالہ سے

Marfat.com

علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کے لکھے ہوئے اس قرآن کا ذکر گزر چکا ہے، جو صرف ایک ورق پر لکھا ہوا تھا۔ یہی عبدالوہاب شعرانی اپنی مشہور کتاب طبقات الصوفیۃ الکبریٰ میں اپنا یہ بیان شیخ علی متقی کے متعلق درج کرتے ہیں

ھو الشیخ الھندی نزیل مکۃ المشرفۃ اجتمعت بہ فی سنۃ سبع واربعین وتسعمائۃ وترددت الیہ وتردد الی۔

شیخ ہندی جن کا قیام مکہ معظمہ میں ہے، ۹۴۷ھ میں ان سے میں مکہ ہی میں ملا۔ میں بھی شیخ کے پاس آتا جاتا تھا اور وہ بھی میرے پاس آتے جاتے تھے۔

شعرانی نے اس کے بعد شیخ علی متقی کے علم و تقویٰ اور ان کے اصحاب و رفقاء، مریدوں کی عجیب و غریب کیفیتیں درج کی ہیں۔ آخر میں دسویں صدی ہجری کا یہ مصری امام جو علوم ظاہری اور مقاماتِ باطنی کا جامع ہے اپنی یہ شہادت ایک ہندوستانی عالم کے متعلق قلم بند کرتا ہے

ما اعجبنی فی مکۃ مثلہ

مکہ معظمہ میں ان جیسا کوئی آدمی مری نگاہوں میں نہیں جچا۔

شیخ عبداللہ بن ملا سعد اللہ، شیخ محمد بن محمد الہندی، شیخ محمد بن محمد الدراجی، اور ازیں قبیل پچھلی صدیوں یعنی آٹھویں نویں میں ہندوستانی علماء کا ایک سلسلہ ہے، جو ان شہروں میں ہجرت کرکے قیام پذیر ہوا۔ اور اپنے علم و عمل کے گہرے نقوش، وہاں کے باشندوں کے قلوب پر قائم کیے۔ آخر زمانہ میں شیخ ابوالحسن سندھی، شیخ حیات سندھی نے مدینہ منورہ میں درس حدیث کا جو حلقہ قائم کیا۔ خصوصاً شیخ حیات سندھی، جن سے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے حدیث کی سند حاصل کی ان کے متعلق تو مولانا آزاد نے یہ ارقام فرما کر کہ

"تمام عمر در خدمت حدیث شریف صرف ساخت، و تجرے عظیم دریں فن شریف اندوخت"

لکھا ہے اور لکھا کیا اسی حال میں خود دیکھا ہے کہ

Marfat.com

"خواص حرمین مکرمین در مصر وشام وروم اعتقاد واخلاص داشتند وازذات ہمایوں کسب برکات نی نمودند" مآثر ص۱۶۴

یا سندھ ہی کے دوسرے مدنی حضرت شیخ عابد سندھی ہندوستان سے یمن پہنچے۔ وہاں کے وزیر کی لڑکی سے شادی کی، حکومت صنعاء نے ان کو سفیر بناکر مصر بھیجا۔ الیانع الجنی میں علامہ محدث محسن البہاری لکھتے ہیں

وکان هو سبب المعرفة بينه وبين والی مصر و وقوفه علی بعض فضله واشرافه علی شئ من عظم شانه۔ ۷

یہی سفارت وجہ ہوگئی اس تعارف کی جو مولانا عابد سندھی اور خدیو مصر میں پیدا ہوگیا تھا۔ اسی ذریعہ سے خدیو کو مولانا کے علم وفضل کے جاننے کا موقعہ ملا۔ اور ان کی جلالت قدر کا وہ کچھ اندازہ کرسکا۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدیو مصر ان کے علم وفضل تقویٰ وورع سے اتنا متاثر ہوا کہ شاید مصر میں ایک دوسرا سراج ہندی کھڑا ہوجاتا اگر وہ مصر میں قیام فرمالیتے۔ لیکن جیسا کہ ملا محسن ہی نے لکھا ہے

وکان الشیخ رحمہ اللہ شدید التحنن الی ربوع طابہ عظیم التشوق الی شذاها کثیر التسآل من ربہ لمحیاہ فیها ومماتہ بها والاستظلال بظلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والانحیاز الی حماہ الیانع ص ۷

شیخ عابد سندھی کو مدینہ منورہ کی سرزمین سے شدید عشقی تعلق تھا، اور مدینہ پاک کی نسیم روح پرور کے لیے انتہائی اشتیاق رکھتے تھے، خدا سے بکثرت اس کی التجا کرتے رہتے تھے کہ اسی پاک سرزمین میں زندہ رہیں اور اسی میں مریں۔ اور چاہتے تھے کہ رسول اللہ کے سایہ میں جئیں اور آپ ہی کے احاطہ میں مقیم رہیں۔

اسی لیے بجائے مصر کے وہ مدینہ منورہ ہی چلے آئے۔ اور

Marfat.com

واقام بها فی غایة مایکون من	انتہائی عزت کے ساتھ مدینہ میں ان کا قیام
العز وولی ریاسۃ علمائھا من	رہا بالآخر مدینہ کے علمار کی ریاست کے بھی مالک والی
قبل والی مصر..... وکان احسن الناس	مصر کی طرف سے مقرر ہو گئے۔ چال ڈھلن طور وطریقہ
سمتا فی زمانہ کثر ثناء الناس علیہ فی	میں بہترین آدمی تھے۔ لوگ ان کے مداح تھے، اور
حیاتہ وسمرھم بمفاخرہ بعد وفاتہ ۔	وفات کے بعد لوگ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حرمین شریفین میں وقتاً فوقتاً جن ہندی علمار کو امتیاز حاصل ہوتا رہا ہے اس کی فہرست بحمد اللہ بہت طویل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں کچھ حضرات تو ایسے ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں پڑھا، اور یہاں سے نکلنے کے بعد بھی دوسرے اسلامی ممالک کے علمار سے استفادہ کیا۔ مثلاً شیخ عابد سندھی کا جو حال ہے کہ اپنے خاندان خصوصاً چچا سے پڑھنے کے بعد یمن کے مشہور تعلیمی شہر زبیدہ کے علمار سے بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا، لیکن زیادہ تر ایسے لوگ ہیں، جنھوں نے جو کچھ پڑھا، ہندوستان ہی میں پڑھا، جو کچھ سیکھا اپنے وطن ہی میں سیکھا۔ حرمین پہنچ کر افادہ نہیں بلکہ استفادہ کی مجلسیں گرم کیں۔ خصوصاً اس مشہور فتنہ ہندیہ کے بعد علامہ محسن بہاری نے جس کی عجب تعبیر کی ہے لکھا ہے

وقعت الفتنۃ الھائلۃ فی الھند	واقع ہوا ہندوستان میں وہ ہائل فتنہ "القرطاس"
عام القرطاس وتسلط العلوج	والے سال میں اور گنواروں نے دہلی پر قبضہ کر لیا
علی دھلی وتحکموا فی اھلھا	اور وہاں کے باشندوں پر زبردستی حکومت قائم کر لی۔[1]

---

[1] غالباً القرطاس سے مراد کارتج یا کارتوس ہے کیوں کہ ۵۷ء کا فتنہ جیسا کہ مشہور ہے کارتوس ہی کے دانت سے کاٹنے کے مسئلے سے شروع ہوا۔ العلوج سے واللہ اعلم کیا مراد ہے۔ کیا کالی پلٹن کے فوجیوں کو "العلوج" کے نام سے موسوم کیا ہے یا کیا ارادہ ہے۔ میں نے اس لیے اس کو نقل کر دیا کہ "عام قرطاس" غدر کے مشہور لفظ کے مقابلہ میں بنا، اور اچھا ہے سال قرطاس اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

بہرحال اس فتنہ کے بعد جو ہندوستان سے ایک قافلہ ہجرت کرکے حجاز چلا گیا، جن میں علماً بھی تھے اور مشائخ بھی۔ ان مشائخ میں حضرت شیخ الشیوخ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو عزت حاصل کی وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔ علماء میں حضرت شاہ عبد الغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے دلی سے اپنے حلقہ درس حدیث کو اسی فتنہ کے بعد جب مدینہ منورہ منتقل فرمایا، توان کے تلمیذ رشید صاحب کتاب الیانع الجنی یعنی وہی علامہ محسن بہاری فرماتے ہیں۔ اور یہ شہادت شاہ صاحب کی زندگی ہی میں مدینہ میں بیٹھ کر قلم بند فرماتے ہیں، یہ لکھ کر کہ

فھو علی ما عودہ من الخیر	جس چیز کا التزام انھوں نے فرمایا تھا، اس
جاد فیہ لا یفتر عما کان علیہ	کی نفع رسانیوں میں وہ معروف ہیں، شب و
لیلاً ونھاراً مشتغل بالحدیث	روز بغیر کسی انقطاع اور ماندگی کے اسی میں مشغول ہیں
مشغوف بروایتہ	حدیث اور اس کی روایت میں انہماک اسی حال میں ہے

آخر وہی ہندوستان جس کا سرمایہ مشارق ومصابیح ومشکوۃ سے زیادہ حدیث میں نہیں ہے اپنے ایک فرزند کو مادی الاسلام میں اسی حدیث کی تدریس میں اس مقام پر پاتا ہے کہ علامہ محسن فرماتے ہیں

فھو الیوم غدیقھا المرجب	آج مدینہ کا سب سے باردار نخل آپ ہی کا وجود باجود
والمحدث بین لابتیھا ؎	ہے، اور وہی مدینہ کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان
ص ۵۹	کا "المحدث" ہے۔

اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ "المحدث بین لابتیھا" (مدینہ کے دو لابتیوں کے درمیان

؎ میں نے لابتیھا کا ترجمہ وہی کردیا ہے جو عام طور پر بتایا جاتا ہے لیکن مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مدینہ کے دونوں طرف دو سنگستان پتھروں کا جو ہے جسے حرہ بھی کہتے ہیں۔ لابتین سے ان دو سنگستانوں کی طرف اشارہ ہے کیا یہ لا یہ لاوہ کی معرب شکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے اسی رنگ کے ہوتے ہیں ۱۲

سب سے بڑا محدث وہی ہے) یہ الفاظ اس شخص کے متعلق لکھے گئے ہیں جس نے ہندوستان کے سوا کسی بیرونی ملک میں کچھ نہیں پڑھا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر اس قصہ کو چھیڑا جائے گا۔ تو یہ مستقل داستان کی شکل اختیار کرے گا۔ اب میں برسر مطلب آتا ہوں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں بدنام ہندوستان جسے خود اس کے کپوت فرزندوں نے خود بدنام کیا ہے، غیروں سے زیادہ اس رسوائی میں اپنوں کا ہاتھ افسوس کہ زیادہ اور بہت زیادہ ہے۔ اسی ہندوستان کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں کچھ نہ تھا، اور بارہویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مقالہ خاکسار نے الفرقان کے لیے لکھا ہے، اس میں میں نے بھی اسی خیال کو ظاہر کیا ہے۔ لیکن اسی مضمون میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا، کہ لفظی حد تک یا سند کے لحاظ سے صحیح ہے کہ حجاز سے حدیث کی سند لانے والوں میں شاہ صاحب اُن لوگوں میں ہیں جن کی وجہ سے اس علم کا بوجوہِ مختلفہ ہندوستان میں بہت چرچا پھیل گیا۔ لیکن لوگوں نے شاید اس پر غور نہیں کیا ہوگا۔ کہ اسی کے ساتھ میں نے اسی خاندان کے فیض یافتہ اور ولی اللہی خانوادہ کے عاشق شیفتہ مولانا محسن بہاری کے حوالہ سے یہ فقرہ ان کی مشہور اور مستند کتاب الیانع الجنی سے نقل کیا تھا کہ شاہ صاحب کے سب سے بڑے اُستاد فی الحدیث جن کے متعلق علامہ بہاری نے لکھا ہے

وھو عمدة ابی	ابو عبدالعزیز (یعنی شاہ ولی اللہ) کے اُستادوں میں
عبد العزیز من بین	وہ (یعنی شیخ ابو طاہر بن ابراہیم الکردی المدنی) ستون
مشائخہ و اکثرلہ	کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی سے شاہ صاحب
نفعا (۸۱)	کو سب سے زیادہ نفع پہنچا

لیکن اسی مدنی اُستاد نے اپنے ہندی شاگرد کو کیا کہا تھا۔ میں نے اپنے مقالہ میں بھی نقل کیا ہے، یعنی

Marfat.com

انّہ کان یسند عنی اللفظ و کنت اصحح منہ المعنی ۔ ص۱۳

لفظ کی سند مجھ سے وہ (شاہ ولی اللہ) حاصل کرتے ہیں اور میں ان کے ذریعہ سے حدیثوں کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں۔

علامہ بہاری نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہی

وکتبہما فیما کتب ۔

شاہ صاحب کو جو سند لکھ کر (شیخ طاہر) نے دی اس میں بھی یہ لکھا۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ شاہ صاحب کی سند میں بھی ان کے ان استاد نے اس عجیب و غریب اعتراف کو درج کیا تھا۔[۱]

میرے عرض کرنے کی غرض یہ ہی، کہ اگر یہ اعتراف شیخ طاہر کا صحیح ہی، اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں، تو پھر اندازہ کیا جاسکتا ہی کہ جس درس کے نتائج نے مصر و شام میں میدان جیتا تھا۔ کیا حرمین میں اس نے اس اعتراف کے ذریعہ جو امتیاز حاصل کیا ہی۔ کیا کم ہی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جس زمانہ میں ہندی علمار کی سرزمین حجاز میں یہ قدر افزائیاں ہوئی ہیں۔ اس وقت حجاز وہ حجاز نہیں تھا، جواب ہی، یہ وہ وقت تھا کہ سلطنت ترکی اور حکومت مصر دونوں کی طرف سے کروڑہا کروڑ روپیہ ان دونوں شہروں پر صرف اس لیے خرچ ہوتے تھے کہ دُنیائے اسلام کے جس گوشہ سے بھی لوگ ان شہروں میں پناہ گیر ہوتے تھے ان کے معاش کا سامان کر دیا جاتا تھا۔ قسطنطنیہ کا شہر، اس شہر کے تمام بازار دکانیں ایک ایک کر کے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی دن سے وقف تھیں جس دن حضرت سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ میں پہلا قدم رکھتے ہوئے فرمایا تھا۔

---

[۱] اسلامی علوم کی تاریخ میں اسی قسم کا ایک فقرہ امام ذہبی کا امام ترمذی کے متعلق نقل کیا جاتا ہی کہ امام بخاری نے ترمذی سے فرمایا ما انتفعت بک اکثر مما انتفعت بی "(میں نے تم سے جتنا نفع اٹھایا وہ اس سے زیادہ ہی جو تم نے مجھ سے فائدہ حاصل کیا)، بلاشبہ کسی شاگرد کے فخر کے لیے یہ انتہائی الفاظ ہو سکتے ہیں جو اپنے اُستاد سے اسے ملے ہوں۔

Marfat.com

وقفت مدینة قیصر علی مدینة النبی صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے قیصر کے شہر کو پیغمبر کے شہر پر وقف کر دیا

اس وقف پر کمالی دور سے پہلے بغیر کسی انقطاع کے عمل ہوتا رہا، یہی حال مصر کا تھا کہ جس سرزمین کی پیداوار کو دیکھ کر دماغوں میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے اسی کا پانچواں حصہ حرمین پر وقف تھا۔ اور اس کے سوا بھی ان دونوں حکومتوں کی جانب سے ساکنین حرمین کی جو خدمتیں ہوتی تھیں، ان سے کون ناواقف ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیائے اسلام کے اہل فضل و کمال کا ان دونوں شہروں میں اجتماع رہتا تھا۔ گویا حجاز میں صرف حجاز کے علماء کے سامنے نہیں بلکہ سارے اسلامی ممالک کے علماء کے سامنے یہ امتحانات ہوئے ہیں، جن میں ہندی علماء نے تقریباً ہر زمانہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ جس اصول پر ان کی تعلیم ہوتی ہے اور اس تعلیم سے جس قسم کی ذہنی تمرین و تشحید ہوتی ہے، دوسرے علاقوں کے تعلیمی طریقے ایسے نتائج نہیں پیدا کر سکتے۔ شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نصاب کا کچھ ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا، اپنے والد مرحوم سے پڑھا تھا، جو مشہور معقولی عالم میرزا زاہد کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ حدیث کا سرمایہ جو ہندوستان سے پڑھ کر آئے تھے وہ کل یہ تھا۔

از علم حدیث مشکوٰة تمام الا خواندہ شد الا فوتے یسیر از کتاب البیع تا کتاب الادب .... طرفے از صحیح بخاری تا کتاب الطہارت (ص ۱۹۴)	حدیث میں پوری مشکوٰة بجز چند ابواب یعنی کتاب البیع سے کتاب الآداب تک میں نے پڑھی تھی اور بخاری شریف کا ایک حصہ یعنی صرف کتاب الطہارت تک

بخاری کا نام اس میں ضرور ہے لیکن "تا کتاب الطہارت" کے الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تبرک سے زیادہ اس پڑھنے کی اور کوئی حیثیت نہ تھی اگر اس "تا" میں کتاب الطہارت کو داخل بھی سمجھا جائے تو گن لیجیے۔ ابتداء سے یہاں تک چند اوراق سے کیا زیادہ زیادہ

ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ پڑھنے کی حد تک واقعۃً انھوں نے بھی وہی مشکوٰۃ ہی پڑھی تھی لیکن باوجود اس کے جن کی عمریں درس حدیث ہی میں گزری تھیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث کے معانی وہی بتاتے تھے، ہیں تو صرف لفظ بتاتا تھا، اور یہ بھی یہی بات کہ شاہ صاحب نے حجاز میں اُستادوں سے حدیث جو پڑھی تھی، زیادہ تر وہ بطریقہ سرد ہی پڑھی تھی۔ اپنے اساتذہ حدیث کے طریقہ درس کا ذکر فرماتے ہوئے انفاس میں لکھتے ہیں

"مختار شیخ حسن عجمی، و احمد قطان، و شیخ ابوطاہر وغیر ایشاں طریقہ سرد بود"

اور گزر چکا کہ سرد کا مطلب فقط اس قدر ہے کہ

"شیخ سمع یا قاری وے تلاوت کند بے تعرض مباحث لغویہ و فقہیہ و اسماء و رجال وغیراں" ص ۱۸۷

اس کے بعد کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں (حجۃ اللہ، مسوّی، ازالۃ الخفا، وغیرہ) میں حدیثوں کے جو معانی بیان کیے ہیں۔ جن پہلوؤں کی طرف ان کا دماغ گیا ہے، وہ طریقہ سرد کی اس تعلیم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ الفاظ اور سند کی حد تک حدیث وہ حجاز سے ضرور لائے۔ لیکن معانی کا انکشاف ان پر جو کچھ ہوا ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ تر دخل تو ان کی خداداد دل و دماغ ہی کو ہے۔ لیکن تعلیم تو نام ہی اس کا ہے کہ جس میں جتنی صلاحیت بالقوہ ہو، اسے بالفعل کر دے۔ اور اسی لیے ہندوستانی نظام تعلیم کا حق ہے کہ شاہ ولی اللہ کی دماغی تربیت کے سلسلہ میں اس کا جو حصہ ہے اس سے اس کو محروم نہ کیا جائے۔

مصر و شام و حجاز کو ختم کر کے اب آیئے اس آخری شہر میں جہاں سب سے آخر میں ہماری تعلیم و تہذیب دفن ہوئی ہے۔ میری مراد اسلامبول یا مسلمانوں کے آخری دار الخلافت قسطنطنیہ سے ہے۔ کوئی کتابی شہادت تو اس وقت پیش نہیں کر سکتا، لیکن جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں، کتابی واقعات سے بھی زیادہ بحمد اللہ اس میں قوت ہے۔ قصہ تو طویل ہے میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔ میں نے براہ راست اس قصہ کو حضرت مولانا محمد علی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ مونگیری

خلیفہ ارشد حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن قدس اللہ سرہ ربانی ندوۃ العلماء سے سُنا ہے۔ عام لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو، لیکن خواص جانتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت کا اقتدار جب قائم ہوا تو اس کے زیر سایہ شروع میں عیسائی مذہب پھیلانے کی پوری کوشش کی گئی اگرچہ بظاہر حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اسی سلسلہ میں فنڈر نامی ایک عیسائی پادری یورپ سے ہندوستان پہنچا۔ جسے عربی و فارسی اور اسلامی علوم میں باضابطہ ماہر بنایا گیا تھا اس نے اسلام پر اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیا، ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائیت اور عیسائی مذہب سے ظاہر ہے کہ دور کا بھی تعلق نہ تھا، علماء بھی اس مذہب کے تفصیلات سے ناواقف تھے۔ شروع میں تھوڑی بہت پریشانی علماء میں ضرور پیدا ہوئی، لیکن انا لہ لحافظون کے وعدہ کی تکمیل جیسا کہ ہمیشہ ہوتی رہی ہے اسی کا ظہور بایں شکل ہوا کہ بہار کے ایک ڈاکٹر وزیر خاں نامی مرشد آباد سے یورپ چلے گئے تھے، وہاں انگریزی زبان تو خیر انھوں نے سیکھی ہی تھی، عیسائی مذہب کی کتابیں، شروح و تفاسیر کا ایک طومار اپنے ساتھ یوروپ سے لائے تھے۔ غالباً آگرہ یا کسی شہر میں وہ سرکاری طور پر ڈاکٹر بھی تھے۔ ان ہی ڈاکٹر وزیر صاحب اور کیرانہ کے ایک عالم مولانا رحمۃ اللہ صاحب سے تعلقات ہو گئے۔ اب یہ ہندی نظام تعلیم کا اثر تھا کہ باوجود انگریزی نہ جاننے کے مولانا رحمۃ اللہ صاحب ڈاکٹر وزیر خاں کی چند صحبتوں میں اتنے تیار ہو گئے کہ فنڈر سے ان کا مناظرہ غالباً کسی حاکم کی ثالثی میں بمقام آگرہ جو ہوا تو فنڈر کو فاش شکست اٹھانی پڑی[1]۔ اسی عرصہ میں وہی فتنہ

---

[1] حضرت مولانا رحمۃ اللہ الھندی اور پادری فنڈر کے اس تاریخی مناظرہ کی کیفیت اب تو خود ہندوستان کے مسلمان عموماً بھلا چکے ہیں۔ حالانکہ جس زمانہ میں یہ مناظرہ آگرہ میں ہوا تھا فارسی اور اردو میں اس کے متعلق اس زمانہ کے اخباروں کے سوا مختلف رسالے خود ان لوگوں نے تصنیف کر کے شائع کیے تھے جو اس مجلس میں موجود تھے باوجود تلاش کے مجھے نہ فارسی کے یہ رسالے مل سکے نہ اردو کے۔ خدا کی شان ہے کہ عربی زبان میں ایک اردو اور ایک فارسی رسالہ کا ترجمہ مجھ کو مطبوعہ مل گیا مترجم کا نام الشیخ علی الطیبی الشافعی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قسطنطنیہ میں بعض امراء الدولہ کے کتب خانے میں یہ رسالے مجھے ملے یہ بھی لکھا ہے کہ ذلّ سمعت فی مکۃ المعظمۃ وباقی ترجمہ

"عام قرطاس" کے ہنگامہ میں جہاں سینکڑوں علماء و مشائخ اِدھر اُدھر بکھرے ان میں مولانا رحمۃ اللہ بھی تھے، یہ بھی حجاز ہجرت کر کے چلے گئے۔ اور اب تک ان کی یادگار مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ وہاں موجود ہے۔

فنڈر ہندوستان سے رسوا و ذلیل ہو کر قسطنطنیہ پہنچا، اور وہاں بھی علماء استنبول کو چیلنج پر چیلنج دینا شروع کیا، غالباً سلطان عبدالمجید مرحوم کا وقت تھا۔ خلیفہ تک خبر پہنچی اور یہ بھی کہ قسطنطنیہ کے علماء میں کوئی اس پادری سے پنجہ آزمائی پر تیار نہیں ہے سلطان نے فوراً حجاز کے گورنر کو لکھا کہ حرمین میں اگر کوئی عالم عیسائیوں سے مقابلہ و مناظرہ کی مشق رکھتا ہو تو اسے بھیج دیا جائے۔ حرم مکہ کے شیخ اس زمانہ میں زینی وحلان مشہور

(بقیہ صفحہ ۲۸۶) حال ھذہ المناظرۃ من افواہ رجال غیر المحصورین الذین جاؤا للحج بعد ھا۔ (یعنی مکہ معظمہ میں بے شمار آدمیوں سے اس مناظرہ کا حال معلوم ہوا جو ہندوستان سے حج کے لیے مناظرہ کے بعد آئے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا حج ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے ذریعہ سے مختلف مسلمانوں کا حال ایک دوسرے تک پہنچتا تھا۔ بہرحال اصل رسالہ اُردو کے مصنف سید عبداللہ الہندی ہیں جو آگرہ میں برٹش حکومت کے ملازم تھے۔ پہلے تو ان تمام خطوط کو مصنف نے نقل کیا ہے جو مولانا رحمۃ اللہ اور پادری فنڈر میں مناظرہ کے متعلق لکھے گئے۔ ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲۷۰ھ ماہ رجب میں مناظرہ کی یہ مجلس آگرہ میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کے ارباب عزت و جاہ علم و فضل کے سوا لکھا ہے کہ آگرہ کے بڑے بڑے یورپین افسر بھی جلسہ میں شریک رہے جن میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی غالباً کمشنر اور مسٹر کرسٹن سکرٹری ریویو بورڈ مسٹر ولیم حاکم علاقہ فوجی مسٹر ٹیلی مترجم اول برٹش گورنمنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں عیسائیوں کی طرف سے لکھا ہے کہ القسیس فنڈر مناظر اول و قسیس فرنچ مناظر دوم کی حیثیت سے تھے اور اسلام کی طرف سے مولانا رحمۃ اللہ الہندی مناظر اول اور ان کے معاون ڈاکٹر وزیر خاں تھے۔ لکھا ہے کہ جلسہ جو کئی دن ہوا۔ ہزاروں ہندو مسلمان تماش بینوں کی حیثیت سے شریک تھے پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی وہ انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔ علانیہ سب کے سامنے فنڈر کو اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں محرف ہو چکی ہیں لیکن صرف مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو خود مشکوک مان رہا ہے اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ الغرض فاش شکست کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے اُٹھنا پڑا تفصیل مقصود ہو تو عربی کے ان رسالوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ان ہی رسالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں نے بھی فارسی میں ایک کتاب بحث میں لکھی تھی اور بہادر شاہ مرحوم بادشاہ کے ولی عہد مرزا فخرو نے اپنے خرچ سے چھپوا کر اسے شائع کیا تھا۔ اس مناظرہ کے کل تین سال بعد غدر کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا۔

محدث تھے، والی مکہ نے سلطان کے اس فرمان سے شیخ دحلان کو مطلع کیا۔ انھوں نے درس حدیث کے حلقہ میں اس کا ذکر کیا، مولانا رحمت اللہ بھی اس حلقہ میں بیٹھا کرتے تھے آگے بڑھ کر اُنھوں نے عرض کیا کہ اس فن سے بندہ بخوبی واقف ہے۔ مولانا رحمت اللہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ قسطنطنیہ میں فنڈر ہی نے فتنہ برپا کیا ہے، بلکہ اُنھوں نے خیال کیا کہ کوئی پادری آگیا ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ حسب منشا سلطان قسطنطنیہ روانہ کیے گئے۔ مولانا رحمت اللہ کا قسطنطنیہ پہنچنا تھا اور فنڈر کو خبر ملی کہ وہی آگرہ والا ہندی عالم یہاں بھی سر پر مسلط ہوگیا ہے، بغیر کسی اطلاع کے وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوگیا، پھر اس کا کیا انجام ہوا، معلوم نہیں۔ لیکن مولانا کے اس اثر کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو ظاہر ہے مولانا کی وقعت ان کے دل میں کتنی پیدا ہوسکتی تھی، کہاں یہ حال تھا کہ "علماء دولت عثمانیہ" ششدر و حیران تھے، اور کہاں یہ صورت پیش آئی کہ ہندی عالم آیا اور مناظرہ کی ہمت تو کیا ہوتی، چیلنج دینے والا خود ہی لاپتہ ہوگیا۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب کے پاس مولانا رحمت اللہ کا گرامی نامہ محفوظ تھا۔ جس میں انھوں نے سلطانی قدر افزائیوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ یہاں تک لکھا تھا کہ خلیفہ کی مجلس سے جب اُٹھتا ہوں تو میری جوتیاں سیدھی کر کے مجھے پہناتے ہیں، اسی زمانہ میں مولانا رحمۃ اللہ کی مشہور کتاب ردّ عیسائیت میں "اظہار الحق" نامی جو فارسی میں تھی، عربی میں ترجمہ ہوئی، اور آج تک اسلامی ممالک کے بعض مدارس حتیٰ کہ ازہر کے نصاب میں بھی ایک مدت تک شریک تھی (اب ادھر کا حال معلوم نہیں) کہتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے قیام پر سلطان نے بہت اصرار کیا، لیکن مولانا نے ہجرت کی نیت کا عذر کر کے پھر اپنے کو حجاز پہنچایا۔ حکومت سے وظیفہ ماہوار جس کی تعداد اس وقت محفوظ نہیں رہی، مولانا کے نام جاری ہوا جو مکہ معظمہ میں ان کو ملتا رہا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ گو مناظرہ کا مواد انگریزی زبان سے ڈاکٹر وزیر نے مولانا کے لیے مہیا کیا، لیکن اگر مولانا کا دماغ تربیت یافتہ نہ ہوتا، تو کیا

Marfat.com

اس آسانی سے وہ اس مسئلہ پر اتنا قابو پا سکتے تھے۔ اور یہی میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کے جس "شجرہ طیبہ" نے ایسے پھل مسلسل پیدا کیے، کیا وہی تعلیم کا طریقہ قابل ملامت و نفرت ہو سکتا ہے۔

آج بھی ہندوستان میں قریب قریب اکثر تعلیم گاہوں میں وہی قدیم نصاب جاری ہے، اضافہ جو کچھ ہوا ہے، وہ صرف بطریقہ سرد حدیث کے درس کا۔ لیکن بحمداللہ اس وقت بھی ہندوستان کے اسی قدیم نصاب سے جو لوگ پیدا ہو رہے ہیں، ہندوستان ہی نہیں، ہندوستان کے باہر بھی، اسی علم میں جس میں ہندوستان کی بضاعت سب سے زیادہ "مزجاۃ" سمجھی جاتی ہے یعنی فن حدیث[۱]، اسی کے متعلق قسطنطنیہ کے فاضل جلیل جو کمالی عہد سے پہلے غالباً کسی ممتاز دینی منصب سے سرفراز تھے، اور انقلاب حکومت کے بعد ان دنوں نزیل مصر ہیں، ان کا نام علامہ زاہد بن الحسن الکوثری ہے، خاکسار نے ان کے چند رسائل مختصرہ دیکھے ہیں، جن سے ان کے تبحر اور علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، اس وقت ان کا شمار

---

[۱] ہندوستان کی علمی منزلت خصوصاً فن حدیث میں جس وجہ سے پچھلے دنوں میں کم کی گئی یا دربار دہرایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام آیا وہ اسلامی احکام سے ناواقف تھے۔ میں نے دیباچہ میں مثالاً چند فقرے بھی نقل کئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو غریب ہندوستان کے شش صد سالہ علمی تاریخ محض ایک صاحب کو بڑھانے کے لئے گھٹائی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی جن کا تعلق تنگ نظر مسجد کے ملاؤں سے نہیں بلکہ مغربی جامعات کے طلسانیوں اور اردو زبان کے مشہور انشا پردازوں سے ہے۔ اسی کے ساتھ اسلامیات میں بھی ان کا علمی سرمایہ اچھے خاصے مولویوں سے کم نہیں ہے۔ اپنے سفرنامہ حجاز میں "جدہ" کے ایک عالم رئیس شیخ نصیف کا تذکرہ درج کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے مکان میں "ایک صاحب سے یہ کہہ کر ملایا گیا کہ وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب رنجدی، کے پوتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ نجد کے مشاہیر علما میں ہیں" اس کے بعد مولانا عبدالماجد نے اسی ہندوستان کے ایک غریب مولوی کا ذکر کیا ہے جو خود اور جس کے اسلاف اسلام کے احکام و تعلیمات سے ناآشنا اور عربی زبان سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ اسی ہندی ملّا نے مولانا فرماتے ہیں کہ ان سے (یعنی محمد بن عبدالوہاب صاحب کے عالم و فاضل پوتے از مشاہیر نجد) سے کچھ سوالات کیے جوابات اس معیار پر نہ ملے جس کی توقع ایک صاحب نظر عالم سے ہو سکتی ہے۔" سفر حجاز صد ۳۲

اسلامی ممالک خصوصاً حنفی دائرہ کے ممتاز ترین علماء میں ہی۔ اس استنبولی اور مصری فاضل نے حضرت الاستاذ العلامۃ الامام مولانا شبیر احمد صاحب صدر دائرۃ الاہتمام د دار العلوم دیوبند کی شرح مسلم جب دیکھی تو مولانا کو ایک خط لکھا جو شرح مسلم کی جلد ثالث کے آخر میں چھاپ بھی دیا گیا ہی۔ اس خط میں علامہ کوثری مولانا کو مخاطب کر کے اعتراف کرتے ہیں۔

فانتم یا مولٰنا فخر الحنفیۃ فی هٰذا العصر حقا ص۱۰۹ — مولانا آپ کی ذات اس عصر میں تمام دُنیا کے حنفیوں کے لیے فخر ہے۔

چودھویں صدی میں سارے حنفی ممالک کا فخر ایک ہندی عالم کو بیرون ہند کا ایک جلیل د مسلّم الثبوت فاضل قرار دیتا ہی لیکن خود ہند کے باشندوں کی نگاہ میں ہندی علماء کی کوئی وقعت نہیں ہی۔ ع والدھر آت بالاعاجیب

یہ تو ایک تحریری اعتراف ہی۔ مصر ہی کے مشہور صاحب قلم و کمال، علامہ رشید رضا مصری مرحوم جب ہندوستان تشریف لائے۔ اور ان کے سامنے ہندی نظام تعلیم کا ایک نمونہ پیش ہوا، تو دیکھنے والوں کا بیان ہی کہ مرحوم رشید رضا کرسی سے اُٹھ اُٹھ جاتے تھے اور جب ہندوستانی عالم اپنی تقریر جو عربی میں ہو رہی تھی ختم کر چکا، علامہ رشید رضا اُٹھے، خدا جانے کیا کیا کہا مگر یہ جملہ بار بار ان کی زبان پر بے ساختہ آتا تھا،

ما رائت مثل هٰذا الاستاذ الجلیل قط — اتنا بڑا اُستاذ میں نے کبھی نہیں دیکھا

یہ حضرت الامام الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی، اور اسی ٹوٹے پھوٹے بوریائی طریقہ تعلیم کے ادارہ کو دیکھ کر ان کو اعلان کرنا پڑا

لولا رأیتھا لرجعت من الھند حزینا — اگر دیو بند کے دار العلوم کو میں نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس ہوتا

اور یہ شہادتیں تو اپنوں کی ہیں۔ عام اسلامی ممالک میں ہندوستانی نظام تعلیم نے اپنی جو قیمت پائی ہی اس کے چند نمونے تھے، لیکن غیروں نے جب کبھی انصاف سے کام لیا ہی تو ان کے

اعترافات بھی اس سلسلہ میں کیا کچھ کم اہم ہیں میکالے صاحب کی تعلیمی رپورٹ[1]، اور برنیر کے خود تراشیدہ افسانہ کا تو سب ذکر کرتے ہیں۔ مگر ہمیں اس قسم کی گواہیوں کو بھی تو نہ بھلانا چاہیے

---

[1] میرا اشارہ اس مشہور تعلیمی رپورٹ کی طرف ہے جو مسٹر میکالے نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی جس کے بعد قدیم نظام تعلیم کی جگہ جدید جامعاتی طریقہ تعلیم کا ہند میں رواج ہوا۔ اسی رپورٹ کے چند خاص فقروں میں ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ "یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان و عرب کے سارے علم ادب کے برابر ہیں" اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا "ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لیے (ہندوستانی علم طب) موجب ننگ و عار ہیں"۔ ہیئت و نجوم کے متعلق فرمایا گیا تھا "جسے پڑھ کر انگلستان کے زنانہ مدرسہ کی لڑکیوں کی ہنسی رک نہیں سکتی" (ماخوذ از ترجمہ ہاشمی فرید آبادی مندرجہ رسالہ اردو) مگر ظاہر ہے کہ "خود مجھے عربی یا سنسکرت نہیں آتی" کے چراغ کو ہاتھ میں لے کر اس قسم کی دلاوریوں کا جواب خاموشی کے سوا اور کیا دیا جا سکتا ہے، دنیائے سوفسطائیت میں مسٹر میکالے کی یہ ایک مثالی رپورٹ ہے۔ اسی طرح برنیر ایک فرانسیسی تھا جو مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ واپسی پر اس نے اپنا ایک سفرنامہ مرتب کیا، جس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے، اسی سفرنامہ میں اس نے حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ایک عجیب و غریب تقریر منسوب کی ہے جسے اپنے ایک رذیل الطبع لئیم الفطرت استاد کو مخاطب کرکے بادشاہ نے کی تھی۔ قدیم نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے عموماً برنیر کے اس افسانہ کو دہرایا جاتا ہے۔ مجھے تعجب شیخ محمد اکرم صاحب سے ہے جنھوں نے حال میں علاوہ غالب نامہ کے دو دلچسپ کتابیں لکھی ہیں۔ باوجودیکہ شیخ صاحب نوعمر نوجوانوں میں ہیں، اور بالکلیہ ان کی تعلیم جہاں تک میں خیال کرتا ہوں جدید تعلیمی مرکزوں میں ہوئی ہے جہیں سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے کامیاب کیا ہے، اور آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو کر برطانوی حکومت میں کسی معزز عہدہ پر ممتاز ہیں۔ بہرحال باوجود ان امور کے میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اتفاق سے ان کی ان دو کتابوں (آب کوثر) اور (موج کوثر) کو دیکھنے کا موقع ملا۔ خلاف دستور ابنائے عصر کی روش سے ہٹ کر ان میں وہ جستجو پیدا ہوئی جس کا پیدا ہونا ہر انسان میں تو ضروری ہے لیکن جدید تعلیم کے فیض یافتہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں اس فطری جستجو کا جذبہ مختلف ترکیبوں سے بجھا دیا گیا ہے۔ یہ سوالات کہ ہم کون ہیں؟ کن لوگوں سے گزر کر ہم نے دنیا میں قدم رکھا ہے۔ ہم سے نکلنے والی آئندہ نسلوں کا انجام کیا ہوگا، یا اس کو کیا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جانوروں ہی کا دماغ ان سوالوں سے خالی ہو سکتا ہے۔ لیکن شیخ اکرام صاحب ان صالح نوجوانوں میں ہیں جن کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ اپنے بزرگوں اور پچھلی نسلوں کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ اور اس سلسلہ میں حقیقت یہ ہے کہ ابتداء سے اس وقت تک ہندوستان میں علم و دین کے لحاظ سے بزرگوں کے جو طبقات گزرے ہیں مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ شیخ صاحب نے ان بزرگوں اور ان بزرگوں کے مقامات و خصوصیات کے جاننے میں اتنی کامیابی حاصل کی ہے کہ اس زمانہ کے مولویوں کی اکثریت بھی اس سے قطعاً ناواقف ہے، بہرحال باوجود اس کے (باقی بر صفحہ ۲۹۲)

Marfat.com

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہی جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہی، وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہی جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو"

یہ جنرل سلیمن کی رائے ہی، شیخ محمد اکرام صاحب جن کی کتاب غالب نامہ کے دیباچہ سے میں نے مذکورہ بالا فقرہ نقل کیا ہی وہ جنرل موصوف کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں کہ "ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں، اور جنھیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یوروپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا ہی"

اسی ملنے جلنے اور قریب سے دیکھنے کا یہ اثر ہی کہ تعلیمی ذوق میں بیس روپیہ ماہوار پانے والا ہندوستانی مسلمان ان کو انگلستان کے وزیر اعظم کا ہم رتبہ نظر آتا ہی، جنرل مذکور نے اس

(بقیہ صفحہ ۲۹۱) شیخ صاحب نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ قصہ تراشیوں اور دروغ بافیوں میں یوروپ کے یہ پُرانے سیاح اپنی آپ نظیر ہیں خود ان ہی نے اسی کتاب کے حصہ آب کوثر کے صفحہ ۶ پر محمود بیگڑہ گجرات کے مشہور مسلمان بادشاہ دفاتح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہی جو لوگ مغربی سیاحوں کی قصہ تراشیوں اور دروغ بافیوں کی مثالیں دیکھنا چاہتے ہیں وہ سلطان بیگڑہ کے متعلق ان کی روایات پڑھیں۔ اس کے بعد خود فرماتے ہیں یہ معتبر راوی کہتے ہیں کہ سلطان کی موچھیں اتنی لمبی تھیں کہ وہ انھیں سر کے اوپر لپیٹ کر گرہ دیتا تھا اور زہر کھانے کا اتنا عادی تھا کہ جو مکھی اس کے جسم پر بیٹھتی تھی وہ مرجاتی۔ شیخ صاحب نے اس واقفیت کے باوجود برنیر کے قصہ کو اس طریقہ سے نقل کیا ہی کہ گویا واقعی وہ کوئی حقیقت ہی۔ ابن تیمیہ بعض حدیثوں کے متعلق لکھتے ہیں تلوح علیہ امارات الوضع یعنی جعلی ہونے کی علامات خود اس کے اندر چمک رہے ہیں، یہی حال اس قصہ کا ہی، ایسا معلوم ہوتا ہی کہ عالمگیر ہندوستان کا مغل اعظم بادشاہ نہیں ہی بلکہ آج زمانہ کا کوئی اسکولی لڑکا ہی جو شہر کے اسکول میں کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد اپنے گاؤں کے میاںجی سے باتیں کر رہا ہی کہ واہ واہ میاں صاحب آپ نے تو مجھے جغرافیہ پڑھایا نہ تاریخ، آپ نے کچھ نہیں بتایا کہ دُنیا کے مختلف ملکوں کی کیا کیا پیداواریں ہیں اور نہ بتایا کہ دُنیا کے مختلف حصوں کے بادشاہوں کے نام کیا ہیں الخ میرے نزدیک تو نہ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ عالمگیر جیسے بادشاہ کی تقریر ہوسکتی ہی اور نہ تاریخوں سے عالمگیر کے کسی ایسے اُستاد کا پتہ چلا ہی جو پیٹ پکڑے بادشاہ کے سامنے بار بار نوکری کے لیے دوڑے پھرتے تھے۔

کے بعد لکھا ہے،

"جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں، وہی یہ لوگ (ہندوستانی مسلمانوں کے بچے) عربی اور فارسی میں سیکھتے ہیں۔"

بیان ان ہی الفاظ پر ختم نہیں ہوجاتا ہے، آگے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، میں نہیں جانتا کہ ایک انگریز مبصر کے ان الفاظ کو سُن کر ان بیچاروں کا کیا حال ہوگا۔ جنھوں نے ہزار ہا ہزار روپے، خرچ کر کے اپنے ناموں کے پیچھے آج ہندوستان میں آکسن اور کینٹب کے لاحقوں کے استعمال کا حق حاصل کیا ہے، جنرل سلیمن لکھتے ہیں،

"سات سال کے درس (یعنی درجہ فضل) کے بعد ایک (ہندوستانی) طالب العلم اپنے سر پر جو اکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے، دستار فضیلت باندھتا ہے، اور اسی طرح روانی سے سقراط ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے، جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب العلم۔" دیباچہ غالب نامہ صلا

شیخ صاحب نے اسی جنرل کی کتاب کی دوسری جگہ سے یہ فقرے بھی نقل کیے ہیں،

"ایک تعلیم یافتہ مسلمان (یعنی وہی جس کا نام اب مُلا مولوی وغیرہ ہے) فلسفہ اور ادبیات اور دوسرے علوم وفنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔"

آخر میں بالکل صحیح حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

"اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ اگر دینی تعلیم کے نظام کو دنیوی تعلیم کے اداروں سے الگ نہ کر دیا جاتا، تعلیم کی دُنیا میں یہ ثنویت نہ پیدا ہوتی، بلکہ دینی عناصر کو باقی رکھتے ہوئے وہی فقہ، حدیث وتفسیر کی تین کتابوں کو قائم رکھتے ہوئے بتدریج عقلی، اور ذہنی علوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں سے کام لیا جاتا، جس طرح مسلمان ہزار بارہ سو سال سے کام لے رہے تھے، تو کوئی د

Marfat.com

نہیں تھی کہ تعلیم کا جو نظام ہندوستان میں جاری تھا، وہ تمام عصری ترمیموں کو علم کی تمام شاخوں میں جذب نہ کر لیتا۔ جنرل موصوف نے بالکل تجربہ کی بات لکھی ہو کہ

"موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہو۔"

لوگوں کو معلوم نہیں ہو کہ مغرب کے جدید نظریات سے ہندوستان جب شروع شروع میں روشناس ہوا ہو، اس وقت اس کے چرچوں سے مسلمانوں کے مدارس جس طرح گونج رہے تھے، شاید یہ کیفیت ان تعلیم گاہوں میں بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی ہو، جہاں ان کی مستقل تعلیم دی جاتی ہو۔[1] زمین کی گردش، آسمانوں کے جرمی وجود سے انکار، بطلیموسی نظام کی جگہ شمسی نظام پر علم ہیئت کی بنیاد، آج تو ان کے تذکرے کبھی کبھی سننے میں آتے ہیں۔ لیکن پُرانے مدرسوں میں بحث و مباحثوں کے جو سلسلے ان مسائل کے متعلق جاری تھے اس کا اندازہ کچھ ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہو، جنھوں نے اس زمانہ کو دیکھا تھا مختلف کتابیں ریاضی کی جو اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں، جن میں سب سے ضخیم کتاب فارسی زبان میں جامع بہادر خانی ہو، جو تین فنون (ہیئت، حساب، علم المرایا والمناظر) پر مشتمل ہو، آپ کو جگہ جگہ اس کتاب میں ان جدید نظریات کا ذکر تفصیل سے ملے گا جو اس وقت تک یورپ میں مختلف مسائل کے متعلق پیدا ہو چکے تھے۔ عربی زبان میں علامہ تفضل حسین خاں نے مختلف کتابیں علوم ہندسیہ کے متعلق لکھیں جن میں حکماء یورپ کے خیالات کا تذکرہ تائید کے ساتھ

---

[1] جدید و قدیم نسلوں میں علمی مذاق کے اعتبار سے کتنا فرق پیدا ہو چکا ہو، اس کا اندازہ آپ کو اس ایک واقعہ سے بھی ہو سکتا ہو۔ مولانا شبلی مرحوم کے حوالہ سے سید سلیمان صاحب نے معارف کے شذرات میں لکھا تھا کہ مولانا بیان کرتے تھے میری کتاب المامون "جس وقت پریس سے نکلی، تو کل تین مہینوں میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا لیکن آخر عمر میں جب انھوں نے شعر العجم لکھی تو یہ خیال کر کے کہ بہ نسبت تاریخ کے ہندوستانی مسلمانوں کو فارسی ادب کا مذاق چوں کہ زیادہ ہو اس لیے یہ کتاب اس سے بھی زیادہ جلد ہاتھوں ہاتھ نکل جائیگی۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پانچ سال کی طویل مدت میں شعر العجم کے پانسو نسخے ختم ہوئے۔ صرف بیس تیس سال میں ملک کا علمی مذاق کس سطح سے اُتر کر کہاں پہنچ گیا، لیکن جز رہی کا نام مد رکھ دیا گیا ہو اور لوگ ترقی تعلیم کے الفاظ پر خوش ہیں ۱۲

Marfat.com

کیا گیا تھا۔ ان ہی پُرانے طرز کے مولویوں کو دلی کے عربی کالج کے زیر اثر جدید علوم وفنون سے روشناسی کے جو مواقع ملے تھے کاش ان میں تھوڑی سی وسعت برتی جاتی، تو ہندُستان کے علم کی دُنیا اور ہوتی، حیدرآباد میں جس شاندار طریقہ سے علوم جدیدہ کا استقبال قدیم مذاق کے امراء اور علماء نے کیا تھا، اس کا اندازہ آپ کو شمس الامراء بہادر کی دارالاشاعت کی کتابوں اور ان کے مدرسہ فخریہ کے نصاب سے ہوسکتا ہے۔ ایک صدی پہلے طبعیات وریاضیات میں شمس الامراء مرحوم اول وثانی نے اُردو زبان میں مختلف کتابیں تصنیف کرائیں خود پریس قائم کرکے ان کو شائع کیا۔ بہرحال ہندوستان میں کام کی ابتدا ہوچکی تھی، کہ بعض فاسد اغراض کے تحت حکومت کو غلط مشورہ دیا گیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا سو ہوا؟

غریب مولویوں کو بدنام کیا گیا، ان پر جھوٹے الزام تراشے گئے، جن میں سب سے بڑا افترائی الزام انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کا فتویٰ تھا[لہ]۔ اور لُطف یہ ہے کہ پھیلانے والوں نے ایک بات پھیلادی، تقریباً ایک صدی سے وہی رٹایا ہوا سبق رٹا جارہا ہے، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بغیر کسی شرم وحیا کے علانیہ کوچہ وبازار میں اسی سبق کو دہراتے چلے جارہے ہیں، اور کوئی نہیں پوچھتا کہ آخر یہ فتویٰ کس کتاب میں ہے، کس مولوی نے کب کہاں

لہ حالاں کہ معاملہ بالعکس ہے، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر سر سید احمد خاں وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے فتاویٰ عزیزی میں ایسا کوئی فتویٰ نفیاً یا اثباتاً نہیں ہے مگر شاہ صاحب کے سوا دوسرے علماء مثلاً حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے فتاویٰ میں دیکھیے ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں آپ کو جواز کا فتویٰ ملیگا، ایک موقع پر ارقام فرماتے ہیں:۔

"فی الواقع نفس تعلیم انگریزی کا شرعاً ممنوع نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زبان یہودی سیکھنے کا حکم کیا، جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہے۔ ملا علی قاری مکی کی شرح مشکوٰۃ میں ہے لا یعرف فی الشرع تحریم علم لغۃ من اللغات سریانیۃ کانت او عبرانیۃ هندیۃ کانت او ترکیۃ او فارسیۃ کانت او غیرها۔ (یعنی شریعت میں کسی لغت کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو، ایسی بات کسی دلیل سے معلوم نہیں ہوتی، خواہ لغت سریانی ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا ترکی یا فارسی وغیرہ کوئی ہو) مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی مرحوم صہ ج ۱

Marfat.com

کس بنیاد پر کس کو یہ فتویٰ دیا تھا۔ انیسویں صدی کے علماء کے فتووں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں ان میں ڈھونڈھا جاتا، لیکن اتنی فرصت کس کو ہے "دیوانہ گفت و ابلہ باور کرد" کی مثال اس سے زیادہ شاید ہی کسی چیز پر کبھی صادق آئی ہو۔ مولویوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہماری تعلیم کے نظام کو نہ توڑا جائے، اس کی قدر و قیمت نہ گھٹائی جائے۔ لیکن جو چیز دین نہیں تھی اس میں بھی وہ کسی ترمیم کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے یہ کس نے کہا؟ جس قوم نے اسی یورپ کے ایک حصہ یونان کے سارے علوم پر قبضہ اور ایسا قبضہ کر لیا کہ آئندہ دنیا کو یونانیوں کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوا مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا

کیا اسی یورپ کے علوم و فنون کے سیکھنے سکھانے سے وہ محض اس لیے انکار کر سکتے تھے کہ وہ یورپ کے علوم و فنون ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو فانی کر کے محض دوسروں کے ساتھ باقی رہنے سے ان کو انکار تھا۔ خود ہی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ انکار ان کا کس حد تک بیجا تھا۔

آج لوگوں کو کیسے باور کرائیے کہ شاہ عبدالعزیز جیسی ہستی جن پر آج ہندوستان کے علم حدیث کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اپنے وقت میں ان ہی کا فعل سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے خواص و عوام کے لیے نمونہ تھا، ملفوظات عزیزیہ میں حضرت کی زبانی منقول ہے کہ

"سکندر (الگزینڈر) و فریزر را از جملہ انگریزاں با من صحبت داشتہ اند"

ان میں سے فریزر کے متعلق شاہ صاحب کا ارشاد تھا کہ

"قابل و قابلیت دوست است از من چیزے خواندہ" صا۱۱

اور سکندر جو بظاہر کوئی فوجی افسر معلوم ہوتا ہے وہ تو شاہ صاحب کا اتنا گرویدہ تھا کہ شاہ صاحب سے اس نے تعویذ لیا تھا، اس کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، ملفوظات میں شاہ صاحب کی زبانی نقل کیا ہے کہ

"از جہت مردن بچ کودکان گو کہ ایشان را چنداں اعتقاد از تعویذ و طومار نیست لیکن باضطرار رجوع

کرد ایں چنیں اتفاقہ (کذا) ز زندان ہستند» صلا۱۴

سیٹھن نامی ایک انگریز کا بھی ذکر اسی کتاب میں ہی وہ اتنا معتقد تھا کہ پُرانی دلی میں حضرت شاہ صاحب جہاں پیدا ہوئے تھے بطور یادگار کے

«بنائے (مکانے) تیار کند چنانچہ بنا کردہ بود مگر درست نہ شد»

بہر حال میری غرض یہ ہی کہ بیچارے مولویوں کو بدنام کرنا کہ اُنھوں نے تنگ نظری سے کام لے کر مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے سے روکا، اس حیثیت سے قطعًا غلط ہی کہ وہ انگریزی پڑھنے کو حرام سمجھتے تھے۔ ہاں اُنھوں نے مقاومت ضرور کی۔ لیکن صرف اس کی کہ دین سے جاہل رکھ کر محض ذہنی علوم و فنون سے مسلمانوں کے عقول کو بیدار کرنا، غلط نتائج پیدا کریگا۔ ان کا تو فقط یہ اندازہ تھا، اور ہم تو اسی اندازہ کو واقعہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں، اور اب بھی علاج وہی اور صرف وہی ہی جو ان علماء نے سوچا تھا۔

خیر میں گفتگو اس پر کر رہا تھا کہ ہمارے ہندی نظام تعلیم اور اس کے نتائج کو اپنوں کے سوا غیروں نے بھی کس نظر سے دیکھا تھا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا چاہا جاتا ہی جس کی شہادت

سلہ اپنی تاریخ سے جو قوم جاہل کردی گئی ہوا سے سب ہی طرح کا دھوکا دیا جا سکتا ہی۔ ائمہ اربعہ میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حافظ ابن حجر نے ان کی سوانح عمری میں نقل کیا ہی کہ طب و نجوم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بقراط کی کتاب غیر اقوام کے لوگ امام شافعی سے پڑھنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے ایک امام یعنی امام شافعی ہی سے یہ روایت حافظ ہی نے درج کی ہی کہ ان کے شاگرد حرملہ کہتے تھے کان الشافعی یتاسّف ما ضیّع المسلمون من الطب ویقول ضیّعوا ثلث العلم و وکلوہ الی الیہود والنصاریٰ یعنی حضرت امام شافعی اس پر بہت افسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں نے علم طب کو کھو دیا۔ فرماتے کہ علم کا ثلث حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا اُنھوں نے اس فن کو یہود و نصاریٰ کے سپرد کر دیا۔ دیکھو توالی التاسیس صلا۶۶ امام شافعی دوسری صدی کے فقہ و حدیث علوم قرآنیہ کے امام ہیں۔ یہود و نصاریٰ سے آپ کا اشارہ عباسی دربار کے عیسائی اور یہودی اطباء کی طرف تھا۔ مسلمانوں کی رواداری کی انتہا ہی کہ یونانی طب میں اُنھوں نے خدا جانے کتنا اضافہ کیا، لیکن نام تک نہ بدلا اور آج تک یونانی طب کے نام سے مسلمانوں کی طب موسوم ہی ۱۲

Marfat.com

جنرل سلمن نے ادا کی، شیخ محمد اکرم صاحب (مد اللہ عمرہ و بارک فیہ) نے سچ لکھا ہے کہ

"ان سطور (یعنی سلمن کے گزشتہ بالا بیانات) سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اس زمانہ میں انگریزی نظام تعلیم سے یا اکسفورڈ کے موجودہ کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پست نہ تھا" ص۱۵

شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جن انگریزوں کو علمی اور دینی عقیدت تھی آخر یہ ان کے فضل و کمال کا اعتراف نہ تھا تو اور کیا تھا، یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ شاہ صاحب سے دینی یا مشرقی زبانوں ہی کے متعلق استفادہ ان کے یہ انگریز شاگرد اور معتقد کرتے تھے اسی ملفوظات عزیزیہ میں ہے کہ ان ہی انگریزوں میں سے ایک انگریز نے ایک دن شاہ صاحب سے پوچھا کہ شہر کے بعض کھاری کنوؤں کا پانی میٹھا کیوں ہو جاتا ہے؟ شاہ صاحب نے اس کا علمی جواب دیا، جو ذرا مبسوط ہے، اس لیے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ان غریب ہندی ملّانوں کے متعلق مسٹر ناس کول برک کی وہ یادداشت بھی قابل ذکر ہے، جس میں حکومت کو ان بے کسوں کی صحیح قدر و قیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ برک صاحب نے لکھا تھا:

"اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے علم و ادب کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا تھا نہ صرف علما کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے، بلکہ وہ جماعت بھی جس میں جوہر قابل پیدا ہوتا تھا، محدود ہوتی جاتی ہے، علوم نظری کا مطالعہ لوگ چھوڑتے جاتے ہیں، ...... اگر گورنمنٹ نے سرپرستی نہ کی تو اندیشہ ہے کہ صرف کتابیں ہی نہ مفقود ہو جائینگی، بلکہ ان کے پڑھانے والے بھی مفقود ہو جائیں گے"

آخر میں بیچارے نے بڑے دردناک لہجہ میں لکھا ہے:

"ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا، اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے آتے تھے آج وہ علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے" منقول از رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۳ء

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ جنرل سلمن نے مسلمانوں کی جن خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے یعنی ہندوستانی مسلمانوں میں

"جو کوئی بیس روپے کا متصدی ہوتا ہے، وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دلاتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو"

افسوس ہے کہ ہماری جن خصوصیتوں پر غیروں کی نظر پڑتی ہے، قرب و نزدیک کی وجہ سے خود ہماری نگاہوں سے وہ کبھی کبھی اوجھل ہو جاتی ہیں، آج ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جہالت کا ایک عام رونا ہے، لیکن جن قوموں کو بتا بتا کر عار دلایا جاتا ہے ایک تو ان کی تعداد نیز اس پر بھی نظر نہیں کی جاتی کہ اب تک ان میں تعلیم جو کچھ بھی پھیلی ہے وہ اس مخصوص طبقہ تک محدود ہے جس کا کام ہی لکھنا پڑھنا ہے مثلاً برہمن اور کائیست لیکن عوام کا جو حال ہے اس کو لوگ نہیں دیکھتے اس کے سوا مسلمان موجودہ نظام تعلیم سے جو دل برداشتہ ہیں اس کی اصلی وجہ وہی تعلیم کی ثنویت ہے، جہاں دین کی تعلیم ہوتی ہے وہاں دنیا نہیں ملتی، اور جہاں دنیا ملتی ہے وہاں کھلم کھلا دیکھا جا رہا ہے کہ دین کو کھو کر لوگ دنیا حاصل کر رہے ہیں، یہ ایسی سخت کش کش ہے جس نے مسلمانوں کے عام طبقات سے اس تعلیمی جوش کو دھیما کر دیا ہے جس کا نظارہ مسٹر سلمن نے اس وقت کیا تھا جب مسلمانوں کا جوش باوجود حکومت کھو دینے کے کم نہیں ہوا تھا،

قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے والد کا نوعمری میں انتقال ہو گیا، سرپرست صرف والدہ صاحبہ رہ گئی تھیں، قدرتاً ایسی حالت میں بچوں میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے، قاری صاحب پر سیر و شکار کا شوق غالب آ گیا، پڑھنا لکھنا چھوڑ بیٹھے، اب سنیے ان ہی کی زبانی ان کی سوانح عمری میں یہ قصہ نقل کیا گیا ہے:

"ان کی والدہ بیچاری یہ حالت دیکھ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئیں، فرط محبت سے بار بار سمجھاتیں مگر آپ ہوں ہاں کہکے ٹال دیتے...... ایک روز والدہ نے پاس بلایا اور نہایت درد و محبت کے ساتھ سمجھانے لگیں، سمجھاتے سمجھاتے ان کی طبیعت بھر آئی، رونے لگیں، انھیں روتا دیکھ کر

آپ رونے لگے، اس واقعہ کا دل پر اتنا اثر ہوا کہ اسی وقت تمام نکمے مشغلوں سے طبیعت کو نفرت ہوگئی اور تحصیل علم کا شوق موجزن ہوگیا" تذکرہ رحمانیہ ص۱۳

یہ تیرھویں صدی کی ایک بیوہ مسلمان خاتون کی کیفیت ہے. حضرت سلطان المشائخ کے حال میں بھی لکھا ہے آپ کو بھی بچپن ہی میں داغ یتیمی اٹھانا پڑا، آپ کی تعلیم بھی والدہ ہی کے شوق تعلیم کی رہین منت ہے کسی موقع پر ذکر آئے گا کہ بسا اوقات گھر میں فاقہ ہوتا تھا لیکن تعلیم بہر حال جاری تھی جب متوسطات آپ کی ختم ہوئی ہے اور استاد نے بداؤں میں چاہا کہ دستار باندھیں تو کرمانی نے لکھا ہے:

"ایں حکایت پیش والدہ خود گفت اں مخدومہ جہاں . . . . خود ریسمانے برشت و دستارے ازاں بافانیدہ چوں سلطان المشائخ آں کتاب تمام کرد والدہ بزرگوار بتقریب طعامے کرد"

سیر الاولیا ص۹۵

بہر حال تعلیم کا جو نظام ہندوستانی بزرگوں نے قائم کیا تھا، اس کی نفع بخشی کے متعلق یہ تو وہ بات تھی جسے آپ چاہے تو منطق کی اصطلاح میں برہان انی قرار دے سکتے ہیں. میں نے نمونے کے چند پھل پیش کر دیے ہیں، اس کے بعد بھی درخت کی بے ثمری کا کسی کو شکوہ باقی رہ جائے تو ایسوں کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

النجم تستصغر الابصار صورتہ ۔۔۔ والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر

تارے نگاہوں کو چھوٹے نظر آتے ہیں ۔۔۔ اس میں گناہ نگاہ کا ہے نہ کہ تارے کا

بلکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ان نتائج کو دیکھ کر ہم ٹھنڈے دل سے تمام عصری مشاغلوں سے جدا ہو کر سوچتے کہ جس نصاب میں "دینیات" کا حصہ اتنا قلیل ہے، اسی سے ایسے عظیم نتائج کیوں پیدا ہوتے رہے، اگرچہ ضمناً اس کی طرف اشارہ کرتا چلا آیا ہوں، لیکن شاید میرے یہ اشارے کافی نہ ہوں، نیز میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ خود اس نصاب کی خصوصیتوں کی طرف بھی آخر میں توجہ دلاؤں گا. گویا اس "انی برہان" کے مقابلہ میں اب جو کچھ کہا جائیگا،

Marfat.com

اس کی حیثیت برہان لمّی کی ہوگی۔

بات یہ ہو کہ تعلیم ہی پر نوع انسانی کے ارتقار کی بنیاد قائم ہو۔ یہ ایک ایسا مسلّمہ مسئلہ ہو جس میں شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں ہو۔ آخری پیغام میں صلّ (نماز پڑھ) صم (روزہ رکھ) وغیرہ احکام کی جگہ پہلا خطاب جس سے نوع انسانی کو اس کے آخری پیغام پر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا وہ اقرأ (پڑھ) کا لفظ تھا، جس رب نے قلم سے سکھایا، اس کی یاد دلاتے ہوئے

علم الانسان مالم یعلم — سکھایا اس رب نے "الانسان" کو جسے وہ نہیں جانتا

پر اپنے اس "خطاب اول" کو ختم فرمایا گیا ہو، خود یہ دلیل ہو کہ اپنی آخری نشأت اور اٹھان میں انسانیت کا بنیادی کام "تعلیم" ہی ہو، اور ہو بھی یہی واقعہ کہ جیتے جی آخر وقت تک جس کسی کو جو کچھ کرنا ہو الانسان کے سوا سب ہی اس کا علم لے کر پیدا ہوتے ہیں جو نہیں معلوم تھا، اس کا علم نہیں حاصل کرتے، بلکہ جو کچھ معلوم تھا صرف اسی پر عمل کر کے اپنی آخری سانس پوری کرتے ہیں شناوری کا علم بط کا بچّہ انڈے کے اندر سے لاتا ہو، لیکن بوڑھا ہو کر یہی بچّہ جب مرتا ہو تو جو علم لے کر پیدا ہوا تھا، مرنے کے وقت بھی اس علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سب کا یہی حال ہو، لیکن ان میں صرف ایک آدمی زادہ ہو کہ پیدا ہوتا ہو ہوش و تمیز عقل و خرد سے خالی ہو کر، لیکن مرتا ہو حکیم و علامہ فاضل و طبیب مہندس بن کر، مالم یعلم (جو کچھ نہیں جانتا) یہ انسان کی خصوصیت ہو کہ زندگی بھر اسی کو جانتا رہتا ہو، اس کے رب نے اس کی فطرت یوں ہی بنائی ہو، یہی مطلب ہو ان لوگوں کا جو پہلی وحی کے خطاب اول کے آخری الفاظ علم الانسان مالم یعلم (سکھائی انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا) کی تاویل میں کہتے ہیں کہ الانسان ایک تعلیمی حقیقت ہو یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت صرف اسی میں ہو، ورنہ اس کے سوا دل و دماغ لے کر جتنے پیدا ہونے والے پیدا ہوے ہیں، وہی جانتے ہیں، جس کا جبلّی اور فطری علم لے کر وہ پیدا ہوئے؛ اس کے سوا وہ

Marfat.com

اور کچھ جان ہی نہیں سکتے خواہ جینے کا موقعہ اس دنیا میں ان کو جتنا بھی دیا جائے ان کی عمر گدھ ہی کی عمر کیوں نہ ہو۔ الانسان کی یہی صلاحیت ہے، جس کا ظہور قراۃ (خواندگی) اور تعلیم بالقلم (نوشت) سے ہوتا ہے اسی کی طرف خطاب اول میں ایما فرمایا گیا ہے[1]۔ خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ علم الانسان مالم یعلم (الانسان جو نہیں جانتا ہے، اسے جانے) کی انسانی فطرت میں جو قدرتی صلاحیت ہے، اسی صلاحیت کو جہاں تک ممکن ہو بر روئے کار لانے کے لیے چمکایا جائے، مانجھا جائے، دھویا جائے، صاف کیا جائے۔ اور قدیم تعلیم ہو یا جدید، سب کا حقیقی نصب العین یہی رہا ہے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جدید تعلیم آدمی میں ریل و موٹر بنانے گراموفون اور ریڈیو کے ایجاد کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور غریب عوام اس سے

[1] اصل یہ ہے کہ جن لوگوں سے پیغمبر کا وطنی یا نسلی تعلق ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ پیغمبر جن لوگوں میں پیدا ہوتا ہے پیغام کی زبان تو پیغمبر کی وہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ بھیجا بھی جاتا ہے ان ہی لوگوں کی طرف جن میں وہ پیدا ہوتا ہے یا جن سے اس کا وطنی یا نسلی تعلق ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ غیر ضروری ہے۔ ایسا پیغمبر جو صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہو اس کے ساتھ تو اتفاقاً یہ صورت پیش آجاتی ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے، ان ہی لوگوں کی زبان اس کے پیغام کی زبان ہوتی ہے۔ لیکن جو "الناس جمیعًا" اور کافۃ للناس" کی طرف مبعوث ہو، دُنیا کی ساری قومیں ساری امتیں اس کی مخاطب ہوں، ایسے پیغمبر کے لیے کیا کیا جاتا، کیا دنیا کی ساری قوموں کی ہر ہر زبان میں اس کو پیغام دیا جاتا، عملی دشواریوں کے ساتھ لاکھ لاکھ زبانوں میں، اس پیغام کی تعبیر اس کی کیا حالت بنا دیتی، جب ایک ہی زبان والے پیغام کی تاویلوں اور تفسیروں میں لوگوں نے اتنے اختلافات پیدا کر دیے۔ آسان صورت یہی تھی اور یہی کیا بھی گیا کہ جن لوگوں میں وہ پیدا ہوا تھا۔ ان ہی کی زبان اس کے پیغام کی زبان رکھی گئی، وہ کلیۃً بھی باقی رہا کہ پیغمبر اپنی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا گیا لیکن جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا، ان میں سے خود اس کی قوم تو اس کی زبان سے واقف ہی تھی ان کے سوا دنیا کی دوسری قوموں کے لیے ابتدائی خطاب ہی میں اشارہ کیا گیا۔ وہ سب کے سب انسان ہیں۔ بیل اور گھوڑے نہیں ہیں۔ اور الانسان کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ جس چیز کو نہیں جانتا ہے اس کے جاننے کی جس زبان سے ناواقف ہے اس کے سیکھنے کی اس میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے یہی صلاحیت پیغام کو عام بنانے کے لیے کافی ہے ۱۲

یہ سمجھ جاتے ہیں کہ واقعی دُنیا کی عصری جامعات تعلیمی ادارے نہیں، بلکہ دستکاریوں کے کرگہ (کارگاہ) یا کارخانے ہیں، لیکن ان کو پھر تعجب ہوتا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ معاشیات ونفسیات السنہ ولنگویجز ہی کے اساتذہ نہیں، جو فنون کے معلّم ہیں، بلکہ کیمیا اور طبیعیات (سائنس و حکمت) کے معلمین کی بھی موٹر جب خراب ہوتی ہے تو بنانا تو بڑی بات ہے، معمولی کل پُرزوں کی اصلاح بھی نہیں کر سکتے، عالم پروفیسر کھڑا تاکتا رہتا ہے، اور جاہل شوفر اپنی فنی مہارت کا اظہار کرتا ہے، بجلی کا کوئی تار ٹوٹا، اور برقیات ہی کا اُستاد کیوں نہ ہو، مستری کی چیخ سے آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مغالطہ اصل حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے تعلیم گاہوں میں جو کچھ بھی تعلیم دی جاتی ہے، ان کا بالکلیہ تعلق علمی نظریات اور کلیات سے ہوتا ہے، ایسے نظریات اور کلیات جن کی روشنی میں فطرت کے نوامیس (قوانین) واضح ہوتے ہیں، اب یہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی قوانین ونوامیس کے علم سے آدمی کسی ایسی چیز کو ایجاد کرلے، جس کا علم پہلے سے اسے حاصل نہ تھا، مطلب یہ ہے کہ جامعاتی تعلیم ایجادات واختراعات کے لیے مقدمہ کا کام دے سکتی ہے[1] لیکن یہ باور کرنا کہ ان جامعات میں بھی چیزوں کے بنانے اور ڈھالنے کا کام طلبہ سے کرایا جاتا ہے۔ نہ یہ واقعہ ہے اور نہ مدارس کے قیام کی یہ غرض ہے۔ تعلیم کی غرض جو ہمیشہ سے تھی، وہی مقصد اب بھی ہے۔ پہلے بھی وہی مالم یعلم (جسے نہیں جانتا) کے متعلق یعلم (انھیں جانے) کی صلاحیتوں کی نشو ونما میں کوشش کی جاتی تھی، اور اب بھی جبلت

---

[1] میں نے سکنے کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عصر حاضر کے محیر العقول درحقیقت محیر العقول ایجادات کے متعلق اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عموماً ان کے ایجاد کرنے والے زیادہ تر ایسے افراد ہیں جو جامعاتی تعلیم سے محروم تھے، تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے شاً بیسویں صدی کے سب سے بڑے موجد ایڈیسن صاحب گراموفون وغیرہ کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ ان کی تعلیم اسکول کے ابتدائی درجوں سے زیادہ نہ تھی حالاں کہ اس صدی کی بیش تر ایجادات اسی شخص کی فکر ونظر کی مرہون منت ہیں اور ایک ایڈیسن کیا آپ کو موجدین کے گروہ میں زیادہ تر وہی لوگ نظر آئیں گے جنھوں نے نہ سائنس پڑھی تھی نہ کیمیا سیکھا تھا والقصۃ بطولہا ۱۲

Marfat.com

بشری کی اسی عجیب و غریب قدرتی ودیعت کو ابھارنے اور اجاگر کرنے میں سارا زور صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ فنون کا شعبہ ہو یا سائنس (حکمت) کا۔

میرے سامنے اس وقت دوسرے علوم و فنون اور ان کی تعلیم و تعلم کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ بحث کا دائرہ صرف اسلامی علوم کی حد تک محدود ہے، یعنی قرآن و حدیث و فقہ و عقاید کی تعلیم کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یا کیا ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اگر ان علوم کی تعلیم کا مقصد معلومات کی گرداوری ہو، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے نصاب قدیم میں دینیات اور خالص اسلامی علوم کی تعلیم میں غفلت بلکہ مجرمانہ غفلت برتی گئی، ظاہر ہے کہ پورے نصاب میں چند مختصر فقہی متون کے علاوہ جیساکہ عرض کر چکا ہوں، جلالین جیسی تفسیر اور مشکوٰۃ جیسے مجموعہ حدیث، اور ہدایہ و شرح وقایہ جیسی کتابوں سے ان علوم کے متعلق کیا معلومات فراہم ہو سکتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان علوم میں سے ہر علم کی حالت یہ ہے کہ بیس بیس تیس تیس جلدوں میں اس کی ایک ایک کتاب پائی جاتی ہے، تفسیر کا فن جس میں جریر طبری، درمنثور، روح المعانی، تفسیر کبیر جیسی ضخیم کتابیں ہوں، اسی فن میں صرف بیچاری جلالین طلبہ کو کیا معلومات عطا کر سکتی ہے، جس کے الفاظ کہا جاتا ہے کہ قرآنی الفاظ کے مساوی ہیں اور حدیث و متعلقات حدیث و رجال، علل، سیرت، اصول حدیث کے طول و عرض کا کیا ٹھکانہ ہے۔ کتب خانوں کے کتب خانے صرف ایک حدیث و متعلقات حدیث کی کتابوں سے بھر دیے جا سکتے ہیں۔ یہی حال فقہ کا ہے، خود ہدایہ ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے

شرحها شرحًا فی نحو ثمانین مجلدات — اسی جلدوں میں شرح لکھی ہے اور اس کا نام

وسماه کفایة المنتهی — مفتاح ص ۲۶ — کفایۃ المنتہی ہے۔

اور اسی کا خلاصہ ہدایہ ہے، اور اس علم کے فتاوی محیطوں اور حاویات (انسائکلوپیڈیاز) اور وہ بھی ہر ہر مذہب کی کتابیں کیا حصر و شمار میں آ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی حدیث و

فقہ میں مشکوۃ اور ہدایہ و وقایہ کی معلومات کے اعتبار سے کیا حیثیت ہے؟

پس اگر تعلیم معلومات کی گرداوری کا نام ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ان فنون میں سے کسی ایک فن کے لیے بھی طالب علم کی پوری عمر وفا کر سکتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کسی ایک فن کی دو تین کتابوں کو درساً درساً پڑھتے ہوئے لحد تک پہنچ جائے گا، بشرطیکہ مہد ہی سے اس نے پڑھنا شروع کیا ہو۔ لیکن اگر تعلیم کا وہی مقصد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا، یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کو جاننے کی انسان میں جو قدرتی صلاحیت ہے اس صلاحیت کو ابھارا جائے۔ طلبہ میں ایک ایسی استعداد اور اس کا راسخ ملکہ پیدا کیا جائے کہ تعلیمی زندگی سے الگ ہونے کے بعد اپنے متعلقہ فنون کے حقائق و مسائل تک استاد کی اعانت کے بغیر اس کی رسائی ہونے لگے، خود سوچنے کی اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی خواہ وہ کسی قسم کی پیچیدہ اور دقیق تعبیر میں پیش کی گئی ہوں، تنقید یا صحیح کو غلط سے جدا کرنے کی صلاحیتوں کو مدرسہ سے لے کر باہر نکلے، اگر پڑھنے پڑھانے کا یہی مطلب ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ چیزوں کو دکھانے پر زیادہ زور دینا مقصود نہ ہو، بلکہ دیکھنے کی قوت بڑھائی جائے، جہاں تک بڑھ سکتی ہو، تعلیم صرف اس کا نام ہو، اور دیکھنے سیر کرنے کا کام تعلیم کے بعد کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں نے اسلامی علوم کی تعلیم کی جو راہ بنائی تھی، اس سے بہتر راہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے جیسا کہ آپ سن چکے کہ عربی تعلیم مدارج کے لحاظ سے دو درجوں میں تقسیم تھی، ایک ضرورت کا درجہ تھا دوسرا افضل کا، ضرورت کے درجہ تک مذہب کی تعلیم حاصل کر کے جو تعلیم کو ختم کر دینا چاہتے تھے، ان کی غرض فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنی شخصی زندگی میں معمولی مذہبی اور دینی ضرورتیں جو ان کو پیش آئیں گی، ان ضرورتوں کی حد تک دین کے سمجھنے کی ان میں لیاقت پیدا ہو جائے، گزر چکا کہ اس کے لیے صرف و نحو کی معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد قدوری وغیرہ جیسی فقہی متن کی کوئی کتاب پڑھا دی جاتی تھی اور یہ اتنا مختصر

Marfat.com

نصاب ہوتا تھا کہ کوشش کرنے والے چاہتے تو چھ مہینوں میں اسے ختم کر سکتے تھے، حضرت سراج عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں مولانا فخر الدین زرادی کا وہ قول نقل کر چکا ہوں کہ انھوں نے ذمہ داری لی تھی کہ چھ مہینہ میں قدر ضروری والے علم تک پہنچا دوں گا، اور جو انھوں نے وعدہ کیا تھا پورا کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی ضرورتوں کے لیے مذہب کی اتنی تعلیم کافی نہ تھی، خدا جانے اس زمانہ میں لوگ کس طرح سوچتے ہیں، میں بار بار کہتا چلا آرہا ہوں، جن زبانوں کو مسلمان بولتے ہیں، عربی کے سوا اور جتنی اسلامی زبانیں ہیں، سب میں قرآن وحدیث کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، جسے مادری زبان کے الفاظ کی حیثیت سے لوگ یونہی جانتے ہیں، آئندہ غیر عربی زبان والوں کو جو کچھ دشواری رہ جاتی ہے وہ کچھ عربی صیغوں کے مختلف اشکال کی اور کچھ عربی جملوں کی ترکیبوں کی، صرف ونحو کی معمولی تعلیم کے بعد خواہ قرآن سبقاً سبقاً پڑھایا جائے یا نہ پڑھایا جائے بجز معدودے چند الفاظ کے جنھیں لغت کی معمولی کتابوں یا کسی فارسی اُردو کے ترجمہ یا تفسیر سے بآسانی حل کر لیا جا سکتا ہے، اپنے سادہ سیدھے معنی کے حساب سے یقیناً بہ سہولت تمام سمجھا جا سکتا ہے، اور ہمیشہ یونہی وہ سمجھا گیا ہے، قرآن کے بعد اب رہ گئی قرآن کی عملی تشکیل، بلاشبہ اس کا ذخیرہ دراصل حدیث ہی کی کتابوں میں ہے۔ لیکن اس ذخیرے سے صحیح نتیجہ نکالنا، کیا ہر معمولی آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ فقہ آخر ہے نام کس چیز کا؟

احادیث و آثار کا وہی ذخیرہ جس سے ہر معمولی آدمی استفادہ نہیں کر سکتا، اسی خام مواد سے بحث و تنقیح، توفیق و ترجیح، جرح و تعدیل کے بعد آئمہ مجتہدین نے جن پختہ نتائج کو پیدا کر کے امت کے حوالہ کیا ہے، کیا فقہ اس کے سوا بھی کچھ اور ہے؟ وہ امام ابو حنیفہ کی فقہ ہو یا امام شافعی کی، حال تو یہ ہے کہ فقہ کے سینکڑوں ابواب کے بلا مبالغہ ہزارہا ہزار مسائل اور ان کے متعلقہ مباحث کو عوام کیا طے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں پچھلے دنوں کل

Marfat.com

چار مسئلوں کو لے کر یعنی رفع الیدین، قراۃ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر والخفا رتین تو یہ ہوئے اور ایک شاید سینے پر ہاتھ نماز میں باندھا جائے یا زیر ناف، نماز کے ان چار مسئلوں پر پچاس برس سے حدیث کی کتابیں اُلٹی پلٹی جارہی ہیں۔ رسالوں پر رسالے نکل رہے ہیں، مناظرے ہو رہے ہیں، مقدمے چل رہے ہیں، لیکن قطعی فیصلہ ہنوز روز اول کی حالت میں ہے، خیال تو کیجیے کہ الزکوۃ، الصوم، الحج، البیوع، الاجارات، الوصایا، الوقف وغیرہ وغیرہ بیسیوں ابواب میں سے صرف تین چار مسئلوں میں جب لوگوں کا یہ حال ہے تو کیا ان ہی لوگوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں حدیث و آثار کی کتابوں سے یہ اپنے لیے صحیح نتائج پیدا کر سکتے ہیں، مختلف آثار و روایات میں سنداً و متناً جو دقیق علمی مباحث پیدا ہوتے ہیں کیا اس خام ذخیرے سے پختہ نتائج کا پیدا کرنا ہر شخص کا کام ہو سکتا ہے، اور بالفرض کوئی اس کی ہمت کر بھی گزرے تو دوسروں سے نہیں خود اسی کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ جو وزن امام ابوحنیفہ، مالک و شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ ائمہ کے فیصلوں کا ہے وہی وزن وثوق و اعتماد کی وہی کیفیت کیا وہ اپنے فیصلوں میں پاسکتا ہے؟

کچھ بھی ہو قدوری اور کنز کا لفظ بولنے میں تو نہایت سبک اور ہلکا سا معلوم ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ کتابیں اسلام کے بہترین دل و دماغ کی انتہائی عرق ریزیوں کے آخری منقح نتائج ہیں، خدا جزا رخیر دے ان بزرگوں کو جنھوں نے دین کی دشواریوں کو حل کر کے مذہبی زندگی گزارنے والوں کے لیے راہ آسان کر دی۔

بزرگوں نے انتہائی احتیاط سے کام لے کر سیکڑوں تصنیفات سے ان چند متون کا انتخاب اس لیے کر دیا ہے کہ ان کے مصنفین کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بیان پر بھروسہ کیا جاتا ہے، یہی قدوری ہے، عوام کو شاید معلوم نہ ہو لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ تقریباً ایک ہزار سال کا یہ قدیم مستند متن متین ہے۔ مشہور امام ابوالحسین بن ابی بکر القدوری البغدادی المتوفی ۴۲۸ھ نے بیسیوں کتابوں سے کہا جاتا ہے کہ بارہ ہزار ضروری

مسائل کا انتخاب فرمایا[1]۔ عہد تصنیف سے آج تک یہ کتاب پڑھائی جارہی ہے، قطع نظر دوسری باتوں کے اس قسم کی کتابوں کا ایک بڑا نفع یہ بھی تھا کہ ایک ایک کتاب سے تین تین چار نسلیں درسی فائدہ اٹھاسکتی ہیں۔ آج جدید مدارس و کلیات میں نصابی کتابوں کی تبدیلی کا جو ایک عارضہ ہے، اس کا یہ نتیجہ ہو رہا ہے کہ جن کتابوں کو پڑھ کر بڑے بھائی نے امتحان میں کامیابی حاصل کی، چند ہی سال کے بعد چھوٹا بھائی جب اسکول میں آتا ہے تو ان ساری کتابوں کو بے کار پاتا ہے جن سے اس کا گھر بھرا رہتا ہے، لیکن اس کا نصاب بدل چکا ہے، بڑے بھائی کی پڑھی ہوئی کتابیں سب بے قیمت ہو چکی ہیں، اور لطف یہ ہے، جن کتابوں کو نکال کر ان کی جگہ دوسری کتابیں رکھی جاتی ہیں، مضامین و مسائل کا طریقہ بیان کسی لحاظ سے بھی عموماً وہ گزشتہ کتابوں سے بہتر نہیں ہوتا، اور اب تو حال یہ ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے ادھر اُدھر سے چند انتخابات کا مجموعہ مرتب کر کے نصاب کی کمیٹیوں میں پیش کر دیتا ہے۔ پھر اندرونی اور بیرونی کوششوں سے نصاب میں شریک کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس طریقہ سے کتاب بیچنے والے تو لاکھوں لاکھ کا سرمایہ سمیٹ لیتے ہیں اور بدقسمتی سے جن غریبوں کو چند بچوں کے باپ ہونے کا شرف حاصل ہوا، ہر سال ہر بچہ کی نئی کتابوں کے لئے ایک کافی رقم خرچ کرنے پر مجبور ہوتا ہے، خیر جس زمانہ میں تعلیم گاہوں کو بھی تجارت گاہوں سے بدل دیا گیا ہو، اس زمانہ میں جو کچھ بھی نہ کیا جائے کم ہے لیکن ہمارا جو نظام تعلیم تھا، ہمیشہ اس کی سخت نگرانی کی جاتی تھی کہ جب تک کوئی بہتر کتاب ظہور میں نہ آجائے، نصاب کی مروجہ کتابوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں، آپ سن چکے کہ ہزار سال تک کی کتاب (قدوری) ہمارے

---

[1] قدرت نے اس کتاب کی عظمت سنی مسلمانوں میں اتنی بڑھادی ہے کہ طاش کبری زادہ نے لکھا ہے: ان ھذا المختصر تبرک بہ العلماء حتی جربوا قرائتہ او قات الشدائد وایام الطاعون (علماء اس کتاب سے برکت حاصل کرتے ہیں مصائب اور طاعون میں اس کو آزمایا گیا ہے) کشف الظنون وغیرہ۔ اور چیزیں اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہیں لکم از کم اتنا تو ہمیں بھی ماننا چاہیے کہ مصنف کے تقوی اور تقدس کا اثر پڑھنے والوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

Marfat.com

درس میں اب تک موجود ہے، یہی حال مثلاً ہدایہ کا ہے، علامہ مرغنیانی[1] صاحب ہدایہ کی وفات پر ساڑھے سات سو سے زیادہ زمانہ گزر چکا، جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب نصاب میں شریک کی گئی ہے، چوں کہ فقہ حنفی کی کوئی دوسری کتاب اب تک ایسی تصنیف نہیں ہوئی کہ اس کی قائم مقامی کر سکے[2]، بزرگوں نے اسی کو اب تک باقی رکھا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں کے اس طرز عمل پر عہد حاضر کے تجارتی کاروبار کو کس بنیاد پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

خیر میں کس مسئلہ میں اُلجھ گیا، برساتی کیڑوں کی طرح نصابی کتابوں کی پیدائش کا مسئلہ نہ صرف اپنی بے حاصلی کی وجہ سے قابل بحث ہے، بلکہ غریب ہندوستان کے غریب باشندوں کے لیے ایک مستقل معاشی اور اقتصادی سوال بنا ہوا ہے۔ کاش جہاں اور مسائل پر توجہ مبذول ہو رہی ہے ملک کے بہی خواہوں کی نگاہ اس علانیہ لوٹ پر بھی پڑتی، جو علم کے طلبہ پر تاجران کتب کی طرف سے مسلسل جاری ہے، محکمۂ تعلیمات ان کا پشتیبان ہے، اور محکمہ کو زور حکومت کی بندوق اور توپ سے حاصل ہے، ان کتابوں کا نہ خریدنے والا یا اردوزی سے محروم ہو یا بغاوت کا مجرم ٹھیرایا جائے۔ بالفعل ان چند ضمنی اشاروں پر بحث کو ختم کر کے پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا، کہ ضروری نصاب کا تو یہ حال تھا، مذہب کی تعلیم ذاتی

---

[1] عام طور پر کتابوں میں صاحب ہدایہ کا وطن مرغنیان ہی بتایا جاتا ہے، جو مراغد کا ایک قصبہ ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ کے ہم وطن بادشاہ بابر نے تزک میں صاحب ہدایہ کے گاؤں کا نام "رشدان" بتایا ہے جو مرغنیان کے تعلقہ میں تھا ۱۲

[2] حضرت زیلعی کی کتاب نصب الرایہ مجلس علمی ڈابھیل کے مصارف سے چھپ کر آئی ہے۔ اس کے شروع میں مولانا یوسف بنوری کا ایک مختصر سا پیش نامہ بھی ہے مولانا نے حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا قول براہ راست ان ہی سے سُن کر نقل کیا ہے کہ فتح القدیر ابن ہمام کی جیسی کتاب لکھنے کے لیے اگر مجھ سے کہا جائے تو اس کام کو میں کر سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی کتاب لکھنے کا مطالبہ کیا جائے تو ہرگز نہیں کے سوا اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔ علامہ کشمیری کی جلالت شان سے جو واقف ہیں وہ ان کے اس قول کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غالباً خاکسار سے ہی حضرت شاہ صاحب نے یہ فرمایا تھا ۱۲

Marfat.com

ضرورت کے لیے اس حد تک کافی ہے، مدت تک ضرورت کے اس نصاب میں فارسی کے سوا تھوڑی بہت عربی یعنی وہی معمولی صرف ونحو، اور کچھ فقہی مسائل کی تعلیم مذہب کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی، آج جس طرح میٹرک تک انگریزی زبان اور معمولی حساب وکتاب کی واقفیت کے بعد لوگ سرکاری محکموں میں داخل ہوجاتے ہیں، اس وقت بھی حکومت کی زبان جو بجائے انگریزی کے فارسی تھی اور نوشت وخواند حساب وکتاب دسیاق وتحریر کے ڈھنگ سے واقف ہوجانے کے بعد دفتری ملازمتوں میں شریک ہوجاتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ آج کل مذہب کی تعلیم بحث سے خارج ہے اور اس وقت لکھے پڑھے لوگوں کے لیے مذہب اور مذہب کے لیے وہی تھوڑی سی بقدر ضرورت عربی بھی ضروری تھی، انتہا یہ ہے کہ انگریزی عہد تک میں پرانے علمی خاندانوں کے بچے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود گھر میں فارسی اور ابتدائی عربی ضرور سیکھ لیتے تھے۔ مسٹر ہمایوں مرزا جو پٹنہ کے ایک عالم رئیس کے لڑکے تھے، ان کے والد مرشد آباد کی نوابی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے، حالانکہ ہمایوں مرزا کی تعلیم بالکلیہ انگریزی ہے، ہندوستان ہی نہیں، بلکہ یورپ تک اسی تعلیم کی تکمیل کے لیے گئے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بچپن کے حالات میں اپنے مکتبی مولوی[1] صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی کے ساتھ ساتھ

"اُنھوں نے میزان الصرف ختم کرائی اور منشعب وتصریف وغیرہ پڑھائی۔ ص۳۳

قدیم فارسی خوانوں کی کتابوں اور خطوط ومکاتیب میں اشعار، عربی زبان کے فقرے، قرآنی

---

[1] آہ یہ مکتبی مولوی جس کی تنخواہ بمشکل دس پندرہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی، محلہ یا گاؤں کے رئیس اپنے بچوں کے لیے ان کو رکھتے تھے. لیکن محلہ اور گاؤں کے بچے ان ہی مولوی صاحب سے مفت یا ۲ر، ۴ر دے کر اس سے زیادہ فارسی سیکھ لیتے تھے جتنی کہ اسکولوں میں انگریزی بھی سکھائی نہیں جاتی، اور فارسی تو ان ہی مکتب خانوں میں وہی دُو دُو آنے چار چار آنے دے کر اتنی پڑھائی جاتی تھی کہ کالجوں میں بھی اتنی فارسی طلبہ کو نہیں آتی حالانکہ پڑھانے والے اساتذہ پانچ اور دس نہیں پانچ سو اور دس سو اسی فارسی کے پڑھانے کے لیے پاتے ہیں ۱۲

Marfat.com

آیتیں وغیرہ جو پائی جاتی ہیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا، شاید آخر زمانہ میں جب دلّی کی حکومت کمزور ہوئی، عربی کا لزوم جاتا رہا، اور جہاں تک میرا خیال ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی میں اپنی فقہی کتاب "مالابدمنہ" اسی رنگ کو دیکھ کر لکھی۔ فارسی مکاتیب میں بجائے قدوری کے پچھلے دنوں قاضی صاحب کی مالابدمنہ نصاب کی جزء تھی۔

خیر یہ تو ضروری تعلیم کا نصاب تھا۔ لیکن فضل کے درجہ کی تعلیم میں جو بات قدیم بزرگوں کے سامنے تھی، جیسا کہ میں نے عرض کیا، معلومات کی فراہمی نہ تھی، بلکہ اس ملکہ اور صلاحیت کا پیدا کرنا مقصود تھا، جس کے ذریعہ سے آدمی عمر بھر اپنے معلومات میں اضافہ کرسکتا تھا۔ اسی نقطۂ نظر کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اتفاقاً نہیں بلکہ قصداً درجۂ فضل کی تعلیم کی بنیاد ان چند اساسی امور پر قائم کی گئی تھی، ہر ایک پر میں الگ الگ مختصر الفاظ میں بحث کرتا ہوں:

(۱) مقصود بالذات علوم سے پہلے اور نسبتاً زیادہ وقت ان علوم پر طلبہ کا صرف کرایا جاتا تھا جنھیں ہم چاہیں تو ورزشی علوم کہہ سکتے ہیں، اپنی اصطلاح میں ان لوگوں نے اس کا نام علوم آلیہ رکھا تھا، یعنی ایسے علوم جن کے مسائل اور دعاوی اضح اور صاف نہ ہوں، بلکہ ان میں ابہام لچک، پیچیدگی زیادہ ہو، جس کا ہر دعویٰ آسانی سے ثابت نہ ہوسکتا ہو، بلکہ جو کلیہ بھی بنایا جائے وہ ٹوٹ سکتا ہو۔ اعتراض اور جواب کے سلسلہ کی اپنے اندر کافی گنجائش رکھتا ہو۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں خود سوچنے اور تنقید کرنے، مسائل کے دقیق پہلوؤں تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو۔

(۲) اسی طرح تلاش کرکر کے ایسی کتابیں ان فنون کی رکھی جاتی تھیں جو نسبتاً بجائے تفصیل کے مجمل زیادہ ہوں، عبارت اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھ میں آجائے جس طرح پہلی بات سے یہ غرض تھی کہ طلبہ میں خود نگری اور خود سوچنے کی صلاحیت کی پرورش کی جائے۔ اسی طرح ان مشکل اور پیچیدہ کتابوں کے رکھنے کی غرض یہ تھی کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو دشواری نہ ہو۔

Marfat.com

اور غور کیا جائے تو تعلیم کی غرض یہی دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی آدمی خود سوچنے لگے اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے لگے، میں جیسا کہ پہلے بیان کر آیا ہوں کہ ابتدائی صدیوں میں ہمارے نصاب میں مذکورہ بالا دو مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے اگرچہ منطق کا بھی عنصر شریک تھا، لیکن زیادہ تر اس زمانہ میں علم کی حیثیت سے جس علم سے یہ کام لیا جاتا تھا وہ خود مسلمانوں کا ایجاد کیا ہوا علم اصول فقہ تھا، اور کتابوں کے لحاظ سے خود اصول فقہ کی مشہور کتاب بزدوی تھی، نیز فقہ کی کتاب ہدایہ، اور تفسیر کی کشاف درس میں ان ہی دونوں اغراض کے لیے رکھی گئی تھیں۔ بزدوی کی یہ کتاب "اصول فخر الاسلام" کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے مصنف پانچویں صدی کے مشہور اصولی عالم فخر الاسلام علامہ علی ابوالحسن البزدوی ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اصول فقہ کا ایک ایسا متن قصداً انھوں نے تیار کیا تھا جس کی عبارتوں کا سمجھنا گویا لوہے کے چنے چبانا ہے، لیکن اگر اس لوہے کے چبانے کی قدرت کسی میں پیدا ہو گئی تو پھر اس کے لیے واقعی جو چبانے کی چیزیں ہیں وہ کچھ بھی باقی نہیں رہتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے لیے تو فخر الاسلام نے یہ کتاب لکھی، لیکن واقعی اصول فقہ کے مسائل کے سمجھنے اور ان پر حاوی ہونے کے لیے شاید ان ہی کے مشورہ سے نہایت سلیس صاف و واضح عبارت میں ان کے حقیقی بھائی جن کا نام محمد تھا اس فن اور اس کے علاوہ دوسرے فنون میں ایسی کتابیں لکھیں کہ ایک طرف فخر الاسلام کو لوگوں نے ابوالعسر (مشکل عبارتوں کا باپ) اور ان کے بھائی کا نام ابوالیسر (یعنی آسانی و سہولت کا باپ)، رکھ دیا، مفتاح السعادۃ میں طاش کبری زادہ نے لکھا ہے،

ولامام فخر الاسلام البزدوی اخ مشھور بابی الیسر لیسر تصنیفاتہ کما ان فخر الاسلام مشھور بابی العسر لعسر تصنیفاتہ۔ ص ۵۵ ج ۲

فخر الاسلام بزدوی کے ایک بھائی مشہور ہیں جن کا نام ابوالیسر تھا یہ نام ان کی کتابوں کی آسانی وسہولت کے مد نظر رکھا گیا تھا جس طرح فخر الاسلام ابوالعسر کے نام سے موسوم ہیں کہ ان کے تصنیفات عسیر اور دشوار ہیں۔

Marfat.com

بزدوی کے تمن کی کیا کیفیت ہی حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم الثبوت کے دیباچہ میں فخر الاسلام اور ان کی اسی کتاب کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

وتلک العبارات کانہا صخور کوزۃ فیہا
الجواہر واوراق مسلو رۃ فیہا الزواہر
تحیرت اصحاب الاذہان اشما قیدفی
اخذ معانیہا وقنع الغائصون فی بحارہا
بالاصداف عن لآلیہا وانا استحی من الحق
واقول قول الصدق ان جل کلامہ العظیم
لا یفہم علی حلہ الا من نال فضلہ
تعالیٰ الجسیم واتی اللہ بقلب
سلیم۔ ص مطبوعہ مصر

فخر الاسلام کی عبارتوں کی مثال ایسی ہو جیسے
چٹانوں میں کسی نے جواہر جڑ دیے ہوں یا ایسے پتے ہیں
جن میں پھول چھپے ہوئے ہیں ذہن و ذکاوت والے
ان عبارتوں سے معانی حاصل کرنے میں متحیر ہیں اور ان
عبارتوں کے دریاؤں میں غوطہ لگانے والے بجائے موتی
کے صرف سیپوں پر قناعت کر رہے ہیں میں حق کے اظہار میں
شرماتا نہیں اور سچی بات کہتا ہوں کہ ان کی باتیں جو عظیم اور
بڑی ہیں ان کو وہی حل کر سکتا ہو جس نے خدا کے فضل عظیم سے
حصہ پایا ہو، اور خدا کے پاس سے قلب سلیم لیکر دنیا میں آیا ہو

یہی حال اس زمانہ کے درجہ فضل کی دوسری کتابیں ہدایہ اور کشاف کا ہی۔ ہدایہ کے متعلق کہہ چکا ہوں کہ سات ساڑھے سات سو کا زمانہ گزر چکا ہی لیکن اس شعر کو شاعرانہ اغراق اگر قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور ہی

ان الہدایۃ کالقرآن قد نسخت
ما صنفوا قبلہا فی الشرع من کتب

ہدایہ گویا اس باب میں قرآن سے مشابہ ہو
جس نے گزشتہ شرائع کی کتابوں کو منسوخ کر دیا

لیکن اسی قطعہ کا دوسرا شعر:

فاحفظ قراتہا والزم تلاوتہا
یسلم مقالک من زیغ ومن کذب

پس اس کتاب کو پڑھتے رہو اور اسکی خواندگی کو لازم کرلو
تم اگر ایسا کروگے تو تمہاری گفتگو کجی اور غلطیوں سے پاک ہو جائیگی

کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کتاب کی یہ خوبی نہیں ہی کہ اس میں فقہ کے تمام مسائل آگئے ہیں اور ان مختصر جلدوں میں فقہ جیسے بحر ذخار علم کا سمانا مشکل کیا ناممکن ہی، لیکن دماغ کی جتنی

Marfat.com

ورزش اس کی عجیب وغریب سہل ممتنع عبارتوں سے ہو جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ اس مقصد کے لیے ہدایہ سے بہتر کتاب مسلمانوں کے پاس موجود ہے، اسی لیے شاعر کا بیان مبالغہ نہیں ہے کہ ہدایہ کے پڑھنے والے کجراہی اور غلط روی کے شکار نہیں ہو سکتے، خود صحیح سوچنے اور دوسرے کے کلام کے صحیح مطلب کے سمجھنے کا جتنا اچھا سلیقہ یہ کتاب پیدا کر سکتی ہے، عام کتابوں میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے وہی قدیم ہندی نصاب فضل کی تیسری معرکۃ الآرا تمرینی کتاب کشاف سو اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ مصنف کتاب جار اللہ زمخشری مسلمانوں اور علماء کی جماعت میں صرف اعتزالی عقائد ہی نہیں بلکہ ان عقائد میں شدت اور غلو کی وجہ سے سخت بدنام ہیں۔ لوگوں کی سوء ظنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ گویا شکر میں لپیٹ کر کونین کھلانے کی جہارت سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص کو خاص طور پر حاصل ہے، اپنی کتاب میں چھپا چھپا کر اپنے عقائد خاص کی سمت جذب کرتے چلے گئے ہیں۔ زین الدین بن المنیر الاسکندرانی العلامہ نے اس راز کو فاش بھی کیا ہے۔ بیرون ہند ہی میں نہیں، بلکہ ابتدار سے ہندوستان میں بھی ان کی بدنامی اچھے خاصے پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھی، شاید کسی موقعہ پر حضرت سلطان المشائخ کے حوالہ سے اس خواب کا ذکر گزر چکا ہے جس میں شیخ الاسلام زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے کو دکھایا گیا کہ جار اللہ صاحب مفصل کو فرشتے پابزنجیر جہنم کی طرف گھسیٹے لئے جارہے ہیں۔ کول (علیگڈھ) کے مولانا صدر الدین کا بیان بھی بحوالہ سلطان المشائخ غالباً اسی موقعہ پر گزرا ہے جو مولانا نجم الدین سنامی سے انھوں نے اسی کشاف کے متعلق نقل کیا تھا۔

لیکن ان بدنامیوں اور بر سر بازار رسوائیوں کے باوجود اس مقصد کے لیے یعنی ایک ایک فقرہ کے مختلف پہلوؤں پر ادبی نقطہ نظر سے ذہن کو منتقل کرانے کی مشق اگر کوئی بہم پہونچانا چاہے، تو کشاف سے بہتر اس مشق کے لیے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی ادبیات کے ذخیرہ میں مشکل کوئی دوسری کتاب مل سکتی تھی خصوصاً اس وقت تک جب تک کہ قاضی بیضاوی نے رازی اور کشاف کا خلاصہ[1]

---

[1] پچھلے زمانہ میں قاضی بیضاوی کی یہ کتاب تفسیر بیضاوی کے نام سے مشہور ہوئی، ورنہ عموماً کتابوں میں (باقی بر صفحہ ۳۱۶)

تیار نہ کیا تھا، صاحب مفتاح السعادۃ نے بھی کشاف کے متعلق لکھا ہے

لم یصنف مثلہ قبلہ۔ ص ۴۳۲ ج ۱ — اس جیسی کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی

مگر جوں جوں ہمارے نصاب میں معقولات کی کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا، ان تمرینی کتابوں کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی۔ بزدوی تو بالکلیہ خارج ہوگئی، کشاف کی جگہ کچھ دن بیضاوی کی گرم بازاری رہی شاہجہاں و عالمگیرؒ کے عہد تک تو یہ حال رہا کہ قرآن کے ساتھ بعض لوگ پوری بیضاوی کو بھی زبانی یاد کر لیتے تھے، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی جن کا بیضاوی پر مشہور حاشیہ ہے قسطنطنیہ میں بھی طبع ہو گیا ہے، ان کے ایک شاگرد مولانا محمد معظم ساکن بنہ تھے، تذکرہ علماء ہند کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی حفظ گرفتہ"[۱] ص ۲۱۳

مگر جب عقلی اور ذہنی کتابوں کا بوجھ جیسا کہ گزر چکا، پچھلے زمانہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا، تو بیضاوی کے عام مدارس میں صرف ڈھائی پارے رہ گئے حتیٰ کہ معقولی درس کا مشہور خانوادہ جو علمی حلقوں میں خیرآبادی خاندان کے نام سے مشہور رہا، اس میں تو بیضاوی کے صرف سوا پارے ہی کو کافی سمجھا گیا، اور لے دے کر خالص دینیات کی وہی تین کتابیں (جلالین قرآن کے لیے، مشکوۃ

(بقیہ صفحہ ۳۱۴) قاضی بیضاوی کے تصنیفات کی فہرست میں ہم اس کتاب کا نام مختصر الکشاف ہی پاتے ہیں۔ دلاسنوی کی طبقات سے طاش کبری زادہ نے تفسیر بیضاوی کا بھی نام نقل کیا ہے، دیکھو مفتاح ص ۴۳۶ ج ۱، لیکن صحیح یہ ہے کہ کشاف کے سوا بیضاوی نے رازی کی تفسیر سے بھی چیزیں چنی ہیں اسی لئے میں نے ان کی کتاب کو رازی و کشاف کا خلاصہ قرار دیا ہے۔ پچھلے زمانہ میں کشاف کو چھوڑ کر لوگوں نے بیضاوی ہی کو نصاب میں شریک کر لیا۔

[۱] مولانا محمد معظم نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی، لیکن تذکرہ علماء ہند ہی میں ہے کہ

"از تصانیف او تفسیر قرآن بود کہ در استیلائے سکھاں سوختہ شد"

مولانا کی عمر کافی ہوئی تھی، طالب علمی کا زمانہ تو عالمگیری عہد میں گزرا، بہادر شاہ کے زمانہ میں بنہ کی قضا کا عہدہ بھی ان کو ملا تھا۔ اسی زمانہ میں سکھوں نے سر اٹھایا۔ بنہ جو پنجاب کا کوئی قصبہ ہے۔ مسلمانوں کے گھروں کو جلایا گیا۔ اسی میں ان کی تفسیر بھی سوخت ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۱۲۔

Marfat.com

حدیث کے لیے ہدایہ و شرح وقایہ فقہ کے لیے) ہمارے نصاب میں باقی رہ گئیں۔ اور یہی میں اب بھی کہتا ہوں کہ درس نظامیہ کی معقولاتی کتابیں جن کا مقصد وہی دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ تھا، یہ ورزشی نصب العین اس زمانہ میں بآسانی ان علوم و فنون سے حاصل ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے، جو عصری جامعات میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، ایسی صورت میں بآسانی خالص دینیات کی ان تین کتابوں کو نصاب کا لازمی جز بنا کر ہم تعلیمی نظام کی ثنویت کو توڑ سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مغربی طرز کی یونیورسٹیوں میں بعض ایسے فنون کی بھی تعلیم ہوتی ہے جن کے متعلق بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے طلبہ کی دماغی تربیت میں زیادہ مدد نہیں مل سکتی، مثلاً تاریخ ہی کا مضمون ہے کہ اس کی نوعیت قریب قریب افسانے کی ہے۔ لیکن ہمیں انصاف سے ہٹنا نہ چاہیے۔ تاریخ کسی زمانہ میں افسانہ کی حیثیت رکھتی ہو تو رکھتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب سے یورپ نے اس کو درسی فن بنا دیا ہے اس وقت سے اب اس کی حالت دوسری ہو گئی ہے۔ اصل حقیقت کا پتہ چلے یا نہ چلے، لیکن تاریخ کے اساتذہ حقیقت کی سراغ رسانی میں، جن دقیقہ سنجیوں، موشگافیوں سے اس زمانہ میں کام لے رہے ہیں، اور طلبہ کو تحقیقات کے اس خاص طریقہ کا عادی بناتے ہیں۔ غلط بیانی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ اس کا تمرینی اثر طلبہ کے دل و دماغ پر نہیں پڑتا، یقیناً کالجوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ اب صرف افسانہ یا گزرے ہوئے واقعات کا فقط دہرانا نہیں ہے، بلکہ باضابطہ اب وہ ایک عقلی فن ہے، اور جب تاریخ جیسے سادہ سبجکٹ کو مدرسہ میں پہنچا کر تال اتول کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا گیا ہے تو یقیناً اب اس کے مباحث سے بھی وہی کام لیا جا سکتا ہے، جو کسی زمانہ میں میر زاہد رسالہ اور حمد اللہ قاضی مبارک شرح مواقف کے امور عامہ سے لیا جاتا تھا، اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو پھر جو فنون (آرٹس) واقعی عقلی فنون ہیں مثلاً منطق، فلسفہ، معاشیات، عمرانیات و سیاسیات وغیرہ یا حکمیات (سائنسز) سے دماغی صلاحیتوں کے نشو و نما میں جتنی امداد مل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

بے وقوفوں کا ایک گروہ ہمارے اسلامی نصاب پر بھی معترض تھا کہ سارے عقلی

Marfat.com

علوم وفنون جو اس میں پڑھائے جاتے تھے، ان کا کوئی حاصل نہیں تھا، مطلب یہ تھا کہ کسی فیصلہ کن آخری بات کا پتہ ان علوم میں نہیں چلتا۔ معمولی معمولی باتیں مثلاً یہی کہ علم یا جاننے کی عام صفت ہر شخص میں پائی جاتی ہو، اس کی حقیقت کیا ہو، آدمی جانتا تو ضرور ہو، لیکن یہ جاننا کیا چیز ہو اور اس صفت کا حصول ہم میں کیسے ہوتا ہو۔ مباحث کا ایک طومار سوال وجواب کا ایک طوفان ہو، جو کتابوں میں موج مار رہا ہو۔ لیکن پھر بھی اس وقت تک یہ طے نہ ہو سکا کہ علم ہو کیا چیز؟ یہی حال وجود کا ہو، وحدت وکثرت کا ہو، بلکہ ہر اس مسئلہ کا ہو، جو معقولات کے نام سے پڑھائے جاتے ہیں۔ بجنسہ یہی اعتراض ان علوم وفنون پر کیا جا رہا ہو جو عصری جامعات کے نصاب میں داخل ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معیار پر قدیم ہوں یا جدید ہماری اکثر وبیشتر عقلی پیداواروں کا یہی حال ہو، عقل نہ پچھلے زمانہ میں کسی مسئلہ کے متعلق آخری فیصلہ تک پہنچ سکتی ہو: اور نہ اس زمانہ میں اس بیچاری کو اس راہ میں کامیابی کا منھ دیکھنا نصیب ہوا ہو: بلکہ جیسے جیسے یہ مباحث بڑھتے جاتے ہیں، اسی نسبت سے شکوک وشبہات کے میدان بھی وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور تو اور یہ بیچاری تاریخ جب سے درسی مباحث کے چکروں میں پھنسی ہو۔ حال یہ ہو رہا ہو کہ بدیہی مسلمات بھی اب نظری بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے مسائل کہ شکسپیر نامی شاعر واقع میں کوئی شاعر تھا بھی یا نہیں۔ حضرت اورنگ زیب جیسے عادل بادشاہ واقع میں عادل تھے یا نہیں، اکبر کا الحاد کوئی واقعہ تھا یا صرف افسانہ ہو، محمد تغلق کے جنون کے قصے واقعی جنون کے قصے ہیں یا بیان کرنے والوں ہی کا یہ جنون ہو، جو باتیں آنکھوں کے سامنے گزر چکی ہیں، جب درسی سوال وجواب انہیں شک کی تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں، تو جن امور کا تجربہ نہیں ہوا ہو، صرف تخمینوں سے جن کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہو، مثلاً معاشیات، نفسیات اور الٰہیات دمابعد الطبیعیات کے مسائل کا جو حال ہو۔ ان علوم میں کسی آخری فیصلہ کن بات کا چلانا، کیا آسان ہو؟ حتی کہ سائنس اور کیمیا جیسے علوم جن کا تعلق صرف محسوسات اور تجربیات سے ہو، لیکن جن مسلمات

کو تسلیم کر کے ان علوم میں دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں۔ آنے والے آتے ہیں، اور شک و ارتیاب کی کلہاڑیوں سے ایسی ضرب ان کی جڑوں پر لگاتے ہیں کہ اچانک سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے، اور نئے سرے سے ابجد شروع ہوتی ہے، علم ہیئت کا تعلق تو ریاضیات جیسے یقینی علم سے تھا لیکن مدت تک اس کے مسائل کی تشریح زمین کی مرکزیت کو مان کر لوگ کر رہے تھے۔ آنے والے آئے اور زمین سے اٹھا کر اسے آفتاب کے کرہ پر لے گئے۔ بطلیموسی نظام کے مقابلہ میں شمسی نظام قائم کیا گیا۔ اب کچھ دنوں سے جھلکنے والے جھانک رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سے بھی مرکزیت کا یہ فخر چھننے والا ہے۔ سائنس کے تجربات سب مادہ پر مبنی تھے، لیکن خود یہ مادّہ سرے سے کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں۔ اب کیا انیسویں صدی کے آغاز ہی سے مدرسوں میں اس پر تنقید شروع ہو گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلی علوم و فنون کی ان ہی درماندگیوں کو دیکھ کر سطحیوں کا ایک گروہ ہمیشہ غل مچاتا رہا ہے کہ جب کسی چیز کا تم لوگوں کو اپنی ان ناکام کوششوں میں پتہ نہیں چلتا تمہارے فیصلے کسی زمانہ میں بھی آخری فیصلوں کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ تو پھر ان لایعنی ہرزہ درائیوں اور یاوہ خوانیوں کا نفع ہی کیا ہے، بظاہر ان کی بات دل کو لگتی بھی ہے۔

لیکن اوروں سے تو مجھے بحث نہیں، اسلام کے خالص علوم یعنی قران و حدیث و فقہ کی تعلیم میں اگر اس کی ضرورت ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر میں گہرائی پیدا کی جائے، دماغی صلاحیتوں کو کافی طور پر اُبھار کر ان علوم کے مطالعہ کا موقعہ طلبہ کے لیے فراہم کیا جائے۔ تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ دماغوں کو ان ورزشی علوم کے اکھاڑوں میں کچھ دن خوب اچھی طرح کھیلنے کا موقعہ دیا جائے۔ یہ سوال کہ ان علوم کی تعلیم سے طلبہ کو کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی، یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ اکھاڑے کی کشتیوں اور مشقی کرتبوں کی قیمت خود اکھاڑے میں تلاش کی جائے۔ چاند ماری میں ہزارہا ہزار روپیہ کی گولہ بارود کے ذخیرہ میں آگ لگادی جاتی ہے یہ پوچھنے والا کہ ان گولیوں اور دوسری چیزوں کو کیوں برباد کیا گیا، اگر دیوانہ ہے تو پھر

جن ورزشوں سے دماغی صلاحیتوں کو ابھارا جاتا ہے، تحقیق وتدقیق، تنقید وتنقیر کی قوتوں کی بیداری کا کام جن ذہنی مشقوں سے لیا جاتا ہے ان کے متعلق بھی یہ پوچھنا کہ ورزش کرنے والوں کو ان ورزش گاہوں میں کیا ملتا ہے، خود ہی سوچیے کہ یہ کتنا بے معنی مطالبہ ہے۔

چاند ماری میں بلاشبہ بندوقوں سے جو گولیاں چھوڑی جاتی ہیں وہ کسی مصنوعی دیوار یا فرضی نشانہ میں گم ہو جاتی ہیں، لیکن ان ہی گم شدہ گولیوں سے نشانہ بازی کی جو صحیح مشق ہمارے اندر واپس آتی ہے کیا اس کی قیمت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔

بجنسہ یہی حال ان علوم کا ہے جن کے مسائل خواہ بذات خود جتنے بھی مشکوک بے معنی، مبہم اور لا یعنی ہوں، لیکن ان مسائل کی بحث وتحقیق سے غور وفکر کا جو ملکہ پڑھنے والوں میں پیدا ہوتا ہے، یقین کیجیے کہ صرف معلومات دینے والی کتاب کے پڑھانے سے یہ بات کبھی نہیں حاصل ہو سکتی خواہ وہ معلومات جتنے بھی قیمتی اور یقینی ہوں، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان معلومات کی صحیح قیمت اور ان کی یقین آفرینیوں کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو شاید ہو بھی نہیں سکتا جنھوں نے کسی ذہنی تربیت سے پہلے ان کا مطالعہ شروع کر دیا ہو، الا ماشاء اللہ وقلیل ماھم۔

اور یہی وہ راز ہے کہ اسلامی علوم کی تعلیم کا جب سے باضابطہ نظام ہمارے بزرگوں نے قائم کیا، جن فنون کو وہ فنون دانش مندی کہتے تھے، علوم مقصودہ سے پہلے اور ان کے ساتھ ساتھ ان فنون کی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں دیتے چلے آئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا پہلے یہ کام اصول فقہ اور بعض خاص کتابوں مثلاً کشاف وہدایہ سے لیا جاتا تھا پھر یہی ضرورت معقولات کی کتابوں سے پوری ہوتی رہی۔ اور آج ہم جن حالات میں گرفتار ہیں، تعلیمی نظام کی ثنویت نے گوناگوں فتنوں کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں، ہر دن نت نئے فتنے ان ہی دو مستقل تعلیمی اداروں کی بدولت پیدا ہو ہو کر سر اٹھا رہے ہیں، ایسی صورت میں بآسانی عقلیات کے پرانے ورزشی علوم کی جگہ ہم جدید علوم وفنون کو مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے اپنے نصاب میں اس طریقہ سے شریک کر سکتے ہیں کہ دینیات کی حد تک وہی

Marfat.com

درس نظامیہ کی تین کتابوں کو نصاب کا لازمی جز رکھا جائے، اور ذہنی و دماغی تربیت کے لئے جدید علوم و فنون کے کسی گروپ کو کافی سمجھا جائے۔ البتہ ایک نقص جامعاتی تعلیم کے نصاب میں باقی رہ جاتا ہے یعنی جو علوم و فنون اس نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں، ان سے تو دماغی تربیت پر اچھا اثر پڑتا ہے، اور خود فکری کی استعداد طلبہ میں اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کافی طور پر بڑھ جاتی ہے، بلکہ شاید پرانے عقلیات سے کچھ زیادہ ہی، اس لیے گو نتیجہ کے لحاظ سے کسی واقعی حقیقت کی یافت میں تو دونوں ہی عموماً ناکام ہیں، لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ قدیم عقلیات کا تعلق زیادہ تر ذہنی امور سے تھا، اور جدید عقلیات میں چوں کہ بحث کرنے کے لیے زیادہ تر واقعی حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے اس لیے عقلی پروانان علوم میں اتنی بے لگام نہیں ہوتی، جتنی کہ پرانے عقلیات میں ہو جاتی تھی، اور یہی مطلق العنانی قدیم عقلیات کے پڑھنے والوں میں گونہ ایک قسم کی کج بحثی کی کیفیت پیدا کر دیتی تھی، ان کے تدقیقات حدود سے کچھ اتنا زیادہ تجاوز کر جاتے ہیں کہ بعض دفعہ اس پر ہنسی آجاتی ہے بخلاف جدید عقلیات کے کہ ان کا موضوعِ بحث خود ان کو روکے تھامے چلتا ہے، اس لیے وہ زیادہ بھٹکنے نہیں پاتے

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا خود فکری کی صلاحیتوں کی نشوونما کی حد تک جدید علوم و فنون کی تعلیم کافی بلکہ قدیم علوم سے بہتر ہے لیکن تعلیم کا مقصد کہہ چکا ہوں کہ صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی میں خود سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے اور اس کو ہونا چاہیے کہ ہم سے پہلے سوچنے والے جو کچھ سوچ چکے ہیں، ان کی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہم میں پیدا ہو، اسی ضرورت کے لیے ہمارے قدیم نصاب میں ایسی کتابیں قصداً رکھی جاتی تھیں جن کی عبارت نسبتاً زیادہ سلیس و واضح نہ ہوتی تھی، مقصد یہی تھا کہ اس مشق کے بعد گزرے ہوئے مصنفوں کی کتاب خواہ کتنی ہی الجھی ہوئی کیوں نہ ہو، ان کی پیچیدگیوں پر قابو حاصل کر کے ان کے افکار تک بآسانی رسائی حاصل ہو سکے۔

مگر خدا جانے اس زمانے میں درسی کتابوں کی اس خصوصیت کو زیادہ اہمیت کیوں

Marfat.com

نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہو رہا ہی کہ آج سے پہلے لوگوں نے جو کچھ سوچا ہی، اگر کسی سلیس شستہ عبارت والی کتاب سے ان تک رسائی حاصل ہو سکتی ہو، تو لوگ اس کو تو پڑھ لیتے ہیں، لیکن کسی مصنف کے بیان میں کچھ تھوڑی بہت اُلجھن اور ژولیدگی و تعقید ہوئی اس زمانہ کا تعلیم یافتہ آدمی اس کے مطالعہ سے گھبراتا ہی، وہ علم میں بھی ادب کی چاشنی ڈھونڈنے کا عادی ہو گیا ہی، حالانکہ تعلیم کے دوسرے مقصد یعنی دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس میں اس طریقہ کار سے بڑی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہی، تاہم یہ تو کتابوں کا مسئلہ ہی اور اس زمانہ میں جب ہر سال ہر چھ مہینے پر نصاب کی کتابیں بدل جاتی ہیں۔ تو بآسانی اس نقص کا ازالہ ہو سکتا ہی۔

مَیں درجہ فضل کی ان خصوصیتوں پر بحث کر رہا تھا جنھیں ان غیر معمولی صلاحیتوں کے پیدا کرنے میں دخل تھا، جو ہندوستان کے پچھلے زمانہ کے علماء میں پائی جاتی تھیں حقیقی اسباب و موثرات تو اس کے نصابی علوم اور نصابی کتابوں کی یہی خصوصیتیں تھیں، جن کا میں نے ذکر کیا لیکن اسی کے ساتھ بعض اور ضمنی باتیں بھی تھیں، اب کچھ تھوڑی بہت گفتگو ان پر بھی کرنا چاہتا ہوں

(۳) چوں کہ گزشتہ بالا دو خصوصیتوں کے حساب سے یہ تیسری بات ہی اس لیے نمبر میں بھی میں نے اس کو تیسرے درجہ پر رکھا ہی، مطلب یہ ہی کہ شاید بیچ بیچ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرانے زمانہ میں اس مفہوم کو ادا کرتے ہوئے کہ میں نے فلاں شخص سے پڑھا، عموماً ایسے موقع پر کہا جاتا ہی کہ " فلاں کتاب را تر د فلاں بحث کردم تحقیق کردم " مَیں نے شاید سلطان المشائخ کے متعلق یہ الفاظ کہیں سیر الاولیاء سے نقل کئے ہیں، کہ اُنھوں نے شمس الملک صدر جہاں (عہد بلبن) سے "ادب عربی بحث کرد چہل مقالہ حریری یاد گرفت" اور آپ کو بکثرت اس زمانہ میں یہ محاورہ ملے گا۔ اس بحث کی نوعیت کیا ہوتی تھی سیر الاولیاء میں مشہور استاذ جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہی یعنی شمس الدین بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک موقع پر ان کا ایک

Marfat.com

بیان نقل کیا ہے جس میں اپنے پڑھنے کے طریقہ کو حضرت نے ظاہر فرماتے ہوئے ان علوم کا نام لے کر جو ان کے زمانہ میں مروج تھے بیان کیا ہے۔

انچہ لوازم آں سبقہا بودے از شبہات و قیود مستحضر کردیم ص۲۲۶

ان اسباق کے متعلق جن شبہات اور قیود کو سامنے لانے کی ضرورت ہوتی تھی ہم ان کو مستحضر کرتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ ان ہی "شبہات و قیود" کو "تحقیق می کردیم" اگرچہ یہ چند الفاظ کا مختصر فقرہ ہے لیکن درس کا جو "طریقہ بحث" تھا اس کی گویا پوری تفصیل اس میں مندرج ہوگئی ہے۔

جامعاتی طریقۂ تعلیم جس کا نام میں نے "گونگا درس" رکھا ہے، اس نظام کے تحت تعلیم پانے والوں کو تو شاید اب سمجھایا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ "شبہات و قیود" کیا چیزیں ہیں، اور ان کے استحضار کی کیا صورت ہوتی تھی، پھر ان کی تحقیق استاد سے کیسے کی جاتی تھی؟ لیکن ہمارے درس قدیم کی یہ ناگزیر صورت تھی، طالب العلم اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہوئے بغیر طالب العلم بن ہی نہیں سکتا تھا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ،

اس زمانہ میں عام طور سے اگرچہ یہ مشہور کر دیا گیا ہے، کہ "امتحان" کا طریقہ اس ملک میں بالکل جدید چیز ہے، ورنہ ہمارا تعلیمی نظام امتحان سے نا آشنا تھا۔ اس لحاظ سے کہ آج کل "امتحان" کا جو مطلب ہے اور جن خاص ضوابط و اصول کے تحت لیا جاتا ہے، کوئی شبہ نہیں اس کا رواج اس ملک میں نہیں تھا[1]، لیکن پڑھانے کے بعد یہ جانچنے کے لیے کہ پڑھنے والوں کو کچھ آیا بھی یا نہیں، کیا ہماری پرانی تعلیم میں اس کا پتہ چلانے کا کوئی صحیح ذریعہ نہ تھا۔

بچوں کا مکتبی امتحان یا آموختہ

ابھی تو مکتب خانوں کے اس قدیم طریقہ کے دیکھنے والے دنیا میں

---

[1] مخدومی نواب ضیار یار جنگ بہادر سے میں نے روایت سُنی کہ سالار جنگ کے عہد میں جب دار العلوم کا مدرسہ قائم ہوا اور بر طریقہ نو امتحان کی بنیاد اس میں قائم کی گئی، تو پہلے امتحان میں سوالات کے مطبوعہ پرچوں کی تقسیم کرنے کے لئے امتحان گاہ میں خود سر سالار جنگ تشریف لائے، سونے کے طشت میں زرد اس کے خوان پوش کے نیچے سوالات کے پرچے تھے اور سالار جنگ اپنے ہاتھ سے طلبہ کو تقسیم کر رہے تھے، چونکہ ایک نئی چیز تھی اس ذریعہ سے عوام کو مانوس بنانا مقصود تھا ۱۲

موجود ہوں گے، کہ چھوٹے بچوں کو مکتب خانوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، روزانہ اُستاد اُن سے پڑھی چیزوں کا آموختہ بالالتزام سُنتا تھا۔ اور جوں جوں بچے تعلیم میں آگے بڑھتے جاتے تھے بجائے روزانہ کے ہفتہ میں دوبار اور آخر میں ہفتہ میں ایک دن صرف آموختہ پڑھنے اور سُننے کے لیے مقرر تھا، عموماً یہ دن یوم تعطیل (جمعہ) سے پہلے کا ہوتا تھا، لوگوں نے غور نہیں کیا، کہ آخر یہ کیا چیز تھی؟ اس میں شک نہیں کہ ایک طرف اس "آموختہ" کے اصول کا ایک فائدہ اگر یہ تھا کہ جو کچھ بچوں نے پڑھا ہی وہ دن بدن پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اسی کے ساتھ اُستادوں کو اس کا بھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ کس بچّہ نے کس حد تک اپنے اسباق اور بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھا ہی۔ خود ہی بتائیے کہ امتحان کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہی۔ یہ آموختہ کے ذریعہ سے "جانچ" کا طریقہ تو اس وقت تک اختیار کیا جاتا تھا جب تک بچوں میں سمجھنے کی پُوری قوت شگفتہ نہیں ہوتی تھی زیادہ تر کام ان کے حافظہ سے لیا جاتا تھا۔

لیکن مکتبی تعلیم سے آگے بڑھ کر جب اعلیٰ تعلیم (درجۂ فضل) میں طلبہ قدم رکھتے تھے۔ اس وقت بجائے حافظہ کے مقصود اس چیز کا دیکھنا ہوتا تھا کہ طالب العلم میں خود سوچنے کی اور دوسرے مفکرین کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت کس حد تک بڑھ رہی ہی، ظاہر ہی کہ اس کے لیے "آموختہ" والا قاعدہ قطعاً غیر مفید تھا، یہی ضرورت تھی جس کے لیے ہمارے یہاں ایک دوسرا قاعدہ مقرر تھا، جس کا رواج افسوس ہی کہ نئے نظام تعلیم کے گونگے درس سے تقریباً اُٹھ چکا ہی، امتحان کے نام سے طلبہ کے جانچنے کا جو طریقہ اب جاری کیا گیا ہی، مکتب خانے والے "آموختہ" سے زیادہ وہ کوئی چیز نہیں ہی۔ بلکہ امتحان کے مسرفانہ مصارف جن پر ہر سال ہزارہا ہزار روپے حکومت صرف کرتی ہی، اور تعلیم پانے والوں کے لیے دماغی کوفت کے سوا ہر سال امتحان کا مسئلہ ایک مستقل مالی سوال بنا ہوا ہی، اور ملکوں کا تو میں نہیں کہتا، لیکن ہندوستان جیسے غریب مُلک میں یہ واقعہ ہی کہ امتحان کی اس فیس کے لیے طلبہ ہر سال باضابطہ دست سوال دراز کرنے پر عموماً مجبور ہوتے ہیں یا پھر باپ کو مقروض ہونا پڑتا

Marfat.com

ہی، یا ماں بہن کے زیوروں کو گرو رکھ کر امتحان کی فیسیں یونیورسٹیوں میں جمع کی جاتی ہیں، اور اس کے بعد بھی اس امتحان سے اگر کسی چیز کا کچھ اندازہ ہوتا ہی، تو صرف اس کا کہ جواب دینے والوں کے دماغ میں اپنی پڑھی چیزوں کا کتنا حصہ محفوظ ہی، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "آموختہ" کتنا یاد ہی، اس سے زیادہ امتحان کے اس طریقہ سے طلبہ کے متعلق نہ کچھ معلوم ہوتا ہی، نہ معلوم ہوسکتا ہی، دس سوالوں میں سے پانچ سوالوں کے متعلق اگر (۳۳ فیصدی) چیزیں بھی امتحان دینے والے کے دماغ میں کسی طرح محفوظ رہ گئی ہیں، پاس کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہی، لیکن خود سوچنے یا دوسروں کی باتوں کے سمجھنے کی قابلیت میں اس نے کس حد تک ترقی کی ہی، عام طور پر امتحان کے اس مسرفانہ غریبوں کو تباہ کرنے والے طریقوں سے اس کا پتہ چلنا سخت دشوار ہی، اور اسی کا یہ نتیجہ ہی کہ اختیاری سوالات میں سے ۳۳ فیصدی نمبروں سے پاس ہونے کے بھروسہ پر طلبہ کی اکثریت اپنے اسباق سے درس کے کمروں سے باہر کوئی تعلق اس وقت تک پیدا کرنا نہیں چاہتی، جب تک کہ امتحان کا موسم سر پر نہ آجائے، اُستاد کے لکچروں میں وہ ایک ایسا دماغ لے کر آتے ہیں جس میں ہونے والے سبق کے متعلق قطعاً کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی، جب تک اُستاد کچھ کہتا رہتا ہی، بُرے بھلے طریقہ سے اس کو یادداشت کی کاپیوں پر نوٹ کرتے جلتے ہیں۔ سبق ختم ہوا، اور ان کا تعلق بھی اس سبق سے اس وقت تک کے لیے ختم ہوگیا، جب تک کہ امتحان کی مصیبت ان کو آکر نہ جھنجھوڑے۔ تیاریِ امتحان کے نام سے ان کو جو فرصت دی جاتی ہی، فرصت کے ان ہی چند دنوں میں کسی نہ کسی طرح کچے پکے لقمہ کی طرح حافظہ میں اپنے متعلقہ مضامین کے متعلق معلومات بھرتے چلے جاتے ہیں اور ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے کسی کو قے ہوتی ہو، جوابی کاپیوں پر جلدی جلدی یہ نگلے ہوئے لقمے اُگل دیے جاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تجربہ ہی اُگلنے کے اس عمل کے ساتھ ہی پھر وہ ان مضامین سے اس طرح کورے اور خالی ہوجاتے ہیں جس طرح پہلے تھے، دماغ میں اس کے بعد اگر کوئی چیز رہ جاتی ہی تو وہ صرف اس نتیجہ کا انتظار جس کی توقع اندھیرے میں چلائے

ہونے اس تیر کے بعد ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔

آج ملک میں جس امتحان پر مجموعی حیثیت سے اگر کروروں نہیں تو لاکھوں روپے جو خرچ ہو رہے ہیں لے دے کر اس کی کل حقیقت عام حالات میں صرف اسی قدر ہے۔ اب سنئے تعلیم کے جس نظام کو آج بدنام کیا جا رہا ہے، کہ امتحان کا کوئی طریقہ اس میں اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اس میں کیا ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ دماغوں کو بوکھلا دینے والے لفظ امتحان کے نام سے تو کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں مروج تھی، اسی قدر بوکھلا دینے والا لفظ کہ کمزور اعصاب والے کتنے بچے ایسے ہیں جو ہر سال اسی لفظ کے دباؤ سے مضطرب ہو کر اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ مدقوقوں اور مسلولوں کے گروہ میں ایک بڑی تعداد ان بدقسمت طالب العلموں کی ہوتی ہے جن کے لیے امتحان اور اس میں ناکامی کی دہشت بسا اوقات کسی عویص مرض کا مقدمہ بن جاتی ہے۔

مگر درس کے جس طریقہ کی تعبیر بحث وتحقیق کے لفظ سے کی جاتی تھی، آپ نے سمجھا اس کا کیا مطلب تھا۔ شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں بجائے خود بیان کرنے کے ایک تاریخی واقعہ کو پیش کر دیتا ہوں، یہی واقعہ آپ کو بتائے گا کہ جس عہد کے متعلق باور کرایا جا رہا ہے کہ کچھ نہ ہوتا تھا اس وقت کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ عہد شاہجہاں کے مشہور عالم ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے درس کا واقعہ ہے۔ مولانا آزاد نے ماثر الکرام میں اسے نقل فرمایا ہے۔

قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بلگرام کے رہنے والے ایک سید میر اسمٰعیل مختلف حلقہائے درس سے استفادہ کرنے کے بعد آخر میں وہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے حلقہ میں پہنچے، ملا صاحب سے میر صاحب نے عرض کیا کہ مجھے کوئی وقت دیا جائے تاکہ جو کتابیں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں، پڑھ سکوں، ملا عبد الحکیم نے اپنے وقت نامہ کو دیکھ کر کہا کہ

"از ہجوم طلبہ گنجائش وقت علیحدہ نیست مگر آں کہ ساعت سبق فلاں شخص اختیار کنند"

مطلب یہ تھا کہ علیحدہ سبق پڑھانا تو تنگی وقت کی وجہ سے دشوار ہے۔ البتہ فلاں طالب العلم کی جماعت میں شریک ہو کر تم سن سکتے ہو۔ میر صاحب آچکے تھے اس پر راضی ہو گئے، "سننے

کی بات اب یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانہ کے لیے تو شاید یہ کوئی نئی بات نہ ہو لیکن اس وقت یہ بات تھی کہ چند ہفتے گزر گئے اور میر اسماعیل نے کسی قسم کی پوچھ گچھ، اعتراض و سوال ملا صاحب سے اس عرصہ میں نہیں کیا، وہ عصر حاضر کا گونگا درس تو تھا نہیں کہ سالہا سال گزر جاتے ہیں، اور شاگردوں کی زبان سے اُستاد کے کان میں کوئی لفظ نہیں پہنچتا۔ اُستاد ڈائس پر، تلامذہ کرسیوں پر کھڑے ہو کر اُستاد نے تقریر کی بیٹھے بیٹھے چپ چاپ شاگردوں نے ان کی تقریر سُن لی، یا کم از کم سُننے والوں کی صورت بنالی، درس ختم ہو گیا۔ حاضری دے کر طلبہ درس کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ تو اس وقت ہو رہا ہے، لیکن جس عہد کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ شاگردوں کی قابلیت کے جانچنے کا کوئی طریقہ اساتذہ کے پاس نہ تھا، یہ اسی زمانہ کی بات ہے، کہ کسی قدیم نہیں، بلکہ ایک نو وارد طالب علم کا یہ رویہ کہ اس نے کوئی بات نہیں پوچھی اُستاد کے لیے ناقابل برداشت بن گیا، حالانکہ احتمال تھا کہ ابھی نئے ہیں، آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے، ابھی پوچھنے میں ہوسکتا ہے کہ حجاب مانع ہو، لیکن ملا عبد الحکیم سے نہ رہا گیا۔ میر صاحب کو مخاطب کر کے دریافت کیا،

"مدتہا گزشت گاہے حرفے از شما سر بر نہ زد"

اب میر صاحب کی یہ طالب العلمانہ ادا تھی، ملا صاحب نے مستقل وقت دینے سے انکار کرتے ہوئے یہ جو کہا تھا کہ "فلاں کا سبق سُن سکتے ہو" اس "سن سکنے" کے لفظ کو اُنھوں نے گویا پکڑ لیا تھا، جو ملا صاحب کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں بولے، کہ مجھے تو صرف سننے (استماع) کی اجازت ہے اس لیے بولنا اپنے لیے مناسب نہ خیال کیا۔ ملا صاحب کی تازہ توجہ کو دیکھ کر میر صاحب نے پھر عرض کیا کہ اگر فقیر کے لیے کوئی مستقل وقت دیا جاتا تو میری بڑی آرزو پوری ہوتی۔ بلگرام سے ایک شخص صرف علم کی خاطر سیالکوٹ آیا تھا۔ ملا صاحب کو ان کی غریب الوطنی اور طلب صادق کے جذبہ پر رحم آگیا۔ اور بولے کہ

"در ایں ایام بین العصر والمغرب فرصتے ست برائے سبق شما مقرر کردیم"

اس زمانہ کے اساتذہ جو سنتے ہیں کہ ہفتہ میں دس گھنٹے اور پندرہ گھنٹے پڑھانا بھی اپنے لیے بار سمجھتے ہیں، کیا وہ سن رہے ہیں، وقت عصر اور مغرب کے درمیان دیا گیا۔ طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کا یہ وقت اتفاق سے اس زمانہ میں خالی ہو گیا تھا۔ ورنہ عموماً اس میں بھی کچھ نہ کچھ مشغلہ پڑھنے پڑھانے کا جاری رہتا تھا۔[ل] خیر یہی وقت سہی میر صاحب کے لیے مقرر ہو گیا۔ سبق شروع ہوا، اور "وہی بحث" کے طریقہ سے شروع ہوا۔ مولانا غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ

"سید روز دیگر درس مستقل شروع کرد و بحث و گفتگو را بجائے رسانید کہ وقت نماز شام رسانید"

مطلب یہ ہے کہ سید صاحب نے ملا صاحب سے اپنے کسی شبہ کا اظہار کیا۔ ملا صاحب نے جواب دیا سید نے اس پر پھر کوئی سوال کیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، نماز کے لیے درس ملتوی ہوا۔

"مولوی (عبدالحکیم) نماز ادا کردہ باز متوجہ درس شد"

بحث پھر چھڑی، اور جاری رہی تا آنکہ

"تا نماز عشا گفتگو بحال بود"

عصر سے مغرب اور مغرب سے عشا کی نوبت آئی، ملا صاحب نے اپنے عزیز اور ہونہار شاگرد سے اب معذرت کی اور فرمایا کہ

"فردا اول روز باید آمد درس ہائے دیگر را موقوف کردہ اول تحقیق ایں مبحث می پردازیم"

ل اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کچھ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، خود اپنے استاد حضرت مولانا برکات احمد بہاری وطنا ٹونکی ثم کو یہ تو اس دیکھتا رہا اور میرے رفقاء درس جو ہندوستان کے طول و عرض میں موجود ہوں گے وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ حضرت علاوہ مقررہ اوقات (یعنی آٹھ سے بارہ تک اور دو سے چار تک) کے سوا عصر کے بعد بھی عموماً ایسی کتابیں مثلاً مثنوی مولانا روم مکتوبات مجدد الف ثانی یا طب کی کسی کتاب کا درس دیا کرتے تھے، اور یہ تو اس زمانہ کی بات ہے جب حضرت کی عمر زیادہ ہو گئی تھی، ورنہ اپنے ایام شباب میں سنا ہے کہ رات کے دس دس گیارہ بجے تک سبق پڑھانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا آج بھی حضرت مولانا حسین احمد مدنی کبھی کبھی رات کے گیارہ بارہ تک بخاری پڑھاتے ہیں ۱۲

Marfat.com

یعنی کل پر بات رہی، اور یہ میر صاحب کے ساتھ خاص رعایت کی گئی کہ کل دوسروں کے اسباق کو ملتوی کر کے تمھاری اس بحث کو طے کروں گا۔ حسب وعدہ دوسرے دن پھر بحث کا بازار گرم ہوا

"سید حاضر شد و طلبار دیگر نیز حاضر شدند واز چاشت تا استوا، (دوپہر) بحث قائم بود"

مگر بات ختم نہ ہوئی، مولانا غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ

"سہ روز متواتر بریں منوال گزشت وسلسلہ بحث انقطاع نہ پذیرفت" صـ۲۳۴

تھک کر ملا صاحب نے سید سے کہا کہ آخر اس مسئلہ میں تمھاری بھی کوئی خاص رائے ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ سید صاحب ایک مضمون اٹھا کر لائے، جو ان ہی کا لکھا ہوا تھا، لیکن انھوں نے اپنے نام کا اظہار نہیں کیا، استاد کے سامنے وہ تحریر پیش کی کہ اس میں تو اس مقام کی تحقیق یوں کی گئی ہے، ملا صاحب نے دیکھا اور پسند کیا۔ البتہ اتنا نقص بتایا کہ "عبارت از اطناب (طوالت بیجا) خالی نیست" ماثر صـ۲۳۴۔ ظاہر ہے کہ بحث و تحقیق کا یہ ایک خصوصی واقعہ ہے۔ اسی لیے تاریخوں میں اس کا تذکرہ بھی کیا گیا۔ میری غرض اس کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ قدیم طریقہ تعلیم میں "بحث و تحقیق" سے جو چیز مراد تھی، اس کا ایک مثالی نمونہ لوگوں کے سامنے آجائے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس امتحان کی لوگوں کو تلاش ہے، اس زمانہ میں اس کا طریقہ یہی تھا، طلبہ کو کتابوں سے الگ کر کے امتحان گاہوں میں سادہ کاپی دے کر اس لیے بٹھایا تو نہیں جاتا تھا کہ خام و نیم پخت غیر منہضم معلومات کا جو ذخیرہ کسی نہ کسی طرح دماغوں میں بھر لیا گیا ہے، اسی کو اگلوا لیا جائے۔ بلکہ طلبہ کا فرض تھا کہ سبق پڑھنے سے پہلے ہر سبق کے متعلق وہی طریقہ کار اختیار کریں، جس کی طرف حضرت شمس الدین یحییٰ بن یحییٰ کے بیان میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی

"شبہات تحقیق می کردیم، وآنچہ لوازم ان سبقہا بودے از شبہات وقیود مستحضر می کردیم" صـ۲۳۶

اسی کا نام "مطالعہ" تھا۔ مسئلہ کے بیان کرنے میں مصنفِ کتاب نے جو طریقہ بیان اختیار کیا ہے، اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا، اس پر جو اعتراضات ہو سکتے ہوں ان کو پیدا کرنا اسی کا

Marfat.com

نام "شبہات" تھا، بیان میں کس حد تک جامعیت اور مانعیت ہے اس کو جانچنا۔ اس کے لیے جن قیود اور شرائط کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے ان کو پرکھنا، کتاب کی عبارت کے سوا خود مسئلہ میں جو پیچیدگیاں ہوں، ان کو خود سلجھانا، جو نہ سلجھ سکتے ہوں تو ان کو استاد پر پیش کرنا الغرض خود مسئلہ پر اور جس عبارت کے ذریعہ سے مسئلہ ادا کیا گیا ہے، اس پر اپنی اپنی حد تک حاوی ہونے کی کوشش کرنا، اس کوشش میں جو نقص رہ جائے استاذ سے روزانہ اس کے متعلق دریافت کرنا، یہ کام تھا، جو پرانے طریقۂ درس کا ایک لازمی جز تھا۔ کتاب مطلع الانوار جو استاذ السلطان حضرت مولانا انوار اللہ خاں حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصر سی سوانح عمری ہے۔ اسی میں مولانا کے حقیقی بھانجے مفتی رکن الدین مرحوم نے یہ لکھتے ہوئے کہ ہنگام طالب العلمی میں مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے مطالعہ کا کیا طریقہ تھا۔ بجنسہ ان کے الفاظ میں یہ نقل کیا ہے:

"ہم کوشش کرتے تھے کہ مضمون کسی صورت سے مطالعہ میں حل ہو جائے۔ طریقہ یہ تھا، کہ پہلے عبارت و ترجمہ کی جانب توجہ کی جاتی تھی جو نئے الفاظ آتے تھے ان کو لغت کی مدد سے حل کیا جاتا، پھر مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر ایک دفعہ مضمون حل نہ ہوتا تو دوبارہ سہ بارہ سعی کی جاتی۔ اگر کوئی اتفاقی مشکل مضمون ہوتا جو سعی پیہم کے باوجود سمجھ میں نہ آتا تو دل میں ایک خلش رہتی۔ جب استاذ (مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ) کے سامنے سبق شروع ہوتا تو بجز شبہات کے جو مطالعہ میں حل نہ ہو سکے ہوں اور کوئی بات دریافت طلب نہ رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ کئی صفحہ درس ہوتا تھا" ص۸ مطلع الانوار

اسی کے بعد لکھا ہے کہ

"استاذ کی قدر و منزلت معلوم ہوتی تھی کہ جو مضمون گھنٹوں میں حل نہ ہو سکا تھا استاذ نے ذرا سی دیر میں حل کر دیا"

یہ بھی مولانا انوار اللہ خاں ہی کا بیان ہے اور اس سے میرے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ درس کے اس طریقہ میں استاذ کا بھی امتحان ہوتا رہتا تھا۔ آخر میں مولانا کے الفاظ اس فقرہ پر ختم ہوئے ہیں کہ "جب استاذ سے مطلب معلوم ہوتا تھا تو فرط مسرت نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے بیش قیمت خزانہ مل گیا"۔

Marfat.com

اور یہ تھا وہ علمی ذوق جو طلبہ میں درس کا یہ عجیب و غریب ماحول قدرتاً پیدا کر دیتا تھا۔ اس طریقہ سے پڑھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ خاکسار مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے اس حلقہ میں بطور استفادہ کے جب کچھ دن کے لیے شریک ہوا جس میں مولانا مرحوم فتوحات مکیہ جیسی سخت دکرخت کتاب کا درس دیا کرتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کتنی آسانی کے ساتھ اس عجیب و غریب پیچیدہ کتاب کے مشکلات کو باتوں باتوں میں وہ پانی بنا کر سمجھا دیتے تھے رحمۃ اللہ علیہ و تغمدہٗ بغفرانہ۔

بہر حال طلبہ مطالعہ کرتے ہیں یا نہیں، اساتذہ اس کی پوری نگرانی کرتے تھے کہ وہ اس کام کو کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اس کا پتہ "طریقہ بحث" سے چل جاتا تھا، یعنی سوال و جواب جو اُستادوں سے اور شاگردوں سے ہوتا تھا، اسی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون طالب العلم تیار ہو کر آتے ہیں، اور کون بغیر کسی تیاری کے بیٹھ گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ میر اسماعیل نے جب کوئی بات نہیں پوچھی تو فوراً ملا صاحب نے ٹوکا، اور یہ کوئی خاص بات نہ تھی طالب العلم اگر چند دن بھی چُپ رہا فوراً اساتذہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے، اور مجبور کرتے کہ رد و قدح سوال و جواب میں وہ حصہ لے۔ اس کا ایک فائدہ وہی تھا کہ خود فکری کے ساتھ ساتھ دوسرے مصنفین و مفکرین کی باتوں کے سمجھنے کا سلیقہ دن بہ دن بہتر ہوتا جاتا تھا۔ اسی لیے طلبہ پر سخت تاکید کی جاتی تھی کہ مطالعہ کے وقت وہ کسی تشریحی نوٹ یا حواشی وغیرہ سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ کسی طالب العلم کے متعلق اگر استادوں کو محسوس ہو جاتا کہ یہ مطالعہ کے وقت حاشیہ وغیرہ دیکھنے کا عادی ہے، تو اس سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا جاتا۔ بقیۃ السلف حضرت قاری عبد الرحمٰن پانی پتی جو مولانا حالی کے اُستاد تھے ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اپنا قصہ خود یہ بیان فرماتے تھے

"بچپن کا زمانہ تھا عربی کی ابتدائی کتابیں والدین سے پڑھتے تھے۔ ایک دن مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا تھا اس پر والد صاحب نے سبق نہیں پڑھایا مجھے اتنا غم ہوا کہ رات کو کھانا نہیں کھایا۔" تذکرہ رحمانیہ ص۲

بچوں کی اتنی نگرانی مطالعہ کے معاملہ میں کی جاتی تھی اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بڑوں کے ساتھ اساتذہ کا کیا رنگ ہو سکتا تھا۔

اور دوسرا اہم فائدہ "بحث وتحقیق" کے اس طریقۂ درس کا یہ تھا کہ اُستادوں کو اپنے شاگردوں کی قابلیت کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ سوالات میں گہرائی، شکوک وشبہات میں قوت جتنی زیادہ بڑھتی جاتی تھی، سمجھا جاتا تھا کہ اسی حد تک وہ علم میں ترقی کر رہا ہے۔ میرے نزدیک طلبہ کا اس ذریعہ سے امتحان بھی ہوتا رہتا تھا۔ مگر یہ ایسا امتحان تھا جس میں طلبہ کو علم کے امتحان گاہوں میں اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا جس نظر سے چوروں اور ڈاکوؤں کو پولیس والے دیکھتے ہیں۔ اس امتحان کے لیے قطعاً کارڈ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ نہ اس میں سوالات کے فاش ہو جانے کا خطرہ اربابِ جامع کو لگا رہتا تھا۔ نہ اس امتحان میں سالانہ لاکھوں روپیہ کے وہ مصارف عائد ہوتے تھے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، نہ امتحان کی دہشت میں طلبہ اور ان کے والدین مبتلا ہوتے تھے گویا نتیجہ کا دن نہیں بلکہ طالب العلم اور اس کے ماں باپ بلکہ شاید سارے خاندان کے لیے وہ قیامت کا دن ہوتا ہے، نہ طالب العلموں سے کتابیں چھینی جاتی تھیں، نہ ان کو اس پر مجبور کیا جاتا تھا کہ جیسے بندر جلدی جلدی کر کے اپنے کلوں میں چنے کے دانے دباتے ہیں اسی طرح ٹھیک وہ امتحانی معلومات کو جلدی جلدی دماغوں میں کسی طرح ٹھونس لیں اور امتحان گاہوں میں جا کر اُگل دیں اور اس کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہی ہے کہ اکثر ناقابل اور جاہل لڑکے جنھوں نے معلومات کے نگلنے کے اس خاص طریقہ میں مہارت حاصل کی ہے، وہ تو کامیاب اور عموماً اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن اچھے اچھے ذہین طباع سوچنے والے جو امتحانی کرتبوں اور اس کے خاص تدبیروں سے ناواقف ہیں باوجود قابل و لائق ہونے کے بسا اوقات بُری طرح ناکامیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ بہتوں کی صحت دل ودماغ پر اپنی اس غیر متوقع ناکامی کا نہایت خراب اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً جب ان کی آنکھوں کے سامنے

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است | قوت دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں | طوق زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

Marfat.com

کا نظارہ پیش ہوتا ہے۔ اور یہ ساری خرابی امتحان کے اس "آموختائی" طریقہ کا نتیجہ ہے، جو زیادہ سے زیادہ ان بچوں کی حد تک مفید ہو سکتا ہے، جن کا دماغ بجائے سوچنے اور سمجھنے کے صرف یاد کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے، کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ امتحان لیا جاتا ہے، قابلیت کا ذہنی لچک اور فکری گہرائیوں کا اور پوچھا جاتا ہے کہ تم کو اپنی آموختہ اور سیکھی ہوئی باتوں میں سے کتنی باتیں یاد ہیں۔ بہرحال اب تو جو کچھ ہو، حکومت جب تک اپنے رویّہ کو نہ بدلے گی مجبوراً ملک میں "فضیلت" اور بلندی کا معیار امتحان کا یہی آموختائی طریقہ رہے گا۔ اس کی وجہ سے خونِ جگر کو قوت بنانے پر اگر کوئی مجبور رہا اور "پالان" کے نیچے تازی گھوڑوں کو مجروح ہونا پڑے تو ہونے دیجیے۔

جس زمانہ کا ذکر میں کر رہا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ استاد کے سامنے "بحث و تحقیق" کی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لئے طلبہ کو مطالعہ میں کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ کہ اپنی جماعت میں امتیاز کا سارا دار و مدار ہی اسی پر تھا، شیخ محدث اپنی طالب علمی کا حال درج کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ

"در اثنائے مطالعہ کہ وقت از نیم شب در می گزشت والدم قدس سرہ مرا فریاد میزدہ بابا چہ می کنی"

یعنی آپ کے والد کو رحم آجاتا اور کہتے کہ کب تک جاگو گے۔ شیخ فرماتے کہ والد کی آواز سن کر فی الحال "دراز می کشیدم" یعنی لیٹ جاتے لیکن کیا ہوگا اس کی فکر سونے کب دیتی تھی، فرماتے ہیں کہ

"تا دروغ نہ شود می گفتم کہ خفتہ ام چہ می فرمایند"

مگر پھر

"باز بر می نشستم و مشغول می شدم"

شیخ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"چند بار دستار و موی سر آتش چراغ در گرفتہ باشد و مرا تا رسیدن حرارت آں بجزو دماغ خبر نہ"

Marfat.com

بلاشبہ یہ انہماک شیخ کا غیر معمولی تھا، اگرچہ اس زمانہ میں یہ مثالیں چنداں غیر معمولی نہ تھیں۔

لیکن محنت کا یہ بار صرف امتحان ہی کے چند دنوں میں اکٹھا ہو کر نہیں پڑتا تھا بلکہ سال کی ساری راتوں پر یہ بار بٹا ہوا رہتا تھا۔ کیوں کہ امتحان کا یہ سلسلہ تو روزانہ جاری تھا۔ اس لئے ظاہر ہی کہ طلبہ کے دل و دماغ پر اچانک امتحان کا بوجھ چند محدود دنوں میں جو پڑ جاتا ہی اور اس کی وجہ سے صحت و تندرستی کو جو نقصان پہنچتا ہی یا پہنچ سکتا ہی یقیناً اس سے وہ محفوظ رہتے تھے۔ اب آپ "بحث و تحقیق" کے اس طریقہ کو چاہیں امتحان تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن اس زمانہ میں طلبہ کی قابلیتوں میں باہمی تفاوت کا اندازہ اسی سے ہوتا تھا۔ مولانا غلام علی آزاد نے اپنے اُستاد میر طفیل محمد کے تذکرہ میں لکھا ہے

"در طلبہ علم بجودت طبع۔ دقوت مطالعہ و مباحثہ اشتہار داشتند"

"مباحثہ" سے وہی "بحث و تحقیق" کی طرف اشارہ ہی جس میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے مطالعہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ حضرت سلطان المشائخ کے تذکرہ میں عموماً یہ لکھا جاتا ہی کہ طالب العلمی کے زمانہ میں

"بخطاب بحاث و محفل شکن مخاطب گشت" ملنا تذکرۃ الاولیار

یعنی اُستادوں سے رد و قدح سوال و جواب کرنے، اور شبہات و خدشات پیش کرنے میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا، اسی لیے آپ کا نام ہی طالب العلموں میں مولوی نظام الدین "بحاث" ہو گیا تھا "محفل شکن" سے شاید مراد یہ ہی کہ درس کی محفل میں اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ فرما لیتے تھے۔ لکھا ہی کہ ان ہی وجوہ سے

"میان متعلمان (طلبہ) تیز طبع و دانش مندان کامل مشہور گشت"

گویا اسی "بحاثی اور محفل شکنی" کے ان امتیازات نے آپ کو نہ صرف طلبا در نظار درس ہی میں بلکہ "دانش مندان کامل" یعنی اس زمانہ کے اساتذہ اور اہل علم میں مشہور کر دیا تھا کہ امتحان اور طلبہ کی اندرونی لیاقت و قابلیت کے جانچنے کا اس وقت یہی طریقہ تھا۔ اور اب بھی اگر

Marfat.com

سوچا جائے تو اس سے بہتر طریقہ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کے امتحان کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اور سچ پوچھیے تو اُستادوں کی قابلیت کے جانچنے کا بھی یہ ایک کارگر طریقہ ہو سکتا ہے، طلبہ چُپ چاپ ردّ و قدح کے بغیر سنتے رہیں اور اُستاد کے جو جی میں آئے ان کے سامنے تقریراً کچھ بول کر یا تحریراً کچھ لکھوا کر چلا جائے یہ خود ہی سوچیے کہ اس سے کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ پڑھانے والے کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، اس فن کے اندر جسے وہ پڑھا رہا ہے کتنی حذاقت استاذ کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر کے گونگے درس میں بسا اوقات اساتذہ کوشش و پیروی کر کے تعلیم گاہوں میں گھس جاتے ہیں۔ چونکہ عمر بھر ایسے شاگردوں سے معاملہ پڑتا ہے جن کا فرض صرف سُننا ہے، اس لیے ان کی اصل حقیقت چھپی رہتی ہے بخلاف اس زمانہ کے جس میں "مطالعہ اور مباحثہ" طالب علم کا ضروری جُز تھا۔ خام اور کچے اُستادوں کا زیادہ دن تک تعلیمی عہدہ پر باقی رہنا مشکل ہوتا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد جتنے پانی میں وہ ہوتے اس کا لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا۔ ملّا عبدالقادر بداؤنی نے شیخ عزیز اللہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ طلبہ

شیخ کا امتحان لینے کے لیے ایسے سوالات کرتے جن کا اپنے نزدیک سمجھتے کہ جواب نہیں ہو سکتا لیکن شیخ موصوف درس کے وقت ہی ان سوالوں کو اسی وقت حل فرما دیتے۔	"بارہا امتحان پیش آمدہ اسولۂ لا منع لہامی آوردند شیخ مشارالیہ در وقت افادہ حل ساختہ"۔ ص۲۲ بداؤنی

آپ خیال کر سکتے ہیں جس طریقہ درس میں سوال و جواب کا حق طلبہ کو اتنی فیاضی سے دیا جا سکتا ہو کہ تین تین دن تک ایک ہی مسئلہ میں اُستاد و شاگرد اُلجھے ہوئے ہیں، جیسا کہ ملّا عبدالحکیم اور میر اسماعیل کے قصہ میں آپ سُن چکے۔ اگرچہ ایسا ہوتا تو بہت کم تھا، لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "مباحثہ" کے اس طریقہ کو ہمارے نظام تعلیم میں کتنی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانہ میں خام کاروں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ مجازی ڈگریوں یا اسناد کو لے کر تنخواہ کی لالچ میں تعلیم جیسے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیں بالفرض تہور سے کام لے کر کوئی ہمت کر ہی لیتا تھا تو طلبہ اس کو زیادہ دن تک ٹھیرنے نہیں دیتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کے امتحان کا بھی اور علمی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنے کا بھی یہ واحد طریقہ تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسلام کے مغربی ممالک (یعنی اندلس، مراکش وغیرہ) میں تعلیمی انحطاط کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے

فتجد طالب العلم منهم بعد ذهاب الكثير من اعمارهم فى ملازمة المجالس العلمية سكوتا لا ينطقون ولا يفاوضون وعنايتهم بالحفظ اكثر من الحاجة فلا يحصلون على طائل من ملكة التصرف فى العلم والتعليم۔ (مقدمہ صفحہ ۳۶۱)	تم (اس ملک کے) طالب علم کو پاؤ گے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ مجلسوں (یعنی تعلیمی مجلسوں) میں صرف سکوت اور خاموشی کے ساتھ گزر گیا، اس طور پر کہ وہ ان مجلسوں میں کچھ نہیں بولتے۔ مفاوضہ یعنی سوال وجواب نہیں کرتے، ان کی توجہ زیادہ تر غیر ضروری طور پر یاد کرنے اور حفظ میں صرف ہوتی ہے اس سے کوئی نفع ان کو حاصل نہیں ہوتا یعنی علم اور تعلیم میں خود سوچنے سمجھنے اور تصرف کی قابلیت اور ملکہ اُن میں پیدا نہیں ہوتا۔

اسی بنیاد پر اس نے اپنی رائے یہ قلم بند کی ہے کہ

وايسر طرق هذه الملكة فتق اللسان بالمحاورة والمناظرة فى المسائل العلمية فهو الذى يقرب شانها ويحصل مرامها۔ صفحہ ۳۶۱	اس ملکہ اور قابلیت کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ زبان سوال وجواب اور مناظرہ کے لیے علمی مسائل میں کھولی جائے اور یہی چیز اس ملکہ اور قابلیت سے آدمی کو قریب کرتی ہے اور جو مقصد ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ وہی زمانہ ہے جب عام مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کی تعلیم میں "مفاوضہ اور محاورہ" یعنی وہی "مباحثہ" کا طریقہ درسوں میں جاری تھا۔ ابن خلدون کی شہادت ہے کہ مشرقی ممالک کے اہل علم کی اعلیٰ قابلیتوں اور علمی ملکات کو دیکھ کر

فيظن كثير من رحالة اهل المغرب الى المشرق فى طلب العلم ان عقلهم	طلب علم کے لیے جو لوگ مغرب سے مشرقی ممالک کی طرف جاتے ہیں ان میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مشرق کے باشندوں

Marfat.com

علی الجملۃ اکمل من عقول اھل المغرب وانھم اشد نباھۃ واعظم کیسا لفطرتھم الاولیٰ وان نفوسھم الناطقۃ اکمل بفطرتھا من نفوس اھل المغرب ویعتقدون التفاوت بیننا وبینھم فی حقیقۃ الانسانیۃ. ص۳۶۱	کے عقول مغرب والوں کی عقلوں سے زیادہ کامل ہیں اور یہ کہ وہ لوگ عظمت دانش میں مغرب والوں سے زیادہ بہتر ہیں سمجھتے ہیں کہ شرق والوں کے نفوس ناطقہ ہی مغرب والوں سے زیادہ کامل ہیں اور ان دونوں میں نقص وکمال کا تفاوت اس پر مبنی ہو کہ دونوں کی حقیقت میں کمال و نقص کا اختلاف ہو۔

جیسا کہ چاہیے تھا ابن خلدون نے اس خوش اعتقادی کی تو تغلیط کی ہو۔ اور وجہ وہی بتائی ہو کہ شرق والوں کی تعلیم کا طریقہ بہتر ہو (طلبہ وہاں گونگے بنا کر نہیں رکھے جاتے) اسی لیے علمی ملکہ ان میں زیادہ راسخ اور استعداد ان کی زیادہ بالغ ہو جاتی ہو، اور مغرب والوں میں اس کی کمی ہو۔

واقعہ یہ ہو کہ تعلیم کا یہ نکتہ مسلمانوں کے سامنے شروع سے تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عباس کے قرب کا تذکرہ کسی موقعہ پر کیا گیا تھا۔ منجملہ اور باتوں کے ابن عباس کو دوسرے صحابہ کی نوجوان اولاد پر حضرت عمر جو ترجیح دیتے تھے اس کی ایک وجہ آپ نے یہ بھی بیان فرمائی تھی، جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں مصنف عبد الرزاق سے یہ اضافہ نقل کیا گیا ہو:۔

ان لہ لسانا سئولا و قلبا عقولا ص۵۴۷	(ابن عباس میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہو) کہ ان کے پاس ایک پوچھنے والی زبان اور سوچنے والا دل ہو۔

یقیناً اس رواج کا فقدان عصر حاضر کی جامعاتی تعلیم کا بڑا نقص ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی نقص کے احساس کا یہ نتیجہ ہو کہ کچھ دنوں سے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ٹیوٹوریل کلاسوں کو مروج کیا گیا ہو، لیکن اس میں جو طریقہ عمل اختیار کیا گیا ہو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے "مباحثہ اور مطالعہ" کے فوائد کی تلافی ہو سکتی ہو۔

اعادہ یا تکرار "مطالعہ" اور "مباحثہ" کے سوا تیسری خصوصیت ہمارے قدیم درس کی وہ چیز تھی جس کی تعبیر پچھلے زمانہ میں "اعادہ" کے لفظ سے کرتے تھے، ادھر کچھ دنوں سے اب اس کا نام "تکرار" ہوگیا ہے۔ شیخ محدث دہلوی نے اپنے تعلیمی مشاغل کا ذکر فرماتے ہوئے جو یہ لکھا ہے

"احاطہ اوقات، وشمول ساعات بہ مطالعہ وتذکار وبحث وتکرار ہر چہ از کتب خوانده باشد" ص ۳۱۳ اخبار

اس میں "بحث وتکرار" سے ان کا اشارہ درس کی اسی خصوصیت کی طرف ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب الغزالی میں درس قدیم کے اس طریقہ عمل کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں نامور علماء کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تھے تو شاگردوں میں جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا، اور استاد کے بتائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا یہ منصب جس کو حاصل ہوتا تھا اس کو معید کہتے تھے" ص۱۲ الغزالی

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں بغداد کے ایک مدرسہ کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد

المدرسة المستنصریة ونسبتها الی امیر المومنین المستنصر باللہ ابی جعفر بن امیر المومنین الظاھر بن امیر المومنین الناصر وبھا المذاھب الاربعة لکل مذھب ایوان فیہ المسجد وموضع التدریس وجلوس المدرس فی قبة خشب علی کرسی علیہ البسط ویقعد المدرس علیہ بالسکینة والوقار لابسا ثیاب السواد معتما	مدرسہ مستنصریہ کی امیر المومنین المستنصر باللہ ابوجعفر بن امیر المومنین الظاہر بن امیر المومنین کی طرف ہے، اس مدرسہ میں چاروں فقہی مکاتب کی تعلیم ہوتی تھی، ہر مذہب کے درس کے لیے ایک خاص ایوان مسجد میں ہے جو درس کی جگہ ہے، جو لکڑی کے ایک قبہ میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہیں، جس پر فرش بچھا رہتا ہے اسی پر سکون و وقار سے بیٹھتا ہے سیاہ کپڑے اور عمامہ باندھ کر مدرس جلوس فرما ہوتا ہے

اعادہ اور تکرار کے اس دستور کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے

وعلی یمینہ ویسارہ معیدان یعیدان کل ما یملی علیہ۔ ص۱۰۰ ابن بطوطہ ج	اور اس کے دائیں اور بائیں جانب دو معید بیٹھتے ہیں جو ان ٹکڑوں کو دہراتے ہیں جسے استاذ شاگردوں کو دیتا ہے۔

میر سید شریف جرجانی کے متعلق اسی اعادہ و تکرار کے سلسلہ میں ایک قصہ مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اعادہ اسباق کی کیا صورت تھی کہتے ہیں کہ میر صاحب پڑھنے کے لیے قطبی کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کے پاس اس وقت پہنچے جب وہ پیر فرتوت ہو چکے تھے۔ علامہ نے بڑھاپے کا عذر کیا، اور اپنے ایک شاگرد مبارک شاہ کے پاس مصر بھیج دیا

انہ کان لہ عبد رباہ من صغرہ علمہ حتی کان مدرسا وفاضلا فی کل العلوم وکان یدعی بمبارک شاہ المنطقی۔[1] مفتاح ص۲۴۲ ج ۱	یہ مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے، بچپن سے انہوں نے مبارک شاہ کو پالا پوسا اور پڑھایا، تا اینکہ مبارک شاہ مدرس ہو گئے۔ اور ہر علم میں فاضل، عام طور سے ان کو لوگ مبارک شاہ منطقی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

لیکن خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ مبارک شاہ نے میر صاحب کو اپنے حلقہ درس میں صرف بیٹھنے اور سننے کی اجازت دی۔ پوچھنے اور قراۃ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن مبارک شاہ رات کو یہ دیکھنے کے لیے کہ طلبہ کیا کر رہے ہیں، چپ چاپ نکلے، میر صاحب جس حجرہ میں رہتے تھے وہاں سے آواز اعادہ کی آرہی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میر صاحب کہہ رہے تھے، کتاب کے مصنف نے تو اس مسئلہ کی یہ تقریر کی، اور استاد نے اسی کو یوں بیان کیا۔ اور میں اس مسئلہ کی

[1] مسلمانوں کا اپنے غلاموں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اس کی مثال یہ واقعہ بھی ہے علامہ قطب الدین کے بیٹوں میں کوئی عالم مشہور نہیں ہوا لیکن غلام کو اپنے انھوں نے پڑھایا اور اس توجہ سے پڑھایا کہ اپنے وقت کے فاضلوں میں اسی غلام کا شمار ہوا، حضرت سلطان جی کے حوالہ سے میں نے ہندوستان کا قصہ بھی نقل کیا ہے کہ لاہور کے ایک قاری صاحب نے اپنے ہندو (نسلاً) غلام شادی نامی کو قرآن کا ایسا قاری بنا دیا کہ وہ شادی مقری کہلاتے تھے۔ سلطان جی نے بھی بچپن میں ان سے پڑھا تھا اور یہ تو معمولی واقعات ہیں، ابن عباس کے غلام عکرمہ ابن عمر کے غلام نافع حدیث کے اساطین میں ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے موالی کو جب سلطنت و حکومت تک پہنچایا۔ فقہ و حدیث تفسیر کے آئمہ میں غلاموں کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسی صورت میں ان کے غلاموں کو غلام کون کہہ سکتا ہے بلکہ مسلمانوں میں علماء کو "مولانا" کے لفظ سے خطاب کرنے کا جو عام دستور ہے اس کی ابتدا میرے خیال میں اس وقت ہوئی جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ بجائے خود جواب دینے کے حضرت نے خواجہ حسن بصری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "سلوا مولینا الحسن" (یعنی حسن بصری سے پوچھو) فرمایا۔ اور کون نہیں جانتا کہ حسن بصری کا تعلق بھی موالی سے تھا۔ دیکھو مناقب ابی حنیفہ للموفق ص۵۳

تقریر یوں کرتا ہوں" مبارک شاہ ٹھہر گئے، اور کان لگا کر غور سے سننے لگے، میر صاحب کی تقریر کا انداز اتنا دل چسپ تھا کہ لکھا ہے

لحقہ البھجۃ والسرا در بحیث رقص فی الفناء المدرسۃ۔ مفتاح ص۲۳۷ ج ۱

ایسی مسرت اور خوشی ان کو ہوئی کہ مدرسہ کے صحن میں ناچنے لگے۔

طالب العلمی کے زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ

ہمارے نظام تعلیم کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو بہ ظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر سوچا جائے تو کتنے ہی درس منافع کی وہ حامل تھی، مطلب یہ ہے کہ منجملہ اور دستوروں کے ایک دستور اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ عموماً بڑی جماعت کے طلبہ یعنی اوپر کی کتابیں پڑھنے والے فارغ ہونے سے پہلے، طالب العلمی ہی کے دنوں میں اس کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابیں نچلی جماعت کے طلبہ کو پڑھاتے رہیں، خصوصاً جو لوگ آگے چل کر مدرسی اور پڑھنے پڑھانے میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے رہتے، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے،

وکلما فرغت من تحصیل کتاب شرعت فی تدریسہ نفع المفتی والسائل ص۲۵

جس کتاب کے پڑھنے سے میں فارغ ہوتا، اسی کو پڑھانا بھی شروع کر دیتا۔

کلما کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی صورت ایک دو کتابوں کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، بلکہ ہر کتاب کے ساتھ آپ کا یہی دستور تھا جس کا پہلا فائدہ تو یہی تھا جیسا کہ مولانا ہی فرماتے ہیں۔

فحصل لی الاستعداد التام فی جمیع العلوم بعون اللہ الحی القیوم

تمام علوم میں میری لیاقت پختہ ہوتی چلی گئی، اللہ حی وقیوم کی اعانت سے۔

اور یہ واقعہ بھی ہے، کہ علم کو جو یوں مسلسل تازہ بتازہ نو بنو حالت میں رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی قابلیت جتنی بھی بڑھتی چلی جائے کم ہے، خصوصاً تجربہ کی بات ہے کہ کسی چیز کے سمجھنے میں آدمی پڑھنے کے وقت اتنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا جتنی ذمہ داری پڑھانے کے وقت

Marfat.com

خود بخود اس پر عائد ہو جاتی ہے۔ خود سمجھ لینا، اور سمجھ کر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ اس طریقہ کار کا یہ نتیجہ تھا کہ

لم یبق تعسرٌ فی ای کتاب کان من ای فن کان حتی انی درست مالم اقرءہ حضرۃ الاستاذ کشرح الاشارات للطوسی والافق المبین وقانون الطب ورسائل العروض۔	مجھے کسی کتاب کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی، خواہ کونسی بھی کتاب ہو اور کسی فن کی ہو حتی کہ اس مشق کی بنیاد پر ایسی کتابوں کو میں نے پڑھا دیا جنھیں استاد کے سامنے میں نے نہیں پڑھی تھی مثلاً طوسی کی شرح اشارات اور افق المبین طب میں قانون شیخ، عروض کا رسالہ

مولانا مرحوم نے بے پڑھے جن کتابوں کے پڑھانے کا ذکر کیا ہے، جو ان کتابوں کی خصوصیتوں سے ناواقف ہیں، وہ کیا اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں "الافق المبین" میر باقر کے ادبی اور ذہنی زور کا شہ کار ہے، پڑھانے والے کو آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے پڑتے ہیں، یا طوسی کی شرح اشارات توازن دماغی کا جتنا اچھا نمونہ ہے، ابن سینا اور امام رازی کی بحثوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ چکانے میں یہ شخص جتنا کامیاب ہوا ہے، اسی لیے اس کتاب کے پڑھانے میں پڑھانے والوں کو بھی ضرورت پڑتی ہے کہ اپنے احساسات کو جادہ اعتدال سے ہٹنے نہ دیں، ورنہ بات ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اسی طرح قانون گو طب کی کتاب ہے نسبتاً اسے زیادہ مشکل نہ ہونا چاہیے، لیکن قلم تو ابن سینا کا ہے، جن حقائق و نکات کی طرف مختصر لفظوں میں اشارہ کرتا ہے، ان کا انہی الفاظ سے اخذ کرنا طلبہ کو سمجھانا، یہ ساری باتیں آسان نہیں ہیں، لیکن یہ اس زمانہ کے طرز تعلیم کا ثمرہ تھا کہ معلومات کی گرد اوری کے لحاظ سے خواہ آپ اس طریقہ پر جس قدر چاہیے اعتراض کیجیے، لیکن جس قوت کے ذریعہ سے معلومات فراہم کیے جاتے ہیں، اس قوت کی پرورش و پرداخت نشو و نما کے لیے درس و تدریس کا یہ طریقہ جتنا مفید تھا۔ مشکل ہی سے یہ فوائد کسی اور ذریعہ سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

غور تو کیجیے مطالعہ، مباحثہ، اعادہ اور فراغت سے پہلے مدارس یعنی پڑھنے کے

Marfat.com

ساتھ ہی پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھاتے چلے جانے ان تمام ذرائع سے دماغوں کو جب مانجا جائے ان میں جلا پیدا کی جائے تو ایسے دماغوں کی صلاحیتوں میں جتنا بھی اضافہ ہو، غور و فکر کا مادہ جتنا بھی بڑھتا چلا جائے۔ احساسات میں نزاکت، شعور کی بیداری میں جتنا بھی اضافہ ہوتا چلا جائے وہ غیر متوقع نہیں ہو سکتا۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ جن لوگوں کا آئندہ بھی ارادہ ہوتا کہ ہم زندگی تعلیم و تدریس میں بسر کریں گے۔ وہ اس چوتھی بات کی خاص طور پر کوشش کرتے تھے، چند ٹکوں کے لیے ٹیوشن کے نام سے دربدر اس زمانہ میں سائکلوں پر عصری جامعات کے طلبا جو مارے مارے پھرتے ہیں، ان کے سامنے یہ دلی جذبہ نہ تھا۔ بلکہ نچلی جماعت کے طلبہ کی خوشامد کر کے کچھ اپنی طرف سے پڑھنے والوں کی امداد کر کے پڑھانے کے اس مغتنم موقعہ کو پیدا کرنا چاہتے تھے، چوں کہ خود شوق سے پڑھاتے تھے۔ اس لیے ان کا حال ٹیوشن والے پیشہ ور طلبہ کا نہ تھا کہ صرف تنخواہ واجب کرنے کے لیے وقت پر حاضری دے دی، کچھ ادھر اُدھر سے بچوں کو اُلٹ پلٹ کرتا دیا، وقت گزر گیا، سائکل لی۔ اور اس دروازہ سے اُٹھ کر دوسری ڈیوڑھی پر پہنچے، علم کی خاطر نہ سہی، پیسوں ہی کی خاطر۔ رضاءً نہ سہی جبراً ہی سہی مگر یہ واقعہ ہے کہ جن طلبہ کو ان غیر ذمہ دارانہ ٹیوشنوں کا موقعہ طالب العلمی کی زندگی میں مل جاتا ہے۔ بایں ہمہ لاپروائی ان کی قابلیت اور علمی مشق ان طلبہ سے عموماً بہتر ہوتی ہے، جو اس قسم کی ٹیوشن پر مجبور نہیں ہوتے ہیں، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں اوپر کی جماعت والے طلبہ خود اپنے شوق سے نچلی جماعتوں کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، اس طرز عمل سے ان کی لیاقتوں میں کتنا اضافہ ہوتا ہوگا۔

طالب العلمی ہی کے زمانہ سے درس دینے کا ذوق بعضوں پر تو اتنا غالب ہوتا تھا کہ بعض اوقات اسی کتاب کو جسے وہ ابھی پڑھ ہی رہے ہیں، لیکن اس کی جو جلد یا جو حصہ ختم ہو چکا ہے، دوسرے طلبہ کو وہی پڑھی ہوئی جلد یا پڑھا ہوا حصہ پڑھانا بھی شروع کر دیتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد نے اپنے اُستاد میر طفیل محمد کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

Marfat.com

"اکثراں بود کہ ہر کتابے کہ خود می خواندند بہ تلامذہ خود درس می گفتند" ص۱۵ ماثر الکرام

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کتاب کو ابھی ایک شخص پڑھ ہی رہا ہے اسی کو اس نے پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ جو تعلیم اس استعداد کو طلبہ میں پیدا کرتی تھی، آج اسی کو مورد صد طعن اور محل ہزار شناعت ٹھیرایا جا رہا ہے مولانا آزاد نے اسی واقعہ کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ

"قوت طبع اقدس ازیں جا فہم تواں کرد"

بلاشبہ یہ معمولی استعداد کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ نچلی جماعت ہی کے طلبہ تھی، لیکن اس زمانہ کا جیسا کہ دستور تھا مطالعہ اور مباحثہ کے بغیر تو کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا تھا، یقیناً خود پڑھنے والے طلبہ سے جو لوگ پڑھا کرتے تھے، وہ ان سے ردوقدح میں کمی کیا کرتے ہوں گے لیکن ان کو راضی رکھتے ہوئے پڑھاتے چلا جانا کوئی آسان بات نہیں ہو سکتی، مولانا عبدالحی مرحوم نے تو اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس طریقہ سے جس زمانہ میں طلبہ کو میں پڑھایا کرتا تھا

وضیت بل دسی طلبۃ العلوم۔ نفع المفتی ص۲۵ اپنے درس سے میں طلبہ کو خوش رکھتا تھا۔

مولانا عبدالحی مرحوم کے مشہور شاگرد رشید مولانا محمد حسین الہ آبادی جن کا ذکر ابتداء کتاب میں بھی کہیں آچکا ہے ان کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ مولانا عبدالحی صاحب نے تمام اسباق آپ کے سپرد کر دیئے تھے سوا آخری کتابوں کے باقی سب آپ (یعنی شاگرد) پڑھاتے تھے۔ ص۱۱

اس عجیب وغریب دستور سے طلبہ کی استعداد کے بڑھانے اور چمکانے میں جو مدد ملتی تھی، وہ تو خیر بجائے خود تھی، اگر غور کیا جائے تو اس ذریعہ سے تعلیمی مصارف کا بار کتنا ہلکا ہوتا تھا۔ خواہ اس بار کو حکومت اٹھاتی ہو، یا عام پبلک، میرا مطلب یہ ہے کہ کسی شہر اور قصبہ میں دس بیس مدرسین مختلف علوم وفنون کے ماہرین جمع ہو جاتے تھے، اور درس دینا شروع کرتے تھے۔ ان مدرسین کے ضروریات زندگی کی کفالت عموماً حکومت ہی کرتی تھی۔ حکومت کے بعد عام مسلمان ان مدرسین کی امداد مختلف

Marfat.com

صورتوں سے کرتے تھے لیکن بسا اوقات ان تعلیمی شہروں اور قصبوں میں طلبہ کی تعداد حد سے زیادہ متجاوز ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات رام پور، لکھنؤ، دلی، مراد آباد وغیرہ میں ہزار ہزار دو دو ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کے لیے گنتی کے یہ دس بیس مدرسین کافی ہو سکتے تھے؟ پھر کیا ہوتا تھا؟ اسی پر غور نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہی تھا کہ علاوہ ان مدرسین کے تدریسی کاروبار کا ایک بڑا حصہ ان طلبہ پر تقسیم ہو جاتا تھا جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ نچلی جماعتوں کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ گویا ہر فن اور ہر علم کے سلسلہ میں ایک یا دو اُستادوں کی حیثیت تو صدر کی ہوتی تھی، حکومت یا پبلک کی جانب سے ان کی معاشی سہولتیں خواہ بشکل تنخواہ و وظائف یا بشکل جاگیر بہم پہنچا دی جاتی تھیں[1]، لیکن ہر مضمون کے صدر کے ساتھ بیسوں مددگار یا اسسٹنٹ مدرسین ان ہی طلبہ کے گروہ سے مُفت پڑھانے والے پیدا ہو جاتے تھے۔

ہمارے زمانہ میں تعلیم کا جو نظم اسکولوں اور کالجوں کی شکل میں قائم کیا گیا ہے جن میں اوپر سے نیچے تک ہر جماعت کے پڑھانے والے تنخواہ دار مدرسین ہیں۔ عموماً بیس بیس پچیس پچیس روپیہ سے کم جن کی تنخواہیں نہیں ہوتیں۔ اگر اس کو پیش نظر رکھ کر اس بچت کا حساب لگایا جائے جو مذکورہ بالا طریقۂ کار اور سسٹم سے قدرتاً پیدا ہوتی تھی، تو یہ مبالغہ نہیں ہے کہ اس بچت کا تخمینہ

---

[1] مقصد یہ ہے کہ چندہ کا رواج تو حال سے ہوا، ورنہ حکومت کی بربادی کے بعد عموماً قوم کے ارباب ثروت و دولت اپنا فریضہ سمجھتے تھے کہ ان اساتذہ کے مصارف کی پابجائی کا سامان کریں۔ حضرت مولانا لطف اللہ (علیگڑھ) رحمۃ اللہ علیہ جو اپنی کثرت درس سے پچھلے زمانہ میں واقعۃً استاذ العلماء ہو گئے تھے، مدت تک جیسا کہ میں نے سُنا آپ کی گزر بسر کا دار و مدار علیگڑھ و نواح علیگڈھ کے رؤسا کی خدمات پر تھا۔ عموماً ان رئیسوں نے اپنے اپنے اسٹیٹ سے حضرت کے لیے کچھ ماہوار جاری کر دیا مسٹر ناس کول برک نے مغل حکومت کے زوال کی وجہ سے ہندوستانی نظام تعلیم کو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی طرف برطانوی حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے ایک مشہور یادداشت لکھی تھی جس میں انھوں نے بھی اس کی توثیق کی ہے کہ سلطنت کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان کے لاوارث طبقہ اہل علم کی سرپرستی یہی مسلمان امراء کر رہے ہیں۔ لکھا ہے "اب بھی شاہزادے نواب اور زمیندار جنھیں اپنے باپ دادا سے علم کا شوق پہنچا ہے تھوڑی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔" رسالہ اردو سہ ماہی اپریل ۱۹۳۶ء

لاکھوں لاکھ تک پہنچ سکتا ہے،

پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ہی پڑھاتے چلے جانے سے جو تعلیمی منافع پڑھانے والے طلبہ کو پہنچتے تھے مزید برآں ایک بڑا عظیم معاشی فائدہ اس دستور کا یہ بھی تھا۔

پُرانی تاریخوں میں ہندوستان کے متعلق مشرقی اور مغربی مولفین کی جو اس قسم کی رپورٹیں پائی جاتی ہیں مثلاً صبح الاعشی میں قشقلندی نے دلّی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیہا الف مدرسۃ واحدۃ للشافعیۃ — ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدرسے تھے

وباقیہا للحنفیۃ — جن میں شافعیوں کا ایک اور باقی سب حنفیوں کے تھے۔ ج ۵ ص ۶۹ مصر

یا اورنگ زیب کے زمانہ کے مشہور مغربی سیاح ہملٹن کا بیان ہے کہ

"شہر ٹھٹھ میں مختلف علم و فن کے چار سو مدرسے تھے" (ہندوستان عالمگیر کے عہد میں۔ نواب مرزا یار جنگ)

مَیں نہیں سمجھتا کہ لوگ ان عبارتوں کو پڑھ کر اپنے ذہن میں کیا نقشہ قائم کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ غلط بیانی اور شاید دوسروں کو دھوکہ دینا ہوگا اگر "مدارس" کے لفظ کو پاکر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اسلامی عہد میں بھی ان مدارس کی نوعیت وہی تھی، جو آج عصری جامعات و کلیات، مدارس اور اسکولوں کی ہے جن کے لیے الگ الگ چھوٹی بڑی عمارتیں بنائی جاتی ہیں، میل دو دو میل کے رقبے گھیرے جاتے ہیں۔ اور ان میں درسگاہوں اور قیام گاہوں، بازی گاہوں وغیرہ کے نام سے ہال (قاعات) کمرے حجرات اور میدان کورٹس وغیرہ لاکھوں بلکہ کروروں روپے کے مصارف سے تیار کیے جاتے ہیں، نیچے سے لے کر اوپر تک ہر چھوٹی بڑی کتابوں کے پڑھانے کے لیے باضابطہ سرکاری تنخواہ پانے والے مدرسین نوکر ہیں۔ اور تدریس ہی نہیں، امتحان، امتحان کے سوالات، امتحانات کی نگرانی، جوابی بیاضوں کی جانچ، سوالی پرچوں کے تبصرے تصحیح، الغرض جو قدم بھی اُٹھایا جاتا ہے، روپیہ کے ساتھ اُٹھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالانہ حکومت بھی تعلیم کی مد پر کروروں روپے صرف کرتی ہے، لیکن اس کے بعد بھی جب تک بیس پچیس روپے ماہوار خرچ کرنے کی صلاحیت کسی میں نہ ہو، عام حالات میں

Marfat.com

وہ عصری تعلیم سے نفع نہیں اُٹھا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا لفظ "مدرسہ" کا ناجائز نفع ہوگا اگر ان پچھلے دنوں میں بھی تعلیم کا یہی نقشہ بنا کر پیش کیا جائے۔ علم و دین کی خدمت پر حکومتیں اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں بھی اپنے خزانوں سے بیش قرار رقم صرف کرتی تھیں، فیروز تغلق کے عہد میں لکھا ہے کہ

وکانت الوظائف فی عہدہ للعلماء	فیروز کے زمانہ میں علماء و مشائخ کی تنخواہوں اور
والمشائخ ثلثۃ ملامین وستمائۃ الف	وظائف پر تین ملین اور چھ لاکھ یعنی چھتیس لاکھ تنکے
تنکہ۔ ص۲۱ نزہۃ الخواطر	خرچ ہوتے تھے"

فیروز تغلق کا زمانہ اور (چھتیس لاکھ تنکہ) روپے کی گرانی اور چیزوں کی ارزانی کے اس زمانہ میں خیال تو کیجیے کہ موجودہ زمانہ کے حساب سے یہ رقم کتنی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم و فن کی قدردانیاں جو مغلوں کے زمانہ میں بہت نمایاں معلوم ہوتی ہیں، یہ کچھ مغلوں ہی کے عہد کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ابتدا سے اسلامی سلاطین کو علم و معرفت کے ساتھ یہی شغف رہا ہے، اور آخر وقت تک یہ ذوق ان کا باقی رہا۔ حکومت آصفیہ کا وہ زمانہ جب اورنگ آصفی پر نواب ناصر الدولہ بہادر مرحوم و مغفور جلوہ فرما تھے، چندو لعل جیسے وزراء کی وزارت تھی، ہر طرف ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی خزانہ خالی تھا، لیکن اسی زمانہ کے مورخ صاحب گلزار آصفیہ راوی ہیں

"در بلدہ حیدرآباد از قدردانی حضور پُرنور (نواب ناصر الدولہ مرحوم) قریب یکصد علماء و فضلاء ارباب علوم عقلی و نقلی بدرماہا ہے بیش قرار بقدر تقدیر ملازم ہستند"۔ ص۲۲۹ گلزار آصفیہ۔

اول و آخر کی یہ دو مثالیں میں نے صرف اس لیے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو کہ علم کی سرپرستی شاہان اسلام کا ہندوستان میں ایک قدیم وطیرہ تھا۔ تفصیل اگر دیکھنا منظور ہو تو ہمارے مرحوم دوست مولانا ابو الحسنات ندوی بہاری کی کتاب "ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں" نامی میں دیکھ سکتے ہیں جس میں انھوں نے دار الخلافہ دہلی کے سوا ہر ہر صوبہ کے مدارس اور تعلیم گاہوں کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ اضافہ

Marfat.com

کی اس میں بہت کچھ گنجائش ہے۔ ڈھونڈھنے سے تو یہاں تک سراغ ملتا ہے کہ ہندوستان میں ایسے مدرسے بھی قائم کئے گئے تھے جن میں طلبہ کے قیام و طعام کا بھی نظم تھا، باضابطہ سرکاری امتحانات بھی ہوتے تھے، اور ان ہی مدارس کے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں بھی دی جاتی تھیں، بیجاپور کی مشہور تاریخ بستان السلاطین میں محمد عادل شاہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

"در آثار شریف دو مدرس تعین نمودہ کہ درس حدیث و فقہ و علم ایمان برپا دارند"

اسی کے بعد اس مدرسہ کے "طعام خانہ" کا ذکر صاحب کتاب ابراہیم زبیری نے جو کیا ہے اس کے سننے کے بعد تو شاید اس زمانہ کے فردوسی اقامت خانوں کے وارڈنس کے منہ میں بھی پانی بھر آئے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"شاگرداں۔ از سفرہ آثار آش و نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام نان گندم و کھچڑی"

کبھی کبھی نہیں روزانہ دن کے کھانے میں طلبہ کو بریانی و مزعفر کی پلیٹیں بغیر کسی معاوضہ کے آج بھی دُنیا کے کسی بورڈنگ ہوس میں میسر آتی ہیں، اور کھلنے پینے ہی کی حد تک نہیں مزید یہ تھا

"و فی اسم یک ہون[1] و بدو ایں (ماسوا اس کے) کتابہائے فارسی و عربی بدو می نمائند"

---

[1] ہون سلاطین دکن کا ایک مشہور طلائی سکہ تھا جسے اس زمانہ کے انگریزی روپے کے چار ساڑھے چار روپیہ کے مساوی سمجھا جاتا ہے ہندوستان میں "ہُن برستا ہے" کی ضرب المثل میں اسی ہون کی طرف اشارہ ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ جنوبی ہند کا کوئی لفظ ہے، لیکن السیوطی نے اپنی کتاب حسن المحاضرہ میں احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ اس نے خلیفہ بغداد معتضد کے پاس جب اپنی لڑکی قطر الندی کو رخصت کیا تو منجملہ اور چیزوں کے مائۃ ھن ذھب (سو ہُن سونا بھی تھا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں بھی اس لفظ کا رواج تھا، کیا تعجب ہے کہ دکن میں یہ لفظ مصر سے آیا ہو۔ میرے خیال میں تو دکن کے قدیم باشندے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے کوئی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ پانی کو آج تک یہ لوگ نیلو (نیلو) کہتے ہیں، سامری قوم کے باشندے بھی یہاں پائے جاتے ہیں، ملا عبد النبی نے دستور العلماء میں لکھا ہے کہ وجیانگر کے راجہ رام راج کی کھوپڑی احمد نگر میں سامری قوم نے لی تھی۔ ہر سال اس کا جلوس بھی نکالتی تھی۔ ہُن کے متعلق السیوطی کی جس عبارت کا میں نے حوالہ دیا ہے وہ پوری عبارت یہ ہے و فی سنۃ اثنتین و مائتین (۲۸۲ھ) زفت قطر الندی بنت خمارویہ بن احمد بن طولون من مصر الی الخلیفہ المعتضد ونقل ابو ھانی جہازھا مالم یر مثلہ کان من جملتہ الف تکہ الجوھر و عشر صنادیق جوھر و مائۃ ھون ذھب حسن المحاضرہ ص ۱۳۵ ج ۲۔ (باقی بر صفحہ ۳۴۷)

کھانے اور کتابوں کے سوا ایک ہون (جو تقریباً ساڑھے چار روپیہ انگریزی کے مساوی تھا) بھی غالباً کپڑوں جوتوں و دیگر ضروریات کے لیے طلبہ کو ملتا تھا اور یہ تو صرف ایک آثار شریف کے مدرسہ کا ذکر تھا، غالباً کوئی عمارت تھی، جس میں تبرکات رکھے جاتے ہوں گے، اسی عمارت میں یہ مدرسہ تھا۔ زبیری نے لکھا ہو کہ جامع مسجد میں بھی چند مکاتب قائم تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"در مسجد جامع دو ملا مکتب دار الطفال، و دو مکتب تحصیل علوم عربی و یک مکتب علم فارسی مقرر داشتہ"

ان سب مدارس و مکاتب میں بھی ان کا بیان ہو کہ طلبہ کو بریانی دمزعفر کھچڑی و نان گندم اور ہون ملا کرتے تھے اور غالباً ہندوستان میں بیجاپور ہی کے مدارس ایسے تھے جن کے متعلق الزبیری نے لکھا ہو کہ

"امتحان بتاریخ سلخ ذیحج می شد"

یعنی ہجری سال کے اختتام پر سالانہ امتحان بھی طلبہ کا ہوتا تھا، دوسری جگہ تصریح بھی کی ہو۔

"ہر سال امتحان می شد"

امتحان کے تذکرہ میں اس کی تفصیل نہیں بتائی ہو کہ تحریری ہوتا تھا یا تقریری لیکن یہ لکھتے ہیں کہ

"واز انعام ہون سرفرازمی فرمودند"

غالباً پاس والے طلبہ کو انعام دیا جاتا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، یہ بھی ان ہی کا بیان ہو کہ

"وکسے کہ درآں (طلبہ) ہوشیار از علم می شد بعہدہ عمدہ دبہتر نوکر و ملازم می درشتند" بستان السلاطین ص ۲۱۵

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الزبیری صاحب بستان السلاطین کا یہ بیان اگر صحیح ہو تو تعلیم کے

(بقیہ صفحہ ۳۴۶) یعنی ۲۸۲ھ میں خمارویہ بن احمد بن طولون نے اپنی لڑکی قطر الندی کو خلیفہ معتضد کے پاس رخصت کیا لڑکی کے باپ نے جہیز میں اتنی چیزیں دی تھیں جن کی نظیر نہیں دیکھی گئی جو چیزیں بھیجی گئی تھیں ان میں ہزار گھنڈیاں جواہرات کی تھیں علاوہ اس کے دس ہاون دستے بھی جو اہرات تھے اور سو تہون سونا بھی تھا" واللہ اعلم ہن سے یہاں سکہ مراد ہو یا کوئی اور چیز لیکن اتنا معلوم ہوتا ہو کہ سونے کے ساتھ ہن کا تعلق تھا۔ یہ بھی کون کہہ سکتا ہو کہ مصری ہن کا وزن کیا ہوتا تھا۔ یہ تیسری صدی ہجری کا قصہ ہو جس سے معلوم ہوا کہ مصر میں ہن کے لفظ کا رواج بہت قدیم زمانہ سے ہے، بظاہر اسلام سے پہلے ۱۲

Marfat.com

عصری نظام کی گونہ جھلک اس میں ضرور محسوس ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جزئیات سے کلیات کے پیدا کرنے کا جو تحقیقاتی قاعدہ ہی چلنے والا چاہیے، تو اس کی بنیاد بنا کر ایک بڑی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں لاجنگ بورڈنگ، امتحان کا باضابطہ نظم حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ اور موجودہ زمانہ کے تعلیمی اداروں کو حکومت نے آج "نوکر سازی" یا "کلرک بافی" کی جو مشین بنا رکھا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔[۱]

---

[۱] جیسا کہ میں نے عرض کیا، بیجاپور کے ان مدرسوں کو موجودہ زمانہ کے کلیات و جامعات کا قائم مقام قرار دینا، موجودہ زمانہ کی تحقیقاتی (ریسرچ) والی شاعری تو ہو سکتی ہے، لیکن حقیقت سے یہ بات بہت بعید ہے اگرچہ بیجاپور کی حکومت کا مغربی باشندوں سے جو تعلق ہو گیا تھا خصوصاً پرتگیز نے گوا بندر پر قبضہ کر کے بیجاپور کی حکومت پر اپنے جو اثرات قائم کر لیے تھے اور اس کی وجہ سے مغربی اقوام سے میل جول کی ایک راہ کھل گئی تھی، اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ یورپ کی سُنی سنائی باتوں کو بھی دخل ہو، ابراہیم زبیری ہی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بیجاپوری دربار میں ابراہیم عادل شاہ ہی کے زمانہ سے یورپین ڈاکٹر، جن ہونے کی حیثیت سے گھس گئے تھے۔ فرلوب نامی ڈاکٹر کا تو ایک دلچسپ لطیفہ بھی نقل کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کو بھگندر والا پھوڑا ابرز میں ہو گیا۔ غالباً جسے فس چولا اور ناسور کہتے ہیں۔ فرلوب حالانکہ اس زخم کے اپریشن سے واقف نہ تھا لیکن بادشاہ پر عمل جراحی کیا۔ نتیجہ بالعکس نکلا، حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ مگر رحم دل ابراہیم نے فرلوب کو بلا کر سمجھایا کہ میرے مرنے سے پہلے بیجاپور چھوڑ دو، ورنہ میرے بعد تجھے لوگ مار ڈالیں گے۔ ابراہیم کا انتقال ہو گیا، فرلوب نہ جا سکا۔ خواص خاں نے ناک اور نچلا لب اس کا غصہ میں کاٹ دیا۔ مگر فرلوب نے گھر پہنچ کر اپنے ایک غلام کی ناک اور لب کو کاٹ کر پھر اپنے چہرہ پر چسپاں کر لیا، اور اس کا یہ عمل کامیاب ہوا۔ زبیری نے لکھا ہے کہ "وبہتر شد" فرلوب اچھا ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جراحی کے فن میں ان لوگوں کو اسی زمانہ سے کمال حاصل تھا۔ لکھا ہے کہ "تا زمانے در شہر بیجاپور بہ حکمت و معالجت گذرانید حکیم بے بدل بود" صفحہ ۳۰۔ بادشاہ کے قتل کرنے والے عیسائی ڈاکٹر کا زندہ رہ جانا صرف بینی و لب تراشی پر قناعت کرنا، اور غلام کے ساتھ اس بے دردی کے ساتھ فرلوب کا پیش آنا اس پر بھی حکومت بیجاپور کی خاموشی بلا وجہ نہ تھی، آپ کو اسی کتاب سے معلوم ہو گا کہ بیجاپور کی حکومت گوا کی مغربی قوت سے ڈرتی تھی، علانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹ کر گوا بندر میں قید کیا جاتا تھا اور حکومت منت سماجت کے سوا ان ڈاکوؤں کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ حضرت سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے بیجاپور کی حکومت کو کیوں ختم کیا؟ بلکہ دکن کی ساری کمزور چھوٹی چھوٹی راج دھانیوں پر حملہ کا کیا مقصد تھا، ایک گروہ ہے جو اورنگ زیبؒ پر زبان طعن دراز کر رہا ہے حالانکہ سچ یہ ہے کہ سمندر کی طرف مغربی بیڑے اور خشکی میں مرہٹے ان ہی حکومتوں کی کمزوریوں سے نفع اٹھا کر اپنے آپ کو آگے بڑھا رہے تھے، بوجہ شیعہ ہونے کے، دکن کے عام مسلمانوں کو جو عموماً سنی تھے، حکومت نہیں پوچھتی تھی بلکہ مسلسل ایرانیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، عہدوں پر وہی قابض تھے۔ رفیع الدین شیرازی کے حوالہ سے جو بیجاپور حکومت میں (باقی بر صفحہ ۳۴۹)

لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ آثار شریف کے مدرسہ میں کل دو مدرس تھے۔ اسی طرح جامع مسجد کے مدرسوں میں بھی ایک دو اُستادوں سے زیادہ ایسے آدمی نظر نہیں آتے ہیں جو حکومت سے تنخواہ پاتے ہوں، نیز طعام و قیام کا نظم ان مدرسوں میں بھی حکومت کی جانب سے تھا پڑھنے والوں پر فیس کا وہ بار نہیں ڈالا جاتا تھا، جس کے بوجھ سے آج ہندوستان کی کمر ٹوٹی چلی جا رہی ہے، تعلیمی حلقوں میں چیخ پکار برپا ہے۔ امتحان اگر لیا بھی جاتا تھا، تو اس کی فیس نہیں لی جاتی تھی، بلکہ اگر الزبیری کے بیان میں اپنی طرف سے یہ الفاظ نہ بڑھا لئے جائیں کہ کامیاب ہونے والوں کو انعام ملتا تھا تو جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے، وہ صرف یہ ہے :۔

(بقیہ صفحہ ۳۴۸) منصب جلیل پر سرفراز تھا۔ نقل کیا ہے:

"بندہ آنچہ می داند از اہل شیراز کہ مولد و منشا ماست دہ ہزار اہل استحقاق آمدہ با جمعیت و اسباب و تجمل بازگشت" (ص ۱۱۱) سوچنے کی بات ہے کہ ایک شیراز شہر ہے دس ہزار اگر رفیع الدین کے زمانہ میں واپس گئے اسی سے خیال کیجئے کہ دکن کی ان حکومتوں کے یہاں ایران کے مختلف شہروں سے کتنے آتے تھے جن میں بڑی تعداد تو نوکر ہو جاتی تھی اور بہت سے لے دے کر واپس ہوتے تھے ایسی صورت میں ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے خود یہاں کے دکنی سنی مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہوگا، ظاہر ہے۔ الزبیری نے اورنگ زیبؒ کا وہ فرمان بھی نقل کیا ہے۔ جب بیجاپور کی حکومت نے کہلا بھیجا کہ ہم تو مسلمان ہیں ہم پر حملہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیبؒ نے جواب میں لکھا تھا۔

"آنچہ شما گفتند درست و راست ہست ما را از شہر شما و ملک شما سروکارے نیست و قصد جنگ و قتال نداریم مگر ایں کافر فاجر حربی شقی کہ در شان او صادق است سہ حرم میں چھپے بھی تو ہے کشتنی، در بغل شما جا گرفتہ و در پناہ شما آمدہ فسادات و خرابیہا کند اسلامیاں بلاد و غربا ملک و دیار ازیں جا تا دہلی از ایذائش رنج کش"

ظاہر ہے کہ اس سے سیواجی مراد ہے، آخر میں عالمگیر کے الفاظ ہیں:

"امالت (دشمنا) و استیصال بیخ فساد بہا کہ شعر ہو کیم واجب و متحتم" مطلب یہ ہے کہ بحیثیت اقتدار اعلیٰ ہند ہونے کے مسلمانوں کو اس کس مپرسی میں چھوڑ دینا میرے لیے کسی حیثیت سے جائز نہیں ہے۔ علی سے دکن اورنگ زیبؒ کی روانگی کس نصب العین کے تحت تھی۔ اسی فرمان میں صراحۃً اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"از سقط الراس (وطن مالوف) آمدن جز ایں نیست کہ آں حربی (سیواجی) را بدست آریم و جہانیاں را از اذیتش رہانیم چوں کہ او در پناہ شما ست او را از شما می طلبیم"

آخر کے یہ الفاظ قابل غور ہیں ۔۔۔ "ہمیں کہ بدست آمد ہمیں ساعت برمی دیم و راہ خویش گیریم" بستان السلاطین ص ۴۲۵ لیکن اس معمولی شرط کی تعمیل پر بھی جو حکومتیں آمادہ نہ تھیں اگر ان کو اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑا تو اس میں قصور کس کا ہے۔

Marfat.com

"از انعام ہون سرفراز می فرمودند"

جو ایک عام بیان ہے، کامیاب اور ناکام پر امتحان دینے والے کی طرف اس انعام کو منسوب کیا گیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے مدارس بھی ہندوستان میں ضرور تھے، لیکن ان ہی چند سرکاری مدرسوں پر تعلیم کا دار مدار تھا، یہ قطعاً غلط ہے۔

اور میرا ذاتی خیال تو ہے کہ ہندوستان میں بعض بادشاہوں یا امیروں کی طرف مدرسہ کی تعمیر کا انتساب جو تاریخوں میں کیا جاتا ہے، عموماً ان مدارس کی زیادہ تر غرض تعمیری ذوق کی تسکین تھی۔ جہاں اس ذوق کے تقاضے کو لوگ محل سراؤں، کوشکوں، قلعوں وغیرہ کی تعمیر سے مطمئن کرتے تھے وہیں کسی مقام کی دل کشی چاہتی تھی کہ یہاں عمارت ہو، عمارت بنا دی جاتی تھی، بن جانے کے بعد اگر تعلیم و تدریس کے لیے کسی کو اس میں بٹھا دیا گیا، تو وہی عمارت "مدرسہ" کے نام سے مشہور ہو جاتی تھی۔ مثلاً دلی میں ہم دیکھتے ہیں سیری کے بند آب پر یا حوض (تالاب) علائی پر جو مدارس تھے، ان کے متعلق میرا بھی گمان ہے، کسی ندی کو روک کر بند بنانے کا عام رواج ہندوستان میں تھا، سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر چھلک رہا ہے، عہد عثمانی کے عثمان ساگر اور حمایت ساگر اور نظام ساگر کا جن لوگوں نے معائنہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے بند (دکشہ) پر بیساختہ دل چاہتا ہے کہ کوئی عمارت ہوتی۔ دل کی اسی خواہش کی تکمیل کی جاتی تھی، جو اس تکمیل کی قدرت رکھتے تھے، ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جن مدرسوں میں ایک دو مدرس سے زیادہ کسی زمانہ میں نہ ہوں۔ کیا موجودہ زمانہ کے لحاظ سے مدرسہ کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور دلی کے ان مدرسوں کا یہی حال تھا۔

"ہندستان کے اسلامی مدارس" کے مصنف جو اس میں شک نہیں ہے، اس موضوع کے محقق ہیں وہ اسلامی عہد کے ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ عظیم الشان اور وسیع سلسلہ عمارت درسگاہ کے لیے کبھی کسی دور میں نہیں بنا" کتاب مذکور ص۶۱

Marfat.com

ذرا عظیم الشان وسیع کبھی اور کسی بے کے الفاظ کو پیشِ نظر رکھیے اور سُنیے، جس مدرسہ سے زیادہ عظیم الشان وسیع کبھی کسی زمانہ میں اس ملک میں مدرسہ نہیں بنا، اس کا طول و عرض کتنا تھا۔ یہ الفاظ اُنہوں نے بیدر کی اسلامی حکومت کے مشہور وزیر خواجہ عماد الدین محمود گیلانی المعروف بہ "محمود گاواں" کے متعلق لکھے ہیں، گو اس مدرسہ کی عمارت کا ایک حصّہ منہدم ہو چکا ہے، خصوصاً ایک بڑا مینار اس کا گر چکا ہے لیکن باوجود اس کے دوسرا مینار اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، اور مدرسہ کی عام حالت بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہے۔ خاکسار جب اس مشہور مدرسہ میں تماشائی کی حیثیت سے داخل ہوا، تو دیر تک متحیر تھا کہ کیا یہی ہندوستان کا سب سے بڑا وسیع مدرسہ تھا۔ خیال گذرا، اور شاید اپنے ساتھیوں سے بولا بھی کہ غالباً مدرسہ کا صرف دروازہ اور دروازہ کی عمارت رہ گئی ہے لیکن غالباً جو اصل مدرسہ تھا، وہ ویران ہو کر شہر کے دوسرے مکانوں میں شریک ہو گیا۔

لیکن بعد کو تاریخوں میں جب پڑھا کہ شرقاً غرباً پچھتر اور شمالاً جنوباً پچپن گز میں اصل عمارت ہی تیار ہوئی تھی، تب مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اور یہی توجیہ سمجھ میں آئی کہ اصل مقصود تو خواجہ جہاں کا ایرانی طرز کے ان دو میناروں کا بنانا تھا، جو اس میں شک نہیں اپنے حسن و خوبی بلندی و رنگ[1] ہر اعتبار سے ہندوستان کے میناروں میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ میلوں دور سے بیدر کی طرف آنے والوں کی جب ان میناروں پر نظر پڑتی ہوگی، اس کوہستانی صحرا میں اچانک اس کے سامنے آجانا یقیناً عجب کیف و سرور کو پیدا کرتا ہوگا، اور اسی زمانہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان عمارتوں کی تعمیر میں تعلیمی اغراض سے زیادہ دہی ذوقِ تعمیر کی تسکین بخشی مقصود تھی

---

[1] اب تو مینار کا رنگ بہت کچھ اُڑ گیا ہے تاہم جہاں جہاں باقی ہے یہ چمکدار نیلا رنگ ہے، معلوم ہوا کہ بیدر کے اطراف میں لوہے کے ذرات میں ملی ہوئی مٹی جو پائی جاتی ہے اور لوہے کے زنگ نے مٹی کو سرخ رنگ دے دیا ہے، اسی رنگ کو دوسرے رنگوں سے مرکب کر کے نیلگوں رنگ پیدا کیا جاتا تھا اور سیپ کو کاٹ کاٹ کر اس کے ٹکڑوں کو جو دو دو انچ کے ہونگے اسی رنگ سے رنگا جاتا تھا اور پھر سیپی کے انہی رنگین ٹکڑوں کو نیچے سے اوپر تک میناروں کے چاروں طرف چسپاں کر دیا گیا تھا، چمک اس میں انہی صدفی ٹکڑوں کی تھی۔ کیا اولوالعزمیاں تھیں؟ بیدر میں اس قسم کی رنگین عمارتوں کے بنانے کا عام رواج تھا، قلعہ میں بھی "رنگین محل" اسی صنعت کا نمونہ ہے۔

ورنہ انصاف کی بات یہی ہے کہ اُس زمانہ کے بڑے سے بڑے مدرسہ کی عمارت طول وعرض میں شاید عہد حاضر کے معمولی اسکولوں کی عمارتوں کے بھی برابر نہ تھی اگر ان بیچاروں کی غرض بھی مدرسہ کی تعمیر سے کسی تعلیم گاہ کی تعمیر مقصود ہوتی تو ان کے پاس کیا زمین کی کمی تھی یا سامانِ تعمیر کی قلت تھی۔ مگر سچ وہی ہے کہ علم کو جس زمانہ میں سنگ وخشت کی چار دیواریوں میں مقید کر دیا گیا ہے، پرائمری اور الف بار کی تعلیم بھی اس وقت تک ناقابل تصور ہے جب تک کہ ایک مستقل عمارت کے ذریعہ سے اس کی تعلیم گاہ کو ظاہر نہ کیا جائے۔ اس زمانہ کو اُن گذرے دنوں پر قیاس ہی کرنا غلط ہے، جب علم آزاد تھا۔ اس انمیل بے جوڑ ضرورت کی زنجیریں اس کے پاؤں میں نہ ڈالی گئی تھیں۔

خود مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی اس کتاب میں "مدرسہ" کا لفظ جس میں استعمال کیا ہے وہ اس معنی سے بالکل جُدا ہے جس کی طرف ہمارا عادی ذہن مدرسہ کے لفظ کے سُننے کے ساتھ ہی منتقل ہو جاتا ہے۔ جس کی ایک اچھی مثال ان کا یہ بیان ہو سکتا ہے۔ انہوں نے صوبۂ بہار کے مدارس کے عنواں کے نیچے منجملہ دیگر مقامات کے ایک تعلیمگاہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"گیلانی مولوی احسن صاحب منطقی کا مولد ومسکن (کتاب اسلامی درسگاہیں)

یہ گیلانی وہی گیلانی ہے جس کی طرف خاکسار اپنے نام کی اضافت کرتا ہے۔ فقیر کا مولد ومنشا بہار کا یہی گاؤں ہے جس کی آبادی بمشکل پانچ چھ سوسے زیادہ ہوگی۔ ممتاز آبادی واسطی زیدی سادات کی ہے جو چند صدیوں سے اس گاؤں میں آباد ہیں۔ مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ خاکسار کے جدِ امجد ہیں چونکہ یہ میرے گھر کی بات ہے اس لیے "صاحب البیت ادری بمافیہ" کے روسے میں بتا سکتا ہوں کہ اس کی اصل حقیقت کیا تھی، یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریباً تیس چالیس سال تک درس وتدریس کا بازار گرم رکھا۔ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد وکابل تک کے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لیے اس گاؤں

میں آئی۔ ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ[1] پنجابی وطناً، گیلانی نزیلاً تو پڑھنے کے لیے آئے اور اسی گاؤں میں متوطن ہو کر اپنے وعظ و تلقین ارشاد و ہدایت، درس و تدریس، افتاء و تصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب برابر جاری رکھا۔ وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ایک وہی کیا بہار کے بعض جلیل القدر علماء، مثلاً مولانا رفیع الدین[2] مرحوم رئیس شکرانواں، مولانا عبدالغفور[3]

---

[1] مولانا عبداللہ نے بہار کے اضلاع پٹنہ و مونگیر خصوصاً ضلع مونگیر میں جو کام انجام دیا وہ یادگار رہیگا، خدا جانے کتنے مسلمانوں کے گھر سے بت نکلوائے اور شراب و تاڑی سے لوگوں کو تائب کیا۔ آخر میں تو آپ کے دست حق پرست پر ضلع مونگیر کے ایک راجہ آف مرچا مسلمان بھی ہو گئے، جن کا خاندان جموی سب ڈویژن کے مسلمان رئیسوں میں بحمد اللہ اس وقت امتیاز رکھتا ہے۔ عقیدۂ محمدیہ عربی میں آپ کی اچھی کتاب ہے۔ اس کے سوا اُردو میں بھی چند رسالے ہیں۔

[2] شکرانواں ضلع پٹنہ کا مشہور گاؤں ہے، مولانا اس اطراف کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے، لاکھوں روپے کی جائداد کے مالک تھے، لیکن علم کا نشہ آخر وقت تک سوار رہا۔ نادر مخطوطات کا ایک قیمتی کتب خانہ آپ نے شکرانواں میں مہیا کیا، تفسیر جریر طبری کا کامل نسخہ تیس جلدوں میں آپ کے پاس موجود تھا۔ اب چھپ جانے کے بعد تو اس کی اہمیت نہ رہی، لیکن طباعت سے پہلے اس کتاب کے کُل تین نسخے ساری دنیا میں پائے جاتے تھے۔ جن میں ایک نسخہ شکرانواں کا تھا۔ ہزارہا ہزار روپے خرچ کرکے آپ نے اس کی نقل مدینہ منورہ کے کتب خانہ سے حاصل کی تھی۔ آپ کے کتب خانہ میں حافظ ابن قیم اور ابن تیمیہ کی تصنیفات کا قلمی ذخیرہ جتنا بڑا جمع ہو گیا ہے، شاید ہندوستان میں تو کہیں اتنا بڑا سرمایہ نہ ہوگا۔ حافظ ابن عبدالبر محدث کی کتابیں استذکار اور تمہید آپ کے یہاں موجود ہیں۔ محلّیٰ ابن حزم جیسی نایاب کتاب کی چودہ جلدیں آپ کے یہاں میں نے دیکھی تھیں۔ طباعت سے پہلے ان کا دیکھنا ہی میرے لیے باعث فخر تھا۔ پٹنہ کا مشہور مشرقی کتب خانہ خدابخش لائبریری کے متعلق مولانا کے صاحبزادے برادر محترم مولانا عبدالمتین نے مجھ سے بیان کیا کہ مولوی خدابخش خاں اور مولانا رفیع الدین ان کے والد کے درمیان گہرے تعلقات تھے، نادر کتابوں کے ذوق میں اضافہ اور ان کی نشان دہی وغیرہ میں بہت زیادہ مشورہ ان کے والد ہی نے خدابخش خاں کو دیا ورنہ ظاہر ہے کہ خاں صاحب تو ایک وکیل آدمی تھے۔ اس لائبریری کی تاریخ میں اس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہیے کہ اس کی نادر مخطوطات کے پیچھے ایک مُلّا کا علمی مشورہ بھی چھپا ہوا تھا۔ واللہ اعلم یہ کہاں تک صحیح ہے کہ شرح عون المعبود جو غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اس کی تالیف میں مولانا رفیع شکرانوی کی شرح ابوداؤد سے بہت نفع اٹھایا، لیکن افسوس کہ خود مولانا شکرانوی کی شرح ضائع کرا دی گئی یا ہو گئی۔ مولانا رفیع نے شکرانواں میں ایک عربی پریس بھی قائم کیا تھا اور ابن قتیبہ کی تاویل الحدیث کے کچھ اجزا اس میں طبع بھی ہوئے، لیکن یہ پریس چل نہ سکا۔ ایک نو مسلم عالم کو مولانا نے ہبہ کر دیا جو گیلانی ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ برصفحہ ۳۵۲)

رمضان پوری، مولانا حکیم عبد السّلام بھاگلپوری، مولانا حکیم دائم علی ٹونکی، مولانا اسمٰعیل رمضان پوری وغیرہم بیسیوں مشاہیر گیلانی کی اس درس گاہ سے اُٹھے۔

لیکن تعلیم و تدریس کا یہ سارا کاروبار جہاں انجام دیا گیا وہ صرف برگد کا ایک طویل عریض درخت تھا جس کی ایک طرف متوسط درجہ کی ایک مسجد اور ایک طرف مولانا مرحوم کا ایک خام چھوٹا سا چند حجروں کا ایک مکان تھا، اسی مکان کے سامنے کویلو کا ایک چھپر اینٹ کے دو پایوں پر پڑا ہوا تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے چند تخت وہ بھی کھلے ہوئے بغیر کسی فرش و فروش کے پڑے رہتے تھے، مولانا درخت کی چھاؤں میں طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، برسات یا سردی کے موسم میں یہ مدرسہ کویلو کے اسی سائبان میں منتقل ہوتا تھا جس کا کل فرنیچر لے دے کر دو چوکیاں تھیں۔ طلبہ کچھ تو اسی خام مکان کے حجروں میں رہتے یا مسجد میں اور زیادہ تر گاؤں کے اربابِ ثروت کے مکانوں میں ان کو جگہ بھی مل جاتی تھی اور کھانے کا نظم بھی ہو جاتا تھا۔ بس اس مدرسہ کی کل کائنات برگد کی چھاؤں اور مولانا کا وہی خام مکان تھا۔ اسی کو مدرسہ خیال کیجیے، یا مولانا کا مطب اس کو قرار دیجیے، یا دیوانخانہ یا طلبہ کا اقامت خانہ۔ کیونکہ وہی سب کچھ تھا۔ سنگ و خشت سے آپ نے دیکھا اس لفظ "مدرسہ" کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۳) رمضان پور بہار میں رئیسوں کی مشہور بستی ہے، انہی رئیسوں میں آپ بھی تھے۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً الاسعاف، مفید الاحناف، مرغوب القلوب وغیرہ۔ آخری کتاب طب یونانی کے نقطۂ نظر سے اغذیہ یا ماکولات و مشروبات کی بہترین کتاب ہے۔ آپ کا تذکرہ تذکرۂ علماء حال کے ص۲۹ میں بھی درج کر

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد ٹونکی کے والد ماجد بہار کے رہنے والے تھے، ٹونک میں نواب کے طبیب خاص تھے، بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ستر بہتر سال کی عمر میں وفات ہوئی، آخر عمر تک نفلی نمازوں کا یومیہ التزام باقی رہا یعنی تہجد، اشراق، چاشت کے سوا تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت بھی ملی تھی۔

۲؎ بہار کے مشہور مدرسہ عزیزیہ اور صغریٰ وقف اسٹیٹ آپ ہی کی کوششوں کا کارنامہ ہے۔

۳؎ اب فقیر کا مسکن یہی مکان ہے اگرچہ اس کی صورت بدل گئی ہے، بجائے خام کے پختہ دو منزلہ ہو گیا ہے، ناصیہ پر "محراب الہدایت والارشاد گیلانی" اس کا تاریخی نام لکھا ہوا ملیگا۔ کچھ مالی خوبیاں تصرّف تھے (باقی برصفحہ ۳۵۵)

Marfat.com

کوئی تعلق ہی! لیکن اس سے ہٹ کر اگر دیکھیے تو کوئی شبہ نہیں کہ اُس زمانہ میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا برگد ہی کی چھاؤں میں ان سب کی گنجائش تھی اسی کے نیچے شمس بازغہ، شرح چغمنی حتیٰ کہ الافق المبین، شفاء، اشارات کے اسباق بھی ہوتے تھے اور ہدایہ، بیضاوی، تلویح، مسلّم کے لیے بھی گاؤں کی اتنی زمین کافی تھی۔ اور برگد کے اسی درخت کے سایہ میں اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مرحا کے اسلامی اسٹیٹ صغریٰ وقف[1] اسٹیٹ اس کے مدرسہ عزیزیہ اور شکرانواب کے اس قیمتی کتب خانہ کو بھی دیکھ سکتا ہے، جس کی بعض نادر کتابوں کی نظیر شاید اس وقت بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۵) جس کے تحت یہ نام رکھا گیا تھا، قرآن میں مسجد، صوامع، بیع کے ساتھ "محراب" کا ذکر بھی چند مقامات پر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مذہبی عمارتوں کی ایک قسم خاص یہ بھی تھی، کیا شیطان اور کفر سے حرب و مقابلہ کی تجویزیں اس میں سوچی جاتی تھیں۔ مادہ کچھ اسی طرف ایما کرتا ہے۔ ہدایت جن تک نہیں پہنچتی ان کے لیے ہدایت اور ہدایت کے بعد جنہیں ارشاد و رہنمائی کی ضرورت ہے ان کے لیے ارشاد ان ہی تجویزوں کی طرف منسوب کر کے کچھ ارادہ تھا جو شاید ارادہ سے آگے نہ بڑھے کہ وقت گذر گیا قبر جھانک رہی ہے، عزرائیل کی پیشانی طلوع ہو رہی ہے۔ غرتکم الامانی (آرزوؤں نے تم کو دھوکے میں ڈال دیا) جس حسرت نصیب کا یہ انجام ہے، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ شاید دوسروں کو کفرستانِ ہند کے اس طول و عرض میں "محاریب" بنانے کی توفیق ہو کہ اسلام اس ملک میں نرغہ میں ہے، ان پادریوں سے عبرت گیر ہونا چاہیے جو نہ اس ملک کی زبان سے، معاشرت سے واقف ہیں نہ یہاں کا موسم ان کے موافق ہے، لیکن جس قوم کے بزرگوں نے اس کو اس ملک کے چپہ چپہ پر آباد کر دیا تھا اب اسی قوم کے فرزندوں کا کیا فرض ہے؟ جو ہدایت یافتہ ہیں ان کے ارشاد کی ضرورت بھی یقیناً ضرورت ہے، لیکن کروڑوں کی تعداد جن لوگوں کی ہے جنہیں ہدایت کی کوئی کرن بھی ہاتھ نہیں آئی ہے، کیا وہ مستحق توجہ نہ تھے۔ لفظ "محراب" کاش جذبات میں تلاطم پیدا کرے ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایک لاولد مسلمان خاتون بی بی صغریٰ مرحومہ نے بیس سے پچیس لاکھ روپے کی قیمتی جائداد جو وقف کی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا اسمٰعیل رمضان پوری مرحوم جو مسماۃ کے اس اسٹیٹ کے منیجر تھے ان ہی کے ایما سے اس نیک دل خاتون نے اس وقف کے بہت بڑے حصہ کو ایک اسلامی تعلیم گاہ کے لیے مختص کر دیا جو اب مدرسہ عزیزیہ کے نام سے بہار میں قائم ہے، بہار کی حکومت نے "جامعہ عربیہ" کا ایک نظام اس صوبہ میں جو قائم کیا ہے جس کے تحت تحتانی، وسطانی فوقانی مکاتب (اسکول) کے سوا کلیات متوسطہ (انٹرمیڈیٹ کالج) ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور مدرسہ شمس الہدیٰ و مدرسہ عزیزیہ غالباً یہی دونوں مدرسے کلیۂ عالیہ (اعلیٰ کالج) کی حیثیت رکھتے ہیں، عالی جناب سید عبدالعزیز صاحب صدر المہام عدالت و امور مذہبی سرکار آصفیہ جب حکومت بہار کے وزیر تعلیم تھے تو ایک کمیٹی سے اس "جامعہ عربیہ" کا نصاب بنوایا تھا جس کا ایک رکن یہ خاکسار بھی تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اس کمیٹی کے صدر تھے ۱۲

Marfat.com

سارے ہندوستان میں نہیں مل سکتی. بلکہ ہوسکتا ہے کہ خدابخش خاں کی مشہورِ عالم مشرقی لائبریری کی ترتیب میں بھی دیکھنے والوں کو اس دماغ کی راہنمائی محسوس ہوسکتی ہے جو بڑ کے اسی درخت کے نیچے سنوارا گیا تھا، فٹ نوٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو ان نتائج کا کیا انکار کیا جا سکتا ہے جو یقیناً اسی تعلیم گاہ کے نتائج تھے جس کے لیے نہ کبھی اینٹ پر اینٹ رکھی گئی، اور نہ اس کی بلڈنگ کے لیے بھیک کا ہاتھ پبلک کے سامنے دراز کیا گیا۔

مولوی ابوالحسنات مرحوم نے گیلانی کی جس درسگاہ کا تذکرہ کیا ہے اُس میں تو براہ راست تعلیم پانے کا موقع مجھے نہ مل سکا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی حاضری سے پہلے سات آٹھ سال تک خود اس فقیر کو جس مدرسہ میں پڑھنے کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے علم حدیث کے سوا شُدبُد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے، میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا سید برکات احمد ٹونکی نزیلاً و بہاری وطناً رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم گاہ سے ہے جس سے صرف ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں پنجاب یوپی، بہار، بنگال، دکن وغیرہ ہی کے طلبہ کی ایک معقول تعداد فارغ ہوکر ملک کے مختلف گوشوں میں علم دین کی خدمت میں مصروف ہی نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں بیرونِ ہند مثلاً افغانستان، بخارا، تاشقند کوقند، سمرقند، ہرات، ترمذ کے طلبہ بھی تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے اور فاتحہ فراغ پڑھ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوئے کم وبیش چالیس سال تک تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ جاری رہا. مگر مکانی حیثیت سے اس تعلیم گاہ کی نوعیت کیا تھی؟ مولانا برکات احمد مرحوم کا شماریوں تو ٹونک کے امرا میں تھا، والی ملک کے طبیب خاص تھے، معقول تنخواہ کے علاوہ گاؤں بھی جاگیر میں تھا، فیس اور دوا کی بھی آمدنیاں تھیں. بڑے صاحبِ ثروت، باپ حکیم دائم علی خاں کے صاحبزادے تھے، اس لیے ان کا ذاتی مکان کیا سارا محلہ تھا جس میں ان کے کنبے کے لوگ بھرے ہوئے تھے، لیکن بایں ہمہ اللہ کا یہ بندہ علم کے اس دریا کو جس جگہ بیٹھ کر ہند و بیرون ہند میں جاری کیے ہوئے تھا، میں اُس کا چشم دید گواہ ہوں کہ وہ صرف خلم دیوارں

اور کو ہلو کے چھپر کا ایک سہ درہ دالان تھا جس کا طول شاید بارہ ہاتھ اور عرض غالباً پانچ ہاتھ سے زیادہ نہ تھا۔ جاجم کا ایک فرش بچھا رہتا، چھوٹے چھوٹے پائے کی ایک میز اُستاذ مرحوم کے سامنے رہتی جس پر طالب علم کتاب رکھ کر ان کے سامنے پڑھتے اور طلبہ کے لیے بھی معمولی لکڑی کی دستی تپائیاں تھیں جن پر وہ اپنی کتابیں رکھ کر سبق سُنا کرتے تھے، یہ حیثیت تھی اس دارالعلوم کی اور اس کے فرنیچر ساز و سامان کی جہاں سے پڑھ پڑھ کر ایک طرف لوگ ہندستان کے شہروں میں پھیل رہے تھے، اور دوسری طرف بخارا کابل سمرقند اپنے اپنے اوطان کی طرف جا رہے تھے۔ مٹی کے اسی دالان میں بخاری ترمذی ہدایہ تلویح کے اسباق بھی ہوتے تھے اور حمداللہ قاضی مبارک شمس بازغہ صدرا جیسی معقولات کی عام درسی کتابوں کے سوا شرح تجرید قوشجی مع حواشی دوانی و صدر معاصر شفا و اشارات، الافق المبین جیسی کتابیں جنہیں وہاں کی اصطلاح میں قدما کی کتابیں کہتے تھے، ان کا درس بھی اس خصوصیت کے ساتھ جاری تھا کہ اب دنیا کے طول و عرض میں ان کتابوں کے پڑھنے والے اس علمی خاندان کے سوا اور کہیں پڑھ نہیں سکتے تھے، بلکہ بسا اوقات اسی دالان میں نفیسی و شرح اسباب قانونِ شیخ طب کی کتابوں کا درس دن کو ہوتا تھا اور رات کو حضرت اُستاذ اسی میں بیٹھ کر طبی طلبہ کو مطب کے نسخے بھی لکھواتے تھے، کبھی کبھی اس میں تصوف کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں، اور جب درس کا کام ختم ہو جاتا تھا، تو چند طلبہ کی خوابگاہ کا بھی کام اسی دالان سے لیا جاتا تھا۔ یہ کانوں کی سنی ہوئی نہیں، برسوں آنکھوں کی دیکھی ہوئی بات ہے۔

میں شاید دور نکل گیا، یہ کہنا چاہتا تھا کہ "مدرسہ" کا لفظ جب ہماری کتابوں میں بولا جاتا ہے تو خواہ مخواہ اس کے متعلق یہی فرض کر لینا کہ وہ کوئی عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی مانند اینٹوں اور پتھروں کا مجموعہ ہوگا، خود بھی دھوکہ کھانا ہے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دینا ہے، اب وہ غلط تعلیمی نظریہ تھا یا صحیح، لیکن تعلیم و تعلم کے لیے بجائے قید و بند کے حتی الوسع ہمارے بزرگوں کے سامنے اشاعتِ تعلیم جیسی اہم ضرورت کے لیے اطلاق اور عمومیت ہی کے

Marfat.com

اصول کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا، صاحبِ ہدایہ نے مسئلہ ربوا پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ جن چیزوں میں منافع کے وجوہ اور پہلو زیادہ ہونگے، یہ اسلام کا اصول ہے کہ

السبیل فی مثلها الاطلاق بابلغ الوجوہ لشدۃ الاحتیاج الیہ دون التضئیق فیہ

ایسی چیزوں میں جہاں تک ممکن ہو، اطلاق اور عمومیت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ آدمی ان کا شدت سے محتاج ہے نہ کہ ان میں تنگی پیدا کی جائے۔

یہ اپنا اپنا مذاق ہے کہ ضرورت بھی کسی چیز کی شدت سے محسوس کی جائے اور کرائی جائے لیکن باوجود اس کے کوئی اس میں "تضئیق" اور تنگی کے اصول کو پسند کرتا ہے اور کوئی اطلاق کو جب تک ڈائرکٹر کا محکمہ قائم نہ ہولے، جب تک اس محکمہ کے مصارف کے لیے سالانہ لاکھوں روپے کی منظوری نہ صادر ہولے، جب تک عمارت نہ تیار ہولے، جب تک اتنی رقم کا نہ بندوبست ہولے کہ باضابطہ معقول تنخواہوں کے مدرسین کے تقرر کا امکان پیدا ہو جائے۔ جب تک پڑھنے والے بچوں کے باپ کی اتنی آمدنی نہ ہولے جس سے ہر سال بدل جانے والی نصابی کتابوں قیمتی کاپیوں، کھیل کود کے قیمتی آلات (بیٹ، رکیٹ، فٹ بال) قیمتی یونیفارم، نیز ماہوار قیام و طعام کے مصارف، اور اسکول و کالج کے مطالبات وغیرہ وغیرہ کی تکمیل کے لیے کافی نہ ہولس وقت تک "تعلیم" کا لفظ کوئی زبان پر نہیں لا سکتا۔

اشاعتِ تعلیم کے حامیوں کا ایک اصول یہ ہے، اور اسی کے مقابلہ میں تعلیم ہی کا ایک دستور وہ بھی تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی کسی گھنے درخت کی چھاؤں اور مٹی کی کچی دیوار کا احاطہ کافی سمجھا جاتا تھا، مدرسے بھی بنتے تھے تو جہاں ہم محمود گاواں کے رنگین میناروں والے اور بالائے بندیسری اور حوض علائی کی شاہانہ عمارتوں کو دیکھتے ہیں اسی کے ساتھ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ

ملا علاء الدین لاری بہ آگرہ آمدہ بہ درس مشغول شد و مدرسہ از خس ساختند (بداونی ص ۱۳ ج ۳)

یہ ملا علاء الدین لاری وہی ہیں، جن کا شرح عقائد نسفی پر مشہور حاشیہ ہے آگرہ میں ان کا

مدرسہ" مدرسۂ خس کے نام سے مشہور تھا لیکن خس سے کیا وہ خس مراد ہی جس سے "خس خانہ و برفاب" والی لذت گرمیوں میں حاصل کی جاتی ہی، اور غالب جس کے بغیر روزہ رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہی کہ خس کو آج جس معنی میں ہم استعمال کر رہے ہیں، یہ ہندوستان کی ایک جدید اصطلاح ہی، جس کی ابتدا اکبری عہد سے ہوئی،[1] ورنہ خس کے وہی عام مشہور معنی گھاس پھوس کے ہیں۔ "فروغ شعلۂ خس یک نفس ہی" کے مصرعہ میں غالب ہی نے جس معنی میں اس کو استعمال کیا ہی "مدرسۂ خس" یعنی گھاس پھوس کا مدرسہ آگرہ میں مولانا نے بنایا تھا، الغرض وہی اصول کہ جس چیز کی ضرورت جتنی زیادہ ہوگی اسی حد تک اس کو قیود و شرائط کی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیئے۔ اصل کام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے غیر ضروری لوازم کی پابندیوں کو

---

[1] آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے ہندوستان کی مذمت کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہی: "از کمی آب سرد، و افزونی گرمی، و کمیابی انگور و خربزہ و گستردنی، دشتر طنز گاہ کارآگاہاں بود" کارآگاہاں سے غالباً بابر کی طرف اشارہ ہی جس نے تزک میں "جز بزہ نے انگور نے برف نے" کے الفاظ سے ہندوستان کو طنز گاہ بنایا تھا، ابوالفضل نے لکھا ہی کہ اس طنز کے ازالہ کے لیے بھی اور ترکستانی امراء کے لئے ہندوستان کی گرمی ناقابلِ برداشت بنی چلی جا رہی تھی، "گیتی خداوند (اکبر) ہمہ را چارہ گر آمد" ابوالفضل کے گیتی خداوندی کی چارہ گری ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ پانی کو "شورہ سرد کردن روائی گرفت و از شمالی کوہ (ہمالہ) برف آوردن کہ و مہ دانست" گویا ہندوستان کے ہر کہ و مہ چھوٹوں بڑوں کی رسائی عہد اکبری ہی سے برف تک ہونے لگی، اسی کے بعد "خس" کا قصہ بھی لکھا ہی کہ "بیخے بود بویا بس خنک آں را خس گویند بفرمائش گیتی خدیو (اکبر) ازاں نے بست خانہا ساختن رواج یافت وچوں آب افشانند زمستانے دیگر در تابستان پدید آمد" جس سے معلوم ہوا کہ خس اور خس کی ٹٹیوں کا رواج اکبر کے زمانہ سے اس ملک میں شروع ہوا۔ کیا شبہ ہی اکبر کی ذہانت اور طباعی میں اور سچ پوچھیے کہ بگاڑنے والوں پر طبیعت اسی لیے تو زیادہ بگڑتی ہی کہ اسلام کے ایسے قیمتی سرمایہ کو چند ذاتی عداوتوں کے بت پر نثار کر دیا گیا۔ اور ہندی اسلام کے جگر پر ایسا کاری زخم لگایا گیا کہ باایں ہمہ چارہ گری آج تک اس کی کسک محسوس ہو رہی ہی خس کی ایجاد پر خیال آیا کہ حجاج بن یوسف جب بنی امیہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر ہو کر آیا، تو طائف جو حجاج کا وطن تھا اس کے سرد موسم کی عادت نے کوفہ کو حجاج کے لیے جہنم بنا دیا۔ لکھا ہی کہ قریب قریب خس خانہ کے حجاج نے بھی سبز بید کی شاخوں سے ایک چیز بنائی تھی۔ ابن عساکر میں ہی کہ حجاج گرمیوں میں
في قبة من خلاف اي صفصاف بید کی شاخوں سے بنائے ہوئے ایک قبہ میں رہتا تھا ان شاخوں کو پھاڑ کر بیچ میں برف
منقفها بالثلج و هو يقعد عليه بھری جاتی تھی وہی ٹپک ٹپک کر حجاج پر پڑتی رہتی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۳۶۰)

Marfat.com

مسلمانوں نے اپنے لیے کبھی ضروری قرار نہیں دیا۔ ایک ایک شہر میں ہزار ہزار اور پان پان سو سات سات سو مدرسوں کی گنجائش کیا ان پابندیوں سے نکلے بغیر پیدا ہو سکتی ہے۔

آج جب تعلیم و تعلّم کی دنیا کو بھی ساہوکارہ کا بازار بنا دیا گیا ہے نئی نئی شکلوں کے قلم بیچنے والوں، بھانت بھانت، طرح طرح کی دواتوں کے بنانے والوں، کتابوں کے فروخت کرنے والوں، الغرض انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو مختلف بھیسوں میں علم کے طالبوں اور علم کے خادموں کو نشانہ بنا کر ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔ حکومت کی پشت پناہی میں لوٹ مچی ہوئی ہے کچھ فریب سے کچھ بچوں کی خام عقلی اور کچھ حکومتی جبر سے کام لے کر طالب العلموں سے روپے وصول کرنے کی نت نئی پیچیدہ ترکیبیں بنائی گئی ہیں۔ علم کے دائرہ میں قدم رکھنا شرط ہے کہ ڈاکوؤں کا جو گروہ بھیس بدلے مختلف موڑوں پر بیٹھا ہوا ہے کچھ اس طرح لپٹ پڑتا ہے کہ ان سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ صبح ہوئی اور سائیکلوں کے پیچھے کتابوں، کاپیوں، سلیٹوں اور خدا جانے کن کن چیزوں کا پشتارہ باندھے غریب طالب العلم اسکول کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے یہ وہ نقشہ ہے جو اس نظام تعلیم نے پیش کیا ہے جو آپ کے سامنے ہے لیکن یہی ہندوستان تھا، یہی ملک اس کا یہی آسمان، یہی زمین تھی جس میں تعلیمی فرائض کو مفت انجام دینے والے جہاں اوپر کی جماعتوں کے وہ طلبہ نظر آتے تھے جو آج ٹیوشن زدگی کے عارضہ میں مبتلا ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں کہ علم ان سے روپیہ مانگتا ہے، اتنا روپیہ مانگتا ہے جو ماں باپ فراہم نہیں کر سکتے اور ساری رسوائیاں وہ اسی مطالبہ کے ہاتھوں آج برداشت کر رہے ہیں۔

لیکن خیر اگر طلبہ مفت پڑھاتے تھے تو یہ تعلیم و تعلّم کی دنیا کے آدمی ہی تھے نیز پڑھانے

(حاشیہ صفحہ ۳۵۹) ؎ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کا تو دعویٰ تھا کہ تشریعی قوانین ہی کی حد تک نہیں بلکہ تکوینی قوانین میں بھی قدرت کی کارفرمائیاں اسی اصول کے تحت ظاہر ہوتی ہیں، انہوں نے مثال دی ہے کہ ہوا پانی کا چونکہ ہر شخص محتاج ہے اس لیے ہر جگہ یہ چیزیں میسر آتی ہیں لیکن الماس، یاقوت، لعل و زمرد کی کوئی حقیقی ضرورت آدمی کو نہیں ہے نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اتنا نایاب کر دیا گیا کہ بادشاہوں اور نوابوں کے سوا عام لوگوں کو ان کا دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا ۱۲۔

Marfat.com

کی اس مشق سے ان کا علم تازہ ہوتا تھا۔ اسی ذریعہ سے بتدریج ان کی شہرت وعظمت کا آوازہ بلندی حاصل کرتا تھا مگر تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ اتفاقاً اِکّے دُکّے نہیں تقریباً ہر معتدبہ آبادی والے شہر اور قصبات بلکہ دیہاتوں میں مفت بالکل مفت پڑھانے والوں کا ایک بڑا طبقہ آخر وقت تک اس ملک میں ان لوگوں کا پایا جاتا تھا جن کا معاشی مشغلہ درس و تدریس نہ تھا۔ وہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، یا تجارت کرتے تھے، زراعت کرتے تھے، لیکن سب کچھ کرنے کے ساتھ روزانہ بالالتزام پڑھانے کا کام بھی آخر دم تک انجام دیتے رہتے تھے، عہد بلبن کے مستوفی الممالک اور صدر کل شمس الملک جن کے متعلق تاج ریزہ کے قصیدہ کا مشہور مطلع ہے۔

صدرا! کنوں بہ کام دل ہندوستاں شدی مستوفی ممالک ہندوستاں شدی

لیکن سنتے ہیں کہ وہ مستوفی ممالک ہندوستان کے منصب عالی پر جو سرفراز تھا، اس کا سب سے بڑا امتیازی وصف کیا تھا۔

"اکثر علمائے شہر شاگرداد بودہ" ص۶۰ اخبار الاخیار۔

جن میں ایک حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء قدس سرہ العزیز بھی ہیں، حریری کے چالیس مقالے جو سلطان جی نے زبانی یاد کیے تھے یہ اُسی زمانہ کی بات ہے جب شمس الملک سے آپ پڑھتے تھے۔

دربار اکبری کے حکیم و عالم ملا فتح اللہ شیرازی کے متعلق تو پہلے بھی گذر چکا ہے کہ ایک طرف وہ مغل امپائر کا بجٹ (موازنہ) تیار کر کے بادشاہ سے خوشنودی حاصل کرتے تھے ٹوڈرمل کی وزارت کے شریک غالب تھے۔ اور اسی کے ساتھ صرف اعلیٰ جماعت کے ہی طلبہ کو نہیں بلکہ ملا بداؤنی کا بیان گذر چکا کہ پانچ پانچ چھ چھ برس تک کے بچوں کو قاعدہ اور ہجا نویسی بھی سکھاتے تھے اور تعلیم و تدریس کے اس مشغلہ کے ساتھ اپنے آپ کو مقید کر رکھا تھا۔

ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ خواہ بظاہر معاشی پیشہ کسی کا کچھ بھی ہو لیکن اپنے پاس جو

Marfat.com

جو بھی کسی قسم کا علمی کمال رکھتا تھا عموماً بغیر کسی معاوضہ کے اس علم کو دوسروں تک پہنچانا گویا اپنا ایک انسانی بلکہ اگر دینی علم ہوا تو مذہبی فرض خیال کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے قاضی (جج) ومفتی، صدر الصدور وغیرہ کے عہدوں پر جو لوگ سرفراز رہتے تھے، چونکہ علماء ہی کے ساتھ یہ عہدے مخصوص تھے، اس لیے علاوہ اپنے سرکاری فرائض کے عموماً سرکاری حکام کے اس طبقہ کا مکان یا دیوان خانہ یا محلہ کی مسجد وغیرہ ایک مستقل درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتی تھی، بلکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں تاریخوں کی پڑھنے سے بھی اثر دل پر پڑتا ہے کہ کوئی قاضی ہو مفتی ہو، صدر الصدور یا صدر جہاں ہو، اور معلمی کا کام نہ کرتا ہو، قریب قریب یہ بات ناقابلِ فہم تھی، اسی طرح ناقابلِ فہم جیسے اس زمانہ میں کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ضلع کا کوئی جج بھی ہو، اور بچوں کو اپنے مکان پر مفت پڑھاتا بھی ہو سرکاری اوقات میں ہائی کورٹ کی ججی کا کام بھی انجام دیتا ہو، اور گھر پہنچ کر طلبہ کے حلقہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھاتا ہو۔ دراصل ایک رواج تھا جو قریباً قرن سے مسلمانوں میں جاری تھا، اور یہ رواج اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ عدالتوں اور سرکاری محکموں پر بجائے بی، اے اور ایم، اے۔ ایل ایل بی۔ سول سروس وغیرہ کی ڈگری داروں کے بیچارے مولویوں کا قبضہ تھا، اور مکالے کی تعلیمی رپورٹ کے انقلابی نتائج سے پہلے سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا چراغ اگرچہ بجھ چکا تھا، لیکن سرکاری عہدوں پر مولویوں ہی کا تقرر ہوتا تھا، موروثی روایات ہی کا یہ اثر تھا کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی ان غریب مولویوں نے سلف کے اس طریقہ کو حتی الوسع باقی رکھنے کی کوشش کی، کلکتہ کو دار السلطنت بنا کر انگریزوں نے کاکوری سے مولانا نجم الدین کاکوروی کو طلب کیا اور "اقضی القضاۃ" کا عہدہ یعنی کلکتہ کے چیف جسٹس کا عہدہ آپ کو دیا گیا، مگر باوجود اس کے ان کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

بمنصب اقضی القضاۃ کلکتہ ممتاز بود معہذا بہ تدریس و افادہ طلبہ علوم بغایت می کوشید

(تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۳۳)

Marfat.com

اسی کلکتہ میں اودھ کی آنجہانی حکومت کی طرف سے مشہور شیعی فاضل خان علامہ تفضل حسین خاںؒ انگریزی دربار میں سفیر تھے لیکن اس سفارت کے ساتھ ساتھ

بمطالعہ کتب وافادہ طلبہ علوم می گذرانید

حکومت مرشد آباد کے سفیر اور نائب السلطنت کلکتہ میں شاہ اُلفت حسین فریاد عظیم آبادی تھے ان کا کام یہ تھا کہ "نظامت" (حکومت مرشد آباد) کے پولیٹکل امور کا تصفیہ گورنر جنرل کلکتہ سے کرائیں۔ تین گورنر جنرلوں لارڈ ایلینبرا، لارڈ ہارڈنگ اوّل، لارڈ منٹو اول کے زمانہ تک مسلسل اس عہدہ پر ممتاز رہے، تنخواہ کئی ہزار ماہوار ملتی تھی نوابوں کی شان وشوکت، تزک و احتشام سے کلکتہ میں زندگی گذارتے تھے ان کے بیٹے مسٹر ہمایوں مرزا مرحوم اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں "اس زمانہ کے امراء کی جو تعلیمی شان تھی چونکہ اس کی یہ ایک چشم دید تصویر ہے میں انہی الفاظ میں نقل کرتا ہوں :۔

"آفتاب ادھر نکلا گاڑی پر سوار ہو جاتے پھر گاڑی تیز گھر تک آئی، گاڑی سے اتر کر پلنگ کے کمرہ میں جاکر پوشاک بدلتے اور نشست کے کمرہ میں آکر اپنی مسند پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے، آدمی پیچوان حقہ لاکر لگا تا اتنے میں لوگ آنا شروع ہوتے"۔

یہ لوگ کون ہیں، کیا مصاحبوں اور احباب کا مجمع مراد ہے؟ ہمایوں مرزا لکھتے ہیں :۔

والد مرحوم کو پڑھانے کا بہت شوق تھا اور لوگ بہت اصرار سے ان کے حلقۂ درس میں شریک

ؒ تفضل حسین خاں اُس زمانہ کے ان مولویوں میں ہیں جنہوں نے علوم عربیہ کی تکمیل ملا حسن فرنگی محلی، مولوی وجیہ، مولوی محمد علی مہندس وغیرہ سے کر کے "زبان انگریزی ویونانی ولاطینی نیکو می دانست" لکھا ہے کہ کلکتہ میں انہوں نے یورپ کے فاضلوں سے یونانی اور لاطینی زبان سیکھی اور ان زبانوں پر ان کو اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ بے تکلف ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، اُنہوں نے مغربی زبان کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر متعدد کتابیں فن ہیئت اور جبر ومقابلہ میں لکھی ہیں جو افسوس ہے کہ اب نہیں ملتیں، واللہ اعلم طبع بھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ایک استاذ مولوی عثمان جعفری بیان کرتے ہیں کہ ان کے وطن مچھلی شہر ضلع جونپور میں تفضل حسین خاں کی کتابوں کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن جن صاحب کے پاس ہیں وہ دوسروں کو نہیں دکھاتے۔

Marfat.com

ہوتے ...... دس بجے تک ڈھائی گھنٹے درس و تدریس کی صحبت رہتی، اس کے بعد برخاست کا حکم ہوتا طلبہ سب سلام کر کے رخصت ہو جاتے۔ (ص ۲۵)

یہ چلی ہوئی رسی کی آخری ذہنی تھی جو ابتدائے عہد انگریزی تک باقی تھی۔

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف رحمان علی[1] نے اپنے استاد مولانا عبدالشکور مچھلی شہری کے حال میں لکھا ہے کہ "ہموارہ بہ مناصب جلیلہ از سرکار انگریزی عزّ و امتیاز داشتند" لیکن اسی کے ساتھ تمام "عمر بدرس علوم صرف فرمودند" (ص ۱۹۲) جہاں جہاں تبادلہ ہوتا، طلبہ کا مجمع بھی ان کے ساتھ جاتا، مولوی رحمان علی بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ فتح پور ہسوہ، غازی پور اور خدا جانے کہاں کہاں رہے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا کرتے تھے، بلکہ بسا اوقات اپنی وسعت و گنجائش کی حد تک طلبہ کے قیام و طعام کا نظم بھی ان کی ذاتی آمدنی سے کیا جاتا تھا، مفتی صدرالدین دہلوی جو اپنے تخلص آزردہ کی وجہ سے مفتی آزردہ کے نام سے مشہور ہیں ان کے متعلق لکھا ہے:۔

"از سرکار انگریزی بعہدہ صدر الصدوری و افتاء دہلی سربلندی داشت"

مگر باوجود اس جلیل عہدہ کے

"مردم از بلاد و امصار بعیدہ ازو مستفید می شدند بوجہ کثرتِ درس بہ تصانیف کم توجہ داشت"

اس "کثرتِ درس" کے ساتھ حال یہ تھا کہ

اکثر طلبہ مدرسہ دارالبقاء کہ زیر جامع مسجد دہلی بود طعام و لباس می داد (ص ۹۳)

اوروں دوسروں کی کیا کہوں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، خود ہمارے استاذ حضرت مولانا سید

---

[1] مولوی رحمان علی کے نام کا عجب لطیفہ ہے۔ اس نام کی وجہ سے ہمیشہ ان کی کتاب تذکرۂ علماء ہند کے دیکھنے سے گریز کرتا رہا سمجھتا تھا کہ کسی غیر عالم آدمی کی کتاب ہے، لیکن اتفاقاً ایک دن نظر پڑ گئی، پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آدمی تو عالم ہیں، پھر ان کا یہ نام ایسا کیوں تھا۔ اس کا خطرہ برابر دل میں لگا رہتا، اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ ان کا اصلی نام عبدالشکور تھا، لیکن ریوان کی ہندو ریاست میں جب ملازم ہوئے تو ولی عہد ریاست نے کہا کہ عبدالشکور کا لفظ میری زبان پر نہ چڑھیگا اس نے ان کا نام رحمان علی رکھ دیا، مجبوراً مولوی صاحب نے قبول کر لیا۔

Marfat.com

برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ والیِ ملک کے طبیب خاص تھے۔ دولت و ثروت عزت و عظمت کے لحاظ سے آپ کا شمار امیروں میں تھا، لیکن ساری عمران کی طلبہ کے پڑھنے پڑھانے میں گذری جس کا صلہ تو کسی سے کیا لیتے شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گذرتا تھا کہ آپ کے یہاں سے پندرہ بیس طالب العلموں کو کھانا نہیں ملتا تھا، جب ان سے پڑھا کرتا تھا کم سنی کا زمانہ تھا اس وقت اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن جب عملی زندگی میں قدم رکھا اور اب ان کی اس عجیب و غریب مخلصانہ قربانیوں کا خیال آتا ہے تو گھنٹوں سوچتا ہوں کہ یا الٰہی وہ کیا تماشا تھا آج یہ کیا حال ہے کہ اساتذہ کو تنخواہیں دیجاتی ہیں، الاؤنس ملتے ہیں، امتحانی آمدنیاں ہوتی ہیں، سب کچھ ہو رہا ہے لیکن عموماً اس کے بعد بھی اجیر معلموں کا عام طبقہ صبح و شام اسی فکر میں رہتا ہے کہ جہاں تک علم سے دور رہ سکتے ہیں دور رہیں، پڑھانے سے جتنا بھاگ سکتے ہوں بھاگیں۔ عربی مدارس کے قلیل المعاش اساتذہ کو تو شاید ایک حد تک معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی قلیل تنخواہوں میں عصر حاضر کی گراں زندگی کے اندر اس کی توقع بیجا ہوگی کہ طلبہ کی وہ امداد کیوں نہیں کرتے جیسے ان کے اسلاف کا حال تھا، لیکن مغربی طرز کی درس گاہوں کے معلموں کو تو معقول مشاہرے ملتے ہیں۔ ہزار ہزار، بارہ بارہ سو ماہوار تک یہ کالجوں سے اٹھا رہے ہیں لیکن ان کے دسترخوانوں یا میزوں پر بھی کبھی کسی طالب العلم کو دیکھا گیا ہے؟

تعلیم کا پیشہ ہے، معاش کا وہی واحد ذریعہ ہے لیکن اس پر بھی امکانی حد تک علم سے گریز، فرصت کے اوقات زیادہ تر کلبوں اور نزہت گاہوں کی کلچیوں میں گزرتے ہیں یہ ہے عام حال اس دور میں ان لوگوں کا جن کا کاروبار ہی پڑھنا پڑھانا ہے۔

بلاشبہ چوبیس گھنٹوں میں ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ کچھ تفریحی مشغلوں میں وقت گذاریں جسمانی صحت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے اور دماغی سکون کے لیے بھی۔ ہم جن بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں ان کی زندگی بھی تفریحی و انبساطی مشاغل سے خالی نہ تھی لیکن کس شان کے ساتھ۔ حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم فتنۃ الہند کے ہنگامہ میں انگریزوں نے

: ۔ الزام غدر جنہیں عبور دریائے شور کی سزا دی اور اسی اسر و قید کی حالت میں آپ کا انتقال جزیرۂ انڈمان میں ہوا، ابتدا میں انگریزی حکومت کے ملازم بھی تھے، لیکن جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا ملازمت کے ساتھ بھی درس تدریس کا قصہ جاری رہتا تھا، مولانا بھی اپنے وقت کے مشاہیر ارباب درس میں سے تھے۔ بلکہ عربی تعلیم کے حلقوں میں خیرآبادی خاندان کے نام سے جو تعلیمی اسکول موسوم ہے سچ پوچھیے تو اس اسکول کو فروغ دے کر ایک خاص طرزِ تعلیم کا اس کو نمائندہ بنا دینا اس میں سب سے زیادہ موثر حصہ آپ ہی کا ہے گو آپ کے پدر بزرگوار مولانا فضل امام صاحبِ مرقاۃ المنطق جو دلی میں صدر الصدور تھے اور حسب دستور درس بھی دیتے تھے، اسی طرح مولانا فضلِ حق کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی ان حضرات کو بھی خیرآبادی طریقۂ تعلیم کی ترویج میں خصوصی دخل ہے، لیکن اس سلسلہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا واسطۃ العقد اور درۃ التاج کا مقام مولانا فضل حق ہی کو حاصل ہے، معقولات کی تعلیم اپنے والد مولانا فضل امام سے پائی تھی اور حدیث کی سند حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حاصل کی تھی، اسیریِ فرنگ سے پہلے باوجود امارت و دولت کے زندگی بھر درس دیتے رہے، چونکہ امیر آدمی تھے، ایک وقت خاص تفریح کا بھی مقرر تھا مولانا کو شطرنج کا شوق تھا[1]، بساط بچھتی تھی اور شطرنج کی بازی ہوتی تھی، لیکن تفریح کے اس وقت میں بھی سنتے ہیں، اور سنتے کیا ہیں، دیکھیے تذکرۂ علماء ہند کے مصنف مولوی رحمان علی خود اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی شطرنج کی اس مجلس کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

بسال دوازدہ صد و شصت و چہار ہجری مؤلف ہیچمداں بہ مقام لکھنؤ بخدمتش رسیدہ، دید کہ درعین حقہ کشی و شطرنجبازی تلمیذے را سبق افق المبین میداد و مطالب کتب را باحسن بیانے دل نشین

---

[1] شطرنج بازی کے متعلق اس میں شک نہیں کہ حنفی مذہب کی رو سے لے جو کچھ بھی آپ چاہیے قرار دیجیے، لیکن بہرحال اگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے امام متقی نے اس حنفی فتوے سے اختلاف کیا ہے اور یقیناً کیا ہے تو کیا اس کی شناعت ہی باقی رہتی ہے جو متفقہ جرائم کی ہے، حنفی عالم کو بھی حکم لگاتے ہوئے امام شافعی جیسے امام کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور مولانا کے فعل کی توجیہ کے لیے شاید یہ عذر ناقابل استماع نہیں قرار پا سکتا۔

می نود۔ (تذکرۂ علماء ہند، ص ۱۶۵)

دیکھ رہے ہیں تفریح بھی ہوتی ہے تو کس شان کے ساتھ ہو رہی ہے، واہی تباہی ہفوات وخرافات کی جگہ اس وقت بھی کچھ نہیں تو افق المبین کا درس ہی جاری ہے، قطع نظر اس سے کہ افق المبین جیسی صبر آزما ژولیدہ و پیچیدہ کتاب کا حسنِ بیان کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھانا مولانا کے اس غیر معمولی کمال کی دلیل ہے جو فنِ معقولات میں آپ کو حاصل تھا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی تفریح کا سامان بھی پڑھنا پڑھانا ہی بن گیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کو چوبیس گھنٹوں میں تھوڑی دیر کے لیے اختلاج کا دورہ آخر میں ہونے لگا تھا اور بینائی تو مدت سے جا چکی تھی کہ اختلاج کا دورہ جوں ہی شروع ہوتا تھا شاہ صاحب قبلہ مکان سے باہر نکل کر جامع مسجد تک ٹہلتے تھے لیکن اس ٹہلنے کے زمانہ میں بھی ثقاۃ سے سُنا گیا ہے کہ ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری کا درس بحالت مشی جاری رہتا تھا۔ حریری کے پڑھنے کا وقت ہی یہ مقرر تھا۔ خم خانوں کو جن پینے والوں نے خالی کیا یہ وہ لوگ تھے۔ آہ!

اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

واقعات کہاں تک بیان کروں نظائر و اشباہ کی حد بھی ہو، میں یہ بیان کر رہا تھا کہ علاوہ ان لوگوں کے جن کا کام ہی تعلیم و تدریس تھا اور جن کی امداد حکومت یا پبلک کی طرف سے ہوتی تھی، تعلیمی کاروبار کے ان چلانے والوں کے سوا جو ایک حد تک معاوضہ کے ساتھ کام کرتے تھے ملک میں ایک بڑا گروہ ان لوگوں کا تھا جو لے کر نہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنی طرف سے کچھ دے کر لوگوں کو پڑھایا کرتا تھا اور یہ طبقہ ان طلبہ کے سوا تھا جو خود تو بڑی کتابیں اپنے اُستادوں سے پڑھا کرتے تھے، اور چھوٹی پڑھی ہوئی کتابیں دوسروں کو پڑھاتے تھے، اور یوں تعلیم کا ایک بڑا حصہ بغیر کسی خرچ اور معاوضہ کے مفت انجام پاتا رہتا تھا لیکن آج جب پیسے کے بغیر کوئی ایک قدم بھی اُٹھانے کے لیے تیار نہیں کیا اس نقشے کو پھر کوئی قائم کرسکتا ہے؟

Marfat.com

ایک بات تھی جو چل پڑی تھی، ورنہ زرطلبی کا جذبہ انسان میں کب نہیں رہا ہے، یہ زر، زمین ہی کا تو قصہ تھا جس نے پہلی صدی ہجری میں واقعہ حرہ اور دشتِ کربلا کے فاجعات کو تاریخ کے اوراق پر خونیں حرفوں میں ثبت کیا ہے، خود درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے دائروں میں بھی ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو اسی ذریعہ سے دولت پیدا کر رہا تھا مگر تعجب تو اسی پر ہوتا ہے کہ جن علوم و فنون کی قیمت اس زمانہ میں بایں شکل مل رہی تھی مولانا آزاد بلگرامی نے شیخ ابوالمعالی نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ خوش الحان قاری تھے، دلی پہنچے، شاہ جہاں کا عہد تھا، امراء دربار سے کسی نے قاری صاحب کا ذکر کیا، طلبی کا حکم ہوا، حاضر ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا شاہجہاں نے فرمائش کی کہ رمضان کے متعلق جو آیتیں ہیں ان ہی کی تلاوت کیجیے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالمعالی نے۔

"شھرُ رمضانَ الذی اُنزِلَ فیہ القرآن شروع کرد نوعے باواز دل فریب خواند کہ بادشاہ را رقتے دست داد، استدعا اعادہ نمود نوبت ثانی در قرأت دیگر خواند (یعنی دوسری قرأت میں وہی آیتیں سنائیں) بادشاہ خیلے محظوظ گشت"

پھر کیا ہوا، صرف شمس القراء کا خطاب دے کر بادشاہ نے قاری صاحب کو گھر روانہ کر دیا، یا کوئی چھڑی یا سگریٹ کی ڈبیہ تحفہ میں دے کر قصہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ اللہ کیا دن تھے، چند آیتیں پڑھ کر سنانے والے نے سنائی ہیں، اسی ہندوستان کا واقعہ ہے جہاں آپ ہم بھی موجود ہیں کہ

"قریہ سیر حاصل از نواح بلگرام کردمی نام حسب الاستدعا شیخ بہ طریق مدد معاش مرحمت فرمود" (مآثر الکرام ص ۶۷)

اودھ کا ایک سیر حاصل گاؤں جاگیر میں مل گیا، چند آیتوں کے سنانے کا یہ صلہ تھا، آج قطبی و میر مختصر المعانی و مطول کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کا جو حال بھی ہو، لیکن اس سرزمین میں ان ہی کتابوں کے مدرسین کے متعلق کوئی باور کر سکتا ہے کہ

Marfat.com

"بزر سنجیدہ شد"

یہ فقرہ ملّا عبد الحکیم سیالکوٹی کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے، دلّی شاہ جہاں کی دلّی تھی، مولانا ارقام فرماتے ہیں کہ

"ہرگاہ وارد حضور (شاہ جہاں) می گردید بہ رعایت نقود نامعدود مخصوص گشت ذوبار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت"

ایک دفعہ نہیں دو دو دفعہ ملّا صاحب زر کے ساتھ تولے گئے اور اپنے ہموزن رقم لے کر گھر روانہ ہوئے، یہی نہیں بلکہ

چند قریہ برسم سیورغال (جاگیر) انعام شد - (ص ۲۰۵)

جمع کیا جائے تو اس قسم کے واقعات سے دفتر تیار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے پھر بھی ایک طبقہ علماء فضلاء و طلباء کا اسی ہندوستان میں ان ہی زر خیز دربار، زر سنج دنوں میں تھا جس کے استغنا اور تعفف کا کنگرہ اتنا بلند تھا کہ مغل میائر کے سلاطین کی بھی وہاں رسائی نہ تھی، مناظرہ کی مشہور درسی کتاب رشیدیہ کے مصنف شیخ عبد الرشید جونپوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ملا محمود صاحب شمس بازغہ کے رفیق درس ہیں، زمانہ ان کا بھی وہی ہے، جب تخت تیموری پر شاہ جہاں جیسا دین پرور معارف پژوہ بادشاہ جلوہ فرما ہے، قدر دانیوں کا شہرہ سن کر اقطار ارض سے علماء فضلاء شاہی دربار کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے پنجاب سے ملّا عبد الحکیم آتے ہیں اور بزر سنجیدہ ہو کر روانہ ہوتے ہیں، پورب سے ملّا محمود جونپوری آتے ہیں اور بادشاہ کے مقربین خاص میں داخل ہو جاتے ہیں انہی مولویوں میں ایک

[1] ملّا صاحب کے ایک ہموطن عالم حدائق الحنفیہ کے مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

جہانگیر، شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں آپ کی بڑی عزت و توقیر تھی اور آپ شہزادگاں کے استاد تھے چنانچہ شاہجہاں بادشاہ نے دو دفعہ میزان میں تلوایا اور ہر دفعہ چھ چھ ہزار روپیہ دیا، آپ کو سیالکوٹ میں سوا لاکھ روپے کی جاگیر ملی ہوئی تھی جو آپ کی اولاد کے پاس نسلاً بعد نسل موجود رہی۔ آخر میں گھٹتے گھٹتے اب سرکار انگلشیہ کے عہد میں بسبب انقطاع خاندان کے بالکل ضبط ہو گئی۔ (حدائق، ص ۴۱۵)

مولوی ملّا سعد اللہ نامی جو چنیوٹ پنجاب کے رہنے والے تھے، بالآخر اسی زمانہ میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

اسی بادشاہ تک شیخ عبدالرشید جونپوری کے علم و فضل، تقویٰ و زہد کا چرچا پہنچا ہے۔ مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں:۔

"صاحب قِرآن شاہ جہاں بہ استماع اوصاف قدسیہ خواہش ملاقات کرد"

خود نہیں جاتے ہیں بلکہ بادشاہ خود خواہش ملاقات کرتا ہے" بلا بھیجتا ہے کس شان کے ساتھ؟

"منشورِ طلب مصحوب یکے از ملازمان ادب داں فرستاد"

ادب داں ملازم" جو علمِ دین کی قدر و قیمت کا جوہری تھا، فرمانِ شاہی اسی کے حوالے ہوتا ہے مگر سُنتے ہیں کہ شیخ عبدالرشید نے کیا کہا۔

"شیخ اباکرد (انکار کیا) و قدم از کنجِ عزلت بیروں نہ گذاشت (ص ۲۴)

جس دربار میں ایک ایک آیت کی تلاوت کے صلہ میں سلَم سلَم سیر حاصل گاؤں جاگیریں مل رہی تھیں، جب وہ خود بُلا رہا تھا کیا کیا توقعات اُس کی ذات سے قائم کیے جا سکتے تھے، لیکن "کنج عزلت" کی حلاوت سے جس کا ایمانی ذوق چاشنی گیر ہو چکا تھا اُس نے دکھا دیا کہ شاہجہاں جیسے دراز کمند والے بادشاہوں کی رسائی بھی ان بلند آشیانوں تک نہیں ہے جنھوں نے ہر قسم کی غیر الٰہی شاخوں کو کاٹ کر اللہ کی بلند ترین شاخ پر اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے حالانکہ اِسی ہندوستان میں علم اور دین کی خدمت کو باشندوں کی ایک بڑی اکثریت دان پن، بھکشا کے استحقاق کا ایک قدرتی ذریعہ یقین کر رہی تھی، اس ملک میں جیسا کہ کہا جاتا ہے صحرائی اور جنگلی آشرموں[۱] یا دوسرے الفاظ میں تعلیم گاہوں کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کی

[۱] یہاں اس کا ذکر شاید نامناسب نہ ہو کہ ہندوستان کے متعلق عام طریقہ سے جو یہ مشہور ہے کہ رشی منی لوگ جنگلوں میں آشرم بنا کر رہتے تھے، اور وہیں تعلیم و تعلم درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، ان آشرموں کا جو نقشہ کتابوں میں کھینچا جاتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بظاہر بہت دلآویز معلوم ہوتا ہے، مہا بھارت کے قصص جن کے متعلق ملا عبدالقادر بدایونی نے ملا شیری جو اس کتاب کے ترجمہ کے لیے اکبر کی طرف سے مامور تھے (بقیہ بر صفحہ ۱۷۱)

گذر بسر کا ذریعہ صرف بھیک، اور لقمۂ گدائی بنا ہوا تھا، اگر واقعی ہندی اسلام نے ہندی تمدن وتہذیب کے عناصر جذب کیے تھے۔ جیسا کہ کہنے والوں کا ایک گروہ کہہ رہا ہے، تو جس چیز کو ہزار ہا سال سے اس ملک میں بجائے ذلت واہانت کے عزو شرف کا ذریعہ ٹھہرایا جا چکا تھا۔ اسی کے اختیار کرنے میں ان بزرگوں کو کونسی چیز روک سکتی تھی، لیکن کسی موقعہ پر شیخ مبارک محدث رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر گذر چکا ہے، فاقہ کی شدت نے جکڑ اکر زمین پر گرا دیا ہے، شاگرد حال سے مطلع ہوتا ہے، گھر سے مرغوب کھانا تیار کر کے لاتا ہے لیکن بھوک کی شدت سے جو زمین پر گرا ہوا تھا، وہ یہ کہہ کر کھانے کو سامنے سے اٹھوا دیتا ہے کہ اشراف نفس والے کھانے کا کھانا اوروں کے لیے جائز ہو تو ہو، لیکن دین اور علم کے خادموں کے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہو سکتا۔

اُستاذ کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب میر مبارک کے یہی شاگرد یعنی میر طفیل محمد بلگرامی نے مسند درس وتدریس، افادہ واستفادہ پر قدم رکھا تو مولانا غلام علی آزاد کو جو میر طفیل محمد کے شاگردوں میں ہیں ان کے تعفف واستغناء کے جو تجربات ہوئے تھے ان میں سے ایک تجربہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ جن دنوں میں میر طفیل محمد بلگرام میں پڑھایا کرتے تھے، طرح طرح کے طلبہ مختلف علاقوں سے ان کے پاس آکر پڑھا کرتے تھے انہی طالب العلموں میں سے ایک طالب العلم کے متعلق بلگرام کے سُناروں سے میر صاحب تک مختلف طور پر یہ اطلاعیں پہنچا میں کہ آپ کا فلاں طالب العلم ہمارے یہاں عموماً چاندی فروخت کرنے کے لیے لایا کرتا ہے، میر صاحب کا بیان ہے کہ یہ خبریں گو مجھے ملتی رہتی تھیں، لیکن میں نے اس طالب العلم سے کبھی نہیں پوچھا کہ قصہ کیا ہے، کچھ دن بعد جب وہ طالب العلم رخصت ہونے لگا تو دست بستہ مجھ سے کہنے لگا۔

"من کیمیا سازم استاذ من در کوہ سوالک می باشد، عمل قمری (چاندی بنانے کا طریقہ) مرا تعلیم کردہ است و فرمود کہ بعد ہفت سال دیگر عمل شمسی (سونا بنانے کا طریقہ) ہم تعلیم می کنم۔"

طالب العلم نے کہا یہ سات سال کی مدت میں نے آپ کی خدمت میں گذاری اور اب میں پھر اپنے استاذ کے پاس عمل شمسی سیکھنے کے لیے جا رہا ہوں اُس نے کہا:۔

Marfat.com

"حق استادی شما خیلے ثابت شدہ خدمت من ہمیں کہ این عمل را یاد می دہم"
یعنی تعلیم کے صلہ میں اس نے خواہش ظاہر کی کہ چاندی بنانے کا یہ طریقہ مجھ سے سیکھ لیجیے، میر صاحب کہتے ہیں" ہر چند مراتب مبالغہ طے کرد آستیں افشاندم" اُس نے شدید اصرار کے ساتھ چاہا کہ میر صاحب یہ چیز اس سے سیکھ لیں لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، میر صاحب کا بیان ہے کہ اس کو شاید شبہ ہوا کہ اس کے قول پر مجھے اعتماد نہیں ہے اسی لیے انکار کر رہا ہوں، یہ خیال کر کے "خاکسترے از کاغذ پیچیدہ برآوردہ" خاک کی ایک چٹکی اُس نے پگھلی ہوئی رانگ پر میر صاحب کے سامنے ڈالی" فی الفور نقرہ بربست" مگر جو آستین جھاڑی جا چکی تھی" وہ پھر اس نسخہ کے لینے کے لیے نہیں چڑھائی گئی، مایوس ہوا اور "رخصت شد باز نیامد" (ص ۱۵۴)

اور دوسروں کو کیوں دیکھیے خود مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا کیا حال تھا، میر طفیل محمد نے میر مبارک محدث سے اگر اس اثر کو اپنے اندر منتقل کیا تھا، تو کوئی وجہ تھی کہ میر طفیل محمد سے یہ" جوہر نایاب" ان کے شاگردوں تک منتقل نہ ہوتا؟ مولانا غلام علی مآثر الکرام میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:-

"ازاں روزے کہ ناصیۂ اخلاص بآستانِ بیت اللہ آشنا شد بے گانگی از رسوم ابنائے روزگار بہم رسید"

حج سے لوٹنے کے بعد کہتے ہیں کہ جو چیز اندر چھپی ہوئی رہتی تھی حجرِ اسود کے مس نے اس کو باہر کر دیا، حجاز سے واپسی کے بعد اورنگ آباد دکن میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہ آصف جاہ اول کے صاحبزادے نواب ناصر جنگ شہید کا عہد تھا، الحمد للہ سلطنت آصفیہ یوں تو اس وقت بھی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے لیکن ناصر جنگ شہید کے زمانہ میں تو آصفی پرچم کے نیچے جنوبی ہند کا اکثر حصہ ساحلِ سمندر تک محروسۂ آصفیہ میں داخل تھا، مولانا غلام علی ہی نے حضرت آصف جاہ اول کے تذکرہ میں ان کے مقبوضات کے متعلق لکھا ہے۔

"از کنار دریائے نربدا تا انصلائے بندر رامیشر در قبضہ تصرف داشت (ص ۲۳ روضۃ الاولیا)

جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ موجودہ وسعت کے لحاظ سے حکومت آصفیہ کا رقبہ تقریباً دونا تھا اتنی

سلطنت حکومت کے مطلق العنان بادشاہ نواب ناصر جنگ شہید اپنے والد مرحوم کے بعد ہوئے تھے، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ

"بانواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید خلف آصف جاہ ربانی سلطنت آصفیہ ربطِ عجیبے اتفاق افتاد"

اس عجیب ربط" کی نوعیت کیا تھی خود ان کا محتاط قلم اس کی تفسیر کرتا ہے۔

"موافقتے کہ بالاتر ازاں متصور نہ باشد دست بہم داد"

ایک مستقل والی ملک کبیر سے ایسی موافقت میسر آتی ہے جس سے زیادہ موافقت ناقابلِ تصور ہے لیکن اس موافقت سے ہندستان کے اس مولوی نے کیا نفع اٹھایا خود ہی لکھتے ہیں:۔

چوں نواب نظام الدولہ (ناصر جنگ) بعد پدر (آصف جاہ اول) بر مسند ایالت دکن نشست بعض یاران دلالت کردند کہ حالا ہر مرتبہ کہ خواہید میسر است اختیار باید کرد وقت را غنیمت باید شمرد"

ہر مرتبہ میں یقیناً "وزارت عظمیٰ" بھی داخل ہے چاہتے تو ممالک آصفیہ کی مدار المہامی مل سکتی تھی، اور جن گوناگوں قابلیتوں کے سرمایہ دار تھے بحسن و خوبی وہ اس منصب جلیل کے فرائض بھی انجام دے سکتے تھے، مگر دلالت کرنے والوں کو اپنی دلالت اور راہنمائی میں سخت مایوسی ہوئی جب وہی مولوی جو آج دنیا کی حقیر ترین ہستی ہے اسی کی زبان سے سُن رہے تھے۔

آزاد شدہ ام، بندہ مخلوق نمی توانم شد"

حالانکہ موروثی جائداد جو بلگرام میں تھی جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت اس سے دوسرے ارباب استحقاق کے ساتھ ان کے خاندان کو بھی محروم کر چکی تھی، جس کا مفصل قصہ گذر چکا، تلافی مافات کی بہترین صورت سامنے آگئی تھی، عمر بھی ساری ناز و نعمت میں گذری تھی، عالمگیری امیر میر عبد الجلیل نے (جو ان کے حقیقی نانا تھے) اُن ہی کے آغوش میں پرورش پائی تھی لیکن باایں ہمہ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے کہا:۔

دنیا نہر طالوت[1] می نماید غرفہ ازاں حلال است نہ زیادہ
دنیا کی حالت نہر طالوت کی سی ہے کہ چلو تو اس کا

[1] اس تلمیح سے تو اہل علم واقف ہی ہیں لیکن نا واقفوں کے لیے لکھا جاتا ہے کہ قرآن میں اس قصہ کا ذکر ہے۔ طالوت بادشاہ نے اپنی فوج کو حکم دیا تھا کہ راستہ میں نہر آئے گی اس سے کوئی پانی ایک چلو سے زیادہ نہ پیے

Marfat.com

حرام وایں شعر فرمودہ خود خواند ؎ حلال ہے، اس سے زیادہ حرام۔ اور اپنا کہا ہوا شعر سُنایا جس کا

دراں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند مطلب یہ ہے کہ جس دنیا میں ہر بھیک منگے کو بادشاہی تک عطا

غنیمت ست کہ ما را ہمیں بما بخشند ہو رہی ہے اس میں یہی غنیمت ہے کہ میں اپنے آپ کو دے دیا جا رہا ہوں

اللہ اللہ سوچنے کی بات ہے کہ امیر گھرانے کے آدمی ہیں، نانا کے ساتھ بھکر سندھ میں وقائع نگاری جیسی اہم خدمت خود بھی انجام دے چکے تھے، دولت و ثروت سب لٹ چکی ہے۔ اور اسی لیے بجائے بلگرام (وطن اصلی) کے حجاز سے لوٹ کر بندر سورت سے سیدھے اورنگ آباد چلے آئے خود فرماتے ہیں۔" ازانجا (سورت بندر سے) اسرے بہ دیار دکن کشید دار خجستہ بنیاد اورنگ آباد گردید در مکتبہ شاہ باباسافر نقشبندی قدس سرہ گوشۂ انزوا گرفت (ص ١٦٣ مآثر)

جہاں تک مجھے علم ہے اسی خانقاہ کے "گوشۂ انزوا" سے آپ کا جنازہ خلد آباد کی پہاڑی تک پہنچایا گیا، جہاں اس وقت تک آسودہ ہیں۔

اور ان قصوں کو کوئی کہاں تک بیان کر سکتا ہے، حضرت مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک دفعہ یہ صورت پیش آئی کہ نواب مرحوم کی چہیتی بیگم اور ان میں اَن بن ہوگئی، بیگم نے جواہرات کا ایک صندوقچہ مولانا کے حوالہ کیا کہ آپ اس کو لے کر اپنے وطن بہار چلے جائیے اور اس سے چند گاؤں خرید لیجیے میں اپنی زندگی آپ ہی کے ساتھ گذار کر مر جاؤنگی، بیگم اس وقت جلال میں تھیں، مولانا نے شدید اصرار کے بعد صندوقچہ لینے کو تو لے لیا، لیکن بیگم کا غصہ جب کچھ دھیما ہوا

لہ آج کل اب یہ خانقاہ پن چکی کے نام سے مشہور ہے، اب اس گدی کا کوئی وارث باقی نہیں رہا۔ حکومتِ نظام کے محکمۂ امور مذہبی کی نگرانی میں ہے، عجب پُرفضا مقام ہے ایک بہتے ہوئے نالے کے اوپر خانقاہ کی عمارت بنی ہوئی ہے میلوں سے اک نہر نکال کر خانقاہ تک لائی گئی ہے جو ایک بلند دیوار سے چادر بن کر خانقاہ کے حوض میں مسلسل گرتی رہتی ہے، دیکھنے کا سماں ہوتا ہے۔ اس خانقاہ میں کہتے ہیں کہ ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا، لیکن دستبرد زمانہ نے اس کو تباہ کر دیا۔ کچھ کتابیں باقی رہ گئی ہیں، خانقاہ کے ساتھ ایک جاگیر بھی ہے۔ امور مذہبی کا محکمہ جاگیر کی آمدنی سے تعلیمی سلسلہ کو جاری کرنا چاہتا ہے۔ واللہ یوفقہ لما یحب ویرضی۔ مولانا آزاد مرحوم کا قیام اس خانقاہ میں زیادہ تر ان کتابوں ہی کی وجہ سے تھا، میں نے سنا ہے کہ کتب خانہ کی ایک ایک کتاب جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں مولانا کی نظر سے گذری ہوئی تھی ١٢-

تو سمجھا بجھا کر ان کو ہجرت کے عزم سے باز رکھا، اور صندوقچہ جس حال میں دیا گیا تھا واپس کر دیا گیا حالانکہ جہاں تک میرا خیال ہے پانچ چھ لاکھ روپے سے کم کا وہ سرمایہ نہ تھا، چاہتے تو اس کو لے کر بہار کے رئیسوں میں جا کر شریک ہو جاتے۔ لیکن "غنیمت است کہ ما را ہمیں با بخشند" کو جو لوگ غنیمت بارد یقین کر چکے تھے ان کے لیے تو اس قسم کے خطرات کا بھی احتمال نہیں[1]، یہ کیوں تھا کیا تھا؟ لوگوں کا ہندی اسلام کے متعلق کچھ بھی خیال ہو کسی کو اس میں عجمیت اور تاتاریت نظر آتی ہے کوئی اس میں ہندویت اور بودھیت کے جراثیم پاتا ہے لیکن اپنا خیال تو یہی ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کے متعلق خواہ کچھ ہی کہا جائے کہ اس وقت ان سے بحث نہیں، لیکن علم و دین کی خدمت کے ایک استوار و محکم نظام کا جو خاکہ کھجور کے تنوں پر کھڑی مسجد میں بنایا گیا تھا، اس وقت تک جب تک مسلمان سیاسی طور پر دنیا میں مغلوب نہیں ہوئے تھے کسی نہ کسی شکل میں اسی "خاکہ" کی راہنمائی میں مسلمان چلتے رہے، حتیٰ کہ ہندوستان کے بھی یہ سارے قصبے

---

[1] اپنی خاندانی خودنمائی کا خیال بار بار بعض عجیب و غریب واقعات کے ذکر میں مانع آجاتا ہے۔ مولٰنا محمد احسن گیلانی جن کے مدرسہ گیلانی کا ذکر کسی موقع پر کیا گیا ہے۔ ایسے معتبر ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے جس کا انکار مشکل ہے، واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا گیلانی جب لکھنؤ کی ایک مسجد جو دبیرالدولہ کی مسجد کے نام سے موسوم ہے قیام فرما تھے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں بادشاہ وقت غالباً واجد علی شاہ کا عتاب کسی وجہ سے دبیرالدولہ پر نازل ہوا، قید کر دیے گئے۔ خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑی اس موقعہ پر مولانا نے قدیم آشنائی کا خیال کر کے دبیرالدولہ کے اہل خاندان کے لیے ممکنہ امداد بہم پہنچائی تھی۔ چند ہی دن کے بعد عتاب شاہی کا ازالہ ہوا، دبیرالدولہ جیل سے رہا ہو کر گھر آئے تو مولانا کی مواساۃ و ہمدردی کی خبر ہوئی بہت متاثر ہوا، اور ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی اس کا حکم ہے کر مولانا کے پاس حاضر ہوا، پہلے تو مولانا نے ریت و لعل سے کام لیا لیکن وہ بضد تھا کہ اس کی حقیر رقم کو قبول کیا جائے، آخر جان چھڑانے کے لیے مولانا نے فرمایا آج شام ہو گئی ہے، کل صبح لینے دینے کا نظم کرونگا، شب درمیان تھی اسی سے نفع اٹھا کر لکھنؤ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد فرما دیا گیا کہ دبیرالدولہ کے اس روپے سے نجات حاصل ہو۔ اپنی کتابیں جن کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا سرمایہ نہ تھا مولوی جان علی صاحب گیلانی جو بعد کو مراد آباد میں متوطن ہو کر وہیں متوفی ہوئے ان کے حوالہ کر کے سیدھے رام پور تشریف لے گئے، اور پھر دبیرالدولہ کو اس کا پتہ چلنے نہ دیا کہ بہار کا وہ مولوی کہاں غائب ہو گیا ساری عمر گیلانی جیسے کور دہ گاؤں میں گذار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

Marfat.com

اگر غور کیا جائے تو ان میں بھی اسی خاکہ کی جھلک کے سوا آپ کو ان شاء اللہ اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام کو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ حکم دیا تھا کہ

ان رجالا یاتون من اقطار الارض — زمین کے اقطار سے لوگ تمہارے پاس دین سیکھنے کے

یتفقهون فی الدین فاستوصوا بهم — لیے آئینگے، تو ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیجیو۔

خیرا۔ (مشکوٰۃ)

علم کے طلبہ کے متعلق مسلمانوں کے قلوب میں یہ عقیدہ بٹھایا گیا تھا۔

ان الملائکۃ لتضع اجنحتها رضی — فرشتے علم کے طلب کرنے والوں کے لیے اپنے پرچھاتے

لطالب العلم (مشکوٰۃ) — ہیں تاکہ اُن کو راضی رکھا جائے۔

اور اس بنیاد پر مسجد نبوی میں جو صفہ (چبوترہ) چھپروں کے نیچے اس لیے قائم کیا تھا کہ باہر سے جو لوگ طلب علم کے لیے آئیں، اُنہیں اسی میں ٹھہرایا جائے اور تعلیم دی جائے۔ اس صفہ کے رہنے والوں کی خبر گیری مسلمانوں کے سپرد تھی، کم و بیش اسلام کی اس پہلی تعلیم گاہ میں مختلف اوقات کے اندر طلبہ کی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی تھی، کچھ تو لکڑیاں جنگل سے لاکر اور اس کو بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ دن کو صفہ والے لکڑیاں چنتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے لیکن اصحاب ثروت و وسعت کی طرف سے باشارۂ نبوت ان کی امداد بھی ہوتی تھی، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم براہ راست ان لوگوں کے کھانے پینے کے مسئلہ کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ کوئی خراب چیز اگر ان کے لیے بھیجتا تو حضور اس پر تنغص کا اظہار فرماتے، مدرسہ کے بعض ممتاز طلبہ مثلاً معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر کیا گیا تھا کہ جو امداد ان طلبہ کے لیے کہیں سے آئے اس کی حفاظت بھی کریں اور طلبہ میں تقسیم بھی کریں، یہ ساری باتیں صحاح کی کتابوں میں آپ کو مل جائینگی۔ ایک طرف عام مسلمانوں کو تو ان طلبہ کے ساتھ استیصا خیر کا یہ حکم تھا، مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی صفہ کے ایک طالب العلم کا انتقال ہوتا ہے غسل کے وقت کمر سے ایک اشرفی نکلتی ہے پیغمبر کی زبان سے کیۃ من النار (آگ میں داغنے کا ایک آلہ) کی آواز سن کر مجمع تھرا اُٹھتا ہے کہتے ہیں کہ دوسری

دفعہ ایک اور طالب العلم کی کمر سے دو اشرفیاں برآمد ہوئیں کیتان من النار آگ میں داغنے کے دو داغ کی آواز لسانِ نبوت سے پھر سُنی گئی، جس کا مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں کو تو یہی چاہیے کہ علم کے ان پیاسوں کے ساتھ اپنی اپنی استطاعت کی حد تک نیکی کا برتاؤ کریں، لیکن خود طلبہ کو چاہیے کہ اپنی نگاہ بلند رکھیں۔ طلبِ علم کو زر طلبی کا ذریعہ نہ بنالیں، اور جو ایسا کریگا، اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ اس کی یہ آمدنی آخرت میں کیۃ من النار بن جائیگی یعنی اُسی روپے سے جہنم میں وہ داغا جائیگا۔ اسلام کے اس قسم کے احکام کا ایک سلسلہ ہے، توانا تندرست آدمی کو کہا گیا ہے کہ بھیک اُس کے لیے حرام ہے، لیکن مسلمانوں کو کہا گیا کہ مانگنے والوں کو جھڑکنا نہ چاہیے۔ مردوں کو کہا گیا کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکیں، لیکن عورتوں سے کہا گیا کہ ان کی نماز گھر کی، مسجد کی نماز سے بہتر ہے، اور یہی طریقۂ عمل طلبہ کے علم کے ساتھ اختیار کیا گیا کہ مسلمانوں کو تو چاہیے کہ ان کی امداد جس حد تک کرسکتے ہوں کریں، لیکن طلبہ کو چاہیے کہ حتی الوسع منت پذیری سے بچ سکتے ہوں تو بچیں اور سچ پوچھیے تو قرآن کی اس آیت کی یہی تفسیر ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا

(صدقہ وخیرات کا استحقاق) ان فقیروں کو ہے جو اللہ کی راہ میں گھر لیے گئے ہیں زمین میں چل پھر کر معاش مہیا نہیں کرسکتے، جو نہیں جانتا وہ تو ان کو تونگر سمجھتا ہے کیونکہ وہ سوال کرنے سے بچتے ہیں، تم انہیں ان کی پیشانیوں سے پہچان سکتے ہو، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ اس آیت کا تعلق مسجد نبوی کی اسی تعلیم گاہ (صفہ) کے طلبہ سے بھی ہے، آیت بالا میں ایک طرف تو مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ ان کے سلوک کے مستحق طلبہ بھی ہیں جو تحصیل علم کے مشغلہ کی وجہ سے گھر گئے ہیں اوروں کی طرح تلاش معاش میں گھوم پھر نہیں سکتے، لیکن دوسری طرف ان طلبہ کے جو صفات بیان کیے گئے ہیں کہ تعفف و استغنا کا اظہار ان سے ایسا ہو

کہ جو حال سے ناواقف ہے سمجھے کہ یہ لوگ تو خوش حال تونگر غنی ہیں، اور اگر کسی سے کچھ کہنے کی بھی ضرورت ہو تو پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے نہ پڑجائیں کہ گویا اس کو کمبل اُڑھا رہے ہیں یا لحاف بن کر چھا جانا چاہتے ہیں، جیسے عام بازاری بھک منگوں گداگروں کا حال ہے، قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی تعلیم کے وہ نتائج ہیں کہ ہر زمانہ میں ہر ملک کے مسلمانوں، اور وہاں کی حکومتوں کو ہم پاتے ہیں کہ طلبۂ علم کے ساتھ استبصار خیر اور حسنِ سلوک کو اپنا ایک مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں، مبالغہ نہیں ہے کہ لاکھوں لاکھ روپیہ سالانہ حکومتوں کی طرف سے بھی اور عام مسلمانوں کی طرف سے بھی تعلیمی مد میں خرچ ہوتے تھے مگر باوجود اس کے ایک گروہ ان میں ایسا ہوتا تھا جو باوجود ضرورت و حاجت کے اسی تعفف اور استغناء کو اپنا شعار بنائے ہوئے رہتا تھا، اور جو ایسا نہیں کرتے تھے سوسائٹی میں ہمیشہ بُری نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ فوائد الفواد میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت والا سے ملنے کے لیے ایک طالب العلم حاضر ہوا، حضرت نے دریافت فرمایا، ان دنوں کس فکر میں ہو۔ بولا

"بدر سرائے آمد و شد می کنم تا مرا نانے و فراغتے حاصل آید"

یہ سُن کر سلطان جی خاموش ہو گئے، متعلم بھی اٹھ کر چلا گیا، حضرت والا تب اہل مجلس کی طرف مخاطب ہوئے اور یہ شعر پڑھا۔

در وصف حال بس سرہ ایست | چوں بخواہش رسید مسخرہ ایست
(کھرا)

مطلب یہ ہے کہ حال اپنا جب بیان کرتے ہیں تو لوگ اپنے کو کھرے سکّہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، لیکن جب نفسانی خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے تو وہی آدمی صرف ایک "مسخرہ" بن کر رہ جاتا ہے، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ

"شعر چیزے لطیف ست اما چوں مدح می کنند در بہر کسے می برند سخت بے ذوق است"

مقصد مبارک یہ تھا کہ شاعری ایک بڑا کمال ہے لیکن اس کمال کو امیروں اور بادشاہوں کی تعریف میں جب استعمال کیا جائے تو اس سے شاعر کی کتنی بے ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی حال علم کا ہے

طالب علم کے کیا کہنے، لیکن جب اس کو "نانے دفراغتے حاصل آمد" کا ذریعہ بنانے کے لیے در بدر آدمی مارا پھرے تو اس کی کور ذوقی میں بھی کیا شبہ ہے حضرت نے خود اپنے منشا کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا :-

"علم ہمچنیں بنفس خویش بس شریف چیزے ست اما چوں آنرا کسب سازند بدر ہا می روند عزت آں می رود" (ص ۱۸۲)

پنڈت اور برہمن ہونا جس ملک میں ہر قسم کی خیرات کا آدمی مستحق بنا رہتا تھا اُسی ملک میں اب یہ خیال پھیلایا جا رہا تھا، لیکن ان کہنے والوں کو کیا کہیے کہ جنہوں نے اس ملک میں اسلامی اصول کی اشاعت کی ان پر الزام دھرا جاتا ہے کہ اسلام میں ہندی خصوصیات کو انہوں نے بھر دیا۔ مگر ہم کہنے والوں کی سنیں یا جو واقعات اس ملک میں پیش آ رہے تھے انہیں دیکھیں، خیال تو کیجیے کہ بلبن کا زمانہ ہے مسلمانوں کے عروج و اقبال کا آفتاب اس ملک میں نصف النہار پر ہے، بادشاہ کی یہ حالت ہے کہ علماء کا وعظ سنتا ہے اور روتے روتے اُس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہے۔ علم و طلبہ علم کی ہر طرف عزت ہو رہی ہے عظمت ہو رہی ہے لیکن انہی دنوں میں اسی علم دین کے کچھ مخلص ایسے بھی تھے۔ فوائد الفواد میں ہی سلطان المشائخ کے حوالہ سے یہ قصہ منقول ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مولانا عزیز زاہد نے سلطان جی سے یہ واقعہ نقل کیا کہ مولانا برہان الدین کابلی نے ان سے اپنے طالب العلمی کے دنوں کا یہ ماجرا ایک دن بیان کیا کہ کسی ضرورت سے

"بر سپہ سالار جمال الدین نیشاپوری کہ کوتوال حضرت دہلی بود رفتہ بودم"

کوتوال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دستر خواں چنا گیا مولانا برہان سے کوتوال نے شرکت کی درخواست کی اصرار جب حد سے زیادہ بڑھا تو بیٹھ گئے کھانے میں کہتے ہیں کہ "ملوائے گدر یزرد" یعنی گاجر کا حلوہ بھی تھا،

کوتوال آں حلوہ آزا پیش مولانا برہان الدین نہاد و گفت ایں حلوہ چگونہ است"

Marfat.com

دلی کے پولیس کمشنر نے ایک غریب طالب العلم کے سامنے حلوا کی تشتری خود پیش کی ہو اس سے ایک طرف اگر اس کا پتہ چلتا ہو کہ اسی دلی میں کبھی ان ہی طالب العلموں کا کیا عروج تھا لیکن اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہو کہ کوتوال کے اس سوال پر کیسے حلوا کیسا ہو؟ مولانا برہان الدین نے جواب دیا :-

متعلمان نان خشک راہچناں خورند کہ	طلبۂ علم تو خشک روٹی کو اس طور پر کھاتے
حلوا گزر تواں دانست پس حلوائے	ہیں جیسے گاجر کا حلوا کھاتے ہوں، بھلا
گزر چہ گونہ خورند۔	ان بیچاروں کو گاجر کا حلوا کہاں سے
	مل سکتا ہو۔

مطلب یہ تھا کہ "ایں حلوا چہ گونہ است" کا جواب تو وہی دے سکتا ہو جس نے گاجر کا حلوا پہلے چکھا بھی ہو، وہ البتہ بتا سکتا ہو کہ آپ کا حلوا اچھا تیار ہوا نہیں ہو اور جن کے لیے خشک روٹی ہی حلوائے گزر کی قائم مقام ہو، ان سے آپ یہ کیا سوال کرتے ہیں، اور یہ کوئی اپنا ذاتی حال نہیں بیان کر رہے ہیں، عام متعلمین وطلبہ کو یہ حالت اس وقت بھی تھی جب دلی کا کوتوال لندن اور مانچسٹر، گلاسگو کے باشندے نہیں، نیشاپور اور کابل کے باشندے ہوتے تھے، دلی التمش اور بلبن کی دلی تھی "آب اندر" کے باوجود اپنے آپ کو لب تشنگی کے اصول پر قائم رکھنا یہ تھی اس زمانہ کی خصوصیت، سب کچھ بنٹ رہا ہو لینے والے سب کچھ لے رہے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ہیں، مذہب نے ان کو تعفف کا حکم دیا ہو، ایسے تعفف کا کہ دوسروں کو اس کا پتہ نہ چلے کہ کس حال میں ہیں، علاء الدین خلجی کا زمانہ وہ زمانہ ہو کہ برنی کا یہ بیان اگر صحیح ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ علم اور دین کی قدر افزائیوں میں اس وقت ہندوستان کا ہمسر کوئی دوسرا اسلامی ملک نہ تھا، البرنی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت بود در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و صفاہان و رے و روم و ربع مسکوں

باشند، ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات تفسیر و فقہ، اصول فقہ و معقولات و اصول دین و نحو و لغت و معانی و بیان و بدیع و کلام و منطق موے می شگافند و ہر سالے چندیں طالبان ازاں استاداں سر آمدِ درجہ افادت می رسیدند و استحقاق دادن جواب فتویٰ می شدند و بعضے ازاں در فنونِ علم و کمالات علمی درجۂ غزالی و رازی می رسیدند (ص ۳۵۲ تا ۳۵۳) (فیروز شاہی)

یہ شنیدہ نہیں بلکہ مورخ کی "دیدہ" گواہی ہے، اور مورخ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں فیروز شاہی کا مصنف ہے جس سے اس کی قابلیت و ذہانت، وسعتِ نظر سب ہی کا پتہ چلتا ہے۔

مگر اسی عہد میں اودھ کے دو شریف لڑکے پڑھنے کے لیے آتے ہیں، انہی پڑھنے والوں میں ایک ہندوستان کے وہ تاریخی عالم تھے جن کے متعلق حضرت چراغ دہلوی کا مشہور شعر ہے:-

سألت العلم من احياك حقا   فقال العلم شمس الدين يحيىٰ

میں نے علم سے پوچھا تجھے واقعۃً کس نے جلایا   تو علم بولا کہ شمس الدین یحییٰ نے

شیخ محدث نے انہی کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے زمانہ میں

"از مشاہیرِ علما، شہر (دہلی) بود بیشتر مردم شہر تلمیذ بانتساب او می کردند"

اور میر خورد نے تو خود ان کے عروج علمی کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ سیر الاولیاء میں لکھتے ہیں

بیشتر علمائے شہر منسوب بر شاگردی ایں بزرگ اند و سند علم ہائے ظاہری و تحقیق علوم دینی نسبت بداں بزرگ می کنند و فخر و مباہات بمجلس رفیع آں بزرگ می دانند، کسے کہ بر شاگردی آں منسوب است میان علما بجیل و مکرم است" (سیر الاولیاء ص ۲۲۶)

بہرحال یہی مولانا شمس الدین یحییٰ اپنے خالہ زاد بھائی مولانا صدر الدین ناؤلی کے ساتھ دلی میں پڑھنے کے لیے آئے تھے، مگر جانتے ہو علاء الدین خلجی والی علم دوست دلی میں علم ہی کے ان طالب علموں کے تعفف کا کیا حال تھا، سفید پوشی نباہنا چاہتے تھے لیکن اتنے پیسے بھی پاس نہ تھے کہ دھوبی کو اجرت دے کر کپڑے دھلوا لیا کریں۔ دستور تھا دونوں بھائیوں کا کر

"دراآوان تعلم درایامِ تعطیل (جمعہ کے دن) برائے جامہ شستن حوالی غیاث پور برلب

آب جون (جمنا) آمدند (ص ۲۲۳ - سیر الاولیا،)

اور ان کے پاس تو شاید صابن بھی ہوگا لیکن ہم آج جس بزرگ کے نامِ نامی سے برکت حاصل کرتے ہیں یعنی خود سلطان جی نظام الدین اولیا، کا حال اپنی طالب العلمی کے زمانہ میں کیا تھا؟ میرخورد ہی نے اپنی سگی دادی کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ حضرت والا جب اجودھن میں اپنے پیر طریقت بابا فرید شکر گنج سے تمہید ابوالشکور اور عوارف پڑھتے تھے، عمر بیس سال سے زائد نہ تھی، جوانی کا شوق مگر میرخورد کی دادی جو اجودھن ہی میں مقیم تھیں کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ

"جامہائے سلطان المشائخ بغایت رنگین (چکٹ) شدہ بود وسبب آں کہ صابون نہ بود کہ سپید کنند"

میرخورد لکھتے ہیں کہ میری دادی صاحبہ سے ان کا حال دیکھا نہ گیا اور بولیں:

"اے برادر جامہائے تو بغایت رنگیں شدہ و پارہ ہم گشتہ اگر بدہی من بشویم و پیوند آں بزنم"

بڑے رد و کد کے بعد سلطان جی اس منت پذیری پر راضی ہوئے اور

"جدہ رحمۃ اللہ علیہا۔۔۔ چادر خود داد کہ ایں را بپوشند تا ایں غایت کہ جامہا را بشویم"

جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر جو جوڑا تھا سلطان جی کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری جلو وغیرہ بھی نہ تھی، اس حکم کی تعمیل کی گئی، کپڑے اتار کر بوڑھی بی بی کے حوالے کیے گئے۔ اور ان کی چادر لپیٹ کر خود سلطان المشائخ

"کتابے در دست داشت وگوشہ گرفت ومطالعہ آں مشغول گشت"

بڑی بی بیچاری نے کپڑے بھی دھو دیے، جہاں جہاں سے پھٹ گیا تھا ان پر پیوند زنی کر کے سلطان جی کے حوالہ کیا۔

بعد معذرت آں جامہا پوشیدہ (سیر الاولیا، ص ۳۱۸)

کہیں کسی کے دل میں اس کا خیال نہ گذرے کہ اُس زمانہ میں کپڑوں کی قلت تھی اور اس لیے یہ حال تھا، اسی سیر الاولیا، میں میرخورد نے ہی اپنے حقیقی چچا کا حال یہ لکھا ہے کہ:-

Marfat.com

"بیش ترکسوت ایں سید پاک صوفیانہ صوفہائے رنگارنگ کمخاب دچینی ومقطاع ومہین بود"

اور پہننے کی کیا حالت تھی۔

ازجنس جامہا چیزے پوشیدے آں راکرت دیگر نپوشیدے وبہر کہ خاطر مبارک او اقتضا کردے عطا فرمودے۔ (سیر الاولیاء ص ۱۹۶)

کپڑوں میں جو چیز بھی پہنتے تو پھر دوبارہ ان کا استعمال نہیں کرتے جسے جی چاہتا دے ڈالتے

کپڑوں کی اس ارزانی اور فراوانی کے باوجود کہ چالیس چالیس گز ایک ایک تنکے میں مل سکتے تھے، اس وقت بھی علم و دین کے طلبہ کی مستی و سرشاری کا یہ حال تھا، صفہ کی تعلیم گاہ ہی سے اس تعفف کی ابتداء ہوئی تھی، وہی روایتیں تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، جن میں

لہ دلی میں خصوصاً اور ہند میں عموماً اس زمانہ میں کس کس قسم کے کپڑوں کا رواج تھا اس کا کچھ تو اندازہ میر خورد کی مذکورۂ بالا عبارت سے ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحیی ناظم ندوہ مرحوم نے نزہۃ الخواطر میں عہدِ علائی کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کپڑوں کے متعلق لکھا ہے، فی تھان ان کپڑوں کی اس زمانہ میں کیا قیمتیں تھیں ترجمہ اس کا یہ ہے۔
چیرۂ دہلی ۱۰ تنکہ، چیرۂ کوکر ۲۰ تنکہ، سرخی صاف اعلیٰ قسم پانچ تنکہ، متوسط تین، اونی دو تنکہ، سلاہٹی اعلیٰ چار تنکے، متوسط تین، اونی دو۔ الکرباس الاعلیٰ بیس گز کا تھان ایک تنکہ، کرباس متوسط تیس گز کا تھان دو تنکے کرباس اونی چالیس گز کا تھان ایک تنکہ۔ سادہ کرباس دس جیتل۔
اور یہ فہرست تو اس زمانہ کی ہے جب مسلمان ہندوستان پہنچ کر یہاں نئے صناعات اور دستکاریوں کو مروج کیا ہے، اس کے بعد مغلوں کے عہد تک ان میں جو ترقیاں ہوئی ہیں صرف کپڑوں ہی کے متعلق ان کی فہرست طویل ہے۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے عہد اکبری کے ریشمین اور سوتی کپڑوں کی جو فہرست دی ہے اسی کو پڑھ جائیے آپ کو ریشمی کپڑوں میں مخمل، زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہروی، قالین گجراتی، داراتی، مشجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، قالی، اطلس خطائی، خز مخمل فرنگی، خارائی، سہ رنگ قطنی، کتان، تافتہ، ابری، طبق۔ یہ پچاسوں نام تو صرف ان کپڑوں کے ہیں جو ریشم یا ریشم کی ترکیب سے تیار ہوتے تھے۔ سوتی کی فہرست بھی کچھ چھوٹی نہیں ہے۔ چوتار، ململ، تین سکھ، مسری صاف، گنگاجلی، بھیرونی، سالور، بہادر شاہی گزیہ سوتی، نیلہ دکن، مہرکل، سہن، جیونہ، اساونی، محمودی، پنچتولیہ، جھولہ، چھینٹ وغیرہ وغیرہ
فائدہ۔ تنکہ کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ تنخواہ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اور اب وہی ٹکہ بن گیا۔ ایک تولہ کا سکہ تھا، چاندی کا ایک سکہ، چالیس جیتل کے مساوی تھا۔ جیتل تانبہ کا سکہ ایک تولہ کا تھا، لیکن ملفوظات عزیزیہ میں جیتل و تنکہ کے متعلق شاہ صاحب کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے جیتل بجائے دمڑی از قسم فلوس خورد مضروب در زمانِ سابق رائج بود و تنکہ از قسم مشدہات چنانچہ ہم در بخارا رائج ست۔ ص ۳ ملفوظات۔

Marfat.com

صلاحیت تھی وہ اس کو قبول کرتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس زمانہ میں تربیت کا حال یہ ہو جیسا کہ چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے میر خورد نے سلطان المشائخ ہی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جن دنوں اجودھن میں پہنچے "دانشمندے کہ یار و ہم سبق من بود بحثیا یک جا کرہ پیش آمد" یعنی دلی کے زمانۂ تعلیم کا ایک ساتھی اجودھن پہنچا پڑھ لکھ کر وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہو چکا تھا، سلطان المشائخ اپنے پھٹے پرانے حال میں اس سے ملنے گئے "چوں مرا با جامہائے رنگیں دید پرسید کہ مولانا نظام الدین ترا چہ روز پیش آمد" تم پر کیا وقت پڑا کہ اس حال میں ہو، اس بیچارے کو جو اس راہ کی لذتوں سے نا آشنا تھا، کیا جواب دیتے مگر وہ کہتا جاتا تھا "اگر در شہر تعلیم می کردے مجتہد زمانہ شدے و اسبابے در روزگارے بہتر شدے" خاموشی کے سوا اس کا جواب اور کیا ہو سکتا تھا خود فرماتے ہیں "ازاں یار ایں سخن شنیدم و ہیچ نگفتم"

مل کر بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، اب آپ اسے کشف سمجھیں یا ایمانی فراست کہ بابا صاحب سلطان جی کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں "نظام اگر کسے از یاراں تو پیش آید و گوید کہ ایں چہ روز ست کہ ترا پیش آمدہ" سلطان جی چپ رہے، ایک طالب العلم کو سلطان الہند بنانے کا کام جس کے سپرد تھا اُس نے کہا، بابا صاحب نے فرمایا کہ

بگو ~ نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو ۔۔۔ ترا سعادت باد امرا نگونساری (دیر۔ ص ۲۳۹)

ساری کدورت دُھل گئی، اور جامہ رنگیں ہی میں وہ مسرت ہاتھ آئی، جو خلعت شاہانہ والوں کو عمر بھر میسر نہیں آسکتی، اور بابا صاحب کی اس تربیت کے متعلق تو شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت پیر ہونے کے مرید کی تربیت ان طریقوں سے فرماتے تھے مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کی مائیں بھی اپنے بچوں میں چاہتی تھیں کہ اسی جذبہ کی پرورش ہو، خود سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا، والدہ صاحبہ کے زیر تربیت بچپن کا سارا زمانہ گذرا لیکن کس طریقہ سے؟ خود ان ہی کا بیان ہے "والدہ مرا با من چناں معہود بود یعنی دستور مقرر تھا کہ روزے کہ در خانہ ما غلہ نہ بودے مرا گفتے" یعنی گھر میں جس دن کھانے کو نہ ہوتا تو اپنے یتیم بچے کی اسلام کی وہ خاتون نظر میں بلندی کن الفاظ سے پیدا کرتی تھیں کہتیں "امروز ما مہمانِ خدائیم

اس لہجہ میں یہ فقرہ ماں کی زبان سے بچہ کے کان میں پہنچتا تھا کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب زمانہ میں مسلسل کھانا ملنے لگتا، تو میں دل میں کہتا "من تنگ آمدم (روز روز کھانے سے تنگ آگیا) والدہ کیے خواہند گفت من مہمان خدائم"

حضرت فرماتے ہیں کہ پھر یہ صورت جب پیش آجاتی اور من مہمان خدائم" والدہ فرماتیں "یک ذوقے وراحتے درمن پیدا شد" (ص ۱۱۳۔ سیر)

یہ تھے وہ عقاب کے بچے جن کی فلک پیما نگاہوں میں قوت ان راہوں سے پیدا کی جاتی تھی، اس طالب العلم پر جس نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ "بردر سرائے آمد ورفت می کنم تا نانے فراغتے دست آید"

حضرت نے ناراضگی کا جو اظہار کیا تھا، یہ موروثی تربیت وتعلیم کا نتیجہ تھا، ورنہ آج یہ بات کیا قابل شناعت قرار پاسکتی ہے، سیر الاولیا میں اسی کے بالمقابل ایک اور واقعہ کا ذکر ہے، اودھ کے ایک عالم مولانا جمال الدین اودھی کمسنی میں فاتحہ فراغ اور تحصیل علم سے فارغ ہوچکے تھے، نوجوان ہی تھے کہ اودھ سے دلی سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اسی زمانہ میں ایک خراسانی مولوی دلی آیا ہوا تھا، بہ ظاہر جھگڑے اور مناظرہ ومجادلہ میں شہرت حاصل کی تھی، لوگوں میں "مولنا بحاث" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا، کبھی حضرت والا کی خانقاہ میں بھی آنا جانا رہتا تھا، مولانا جمال الدین جب خانقاہ میں موجود تھے کہ یہ خراسانی بحاث بھی کہیں سے آگیا، اور خانقاہ کے علماء سے مختلف مسائل پر الجھنے لگا، مولانا جمال الدین نے اس رنگ کو دیکھ کر خراسانی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور چند ایسی گرفتیں کیں کہ "اورا ملزم گردانید"

ہندی مولوی کے پنجوں میں یہ خراسانی کچھ ایسا بری طرح پھنسا کہ لاکھ نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفت اتنی سخت تھی کہ سٹ پٹا کر رہ گیا، علماء کا جو مجمع موجود تھا "جملہ انصافہا کردند وگفتند کہ رحمت برشما باد وعلم شما کہ رعونت ازسرایں عزیز دور گردید"

سلطان المشائخ کے خادم خاص ومشہور میاں اقبال بھی موجود تھے ان کو تو اتنی

مسرت ہوئی کہ بھلے چنگے ہوئے حضرت والا کے پاس اوپر پہنچے اور ہانپتے ہوئے عرض کیا کہ

"جوان (مولانا جمال الدین) دانش مند است، با مولانا بحاث بحث کرد و در بزدوی بحاث

را الزام داد، چنانکہ مولانا وجیہ الدین پائلی و یاران دیگر ہمہ انصافہا دادند"

اس خبر سے حضرت کو بھی خاص مسرت ہوئی، آپ واقف نہ تھے کہ مولانا جمال الدین فارغ التحصیل عالم ہیں، میاں اقبال سے ارشاد ہوا، "لالا[١] جوان (مولانا جمال الدین) را با یاراں طلب کن"

میاں اقبال سب کو بلا کر اوپر لے گئے، اس وقت سلطان المشائخ نے مولانا جمال الدین کو خطاب کرتے ہوئے جو بات فرمائی اس کا پیش کرنا یہاں مقصود ہے، فرمایا "ہمت بر آمدن توکہ علم خود را نفروختی" (سیر۔ ص ٣١٩)

مطلب یہ تھا کہ اس علم و فضل کے ساتھ تم دلی (پایہ تخت خلافت) پہنچے لیکن بجائے اس کے کہ اپنے علم کا ڈنکا پیٹتے اور حکومت میں کوئی عہدہ اس ذریعہ سے حاصل کرتے تم ایک عامی آدمی کی شکل میں میرے پاس آئے۔ اتفاق سے تمہارے علم کا اظہار ہو گیا، دیر تک ان کی ہمت افزائی مختلف الفاظ میں فرماتے رہے۔

لیکن اسی کے ساتھ میں اس کو صرف مبالغہ اور غلو ہی نہیں بلکہ غلط بیانی قرار دوں گا اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ علم اور دین کے دائرہ میں جو لوگ زندگی بسر کرتے تھے سب کا یہی حال تھا کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور ایک گروہ ان ہی ملاؤں اور مولویوں میں، ان کا بھی تھا، جو علم ہو یا دین دونوں کو صرف حصول دنیا کا شبکہ یا جال قرار دیے ہوئے تھا۔ عہد اکبری مشہور قاضی نظام بدخشی جن کے متعلق ملا عبد القادر نے لکھا ہے "برشرح عقائد حاشیہ و در تصوف رسائل متعدد تصنیف نمود" لیکن یہی حضرت ہیں جنہوں نے "اول کسے کہ اختراع سجدہ[٢] پیش بادشاہ کرد در فتح پور او بود۔ ص ١٥٣"

---

[١] لالا شاید اس زمانہ میں پیار کا کوئی کلمہ تھا۔ بڑے چھوٹوں کو اس لفظ سے تعبیر کرتے تھے، غالباً بداؤں کا للا کا لفظ اسی کی یادگار ہے "یاران" سلطان المشائخ کے جماعت خانہ کی اصطلاح تھی "مریدان خاص جو عموماً صحبت عالی میں رہتے ان کو آپ "یاران" کے لفظ سے موسوم کرتے تھے۔

[٢] جس سے معلوم ہوا کہ بادشاہوں کے سامنے سجدہ گذاری کی رسم اکبری بدعات میں سے بقیہ بر صفحہ ٣٨٧

Marfat.com

اور ایک بیچارہ یہ قاضی کیا ؟ اکبری فتنہ میں جیسا کہ معلوم ہے زیادہ دخل انہی دنیا ساز عباد الدراہم والدنیا نیز علماء کا تھا، دین اور علم والے جب گرتے ہیں تو کہاں تک چلے جاتے ہیں۔ ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے کہ دربار میں ایک دن بایں شکل "دو صاحب تشریف لائے کہ

سر و بروت و ابرو را حلق موافق ریش ساختند (منتخب ص ۳۸۸) سر مونچھ، بھاؤں سب کو منڈوا کر منڈی ہوئی ڈاڑھی کے برابر کیے

ان میں ایک قرآن کے مفسر جناب مولانا فیضی فیاضی ہیں اور دوسرے علامی فہامی جناب مولانا ابوالفضل ہیں۔ آپ کے والد جناب مولانا مبارک محدث ناگوری کا آج انتقال ہوا ہے اسی سوگ میں ان علمائِ دین نے مچھندروں کی یہ صورت بنائی ہے،

اور سچ تو یہ ہے کہ ان بیچاروں کو کیا کہیے ان لڑکوں کے سامنے باپ نے اپنے جس کردار کو پیش کیا تھا اس کا نتیجہ اگر ان شکلوں میں ظاہر ہوا تو غالباً یہ محل تعجب بھی نہیں ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے تو صرف اپنے باپ کو دیکھا تھا لیکن خود ملا مبارک نے جن بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں جن کی صحبتوں میں بیٹھے تھے حتیٰ کہ ابوالفضل کا اگر یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت عبید اللہ احرار سے ملا مبارک کو بیعت کا شرف حاصل ہوا تھا، حافظ ابن حجر کے بدو واسطہ حدیث میں شاگرد تھے لیکن بایں ہمہ جس قسم کی زندگی انہوں نے گذاری اس کا اثر بیٹوں پر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، ملا عبد القادر جو ملا مبارک کے براہ راست شاگرد ہیں وہی ان کے متعلق یہ لکھ کر کہ

"از علماء کبار روزگار است در صلاح و تقویٰ و توکل ممتاز اہل زمان و خلائق دوران است، در ابتداء حال ریاضت و مجاہدہ بسیار کرد"

اسی لیے ابتداء میں آپ کے مذہبی جوش کا یہ حال تھا کہ "اگر کسے در مجلس وعظ انگشتری طلا و حریر یا موزہ سرخ یا جامہ سرخ یا زرد پوشیدہ می آید فی الحال می فرمود کہ از تن بر آرد و ازارے کہ از پاشنہ گذشتہ بودے حکم بہ پارہ کردن آں میکرد"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۶) ایک بدعت ہے، سلاطین اسلام میں اس کا رواج نہ تھا، اکبر کے زمانہ میں اسی قاضی بدخشی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ جہانگیر کے عہد میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے حضرت کو جیل کی سزا بھگتنی پڑی جس کی تفصیلات مجدد نمبر الفرقان میں ملینگی۔ بحمد اللہ مجدد صاحب کی کوشش بار آور ہوئی اور شاہجہاں بادشاہ جس وقت تخت نشین ہوئے، اول حکمے کہ اصدار یافت منع سجدہ بود

فرمود کہ ... (... ص ۱۲۵۵)

"سماع" اور نغمہ سے ایسی نفرت تھی کہ "اگر آواز نغمہ در رہ گذرے شنودے جست نمودے" یعنی کود کر اس مقام سے دور بھاگتے تھے۔ ایک حال تو ملا صاحب کا یہ تھا، اس کے بعد قلابازیوں کا سلسلہ شروع ہوا، ماثر الامراء میں ہے:-

درعہد سلیم شاہ (پسر شیر شاہ سوری) بربط شیخ علائی[1] مہدوی بمہدویت شہرت گرفت، و درعہد آغاز اکبر کہ امرا چغتائیہ بیشتر درعرصہ بودند بطریقہ نقشبندیہ خود را وانمود پس ازاں بسلسلہ مشائخ ہمدانیہ منسوب می کرد، و چوں عراقیہ (شیعہ) دربار را گرفتند برنگ ایشاں سخن راند چنانچہ بہ تشیع انتہا ریافت (ماثر الامراء ج ۲ ص ۵۸۵)

اور آخر میں تو "دین الٰہی" کی تمہید لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہو گئے، پھر ہوا جو کچھ ہوا، بادشاہ کو پہلے

[1] یہ شیخ علائی سید محمد جونپوری کے خلفاء میں ہیں، مخدوم الملک سلطان پوری کے اشارہ سے سلیم شاہ نے شیخ علائی کو کوڑے سے پٹوایا، کمزور آدمی تھے، چند کوڑوں کے بعد روح پرواز کر گئی۔ امراء چغتائی سے مراد تیموری اور مغل امرا ہیں، ان تورانی امیروں پر حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کا بہت اثر تھا، اسی لیے ان کے دیکھا دیکھی نقشبندیوں میں شریک ہو گئے، ہمدانیہ درویشوں کا ایک خاص گروہ ہندستان میں تھا جن کے سرخیل حضرت سید علی ہمدانی تھے، بعض خاص اشغال و اوراد کی وجہ سے ان لوگوں کو ایک امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، عراقیہ سے مراد شیعہ ہیں۔ ہمایوں کی آخری کامیابی چونکہ ایران کے قزلباشوں کی امداد سے ہوئی تھی، جس کی وجہ میرے خیال میں ایرانیوں کا وہ خطرہ تھا، جو شیر شاہ سے ان کو پیدا ہو گیا تھا، مولانا رفیع الدین صفوی کے حالات میں لکھا ہے کہ شیر شاہ نے ان سے کہا تھا کہ ہندستان کے چند باغیوں سے فرصت ہو لے تو میں آپ کو سلطان ترکی کے پاس بھیجونگا کہ وہ ایران پر اس طرف سے حملہ کریں اور میں ہندستان سے بڑھونگا۔ یوں قزلباشوں کا جو فتنہ ایران میں اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ زبردستی لوگوں کو شیعہ بنایا جا رہا ہے ختم ہو جائیگا۔ غالباً اس خطرہ نے ایرانی حکومت کو ہمایوں کی امداد پر آمادہ کیا لیکن ہندستان میں شیعوں کے اقتدار حاصل کرنے کا یہ ذریعہ بن گیا، ورنہ ہمایوں سے پہلے شمالی ہندوستان ہمیشہ ایک ہی حنفی عقیدہ کے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا رفیع الدین صفوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ شاید کتاب میں کسی اور موقع پر بھی ہے۔ سطور بالا میں جس اہم تاریخی انکشاف کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے یعنی ہمایوں کی امداد ایرانی حکومت نے دوبارہ ہندوستان کے واپس دلانے میں کیوں کی۔ تاریخ کا یہ کتنا اہم سوال ہے۔ نیز ہندستان خصوصاً شمالی ہند میں شیعہ مذہب کی تاریخ کا بھی یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ میں نے اسی کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس لیے کہ اسے میرا ذاتی خیال نہ سمجھا جائے ملا عبد القادر بداؤنی جو شیر شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے ہیں ان کی بجنسہ عبارت درج کرتا ہوں۔ یہ لکھ کر مولانا رفیع الدین صفوی جنہیں سکندر لودی نے "الحضرۃ القدسیہ" کا خطاب دے رکھا تھا، آگرہ میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے۔ شیر شاہی عہد میں انہوں نے بادشاہ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ حجاز میں قیام کرنا چاہتے ہیں جس کی اجازت دی جائے۔ جواب میں شیر شاہ نے کہا شمارا بہ مصلحتے نگاہ داشتہ ام وآں این است کہ داعیہ (ارادہ) دارم کہ در اندک فرصت بعون اللہ تعالیٰ وتقدس عرصہ دلکشائے ہندوستان را از خار کفر پاک ساختہ وچند قلعہ کہ ماندہ عنقریب باندک توجہے تسخیر کردہ (باقی بر صفحہ ۳۹۰)

مجتہد بنایا گیا آگے بڑھایا گیا تا اینکہ وہاں پہنچایا گیا کہ اگر رحمت الٰہیہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ہاتھ مجدد الف ثانی کو پیدا کرکے نہ پکڑتی تو اس ملک میں اسلام کا نام لیوا بھی کوئی باقی نہ رہتا[1]۔ میرا تو خیال ہے کہ ملا مبارک کے لڑکوں پر ملا صاحب ہی کی اس عجیب و غریب سیرت کا یہ اثر پڑا تھا، پسر نے اسی چیز کی تکمیل کی تھی جسے پدر نامکمل چھوڑ کر چلا گیا تھا، ایک دلچسپ لطیفہ باپ بیٹوں کا وہ ہے جس کا ابوالفضل نے آئین اکبری میں ذکر کیا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ جب ملا مبارک کے نت نئے فتنوں نے مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کیا تو علماء نے اکبر تک ان کے حالات پہنچائے۔ اس وقت تک اکبر محمد اکبر تھا، اس نے گرفتاری کا حکم دیا رات کا وقت تھا فیضی کو سب سے پہلے اس حکم کی خبر ملی، اب تک ان لوگوں کی رسائی دربار تک نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال فیضی نے باپ کو اٹھایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۹) از کنار دریائے شور گذشتہ تا قزلباش و صفویہ ایران، کہ سر راہ جماعت حاج و زوار بیت الحرام گشتہ بدعتے در دین قویم و ملت مستقیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کردہ محاربہ کنم و شما را از انجا بوکالت و رسالت نزد سلطان روم فرستم تا میان من و او عقد برادر دینی و ابستہ خدمتے از در حرم زاد ہا اللہ شرفا از ذو التماس برائے من بگیرید آں گاہ من ازیں طرف و خوندگار روم از آں طرف آمدہ قزلباش را از میان برداریم و سرگاہ سلطان روم بر سر او می آید قزاق شدہ رو بایں طرف می نہد و بعد از معاودت رومی باز بہ مکان خویش مراجعت می کند، اگر از ہر دو جانب احاطہ کنیم بایں لشکر و کثرت جمعیت کہ در ہندستان ست و باں شوکت دانش باری کہ در روم است طاقت مقاومت قزلباش است معلوم ست ہر چند ملاحظہ می کنم برائے ادائے ایں پیغام غیر از شما کسے را لائق نمی بینم و عرض برائے حصول ایں مطلب دل بر رخصت شما نمی توانم نہاد (ج ۱ ص ۱۰۳) اور اس سے وہ راز سامنے آجاتا ہے جس نے قزلباشوں کو ہمایوں کی امداد پر آمادہ کیا۔ شیر شاہی حکومت ان کی راہ کا کانٹا تھی۔ اولاد تیمور کی امداد سے ان کو اطمینان تھا کہ یلدرم کی اولاد یعنی سلاطین ترکی سے یہ ساز باز نہیں کر سکتے، لیکن افسوس فلک حقہ باز نے کالنجر کے قلعہ کے سامنے شیر شاہ کے اس عجیب و غریب پروگرام کو جلا کر خاک کر دیا۔ ورنہ میں نہیں جانتا کہ اگر کچھ بھی فرصت اس بہاری بادشاہ کو مل جاتی تو جس جنگی مہارت کا ثبوت اس نے کل آٹھ دس سال میں پیش کیا تھا اُن کو دیکھتے ہوئے دنیا کے نقشہ کو کس حال میں چھوڑ کر وہ جاتا۔ ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فقیر نے ایک مستقل مقالہ لکھا ہے جس میں اکبر کے دین الٰہی کی پوری تفصیل کی گئی ہے۔ اسلام سے نفرت کرنے میں اکبر کو کہاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ حال میں ایک اور چیز اس باب میں ملی جو باعث عبرت ہے۔ راجہ سانبھر کا بیٹا منوہر نامی نے فارسی میں بہت اچھی دستگاہ پیدا کی تھی، توسنی تخلص کرتا تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا، اکبر اس کو بہت مانتا تھا۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے: صاحب حسن غریب و ذہن عجیب است، محبت کی وجہ سے اکبر شروع میں اس کو محمد منوہر کے نام سے پکارتا تھا لیکن جب اس کا دوسرا رنگ ہوا تو بجائے محمد منوہر کے مرزا منوہر نام رکھا گیا۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ منوہر کا باپ راجہ سانبھر جس کا لون کرن نام تھا، باوجود کفر شرف و افتخار و مباہات ہمیں محمد منوہر می گفت نہ کا فر تو اس پر فخر و مباہات کرتا تھا۔ اور جو ہمایوں کے گھر پیدا ہوا تھا اس کو اتنا برگردہ کیا گیا کہ "ہر چند مخفی

اور مشورہ دیا کہ گھر سے نکل کر کہیں روپوش ہو جانا چاہیے۔ فیضی کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر تجربہ کار بوڑھے باپ نے تسلی دی اور کچھ صبر و توکل وغیرہ کی تلقین کی۔ اس وقت فیضی نے اپنے باپ سے جو بات کہی وہ یہ دلچسپ فقرہ ہے: "کار معاملہ دیگر است و داستان تصوف دیگر"

ان لوگوں کے اندر دین کی پرورش جس رنگ میں ہو رہی تھی اس کا اندازہ اسی فقرہ سے ہو جاتا ہے۔ تصوف کی تعریف انہی لوگوں نے یہ کی ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ملا عبدالقادر کی یہ چشم دید گواہی اگر جھوٹی نہیں ہے کہ فیضی نے جو تفسیر لکھی تھی کہ العیاذ باللہ۔

درایں حالت مستی وجنابت می نوشت وسگاں آں را از ہر طرف پائمال می ساختند (ج ۳ ص۳۰۰)

ان بدبختوں کا دین ان کا تصوف ان کا علم نہ دین ہوتا ہے نہ تصوف اور نہ علم بلکہ "اکل" کی جہاں بیسیوں شکلیں ہیں، کور نصیبوں کا یہ گروہ اسی کی ایک "شکل" اپنے علمی و دینی سرمایہ کو بنا لیتا ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ فیضی و ابوالفضل، ملا مبارک، قاضی بدخشی جیسے لوگ پرانی تعلیم سے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ واقعات کا بھلا کون انکار کر سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ابتداءِ اسلام سے اس وقت تک کا یہ تجربہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک

لہ ملا صاحب نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ "بادشاہ بہ عیادت او (فیضی) در دم اخیر رفتند بانگ سگ برمے آورد" یعنی بحران اور بیہوشی کی حالت میں کتے کی آواز منہ سے نکال رہا تھا، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اکبر "ایں معنی را خود بر سر دیوان نقل می فرمودند" یہ بالکل ممکن ہے کہ آخر زندگی کے ان ہی دردناک تجربوں نیز ان بیٹوں (دانیال و مراد) کا شراب خواری کی لت میں گرفتار ہو کر عین شباب میں یکے بعد دیگرے اکبر کے سامنے مرنا جس میں نہ جوگ کام آیا اور نہ کایا پلٹ کے بلند بانگ دعوے، جہانگیر کا بھی شراب میں استغراق اور اس کے ساتھ علانیہ بوڑھے باپ سے سرکشی یا اور اسی قسم کی بیسیوں ناکامیاں اکبر پر اثر انداز ہوئی ہوں، پنڈتوں کے مواعید کہ آپ کی عمر ہزار سال کی ہوگی ان کا جوتش یہی کہتا تھا۔ ان سب کا راز کھلا ہو گا اور وہ غرور و استکبار جو ابتدائی زندگی کی غیر معمولی فاتحانہ کامیابیوں نے اس میں پیدا کر دیا تھا اس کا نشہ ہٹا ہو گا، کہنے والے جو کہتے ہیں کہ آخر میں اس کی زندگی میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی کچھ عجب نہیں کہ ایسا ہوا ہو۔ اس کے قرنار ابوالفضل، بیربر نامرادی کی موت سے مر چکے تھے اب ورغلانے والا بھی تو کوئی باقی نہ رہا تھا۔ کوئی مارا گیا کوئی گم ہو گیا کوئی خون تھوک تھوک کر دنیا سے روانہ ہوا۔ اکبر اب تنہا تھا، نورتن کے ایک ایک رتن جدا ہو چکے تھے

Marfat.com

نہ علم و دین کے خدام کا ایک طبقہ ایسا باقی رہا ہی جس کا دامن اس قسم کے دنی چھچھورے اغراض سے پاک تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ایک ایسے نظام تعلیم کے مرج کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جس میں کام کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت کے سامنے مزد اور صلہ کا سوال کبھی نہیں آیا، میں یہ مانتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ کہ قرآن و حدیث کی تعلیم و تبلیغ پر معاوضہ لینا ناجائز ہی، عملاً مسلمانوں میں امام کا یہ فتویٰ مقبول نہ ہو سکا، مجبوراً خود حنفی علماء کو دوسرے ائمہ کے نقطۂ نظر ہی کی پناہ ڈھونڈھنی پڑی، لیکن باوجود فتوئی جواز کے ایک معقول تعداد ہمیشہ ان لوگوں کی پائی گئی، جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ معاشی ضرورتیں جب دوسری راہوں سے پوری ہو رہی ہیں تو تعلیم و تعلم کے کاروبار کو رضاکارانہ طور پر انجام دینے کے لیے اُنھوں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔

اس سلسلہ میں موروثی روایات اور ماحولی آثار کا ہی یہ نتیجہ تھا، ہندوستان میں جب حکومت پر زوال آیا، اور دوسری سلطہ حکومت نے پُرانی تعلیم کی سرپرستی کو ترک کر کے ملک میں جدید جامعاتی نظام تعلیم کو مرج کیا، تو باوجودیکہ اس تعلیم کا مسلمانوں کے دینی علوم سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن محض اس لیے کہ اسکول اور کالج میں پڑھنے والے طلبہ بھی طالب العلم ہی کہلاتے تھے، شروع شروع میں مسلمان اپنے پُرانے دستور کے مطابق ان طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بغیر کسی معاوضہ کے اپنے گھروں میں کرتے تھے، اور صوبوں کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن صوبۂ بہار کے متعلق تو میں کہہ سکتا ہوں کہ بیس پچیس سال پیشتر تک شہروں اور قصبوں میں شاید ہی کسی مسلمان وکیل[1]

---

[1] پٹنہ میں خان بہادر مولوی محمد حسین وکیل مرحوم جو آخر میں بہار گورنمنٹ میں تعلیمات کے وزیر بھی ہو گئے تھے کم از کم تیس پینتیس سال تک میں نے ان کو دیکھا کہ دس بارہ طالب العلموں کو وہ اپنے یہاں کھانا بھی دیتے تھے اور رہنے سہنے کا ان کے نظم بھی فرماتے تھے، خدا ہی جانتا ہی کہ اللہ کے اس بندہ کی خاموش امداد نے کتنے غریبوں کو بی اے اور ایم اے پاس کرنے کا موقع دیا ان کی وجہ سے کتنے غریب مسلمان خوش حال زندگی تعلیم پانے کے بعد گذار رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ منفرد مثال نہ تھی بلکہ پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور ہر شہر میں ایسے مسلمان ارباب خیر پائے جاتے تھے اور یہ اسی پُرانے دستور کا اثر تھا۔

Marfat.com

یا مختار کا ذریعہ اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم پانے والے غیر مستطیع طلبہ سے خالی رہتا تھا، اگرچہ رفتہ رفتہ بہ تدریج زمانہ نے اس رواج کو مٹانا شروع کیا اور اب اس کی مثالیں کم ہوتی جاری ہیں۔ پھر بھی مسلمانوں میں ابھی اس کی جرأت نہیں پیدا ہوئی ہو کہ یورپ کے رواج کے مطابق معاوضہ لے کر اپنی فیملی میں طالب العلموں کو رکھنے کی ہمت کریں، ممکن ہو کہ کچھ دنوں کے بعد یہ حجاب بھی اُٹھ جائے لیکن ابھی لوگوں کو شرم آتی ہو کہ طالب العلم سے معاوضہ لے کر اس کو دُووقت اپنے ساتھ کھانا کھلائیں، حالانکہ سُنا جاتا ہو کہ یورپ میں بہت سے خاندانوں کی گذر بسر کا ذریعہ یہی رہ گیا ہی، بہر حال اس بحث کو اب اسی نقطہ پر ختم کرتا ہوں، اس کے بعد دوسرے حصہ میں نظام تعلیم کے دوسرے ابواب سے بحث کی جائیگی۔ ان شاء اللہ۔

تم المجلد الاوّل

○

پاک و ہند میں مسلمانوں

کا

نظامِ تعلیم و تربیت

مطلوب

حصّہ دوم

حضرت مولانا سیّد مناظر احسن صاحب گیلانی

مکتبۂ رحمانیہ

اقرا سنٹر اردو بازار

۱۸ — اردو بازار

لاہور

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلاۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

بجائے ایک جلد کے وہی کتاب جو ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں شروع ہوئی تھی دو جلدوں میں تقسیم ہو گئی۔ پہلی جلد کے بعد دوسری جلد اب آپ کے سامنے ہے۔ جنگ کی افراتفری میں جہاں دنیا کے دوسرے بڑے چھوٹے کام متاثر ہو رہے ہیں۔ اشاعت و طباعت کتب کا مسئلہ بھی حصہ رسدی کے مطابق مصائب کا شکار ہے۔ کتاب کی اس دوسری جلد کی کاپی دلی میں لکھی گئی، چھپنے کے لئے حیدرآباد آئی۔ اس طول عمل کی وجہ سے جو رکاوٹیں پیدا ہوئیں اب اُن کی تفصیل

سفینہ اپنا کنارہ جب آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

البتہ اس تگ و دو اور ذمہ داریوں کو مختلف حضرات کے سپرد کرنے کا خمیازہ کہیئے یا بجالتِ بیکسی و مسافرت اِس غریب کتاب کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ عام طباعی اغلاط کے دو جگہ ایسی ناقابلِ عفو فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ اُن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔ پڑھنے سے پہلے ہی ناظرین کو ان سے واقف کر دینا ضروری ہے:۔

ملاحظہ ہو کتاب کا صفحہ ۲۰۹ اس میں ایک روایت کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ کس کتاب کی یہ روایت اس کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے لیکن بحمد اللہ بعد کو امام بخاری کی کتاب ادب المفرد میں وہ روایت مل گئی، اس لئے پہلی عبارت کو قلمزد کر کے کتاب کا حوالہ دے دیا گیا لیکن کاتب صاحب کی مہربانی کہ انھوں نے اُسے قلمزد نہیں فرمایا، گویا روایت کے مل جانے اور نہ ملنے کا ذکر اس میں درج کیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۳۹۳ میں ایک نوٹ جس کا اندراج حاشیہ میں ہونا چاہیئے تھا، کاتب صاحب نے اصل کتاب کی عبارت میں اس کو اس طرح شریک کر دیا ہے کہ مضمون ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ اربابِ نظر سے توقع ہے کہ ان غلطیوں کو معاف فرمائیں گے۔

باقی عام غلطیوں کے متعلق کیا لکھا جائے۔ غلط ناموں کا اضافہ عموماً مفید ثابت نہیں ہوا ہے مشکل ہی سے پڑھنے والے ان سے نفع اُٹھاتے ہیں، کاغذ کی گرانی کے اس زمانہ میں اس لئے اس کے اضافہ کی ہمت نہ ہوئی۔

کتاب کی پہلی جلد کو پڑھکر مختلف دوائر اور حلقوں میں اس کا جو اثر لیا گیا۔ مسکین مصنف کے توقعات سے وہ بہت زیادہ ہے۔ البتہ ترتیب، اور مضامین کا عنوانوں سے خالی ہونا اِن دونوں باتوں کی بجا شکایت لوگوں نے ضرور کی ہے لیکن کن مجبوریوں سے یہ نقائص رہ گئے ہیں، اب اسے کیا بتایا جائے۔ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ ان

کوتاہیوں کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ خصوصاً ذیلی عنوانوں کا اندراج اصل کتاب میں اور ان ہی کے اعتبار سے مفصل فہرست کا شروع میں اضافہ بہت ضروری ہے۔ البتہ ترتیب مضامین کے متعلق تصنیفی نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی، اس میں آورد کی بدمزگی کے ساتھ آمد کا لطف جاتا رہے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو ان کے لئے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ آب پاشی کی رپورٹ، یا بنیوں کا مدواری کھاتہ ان کو بنا دیا جائے ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے اسی حال میں اس کو چھوڑ دیا جائے۔ لاکھوں مرتبہ کتابوں کے ساتھ آخر کیا بگڑے گا اگر ایک غیر مرتب کتاب بھی لوگوں کے سامنے ہو۔

منجملہ دیگر اہم مقاصد کے جو اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کے پیش نظر تھے۔ بڑا مقصد "نظام تعلیم کی وحدت" کے نظریہ کو پیش کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض ممتاز مفکرین اور ارباب سعی وعمل نے اسے مستحق توجہ قرار دیا ہے۔ بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی نے خصوصیت کے ساتھ مختصر لفظوں میں خاکسار مصنف سے چاہا کہ "اس تعلیمی خاکے" کو مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کروں۔ سید صاحب موصوف نے "معارف" ماہ جولائی ۱۹۲۵ء میں شذرات کے تعارفی نوٹ کے ساتھ اس خلاصے کو شائع بھی کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اس جلد کے ساتھ اس خلاصہ کو بھی اس کا ضمیمہ بنا دیا جائے۔ جو یہ ہے:-

ضمیمہ

مسلمانانِ ہند کا

نظامِ تعلیم و تربیت

(از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مشکلات ہی کا حل میری کتاب نظام تعلیم تربیت میں پیش کیا گیا ہے۔ جو سالہاسال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے۔ چونکہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی ہے اسلئے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ابتداہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمان رہتے ہوے او حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کی آبیاری کرتے ہوئے مسلمان کسطرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سر دست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ جن مشکلات کے تصور نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے وہ کیا ہیں۔

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہو جانے کے بعد حکومت مسلّطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے قایم کیا مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلام اور اسلامی زندگی سے بعد پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے؛ ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں، یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا سا

Marfat.com

تھا لیکن وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے' ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو' وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے' یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہو تو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائیگی'

(۲) حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے' اس وقت تک تو اس تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کر رہی ہے' لیکن وہ دن دور نہیں ہے' کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائیگا کہ حکومت کے منظورہ نصاب کی تعلیم لزوماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے' جسکے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے' تعلیم کی وسعت اور اسکا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائیگا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہو کر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

(۳) مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہونچنے کے بعد کیا ہے' اور یہ بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے بعد ممکن ہے' لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کریگا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

دراصل یہی تین باتیں ہیں جنھیں دیکھ دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین بے چین ہیں خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر رہا ہے' تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں' یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں ان سے بحث میں طوالت ہو گی' اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب تعلیم و تربیت میں میں نے کیا ہے ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومت تسلط) کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں اس کی دوئی اور اثنینیت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے اسی لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے

رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومت مسلطہ سے قبل مسلمانان ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا۔ عام طور پر "درس نظامیہ" کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر و انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی ابتداء سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی۔ اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے) حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو بظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ لیکن ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ حکماً و عملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے خیرآبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ بیضاوی کا جزو نصاب تھا۔ لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی تو مطلب کیا ہوا؟ یہی نا کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرانے کیلئے کافی سمجھا جاتا تھا ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلباء جو کچھ پڑھتے تھے فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا یعنی علم کلام، اور علم اصول فقہ معانی و بیان وغیرہ ان ہی علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا جن میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس

Marfat.com

سے متجاوز بھی۔

میں نے بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کیلئے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے،

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی، ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم۔ ملاہی مسٹر ہونگے، اور مسٹر ملا، عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے "نظریۂ وحدت نظام تعلیم" کے نام سے اپنی کتاب میں میں نے پیش کیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں میری تجویز پر جو شبہات کئے جاتے ہیں، ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائیگا، پہلا شبہ یہ ہے، کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لئے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اسی کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لئے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت

رکھتا ہے۔ یعنی اسی پچاسی فیصدی الفاظ اس حصے کے اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں، چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے، البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت و عہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات و مسامرت و انشاء خالص ادبی نثر و نظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے۔ لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر و اختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے، میری گفتگو صرف عام و لزومی واقفیت تک محدود ہے، درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت و مناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت و مناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں؛

باقی تبحر و اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لئے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی، جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے وہی طرز عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں بلکہ طبعاً اختیار کرنا چاہیے،

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا، پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو تو کیا ان کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا مناسب ہوگا، علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے، خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح و توضیح کے لئے ایجاد کیا تھا مثلاً اصول فقہ، کلام یا بیان و معانی و بدیع وغیرہ کا جو حال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں جواب دیا ہے۔ کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہوگا، کچھ لوگوں کا

Marfat.com

پڑھنا پڑھانا ان کی بقاء اور ارتقاء کے لئے کافی ہے،

بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ ان کو وہی اختیاری مضامین میں شریک کرکے زندہ رکھا جائے لیکن ہر مسلمان کو مسلمان باقی رکھنے کے لئے خصوصاً موجودہ حالت میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لزومی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے بعد اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائے گی؟ کیا ان کا جو ماحول ہے اسی کے سمی اثرات کے ازالہ کے لئے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلاشبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے، ماحول حکومت کے نقطۂ نظر کا تابع ہوتا ہے جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر و عزت کی توقع غلط توقع ہے لیکن پھر کیا کیا جائے کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو اسی کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مولانا محمد علی مرحوم ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے، ہو سکتا ہے کہ قرآن کی، پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے۔ سب کو نہیں تو بعض کو تو انشاء اللہ ضرور متاثر کرکے رہے گی اور ان بعض کا اثر انشاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبا کیلئے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کئے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے گا تو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت

Marfat.com

یہ بھی ہو سکتی ہے۔

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جوامع اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پا سکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں ان میں جب جدید نصاب کو جاری کر دیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں، جدید علوم و فنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لئے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کئے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں کا کرتے ہوں، بحمد اللہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہو چکی ہے تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی ملیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل علم کا تقرر کر کے ہم خود اپنے یہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں، جو آگے چل کر خود ہمارے قدیم علوم و فنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلمین کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں"

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے، اس کا پیش کرنا ہے،

میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیے لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہئیے، کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے، اور اسی طرح آشنا کیا جائے، کہ جیسے اس وقت کیا جاتا ہے پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے، جیسے اب تک رواج ہے، قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خط نستعلیق[1] سے بھی ان کو آشنا کیا جائے، یعنی

---

[1] نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لئے نسخ کے حروف کو اردو کے لئے تسلیم نہیں کیا گیا ہے اگر یہ مسئلہ طے ہو گیا تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہے گی البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیے، انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدلی ہوئی ہے، یہی طرز عمل ہم بھی اختیار کریں گے، نسخ طباعت کے لئے اور نستعلیق کتابت کے لئے ۱۲۔

اردو پڑھائی جائے، اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے، اور آئندہ اردو کو چھوڑ اکر فارسی کے آمدنامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ لگا دیا جائے، یہی عربی پڑھتے ہوئے بی۔ اے تک پہونچے گی، اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درسِ نظامیہ والی کتبِ ثلثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی، عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا، میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے کہ ہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے، البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں، اگر عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا،

(۱) تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقے سے پہونچانا چاہئیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کرلیں، اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعۂ حدیث کی پڑھادی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنے معلومات حاصل کرلینا چاہئیے جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے میں کرتا چلا آرہا ہوں ان میں سے قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہئیے لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے، مقصود معیار کو تعین کرنا ہے، یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث وفقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہئیے، املاء کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ کتاب کے ذریعے سے زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقے کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے۔

(۲) میرا خیال ہے کہ وحدتِ تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کر لیا جائے تو عربی کے عام مدارس کو مدارسِ فوقانیہ (ہائی اسکول) کی شکل میں بدل دیا جائے، جن میں دینیات کی تعلیم صرف قرآن

Marfat.com

قرآن پڑھانے تک ختم ہو جائے گی البتہ بعض بڑے تعلیمی مراکز ان کے تحتانی درجوں کو تو ہائی اسکول کی حیثیت دے دی جائے اور ان بڑے مراکز میں سے مختلف مرکزوں کو مختلف دینی و اسلامی علوم کی تکمیل کی تعلیم گاہ بنا دی جائے جہاں عام یونورسٹیوں کے فارغ شدہ طیلسانیوں کو دینی علوم میں سے کسی خاص علم مثلاً تفسیر یا حدیث یا فقہ یا کلام میں اعلیٰ تکمیلی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہو، ہو سکتا ہے کہ تفسیر کے لئے ندوہ کو اور حدیث کے لئے دیوبند کو مختص کر دیا جائے اور فقہ کے لئے فرنگی محل میں کوئی تکمیلی ادارہ قائم کیا جائے۔ کلام اور تصوف کے لئے اجمیر شریف میں انتظام کیا جائے، جہاں اسوقت بھی سرکار نظام کی طرف سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں جن باتوں کا اجمالاً تذکرہ مقصود تھا وہ ختم ہو چکیں، آخر میں یہ بھی کہدینا چاہتا ہوں کہ بعضوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے اس تعلیمی مطالبے کو کیا تسلیم کرے گی؟ اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک مطالبوں کے تسلیم کرنے پر اس زمانہ میں جب حکومت کو مجبور کیا جا سکتا ہے، تو مسلمانوں کا صرف اتنا مطالبہ کہ ایسی تعلیم جو تبدریج ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی چلی جارہی ہے، اس تعلیم میں اتنی ترمیم کر دی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے اس سیلاب کا انسداد ممکن ہو جائے، تو یقیناً کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے، جسے خواہ مخواہ حکومت مسترد کرنے پر ضد کرے گی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کو حیلہ بنا کر پیش کیا جائے۔ لیکن اس حیلہ کا جواب با آسانی دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹنہ یونورسٹی میں یہ تحریک جو ہندو لیڈروں نے پیش کی تھی، پاس ہو گئی ہے، کہ سنسکرت زبان کی تعلیم ہندو طلبہ کے لئے لازم کر دی جائے۔ گو مسلمانوں کی طرف سے کوئی بولنے والا کھڑا نہ ہوا، لیکن تعلیمی وزن کو برابر کرنے کے لئے مسلمان طلبہ پر بھی ان کی کلاسیکل زبانوں (عربی و فارسی) میں سے کسی زبان کا لینا ضروری قرار دیا گیا ہے نہ جاننے کی وجہ سے کہئے یا خود مولویوں کی طرف سے عربی کی دشواری کی غلط شہرت، عموماً بجائے عربی کے فارسی ہی کے لینے پر طلبہ کو سنا ہے کہ آمادہ کر رہی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے اور

Marfat.com

جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہونچی ہے اس میں شک کی بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تو یوں سمجھئے کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں، حکومت اس مطالبہ کو منظور کر چکی ہے کلاسیکل زبانوں کی تشریح و تفصیل خود ہم مسلمانوں کو اسی شکل میں کرنا چاہیے۔ جس کا ذکر اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے، جس میں اردو فارسی و عربی تینوں زبان کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کی عملی شکل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم بغیر کسی کش مکش کے بآسانی حل کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل بچوں کو پڑھائی جائے۔ بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لئے ضرورت ہے فارسی سے مناسبت پیدا کرانے کی اور فارسی میں قوت وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کے پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی، اور فارسی کے بعد عربی سے طلبا کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔ یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر بے خطا نسخہ ہوگا۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائینس و کیمیا وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی ناممکن ہے۔ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے۔ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس جو عموماً اس وقت شہروں اور قصبوں میں قائم ہیں ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم و فنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لئے بنا لیا جائے۔ اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس

Marfat.com

مدارس کو قرار دیا جائے

اِس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سیکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول موجود ہیں، لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صرف صفر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس مناسبت سے اُن کی تعداد بڑھ جائے۔ کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم و فنون کی تعلیم کو قبول کرلینے کے بعد حکومت کا محکمۂ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے اِن دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کرلیں گے کہنے کو تو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے، لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہونگے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دَور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گذرے گا۔ باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہوگئی۔ لیکن کیا کروں ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنی بات جس پر اپنی کتاب میں مَیں نے کافی بحث کی ہے، اور بھی کہہ دینی چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کرکے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائیگا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہوگئی ہے۔ روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اس کا خاتمہ نہیں ہوسکتا،

Marfat.com

آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہو رہے ہیں، لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لیے پیدا ہو جائیں کہ مذہب کے نمایندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمایندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے (لا فعلہ اللہ) میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا جو دیا جا رہا ہے، کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے۔ اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے، کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے۔ جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہو جائیگی

یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن و حدیث سے واقف بنانا

دادن تیغے بدستے راہ زن

کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے! یہ ظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیئے، تجربہ اس کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی و صحت کے نقطہ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور اسی لئے

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا خطرہ غلط نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچکر علت کی شکل نہ اختیار

Marfat.com

کرے۔ لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی اُلجھے ہوؤں میں سے انشاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے، اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی انشاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہرحال مذہب اور مذہبی تعلیم عمومیت سے گریز میرے نزدیک تو برہمنیت ہے، اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اسکی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو، اس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کردیں، اپنے آخری دین کی بہرحال وحفاظات فرمائیگا۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
جماعت بندی اور اس کے فوائد و نقائص	۹
کم وقت میں زیادہ تعلیم	۱۲
نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور ایک مصری مورخ	〃
قاری عبدالرحمٰن پانی پتی و نواب فضیلت جنگ رحمۃ اللہ علیہما کی شہادتیں	۱۳
ایک ہی کتاب چند مقامات سے	۱۳-۱۴
اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلقات	۱۵
حکیم الملک گیلانی اور طلبہ	〃
حکیم مولٰنا برکات احمد ٹونکی و طلبہ	۱۵-۱۶
ملا محمود جونپوری کی موت کی خبر سے استاذ الملک کا عجیب تاثر اور موت	۱۶
طلبہ کے لئے مولٰنا برکات ٹونکی کا اپنی اہلیہ کا زیور فروخت کرنا۔	۱۶
مولانا احمد الدین بگوی و طلبہ	۱۶
مولٰنا عبداللہ بداؤنی کے متعلق ملا عبدالقادر بداؤنی کی شہادت	۱۷
مولانا عبداللہ بداؤنی کا بازار سے خود سودا سلف لانا	۱۸
دارالعلوم دیوبند کے مفتیِ اعظم مفتی عزیزالرحمٰن کا محلہ کی بڑی بوڑھیوں کا سودا خود بازار سے لانا۔	۱۸
قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کا طلبہ سے کام لینے میں احتیاط کا عجیب واقعہ۔	۱۹
قاری عبدالرحمٰن کے تلامذہ مولانا حالی وغیرہ	〃
مذہب بدلنے کی رشوت اور قاری صاحب کا اس سے اعراض	۲۰
عہد اکبری کے ایک عالم ملا علاء الدین اور طلبہ	۲۱

مضمون	صفحہ
مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی اور طلبہ	۲۲
مولانا بحرالعلوم اور بہار	۱۲
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار اور طلبہ	۲۳
ملا عبدالنبی احمد نگری اور طلبہ	۲۴
نواب فضیلت جنگ اور طلبہ	〃
طلبِ علم کا شوق اور ولولہ	〃
مولانا سید محمود اصغر بلگرامی	〃
دس میل پر وطن لیکن برسوں وہاں نہ جانا	۲۵
مولانا غلام علی اور طلب علم میں ان کا شوق بے پروا وطن سے ہجرت	〃
مولانا غلام علی آزاد اور عساکر آصفی	۲۶
مولٰنا غلام علی کا عساکر آصفی کے ساتھ بھوپال میں مرہٹوں سے جہاد۔	۲۷
حضرت آصفجاہ اول اور مولانا غلام علی	〃
سفر حج کے مصارف کی دربار آصفی سے منظوری	〃
سرزمین حجاز میں مولانا غلام علی کے مشاغل	〃
روضۂ طیبہ پہ بخاری کا مطالعہ	〃
خواب میں جمال جہاں آرا محمدی سے مولانا غلام علی کا مشرف ہونا	〃
علامہ سندھی سے مولانا آزاد کی سند حدیث	۲۸
شیخ علی بن محمد جیولنسوی کی طلب علم میں صحرا نوردی	〃
سندھ سے ملتان، ملتان سے بہار، بہار سے پراگ	〃
شیخ منہاج الدین حسن بہاری سے شیخ علی بن محمد کا استفادہ	〃
شیخپورہ (حاشیہ)	〃

Marfat.com

شیخ شعیب بہاری اور اُن کی کتاب تذکرۃ الاصفیا ۲۸
شیخ علی بن محمد جھونسوی اور اشاعت اسلام ۲۹
مولانا محمد احسن گیلانی اور اُن کے طلب علم کی عبرت آموز داستان ״
مولانا محمد احسن گیلانی کے اساتذہ ״
مولانا محمد احسن گیلانی کے تصنیفات ״
رجسٹر حاضری اور ناغہ ۳۰
مولانا برکات احمد کے درس میں ناغہ کا فقدان ״
سلطان المشائخ اور شمس الملک مستوفی الممالک کا ایک قصہ "ناغہ" کے متعلق ״
شیخ محدث کے طلب علم کا حال ۳۱
ایک دیوانہ اور راجپوتانہ کی گرم زندگی (حاشیہ) ״
قاری عبد الرحمٰن پانی پتی شاہ محمد اسحاق کے درس میں ۳۲
گھوڑے میں کتاب ״
ہفتہ میں دو دن (منگل وجمعہ) کی تعطیل
خیرآبادی و ولی اللّٰہی خاندان میں ״
علم سے فارغ ہونے کی عمر کا اوسط ۳۳
ملا فیضی کی فراغت چودہ[۱۴] سال کی عمر میں ״
مولانا فضل حق خیرآبادی کی فراغت تیرہ[۱۳] سال میں ״
مولانا عبدالحئی کا حفظ قرآن اور تمام علوم مروجہ سے فراغت سترہ[۱۷] سال کی عمر میں ۳۴
شاہ ولی اللہ کی فراغت پندرہ[۱۵] سال کی عمر میں ۳۵
ملا محمود جونپوری کی فراغت سترہ سال کی عمر میں ״
مولانا بحرالعلوم کی فراغت سترہ سال کی عمر میں ״
قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی فراغت علم و طریقت سے اٹھارہ سال کی عمر میں ״
قاضی صاحب کی اسی زمانہ میں ساڑھے تین سو کتابوں کے مطالعہ سے فراغت۔ ۳۶
قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے متعلق ایک نوٹ ״
ان کے تصنیفاتِ فائقہ کی فہرست ״

تحصیل علم کے لئے عمر کی قید نہ تھی۔ ۳۶
عصری تعلیم گاہوں میں کذب بیانی پر لوگوں کو مجبور کرنا۔
تحصیل علم کے لئے عمر کی قید بے معنی ہے ۳۷
کافی عمر کے بعد تحصیل علم کے نظائر ״
مولانا محمد احسن گیلانی کی مثال ״
میر درگاہی بلگرامی کی مثال ״
مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کا عالم ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنا۔ ۳۸
مولانا عنایت رسول کے علمی خدمات ״
خطبات احمدیہ سرسید احمد خاں میں مولانا عنایت رسول کا رسالہ ״
قاضی غلام مخدوم چریاکوٹی کا عالم ہونے کے بعد سنسکرت زبان سیکھنا۔ ״
مسلمانوں میں مختلف زبانوں کے سیکھنے کا شوق۔
علامہ زین الدین عابد کا مغلی ترکی فارسی رومی عربی میں غازان خاں تاتاری کو دعا ״
ہفت زبان کا محاورہ ״
مولوی نصرت علی قیصر کا ترکی و انگریزی زبان کا سیکھنا ۳۹
امام فن مناظرہ علامہ ابوالمنصور کا عبرانی و یونانی زبان سیکھنا۔ ״
مولانا نجف علی جھجھری کا ترکی و دری زبانوں کا سیکھنا "دیزا" "رمان سفرنگ" ان کی دو کتابیں ״
بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسمؒ کا انگریزی سیکھنے کا قطعی ارادہ ۴۰
مولانا اشرف علی تھانوی کا خیال کہ فلسفہ ومنطق کے پڑھنے کا وہی ثواب ہے جو بخاری کے مطالعہ کا ״
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا عبرانی زبان سیکھنا ۴۱
ابوالفضل کا معمر ہونے کے بعد حسن موصلی سے ״

Marfat.com

ریاضی وطبعی واقسامِ حکمت کی کتابوں کا پڑھنا	۴۲
ملا عبدالقادر کا اسی زمانے میں اصطرلاب وبست باب کا پڑھنا	〃
مولوی زین العابدین آروی بہاری کا فارغ التحصیل ہونے کے بعد انگریزی سیکھنے کا عجیب واقعہ	۴۳
مولوی زین العابدین کی مشق کتابت (حاشیہ)	〃
معمر ہونے کے بعد قرآن مجید کا حفظ	〃
میر محب اللہ بلگرامی کا قرآن یاد کرنا	〃
مولٰنا معین الدین کڑوی اور حفظ قرآن	〃
مولٰنا احمدی فیاض امیٹھوی کا بحالتِ علالت حفظ قرآن	〃
مولانا فضل حق خیرآبادی کا آخر عمر میں حفظ قرآن	۴۴
مولوی روح اللہ کا تیس دن میں قرآن حفظ کرنا	〃
مولٰنا عبدالحیؒ استاد جامعہ عثمانیہ کا معمر ہونے کے بعد حفظ قرآن	〃
مولٰنا شبیر احمد صاحب کا حفظ قرآن	〃
مولٰنا حسین احمد صاحب مدنی کا حفظ قرآن	〃
مولٰنا محمد قاسم کا جہاز پر سفر حج میں حفظ قرآن	۴۵
معمر ہونے کے بعد قرآن یاد کرنا غالباً یہی سنتِ پیغمبر وصحابہ ہے	〃
انگریزی دلی کی جامع مسجد میں پینتیس پینتیس حفاظ کی تراویح خوانی شاہ عبدالعزیزؒ کی شہادت	〃
صدر اعظم سلطنت آصفیہ نواب سر سید الملک کا حفظ قرآن اور گورنر ہوس میں تراویح	۴۶
نواب ابراہیم علی خاں والی ریاست ٹونک کا حفظ قرآن	۴۶
نواب سعادت علی خاں والی ٹونک کا حفظ قرآن	〃
محمود بیگڑہ بادشاہ گجرات کے شاہزادے کے حفظ قرآن کا عجب واقعہ	〃
علم کے خطرناک پہلو کا قرآنی علاج	۴۷
سورۂ اقرا کی ابتدائی آیتوں کا عمیق مضمون	〃

علم سے طغیانی کا پیدا ہونا	۴۷
عالم کا اپنے آپ کو مستغنی پانا	۴۸
ان الی ربک الرجعٰی کے علاج کا مطلب	〃
پیری مریدی کا مقصد	〃
ہبوطی زندگی میں آدمی کی نجات کی قرآنی راہ	۴۹
ہندوستان کے تعلیمی نظام کا سب سے بڑا آخری عنصر	〃
ہندی علماء کے خصوصیات مولانا غلام علی آزاد کے الفاظ میں	〃
صوفیہ اور تصوف اور لفظ صوفی	۵۰
صفا اور لامہ میں مناسبت	〃
ہندی تصوف اور ہندوستانی صوفیہ	۵۱
ہندی تصوف اور جوگیانہ زندگی فلسفہ ویدانت	〃
ہندوستان کا یوگا	〃
یوگا کے نتائج	〃
ہندوستان کا روحانی افلاس اور مادی مسکنت	〃
بھوتوں پریتوں، ٹوٹکے، فال، جنتر، منتر وغیرہ اوہام کا ملک	۵۲
کیا ہندی صوفیاء نے جوگیوں کے علم سے استفادہ کیا ہے؟	〃
سلطان المشائخ کی ایک شہادت	۵۳
شیخ صفی الدین گازرونی اور ایک جوگی	〃
جوگی کا طیران۔ شیخ کا عجز کے بعد قوی ہونا	۵۴
اسلامی صوفی کی کرامتوں اور جوگیہ کے اعمال میں اساسی فرق	〃
جوگیہ کا ہندوستانی صوفیہ سے استفادہ	۵۵
شیخ کبیر شکر گنج کے دربار میں جوگی	〃
ایک جوگی کا جوگیانہ علم	〃
ہم بستری کی صحیح تاریخوں کا علم۔ شیخ زکریا ملتانی اور بابا فرید کی مجلسوں کی خصوصیت (حاشیہ)	〃

Marfat.com

سلطان المشائخ اور دہی جوگی	۵۶
شیخ کبیر شکر گنج کا کشفی اشارہ	”
نصیر طالب العلم اور جوگی سلطان المشائخ کا بیان	”
بال بڑھانے کا نسخہ	”
جوگیوں کے عام علوم	”
جوگی اور سلطان المشائخ کا ایک صوفیانہ مسئلہ پر مکالمہ۔	۵۷
ایک برہمن کا ذکر سلطان المشائخ کی مجلس میں	۵۸
شاہ شرف الدین یحییٰ منیری اور ایک بدھسٹ بیراگی کے متعلق چشم دید شہادت	۵۹
ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم ابوالفضل کے نزدیک (حاشیہ)	”
اردو کی قدامت	۶۰
ہندوستان کے خواجگان چشت	
خواجۂ اجمیری کی ذات بابرکات	۶۱
مختلف ممالک میں مختلف خانوادۂ تصوف کا اثر	”
ہندوستان اور چشتی خانوادہ	”
قادریہ سلسلہ کی عمومیت دنیائے اسلام میں	”
قدمی علی رقبۃ کل ولی کا ایک مطلب	”
چشتی صوفیہ اور غنا، و مزامیر، اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث	۶۲
ہندوستان کی گانے بجانے سے فطری مناسبت	۶۳
یورپ اور راگ باجہ	”
مسلمانوں میں فن موسیقی کس راہ سے آیا؟	”
تبلیغ اسلام راگ باجے کے ذریعہ	۶۴
ہندو قوم اور اس کے متعلق سلطان المشائخ کی تجربی رائے۔	”
مذہب کی تبلیغ کی دو راہ	”
برہمن اور فلسفہ اور ان کے فلسفی ہونے کی وجہ	”
اپنشد ہندو مذہب کا فلسفہ ہے	۶۵
خوارق و کرامات کے قصوں سے مذہب کی تبلیغ	”

ہندوؤں میں خوارق و محیر العقول انسانوں کی کثرت	۶۵
مہابھارت کے عجائب و غرائب	”
ہندوؤں کے حال پر سلطان المشائخ کا بے اختیار گریہ	”
پرانوں کے قصے	۶۶
فلسفہ کی حقیقت	۶۷
ہندوؤں کے پیشواؤں کا اخلاقی و مذہبی رسوخ	”
پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کی شہادت	”
اسلام کے سوا "یقین" کی قوت تمام مذاہب کھو چکے	۶۸
یورپ کا ایک بڑا احسان	”
فلسفۂ تشکیک کی پوری تنقیح (نوٹ)	”
معمۂ ہستی اور اس کے حل سے مایوسی	”
اس معمہ کے حل کی واحد راہ تاریخ کے نامعلوم ایام سے	”
مذاہب میں غیر خدائی عناصر کا امتزاج	”
اسلام اور مسلمانوں کے دین کی واحد خصوصیت	۶۹
نہ صرف اخلاقی بلکہ تمام عباداتی عناصر کا مذاہب عالم میں اشتراک	”
"ذلک الکتاب لاریب فیہ" قرآن کا کھلا چیلنج تمام دنیا کی لائبریریوں کے مقابلہ میں (نوٹ)	”
"ہردوار" میں ہر کی پیڑھی کے متعلق مولانا محمد یعقوب سابق صدر دارالعلوم کا مکاشفہ (نوٹ)	۷۰
توحید کا عقیدہ فطرت انسانی کا جبلی اور اٹل ہے	”
مشرقی و مغربی پیغمبروں کی طرف قرآن کا اشارہ برہمن ابراہیمی ملت کی طرف منسوب ہیں۔	”
شیخ عبدالکریم جیلی کا خیال	۷۰
قرآن سر مو تفاوت کے بغیر اسی حال پر باقی ہے جس حال میں پیش ہوا	۷۱
ایک برہمنی عالم کا عجیب فقرہ	”
اپنے اصلی حال پر قرآن کے باقی رہنے کا کھلا ہوا	”

Marfat.com

تاریخی سبب	۷۱
قرآن کسی نئے دعوے کا مدعی نہیں ہے	۷۲
وہ غیر فانی صداقتوں کا محافظ اور داعی ہے	״
رازِ حیات کے بنیادی سوالوں کا قطعی جواب صرف قرآن سے مل سکتا ہے	״
دوسرے ادیان و مذاہب کے مشتبہ علم کو قرآن یقینی بنا دیتا ہے	״
کسی سچے مذہب کے پیرو کو اس مذہب کے داعی سے قرآن چھڑاتا نہیں بلکہ ملاتا ہے۔	״
یورپ کا ایک بڑا ظلم "کلچر" کا لفظ	۷۳
قرآن کے محوری مضامین	״
علمی زندگی کی استواری علمی رسوخ کی استواری پر مبنی ہے	۷۴
ہندو قوم میں اسلام کی تبلیغ کا واحد ذریعہ سلطان المشائخ کے نزدیک	״
مولانا عبید اللہ سندھی اور تبلیغ اسلام	۷۵
عہد حاضر میں تبلیغ کا چرچا حکومت سر شماری پر مبنی ہے۔	״
مغربی عیسائیوں کی تبلیغ کا طریقہ مسلمان کیوں اختیار نہیں کر سکتے؟	۷۶
خواجگانِ چشت کا محورِ عمل	۷۶
چشتی طریقِ سلوک کے متعلق نیا لیکن صحیح دعویٰ	۷۶
مشائخ چشت کی نگاہوں میں علم کی اہمیت	۷۷
سلطان المشائخ کا قول	״
"مرد درویش را قدرے علم باید" شیخ کبیر شکر گنج کے اس قول کا مطلب۔	״
تجوید کے ساتھ سلطان المشائخ شیخ کبیر شکر گنج سے قرآن کی تعلیم	״
اس تعلیم کا طریقہ سلطان جی کا ذاتی بیان	״
ولا الضالین کے ادا کرنے کا طریقہ	۷۸
سلطان المشائخ کی مجلس میں اہل علم کا درجہ	״
مجدد اور متنعم کی اصطلاح	۷۸
دلی میں عالم اور غیر عالم طبقہ میں وضع کا امتیاز	״
علوی سادات دو گندھی ہوئی چوٹیاں لٹکاتے اور عوام ایک	״
سلطان جی بھی جوانی میں مجدد رہتے تھے	״
علم کے ساتھ مشغولیت کی حد	״
سلطان جی کے یاروں کا علمی بحث کی اجازت خواہی	״
سلطان جی کی برہمی	۸۰
علمی مشغولیت اور کتب بینی کے متعلق سلطان جی کا ذاتی حال	۸۱
غیر نافع علوم	״
امام غزالی کا نظریہ	۸۲
اختر شماری اور سنگریزہ شماری میں مساوات	״
شیخ کبیر سے علمی مشغولیت کے متعلق سلطان جی کا سوال اور اس کا جواب۔	۸۲
نقصان رساں علوم اور علم کا غلط استعمال	۸۳
شیخ کبیر کا اپنے ایک ہم درس مولوی سے مکالمہ	״
عہد حاضر میں دینی علوم کا ہندوستان میں غلط استعمال	۸۴
خود رائیوں کا ایک طوفان	״
عمل کے لئے دینی علوم کی کافی مقدار	״
عربی ادب کی تعلیم پر بے جا زور	״
قرآن کے ۹۰ فی صدی الفاظ کو اردو بولنے والے مسلمان بے سیکھے جانتے ہیں	۸۵
سورۂ فاتحہ میں کل چھ الفاظ اردو سمجھنے والوں کے لئے نامعلوم ہیں	״
صرفی قواعد پر غیر ضروری زور	״
صرف کا موجودہ علم اشتقاق کبیر (ایٹیمالوجی) کی ایک شکل ہے	״
اردو زبان کی بعض صرفی تبدیلیاں	۸۶
تجارت ملازمت کے لئے تعلیم کی مدت میں درازی	״

Marfat.com

گیلانی کے ایک گرد کا قصہ ۸۶
ارباب تحقیق قرآن و حدیث کے الفاظ کی کافی ۸۷
تنقیح کر چکے ہیں ۸۷
حدیث کے درس میں غیر ضروری تکلفات ۸۸
حدیث میں پڑھانے کی چیز سیرت کا حصہ ہے ״
فقہی ابواب کی حدیثوں کو ائمہ اسلام منقح
کر چکے ״
حدیث کی ایک کتاب درس کیلئے کافی تھی ״
بعض گزشتہ مباحث کا اعادہ ۸۹
وقت سے پہلے طلبہ کے سامنے اظہار فضل ۹۰
ہندوستان کے ایک مولوی جن کی تقریر
مصلی سے باہر نہیں جاتی تھی ״
دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے درس کا خاص
طریقہ اور اس کی وجہ ״
جھگڑوں رگڑوں کے لئے عقلی علوم کا میدان
زیادہ مناسب ہے۔ ۹۱
علم کی تمثیلی شکل خواجگان چشت میں ۹۱
دوسرے سلاسل و طرق والوں سے معذرت ۹۱
زندگی کا موجودہ دور خیر و شر کا مجموعہ ہے ۹۲
مشرکانہ پہلو علم میں ״
سلطان جی کی شہادت ״
علمی پندار ״
علمی پندار کے مفاسد اور اس کا علاج ۹۳
شیخ کبیر شکر گنج اور سلطان جی کی علمی پندار پر
ضرب شدید ״
ایک دردناک سانحہ ״
عوارف کے سبق میں سلطان جی کا تشدد اور
مصیبت کا آغاز ״
سلطان جی کی پریشانیاں آہ و زاریاں ۹۵
بالآخر کنوئیں میں گرنے کا ارادہ ״
صحرا نوردی ״

عتاب کا ازالہ ۹۶
شیخ کبیر کی نمائش ״
پیر مرید کا منشاط ہے ״
خلعت سے سرفرازی ۹۷
خروج پندار کے بعد سلطان جی کا حال ״
نحوی مسئلہ میں سیبویہ کا بھی شیخ کے مقابلہ
میں انکار ״
مولانا بدر الدین اسحاق کی ستائش عہد حاضر کا
معکوس فلسفہ۔ ״
مخالفت نفس صوفیانہ اصطلاح کا مطلب ۹۸
قرآن کی شہادت - آزادئ فکر و رائے ״
نفس کے متعلق عامیانہ تصور ۹۹
چراغ دہلوی کا ایک تجربی قول اصلاح نفس کے متعلق ״
سلطان جی کی اصلاح نفس کا ایک عجیب واقعہ ۱۰۰
سلطان جی کا رفیق درس عہدہ دار بن کر اجودھن میں
شیخ کبیر کا اسکے متعلق سوال ״
ابتدا میں شیخ کبیر کی معاشی تنگی۔ ״
پیلو وغیرہ جنگلی پھلوں پر گذارہ ״
بلبن شیخ کبیر کے دربار میں (حاشیہ) ״
فوج نے اجودھن کا احاطہ کر لیا ״
شیخ کبیر کی آستین - بلبن کو شیخ کبیر کی ایک ״
رباعی سے نصیحت ״
عسر کے بعد یسر - سلطان جی کے سر پر خوانچہ ۱۰۱
بر سر بازار رسوائی ״
رفیق درس حاکم کے سامنے سلطان جی کا خوانچہ بر سر حاضر ہونا ۱۰۲
رفیق درس پر حال کا طاری ہونا ״
گریہ کناں سامنے آنا - حاکم پر شیخ کبیر کا اثر ״
خوانچہ بر سر سلطان جی کی واپسی ۱۰۳
شاہ ولی اللہ کا بیان ״
مخالفت نفس کی اہمیت خاندان چشت میں ״
نفس کشی تمام ادیان و مذاہب کی مشترک بات ہے ۱۰۴

Marfat.com

نفس کشی میں غلو اور اس کے نتائج	۱۰۴
مخالفت نفس کے متعلق قرآن سے ایک غلط استدلال (حاشیہ)	"
ہندوستان اور مخالفت نفس کے فلسفہ کا غلط استعمال	"
دام مارگی فرقہ	"
اگھوری پنتھ	۱۰۵
مانگ رویا	"
مخالفت نفس کی مشق کا صحیح مقصد	"
یہ ایک سلبی مجاہدہ ہے	"
مرضیات حق پر اپنی مرضی کو منطبق کرنا اصل مقصود ہے	۱۰۶
خدا کی صحیح مرضی کو کھو دینے والی قوموں میں نفس کشی کا انجام	"
نفس کشی بعض خوابیدہ باطنی قوتوں کا ذریعہ بن جاتی ہے	"
سخت مغالطہ	"
احساسی و ادراکی قوتوں کی بیداری وصول حق نہیں ہے	۱۰۷
خوابیدہ قوتوں کو پہلوان بھی بیدار کرتے ہیں	"
حق تعالیٰ کی خالص مرضی کے قبول کرنے سے انکار کی وجہ	۱۰۸
قومی و وطنی نخوت	"
ایک بڑے دعوے کا اعلان	۱۰۹
خواجگان چشت اور قرآن	۱۱۰
خواجہ بزرگ اجمیری اور قرآن	۱۱۱
حضرت سیدنا بختیار الکاکی القطب اور قرآن	"
سلطان المشائخ کا بیان	"
حضرت خواجہ حمید الدین الناگوری خلیفہ خواجہ بزرگ اور شغل قرآن	۱۱۲
خواجہ حمید الدین الناگوری کا مختصر حال	"
دلی میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا مسلمان	"

ناگور میں خواجہ کی سادہ زندگی	۱۱۳
کل ایک بیگھہ کھیت	"
خواجہ حمید الدین کی اہلیہ محترمہ کا عجب استغنا (حاشیہ)	"
خواجہ حمید الدین کے مکاتیب	۱۱۴
سلطان المشائخ نے بھی ان کے مکاتیب کا خلاصہ تیار کیا تھا۔	"
انتخاب اور کتابوں کے خصوصی مضامین کو ظاہر کرنے کا قدیم طریقہ	"
ناگور اور ملتان کی پیداوار کا ذکر (حاشیہ)	"
شادی آباد مانڈو	"
مانڈو کا بادشاہ محمود خلجی	"
بوندی مارواڑ کا ناچ	"
حکومت مانڈو کی شہرت و عظمت	"
محمود خلجی کی علم دوستی	"
لفظ مانڈو کی تحقیق۔ (حاشیہ)	"
مالوے کے جنگل میں "یونان ثانی"۔	"
امام محمد بن حسن شیبانی کی ہندوستان میں اولاد	۱۱۶
تاج الافاضل شیبانی	"
قاضی محمد شیبانی	"
شیخ احمد محمد شیبانی	"
خواجہ حسین ناگوری	"
شیخ احمد محمد اور تفسیر مدارک کا درس	۱۱۷
درس کا طریقہ اور اس وقت کا حال	"
طریقہ حمیدیہ چشتیہ اور درس مدارک	"
تین صدیوں تک اس تفسیر کا شغلاً سلسلہ جاری تھا	"
جامع اجمیر اور اسکے امام شیخ مادھو	۱۱۸
خواجہ احمد نہروانی اور ہندی گانا۔ قرآن کی طرف توجہ	"
شیخ احمد نہروانی اور شیخ الاسلام ذکریا ملتانی	۱۱۹
قطب صاحب اور ایلتمش	"
خواجہ حسین ناگوری اور غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ	۱۲۰

Marfat.com

غیاث الدین خلجی اور اسکی محل سرا میں ہزار حافظ عورتیں ۱۲۱
یہی خلجی اور نماز تہجد ″
کفن اور جہبک ″
خواجہ بزرگ اجمیری کے روضۂ پاک کا اجمالی ذکر ″
بزرگان چشت کے مزاروں میں خام خشت ۱۲۲
رانا سانگا گبر عظیم اور اجمیر کی بربادی ″
بابر کی ہندوستان میں آمد
شیخ احمد مجدد کا کشف یا خواب ″
پتھورا راؤ زندہ گرفتیم ودادیم" خواجہ بزرگ کا لاہوتی فقرہ ۱۲۴
بابر کی توبہ اور اس کا اثر ″
قرآن اور شیخ کبیر شکر گنج ۱۲۵
سلطان المشائخ کی خلافت و اجازت کا حال ″
ان ہی کے قلم سے ″
لعاب در دہن و وصیت تحفظ قرآن ″
شیخ کبیر کی خانقاہ میں عدد حفاظ ″
حفظ قرآن کی دعا شیخ کبیر کی فرمودہ ۱۲۶
"برو ملک ہندگیر" شیخ کبیر کا سلطان المشائخ کو حکم ۱۲۸
"نظرۃ" منک یکفینی" شیخ کبیر کے اس قول مبارک کا مطلب ″
ذکر اور تلاوت قرآن کے نتائج میں فرق ۱۲۹
علم بزبان مشائخ "عمل" یعنی دونوں کی دعوت میں فرق ہے ۱۳۱
مرید سے مشائخ چشت کا پہلا عہد ۱۳۲
"دیدہ را نا دیدہ شنیدہ را ناشنیدہ کنی" ″
حصول علم کے ذرائع سلطان المشائخ کے نزدیک ″
بطور حس، بطور عقل، بطور قدس ″
تلاوت کا قاعدہ سلطان المشائخ
موجودہ زندگی کی سب سے بڑی دو نعمتیں ۱۳۳
تلاوت کے اثنا ۱۳۷
امیر خسرو پر تلاوت کا اثر ″
قرآنی نور کا مشاہدہ (حاشیہ، بحوالہ بخاری) ″
خواجگان چشت کے تدبر فی القرآن کا طریقہ ۱۳۸
فقیر صابر اور غنی شاکر ″
معیت عامہ اور معیت خاصہ ۱۳۹
عمل بالقرآن کا عصری مطالبہ ″
ایمان و علم صحیح کی قیمت سے غفلت ″
قرآن پر عمل کرنے کا مطلب ۱۴۰
قرآن میں عملی چیزوں کا صرف اجمالی ذکر ہے ۱۴۱
دین کے تفصیلات کا علم کیا قرآن سے حاصل ہو سکتا ہے ″
قرآنی علم اور حسی علم و عقلی علم ۱۴۲
موجودہ زمانہ کی دماغی پستیاں ″
پیغمبر سے کیا مانگنا چاہیئے؟ ″
فہم قرآنی کی ایک اور چشتی مثال ۱۴۳
خواجہ حمید الدین ناگوری اور قرآن کی چند آیتوں کی تفسیر ″
ظالم لنفسہ، مقتصد، سابق بالخیرات کے مصادیق ۱۴۴
خواجہ بزرگ اور خواجہ حمید الدین میں ایک دلچسپ قرآنی مکالمہ (حاشیہ) ۱۴۵
سلطان المشائخ اور شیخ کبیر کی وصیت کی تعمیل ۱۴۶
شیخ کبیر سے سلطان المشائخ کی ایک استدعا ″
فاتحہ کا مطلب ۱۴۷
سلطان المشائخ کو شیخ کبیر کی طرف سے بشارت ″
شیخ کبیر پر ایک عجب حال ″
شیخ جمال ہانسوی کی شیخ کبیر سے ایک استدعا ۱۴۸
دنیا کے بادشاہ اور دین کے بادشاہ کے طریقہ عمل میں فرق ″
سلطان المشائخ شیخ کبیر کے قدموں پر ″
استقامت کی دعا خواہی ″

Marfat.com

سلطان المشائخ کا ہندگیری کی مہم پر اجودھن
سے روانگی ۱۴۹
دلی کی طرف یخ دلی کا حال ،،
الہ کی یافت ۱۵۰
ہمہ خلق بدتر از پشک شتر ،،
"بسوز شیخ الاسلامی مادلیس خانقاہ را" ،،
سلطان المشائخ کا پہلے بداؤں آنا ،،
والدہ و ہمشیرہ وغیرہا کو ساتھ لے کر دلی روانہ ہونا ،،
مشائخ چشت میں خانقاہ کا رواج نہ تھا (حاشیہ) ،،
دلی میں سلطان المشائخ کی ابتدائی زندگی ۱۵۱
زلزال دور ،،
رادت اور روتا ڈا کے لفظ کی تحقیق ؛ ،،
سلطان المشائخ کا قتلغ خاں کے تالاب پر
قرآن حفظ کرنا۔ ۱۵۲
استفادہ بالقرآن ،،
ایک آگ جس میں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے ۱۵۳
سلطان جی نے کوئی کتاب نہیں لکھی (حاشیہ) ،،
مسرت کی انتہا ۱۵۴
عہد بلبنی دو چیتل میں ایک من خربزہ ،،
چیتل کیا دمڑی ہے ؟ (حاشیہ) ،،
ایک چیتل میں میدے کی روٹی دو سیر ۱۵۵
ہر دوری ذقیر ،،
ہر دوری معنوی ،،
سلطان جی کا عہد کہ قرآن کے سوا نہ کوئی کتاب
سوال لوں گا نہ نقل کراؤں گا ۱۵۶
قرآن پڑھنے والوں کو مانگنے والوں سے زیادہ
ملتا ہے (حاشیہ) ،،
اس حدیث کا علمی تجربہ ،،
سلطان جی نے قرآن یاد کر لیا ۱۵۷
سلطان جی کا ادبی مذاق فارسی زبان میں ،،
امیر خسرو کی ادبی تربیت

ذکر اللہ اور قرآن کے سوا کسی دوسرے شغل
کی کیفیت ۱۵۸
اپنے وابستوں کو سلطان جی کی تاکید کہ تلاوت
قرآن کو شعر خوانی پر غالب رکھیں ،،
امیر خسرو تہجد میں روزانہ سات پارے پڑھتے تھے ۱۵۹
سلطان جی کا جماعت خانہ مدرسۃ الحفاظ تھا ،،
سلطان جی کی سحری ،،
سحری کھانے سے باز رہنا کہ بہت سے بھوکے
پڑے ہیں ،،
سلطان جی کی افطاری
سبزی ہانڈی کریلہ اور روٹی (حاشیہ) ،،
پتنہائے مبارک کی مستی امیر کا شعر ،،
سلطان جی کے مدرسۃ الحفاظ کے طلبہ ۱۶۰
اس مدرسہ کے مدرس مولانا علاء الدین اندپتی ،،
حضرت والا کے بھانجے ۱۶۱
نوجوانوں کے ساتھ سلطان جی کا طرز عمل ،،
قرآن کا حافظ ہونا سب سے بڑا کمال تھا ۱۶۲
دعا ر مائدہ کے وقت قرأت اور "رحمت باد"
رحمت باد کے الفاظ سلطان جی کی زبان سے ،،
وقت سکرات اور قرآن ،،
قرآن حفظ کرانے کا طریقہ ۱۶۳
قرآن انسان کی دماغی منطق کو سلجھا دیتا ہے ،،
ایک آیت روز اگر یاد کی جائے تو سات سال
میں پورا قرآن محفوظ ہو سکتا ہے ،،
سلطان جی کے نوافل کی تعداد چہار پالصد ۱۶۴
رکعات تھی ،،
دلی کا ڈپٹی کمشنر بھی حافظ ۱۶۵
چراغ دہلوی اور کتاب و سنت ،،
صاحب گلبرگہ سیدنا گیسو دراز اور قرآن ،،
سیدنا گیسو دراز کا شغف کار قرآن سے ۱۶۶
سیدنا گیسو دراز کے ساتھ دکن والوں کا فرط عقیدت ،،

Marfat.com

تالابی سید (نوٹ)	١٦٦
مولانا زین الدین شیرازی اور قرآن	١٦٧
سلطان المشائخ کے روضہ سے قرآن خوانی کی مولانا زین الدین کو بشارت	، ،
مولانا زین الدین اور محمد شاہ بہمنی (حاشیہ)	١٦٨
شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا وظیفہ تلاوتِ قرآن	١٦٩
چشتی اور فردوسی طریقہ کے تعلقات	١٧٠
خواجگان چشت اور ہزار ختم قرآن	، ،
ہمہ خواجگان چشت برین سئوال	، ،
شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کا بیان حفظ قرآن کے متعلق	، ،
شرف الدین توامہ استاذ مخدوم کا درس سنار گاؤں میں	
خواجگان چشت اور چنگ و چغانہ	١٧٧
سرخورد (نوٹ)	١٨٠
محمول کرنے کا اشعار کے طریقہ	١٨٦
سلطان المشائخ جس شعر سے متاثر ہوتے تھے سارے ہند میں پھیل جاتا تھا۔	١٨٩
علاء الدین کی فوج حضرت کی مرید تھی	، ،
عہد علائی کے فتوحات اور غیر معمولی کامیابیوں کا سبب	١٩٠
فتح چندیری و مولانا محمد یوسف	١٩٢
سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد، دیگر ہنوز در اختلاف است	١٩٧
شیخ کبیر کی آخری ناسوتی شب	، ،
عمارت کے بس رفیع سے پانچوں وقت نماز کے لئے سلطان المشائخ کا اترنا۔	١٩٨
بیعت عام کی وجہ	، ،
جوگیوں کی طرح نشست سے ممانعت	، ،
کیا سلطان المشائخ لوگوں سے اپنے آگے سجدے کراتے تھے۔	٢٠۴
قدم بوسی اور سجدے میں فرق	٢٠۵
صوفیا کے لنگر خانے اور انکی وسعت	، ،
عہد بلبن میں خضر بارہ روز کی خانقاہ بہار میں	٢٢٨
سلطان المشائخ اور سلاطین وقت	٢٣٠
غیاث الدین تغلق کا دربار۔ مسئلہ سماع پر سلطان جی کی علماء دلی سے بحث	٢٣٢
حدیث کا انکار	
اس انکار کا نتیجہ	
دلی کی بربادی محمد تغلق کے ہاتھوں	٢٣۵
سلطان المشائخ کا آخری وقت اور نماز	٢۴۴
بارگاہِ رسالت میں سلطان المشائخ کی طلبی	، ،
سلطان المشائخ کی وصیت اپنی آخری خوابگاہ کے متعلق	، ،
قاضی جلال الدین لوا بجی سے سماع کے مسئلہ میں سلطان جی کا مناظرہ	٢۴۵
قاضی محی الدین کاشانی کے خلافت نامہ کا ایک فقرہ	٢۴٦
قاضی محی الدین کا ایک اور واقعہ	، ،
محمد تغلق اور مولانا فخر الدین کا زہرہ گداز مکالمہ	٢۴٩
حضرت قطب الدین منور محمد تغلق کے دربار میں	٢۵٢
ایمانی بیعت	٢۵٣
محمد تغلق کے ایک لاکھ ٹنکے کی واپسی	٢۵۴
دو سیر کھچڑی و دانگے روغن زرد کا کافی ہونا۔	، ،
شیخ نور الدین پر تغلق کے دربار کا اثر اور اس کا ازالہ	٢۵۵
بلگرام اور اس کے کچھ خصوصیات	٢۵٨
بلگرام کے چند بزرگوں کا تذکرہ۔ قرآن سے انکا تعلق	٢۵٩
سلوک کی راہ میں دشواری اور قرآن سے اسکا حل	٢٦١
بعد الموت کی زندگی	٢٦٢

Marfat.com

شیخ عبدالعزیز شکربار کی وفات قرآنی آیت پر ۲۶۳
سید محب اللہ بلگرامی کی وفات قرآن پڑھتے ہوئے ۲۶۴
ترک لذائذ کے متعلق صوفیۂ اسلام کا مسلک ۲۶۶
حضرت علاء الدولہ سمنانی کا خیال ترک دنیا کے متعلق (حاشیہ) ۲۶۷
جوگیہ ہند اور ان کے مجاہدات شاقہ ۲۶۸
سماع کے مجالس اسلامی صوفیہ کی خاص ایجاد ہے ۲۶۹
اسلامی صوفیہ اور نفسانی مجاہدات 〃
سحر سے حضرت سلطان المشائخ کا متاثر ہونا ۲۷۰
شیخ کبیر شکر گنج کا سحر سے متاثر ہونا۔ 〃
سحر سے خود ذات نبوت کبریٰ کا تاثر اور اس کی وجہ ۲۷۱
تصوف اور تشیع ۲۷۲
مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کا حضرت صدیق اکبر کے دست مبارک پر بیعت وخلافت ۲۷۳
بہاء الدین عاملی اور صوفیہ ۲۷۴
اخباریہ واجتہادیہ شیعوں کے یہ دو فرقے ۲۷۵
اخباریہ فرقہ کا نجدی وہابی تحریک سے تعلق 〃
مسلمانوں کے متعلق فرقہ بندیوں کا افسانہ ۲۷۶
مسلمانوں میں صرف دو فرقے ۲۷۷

خاتمہ

ہندوستانی علماء کے کارنامے ولی اللٰہی عہد سے ۲۷۸
قرآنی آیات کے ربط کا مسئلہ ہندوستانی علماء کے اس مسئلہ میں کارنامے۔ 〃
شیخ علی مہائمی 〃
علامہ فراہی اور ان کی تفسیر نظام الفرقان ۲۸۰
چند متاخرین علماء ہند 〃
حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند 〃
مجلس دارالمصنفین اعظم گڑھ 〃
مولانا شبلی نعمانی 〃
جسٹس امیر علی ۲۸۱
صلاح الدین خدابخش 〃
مصر کے جدید مصنفین 〃
بارھویں صدی میں ہندوستان کا ایک [illegible] 〃
کشاف الاصطلاحات والفنون 〃
علامہ تھانوی ۲۸۲
مغربی زبانوں کی انسائیکلوپیڈیا بعد کی چیزیں ہیں 〃
مولانا عبدالنبی احمدنگری کی دستور العلماء ۲۸۳
چینی اور جاپانی انسائیکلوپیڈیا ۲۸۴
ایک کشمیری عالم کا کام 〃
فیضی کی تفسیر سواطع الالہام ۲۸۵
اس تفسیر کی تالیف کی وجہ ۲۸۷
ابوالفضل کا سنسکرت زبان کے متعلق ایک بڑا دعویٰ 〃
فارسی کو شستہ کرنے کی تحریک اکبری عہد میں ۲۸۸
آذر کیوان مجوسی کی ایک عجب کتاب عہد اکبری میں ۲۸۹
میاں الہ داد لکھنوی کی ایک عجیب تالیفی صنعت ۲۹۰
فیضی اور اپنی کتابوں کی نقل کا انتظام ۲۹۲
فیضی کی تفسیر کا جواب ایک ترکی عالم کی طرف سے ۲۹۳
تیموریوں اور عثمانی ترکوں میں نوک جھونک 〃
ہندوستان کی ایک اور تالیفی صنعت ۲۹۴
ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی ۲۹۵
کافیہ کی بعض صوفیانہ شرحیں ہندوستان میں ۲۹۶
مغل شاہی خاندان کے اساتذہ عموماً بہاری تھے۔ ۲۹۷

Marfat.com

سید محمد جونپوری اور دانا پور (بہار)	۲۹۷
کافیہ کی صوفیانہ شرحوں کا مطلب	۲۹۸
سبع سنابل اور اس کے مصنف	۳۰۰
تحریفی طوفان	۳۰۲
ہندوستان کا پر سکون ماحول	۳۰۳
ہندوستان کے بعض خاص ارباب قلم و مصنفین کا اجمالی ذکر	۳۰۴
حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات (حاشیہ)	۳۰۵
محب اللہ بہاری اور امان اللہ بنارسی میں مباحثہ	۳۰۶
حافظ امان اللہ بنارسی کا ترجمہ (حاشیہ)	
خسرو و حسن کے متعلق مولانا جامی کی رائے	۳۰۷
صوفیہ میں اشارہ و اعتبار کا رواج۔ اس کا مطلب	۳۰۸
شیخ عبدالوہاب بخاری المعروف بہ مخمی روٹی کی عجیب تفسیر	۳۰۹
پورا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہے	
شیخ محی الدین بن عربی کی طرف ایک تفسیر کا غلط انتساب	
بعض تحریفی مثالیں عہد اکبری کی	۳۱۱
قرآن کی ابتدائی تعلیم کا ایک خاص طریقہ ہندوستان میں	۳۱۴
قرآن کی تعلیم مکتب خانوں میں	۳۱۷
ڈپٹی نذیر احمد مرحوم اور بچوں کی قرآنی تعلیم	"
ڈپٹی صاحب کی زود پشیمانی	۳۱۹
ابتدائی تعلیم کے متعلق مصنف کی رائے	۳۲۲
بسم اللہ کی رسم اور اسکی تاریخ	۳۲۳
سلطان المشائخ کے دربار میں بسم اللہ کی رسم	۳۲۴
شاہ شرف الدین یحییٰ منیری اور بسم اللہ کی رسم	۳۲۵
دعا، خاتمہ	۳۲۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت بندی

قدیم نظام تعلیم پر جو اعتراضات اس زمانہ میں کیے جاتے ہیں، ان میں ایک نمایاں اعتراض یہ بھی ہے کہ جماعت بندی کا جو دستور عصری مدارس و کلیات میں ہے، یہ چیز اس وقت نہ تھی، اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہے، اتنی سخت صف آرائی جس کی پابندی آج کل کی تعلیم گاہوں میں کی جاتی ہے، اتنی سخت کہ صف سے الگ ہو کر اگر کوئی کچھ بھی پڑھنا چاہے نہیں پڑھ سکتا، بلکہ پڑھنے اور سیکھنے کے لیے ان علمی صفوف میں سے کسی نہ کسی صف میں اپنے آپ کو شریک کرنا ناگزیر ہے، میں یہ مانتا ہوں کہ اس کا رواج اس وقت نہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس فوجی صف بندی کے اصول کو تعلیم گاہوں میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوئی؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر ایسا نہ کیا جائے اور ہر پڑھنے والے کو آزادی دی جائے کہ جس کتاب کو جس وقت چاہے، پڑھے۔ تو تنخواہ دار استادوں کی محدود جماعت سے ظاہر ہے کہ اس کا نباہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اب تو ہر اسکول میں چند اساتذہ مقرر ہیں، ہر استاد سے چند صفوف اور جماعتوں کا تعلق ہے، جسے جو کچھ پڑھنا ہے ان ہی صفوف میں گھس کر پڑھنا ہے، انفرادی طور پر ہر طالب العلم کے لیے بلکہ طلبہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے لیے کون نظم کر سکتا ہے۔

بلاشبہ اجر و مزد کے اس عہد میں اس طریقہ کے سوا اور کوئی دوسرا طریقہ تعلیم کا ممکن بھی نہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے، ایک ہی لاٹھی سے آپ نے کل بھینسوں کو ہانکنا شروع کر دیا جو ذہین لڑکے ہیں اگر ان کو غبی لڑکوں کی رفاقت پر مجبور نہ کیا جاتا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جتنی مدت میں ایک

کتاب پڑھائی جاتی ہے وہ چند کتابیں ختم کر لیتے، مگر اُن کے دماغ کی ذاتی خصوصیتوں سے تو بحث نہیں ہے، مجبوراً جماعت کے غبی کند دماغ لڑکوں کے ساتھ ان کو بھی گھسٹنا پڑتا ہے۔ اور یہی نہیں دوسری طرف ان کند دماغ بچوں پر بھی ظلم ہو جاتا ہے کہ ان کو تیز رو لڑکوں کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ ذہین بچے جس نصاب کو سال بھر میں پورا کرتے ہیں اُسے یہ بچارے دو سال میں پورا کرتے، لیکن ان کو تو اپنے رفقاء درس کے ساتھ گھسٹنا ہے، عموماً صلاحیت سے زیادہ محنت کا ان پر غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے، نیز جن لڑکوں کے ساتھ وہ چل نہیں سکتے تھے ان کے ساتھ ان کو چلانے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ امتحان میں وہ فیل ہو جاتے ہیں جس کا اثر ان کے جذبات اور حوصلوں پر پڑتا ہے کتنے بدبخت لڑکے محض فیل ہونے کی چوٹ کھا کر ایسے زخمی ہوئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پڑھنے سے ان کا دل اُچاٹ ہو گیا حالانکہ اگر ان کو دوسروں کے ساتھ باندھا نہ جاتا تو اپنی صلاحیت کے مطابق اُستاد سے روزانہ سبق کی مقدار پڑھ کر آگے بڑھتے رہتے دوسروں نے اگر اسی کتاب کو ایک سال میں ختم کیا تھا تو یہ ڈیڑھ سال میں ختم کرتے، لیکن ناکامی اور نامرادی کی اس چوٹ سے تو محفوظ رہتے، اسلامی عہد میں چونکہ بلا معاوضہ پڑھانے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہر جگہ مل جاتی تھی کہ قدرتاً مسلمانوں کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ رسی لے کر طلبہ کی ایک خاص تعداد کو خواہ ذہناً و حافظۃً و محنتاً ان میں جتنا بھی تفاوت ہو کمر سے کمر ملا کر باندھ دیں اور یوں آگے بڑھنے والوں کو بڑھنے سے روکا جائے یا پیچھے رہنے والوں کو زبردستی آگے بڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ چھوٹی کتابوں کے پڑھنے والے طلبا کو بڑی کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ میں اساتذہ کی کافی تعداد ہر جگہ مل جاتی تھی۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ تعلیم کے خاص پیشہ ور اساتذہ کے سوا ہر شہر میں حکام و ولاۃ بلکہ دیگر خوش باش لوگوں میں بھی پڑھانے والے مل جاتے تھے طلبہ کو اپنی دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے پوری آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے یا پیچھے رہنے کا موقع مل جاتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اب اس نظام کو واپس لانا تقریباً ناممکن ہے، کسی قسم کی تعلیم ہو جماعت بندی کے

Marfat.com

بغیر تنخواہ یاب اساتذہ کی اس محدود جماعت سے استفادہ کا اب کوئی دوسرا طریقہ باقی نہیں۔ ایک ایک کلاس میں کبھی کبھی سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو طلبہ داخل ہو جاتے ہیں استاد کی نہ آواز ایسی صورت میں سب کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے نہ اس ہنگامہ میں طالب العلم ہی اُستادوں سے کچھ پوچھ سکتا ہے نہ اساتذہ طلبہ کی انفرادی توجہ کی نگرانی کر سکتے ہیں مگر کیا کیا جائے اسکولوں اور مدرسوں کے فنڈ اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کم از کم اس جماعت ہی کو چند حصوں میں تقسیم کر کے مختلف اساتذہ کے سپرد کر دیا جائے، چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جس طرح کام چل رہا ہے چلنے دو۔ کسی مدرسہ یا کالج میں جب کوئی اجنبی آج داخل ہوتا ہے اور ایک ایک صف میں اُسے طلبہ کی فوج در فوج نظر آتی ہے اس حال کا اندازہ جب پچھلے زمانہ کی اس تعلیم سے کرتا ہے جس میں عموماً ایک ایک مدرس یا اُستاد کے پاس دس پانچ سے زیادہ طلبہ کی جماعت نہیں رہتی تھی بلکہ بسا اوقات تین چار ہی ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے تو عصری تعلیم گاہوں کی یہ سطحی رونق آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، ناواقف سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم کے ارتقاء کا نتیجہ ہے حالانکہ بھیڑ یا دھسان کی یہ صورت آج طلبہ کی استعداد کو جتنا نقصان پہنچا رہی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں پڑھنے پڑھانے کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہو۔ کتنا دردناک سماں ہے کہ جو پڑھنا چاہتے ہیں جماعت کی آہنی زنجیر اُن کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہے اور جو پڑھ نہیں سکتے ہیں اُن کو زبردستی گھسیٹا جاتا ہے۔ ناکامی اور فیل ہونے کے کچوکوں سے بلاوجہ اُنھیں مجروح کیا جا رہا ہے۔ اور ایک ہی ترازو میں آپ جب سب کو تولنا چاہیں گے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا آخر ہاتھ کی پانچوں اُنگلیوں کو جو برابر کرنا چاہے گا وہ مجبور ہے کہ اپنی لانبی اُنگلیوں کو توڑے یا چھوٹی اُنگلیوں کی رگوں کو ڈھیلی کر کے اپنے آپ کو دکھ میں مبتلا کرے دماغوں اور ذہنوں کو جب قدرت ہی نے برابر کر کے پیدا نہیں کیا ہے تو تعلیم جس کا بالکلیہ قائمۃ تعلق دماغ و ذہن ہی سے ہے، سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس قدرتی تفاوت سے آزاد ہو کر جس حد تک لوگ نفع اٹھا سکتے ہوں نفع اٹھانے کا ان کو موقع دیا جائے۔ آپ نے تو اس کو سوچا نہیں اور جن لوگوں نے اپنے امکان کی حد تک اس میں آزادی پیدا کرنے

کی کوشش کی تھی، انھی کو مطعون و ملام ٹھہرایا، زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ مرحوم نواب صدیق حسن خاںؒ بھوپال والے مفتی صدرالدین خانصاحب سے دلّی میں پڑھتے تھے، مفتی صاحب نے ان کی خاص دماغی حالت کو دیکھ کر ان کے لیے اسباق کا الگ مستقل انتظام کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ بیان تقریباً نواب صاحب کے اپنے قلم ہی کا قلمبند کیا ہوا ہے۔

ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانشمندی کو سبقاً سبقاً حاصل کیا تحصیل کی سند حاصل کی، کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا یہ ہیں۔

لہ ہندوستان کے ان عالموں میں جن کی کتابیں ہند کے سوا مصر و قسطنطنیہ میں بھی طبع ہوئی ہیں اُن میں نواب صاحب بھی ہیں۔ خدا نے ان کو ایک موقعہ دیا تھا جس سے علم و دین کی خدمت میں اُنھوں نے پورا پورا نفع اُٹھایا اسلامی علوم میں شاید ہی کوئی فن ہوگا جس میں نواب صاحب کی کتاب نہ ہو لیکن مجھے مصر کی ایک کتاب اکتفاء القنوع میں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اُس نے نواب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اصلہ من عوام الناس الا انہ توصل الی ملکۃ بھوپال فی اقلیم الدکن، فی الھند و تزوج بھا وسمی نائبا عنہا فصدما اغتنی بالمال جمع الیہ العلماء وارسل الناس فابتاع الکتب الخطیۃ من کل جہۃ وجمع مکتبۃ کبیرۃ وکلف من حولہ من العلماء بالتالیف ثم اخذ مصنفاتہم ونسبھا النفسہ بل کان یختار الکتب القدیمۃ التی لم تکن لھا سوی النسخۃ الواحدۃ ویغیر العنوان ویبدلہ باسم اخر ویضع علی الصحیفۃ الاولی اسمہ مع القاب الفخر۔ ص ۲۵۲۔

دراصل ان کا تعلق عوام کے خاندان سے ہے لیکن کسی طرح بھوپال دکن کی ملکہ تک رسائی حاصل کی اور اُن سے شادی کر لی اور اُن کی طرف سے نائب بن بیٹھے، پھر جب دولتمند ہو گئے، تب علماء کو اپنے اردگرد جمع کیا اور لوگوں کو کتابوں کے خریدنے کے لیے ادھر اُدھر دنیا کے مختلف حصوں میں روانہ کیا جو ہاتھ کی لکھی ہوئی قلمی کتابیں فراہم کرکے ان تک پہنچاتے تھے، اس ذریعہ سے ایک بڑا عظیم کتب خانہ اس شخص نے جمع کر لیا۔ اور اپنے دربار کے علماء کو حکم دیا کہ کتابیں تصنیف کریں، پھر انہی کی تصنیف کردہ کتابوں کو اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے بلکہ ایسی قلمی کتابیں جن کا دنیا میں ایک ہی نسخہ تھا اُس کا نام اور ابتداء کا دیباچہ بدل کر لوح کتاب پر اپنا نام القاب فاخرہ کے ساتھ درج کر دیتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب مرحوم کے متعلق اس قسم کی باتیں ہندوستانی مولویوں میں بھی مشہور رہیں۔ اور غالباً کسی ہندی مولوی ہی سے مصر کے اس عیسائی عالم کو اس کا سُراغ ملا لیکن خود نواب کے ملنے والوں سے جہاں تک میں نے سُنا ہے عقیدتاً وعلاً ان کی حالت جیسی کچھ ہو، لیکن علم کی سب تعریف کرتے ہیں"۔

مختصر معانی[1]، تا آخر عبادات شرح وقایہ[2]، معاملات ہدایہ[3]، اوائل توضیح[4] و تلویح[5] اصول فقہ میں، سلم[6] مع ملا حسن[7]، و حمد اللہ[8] و قاضی[9] مبارک منطق میں، میبذی[10] تمام و قدرے شمس[11] بازغہ و صدرا[12] مابعم الاجسام تک، میر زاہد[13]، ملا جلال تا بحث دلالت میر زاہد[14] شرح مواقف تا بحث وجود، میر زاہد[15] رسالہ تا مذہب منصور، صحیح بخاری[16] کے تین جز سماعاً اول[17] تفسیر بیضاوی قراۃً، دیوان متنبی[18] نصف اول، بعض دیوان[19] حماسہ، سبعہ معلقہ[20] مقالۂ اول[21] اقلیدس، قطبی[22] مع میر شرح[23] عقائد نسفی تمام، حاشیہ بحر العلوم[24] بر میر زاہد، مقامات حریری[25] و ہندی چند مقالات[26] شرح مطالع سماعاً، ص ۲۴۶۔

ایک سال آٹھ مہینے کی مدت خیال کیجیے، اور چھبیس[26] کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجیے آج کوئی باور کر سکتا ہے، کہ نصاب نظامیہ کی یہ اعلیٰ سخت دشوار کتابیں ایک شخص نے ڈیڑھ سال دو مہینے میں پوری کر لیں، بلاشبہ جماعت کی پابندیوں کے ساتھ اس کا تصور دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے، لیکن جس قسم کی آزادی مفتی صاحب نے نواب صاحب کو عطا کی تھی اور خدا نے جیسی طبیعت ان کو ارزانی فرمائی تھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو بات سوچی نہیں جا سکتی ہے وہ وقوع پذیر ہوتی تھی۔ حضرت قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی کی زبانی بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ "ہم نے مختلف علوم و فنون کی انتہائی کتابیں قریباً پونے تین سال میں تمام کی تمام پڑھ لی تھیں"۔

کسی موقعہ پر مولانا انوار اللہ خاں نواب فضیلت جنگ اُستاذ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کی ایک روایت طریقۂ مطالعہ کی گذری ہے۔ مولانا نے آخر میں اس کی وجہ کہ کتابیں جلد کیوں ختم ہوتی تھیں یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ طریقۂ مطالعہ کی وجہ سے سبق کا زیادہ حصہ چونکہ طلبہ کے لیے سمجھا سمجھایا رہتا تھا بجز چند شکوک و شبہات کے ازالہ کے، اُستاذ کو کچھ کہنا نہ پڑتا تھا، اس لیے سبق کی مقدار زیادہ ہوتی، روزانہ صفحات کے صفحات ہو جاتے تھے۔

ایک ہی کتاب کو متعدد مقامات سے پڑھنا

جماعت کی قید و بند سے جس زمانہ میں علم و تعلیم آزاد تھا طلبہ کو اس کا بھی موقع دیا جاتا تھا کہ چاہیں تو ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیں مولانا آزاد

Marfat.com

ہی نے اپنی تحصیل کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر طفیل محمد سے وہ اور ان کے خالہ زاد بھائی ساتھ پڑھا کرتے ہے۔

"طریق تحصیل چنیں بود کہ پیوستہ (مسلسل) دو کتاب یا کتابے واحد را از دو مقام بہ سماعت و قرات یک دگر می خواندم"

گویا کل دو آدمی ایک جماعت میں تھے، باری باری سے سبق ایک دن ایک پڑھتے اور دوسرا سنتا دوسرے دن پڑھنے والا سنتا اور سننے والا پڑھتا، یوں استاد کو پورا موقع ان کی خواندگی کی اصلاح کا ملتا تھا خصوصاً عربی زبان میں تو اس کی شدید ضرورت اعراب اور حرکات کی وجہ سے ہے مگر ظاہر ہے کہ اتنی توجہ سے استاد چند ہی طالب العلموں کو پڑھا سکتا ہے مولانا آزاد کا یہ فرمانا کہ ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیتے تھے، اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے واقعہ یہ ہے کہ کتابوں یا علوم کی دو قسمیں ہیں، بعض علوم تو ایسے ہیں کہ جب تک ان کے اول کو نہ پڑھا جائے آخر سمجھ میں نہیں آسکتا مثلاً اقلیدس کا جو حال ہے اگر علم کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ اول کو آخر کے بغیر اور آخر کو اول کے بغیر پڑھ سکتے ہیں، مثلاً فقہ کے ابواب کا جو حال ہے آپ معاملات کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، خواہ نماز اور صلوٰۃ کے مسائل آپ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں، یہی حال نماز یا روزہ کے مسائل کا ہے کہ کسی کو مساقاۃ یا مضاربت کے مسائل نہ معلوم ہوں، تو اس سے نماز و روزہ کے مسائل کے سمجھنے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے، میرے نزدیک تو اس طریقہ سے کامل ایک کتاب کا پڑھانا ان چند کتابوں کے پڑھانے سے بہتر ہے، جن کی تھوڑی تھوڑی مقدار نصاب پڑھا کر چھوڑ دی جاتی ہیں اور اس کا اچھا طریقہ یہی ہے کہ بجائے دو کتابوں کے ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھایا جائے لیکن یہ ساری آزادیاں آزاد درس ہی میں برتی جاسکتی ہیں، جماعت بندی کی گھسیٹ میں تو یہ ممکن ہے نہ وہ بلکہ جو چل رہا ہے وہی ٹھیک ہے۔

قلیل عرصہ میں زیادہ پڑھنے کا موقع ذہین طالب العلموں کو ایک تو اسی لئے مل جاتا تھا کہ ان کو اونٹ کے گلے میں لٹکا نہیں دیا جاتا تھا، ہرن کو اپنی چال سے اونٹ کو اپنی چال

سے جانے کی آزادی تھی، ممکن ہے کہ کچھ اس کو بھی دخل ہو جو مولانا آزاد کے بیان سے ثابت ہوتا ہے یعنی ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھنا، اور سب سے بڑی قیمتی بات وہ نسبت تھی جو اس زمانہ میں اساتذہ اور طلبہ میں قائم ہو جاتی تھی، ایسے اساتذہ جو بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی طرف سے طلبہ کے قلوب میں ممنونیت کے جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں وہ تو ظاہر ہی ہے، لیکن معاوضہ والے استادوں کی بھی شفقت و مہربانی طلبہ کے حال پر جتنی رہتی تھی۔ دکھ درد میں جس طرح کام آتے تھے بتدریج یہی چیزیں تعلقات کو بڑھاتے ہوئے ایک ایسی حد تک پہنچا دیتی تھیں کہ شاگردوں کا تعلق استادوں سے کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ شاید ماں باپ کے ساتھ بچوں کو اتنا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اب آپ خود ہی خیال کیجئے استاد کا جب یہ حال ہو، مثلاً اکبری عہد کے ایک عالم جو طبیب بھی تھے اس لئے حکیم الملک گیلانی کے نام سے مشہور تھے اصلی نام شمس الدین تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے، کہ ملازم تو دربار کے تھے، اکبر کے خصوصی معالجوں میں یہ بھی داخل تھے، لیکن

اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلقات

"ہمیشہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نخوردے" (ص ۱۰۶ تذکرہ علماء ہند)

تنخواہ بہ صیغۂ طبابت مل رہی ہے، ایک حرف بھی نہ پڑھاتے تو ان کی تنخواہ میں پیسے کی کمی نہیں ہو سکتی تھی، نہ پڑھانے سے اضافہ لیکن تعلیم کے لئے معاوضہ کی ضرورت اس زمانہ کا سوال ہی نہ تھا اور اسی کے ساتھ طلبا کو اپنے گھر سے کھانا بھی دینا، ان کا اتنا خیال کہ جب تک سب طالب العلم جمع نہیں ہو لیتے، خود بھی وہ کھانا نہیں کھاتے، سوچا جا سکتا ہے کہ ایسے استادوں کا قدرتاً تلامذہ کے قلوب پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خود ہمارے استاد مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کا قریب قریب یہی معاملہ تھا، وہ بھی تنخواہ طبابت کی راہ سے پاتے تھے لیکن عمر بھر پڑھاتے رہے اور دس بیس طالب العلموں کو کھانا دے کر پڑھاتے رہے، اس راہ میں وقت کی، مال کی، دل کی، دماغ کی، جو قربانیاں حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کرنی پڑیں ان سے وہ یا ان کا خدا ہی واقف ہے۔ لیکن

اس کا اثر کیا تھا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی طالب علم حضرت سے رخصت ہوا ہو اور بچوں کی طرح بلبلا کر رو نہ پڑا ہو، دوسروں کا حال کیا بیان کروں خود راقم الحروف کا حال بھی یہی تھا اور اب بھی حضرت والا کی پدرانہ شفقتوں کا جب خیال آتا ہے دل تڑپ اٹھتا ہے۔ بیتے ہوئے دن زندگی کے سامنے آجاتے ہیں[1]۔

کوئی یقین کر سکتا ہے، اس قصہ کا جس کے راوی مولانا آزاد بلگرامی ہیں، استاذ و شاگرد کے تعلقات کہاں تک پہنچے ہوئے تھے، ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے پہلے بھی گذر چکا ہے، ان کے حالات میں مولانا رقمطراز ہیں کہ ملا محمود کی وفات بالکل جوانی میں ہوئی، ان کے استاد مولانا محمد افضل جنہیں شاہ جہاں کے دربار سے استاذ الملک کا خطاب تھا، اس وقت زندہ تھے سُنیے استاذ کو خبر ملتی ہے کہ شاگرد مر گیا۔

"تا چہل روز استاذ را کسے بتبسم نہ دید و بعد چہل روز استاد بہ شاگرد ملحق شد شخصے این مصرعہ تاریخ یافت : زمحمود و افضل بگو آہ آہ!"

اور یہ تو خیر دو ڈھائی سو سال کی بات ہے تیرہویں صدی کے ایک عالم مولانا احمد الدین صاحب بگوی المولود ۱۲۱۱ھ لاہور میں درس دیتے تھے، حضرت شاہ اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے، صاحب حدائق حنفیہ نے لکھا ہے کہ مولانا احمد الدین اور اُن کے بھائی سے

---

[1] بے ساختہ یہاں اس واقعہ کے ذکر پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، حضرت حکیم صاحب بعض خاص پیچیدگیوں کی وجہ سے چند دنوں مالی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے، لیکن ایک اندرونی واقعہ تھا جس کی دوسروں کو خبر نہ تھی مصارف اپنے حال پر جاری تھے، طلبہ کی جتنی تعداد پہلے کھانا کھاتی تھی اندر سے اُن کے لیے ہمیشہ کھانا آتا رہا۔ ایک دن حضرت کی اہلیہ محترمہ کو بالآخر ان ہی طلبہ کے لیے یہ کرنا پڑا کہ سونے کے کنگن اُنہوں نے اپنے ایک معتمد طالب العلم کے حوالہ کیے۔ بازار سے بیچ کر یا گرو رکھ کر ان کے روپے سے گیہوں اور گھی خرید کر لاوے کہ طالب العلموں کے کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا کنگن فروخت کیے گئے۔ اور ان طالب العلموں کو کھلا دیے گئے، جن کی طرف سے دنیا میں حکیم صاحب یا ان کے اہل خاندان کو ایک حبہ کا نفع نہ اس وقت پہنچتا تھا اور نہ اب پہنچ رہا ہے۔ اب قربانیوں کی ان مثالوں کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے، لیکن انشاء اللہ یہی نیکیاں حضرت والا کو اب کام آ رہی ہوں گی، اور خدا سے امید ہے کہ ان کے پوتوں کے لیے آبا کا یہ صلاح باعث فلاح بن جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ ۲ھ (برجمعہ ۱)

Marfat.com

جس قدر انتشار علم منقول و معقول پنجاب میں ان ہر دو بھائیوں سے ہوا کسی دوسرے سے نہیں ہوا ہزارہا آدمی صرف بھائی سے لے کر ان سے فارغ التحصیل ہوئے گویا پنجاب میں کوئی صاحب علم ان کی شاگردی سے بے بہرہ نہ ہوگا۔ کوئی بالذات کوئی بالواسطہ ان کے تلامذہ میں منسلک ہوگا (ﷺ)

بہر حال مولانا احمد الدین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہو کہ

حالت صحت و بیماری میں طالب العلموں کو سبق پڑھاتے رہتے تھے، طالب العلموں میں اگر کوئی بیمار پڑجاتا تو اپنے ہاتھ سے دوا تیار کرکے دیتے" (حدائق ص ۴۸۰)

ملا عبد القادر بداؤنی نے اپنے ایک ہم وطن عالم اُستاد مولانا عبد اللہ بداؤنی کے متعلق یہ لکھ کر

"سالہا در بداؤں درس و افادہ فرمودہ خیلے از دانش مندان نامی کہ بہ مرتبہ اشتہار رسیدہ اند از دامن او برخاستند و مردم اکناف و اطراف از اقصی ولایات بہ ملازمت شریفش رسیدہ بہ سعادت جاودانی می رسیدند"

خود ملا عبد القادر صاحب نے بھی شرح صحائف اور تحقیق در اصول ان ہی سے پڑھی تھی ملا صاحب نے اپنا تجربہ ان کے علم کے متعلق یہ بیان کیا ہو کہ

جمعے از مسترشدان فیاض و متعلمان صافی قریحہ شریک بودند و اشکالات دقیق می آوردند ہرگز ندیدم او را کہ در افادہ و افاضہ و حل آں ابحاث شریفہ و نکات غامضہ احتیاج بہ مطالعہ افتادہ باشد ج ۳ ص ۵۶

جس سے اس زمانہ کے طریقہ درس کا بھی اندازہ ہوتا ہو، میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ درس کے اس طریقہ سے ایک طرف طلبہ کی استعداد کا امتحان ہوتا رہتا تھا، اور دوسری طرف استادوں کی قابلیت کا بھی پتہ چلتا تھا، جسے عصری طریقہ تعلیم نے بالکل اندھیرے میں ڈال دیا ہو، اس

(حاشیہ صفحہ ۱۶) ؎ ان کا نام مولانا غلام محی الدین بگوی تھا، "بگا" پنجاب کے کسی گاؤں کا نام ہو۔ یہ بھی شاہ اسحٰق ہی کے فیض یافتوں میں ہیں لکھا ہو کہ لاہور میں لال کی مسجد میں تیس سال تک درس دیتے رہے۔ آخر میں فالج کا جب اثر ہوا تو بگا اپنے گاؤں چلے گئے جہاں تیرہ چودہ سال تک اسی بیماری کی حالت میں درس دیتے رہے شاہی مسجد لاہور کے مشہور مدرس مولانا غلام محمد (جو بیک واسطہ خاکسار کے بھی استاذ ہیں، یعنی میرے اُستاذ مولانا محمد اشرف ملتانی جن سے ادب و ریاضی کی کتابیں فقیر نے پڑھی ہیں) ان ہی کے شاگرد تھے۔ فالحمد للہ۔

Marfat.com

گونگے درس میں عالم و جاہل ہر قسم کے اُستادوں کی کھپت بآسانی ہو رہی ہے، لیکن جس زمانہ میں اُستادوں سے طلبہ کو "اشکالات دقیق" اور "ابحاث شریفہ" و "نکات غامضہ" کے دریافت کرنے اور ان پر اُستادوں سے بحث کرنے کا حق حاصل تھا، ناکاروں کی گنجائش حلقہ تدریس میں ناممکن تھی

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی اس کے متعلق کافی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اس وقت مجھے انہی میاں عبداللہ بداؤنی کے متعلق ملا عبدالقادر کی یہ شہادت پیش کرنی ہے کہ میاں صاحب کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

ہر چہ از اسباب متاع خانہ خواہ قلیل باشد یا خواہ کثیر وسائر مصالح ضروری ما یحتاج الیہ پیادہ بدکان ما بازار تشریف می برد و برداشتہ بہ منزل می آورد۔	اپنے گھر کے لئے سودا خواہ زیادہ ہو یا کم اور تمام دوسری ضرورت کی چیزیں میاں صاحب پیادہ پا دکان اور بازار سے جا کر لاتے اور خود اپنے اوپر لاد کر ان کو گھر پہنچاتے۔

ملا صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

درمیان راہ جماعہ طلبہ راسبق نیز می فرمودہ ہر چند می گویند کہ حاجت بہ تصدیع مخدومی نیست تا ایں خدمت (تکلیف ۱۲) را بجای آریم، قبول ندارد" (ص ۵۶ ج ۳)

لہ دار العلوم دیوبند کے سابق مفتی حضرت استاذ مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو خاکسار نے دیکھا تھا، انکا بھی یہی حال تھا، حالانکہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسہ کے سب سے بڑے مفتی تھے اور اسی لئے اخباروں میں عموماً ان کے زمانہ میں لوگ ان کو مفتی اعظم کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن آخر عمر تک ان کو اسی حال میں دیکھا گیا کہ عصر کی نماز کے بعد نہ صرف اپنے گھر کا سودا سلف بلکہ محلے ٹولے کی بوڑھی بیوہ عورتوں کی فرمائشوں کو بازار سے خرید کر ان کے گھر پہنچانا ایک مزدوری کام کی حیثیت سے انجام دیتے تھے ملا عبدالقادر نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میاں عبداللہ کا یہ طریقہ نیا نہ تھا بلکہ بزرگوں سلف و خلف کی یہ پیروی تھی، خدا کا شکر ہے کہ ان آنکھوں نے بھی خلف میں ایسی ہستیوں کو دیکھا تھا۔ ریاست ٹونک میں اسلامی ریاست کی ایک شان اب تک یہ باقی ہے کہ شریعت کا محکمہ وہاں قائم ہے جس میں ناظم محکمہ شریعت کے سوا چند مفتی بھی ریاست سے مقرر ہیں، ان مفتیوں میں ایک بزرگ مولانا نورالحق قدس سرہ بھی تھے، خاکسار نے بزرگ فقہاء کے ساتھ ان سے مشکوٰۃ اور جلالین کے چند اجزاء پڑھے تھے، مولانا نورالحق باوجود مفتی شریعت ہونے کے بازار سے بھاجی دال گھی الغرض خانگی سودا گھر کا خود خرید کر لاتے ساری زندگی اسی طریقہ سے گزاری ۱۲۔

Marfat.com

اور یہ تھا طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا تعلق، طلبہ اصرار کر رہے ہیں کہ مجھے دیجئے ان چیزوں کو گھر تک پہنچا آتا ہوں، لیکن پیٹھ پر گھٹری لدی ہوئی، سبق ہو رہا ہے اور طلبہ کو تکلیف دینا نہیں چاہتے اس سلسلہ کا ایک دلچسپ عبرت آموز واقعہ حضرت جناب مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کا ذکر ابھی گذرا ہے۔ قاری صاحب کے سعادتمند حفید رشید جناب قاری عبدالحلیم صاحب معلم حالی پانی اسکول پانی پت نے قاری صاحب کی جو سوانح عمری تذکرہ رحمانیہ کے نام سے مرتب کی ہے اسی میں اس قصہ کو شیخ محمد ابراہیم حسن صاحب کی ایک کتاب منظوم "دُرّہ مرتشی" سے بایں الفاظ درج فرمایا ہے:۔

"میں (یعنی شیخ محمد ابراہیم) حضرت کے پاس بیٹھا تھا آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادم خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوایا جائے کسی مستفید شاگرد نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا "لایئے یہ خط میں ڈال آؤں" اور بہت اصرار کیا، حضرت نے فرمایا میں تم سے یہ کام لینا نہیں چاہتا کیونکہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے، میرا حق اُستادی سمجھ کر یہ خط ڈاک میں ڈالو گے امیرے نزدیک یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے، اس کے بعد لوجہ اللہ تعلیم کا خلوص باقی نہ رہیگا لہٰذا میں تم سے یہ معمولی کام لیکر اپنا ثواب کیوں ضائع کردوں" ص ۱۹۹

یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے، قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور مدرسین میں تھا، حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی استاذ الکل کے ارشد تلامذہ میں تھے علماء کا ایک طبقہ آپ کے حلقہ درس سے اٹھا، مولانا حالی صاحب کا ذکر تو گذر ہی چکا صحاح ستہ کی کل کتابیں مولانا حالی نے قاری صاحب ہی سے پڑھی تھیں ان کا ایک مستقل معرکۃ الآرا، مقالہ بھی قاری صاحب کے خصوصیات وحالات پر چھپ چکا ہے ان کے سوا پیر جماعت علی شاہ مولانا گل حسن، مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی اور بیسیوں علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی بلکہ جن لوگوں نے قاری صاحب سے استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اکابر ملت کے اسماء گرامی

Marfat.com

بھی ہیں، سوچنے کی بات ہے کہ جس کی ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری، اس نے اپنے اس التزام کو کہ کسی شاگرد سے کسی قسم کا کوئی ذاتی کام اپنا نہ لونگا، اور اس کو آخر وقت تک نباہ دینا کیا عزم و ارادہ کی معمولی قوت کی دلیل ہے؟

شاگردوں سے کام لینے کو بھی رشوت قرار دینے کا غالباً مطلب وہی ہے جس کا پتہ ان ہی کے ایک دوسرے طرز عمل سے چلتا ہے اسی کتاب میں قاری عبدالحلیم صاحب نے حضرت کا ایک اور قصہ نقل کیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آپ سے ایک شیعی عالم کسی خاص فن کی کتاب پڑھا کرتے تھے، مضمون سے ان کو چونکہ زیادہ دلچسپی تھی اس لیے چاہا کہ وقت ذرا زیادہ دیا جائے لیکن حضرت قاری صاحب عدم گنجائش کی وجہ سے راضی نہ ہوئے، ان شیعہ صاحب کو خیال ہوا کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے غالباً یہ بے اعتنائی برتی گئی، یہی خیال کر کے اُنھوں نے عرض کیا کہ "اگر میں شیعیت ترک کردوں اور سُنّی ہو جاؤں تو پھر تو آپ پوری توجہ کے ساتھ وقت دینگے" حضرت نے ان کی زبان سے یہ سُن کر فرمایا۔ "تم مذہب تبدیل کرو یا نہ کرو میری توجہ علم کے لیے ویسی ہی رہیگی اس میں بال برابر فرق نہیں آسکتا" (تذکرۂ رحمانیہ ص ۱۹۲)

گویا تبدیل مذہب کی رشوت دے کر قاری صاحب کی توجہ کو ذرا زیادتی کے ساتھ اپنی طرف وہ مائل کرانا چاہتے تھے، خدمت لینے میں ان کو غالباً یہی خیال ہوتا ہوگا کہ خدمت کی رشوت دے کر بہ نسبت دوسرے طالب العلموں کے بعض لوگ استاد کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں، اور وہ شاگردوں میں اس فرق کو روا نہ رکھتے تھے۔

مذکورہ واقعہ سے اس تعلیمی بے تعصبی کا بھی آپ کو اندازہ ہوا ہوگا، جو ان بزرگوں میں عموماً پایا جاتا تھا، شاگردوں کا مقام اساتذہ کے قلوب میں کہاں پر تھا، تذکرہ غوثیہ جو حضرت شاہ غوث علیؒ بہاری وطناً و پانی پتی نزیلاً کے حالات میں ایک دلچسپ کتاب ہے اس میں ایک قصہ مولانا فضل امام خیرآبادی کا درج ہے، غالباً شاہ غوث علی صاحب کے سامنے کا واقعہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی جو مولانا فضل امام کے صاحبزادے ہیں، جوان تھے، اور

Marfat.com

اپنے والد کے ساتھ خود بھی دلّی میں درس دیتے تھے، جہاں مولانا فضل امام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے، ایک طالب العلم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا، اُنہوں نے مولوی فضل حق صاحب کے پاس اُس کو بھیج دیا کہ مجھے فرصت نہیں ہے تم ہی پڑھا دیا کرو۔ یہ طالب العلم بیچارا کچھ غبی تھا، مولوی فضل حق صاحب کی جوانی کا زمانہ چند اسباق کے بعد ان کا جی اُکتا گیا۔ ایک دن پڑھاتے ہوئے کتاب پھینکدی اور بُرا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ طالب العلم مولانا فضل امام کے پاس پہنچا، اور حال بیان کیا۔ یہی سُننے کی بات ہے، مولانا فضل امام آپے سے باہر ہو گئے۔ مولوی فضل حق کو اسی وقت طلب کیا۔ طلبی کا فقرہ تھا "بلاؤ اس خبیث کو" جوان عالم بیٹا ہے لیکن ایک طالب العلم کی تحقیر کی ہے۔ مولوی فضلِ حق سامنے آتے ہیں، لکھا ہے کہ بے تحاشا ایک تھپڑ مولوی فضل امام نے رسید کیا، پگڑی دور جا پڑی، اور فرماتے جاتے تھے، تو طلبہ کی قدر کیا جانے۔ بسم اللہ کے گنبد میں پلا ہے، خبردار! میرے طالب العلموں کو اگر کبھی کچھ کہا۔

بہرحال میں تو اساتذہ اور تلامذہ کے باہمی تعلقات کی مثالیں پیش کر رہا تھا، ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، شیخ منصور لاہوری اکبری دربار کے امراء میں تھے ایک زمانہ تک مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے، پھر پنجاب کے علاقہ بجواڑہ اور حدود دامن کوہ کے ضبط و ربط کی خدمت ان ہی کے سپرد ہوئی، یوں ہی وہ مختلف عہدوں اور مناصب پر سرفراز ہوتے رہے، بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ علاوہ امیر کبیر ہونے کے علم میں بھی ان کا پایہ غیر معمولی تھا، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے۔

"در علوم عقلی کہ در ہندستان متعارف ست مستحضر و خوش طبع و سلیم الفہم و منصرف و با امراء و ملوک صحبت بسیار داشت"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری خدمات کی مشغولیت کی وجہ سے درس تدریس میں زیادہ حصہ نہ لے سکے، مگر ان کے صاحبزادے ملا علاء الدین کا رنگ دوسرا تھا، ملا عبدالقادر ہی نے لکھا ہے کہ اکبر نے "ہر چند کہ تکلیف سپاہی گری نمود قبول نہ کردہ بدرس و افادہ مشغول شد"

چاہتے تو کوئی ہزاری منصب فوج رکھنے کے صلے میں ان کو بھی مل جاتا، لیکن جو موروثی جاگیر والد سے ملی تھی "اسی پر قناعت کر کے ساری عمر پڑھنے پڑھانے ہی میں گذار دی، طلبہ کے ساتھ ان کا جو سلوک تھا، اور اسی کو مجھے پیش کرنا ہے، ملا عبد القادر نے لکھا ہے: "وہر چہ از جاگیر حاصل می شد ہمہ صرف طلبہ بود" (ص ۱۰۶)

اگرچہ اس زمانہ کا یہ عام دستور تھا کہ ارباب ثروت و دولت میں جو بھی درس تدریس کا کام کرتا تھا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق علاوہ پڑھانے کے طلبہ کی خدمت طعاماً و قیاماً اپنی اپنی استطاعت کی حد تک کیا کرتا تھا، لیکن ملا علاء الدین کا دستر خوان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں غیر معمولی وسیع تھا، ملا عبد القادر نے لکھا ہے کہ:-

از جملہ ملایاں در ہند بعد از پیر محمد خاں[1] چوں او (ملا علاء الدین) و ملا نور محمد ترخان ہیچکس دیگر بذل وکرم و نثار و ایثار ضرب المثل نہ شد"

بانی مدرسہ نظامیہ ملا نظام الدین فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف رشید مولانا عبد العلی الملقب بہ بحر العلوم کے متعلق لکھا ہے کہ

"منشی صدر الدین بہاری ویرا برائے تدریس مدرسہ خود کہ در بہار[2] بنا کردہ بود خرج معتد بہ فرستادہ طلبید"

جس وقت مولانا کو طلب کیا گیا ہے، اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھے، منشی صدر الدین نے چار سو

---

[1] افسوس ہے کہ پیر محمد اور ملا نور محمد ترخاں کے تفصیلی حالات نہ مل سکے ملا عبد القادر کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر یعنی ملا پیر محمد شیروانی الاصل تھے ابتداء میں بیرم خاں کے متوسلوں میں تھے بعد کو ناصر الملک کا خطاب شاہی دربار سے ملا۔ زہد میں ڈوب کر ... دینی حالت ان کی کچھ اچھی نہ تھی، ملا نور محمد کے متعلق بھی اتنا لکھا ہے کہ جامع اقسام علوم حکمت و کلام بود" ہمایوں کے مقبرہ کے آخری متولی تھے شعر بھی کہتے تھے ۱۲

[2] یہ عبارت میں نے تذکرۂ علماء ہند سے نقل کی ہے لیکن مولانا ابو الحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ہندوستان کے اسلامی مدارس "میں بجائے بہار کے بردوان لکھا ہے، واللہ اعلم کیا واقعہ ہے، میں نے خود واقعہ کی تحقیق نہیں کی ہے ممکن ہے کہ بردوان کو بہار کے قرب کی وجہ سے بہار میں داخل کر لیا گیا ہو ورنہ اب اس وقت تو وہ صوبہ بنگال کے مغربی حصہ کا ایک ضلع ہے۔

Marfat.com

ماہوار تنخواہ آپ کی اور آپ کے ایک فرنگی محلی عزیز مولوی اظہار الحق کی سنو مقرر کی تھی، لیکن مولانا نے لکھ بھیجا کہ میرے ساتھ طلبہ بھی ہونگے جن کی تعداد سنو سے کم نہ ہوگی اگر ان کے قیام و طعام کا نظم کر سکتے ہو تو میں آسکتا ہوں" اعضان اربعہ جو فرنگی محل کے علماء کی تاریخ ہے اس میں لکھا ہے کہ منشی صدر الدین نے جب تک باضابطہ معاہدہ کی شکل میں ان طلبہ کے مصارف کی ذمہ داری اپنے سر نہ لی، مولانا اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں، حالانکہ ان دنوں سخت معاشی دشواریوں میں مبتلا تھے۔

اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان تعلقات کی یہ نوعیت روایات موروثی کی شکل میں منتقل ہوتی ہوئی اس وقت تک آئی تھی آخری آدمی جس کا حال اس باب میں مجھے معلوم ہوا وہ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار مرحوم تھے ایک زمانہ تک ان کا قیام الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں رہا بعض واقعات پیش آئے کہ الہ آباد سے منتقل ہو کر آپ اپنے وطن صوبہ بہار چلے آئے، اور گیا کو مستقر قرار دیا۔ طلبہ کا بھی ایک بڑا مجمع آپ کے ساتھ مدرسہ سبحانیہ چھوڑ کر گیا پہنچ گیا بے سروسامانی کے حال میں آئے تھے کوئی انتظام معقول شروع میں نہ ہو سکا مولانا عبد الصمد رحمانی جو ان ہی طالب العلموں میں تھے ان کی سوانح عمری میں اپنی عینی شہادت یہ نقل کرتے ہیں۔

> یہاں (گیا) پہنچ کر سب سے اہم مسئلہ طعام کا تھا جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا، اس کو سرخ مرچ کے بھرتے کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اس میں نمک مل لیا جاتا تھا مولانا ایک دسترخوان پر بلا تکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا کھا لیتے تھے اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی۔" (حیات سجاد)

حالانکہ ذاتی طور پر مولانا کی ایسی گئی گذری حالت نہ تھی اجائداد و زمین کے مالک تھے اپنی ذات کی حد تک چاہتے تو خواہ مخواہ اس قسم کے کھانے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پاتے لیکن اتنی حیثیت بھی

نہ تھی کہ روزانہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع کو اپنی جیب سے کھلا سکتے ہوں محض طلبہ کی خاطر سے جب تک یہ حال رہا سب کے ساتھ مولانا کی بھی یہی غذا رہی[1]۔

اب ایک طرف اساتذہ کے ان عجیب و غریب تعلقات کو پیشِ نظر رکھیے، جو اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے ساتھ رکھتے تھے، اور دوسری طرف اس بے پناہ جذبۂ شوق و جستجو کو سامنے رکھیے جو نسلاً بعد نسلٍ بطور موروثی روایات کے اسلامی خاندانوں میں طلبِ علم کے متعلق منتقل ہوتا چلا آتا تھا، کہ آج ان قصّوں کو افسانہ سے شاید زیادہ وقعت نہ دی جائے، لیکن کیا کیجیے کہ واقعات یہی تھے، مولانا غلام علی آزاد نے بعض واقعات اس سلسلہ میں نقل کیے ہیں مثلاً مولانا سید محمود اصغر کے حالات میں لکھتے ہیں۔

بہ ارادۂ تحصیل علم قنوج رفت و نزد علما، آنجا کتب درسی گذرانید و کمال استعداد بہم رساند

---

[1] طلبہ اور اساتذہ میں کس قسم کے انبساطی تعلقات تھے اس کی ایک مثال وہ بات بھی ہو سکتی ہے جو ملا عبد النبی احمد نگری نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ میرا دستور تھا۔ "در ایام تعطیل با طلبائے یک دل و یک رو بہ جہت شکارِ ماہی دراں باغ اتفاق سیر و تفریح می شد ص ۲۶" آں باغ سے اشارہ احمد نظام شاہ بحری کے ایک باغ کی طرف ہے جس کا نام فیض بخش تھا، باغ کے بیچ میں ایک عظیم ساگر بنایا گیا تھا، اور اسی ساگر کے بیچوں بیچ میں عمارت پختہ دو منزلہ بادشاہ نے بنوائی تھی، چاروں طرف پانی اور بیچ میں اس شاہی قصر کا ہونا جو دل کشی پیدا کر سکتا ہے ظاہر ہے۔ ملا عبد النبی اسی تالاب میں طلبہ کے ساتھ شکار ماہی کے لیے آتے تھے۔ اسی قسم کی ایک نظیر استاذ السلطان نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کی سوانح عمری میں درج ہے، لکھا ہے کہ مولانا کو مدرسہ نظامیہ (جو ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا خدا کے فضل سے اب تک موجود ہے اسی مدرسہ نظامیہ) کے طلبہ سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ سال میں دو تین مرتبہ تمام طلبہ کو کسی باغ یا تفریح گاہ میں لے جاتے، دو تین روز قیام فرماتے وہاں ان سے تقریریں مناظرے بیت بازی کے مقابلے کراتے، طلبہ جب اس سے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ان کو کھیلنے کی اجازت دیتے (ص ۸۰) یہاں اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ طلبہ کے ساتھ مولانا مرحوم کے انبساطی تعلقات کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب مولانا مرحوم نواب فضیلت جنگ کے خطاب شاہی کے ساتھ حکومت آصفیہ کے وزیر مذہب یعنی صدر المہام امور مذہبی تھے۔ بلکہ اپنے ذاتی اثر و اقتدار کے لحاظ سے تو کہا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم وقت سے بھی ان کا درجہ بلند و رفیع تھا، لیکن عز و جاہ کے ان مدارج عالیہ پر پہنچ جانے کے بعد بھی علم کی جو عظمت قلبِ مبارک میں تھی اس نے طلبہ علم سے زندگی بھر ان کو باندھے رکھا حتی کہ ان ہی طالب علموں کے درمیان مدرسہ نظامیہ ہی کے صحن میں مدفون ہیں۔ طاب ثراہ ۱۲

Marfat.com

مگر کس طریقے سے، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مسافت مابین بلگرام وقنوج پنج کروہ است" کروہ دو میل کے قریب قریب ہوتا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بلگرام اور قنوج میں بہ مشکل دس میل کا فاصلہ ہوگا، لیکن کوئی باور کرسکتا ہے اس قرب مسافت کے باوجود مولانا محمود اختر نے قنوج میں طالب العلمی کے یہ دن کس طریقے سے گذارے، مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ "در ایام تحصیل باوجود قرب مسافت میل بہ وطن نہ کرد" خدا ہی جانتا ہے کہ تحصیل کی یہ مدت کتنے زمانہ میں پوری ہوئی، سال دو سال تو قطعاً نہ ہوگی مگر دھن کے پکوں کے عزم کی پختگی ملاحظہ فرمائیے کہ جب "تصحیح نسخۂ ظاہر و باطن بکمال رسانداں گاہ بہ جانب وطن عطف عناں نمود مسٰہ

اور دوسروں کو جانے دیجیے، خود مولانا آزاد کی عشق علم کی داستان کیا کچھ کم عجیب ہے، ہم میں نے مختلف موقعوں پر ظاہر کیا ہے کہ مولانا ایک امیر گھرانے کے آدمی تھے، ان کے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی عالمگیری امرا میں تھے، مختلف جلیل مناصب کا تعلق ان سے فرخ سیر کے زمانہ تک رہا، مولانا آزاد نے علاوہ مولوی طفیل محمد صاحب کے خود اپنے نانا مرحوم سے بھی پڑھا تھا، خود فرماتے ہیں: "لغت وحدیث وسیر نبوی درخدمت قدسی منزلت جدنا واستاذنا علامہ مرحوم مرقوم بسند رسانیدم" اور بھی مختلف لوگوں سے مختلف علوم وفنون کے سیکھنے سکھانے کے مواقع حالانکہ ہندستان ہی میں میسر آچکے تھے، عمر بھی چونتیس سال کی ہوچکی تھی۔ بہ ظاہر جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا، غیر متاہل رہنا مشکل تھا، مگر ایک "جنون" تھا جس کی آگ اندر اندر سلگتی رہتی تھی، آخر ایک دن جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں: "پیادہ پا تنہا از بلگرام رخت سفر بربستم" کیسی تنہائی؟

"اجارواقربا راطورے غافل ساختم کہ اگر ایں ہا سراغ می یافتند سد راہ مقصود می شدند"

یہ تنہا کس لیے نکلے تھے، حدیث کا شوق تھا حجاز جانا چاہتے تھے، اندیشہ تھا کہ لوگوں پر اس قصد کو اگر ظاہر کردیں گا، تو مانع ہوں گے، چپ چاپ یکہ وتنہا وہی شخص آج تک جو ایک میل بھی کبھی پیدل نہ چلا تھا، گھر سے نکل پڑا، گھر میں لوگوں کو خیال گذرا کہ شائد قریب کے کسی گاؤں میں کسی سے ملنے جلنے چلے گئے ہیں، لیکن جب تین دن گذر گئے، اور کسی طرف سے کوئی خبر نہ ملی تب

لوگ چونکے۔ "اہلِ بیت ایں فقیر بعد سہ روز آگاہ شدند و انگشت تحیر بدنداں گزیدند" مگر تین دن کے نکلے ہوئے مسافر کو پکڑنا آسان نہ تھا خصوصاً "راہے کہ غیر متعارف بود پیش گرفتم"

بلگرام اودھ کا قصبہ ہے، اور جو ایک میل بھی کبھی پیادہ پا نہ چلا تھا، جانتے ہو رواروی کرتا ہوا کہاں دم لیتا ہے، مالوہ میں ایک مشہور قصبہ سرونج بھوپال* کے پاس ہے، یہاں پہنچ جاتے ہیں راہ میں کیا گذری اور تو کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ اتنا قلم سے نکل گیا، قدم گاہے بہ پیادہ گردی آشنا نبود آبلہا را خوشہ تاک ساخت، پاؤں کیا تھا آبلوں سے انگور کا خوشہ بن گیا تھا اور انھی دانوں میں وہ کیف و مستی بھری ہوئی تھی جو مولانا کو آگے بڑھائے لیے چلی جاتی تھی۔ سرونج میں خبر ملی کہ بانیٔ سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ کی بارگاہ فلک پناہ دکن جا رہی ہے، قریب ہی میں کہیں فروکش ہیں، مولانا آزاد کسی طرح گرتے پڑتے، عساکر آصفیہ تک پہنچ کر فوجیوں میں گھل مل گئے، پیشانی سے شرافت و نجابت، علم و تقویٰ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، آصف جاہی فوج کا ایک امیر آپ پر مہربان ہو گیا، اور مولانا کو اس نے اپنا مہمان بنا لیا، ایک مستقل خیمہ اور سفر کے لیے ایک رتھ کا نظم مولانا کے لیے اس امیر نے کر دیا، اب عساکر آصفی کے ساتھ منزل بمنزل کوچ کرتے ہوئے بھوپال پہنچے، بھوپال میں آصف جاہی فوجوں کی مٹ بھیڑ مرہٹوں سے ہو گئی، رمضان کا مہینہ تھا، لکھتے ہیں کہ

"تمام رمضان در سواد بھوپال آتش حرب اشتعال داشت و زلزلۂ ساعت قائم بود"

کیا زمانہ تھا، امیر خاندان کے صاحبزادے ہیں، ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گذری ہے لیکن اچانک میدان جنگ میں گھر جاتے ہیں، پھر کیا وہ صرف تماش بینوں میں تھے ایک نظم میں اپنے اس حال کو بیان کیا ہے:-

فوج اسلام و کفر صف آراست — طرفہ شورے قیامتے برپاست

کرۂ آتشین توپ و تفنگ — کرۂ نار ساخت عرصۂ جنگ

اور جس کے ہاتھ میں اب تک قلم تھا وہی۔

* بھوپال سے ۵۶ میل شمال میں اور گوالیار سے ۱۵۰ میل دور جنوب میں واقع ہے۔ اس لیے قربت بھوپال

من ہم آں روز در صف اسلام   با یکے ذوالفقار خوں آشام

قدم پر دلانہ افشردم   حملہ ہا بر مخالفاں بردم

مرہٹوں کو ہزیمت ہوئی، آصف جاہی فوج آگے بڑھی، غالباً اسی امیر نے جس کے آپ مہمان تھے آپ کو ایک دن حضرت آصف جاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

"باوصف موزونی طبع مدت العمر زبان بمدح امرا و اغنیا نکشودیم"

لیکن آج ضرورت پیش آگئی تھی جس مقصد کو سامنے رکھ کر گھر سے نکلے تھے دیکھا کہ اس میں کامیابی کی یہی صورت ہے، یہ رباعی فارسی میں لکھ کر حضرت آصف جاہ کی خدمت میں پیش کی

اے حامی دیں، محیط جود احساں   حق داد ترا خطاب آصف شایاں

از تخت بدرگاہ سلیماں آورد   تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

حضرت آصف جاہ خود موزوں طبیعت رکھتے تھے، رباعی پسند آئی، اور فرمان ہوگیا کہ حجاز کی طرف روانگی کا سامان مولانا کے لیے کردیا جائے، یوں خدا نے ان کو سورت پہنچایا سورت میں جہاز پر سوار ہوکر مکہ معظمہ اور مکہ کے بعد مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حج و زیارت کے سوا ان پاک شہروں کے علماء سے استفادہ کا جو شوق تھا وہ پورا ہوا، مدینہ میں مولانا کا جو شغل تھا ان الفاظ میں اس کا اظہار فرماتے ہیں۔

"شبہا ما بین بیت و منبر والا (روضۃ الجنۃ) نشستم و مطالعہ صحیح بخاری می پرداختم"

بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا، خود ہی ان الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے:

"من فدائے جلوۂ احمدی و صید بستۂ فتراک محمدی در صغر سن خوابے دیدم کہ در مسجد مکہ معظمہ زادہا اللہ تعظیماً حاضرم و جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم در محرابے از مسجد قائم اند، نیز شرف ملازمت اقدس دریافتم حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التفات فراواں نمودند لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند"

آج کسی کے سامنے بیٹھ کر صحیح بخاری کے ذریعہ سے وہی "لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند" کی تعبیر پوری کررہے تھے، مولانا حیات سندھی جو اس زمانہ میں مدینہ منورہ کے سرخیل حلقہ محدثین تھے

ان سے "صحیح بخاری را ... سند کردم و اجازت صحاح ستہ و سائر مرویات مولانا بر گرفتم" زیادہ وقت مدینہ میں گذار کر جب حج کا موسم قریب آگیا، مکہ معظمہ پہنچے، مناسک حج سے فارغ ہوئے اور شیخ الحرم علامہ عبدالوہاب طنطاوی سے جیساکہ فرماتے ہیں :- "فوائد فن حدیث در گرفتم"

اور یہ کوئی ایک مثال ہے، علم کے دیوانوں کو فتنہ و فساد کے ان ہی دنوں میں اس ملک سے، اُس ملک میں اس علاقہ سے، اس علاقہ کی طرف سرگرداں دیکھنا چاہتے ہوں تو ان بزرگوں کے حالات اُٹھا کر پڑھیے، کتنوں کے تذکرے مختلف حیثیتوں سے خود اسی مضمون میں گذر چکے ہیں۔ کتاب منبع الانساب کے حوالہ سے صاحب نزہۃ الخواطر نے ایک سندھی عالم شیخ علی بن محمد جھونسوی کی سراسیمگیوں کا عجب حال نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پیدا ہوئے بھکر (سندھ) میں، وہی ذوق علم بھکر سے ملتان لے گیا، ملتان میں شیخ شمس الدین الحسینی العریضی اور مولانا ابوالفتح رکن الدین کی صحبتوں میں ایک مدت گذاری، لیکن دل کو قرار نہ تھا، ملتان سے بھی اُڑے اور

سافر الی بہار و لازم الشیخ منہاج الدین الحسن البہاری اثنتی عشرۃ سنۃ	بہار کا سفر اختیار کیا اور شیخ منہاج حسن بہاری کی خدمت میں بارہ سال مقیم رہے۔

شیخ منہاج حسن نے ان کو پہلے

ارسل الی شیخپورہ فلبث ہنا سنتین ثم ارسل الی پراگ (الہ آباد) فسکن بصحرا ماوراء النہر	شیخ پورہ[1] بھیجا جہاں وہ دو سال رہے شیخپورہ سے پراگ (الہ آباد) بھیجے گئے جمنا گنگا کے سنگم کے پاس

---

[1] واللہ اعلم اس شیخپورہ سے کون سا شیخپورہ مراد ہے، صوبہ بہار میں بہار نامی ایک قصبہ بھی ہے جو اسلامی عہد میں بہار کا عاصمہ (پایۂ تخت) تھا، اور اب ایک معمولی سب ڈویژن کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سے دس کوس کے فاصلہ پر بسمت مشرق شیخپورہ نامی ایک اور قصبہ آباد ہے جس کے اطراف میں زیدی سادات کے بارہ گاؤں وندھیاچل کے سلسلہ کی ایک پہاڑی کے نیچے مسلسل ایک دوسرے سے ملے جلے آباد ہیں اور یہ شیخپورہ انہی گاؤں کا مرکزی قصبہ ہے۔ ایک بزرگ شیخ شعیب رحمۃ اللہ علیہ کا وہاں مزار ہے کہتے ہیں کہ قصبہ ان ہی کے نام کی طرف منسوب ہے۔ شیخ شعیب آٹھویں صدی کے اکابر میں ہیں ایک کتاب "تذکرۃ الاصفیا" آپ کی مشہور بھی ہے۔"

حیث یلتقی ما جون وگنگ قریباً من قریۃ ہربونگ پور فاسلم علی یدہ خلق کثیر (ص ۹۲)

جنگل میں ایک گاؤں ہربونگ پور کے پاس قیام کیا بکثرت لوگ آپ کے ذریعہ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے

علم اور دین کے وارفتوں کو دیکھ رہے ہیں، زمان و مکان دونوں کے فاصلے گویا ان کی نگاہوں میں صفر کا درجہ رکھتے تھے، جہاں جی چاہا چلے گئے، جب تک جی چاہا ٹھہرے رہے، آخر آخر وقت تک روایات کا اثر خاندانوں میں باقی تھا، خود فقیر کے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ علیہ جن کے مدرسہ کا تذکرہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب سے گذر چکا ہے، حالانکہ یہ اس زمانہ کے آدمی ہیں جب برٹش راج کا تسلط ملک میں قائم ہو چکا ہے۔ مولانا کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر ممتاز تھے، بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بچوں میں کوئی لڑکا عالم ہوتا، مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ مولانا محمد احسن کی شادی ہو چکی تھی، بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے۔ اس عمر اور ان حالات میں تحصیل علم کا سودا سر پر سوار ہوا، بیوی بچے گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلان سے روانہ ہوئے اور بکامل چودہ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گذری خط و کتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ آئے۔ مختلف علوم کے اہل کمال جس جس شہر میں تھے ان کی خدمتوں میں پہنچے علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھی، ریاضی، ہیئت، حساب مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند حضرت مولانا عالم علی نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہما سے حاصل کی۔ اسی زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کیے جن میں وجود رابطی اور رشناۃ بالنکر یرد الارسالہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ شرح سلم بحر العلوم پر معرکۃ الآرا حاشیہ لکھا اقلیدس کا مقالہ اولیٰ عربی جو

Marfat.com

عام مدارس کے نصاب میں شریک ہے، پہلی دفعہ تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ آپ ہی نے لکھنؤ سے شائع کرایا اسی نسخہ کی نقل آج تک مطابع میں چھپ رہی ہے اور بھی بیسیوں کام اس عرصہ میں کرتے رہے، جب کامل اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی اُسی برگد کے درخت کے نیچے گذار دی جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل نہیں کیا ہے کہ اس سے اپنے کسی خاندانی امتیاز کا اظہار مقصود ہے، کیونکہ اس زمانہ کے لحاظ سے اس واقعہ میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ پرانے علمی گھرانوں میں بزرگوں کے متعلق آپ کو ہند کے طول و عرض میں اس قسم کی داستانوں کا ایک سلسلہ مل سکتا ہے، افسوس کہ اب اس کی یاد مٹتی جاتی ہے۔ کاش! جمع کرنے والے ان ولولہ انگیز نمونوں کو پچھلوں کے سامنے پیش کر دیتے۔ شاید اپنے اگلوں کے ان حالات سے ان پر اپنی حقیقت واضح ہو۔

رجسٹر حاضری اور ناغہ

اور اس وقت تو غرض یہ تھی کہ قدیم نظامِ تعلیم کی وہ عجیب و غریب خصوصیت یعنی بالکلیہ درس کا یہ نظام حاضری اور حاضری کے رجسٹروں سے ہمیشہ بے نیاز رہا، لیکن اس پر بھی یہ واقعہ تھا کہ ۵، فیصدی نہیں تین چار فیصدی غیر حاضری یا ناغہ[1] بھی ناممکن تھا، خود خاکسار کو مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ کا تجربہ ہے، سات آٹھ سال کے اس عرصہ میں بجز کسی شدید ارضی و سماوی آفت یا حادثہ کے میں نہیں جانتا، کہ کسی درس میں ایک دن کے لیے کبھی کوئی غیر حاضر رہا ہو۔ بعض بعض اسباق ٹھیک مئی اور جون کے مہینوں میں بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوتے تھے، گرمی اور تپش راجپوتانہ کی تھی،

---

[1] فوائد الفواد میں سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس ناغہ کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات نقل کی ہے حضرت اپنے استاذ شمس الملک متوفی الممالک جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے ان کے درسی خصوصیات کا تذکرہ فرماتے ہوئے یہ بھی بیان کرتے تھے کہ جو ان سے پڑھنا چاہتا اس سے منجملہ دیگر چند معاہدوں کے ایک معاہدہ اس کا بھی لیتے تھے کہ "ناغہ" نہ کروگے۔ حضرت سلطان جی فرماتے ہیں۔ اتفاقاً کسی وجہ سے کسی ناغہ

بعض طلبہ کی قیامگاہیں کافی فاصلہ پر تھیں، لیکن وقت پر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی نہ آیا ہو، شیخ محدث نے خود اپنا حال لکھا ہے کہ

"باوجود غلبہ برودت ہوائے زمستان و شدت حرارت تابستان دوبار بمدرسہ دہلی کہ شائد از منزل ما دو میل داشتہ میل می کردم"

مدرسہ دو میل ہے، گرمی ہو، یا سردی دن میں دو دفعہ آرہے ہیں جارہے ہیں، صرف اسی قدر نہیں بلکہ "بسے پیش تر از صبح بمدرسہ می رسیدیم و در سایۂ چراغ جزو می کشیدم" (اخبار الاخیار ص ۳۱۳)

رات رہتے اندھیرے مُنہ گھر سے نکل جاتے اور مدرسہ پہنچ کر چراغ کی روشنی میں ایک ایک جُز لکھ ڈالتے، گویا رات کافی باقی رہتی ہوگی، "دو میل چلنا اور پھر ایک جز کا چراغ ہی کی روشنی میں نقل کرنا معمولی قلیل وقت میں ممکن نہیں،

ادھر طلبہ میں علم کے طلب کا یہ بے پناہ شوق اور دوسری طرف اساتذہ کا ان کے ساتھ تعلق کچھ اس نوعیت کا ہوجاتا تھا کہ ان کی معمولی ناراضی کے خیال کو بھی طلبہ برداشت نہیں کرسکتے تھے، جانتے تھے کہ اساتذہ کے لیے سب سے زیادہ گراں بات طالب العلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) کوئی طالب العلم درس میں حاضر نہ ہوسکا، تو شمس الملک کا قاعدہ تھا کہ اس سے کہتے "چہ کردہ ایم کہ نمی آئی" یعنی میں نے آپ کا کیا گناہ کیا تھا جو تشریف نہ لائے، خود اپنے متعلق بھی فرماتے کہ "اگر مرا نائشے یا بعد از دیر رفتے در خاطر گذشتے ما را ہم چیزے خواہد گفت" بس یہی خیال کہ استاذ پوچھینگے۔ ناغہ سے طالب العلموں کو روکتا تھا، آج بھی دیر آنے والے طلبہ سے عصری جامعات میں بازپرس کی جاتی ہے لیکن کس انداز میں "پندرہ منٹ ہوچکے کلاس سے باہر ہوجاؤ" ایک طرف بازپرس کا یہ حال ہے اور دوسری طرف سنیئے سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ان کے استاذ بازپرس بھی کرتے تو کن الفاظ میں، فرماتے ہیں: ایں گفتے "یعنی یہ شعر پڑھتے ع آخر کم از آنکہ گاہ گاہے، آئی و ہما کنی نگاہے۔ (فوائد الفواد ص ۲۰۸) شاگرد کی گردن شرم سے جھک جاتی، محبت کے اسی برتاؤ کا یہ اثر تھا کہ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ سلطان جی اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد "چشم پُرآب کرد" کہاں اساتذہ و تلامذہ کے یہ تعلقات مودت و لطف ادا کہاں مدرسہ کو پولیس کا محکمہ بنا دینا، اساتذہ گویا تھانہ دار کا گروہ ہے اور تلامذہ مجرموں کی جماعت۔ و شتان بینہما ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) شاہ صاحب بعض میں کچھ دنوں نے کے لیے ایک دیوانہ بھی شریک تھا۔ اشتداد اچوتا نہ کی وہ لو اور بارہ کے بعد قیامگاہ کی واپسی، خس خانہ و برفاب کی تلافی تاریک حجرے میں ایک موٹے لحاف کے اندر گھس کر کی جاتی تھی، پسینہ سے تو

[illegible] ۱۲۔

Marfat.com

کا وقت پر نہ آنا تھا جس سے اُس کا استغنا ثابت ہوتا تھا، اور کوئی استاد اپنے شاگرد کے متعلق اس رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے پڑھنا بھی چاہتا ہو اور طریقۂ عمل سے یہ بھی ظاہر کرتا ہو کہ اپنے اُستاد کا وہ اس علم میں چنداں محتاج نہیں ہے۔

بہرحال اب اسباب کچھ ہی ہوں، موروثی روایات کا اثر ہو، یا کوئی بات ہو، واقعہ یہی تھا کہ حاضری کے رجسٹروں کے فقدان کے باوجود طالب العلم کا سبق سے غیر حاضر ہونا اس زمانہ میں اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ قدرت ہی نے غیر حاضری پر اسے مجبور نہ کر دیا ہو۔ بلکہ بسا اوقات ان بزرگوں کے شوق بے پروانے قدرتی موانع کی بھی پروا نہ کی۔ محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں یہ واقعہ درج ہے کہ جن دنوں قاری صاحب شاہ اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے۔ ایک دن موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہوا، اور قاری صاحب قیام گاہ کی دوری کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے جو طلبہ حاضر تھے اُنہوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اس بارش میں قاری صاحب کا اتنے طول طویل فاصلہ سے آنا ناممکن ہے اس لیے سبق شروع کرا دیا جائے، شاہ صاحب نے فرمایا "ابھی ٹھہرو وہ ضرور آئیں گے" یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اس برستے ہوئے پانی میں دیکھا جاتا ہے کہ پائنچے چڑھائے اور کتاب ایک گھڑے میں بہ حفاظت بند کیئے قاری صاحب آرہے ہیں، شاہ صاحب نے طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا لو دیکھو میں نے کیا کہا تھا، وہ قاری صاحب آگئے، آؤ اب سبق پڑھو" (تذکرہ رحمانیہ ص ۳۱)

بہرحال تعلیم میں اس کی وجہ سے جو تسلسل باقی رہتا تھا، نیز بجز جمعہ[۱] اور غالباً رمضان

---

[۱] بعض علمی خانوادوں میں علاوہ جمعہ کے منگل کے دن بھی درس نہ ہوتا تھا، ہمارے خیر آبادی خاندان میں بھی یہی دستور تھا منگل کا دن صرف اساتذہ کے لیے تصنیف و تالیف کا تھا اور طلبہ کے لیے کتابوں کی نقل کا۔ محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ منگل کے روز طلبہ کو سبق نہیں پڑھایا کرتے تھے، قاری صاحب چونکہ لفظاً و معناً ولی اللہی خاندان کے اتباع میں مشہور تھے اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ یہ طریقہ اُنہوں نے شاہ صاحب کے خاندان ہی سے حاصل کیا تھا۔ ۱۲

Marfat.com

کے ایک مہینہ کے سوا درس چونکہ سال بھر تک مسلسل جاری رہتا تھا، اور اساتذہ کی کثرت کی وجہ سے جماعت کی پابندیوں سے لوگ آزاد تھے، دوسروں کی وجہ سے آہستہ چلنے پر چونکہ کوئی مجبور نہ تھا، کچھ تو قدیم طریقۂ تعلیم کے ان خصوصیات اور سب سے بڑی وجہ یعنی وہی بات کہ تعلیم کا مقصد معلومات کی گرداوری نہیں بلکہ عالم العلیم (جو آدمی نہیں جانتا) اس کے یعلم (جانے اُس کو) کی صلاحیتوں کا اُبھارنا، سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا تھا۔

ان ساری باتوں کا نتیجہ وہی تھا کہ عموماً لوگ بہت تھوڑی عمر میں سند فراغ حاصل کر لیتے تھے، اتنی تھوڑی عمر کہ آج اگر اس کا تذکرہ کیا جائے تو شاید افسانہ سے زیادہ اُسے وقعت نہ دی جائے۔

ایسی ایسی ہستیاں جن کی عظمت وجلالت کے آوازے سے آج تک علم کا ایوان گونج رہا ہے، علم کے مختلف کنگروں پر ان کے جھنڈے لہرا رہے ہیں، ان بزرگوں کی سوانح عمریاں اُٹھا کر پڑھیے، حیرت ہوتی ہے کہ آج جس عمر میں لوگ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکتے اسی عمر میں یہ حضرات فارغ التحصیل عالم قرار پا چکے تھے، فیضی جیسا ہمہ داں

امروز نہ شاعر و حکیم　　　دانندہ حادث و قدیم

کا نعرہ لگانے والا۔

یں کالبدم زخاک ہندست ولیک　　　دربن مو ہزار یوناں دارم

لیکن "ہزار یونان جس کے ہر بن مو" میں پوشیدہ تھا، سنتے ہیں: فنون را نزد پدر در چہار دہ سالگی بانجام رسانید۔ (مآثر الکرام ص ۱۹۰)

مولانا فضل حق خیر آبادی صاحب "ہدیہ سعیدیہ"

شاگرد پدر خود مولوی فضل امام ست حدیث از مولانا عبد القادر دہلوی اخذ کردہ ...... و فراغ علی بعمر سیزدہ سالگی حاصل نمودہ۔ (تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۴)

یہ وہی مولانا فضل حق خیر آبادی ہیں، جو افق المبین کا سبق شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھایا کرتے

Marfat.com

تھے، علومِ رسمیہ خصوصاً معقولات اور حدیث یہ سارا قصہ کل تیرہ سال کی عمر میں ختم ہوگیا۔

مولانا عبدالحیی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں۔

لما وصلت الی خمس سنین اشتغلت بحفظ القرآن المجید وحصلت فی اثنائہ بعض الکتب الفارسیہ وتعلمت الخط وفرغت من الحفظ حین کان عمری عشر سنین ومن بدء السنۃ الحادیۃ عشر شرعت فی تحصیل العلوم ففرغت من الکتب الدرسیۃ فی الفنون الرسمیۃ الصرف والنحو والمعانی والبیان والمنطق والحکمۃ والطب والفقہ واصول الفقہ وعلم الکلام والحدیث والتفسیر وغیر ذلک حین کان عمری سبع عشر سنۃ ۱۷

جب عمر کے پانچویں سال میں پہنچا تب حفظ قرآن میں مشغول ہوا حفظ کے زمانہ میں بعض فارسی کتابیں پڑھتا رہا اور خط نویسی بھی، جب دس سال کی عمر ہوئی تو حفظ قرآن سے فارغ ہوگیا اور گیارہویں سال سے تحصیل علوم میں مشغول ہوا، رسمی فنون کی درسی کتابوں یعنی نحو صرف معانی بیان منطق حکمت فلسفہ طب فقہ واصول فقہ علم کلام حدیث تفسیر وغیرہ علوم سے سترہویں سال کی عمر میں فارغ ہوگیا۔

سترہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی مدت بھی داخل ہے، بلکہ اسی میں بقول مولانا

مع فترات وقعت فی اثناء التحصیل وطفرات واقعۃ فی آوان التکمیل

اس میں بعض وقفے بھی تحصیل علوم میں پیش آئے اور تکمیل کے اس زمانہ میں بعض رکاوٹیں بھی ہوئیں۔

میں نے قصداً مولانا کی عبارت اسی لیے نقل کی تاکہ معلوم ہو کہ اس قلیل مدت میں ان لوگوں کو کیا کیا پڑھایا جاتا تھا، اور یہ چیزیں تو وہ ہیں جو اپنے والد سے انہوں نے پڑھی ہیں ان کے سوا جب لکھنؤ آنا ہوتا تھا تو مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے جیسا کہ خود لکھتے ہیں

قرأت علیہ فی ثمان ثمانین شرح الجغمینی مع مواضع من حواشی البرجندی ؒ امام الدین الریاضی ورسالۃ الاصطرلاب للطوسی ؒ قدراً کثیراً من شرح التذکرۃ للسید وشرحہا للحضری وشرحہا للبرجندی ؒ زیج الغ بیگ مع شرح البرجندی ورسائل الاکر

۱۲۸۸ھ میں مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے شرح چغمینی برجندی امام الدین ریاضی کے حواشی کے ساتھ میں نے پڑھی اور طوسی کے اسطرلاب کا رسالہ نیز تذکرہ کی شرح کا بھی ایک حصہ حضری و برجندی کی شرح کے ساتھ الغ بیگ کی زیج برجندی کی شرح

Marfat.com

التسطیح وغیر ذالک کے ساتھ اکر کا رسالہ اور تسطیح کا رسالہ یہ ساری کتابیں بھی مولانا سے پڑھیں

سترہ سال کی عمر اور اس میں علوم وفنون کے ان ہفت خوانوں کو طے کرنا، اور کس طرح طے کرنا، کہ ان ہی علوم کو پڑھانے بیٹھے تو ملک کے کناروں تک اپنے جلیل تلامذہ کی ایک فوج پھیلا دی، خود مولانا مرحوم کی پوری عمر ہی کیا ہوئی، چالیس کے قریب میں انتقال ہوگیا، لیکن اس عرصہ میں ستر سے اوپر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، جن میں بعض کافی ضخیم ہیں، بعض ہندوستان کے سوا مصر میں بھی طبع ہوئیں، اس وقت تک بیسیوں کتابیں نظامی نصاب میں آپ ہی کی تحشیہ کی داخل ہیں، اسی کے ساتھ فتاوی کے مجلدات ہیں، علم کی یہ پختگی اور اس کے حصول میں وقت کی یہ نوعیت کیسی عجیب بات ہے۔

خود حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا کیا حال ہے، انفاس میں رقمطراز ہیں:۔

بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم ایں دیار در پانزدہم فراغ حاصل شد" ص ۱۹۴۔

صاحب شمس بازغہ علامہ محمود جونپوری کے ترجمہ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

نزد استاد الملک شیخ محمد افضل جونپوری تلمذ نمود و در عرض ہفتدہ سالگی فاتحہ فراغ خواند ص ۲۰۲

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم کے متعلق بھی صاحب کتاب حدائق حنفیہ نے لکھا ہے

"سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر فائق اقران اور افاضل و اماثل ہو گئے"۔ ص ۴۶۷

اور کس کس کا نام گناؤں، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اسی کتاب حدائق الحنفیہ میں ہندوستان کے مشہور فاضل جلیل قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو عوام میں تو اپنی کتاب "مالا بدمنہ" کی وجہ سے مشہور ہیں، لیکن اہل علم قاضی صاحب کی علمی بلند پائگی کو ان کی تفسیر مظہری سے پہچانتے ہیں۔ جس کا شاید میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے، قاضی صاحب کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم ظاہری سے فراغت پا کر علم طریقت کا شیخ محمد عابد سے اخذ کیا ص ۴۶۵

اور صرف یہی نہیں اٹھارہ سال کی اسی مدت طالب العلمی میں ایک طرف تو قاضی صاحب نے تمام علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی اور دوسری طرف حیرت انگیز بات یہ ہے کہ

Marfat.com

ایام تحصیل علم میں علاوہ کتب تحصیلیہ کے ساڑھے تین سو کتابیں مطالعہ کیں[۲۶]

کس قسم کی کتابیں ان کے مطالعہ سے گذری ہونگی، اس کا اندازہ ان کے اس خاص علمی رجحان سے ہو سکتا ہے جو ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے[لہ] خصوصاً ہم جب اس پر غور کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمی زندگی زیادہ تر شاہ ولی اللہ جیسے بلند علمی مذاق رکھنے والے اُستاد کی شاگردی میں گذری۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کی جس شاخ کے اہل کمال کو آپ اس ملک میں پائینگے، فراغت کی عمر بھی تیرہ چودہ سال سے بیس بائیس سال کی عمر سے زیادہ نظر نہ آئیگی، مولانا غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں تقریباً سو ڈیڑھ سو سے اوپر علماء کا تذکرہ درج کیا ہے، اوسط عمر تحصیل کی قریب قریب یہی ہے۔

آج ہندوستان میں عصری جامعات جن لوگوں کو گریجویٹ بنا بنا کر نکال رہی ہیں، یوں کہنے کو تو ان طیلسانیوں کو سب ہی کچھ سکھایا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہر علم کی نمک چشی کے ساتھ زیادہ زور انگریزی دانی اور حساب و کتاب پر دیا جاتا ہے، لیکن اس پر بھی حال یہ ہے کہ ایک طرف اگر کذب بیانی[۲] کو اسکولی اور کالجی عمر کے اندراج میں جائز نہ ٹھہرالیا جاتا، اور اسی کے ساتھ خضاب آہنی کی چلتی ہوئی ترکیب پردہ دار نہ بن جاتی، تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بی ۔ اے

لہ قاضی صاحب کی جو وسعت نظر علم حدیث اور فقہ و اصول فقہ و تصوف میں حاصل تھی حقیقت یہ ہے ان کی تفسیر کے دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اس جامعیت کے علماء ہندوستان میں کم ہی گذرے ہیں اور ہندوستان ہی نہیں اگر مبالغہ نہ خیال کیا جائے تو قاضی صاحب کو بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ ان کو بیہقی وقت بلا وجہ نہیں کہتے تھے حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ سے قاضی صاحب نے اگرچہ ارشاد اپنے پیر شیخ محمد عابد کے حکم سے حاصل کیا تھا لیکن خود مرزا صاحب قاضی صاحب کو علم الہدیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے، تفسیر کے سوا قاضی صاحب نے ایک بڑی معرکۃ الآراء مبسوط کتاب فقہ میں لکھی ہے جو فقہ جامع کی ایک بہترین استدلالی کتاب ہے۔ اس میں ہر باب میں ائمہ اربعہ کے مسائل دلائل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اسی کتاب سے الگ کر کے آپ نے ماخذ الاقوی کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جس میں آپ نے ان مسائل کو جمع کیا ہے جو دلیل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک قوی تر تھے افسوس کہ ملک کی ناقدریوں نے اب تک ان کتابوں کی اشاعت کا موقعہ بھی بہم نہ پہنچایا۔ تفسیر مظہری متعدد بار چھپنی شروع ہوئی لیکن آج تک مکمل نہ ہو سکی۔ حکومت آصفیہ سے ایک صاحب نے روپیہ بھی وصول کر لیا لیکن تفسیر چھاپ کر نہ دی۔ ۲ے (بر صفحہ ۳۷)

اور ایم اے کی ڈگریاں لینے والے طلبہ کتنی لمبی لمبی ڈاڑھیوں کو لے کر تعلیم گاہوں سے باہر نکلتے۔

بہرحال ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں تحصیل علم کی اوسط مدت جو تھی وہ آپ دیکھ چکے لیکن نتیجے کے لحاظ سے اسی مختصر مدت تعلیم میں ہندستان کو شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ مولانا عبد الحیی، ملا محمود، ملا فیضی، مولانا بحر العلوم مولانا فضل حق وغیرہم جیسی لازوال شہرتوں کی مالک ہستیاں مسلسل مل رہی تھیں۔

لیکن باوجود اس کے اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تعلیم کی اس زمانہ میں بھی کوئی مدت مقرر کر دی گئی تھی جس کے دل میں جس وقت بھی علم کا ولولہ سر اٹھاتا آزاد تھا جس استاد کے پاس چاہتا حاضر ہو جاتا تھا، عمر کی زیادتی کبھی حصول علم کی راہ میں مانع نہ آئی، خود مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم (جد امجد فقیر) کا قصہ گذر چکا کہ متاہل ہونے کے بعد گھر سے پڑھنے کے لیے نکلے اور پڑھ ہی کر واپس ہوئے۔ مولانا آزاد نے میر درگاہی کے تذکرہ میں ان ہی کا بیان نقل کیا ہے۔ "بعد از انے کہ پابند متاہل شدیم بہ کسب علم ترغیب نمودند" اشارہ میر عبد الجلیل آزاد مرحوم کے نانا کی طرف ہے کہ انہوں نے کسب علم کی طرف متوجہ کیا، اسی سے پہلے یہ فقرہ ہے

"باعث تحصیل علم علامہ میر عبد الجلیل شدند"

چاہا جائے تو اس کے نظائر و امثال بھی پیش کیے جا سکتے ہیں خصوصاً پڑھنے پڑھانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) سے حکومت نے یہ قانون بنا کر سولہ سال کی عمر سے پہلے کوئی میٹرک پاس نہیں کر سکتا تھا اور چوبیس سال کی عمر کے بعد کسی کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جا سکتا، اس عجیب و غریب قانون نے لوگوں کو جھوٹ بولنے اور بلوانے پر آج مجبور کر دیا ہے، حالانکہ ان عجیب و غریب قیود کا مطلب آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہے، ایک لڑکے میں اگر میٹرک پاس کرنے کی صلاحیت سولہ سال سے پہلے پیدا ہو گئی ہے تو آپ اس کو زبردستی اس امتحان میں کامیاب ہونے سے کیوں روک رہے ہیں ...... ممکن ہے یورپ کے سرد ملک میں لوگ دیر میں ہوش و حواس سنبھالتے ہوں، لیکن ہندستان کی تاریخ آپ کو بتا رہی ہے کہ میٹرک تو علم کا ابتدائی دروازہ ہے یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر میں لوگ فارغ التحصیل ہو کر فیضی اور بحر العلوم بنتے تھے۔ یہی حال ملازمت کا ہے۔ کارکردگی کی صلاحیت جس میں پائی جاتی ہو، وہ ملازمت کا مستحق ہو سکتا ہے خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو آج بھی یہی ہو رہا ہے لیکن جھوٹ کے پردے میں حقیقت کو چھپا کر بلا وجہ ایک اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونے پر لوگوں کو مجبور کرنا اس زمانہ کا عجیب مذاق ہے۔

Marfat.com

کے بعد کسی جدید زبان یا علم کے سیکھنے کی ضرورت اگر کسی کو پیش آگئی ہے تو پیرانہ سری بھی اس ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی تھی، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے متعلق لکھے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا تذکرہ علماء ہند میں ہے۔

"بشوق آموختن زبانِ عبرانی بہ کلکتہ رفتہ در آنجا سالے چند پابند اقامت گشتہ از احبار (ہاخام) زبان عبرانی را بجمیع الوجوہ آموخت" (ص ۱۵۲)

جبرو (عبرانی) زبان میں مولانا کو جو دستگاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب "بشریٰ" اور اس رسالہ سے ہو سکتا ہے، جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہ السلام کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب "خطبات احمدیہ" کا جز بنا کر اُسے شائع کیا ہے۔

علامہ تفضل حسین خاں کا ذکر پہلے کہیں گذرا ہے، یہ بھی اُن ہی لوگوں میں ہیں جنہوں نے تحصیل علوم رسمیہ کے بعد "انگریزی وردمی ... آں را لاطینی نیز گویند ... یونانی را نیکو گفتہ و خواندے و نوشتے" (نجوم السماء ص ۳۲۲)

چڑیا کوٹ ہی کے ایک اور بزرگ قاضی غلام مخدوم چریا کوٹی ہیں، صاحب تذکرہ علماء ہند نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

بعد تکمیل علوم متداولہ شوق تعلم زبانِ سنسکرت در دلش پدید آمد تا اینکہ در تحصیل زبان مذکور حصے وافی برگرفت و بمقام بنارس کہ معدن مہرہ زبان مرقوم ست میاں ماہران ایں فن امتیازے کافی یافت ص۱۵۷

لہ مختلف زبانوں کے سیکھنے کا مسلمانوں میں جو مذاق تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں آٹھویں صدی کے ایک بغدادی عالم زین الدین العابر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ "تاتاری نو مسلم بادشاہ غازان خان جب آپ کے مدرسہ میں آیا اور آپ سے ملا تو بالغ فی الدعاء (یعنی اس نو مسلم بادشاہ کو شیخ نے بہت دعائیں دیں) یہ دعائیں کن کن زبانوں میں کی گئیں، حافظ لکھتے ہیں بالمغلی ثم بالترکی ثم بالفارسی ثم بالرومی ثم بالعربی۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ زبانوں پر ان کو قدرت تھی، ہفت زبان کا لفظ مسلمانوں میں مروج بھی تھا۔ دیکھئے

مولوی نصرت علی خاں دہلوی تخلص قیصر کے متعلق بھی اسی کتاب میں ہے۔

"علوم رسمی باستعداد حاصل نمود ماہر زبان فارسی و عربی و ترکی و انگریزی و ہندی ست" ص۲۳

ان ہی مولوی نصرت علی کے والد مولوی ناصر الدین جو عیسائیوں کے ساتھ اپنے زمانہ میں چونکہ سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے، اس لیے لوگوں میں "امامِ فنِ مناظرہ" کے لقب سے مشہور تھے، کنیت ابو المنصور تھی، ان کے متعلق بھی لکھا ہے: "اکتساب علوم از والد ماجد و جد امجد خود نمودہ" جب عیسائیوں سے مناظرہ کی مہم سامنے آئی تو "تورات و انجیل بالتفسیر عبرانی و یونانی از علماء اہل کتاب خواندہ" ص۲۳

مولوی بخت علی جھجر کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خاں کے دربار کے مولوی تھے لکھا ہے کہ "پنجاہ رسائل بالسنہ خمسہ کہ دری و پاژندی و عربی و فارسی و اردو عبارت از آنست" تذکرۂ علماء ہند، ص۲۳۶) جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی اُردو کے سوا دری اور پاژندی زبانوں کو بھی اُنھوں نے تحصیل علم کے بعد غالباً کسی پارسی عالم سے سیکھا تھا، حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ "شرح مقامات حریری بہ زبان عربی بصنعت اہمال تصنیف کرد" پوری حریری کی شرح غیر منقوط الفاظ میں کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب "دساتیر" کی ایک شرح "ومیزا" نامی پاژندی زبان میں اور "زمان سفرنگ" دری زبان میں لکھی تھی۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہِ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند سے سُنی تھی۔ اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے، اُنھوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کیے، اُس نے ملنے

کی خواہش ظاہر کی، وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں، مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا۔ وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سُن کر وہ کچھ مبہوت سا ہوگیا، اور مولانا کے ساتھ اُس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اُس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھونگا، کیونکہ مولانا کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہِ راست گفتگو کرنے سے پڑسکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اجلِ مسمیٰ نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی۔ کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جارہا ہے، ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی۔ حضرت مولانا قاسم کے نقطۂ نظر کو تو آپ سُن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سربرآوردہ ہستی مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامت مدظلہ العالی[1] کی ہے، النور میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہوتے رہتے ہیں ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حضرت والا کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے۔

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میر زاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں"

خیال کرنے کی بات ہے، کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امور عامہ میر زاہد کی لیکن حکیم الامۃ کا خیال یہی ہے، اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "کیونکہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی" یعنی وہی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ والی بات ہے، جامع ملفوظ نے اس ملفوظ کو

---

[1] صد حیف کہ شریعت و طریقت کا یہ آفتاب درخشاں ۱۹۔۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب میں غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ "یہ بات بڑی قوت سے فرمائی"

کیا دیوبند کے جن اکابر کا یہ نقطۂ نظر ہو، اگر بجائے امور عامہ اور صدرا و شمس بازغہ کے تمرینی اغراض کے لیے جدید علوم و فنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے اختیار کیا جائے ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعث اجر نہ ہوگا، جیسے بخاری کا پڑھنا باعث اجر ہے، بلکہ اس زمانہ میں علوم جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چونکہ اسلام کی خدمت کا موقعہ امور عامہ کے پڑھنے سے زیادہ مل سکتا ہے، اس لیے یقیناً اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا،

اور واقعہ یہ ہے کہ "استاذ اساتذۃ الہند، مسند الدیار الہندیہ فی الحدیث خصوصاً جماعت دیوبندیہ کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جب ان کے ملفوظات طیبہ میں خود ان ہی کی زبانی یہ روایت درج کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبری (جبرو) زبان کا جاننے والا کوئی فاضل شاہ صاحب کے زمانہ میں دتی آگیا تھا، حالانکہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ اور خود مرجع انام بنے ہوئے تھے، لیکن باوجود اس کے حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ

فاضلے از اکابر علماء آمدہ از تحقیق توریت بلسان عبری می کردم" (ملفوظات عزیزیہ ص۹۴)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے براہ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اس فاضل سے پڑھی تھی، جامع ملفوظات نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "چنانچہ چند آیات او (توریت) مع ترجمہ ارشاد فرمود ص۹۴" اس آیت کو بھی عربی خط میں جامع نے نقل کیا ہے، لیکن کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ امید نہیں الفاظ صحیح ادا ہوئے ہوں۔

بہرحال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے عبری زبان سیکھی تھی، پھر جن کے پیشواؤں نے عبری سیکھی تھی اگر ان ہی کے پس رووں نے انگریزی سیکھنے کا عزم بالجزم حج سے واپسی کے بعد باوجود عمر ہونے کے اگر کر لیا ہو۔ تو کیا تعجب ہے؟ واقعات تو یہ ہیں

Marfat.com

لیکن اب ان کو کیا کہیے جنہوں نے ان ہی مولویوں کی طرف انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کے فتوے کو اس طرح منسوب کیا کہ گویا وہ کوئی واقعہ ہو۔ خیر ایک ضمنی بات کا تذکرہ چھڑ گیا، میں اسلامی عہد کے اس دستور کا ذکر کر رہا تھا کہ عمر کی کوئی قید تحصیل علم کے لیے نہ تھی، ابوالفضل جیسے سر چھرے آدمی کے متعلق ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہو کہ شیخ حسن علی موصلی جو شاہ فتح اللہ کے شاگرد تھے ان سے "چندگاہ شیخ ابوالفضل نیز خفیہ از و تعلیم فنِ ریاضی و طبعی و سائر اقسام حکمت گرفت، و دقائق خوامض علوم را از و کسب کرد" (ص ۱۳۶ ج ۳) خفیہ غالباً اس لیے پڑھائی ہوتی ہوگی کہ اکبر کو تو ابوالفضل نے یہ باور کرایا تھا کہ ان کے والد جامع معقول و منقول نے سب کچھ گھول کر اس کو پلا دیا ہو، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ فلسفہ اور ریاضی میں یا تو خود ملا مبارک زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے یا ابوالفضل کو ان سے پڑھنے کا موقعہ نہ ملا تھا، خود ملا عبدالقادر نے اپنے متعلق بھی لکھا ہو کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے بھتیجے میر تقی سے" فقیر پارہ از بست باب اصطرلاب پیش او گزرانید۔ ص ۲۹۳ ج ۳) حقیقت یہ ہو کہ اطلبوا العلم من المھد الی اللحد پر مسلمانوں کا عمل زبانی حد تک نہیں تھا، اور جب قوموں کے اقبال و عروج کا زمانہ ہوتا ہو تو ان میں یہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہو خود ان انگریزوں کا کیا حال تھا جو شروع شروع ہندوستان آئے، ان میں کتنے تھے جو عربی و فارسی سنسکرت ہندوستان کے مولویوں اور پنڈتوں سے سیکھتے تھے۔

خلاصہ یہ ہو کہ اس زمانہ میں پڑھ لکھ لینے یا فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اب کچھ نہیں سیکھا جا سکتا، جو کچھ پڑھنا تھا پڑھ چکے بلکہ ایک طبقہ ہمیشہ ایسے لوگوں کا نظر آتا ہو جس نے ضرورت کے وقت نہ عمر کا خیال کیا، اور نہ وقت کا، دھن بندھی اور کام میں لگ گئے، حیدرآباد میں ایک اہل حدیث مولوی زین العابدینؒ نامی رہتے تھے

لہ پندرہ سولہ سال ہوئے وظیفہ حسن خدمت لے کر آرہ اپنے وطن گئے اور چند سال بعد انتقال کر گئے، عجب مزاج کے آدمی تھے جو دھن بندھ گئی کر گزرتے تھے، خط پاکیزہ تھا جلدوں کی کتابیں نقل کر کے کتب خانہ آصفیہ میں داخل کیں تہذیب التہذیب ابن حجر کی بارہ جلدوں میں مولانا کے ہاتھ کی کتب خانہ میں موجود ہو۔

وطن آرہ شاہ آباد (بہار) تھا، اسکول میں عربی کے معلم تھے، اپنا قصہ مجھ سے خود بیان فرماتے تھے کہ علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد طب پڑھ کر چھپرہ میں میں نے مطب شروع کیا، کسی مریض کے پاس گیا ہوا تھا، ایک ڈاکٹر بھی اس عرصہ میں بلایا گیا، مجھے دیکھ کر میرے مُنہ پر اس نے تیمارداروں سے کہا کہ اس نے مرض کی کیا تشخیص کی ہے، جو میری تشخیص تھی میں نے بیان کی جس پر ہنسا اور میری ناواقفیت کا اُس نے مضحکہ اُڑایا، مجھے اس کی یہ حرکت اتنی ناگوار گذری کہ مریض کے گھر سے مطب آیا، اسی وقت مطب کو بند کر کے میں نے کلکتہ کا ٹکٹ لیا، وہاں انگریزی شروع کی، انٹرنس پاس کیا، مقصود یہ تھا کہ اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اس ڈاکٹر کو جواب دونگا، اب یہ محفوظ نہ رہا کہ ڈاکٹری بھی انھوں نے پڑھی یا نہیں، لیکن اسی جھونک میں انٹرنس تک انگریزی تو پڑھ ڈالی۔

سب سے عجیب چیز جو ہندستانی علماء کی بلند ہمتیوں کے سلسلہ میں مجھے نظر آتی ہے وہ قرآن مجید کے حفظ کے ساتھ ان کا تعلق ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو بچپن میں قرآن کے یاد کرنے کا موقع نہ مل سکا، اور آخر عمر میں خیال آیا کہ قرآن یاد کرنا چاہیے، ایک نہیں آپ کو بیسیوں مثالیں اس کی ملینگی کہ کمر کس کر بیٹھ گئے، اور حافظ بن کر اٹھے، مولانا آزاد نے میر محب اللہ بلگرامی کے ترجمہ میں لکھا ہے:-

"در عنفوان جوانی ذوق حفظ کلام ربانی بہم رسانید بر بالاخانہ خود نشستہ در عرصہ شش ماہ قرآن را یاد کرد" (ص ۱۲۸)

مشہور مدرس و محشی مولانا معین الدین کڑوی کے متعلق تذکرۂ علماء ہند میں لکھا ہے:

"باواسط عمر خود باوجود کثرت درس حفظ قرآن مجید کردہ" (ص ۲۲۹)

انبیٹھی (اودھ) کے ایک بزرگ شیخ احمدی فیاض تھے، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

؎ مولانا احمدی فیاض بھی ہندوستان کے اُن علماء میں ہیں جن کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے "تفسیر و حدیث و سیر و تاریخ خوب می دانست و اکثر کتب متداولہ را از بر داشت"

Marfat.com

"بیمار ضعیف و مسن شدہ چنانچہ نوبت رفتن و گشتن نداشت اسی حال میں "آن کبیرسن بر بستر بیماری صعب افتادہ و قرآن مجید را در یک سال آن گو فتہ" (ص ۸۲)

وہی مولانا فضل حق خیرآبادی جنہیں شطرنج کھیلتے ہوئے مولوی رحمان علی نے دیکھا تھا جب شاہ دھومن دہلوی سے مرید ہو کر تائب ہوئے تو ان کے تذکرہ میں لکھا ہے "قرآنِ مجید در چہار ماہ یاد گرفت" ص ۱۶۴

اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ لاہور کے مولوی روح اللہ صاحب جو "در صرف و نحو منطق و معانی و حدیث و تفسیر دانی نظیر نہ داشت" جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو "تیس[۳۰] روز بماہ رمضان شریف قرآنِ مجید حفظ کرد" ص۶۶ انتہا اس ذوق کی یہ ہے کہ اورنگ جہاں بانی پر جلوہ افروز ہونے

یہ رواج ہندوستان میں اتنا چلا ہوا نظر آتا ہے کہ صرف اسی پر ایک مستقل مقالہ لکھنے والے چاہیں تو تیار کر سکتے ہیں، ہمارے عہد میں بھی جامعہ عثمانیہ کے سابق پروفیسر مولانا عبدالحیی مرحوم نبیرۂ مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جو شاہزادگان آصفی کے اُستاد بھی تھے پچاس سال کی عمر کے بعد حفظ قرآن میں مشغول ہوئے، اور تراویح سُنا کر بلکہ دوسرے سال تراویح پڑھتے ہوئے طاعون میں مبتلا ہو کر مولانا نے درجہ شہادت حاصل کیا، حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی سے ارادت و خلافت کا تعلق رکھتے تھے، حضرت الاستاذ مولانا مولانا شبیر احمد عثمانی (صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے بھی تریب قریب پورا قرآن حال ہی میں یاد فرمایا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی سن کہولت ہی میں قرآن کو محفوظ فرمایا ہے، جیل خانوں کی زندگی میں حضرت والا کا سب سے بڑا مشغلہ بھی اشتغال بالقرآن رہتا ہے، اور پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے اکابر اساتذہ سے ہی غالباً یہ بات میرے کان میں پہنچی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا

ل بعد کو تذکرہ رحمانیہ یعنی قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں بحمد اللہ یہ الفاظ بھی مل گئے "ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم (مع بیت اللہ کو تشریف لیجا رہے تھے، جہاز میں ماہ رمضان المبارک آ گیا مولانا ممدوح نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا دن میں بمقدار تراویح یاد کر کے رات کو سنا دیتے تھے" ص ۱۲۲

عہد عالمگیر نے قرآن خود حفظ کیا ...

محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اس وقت یاد کیا، جب حج کے ارادہ سے آپ جہاز پر سوار ہوئے مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ جہاز ہی پر رمضان کا چاند دکھا گیا، تراویح کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو اسی جہاز میں مولانا کے ہم سفر تھے، اتفاقاً ان میں کوئی حافظ نہ تھا، آخر مولانا ہی تیار ہو گئے روزانہ ایک پارہ یاد کر کے رات کو تراویح میں سُنا دیا کرتے تھے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، حدائق حنفیہ میں مولوی غلام محیی الدین بگوی جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے والد نے تراویح سُننے کی ان سے خواہش کی انہوں نے کہا کہ روزانہ ایک پارہ کا درس لیں تو سُنا سکتا ہوں، آخر یہی ہوا کہ روز ایک پارہ کا دَور جو صرف چاشت کے وقت کرتے تھے اور رات کو وہی پارہ سنا دیتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمر ہونے کے بعد قرآن کو یاد کرنے کا دستور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں شروع سے جاری رہا ہے، اور سچ پوچھیے تو حفظ قرآن کے مسئلہ میں شاید سنت یہی عمل قرار پا سکتا ہے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر ہے کہ چالیس کے بعد ہی قرآن یاد فرمایا صحابہ میں بھی جو لوگ حافظ تھے کھلی ہوئی بات ہے کہ اس کا موقعہ عمر ہونے کے بعد ہی ان کو ملا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی ہندوستانی مسلمانوں کا حفظ قرآن کے ساتھ جو تعلق رہا ہے اور اسی جذبہ کے زیر اثر بچپن میں قرآن یاد کرانے کا جو ذوق شوق ہندی مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے، اس کے لیے تو کسی تاریخی شہادت کی بھی حاجت نہیں، شاید ہی مسلمانوں کی کوئی معقول آبادی ہوگی جس میں آپ کو ایک دو آدمی پورے قرآن کے حافظ نہ مل جائیں پنجاب سے بنگال تک اور نیپال کی ترائی سے راس کماری تک جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں ان شاء اللہ آپ کو یہ کیفیت نظر آئیگی، امیر و غریب متوسط حال، ہر طبقہ میں یہ حال عام ہے۔ دلی جب مسلمانوں کی دلی تھی اُس وقت اس کا کیا حال ہوگا اس کا اندازہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے ان کے ملفوظات میں ہے "شبے در جامع مسجد شمار کردہ بودم سی و پنج (۳۵) جا تراویح مع الجماعت حفاظ می خوانندم" ظاہر ہے کہ یہ اس وقت

کا واقعہ ہے جب لال قلعہ کے باہر مسلمانوں کے بادشاہ کی بادشاہی باقی نہ تھی۔

خود اسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے صدر اعظم عالیجناب نواب سر حافظ احمد سعید خاں بالقابہ حفظ قرآن کی دولت سرمدی سے سرفراز ہیں۔ التزاماً ہر سال تراویح بھی سناتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جن دنوں آپ برطانوی حکومت کی طرف سے صوبجات متحدہ کے گورنر (حاکم اعلیٰ) تھے اس زمانہ میں بھی گورنر ہاؤس (دار الحکومت) میں تراویح کے سلسلہ کو آپ نے برابر جاری رکھا، صرف یہی نہیں کہ سلطنت آصفیہ کے باب حکومت کے آپ صدر ہیں بلکہ بحمد اللہ چھتاری کی ریاست کے کابراً عن کابرٍ اباً عن جدٍ آپ کا خاندان والی چلا آرہا ہے اور اس وقت اس ریاست کے مالک آپ ہی ہیں!

اسی طرح ریاست ٹونک کے فرمانروائے حال نواب سعادت علی خاں اور ان کے پدر بزرگوار حافظ ابراہیم علی خاں خلیل مرحوم کو بھی حفظ قرآن کا شرف حاصل تھا

اس فہرست کو اپنی معلومات کے لحاظ سے اگر بڑھاؤں تو غالباً چند اوراق نذر کرنے پڑینگے، وہی تاریخی مثال کیا کم ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ جیسا باجبروت وجلال بادشاہ جو گجرات کاٹھیاواڑ، کوکن، خاندیس اور دکن کے ایک بڑے علاقہ کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ تاریخ گجرات میں اسی بادشاہ کے متعلق یہ واقعہ درج ہے کہ

ایک روز رمضان میں حافظ قرآن کی بہت تعریف ہو رہی تھی خود (محمود بیگڑہ سلطان گجرات) کہنے لگا افسوس ہماری اولاد میں کوئی حافظ ہوتا تو ہم کو بھی جنت ملتی۔ شاہزادہ خلیل نے سُنا، یہ صاحب علم تھا، دل میں چوٹ لگی اُسی روز سے خفیہ طور پر حفظ شروع کیا آئندہ سال پہلی رمضان کو باپ سے کہا حکم ہو تو میں نماز تراویح میں تمام قرآن مجید سناؤں، سلطان بہت خوش ہوا اور معقول انعام دیا" (مرأۃ محمدی ص ۹۱)

ہندوستان کے نظام تعلیم کے متعلق جن اساسی امور کا تذکرہ مقصود تھا تقریباً وہ ختم ہو چکے ہیں لیکن چند ضمنی امور اور ایک اہم باب اس سلسلہ میں باقی ہے۔ اب میں اس کے متعلق

Marfat.com

گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ان شاء اللہ اسی سے وہ راز بھی منکشف ہوگا کہ ہندی مسلمانوں کا قرآن سے غیر معمولی والہانہ تعلق کیوں پیدا ہوگیا، کن تاریخی عوامل و موثرات کے تحت یہ چیز ہم میں پیدا ہوئی

علم کے ایک خطرناک پہلو کا قرآنی علاج

بات یہ ہے کہ عام حیوانات کے مقابلہ میں "الانسان" ایک تعلیمی حقیقت ہے یعنی جن چیزوں کے علم سے خالی اور جاہل ہو کر پیدا ہوتا ہے، تعلیم کے ذریعہ سے ان کے جاننے کی صلاحیت آدمی ہی میں ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی پہلی نازل شدہ آیتوں میں قرأت (خواندہ) تعلیم بالقلم (نوشت) کا ذکر کرنے کے بعد

علم الانسان ما لم یعلم سکھائی انسان کو وہ باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا

کی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اسی کے بعد ارشاد ہے:-

کلا ان الانسان لیطغیٰ خبردار! بلاشبہ انسان سرکش ہو جاتا ہے۔

"الانسان تعلیمی حقیقت ہے" پھر ایک تنبیہی کلمہ "کلا" کے بعد فرمانا کہ "الانسان سرکش ہوجاتا ہے" ظاہر ہے کہ محض کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ جو مشاہدہ ہے اسی کا اظہار ہے، یعنی نجانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی جوں جوں آدمی میں صلاحیت بڑھتی جاتی ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اسی نسبت سے اس میں طغیان اور سرکشی کی لہریں بھی اٹھنے لگتی ہیں، وساوس و شکوک، تنقید و اعتراض یہ قصے ظاہر ہے کہ جاہلوں اور کند دماغوں میں نہیں پیدا ہوتے، بلکہ یہ سارے عوارض علم کے ہیں، شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ دماغوں پر جتنا اچھا اثر جس تعلیم سے زیادہ پڑتا ہے اسی قدر اس تعلیم سے سرکشی اور طغیان کی تولید بھی زیادہ ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ علم کا بھی وہ خطرناک پہلو ہے کہ اس پہلو کی جانب سے معمولی غفلت ہمیشہ خطرناک نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے تعلیم اور ایجوکیشن کے خلاف بعض دلوں میں جو مخالفت پائی جاتی ہے، دراصل علم کے ان ہی طغیانی نتائج پر ان کی مخالفت مبنی ہے، خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

Marfat.com

بہرحال مسلمانوں کو پہلی نازل شدہ سورت میں تعلیم کے اس خطرناک پہلو پر بھی متنبہ کردیا گیا تھا، مجھے اس وقت دوسرے ممالک سے بحث نہیں لیکن ہندوستان کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ جس زمانہ سے اس ملک میں اسلامی تعلیم کا نظام قائم کیا گیا، اسی زمانہ سے آخر وقت تک جب تک زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیمی شعبہ بھی مسلمانوں کا برباد نہ ہوا تھا، یہ قرآنی نکتہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دماغی تربیت و اصلاح کے ساتھ ساتھ لزومی طور پر قلبی اصلاح کی طرف توجہ تعلیم کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشاندہی کرسکتے ہیں جس نے مدرسے سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو، خود قرآن میں علم کے اس طغیانی پہلو پر چونکانے کے بعد

ان راٰہ استغنیٰ (اس لیے آدمی سرکش ہوجاتا ہے) وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے

کے الفاظ سے اس سبب کو ظاہر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اہل علم میں یہ بیماری پیدا ہوجاتی ہے، گویا پڑھ لکھ لینے کے بعد آدمی یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اب میں خود سوچ سکتا ہوں، دوسروں سے مشورہ لینے کی مجھے کوئی حاجت نہیں، حق و باطل میں امتیاز میرا دماغ خود پیدا کرسکتا ہے، علم کا یہی استغنا، انسانیت کی موت ہوتی ہے، الغرض مرض (طغیان) سبب مرض استغنا کے بعد

ان الی ربک الرجعیٰ (علاج اس کی طغیانی کا یہ ہے کہ تیرے رب کی طرف واپسی ہو)

کو اس طغیان کا واحد علاج بتایا گیا ہے، اسی قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل تھی کہ جن کے پاس ان کا رب تھا ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اپنی صحبت اپنی تربیت میں رکھ کر رجوع کرنے والے کو بھی اس کے رب کی طرف وہ پھیر دیتے تھے، اسی کا اصطلاحی نام پیری مریدی یا بیعت وصحبت تھا، قرآن کے بینات بتارہے تھے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کی شکل اس ہبوطی

Marfat.com

زندگی میں بنی آدم کے لیے یہی ہے کہ خداوالوں کی طرف پلٹا جائے۔

فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون — اور میرے راہنماؤں کی جس نے پیروی کی نہ اس کو اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کڑھیگا۔

کی وصیت اس وقت بھی کی گئی تھی جب آدم کو اس ہبوطی زندگی گذارنے کے لیے بھیجا گیا تھا، اور یہی اس وقت بھی کہا گیا جب آخری پیغام لانے والے نے پیغام سناتے ہوئے کہا۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی — اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو۔

اور قیامت تک کے لیے یہ منادی کردی گئی

واتبع سبیل من اناب الی — اور پیچھے چلو ان لوگوں کی راہ پر جو میری طرف جھک پڑے ہیں

جس زمانہ میں جس کی انابت رب کی طرف زیادہ ہوگی، اسی حد تک وہی اس کا زیادہ مستحق سمجھا جائیگا، کہ لوگ اس کی راہ پر چلیں، اسی کا رنگ اسی کا ڈھنگ اختیار کریں، ہمارے تعلیمی نظام کا آخری اختتامی جز یہی چیز تھی، مدرسوں میں دماغوں کو بنایا جاتا تھا، اور خانقاہوں میں دلوں کو سلجھایا جاتا تھا اور تب جاکر وہ نتائج پیدا ہوتے تھے جن کی لفظی تعبیریں جو آج کتابوں میں پائی جاتی ہیں کچھ شاعرانہ رسمی باتوں سے زیادہ نگاہوں میں نہیں بچیں، مثلاً ہندی علماء کے عام تذکروں میں مولانا آزاد ہی کے قلم سے بے ساختہ اس قسم کے الفاظ نکلتے جاتے ہیں

خدا دوست، دنیا دشمن، با دل بریاں، دیدۂ گریاں، زبانے لطیف، بیانے شیریں باوضع لطافت و نزاکت ہانکین وقار و رزانت، ظرافت طبع، اقدس ذات جلائل صفات یگانۂ روزگار، ہموارہ بیاد سلطان حقیقی، وغیرہ وغیرہ۔

جس تذکرہ کو اٹھا کر دیکھیے عموماً ان میں کچھ اسی قسم کے ترشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے فقرے آپ کو ملتے چلے جائیں گے پڑھنے والے ان الفاظ کو پڑھتے ہیں، چونکہ اب آنکھوں کے سامنے

Marfat.com

سے وہ تماشا غائب ہو چکا ہے، اس لیے مجبور ہیں کہ پرانے زمانہ کی انشا، کا اسے ایک اسلوب خاص قرار دے کر آگے نکل جائیں۔

مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ دماغ کے ساتھ جب کبھی "دل" کی تربیت کا سامان کسی نظامِ تعلیم میں کیا گیا ہے، تو مذکورۂ بالا الفاظ کے سوا ان کے نتائج کے اظہار کی کوئی دوسری صورت ہی نہیں ہے، بلکہ اصل حقیقت جیسی کہ چاہیے پھر بھی سامنے نہیں آتی

بہرحال انابت الی اللہ اور ہر طرف سے ٹوٹ کر خدا ہی کے قدموں پر جھک جانے والوں کا اصطلاحی نام "صوفیہ" اور ان کے علمی و عملی نظام کا نام "تصوف"[1] تھا، دستور تھا کہ رسمی علوم سے فارغ ہونے کے بعد لوگ اسلام کے اسی طبقہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، اور اپنی اپنی مناسبتوں کے لحاظ سے ان بزرگوں میں سے کسی کو نمونہ بنا کر ان کی صحبت اور ان کی نگرانی میں زندگی گذارتے تھے، علمی شکوک اور ذہنی شبہات کے گرد و غبار سے دماغ جو بھر جاتے تھے اس کی شست و شو ان ہی ہستیوں کی رفاقت اور صحبت میں میسر آتی تھی، یقین و ایمان کی برفانی سلوں سے جن کے سینے معمور تھے وہ اپنی خنکیوں کو دوسروں تک منتقل کرتے تھے کردار کی استواری سیرت کا استحکام، دین کا وقار و جلال خود بخود ان مثالی نمونوں کو دیکھ کر لوگوں میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق پیدا ہو جاتا تھا اور اس وقت ملت کی صحیح رہنمائی کا استحقاق اہل علم کو حاصل ہوتا تھا۔

---

[1] اس قسم کی فضول بے معنی بحثیں کہ "صوفی" کا مادۂ اشتقاق کیا ہے؟ وہ مادہ عربی ہے کہ یونانی، میرے نزدیک غیر ضروری ہیں، الفاظ کچھ ہی ہوں نظر معنی اور مصداق پر رکھنی چاہیے مسلمانوں نے تو روزہ اور نماز جیسی عبادتوں کا ترجمہ عجمی الفاظ میں کر لیا ہے، کیا یہ دلیل ہوگی کہ یہ عبادتیں ایران سے حاصل کی گئی ہیں، کیونکہ یہ الفاظ عربی نہیں ہیں علماء رسوم کو عموماً ملّا یا مُلّا مختلف اسلامی ملکوں میں کہا جاتا ہے، اس لفظ کی اصل کیا ہے؟ کیا بودھ مذہب کے مذہبی پیشواؤں کو جو لامہ کہتے تھے اسی کی یہ معکوس شکل ہے؟ بالفرض اگر ہو بھی تو کیا ہمارے علماء کے علوم بدھ مذہب کی کتابوں سے ماخوذ سمجھے جائینگے؟

ہندی تصوف اور ہندوستانی صوفیا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اس ملک میں تصوف اور صوفیا کی نمائندگی جو طبقہ کر رہا ہی، اُن کو دیکھ کر اسلاف کے متعلق رائے قائم کرنے والوں کو اگر کچھ مغالطہ ہو، تو یہ مغالطہ بے بنیاد نہیں ہی۔ لیکن جو حالات سے واقف ہیں ان کے نزدیک یہ اسی قسم کا مغالطہ ہی، جیسے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دیکھ کر کوئی حقیقی اسلام یا پیغمبر اسلام علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کرامؓ کے متعلق غلط فیصلہ کر بیٹھے۔ مگر کیا کیجیے کہ آج یہی کیا جا رہا ہی۔ اسی کا نام ریسرچ اور تحقیقات رکھا گیا ہی، خصوصاً تصوف اور صوفیہ کے ساتھ تحقیقاتی بازیگروں کی ذہنی بازیچوں کا عجب حال ہی صوفیہ اور تصوف کی اہمیت کو گھٹانے کا جو فیصلہ کر چکے ہیں وہ اپنے اس طے شدہ فیصلہ کی تائید میں ایسی باتیں جمع کرتے ہیں جن سے ثابت ہو جائے کہ ہندو جوگیوں اور فلسفہ ویدانت کے زیرِ اثر ایک خاص قسم کی راہبانہ زندگی بعض مسلمانوں نے جو اختیار کی، اسی کا نام تصوف ہی ورنہ اسلام کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا اگرچہ اس کا بھی کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہی کہ جس طرح مسلمانوں نے اس ملک میں آکر ہندی اور بھاشا میں شاعری کی بعضوں نے سنسکرت سیکھی، بعضوں نے یہاں کی موسیقی اور موسیقی کے لوازم سیکھے، اسی طرح یہ ہو سکتا ہی کہ بعض لوگوں نے ہندوؤں کے یوگا کو بھی سیکھا ہو جس کی یوں تو بہت کچھ تعریف کیجاتی ہی، کہا جاتا ہی کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے انسان میں غیر معمولی روحانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور یہ ہوتا ہی وہ ہوتا ہی، لیکن اگر پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کی کوشش کیجائے تو ہم مذہبی اور دینی حیثیت سے تو ہندوستان کے اس یوگا یا جوگ گیان دھیان، اور خدا جانے کیا کیا، کا نتیجہ یہی دیکھتے ہیں کہ ننانوے فیصدی مخلوق اس ملک کی انتہائی مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہی، اور نیچے اندر باہر اس ملک کے عوام ہی کیا، اکثر و بیشتر خواص کے نزدیک بھی سارا ہندوستان اور اس کی فضا صرف بھوتوں اور

Marfat.com

پر ستیوں سے بھری ہوئی ہے، ٹوٹکے، فال، بدشگونی، جنتر منتر، جوتش ان ہی چیزوں پر یہاں کے عام باشندوں کی زندگی کا دارومدار ہے، توحید خالص کا وہ نظریہ جس کا انتساب ویدانت والوں کی طرف کیا جاتا ہے، اس کا کوئی اثر اس ملک کے رہنے والوں پر نظر نہیں آتا، پھر وہ کیا خاک روحانیت ہوئی، جو لوگوں کو درختوں اور پتھروں، سانپوں، بچھوؤں کے آگے جھکنے سے بھی روک نہ سکی، روحانی طاقت کا سب سے بڑا استعمال اگر ہو سکتا تھا، تو ان ہی بے بنیاد اوہام کی صفائی ہو سکتا تھا، اس میں جس حد تک یہ ملک، ناکام ہے سو ظاہر ہے؛ یہ نہ ہو سکتا تھا، تو جن روحانی قوتوں کی لن ترانیاں ان کے مداحوں کی طرف سے سننے میں آتی ہیں، کاش! اس کا یہی اثر ہوتا کہ اپنی ان روحانی قوتوں سے باہر سے آنے والی مادی قوتوں ہی کا مقابلہ کیا جاتا، سو اس کا حال بھی ظاہر ہے کہ باوجود رشیوں منیوں، گیانیوں اور دھیانیوں کے یہ مسکین ملک ہمیشہ بیرونی قوموں کی چراگاہ کا کام دیتا رہا، مسلمانوں سے پہلے بھی مسلمانوں کے زمانہ میں بھی، مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل جانے کے بعد بھی اسی حال میں اب تک گرفتار ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان مجاہدات و ریاضات کا آخر حاصل کیا ہوا۔ اگر مداریوں کے چند تماشوں کے دکھانے کی قدرت ان سے پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بیچارے مداریوں اور نٹوں کو کیوں ذلیل سمجھا جاتا ہے؟

بہرحال مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ اس قسم کے اعمال و اشغال ہندوؤں اور ان کے جوگیوں میں ضرور پائے جاتے ہیں جن سے کچھ نادرہ نمائیوں کی قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے۔

لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ ہندوستان کے اسلامی صوفیا کی طرف جو یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جوگیوں سے یہ چیزیں سیکھی تھیں آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ ہمارے بزرگوں کے حالات سوانح عمریاں موجود ہیں، کم از کم صوفیائے ہند کے مشاہیر اکابر کی زندگی تو سب کے سامنے ہے کیا کوئی ایک دو فقرے ہی نکال کر بتا سکتا ہے جن سے اس دعوے

کے کسی پہلو پر کوئی روشنی پڑ سکتی ہے، ہندوستانی صوفیوں میں سب سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز طبقہ اصحاب چشت کا ہے، چشتی سلسلہ کے بزرگوں میں خواجہ بزرگ اجمیریؒ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فرید الحق والدین شکر گنجؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الاولیاءؒ وغیرہم حضرات ہیں، ان میں سے بتایا جائے کہ کس بزرگ کو جوگیوں کی صحبت حاصل ہوئی ہے اور بزرگوں کی تو کوئی معتبر کتاب نہیں پائی جاتی ہے لیکن فوائد الفواد کے متعلق تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات اور ان کی نظر سے گذری ہوئی کتاب ہے، افسوس ہے کہ لوگ اس زمانہ میں اس قسم کی کتابیں پڑھتے نہیں یا پڑھتے ہیں تو سوچتے نہیں، ورنہ اسی کتاب سے لوگوں کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان بزرگوں کا ہندوستان کے جوگیوں سے کس قسم کا تعلق تھا، اور اس طبقہ کا ذکر وہ کن الفاظ میں فرماتے تھے، جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ ایک دن شیخ صفی الدین گازرونی کا ذکر فرما رہے تھے کہ ان کی خدمت میں ایک جوگی آیا اور بڑے بڑے دعوے کرنے لگا، شیخ گازرونی کو مخاطب کر کے بولا "بیا قدم بنما" آؤ اپنا مقام یا اپنی کرامت دکھاؤ، شیخ گازرونی نے جواب میں فرمایا کہ دعویٰ تو می کنی تو قدم بنما" جوگی قدم نمائی کا اظہار "از زمیں بر ہوا بر آمد" سے کرنے لگا، یعنی زمین سے معلق ہو کر "ہوا میں تھرانے لگا" اور چند منٹ کے بعد زمین پر اتر کر شیخ گازرونی سے بھی اسی تماشے کا مطالبہ کرنے لگا، اب یہی مقام سوچنے کا ہے اگر اسلامی صوفیا کو بھی اسی قسم کی کوئی خواہش ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ بھی بازوؤں کو پھڑپھڑا کر ہوا میں اڑنے لگتے لیکن شیخ گازرونی نے اس تماشے کو دیکھ کر کیا کیا؟ سلطان المشائخ فرماتے ہیں،

"شیخ صفی الدین گازرونی روئے سوئے آسمان کرد و گفت خداوندا! بیگانہ را ایں قدم دادہ مرا ہم ایں چنیں کرامت کن"

یعنی عین وقت پر اب ان کو کرامت کی تلاش ہوتی ہے، اپنے مالک سے التجا کرتے ہیں کہ ہم نے تو یہ درخواست کبھی کی نہیں اب ایک بیگانہ آپ سے ناآشنا برسر جدل آمادہ ہے آپ ہی اپنے بندے کی مدد کیجیے

بہر حال کہا جاتا ہے کہ شیخ کو بھی حق تعالیٰ نے قوت طیران عطا فرمائی، اور ایسی قوت کہ جوگی بھی دیکھ کر حیران ہو گیا، کیونکہ جوگی کو لے دے کر بس اتنی ہی مشق تھی کہ سیدھے ہوا میں جائے اور پھر اسی خط مستقیم پر واپس آجائے، ادھر اُدھر نہیں جا سکتا تھا، لیکن شیخ گازرونی کا طیران مشق کا نتیجہ تو تھا نہیں وہ تو

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیوٰۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد (مومن) ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا والی زندگی میں اور جب گواہ پیش ہونگے۔

کے وعدے کا ایفا اپنے اس مالک سے چاہتے تھے جس پر وہ ایمان لائے تھے اور اس کی نصرت جس بندہ کو حاصل ہو جائے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، ہوا یہ کہ

بعد ازاں شیخ (گازرونی) از جائے برآمد جانب قبلہ طیران نمود، از انجا بجانب شمال شد، باز مر جنوب، باز بہ مقام خود بنشست" (ص۔ ۵ فوائد الفواد)

یہ الگ بحث ہے کہ ایمان والوں کے ساتھ اس "الحیوٰۃ الدنیا" میں حق تعالیٰ کی نصرت کا ظہور اس شکل میں ہو سکتا ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر کیجیے بلکہ یہ دیکھیے کہ اس قصہ کے بیان کرنے والے کے متعلق کیا ادنیٰ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جوگیانہ کرتبوں سے واقف تھا، یا اس کی نگاہ میں ان جوگیانہ اعمال وافعال کی کچھ وقعت تھی، ایک سیدھا سادہ مسلمان ان جوگیانہ اعمال کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا خیال رکھ سکتا ہے، جو اس قصہ میں ظاہر کیا گیا ہے، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جن ہندی صوفیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ جوگیوں سے اُنھوں نے یوگا، اور جوگ کا فن سیکھا تھا، وہ کون لوگ ہیں، سلطان المشائخ کا شمار اگر ہندی صوفیوں میں نہیں ہے تو کن کا ہے۔

کس قدر بات الٹی بیان کیجاتی ہے، جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خود ان اسلامی بزرگوں کے روحانی تقدس وجلال کو دیکھ کر پہلے بھی اور اب بھی جوگیوں میں سے بعض لوگ اسلامی بزرگوں کی خدمت میں "درشن" ہی کی نیت سے سہی مگر آمد و رفت رکھتے

تھے، اور بسا اوقات اپنے دوسرے دیوتاؤں میں اس بزرگ کو بھی دیوتا بنا کر شریک کر لیتے تھے یہ اس قوم کی پرانی عادت ہے، ہندوؤں میں جو لوگ "انگریزی قومیت" کے زہریلے اثر سے پاک ہیں، وہ اسلامی بزرگوں کا اب بھی احترام کرتے ہیں، حضرت سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر بابا شکر گنج کی خدمت میں جب وہ تشریف رکھتے تھے تو کبھی کبھی بابا صاحب کی مجلس میں "رمتے جوگی" بھی وہی "درشن" یا تبرک حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے، سلطان جی نے حضرت کے دربار کی یہ خصوصیت بیان کی ہے۔

بخدمت[1] شیخ الاسلام فریدالدینؒ از ہر جنس درویش وغیر آں برسیدے" (فوائد ص ۵۱)

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا، کبھی کبھی ان جوگیوں سے آپ باتیں بھی کر لیا کرتے تھے. لیکن کس قسم کی باتیں ایک دو نمونے ان کے بھی سن لیجیے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن بزرگوں کا نام "ہندوستانی صوفیا" ہے ان کا تعلق ان بیچارے جوگیوں سے کیا تھا، سلطان المشائخ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"گفتے بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین بودم قدس اللہ سرہ العزیز آنجا جوگیے حاضر بود"

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی مجلس میں اس کا ذکر چھڑا کہ بعض بچے فطرۃً نالائق اور ناہموار، بے ذوق پیدا ہوتے ہیں، اس پر جوگی نے اپنے جوگیانہ علم کا اظہار کیا کہ اس کی وجہ یہ ہے: "مردمان وقتِ مباشرت نمی دانند" اور اس کے بعد کہنے لگا کہ دراصل بعض مہینے تیس دن کے ہوتے ہیں اور بعض مہینے انتیس دن کے۔

"وہر روز را خاصیتے ست مثلاً اگر روز اول مباشرت کنند فرزند چنیں آید اگر روز دوم کنند چنیں باشد، الغرض ہر روز را حکم بیان می کرد"

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا، جوگی کی یہ عجیب بات انہیں پسند آئی، اور آپ نے جوگی

---

[1] اس کا ذکر آپ نے آزاد قلندروں کے سلسلہ میں کیا ہے کہ حضرت زکریا ملتانی کے یہاں اس قسم کے بے قید فقیروں کو راہ نہیں ملتی مگر بابا فرید کے یہاں سب ہی طرح کے فقرا، "غیراں" سے جوگی وغیرہ مراد ہیں گئے جاتے تھے۔

کی بتائی ہوئی تاریخوں اور ہر تاریخ کی جو خاصیت اُس نے بیان کی تھی اُس کو دہراکر جوگی سے پوچھا کہ تم نے یہی بتایا تھا؟ حضرت بابا صاحب جوگی اور سلطان المشائخ کی باتیں سُن رہے تھے جب دیکھا کہ سلطان المشائخ ان تاریخوں کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو بولے۔

"تو ازیں چیزہا چہ می پرسی ترا ہرگز کار نخواہد آمد" (ص ۲۴۶)

ایک کشفی اشارہ تھا کہ آپ کی زندگی مجردانہ گذریگی، سو گذری۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ان جوگیوں سے اس زمانہ میں جو باتیں ہوتی بھی تھیں تو اسی قسم کی، ایک اور قصہ اسی، فوائد الفواد میں سلطان المشائخ ہی کی زبانی مروی ہے، نصیر نامی ایک طالب العلم کا قصہ آپ نے بیان کیا کہ وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں بیعت کے بعد سر کے بال بڑھا رہا تھا، گویا کاکل بنانے کا ارادہ تھا۔ اتفاق سے ایک جوگی پھر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ "آں متعلم (نصیر) از اں جوگی پرسیدن گرفت کہ موئے سر از چہ دراز شود" سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھے اس طالب العلم کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری، گویا اس ذریعہ سے بال بڑھا کر وہ زور پھیلانا چاہتا تھا، میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل کیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں مسلمان عموماً ان جوگیوں سے اگر پوچھتے بھی تھے تو اسی قسم کی باتیں کہ سر کے بال کن دواؤں سے بڑھتے ہیں، ہم بستری کی اچھی تاریخیں جن میں اچھے بچے پیدا ہو سکتے ہوں کیا ہیں۔ اور خدا جانے ان باتوں کا بھی علم ان جوگیوں کو ہوتا ہے یا نہیں لیکن بہرحال اپنے آپ کو وہ ان ہی چیزوں کا جاننے والا پہلے بھی مشہور کرتے تھے اور اب بھی سنیاسی جوگی وغیرہ کا یہی کام ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان جوگیوں سے اگر کسی بزرگ نے کوئی بات پوچھی بھی ہے تو اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ اب آپ ہی خیال کیجیے کہ فوائد الفواد جو متوسط تقطیع پر ڈھائی سو صفحات کی کتاب ہے، اور اس میں تقریباً آپ کی سیکڑوں مجلسوں کی پوری گفتگو من وعن درج ہے، بمشکل ان سارے ملفوظات میں یہی چند مقامات ہیں جہاں جوگی کا ذکر آیا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی گفتگو کا تعلق بھی ان امور سے ہے جن کا اہتمام ان بزرگوں کے سر اس زمانہ میں تھوپا

Marfat.com

جارہا ہے، صرف ایک مقام اور ہے جس میں اجودھن ہی کا ایک اور واقعہ جوگی کے متعلق حضرت سلطان المشائخ نے بیان فرمایا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "من وقتے بخدمت شیخ کبیر در اجودھن بودم جوگیے بود بیامد" اور اس سے میرے اس دعوے کی توثیق ہو رہی ہے کہ خود یہ جوگی ان بزرگوں کی خدمت میں کبھی کبھی استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔[1]

بہرحال حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ "من از و پرسیدم کہ شما کدام راہ می روید اصل کار در میان شما چیست" آپ دیکھ رہے ہیں کہ سوال کا لہجہ کیا وہی نہیں ہے جو آج بھی جب کبھی ملنے جلنے والے پوچیڑی ہندو یا سادھو سے کسی مسلمان کی ادھر ادھر ریل پر یا کسی مقام پر ملاقات ہو جاتی ہے، تو عموماً تفنن طبع کے لیے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی! تم لوگ کیا کرتے ہو، جوگی نے جواب دیا، سلطان المشائخ نے اسے بھی فرمایا ہے۔

اد جوگی گفت در علم ما چنیں آمدہ است کہ در نفس آدمی دو عالم است یکے عالم علوی و دوم عالم سفلی از نارک (چندیا) تا ناف عالم علوی ست، و از ناف تا قدم عالم سفلی است"

یہ انسانی نفس کی تقسیم ہوئی، آگے اس نے کہا کہ

سبیل کار آن است کہ در عالم علوی ہمہ صدق وصفا و اخلاق خوب و حسن معاملہ باشد، و در عالم سفلی نگہداشت و پاکی و پارسائی۔

مطلب جوگی کا یہ تھا کہ ناف کے اوپر جتنے اعضا ہیں مثلاً دل ہے، آنکھیں ہیں، زبان ہے، دماغ ہے، کان ہیں، زیادہ تر اخلاقی اعمال کا ان ہی سے تعلق ہے، اور ناف کے نیچے جو اعضا ہیں عفت و پارسائی، پاکی وغیرہ کا ان ہی سے تعلق ہے، ایک اچھی تقسیم تھی جو جوگی نے بیان کی

---

[1] اسلامی صوفیۂ ہند کے پاس جوگیوں کی آمد و رفت استفادہ کے لیے ہوتی تھی چاہا جائے تو اس کے متعلق ایک الگ مضمون تیار کیا جا سکتا ہے بخوف طوالت میں نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ورنہ دلچسپ باتیں سننے میں آئیں کم از کم ثمرۃ الفوائد نامی کتاب جو حضرت شاہ بھیک قدس سرہ کے حالات میں ہے مطالعہ کیجیے۔ بیسیوں واقعات اس سلسلہ کے آپ کو ملینگے ۱۲۔

Marfat.com

سلطان المشائخ فرماتے ہیں۔" مرا این ز

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جن بزرگوں کا سارا سرمایہ جوگ ہی سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے، کیا وہ اس ندرت کے ساتھ جوگی کی ایک اچھی شاعری کا داد کے ساتھ تذکرہ کر سکتے ہیں۔

کبھی مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان جوگیوں، سادھوؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد ہی میں منقول ہے، امیر حسن علا فرماتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کی تنخواہ (مواجب) جس کی وجہ انھوں نے نہیں لکھی ہے رک گئی تھی۔ توقف موجب دلتنگی بود، مجلس مبارک میں حاضر ہوا کسی بزرگ کے حوالہ سے حضرت نے یہ قصہ بیان کیا کہ کسی شہر میں" برہمنے بود مال بسیار داشت" شہر کا والی کسی وجہ سے برہمن سے بگڑ گیا، اور جو کچھ اس کے پاس تھا سب کی ضبطی ہو گئی، غریب برہمن ولنے والے کو محتاج ہو گیا۔ ایک دن جا رہا تھا، راستہ میں کسی دوست سے ملاقات ہوئی اُس نے حال پوچھا برہمن نے کہا" نیکو وخوش می گذرد" یعنی خوب گذر رہی ہے، دوست نے کہا ہر چیز تو تمہاری چھن گئی" خوشی ترا از کجاست" جواب میں برہمن کا یہ فقرہ زنار من با من ست" میرا جنیو تو میرے ساتھ ہے، امیر حسن کہتے ہیں کہ اس فقرہ نے میرے دل کو ہلکا کر دیا۔ خیال یہی ہوا کہ از توقف مواجب و نایافت اسباب دنیا ہیچ غم نمی باید خورد اگر ہمہ جہاں برود با کے نیست محبت حق می باید کہ برقرار باشد بندہ تقریب آں تقریر ہمیں تصور کرد (ص ۱۵۶)

عبرت دلانے کے لئے اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات میں بھی ہے حضرت فرماتے ہیں کہ ایک تارک الدنیا سادھو در راجگیر رسیدہ بود، راجگیر اس مقام کا نام ہے جہاں حضرت والا ریاضت و مجاہدہ میں ایک مدت تک مشغول رہے تھے۔ چند پہاڑیاں ہیں جن سے گرم اور سرد چشمے تا یادگار زمانہ سے اُبلتے رہتے ہیں، ایک گرم چشمہ اب اس وقت تک مخدوم کنڈ کے نام سے حضرت والا کی طرف منسوب ہے موجودہ قصبہ بہار سے بجانب مغرب جنوب راجگیر کی یہ پہاڑیاں ہیں، بہرحال حضرت فرماتے ہیں کہ سادھو "بے از سنگ

Marfat.com

ترا شیدہ و از دست چپ گرفتہ استادہ ناخنہا چناں بزرگ شدہ کہ گرد بہ گرد دست پیچیدہ" الغرض اس بت کو مٹھی میں دبائے یہ جوگی سالہا سال سے یونہی کھڑا ہوا تھا "استنجا بہ پا می کرد" ناگاہ ایک دن مٹھی کھل گئی، بت گر گیا، حضرت کا چشم دید واقعہ ہے کہ سادھو "بہ نشست" کھڑا تھا بیٹھ گیا، آغاز کرد کہ "من چندیں سال ترا پیش نظر می دارم و از عشق و محبت تو ہمہ را ترک دادہ ام اکنوں اگر تو مرا دوست داشتی از من جدا نمی شدی پس ہرگاہ مرا دوست نمی داری مرا زیستن نہ شاید در حال کاردے بستد ہماں جا حلق خود را ببرید" اور مر گیا، مخدوم نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا "ہندوئے در محبت سنگ پرکالہ ایں چنیں می کند مومن در دین حق اگر ایں چنیں کند چہ عجب" (ص ۲۰۵ معدن المعانی) خلاصہ یہ ہے کہ ان جوگیوں کا ذکر جن کی مجلسوں میں اس حیثیت سے آتا ہو، خیال کرنے کی بات ہے کہ ان ہی کے مسلک و مشرب کے کیا وہی لوگ پیرو ہو سکتے ہیں؟

واقعہ تو یہ ہے کہ بول چال کی عام زبانوں کے سوا جس کا مرکز ابوالفضل آئین اکبری میں دلی کو بتاتا ہے[۱] صوفیا، ہند کے اساطین و اکابر کا عموماً ہندوؤں کی کسی علمی زبان سے بھی واقفیت

---

[۱] ابوالفضل نے آئین اکبری میں ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی اچھی تقسیم پیش کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ اس ملک کے ورگ "بغرادان زباں می سرائند" لیکن ان زبانوں میں جو اختلافات ہیں ان کی نوعیت دو قسم کی ہے، اختلافات کی ایک شکل تو وہ ہے کہ باوجود اختلاف کے یہ اختلاف باہمی افہام و تفہیم میں مانع نہیں ہوتا یعنی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "آن اختلاف کہ از فہمیدگی یک دیگر باز ندارد از شمارہ بیروں" اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافات کا اگر خیال کیا جائے تو جیسا کہ تجربہ کاروں سے سننے میں آتا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، لیکن باوجود اس اختلاف کے جب باہم ایک دوسرے کی سمجھ لیتے ہیں تو ایک ہی زبان سمجھی جائیگی۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اختلاف کی وجہ سے ان مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے، اسی کا نام اس نے "ایچ نیازمند دریافت" رکھا ہے، اختلاف کی آخری قسم کو پیش نظر رکھ کر اکبر کے زمانہ میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کی تقسیم ان کے مختلف مقامی مرکزوں کے اعتبار سے بایں الفاظ کرتا ہے۔

دہلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹ، کرناٹک، سندھ، افغانستان، شال درمیان سندھ کابل و قندھار است، بلوچستان، کشمیر۔

جن زبانوں میں اسی قسم کا اختلاف ہے کہ ان کے بولنے والے ایک دوسرے کی نہیں سمجھ سکتے، ابوالفضل کے حساب سے عہد اکبری میں ان کی تیرہ قسمیں تھیں، جن میں بارہ قسمیں ایک طرف اور دلی کی زبان (باقی بر صفحہ ۶۰)

Marfat.com

نہ تھی، ان پر یہ کتنا بڑا ظلم توڑا گیا ہے، کہ ان کی ساری زندگی کو ہندوستان کے تصوف کا عکس قرار دیا جاتا ہے، میں تو اب تک یہی نہ سمجھ سکا کہ ہمارے بزرگوں کی طرف یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوؤں سے تصوف کا فن سیکھا تھا آخر اس کے ثبوت میں لوگ کہتے کیا ہیں: یا یونہی کسی نے بات ایک اڑا دی، اور بے سمجھے لوگوں نے اسے دہرانا شروع کیا، آخر کوئی بات تو مشترک پیدا کی جاتی، اتنا بھی یہ لوگ نہیں سوچتے کہ اس زمانہ میں مسلمان اس ملک کے حاکم تھے، عام طور پر حاکم قوموں میں اپنی رفعت وبلندی کا جو شعور ہوتا ہے، وہ محکوم قوموں کی چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کب دیتا ہے کسی چیز کی کس مپرسی کے لیے ہر زمانہ میں یہ بات کافی سمجھی گئی ہے کہ اس کا تعلق محکوم قوم سے ہے آج خود ہم مسلمانوں کا کیا حال ہے، ہماری محکومیت ہماری پوری زندگی کی تحقیر وتوہین کے لیے کافی ہے، دوسروں میں نہیں خود اپنوں میں جب مسلمانوں کی وضع وقطع شکل وصورت آج جس نگاہ سے دیکھی جارہی ہے اسی سے اندازہ کیجیے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کی کن چیزوں کی مسلمانوں کی نظر میں کیا قیمت ہوگی میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان صوفیہ نے سب کچھ ہندو سادھوؤں، اور سنیاسیوں سے اخذ کیا تھا، تو آخر جب اکبر نے اپنا رجحان ہندو مذہب کی جانب ظاہر کیا، تو اس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش وہی لوگ کیوں تھے، جن کا تعلق مسلمانوں میں طبقہ صوفیاء سے تھا۔

ملا عبد القادر ہوں، یا حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی، یہی لوگ تو اکبری دین کی مخالفت کے علمبرداروں میں ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں ہی صوفی المشرب ہیں، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر کچھ کہا بھی جا سکتا ہے، ملا عبد القادر کی تو پوری زندگی صوفیوں کی ہے، وہی مسلک وہی مشرب ہے، جو ہندوستانی صوفی رکھتے تھے، لیکن اکبر کی مخالفت میں ان سے زیادہ بدنام کون ہے؟ اگر وہی خیال سچ ہوتا جسے آج پھیلایا جارہا ہے، تو ہندی صوفیوں کے تو دل کی بات تھی جسے اکبر بزور حکومت انجام دینا چاہتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹) ایک طرف تو جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بازہ علاقوں کے سوا ساری ہندوستان کی زبان اسی زمانہ سے ایک تھی، مقامی اختلافات سے اس زبان کی وحدت متاثر نہیں ہوتی تھی آج کل اسی کو ہم اردو کہتے ہیں جس کی صحیح تعبیر ہم از تمہیدگی یک

ہندوستان کے خواجگان چشت کا تصوف

بہرحال اب تک تو اس بے بنیاد، یا در ہوا بات کی تردید میں میں نے چند سلبی اور منفی اِن کا ذکر کیا ہے، دراصل جس کا ذکر مقصود تھا، اب اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ یوں تو رفتہ رفتہ ان چھ سات صدیوں میں جب سے ہندوستان باضابطہ دارالاسلام بنایا گیا، مختلف زمانوں میں اسلامی تصوف کے مختلف سلاسل اور طرق کے اولیاء اللہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس سرزمین کو سرفراز فرماتے رہے، اور اب تو یہ واقعہ ہے کہ مشہور خانوادوں میں شاید ہی اب کوئی خانوادہ باقی ہوگا جس میں منسلک ہونے والے لوگ اس ملک میں نہ پائے جاتے ہوں، خصوصاً قادریہ اور نقشبندیہ اور اس کے بعد سہروردیہ سلسلوں نے اس ملک میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ پہلا قدم مبارک جس بزرگ کا ایک خاص شان آن بان کے اس ملک میں آیا وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے، آج ہی نہیں اسی صدی میں یہ اشعار تقریباً ہندی مسلمانوں کے گھر گھر میں پڑھے جاتے تھے۔

انجا کہ بود نعرۂ فریاد مشرکاں اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر ست

سمجھا جاتا تھا کہ یہ خواجہ بزرگ کی قدموں ہی کی برکت کا نتیجہ ہے۔

پس میں اب بتانا چاہتا ہوں کہ صوفیہ کے جس طریقہ کا نام طریقہ چشتیہ ہے اور جس کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جیسے نقشبندیہ کا مرکز بخارا اور ترکستان، شاذلیہ کا مغرب اور تیونس، سہروردیہ کا بغداد، بدویہ کا مصر ہے، اسی طرح چشتیہ طریقہ کو کچھ ہندوستان کے ساتھ خصوصیت ہے[1]۔

---

[1] میں نے قادریہ کا ذکر اس سلسلہ میں قصداً اس لیے نہیں کیا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، طریقہ قادریہ کو کسی اسلامی ملک سے کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں اسلام ہے قادریہ طریقہ بھی وہاں اس کے ساتھ پہنچا ہے یہ حضرت سیدنا شیخ جیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلالت قدر کا اثر ہے کہ وہ سارے اسلامی ممالک پر حاوی ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء و قدمی علی رقبۃ کل ولی کا شاید یہی مطلب ہو ۱۲

اس زمانہ میں چشتی اور چشتیت کے مفہوم کو کچھ گانے بجانے، چنگ و نے، دف و چغانہ کے ساتھ کچھ اس طرح لازم کردیا گیا ہے کہ لفظ چشتی کے بولنے کے ساتھ ہی گویا مخاطب کا ذہن رقص و سرود کے ان ہی سامانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ سماع کا تعلق چشتی طریقہ سے کیا ہے۔ اس کا ذکر تو ان شاء اللہ آخر میں کرونگا، لیکن اس زمانہ میں تحقیق و مطالعہ کے بغیر کسی معمولی مناسبت کو واسطہ بنا کر جو نتائج پیدا کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ استدلال کے اسی طرزِ جدید کا نتیجہ ہے کہ انسان اور بندروں میں صوری مشابہت جو پائی جاتی ہے محض اسی مشابہت کو واسطہ بنا کر مسئلۂ ارتقاء پر لائبریریاں تیار کردی گئی ہیں، یہ عہد جدید کا خاص لطیفہ ہے۔

تصوف کو جوگیت قرار دینے والے تو خیر وہ لوگ تھے جنہیں صوفیاء اور تصوف سے ہمدردی نہیں ہے لیکن اس غریب تصوف کے غم گساروں نے بھی غم گساری کا جو فرض ادا کیا ہے اس کی ایک مثال وہی توجیہ ہو سکتی ہے جو "طریقہ چشتیہ" میں گانے بجانے کے رواج کو پا کر اس زمانہ میں بکثرت مختلف الفاظ میں مختلف دائروں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک خاص قسم کا ملک تھا یہاں کے عام باشندوں میں موسیقی سرود و نغمہ وغیرہ کا شدید میلان پایا جاتا تھا، باشندگان ملک میں رقاصی اور نغمہ نوازی کے اسی میلان کو دیکھ کر بزرگان چشت نے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ مناسب خیال کیا کہ ان کے اسی مذاق سے نفع اٹھایا جائے اور یوں چشتی طریقہ میں اسی مصلحت سے گانے بجانے کو مروج کیا گیا، نادان دوستوں کی ذہانت کی داد دینی چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اس ہمت کی کہ بنیاد ہو یا نہ ہو لیکن دماغ میں جو خیال آگیا اُس کے آگے بڑھانے میں ان لوگوں کو کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

کچھ نہیں تو کم از کم ایک ہی واقعہ بھی ان لوگوں کو کہیں ایسا مل جاتا کہ ایک ہندو محض صوفیوں کی محفل کے گانے سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تو کہا جاسکتا تھا کہ اس زمانہ میں اس قسم کے جزئیات سے کلیات بنانے کا جب عام رواج ہی ہے تو کیا مضائقہ ہے کہ ایک جزئی واقعہ سے کلی توجیہ پیدا کر دی گئی، مگر میں جانتا ہوں اس سلسلہ میں ان کے پاس ایک واقعہ بھی تو نہیں ہے۔

اب اسے میں صرف شاعری نہ سمجھوں تو اور کیا سمجھوں، اور شاعری میں بھی بہرحال تشبیہ اور استعارہ کی وجہ شبہ ہوتی ہے، یہاں تو وہ بھی نہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ گانے بجانے کو ہندستان کی فطرت کے ساتھ آخر کس بنیاد پر مخصوص سمجھا جا رہا ہے، دنیا کی کونسی قوم کونسا ملک ہے جہاں کے لوگوں میں اس کا ذوق نہیں، ہم تو سنتے ہیں کہ عرب کا اونٹ بھی گانے سے متاثر ہوتا اور تال و سر پر ناچتا ہے، تھرکتا ہے، آپ جنگلی جزیروں میں چلے جائیے، بش مینوں اور صحرائیوں کو پائیگا کہ ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے ہندستان کے عوام گلے میں ڈھول ڈالے ناچتے گاتے بجاتے اچھلتے پھاندتے پھرتے ہیں بجنسہ اسی شکل اسی صورت میں وہ بھی گاتے بجاتے اچھلتے کودتے ہیں۔ پھر اس ملک کی اس مسئلہ میں کوئی خاص خصوصیت کیا ہے، سمجھ میں نہ آیا' یورپ بااین ہمہ دعوی تہذیب و شائستگی اب بھی ناچتا ہے، گاتا ہے، بجاتا ہے، بلکہ ہندستان نے تو شاید گانے بجانے کے آلات کے ایجاد کرنے میں وہ کمالات بھی نہیں دکھائے ہیں، جو یورپ آج ہی نہیں ہمیشہ سے دکھلا رہا ہے، آپ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے تو نظر آئیگا کہ شروع شروع میں یورپ کے باشندے جو اس ملک میں آئے ہیں تو نچنیے بھیجے، تماشاگروں کی ہی حیثیت سے آئے ہیں، تاجروں اور سوداگروں کا بھیس تو انہوں نے بعد کو بدلا ہے، ابتدا میں ان کی طرف توجہ ہندی بادشاہوں کو ان کے خاص خاص باجوں ہی کی وجہ سے ہوئی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے، مجدد الف ثانی والے مقالے میں بعض چیزیں اس سلسلہ میں میں نے نقل بھی کی ہیں۔ رہا فنی حیثیت سے میوزک کا علم ہندوؤں میں ضرور تھا لیکن اس سے پہلے مسلمانوں میں یہ چیز یونانیوں کی راہ سے آچکی تھی اور عباسی خلافت ہی کے زمانہ سے اس فن میں مسلمانوں کے عیاش امیروں نے اتنی سرپرستی کی تھی کہ اس میں بھی کوئی خاص فضیلت اس ملک کو باقی نہ رہی تھی، اور ہو بھی تو اس کا تعلق خواص سے تھا۔ اور یہاں تو کہا جاتا ہے کہ گلے میں ڈھول ڈال کر عام طور پر جو ہندوستان میں عوام ادھر ادھر ناچتے بجاتے پھرتے ہیں، ان کو مائل کرنا مقصود تھا۔

Marfat.com

واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ اسلام کا مسئلہ نہ اتنا آسان تھا اور نہ ہے کہ صرف چند غزلوں کے الاپنے سے اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہو، اور نہ ہندو اتنے بے وقوف تھے کہ وہ صرف گانے پر شیفتہ ہو کر اپنے آبائی دین اور دھرم کو چھوڑ دیتے، گانا بجانا تو بڑی چیز ہے، آپ جن بزرگوں کو متہم فرما رہے ہیں کہ انہوں نے تبلیغ اسلام کی راہ یہ نکالی تھی اس کی تائید میں تو کوئی چیز آپ پیش نہیں کر سکتے لیکن میں آپ کی خدمت میں تجربہ کی وہ بات پیش کرتا ہوں جو ہندو قوم کے نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد "طریقہ چشتیہ" کے رکن اعظم حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا تھا، فوائد الفواد میں ہے ایک غلام جو مسلمان تھا وہ حضرت کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا اور "یک ہندوے در برابر خود آورد و گفت کہ ایں برادر من است" جب دونوں بیٹھ گئے تو جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ "خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر ازاں غلام پرسید کہ ایں برادر تو ہیچ میلے بہ مسلمانی دارد" جواب میں اس مسلمان غلام نے عرض کیا کہ "او را بحبت اقدام بحبت ایں معنی آوردہ ام تا بہ برکت نظر مخدوم مسلمان شود" اس مسلمان غلام سے یہ سننا تھا کہ جامع ملفوظات کہتے ہیں "خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چشم پر آب کرد" حضرت والا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، کیا خیال آیا، ظاہر ہے کہ اس غریب ہندو بیچارے کے انجام کا خیال آیا اور اسی کے ساتھ اپنی بے بسی کا جس کا اظہار حضرت ہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں "فرمود کہ ایں قوم را چنداں بگفت کسے دل نہ گردد" یعنی صرف باتوں سے کوئی چاہے کہ ہندو قوم کے دل کو ان کے دھرم کی پھیر دے یہ مشکل ہے، یہ تھی پتہ کی وہ بات جو وہی کہہ سکتا ہے جسے اس راہ کا کچھ تجربہ ہو، اور کچھ دن اس مسئلہ کو اس نے سوچا ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام اپنے خواص کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ہیں، ہر انقلابی اقدام میں ان کی نظر ان ہی لوگوں پر رہتی ہے، جن کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ ہے میری مراد برہمنوں سے ہے، اور برہمنوں کا حال یہ ہے کہ ان کو کوئی گا بجا کر کیا مسلمان کر سکتا ہے، ان کا تو کسی کی تقریر اور تحریر سے بھی متاثر ہونا آسان نہیں ہے۔ آپ ان کے سامنے مذہب کو جس حد تک بھی فلسفہ بنا کر پیش کیجیے، وہ آپ کے سامنے اس سے زیادہ فلسفیانہ گفتگو شروع کر دینگے۔ اس قسم کی مذہبی اور دینی تقریروں کی اس ملک میں کیا کمی ہے، ان برہمنوں کو ہزار ہا ہزار

Marfat.com

سال اطمینان کے ساتھ روٹی کھانے کا موقع ملا ہے، ان پر نہ حکومتوں کے بدلنے کا اثر پڑتا تھا، نہ سلطنتوں کے، کیونکہ ایک راجہ کو مار کر دوسرا راجہ اگر گدی پر بیٹھتا تھا تو برہمن کی خدمت اس پر اسی طرح واجب ہوتی تھی جتنی پہلے پر، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کو فلسفہ بنانے کا کام ہندوستان میں بڑے اطمینان سے انجام دیا گیا ہے، اپنشد جسے دیکھ دیکھ کر آج یورپ بھی حیران ہے، وہ کیا ہے! کیا واقعی خالص کوئی فلسفہ ہے؟ یقیناً مذہب ہے جسے فلسفہ بنایا گیا ہے، وہ وہ لن ترانیاں ہیں، اور دور کی کوڑیوں کے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج ہندو فلسفہ کی کتابوں سے ہر اس فلسفہ کا طلسم کھڑا کیا جا سکتا ہے، جو یونانیوں نے بلکہ آج میٹافزکس (مابعد الطبیعیات) کے مسائل میں یورپ نے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ مذہب کو قصہ کہانی کی شکل میں جس میں خوارق اور عجائب کا ذکر ہو اگر ان کے سامنے پیش کرینگے تو وہ آپ کے آگے اس سے بھی عجیب تر چیزوں کو اپنے پرانوں اور مہابھارت، رامائن وغیرہ سے اخذ کر کے رکھ دینگے۔ اور عام طور پر غلط طریقہ سے مذہب کی تبلیغ کی جب کوشش کی گئی ہے تو عموماً یہی دو راہیں اختیار کی جاتی ہیں، مذہب کو فلسفہ بنایا جاتا ہے یا مذہب کو خیالی افسانوں، محیر العقول خوارق اور اعجوبہ طرازیوں سے بھر کر پیش کیا جاتا ہے، ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ ان میدانوں میں وہ آگے بڑھے ہوئے ہیں بلکہ اس ملک کے عام باشندے برہمنوں کے جن بجوں میں ہزار ہا ہزار سال سے گرفتار ہیں اس کی وجہ ہی یہ ہے، یہی دو حربے ہیں جن میں اپنشد اسے تو سوچنے والے ارباب فکر کو گھیر لیا جاتا ہے، ان کے سامنے وہ آسمان و زمین کی باتیں سنائی جاتی ہیں کہ بہر حال انہیں اپنی عقلی پرواز کی درماندگی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اور پرانوں کے عجیب و غریب قصوں کا پھندا عوام کے گلوں میں پڑا ہوا ہے، بڑے سے بڑا معجزہ بڑی سے بڑی کرامت جو سوچی جا سکتی ہے وہ آپ کو ان کی کتابوں کے ورق ورق پر ملیگی۔ بھلا جاہلوں کا جو گروہ ان کو سنتے ہوئے ہے اس پر واقعی معجزات اور کرامات کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، آپ تو واقعہ بیان کرینگے، اور وہاں یہ کیا گیا ہے کہ جس قسم کے مستحیلات و ناممکنات عقل سوچ سکتی ہے سب ہی کے متعلق لکھ دیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں واقع ہو چکا ہے خیال کرنے کی بات ہے کہ جس قوم کی نفسیاتی

لہ کچھ نہیں تو مہابھارت ہی پڑھیے جا بجا کسی درخت کا اچانک آدمی ہو جانا آدمی کا درخت ہو جانا۔ لڑکے کا جوان۔ جوانوں کا بڑھوں کی صورت اختیار کرنا۔ ناڑی کا تلوار کی صورت، تلوار کا کسی اور ... غرض ہر ناممکن کو ممکن بنا دینا ہی نہیں بلکہ قدم قدم پر واقعے کی شکل اختیار کرتے جو ملتے ہیں آپ اس کتاب میں پائیں گے۔ اس کے ماسوا

حالت یہ ہو، اس کے متعلق یہ کتنی پھسپھسی بودی بات ہوگی کہ چشتی فقراگا بجا کران کو مسلمان کرنا چاہتے تھے، یا اس ذریعہ سے ان کو مسلمان کرنے میں وہ کامیاب ہوئے، مگر یہ تو آپ فرماتے ہیں یہی جنہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اس ملک کے غریب ہندوؤں کے متعلق ہم پر کوئی فریضہ عائد ہوتا ہو بھی یا نہیں۔

پر جس کا سینہ نسل آدم کی اتنی بڑی تعداد کی گمراہیوں کو دیکھ کر شق ہوا جاتا تھا، آپ نے دیکھا کہ ذکر کے ساتھ ہی وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا، اور اس قوم کے متعلق جو صحیح تشخیص ہو سکتی تھی، اس کا اظہار ان مختصر الفاظ میں کیا گیا، یعنی صرف باتوں سے ان کو مسلمان کرنا آسان نہیں ہو، باتوں کی تو ان کے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہو، اور ہر طرح کی باتوں کی، یہ تو اس قوم کے متعلق منفی رائے ہوئی، رہی یہ بات کہ پھر اسلام سے روشناس کرانے کی آج کوئی تدبیر ہندؤں کے لیے ہو بھی، یا نہیں، سلطان المشائخؒ نے اس کے بعد اس کا بھی جواب دیا ہو، اسی کے بعد ارشاد ہو:۔

"اما اگر صحبت صالحے بیابد اُمید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود" (ص ۱۸۲)

مقصد مبارک یہ ہو کہ بات کی حد تک تو ان کے یہاں کوئی خلا نہیں ہو، تو اس میں باہر سے کسی چیز کے بھرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہو۔ البتہ ایک چیز کی ان کے یہاں کمی ہو یعنی باوجود سب کچھ ہونے کے چونکہ ہندوؤں کے پاس دین کا جو سرمایہ بھی ہو اس کی انتہا یقین پر نہیں ہوتی کیونکہ یقین، ایسا یقین جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ ہو، اس کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہو پرانوں میں عجیب عجیب قصے ضرور ہیں، الف لیلہ سے بھی عجیب تر قصے؛ لیکن عوام کا خیال کچھ ہی ہو، ان کے خواص تو جانتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں مختلف برہمنوں نے یہ قصے خود ہی

دیگر قصص و حکایات کا تقریباً ایک ایسا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے جس میں مذہبی رنگ کی شرکت ہے اور اس کو واقعیت کا درجہ مل چکا ہے۔

Marfat.com

گڑھ لیے ہیں، اور یہی حال اپنشدوں کا ہو کہ وہ فلسفہ ہے اور فلسفہ جو صرف مطمئن دماغوں کے مالیخولیا کا نام ہو، اس میں اور یقین میں تو آگ اور پانی کا تعلق ہو۔ وہ دوسروں میں ضرور یقین پیدا کرنا چاہتا ہو لیکن خود یقین سے خالی ہوتا ہو۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہو بے دیکھے کہتا ہو۔ بے جانے کہتا ہو، آنکھیں بند کیے باتوں سے باتیں پیدا کرتا جاتا ہو، خیالات کی تعبیر کی بھی قوت اگر کسی میں اس خیالی پرواز کے ساتھ ہوئی۔ بس یہی بنا بنایا فلسفہ ہو، ظاہر ہو کہ کہیں ان خیالی باتوں سے آدمی اپنے اندر کسی قطعی اور یقینی پہلو کا لازوال اذعان اور نہ ٹلنے والا اٹل اعتقاد پیدا کر سکتا ہو، دوسروں کے سامنے ممکن ہو اپنے الفاظ سے یہی باور کرانے کی کوشش کرے لیکن اس کی مثال ٹھیک اس اندھے کی ہوگی جس کی آنکھ آفتاب کو نہیں دیکھ رہی ہو لیکن یوں ہی ایک خیال قائم کر کے کہ آفتاب نکل چکا ہوگا اعلان شروع کر دے کہ آفتاب کے نکلنے کا مجھے قطعی یقین ہو، ممکن ہو کہ آفتاب واقع میں نکلا ہوا ہو بھی، لیکن اندھا تو صرف ایک خیالی بات کہہ رہا ہو، اور جس کیفیت کی تعبیر وہ قطعی یقین سے کر رہا ہو وہ واقع میں قطعی یقین نہیں ہو۔

یہی حال ہندوؤں کا ہو ان کے پاس فلسفہ بھی ہو اور ان کے پاس خوارق ونوادر کے قصوں کا عظیم الشان ذخیرہ بھی، لیکن جس سے یقین کی واقعی اور حقیقی روشنی آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہو، اس ذریعہ سے وہ محروم ہیں، اور جب تک خود اپنے مسلمات پر آدمی کو کامل یقین نہ ہو، اس کی زندگی ان مسلمات کے دباؤ کو جیسا کہ چاہیے محسوس نہیں کرتی، اسی لیے مذہبی مسلمات کا جو نتیجہ ہو یعنی "صلاح وتقویٰ" حقیقی معنوں میں یہ ان میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا لمبی چوڑی باتوں کے باوجود فلسفیانہ عقائد رکھنے والوں کی خانگی زندگی کا جب جائزہ آپ لینگے، اس کو ان کے عقائد کے مطابق بہت کم پائینگے۔

ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں کا صلاح وتقویٰ کے لحاظ سے کیا حال ہو اس کا تجربہ بہ نسبت دوسروں کے خود ان کی قوم کے لوگوں کو زیادہ ہو سکتا ہو کچھ نہیں تو ان کے گھر کے بھیدی خود پنڈت دیانند جی سرسوتی مہاراج ہیں، آپ ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش ہی

Marfat.com

اُٹھا کر پڑھ لیجیے۔ برہمنوں کی اندرونی زندگی کی ناگفتہ بہ مفصل رپورٹ اسی میں آپ کو مل سکتی ہے اور یقین کی محرومی کا قصہ کچھ بیچارے برہمنوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، آج دنیا میں جتنی بھی مذہبی قومیں ہیں مثلاً یہودی نصرانی، بودھسٹ، پارسی وغیرہ، سب ہی کا یہی حال ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہستی کا یہ معمہ ایک راز ہے جس پر پردہ پڑا ہوا ہے، ایسا پردہ؟ ع

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

عقل کے ناخن اس گرہ کے کھولنے میں نہ پہلے کامیاب ہوئے نہ اب کامیاب ہیں نہ آئندہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک گرہ کھلتی ہے کہ معاً ع گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد۔[۱] لے دے کر صرف ایک ہی صورت ہے کہ خود معمہ بنانے والا اپنی مہربانی سے اس "اٹھائے نہ بنے والے" پردہ کو اُٹھا دے، اپنی پہیلی خود ہی سمجھا دے کہ اسی کے فیصلہ کے ساتھ خود ہم میں ہر شخص کے آغاز و انجام کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ زمین کے کرہ پر جب سے انسانیت کی نمائش ہوئی ہے خالق کردگار کی طرف سے اس مہربانی کا ظہور بھی ان لوگوں کے ذریعہ سے ہوتا رہا ہے جنہیں خدا اپنا علم دیتا ہے اور خدا کے اسی عطا کیے ہوئے جواب کو وہ عام انسانوں میں تقسیم کرتے ہیں، دنیا کی ساری قومیں اس کی شاہد ہیں کہ اس ذریعہ سے ان کے پاس بھی جواب آیا تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ خدا کا وہ بتایا ہوا جواب مختلف اسباب و وجوہ کے زیر اثر اپنی خالص حالت میں باقی نہیں ہے، اس تریاق میں زہر شریک ہو چکا ہے انسانوں نے مختلف زمانوں میں اپنے مختلف خیالات کی اس میں آمیزش کی ہے، ایسی آمیزش کہ ایک کو دوسرے سے اب جدا کرنا انسانی قوت کی حد پرواز سے خارج ہے۔[۲]

---

[۱] اس زمانہ میں یورپ والوں نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میٹافزکس (فلسفہ مابعد الطبیعات) یا حقیقت کون کے مسائل مبدأ و معاد کے متعلق اگناسٹک (ارتیابیت) کے فلسفہ کو انہوں نے خوب منقح کر کے رکھ دیا ہے گو اگناسٹک دنیا کے پرانے فلسفی نظریات میں ایک قدیم نظریہ ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ پہلے اس پر اتنی توجہ کبھی نہیں کی گئی جتنی کہ یورپ میں کی گئی اگناسٹک دراصل انسانی جہل کا تحقق ہے، یہی جہل اس علم کی راہ درست کرتا ہے جس سے معمۂ کائنات حل ہو جاتا ہے۔

[۲] تفصیل کے لیے تو دنیا کے تمام مذاہب کی آسمانی کتابوں کی تحقیقی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ (باقی بر صفحہ ۶۹)

Marfat.com

پس گو خدا کا بانا ہوا علم جسے ہر زمانہ میں ہر قوم کو بخشا گیا تھا، کسی نہ کسی صورت سے سب کے پاس موجود ہی، لیکن یقین کی جو کیفیت اس علم سے پیدا ہو سکتی تھی اس کی جس چیز میں حقیقی ضمانت پوشیدہ ہے اس کے فقدان نے یعنی بیرونی آمیزشوں نے اس تاثیر کو باطل کر دیا ہے، آدمی لاکھ ان کے ساتھ اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہیگا، لیکن مطمئن نہیں ہو سکتا، ہو سکتا ہے کہ اپنی اس بے اطمینانی کا اسے شعور بھی نہ ہو، لیکن یقین اور قطعیت سے جو اثر پیدا ہو سکتا ہے اس کی آفرینش اور تولید تو ہی نہیں سکتی اور یہی ایک واحد چیز ہے، جو صرف مسلمانوں کے پاس ہے، جسے دوست ہی نہیں دشمن بھی جانتے ہیں ورنہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں ایسا کونسا مذہب ہو جس کے پاس کوئی اخلاقی نظام نامہ نہیں ہے کس مذہب میں جھوٹ چوری، زنا، دغابازی، فریب کی اجازت دی گئی ہے اور راستبازی، دیانت، امانت، پارسائی، پاک دامنی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے حتیٰ کہ خالص عباداتی چیزیں الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الصوم (روزہ) آپ کو قرآن ہی بتائیگا کہ قدیم سے قدیم دیانات و ملل کے عناصر بھی یہی تھے، انتہا یہ ہے کہ الحج ماسوا اس کے کہ یہ ایک قدیم ابراہیمی نسک ہے، یوں بھی جب اقوام کے قبلے کسی زمانہ میں یعنی ان ہی دنوں میں جب ہر قوم کے لیے ان کا مخصوص قومی نبی ہوتا تھا قبلے بھی قومی تھے تو اس کی تردید کیسے ہو سکتی ہے کہ عیسائی یا یہودی یلگرمس اگر بیت المقدس میں جاتے تھے یا دنیا کی قومیں مختلف تیرتھ گاہوں کو جاتی تھیں، ان کی کوئی اصل نہ تھی۔ رہا خالق کائنات اور اس کی توحید کا مسئلہ سو قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ من خلق السمٰوٰت والارض (کس نے آسمان و زمین پیدا کیے) کا سوال جس کسی سے بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۸) خاکسار نے اپنی کتاب النبی الخاتم کے شروع میں کچھ اشارے اس طرف کیے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس مطالعہ کے بغیر ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ کے قرآنی دعووں کی قیمت آدمی پر واضح ہی نہیں ہو سکتی کہ یہ عالم کی ساری لائبریریوں کے مقابلہ میں کھلا ہوا چیلنج ہے ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎ میں نے اپنے دیوبندی اساتذہ جن کا نام صحیح طور پر اس وقت محفوظ نہ رہا یہ بھی سنا ہے کہ دیوبند کے سابق صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یعنی حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام جو اپنے کشفی بیانات میں جماعت دیوبند میں خاص امتیاز رکھتے تھے، کبھی کبھی یہ فرماتے کہ ہر دوار (شری بنی خدا دوار گھر بیت یعنی بیت اللہ)

کیا جائیگا لیقولن اللہ (وہ یہی کہینگے کہ اللہ) صرف خلق کی حد تک نہیں بلکہ تدبیر و تصرف کے کلی و جزئی اعمال بارش برسانا، روزی دینا ان ساری چیزوں کے متعلق بھی قرآن نے اعلان کیا ہے کہ یہ انسانی اعتقادات کے اجزاء عامہ ہیں یوں ہی مجازات و مکافات کا قانون جس شکل میں بھی ہو لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت (یعنی آدمی کو اپنے اچھے کاموں کا نفع بھی پہنچتا ہے اور بُرے کاموں کا ضرر بھی) ان ساری باتوں کا آپ ہی بتلائیے کہ دنیا کی کونسی قابلِ ذکر قوم منکر ہے جب سارے اخلاقی قوانین عباداتی عناصر عقائد کے اصول سارے جہان کی قوموں میں مشترک ہیں۔ تو آپ ہی غور کیجئے قوموں کے مقابلہ میں آپ اسلام کا کیا امتیاز پیش کر سکتے ہیں؟ جزئیات نہ سہی کلیات میں تو سب آپ کے ساجھی اور شریک ہیں اور اس کا بجز علاوہ واقعات کے خود قرآن ہے۔ اس کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو وہی دین دیا جا رہا ہے جو نوحؑ کو ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو عیسیٰؑ کو سب ہی کو دیا گیا تھا۔ قرآن میں وہی ہے جو صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں تھا۔

اب آپ ہی بتلائیے کہ بجز ایک بات کے اگلوں کو جو کچھ خالق تعالیٰ اجل مجدہ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا، خالق کے ان علوم کے ساتھ مخلوقات کی دماغی آمیزشوں نے شریک ہو کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) میں ہر کی پیڑی کے نام سے جو مقام موسوم ہے مجھے اُس میں ایک لاہوتی نسبت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ شاید کچھ اور ہوں لیکن معنی یہی تھے اور اس سے اس بات کی توثیق کہ "لکل امۃ جعلنا انبیاء" کا جب زمانہ تھا تو اس وقت بالکل ممکن ہے کہ اقوام کے قبیلے جیسے مختلف تھے جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان کے مناسک کے مقامات بھی مختلف ہوں ولکل امۃ جعلنا منسکا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ والقصۃ بطولہا ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) نہ گو اس کی کوئی تصریحی دلیل تو میرے پاس نہیں ہے لیکن تمام انبیاء میں صرف دو پیغمبروں کا یہاں انتخاب ایک اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خیال گزرتا ہے کہ مغربی ممالک عموماً مسیح علیہ السلام (جو موسوی دین ہی پر لوگوں کو قائم کرتے تھے) ان کو پیغمبر مانتے ہیں بلکہ ان کا عمل درآمد ان کی شریعت وہی موسیٰ کی شریعت ہے اور مشرقی اقوام ایرانی، ہندی وغیرہ کے متعلق تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ ایرانی اپنا دستور (پیغمبر) اول مرکابابائی کہ کو ٹھہراتے ہیں، ہندو دید کے متعلق مدعی ہیں کہ برہما کے منہ سے نکلا۔ اسی بنیاد پر وید والے اپنے کو برہمن کہتے ہیں۔ نون آرین زبانوں میں یہ ایک نسبت کا قائم مقام ہے۔ گویا مغرب اور مشرق کے دیانات کی طرف یوں اس روایت میں ایماء ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الانسان الکامل" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو قسم کے لوگ ہیں، عوام تو وثنیوں (بت پرستوں) کا گروہ ہے لیکن وہاں کے خواص براہمہ دین ابراہیمی کی یادگار ہیں ۱۲۔

Marfat.com

اس کو مشکوک اور قابلِ اعتماد باقی نہیں رکھا، ایسی کتاب جو خدا کے نام سے نسل آدم کو ان ہی صفات رکھنے والی ہستی کے ذریعے سپرد کی گئی ہو جن صفات کی بنیاد پر قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو پیغمبروں کو دخشوروں کو یا اوتاروں کو مانا ہو، روئے زمین پر بنی آدم کے سارے گھرانوں اور امتوں میں قرآن کے سوا قطعاً کوئی دوسری کتاب ایسی باقی نہیں رہی ہے جو بغیر کسی کمی بیشی اور سرمو تفاوت کے ٹھیک اسی حال میں موجود ہو، جس حال میں دینے والے نے اسے دیا ہو۔ یہ ایسی کھلی ہوئی واضح مین حقیقت ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ جرمنی عالم وان ہیمر کا یہ مشہور فقرہ ہے :-

"ہم قرآن کو محمدؐ کا کلام ایسا ہی یقین کرتے ہیں جیسے مسلمان اس کو کلام الٰہی یقین کرتے ہیں"

(اعجاز التنزیل ص۵۰)

کچھ عیسائیوں ہی کی یہ خصوصیت نہیں ہے جو بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ علی الاتصال عہد نبوت سے موجودہ انسانی نسلوں تک یہ کتاب اس شان کے ساتھ منتقل ہوتی چلی آئی ہے کہ درمیان میں سال دو سال تو کیا لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی کوئی ایسا وقفہ نہیں پیش آیا جیسے یہودیوں یا عیسائیوں یا اسی قسم کی دوسری قوموں کی آسمانی کتابوں کو پیش آیا، یعنی متعدد صدیاں ان کتابوں پر ایسی گذری ہیں کہ ان کا دنیا میں نام و نشان نہ تھا پھر کسی طریقے سے ان کے نام و نشان کا پتہ چلایا گیا، خدا نخواستہ قرآن کے ساتھ بھی اگر ایسا حادثہ پیش آتا کہ مسلمانوں سے (العیاذ باللہ) قرآن لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی الگ ہو جاتا تو اس وقت شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی، لیکن سب جانتے ہیں کہ کم از کم مسلمان اس تاریخی حادثہ میں اب تک تو بحمد اللہ مبتلا نہیں ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ باایں ہمہ سرد مہریاں جو غیر اقوام کے سیاسی اور ذہنی دباؤ سے آہ! کہ اپنی کتاب کے متعلق مسلمانوں میں محسوس ہو رہی ہیں حفاظت قرآن کے ذمہ دار سے اُمید ہے کہ ان کو خدانخواستہ اس حال میں مبتلا نہ ہونے دیگا، بہرحال آئندہ سے نہیں

گذشتہ اور حال کی جو نوعیت ہے، گفتگو اس میں ہو رہی ہے۔ یہ ایسا بدیہی واضح ناقابل تردید واقعہ ہے کہ دوست دشمن کسی کے لیے مجال انکار نہیں۔

اسی لیے میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کی ان ہی باتوں کو جو غیر اقوام میں مشکوک و مشتبہ ہو گئی ہیں، ان ہی کی تصحیح کر کے قرآن نے ان کو قطعی اور یقینی بنا دیا ہے آپ اسلام میں یہ کیا تلاش کرتے ہیں کہ وہ کیا نئی بات بتاتا ہے، وہ نئی بات کا مدعی ہی کب ہے بلکہ جو کچھ ڈھونڈھتا ہے دنیا کے تمام ارباب مذاہب کو ڈھونڈھتا ہے وہ یہی ہے کہ معمہ کائنات، اور راز حیات کے جن بنیادی سوالات کے جوابات بیرونی آمیزشوں سے مشکوک ہو گئے ہیں اور ایسے مشکوک کہ اب خدا کی بات کو آدمی کی بات سے آپ کسی طرح جدا نہیں کر سکتے، ناخن کو گوشت سے چھڑا نہیں سکتے، قرآن ان ہی بنیادی امور کا قطعی واضح غیر مشتبہ علم و یقین آپ کو عطا کریگا، گویا دوسرے لفظوں میں ہر مذہب اور دین والے قرآن میں کسی جدید دین کو نہیں بلکہ اپنے اپنے آبائی دین ہی کو بجائے مشکوک حالت کے یقینی شکل میں پانا چاہیں تو پا سکتے ہیں، یہودیوں کو حضرت موسیٰ کی عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی ابراہیمیوں کو حضرت ابراہیم کی نوحیوں کو حضرت نوح کی از ایں قبیل ہر پیغمبر کی امت اپنے پیغمبروں کی تعلیم قرآن سے پا سکتی ہے اور بچھڑے ہوئے قرآن کے ذریعہ سے پھر اپنے اپنے پیغمبروں تک امت واپس ہو سکتی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوموں کو ان کے پیشواؤں سے توڑنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آئے تھے۔ اور مُصدِّق لما معکم اور "النبیین" کے خاتم کا حقیقی منصب ہی یہی ہے۔

انتہائی دیانتداری اور بغیر کسی پاس داری کے میں اس کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن سے ہٹ کر جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کے مسلمات اور تعلیمات کو مانتے ہیں، مانتے ضرور ہیں لیکن جسے واقعی یقین کہتے ہیں، اس یقین کے ساتھ جزئیات مذہب کے عام تفصیلات ہی نہیں، بلکہ بنیادی امور کا بھی ماننا ان کے لیے ناممکن ہے، انسان بہر حال ایک عقلی فطرت ہے۔ ضد، ہٹ دھرمی، آبائیت جس کی تعبیر اس زمانہ میں قومی روایات یا کلچر وغیرہ سے

(بر صفحہ ۷۳)

Marfat.com

الفاظ سے کی جاتی ہے، ان جذبات کے زور سے لاکھ وہ باور کرانا چاہیں کہ جو چیزیں مشکوک ہیں ہمیں ان پر اسی قسم کا یقین ہے جیسے واقعی یقینی ذرائع سے حاصل ہونے والے معلومات کو مانا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا جو آفتاب کو طلوع ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ کر مان رہا ہو اس کے یقین کی جو کیفیت ہوگی کیا اس کی برابری اس شخص کے ماننے کی کیفیت کر سکتی ہے جس نے یونہی بعض تخمینی قرائن سے باور کر لیا ہو، کہ اُفق سے آفتاب سر باہر نکال چکا ہو۔ مذہب کی بنیاد جن امور پر قائم ہے، جب ان ہی کے متعلق واقعی شک یا یقین نما شک ہو تو پھر ان بنیادوں پر جو تفریعات اور نتائج و آثار پیدا ہوں گے ان کی گرفت میں بھی وہ قوت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی، جو بنیادی امور کے قطعی علم والوں میں پیدا ہو سکتی ہے، آپ قرآن میں پڑھیے یہی راز ہے کہ ان ہی چند بنیادی امور جس پر مذہب کا چکہ گھومتا ہے ان ہی کی یقین آفرینی کے لیے ان کو بار بار مختلف پیراؤں میں دہرایا جاتا ہے، مثلاً حق تعالیٰ کے صفات وکمالات، قانون مجازاۃ، اور ان دونوں سے بھی زیادہ ذریعہ علم یعنی رسول کی رسالت کی صداقت، چاہتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کا یقین انسانی فطرت میں محلول کر دیا جائے کہ سارا دار و مدار تو علم کے ذریعہ کی قوت اور وثاقت ہی پر ہے اب کچھ ہو لیکن آنکھ نہ ہو تو ٹول ٹول کر آپ کن کن چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آنکھ روشن ہو چکی ہے، اب کیا ہے جن چیزوں سے زندگی کا حقیقی تعلق ہے، ان کو آنکھوں سے دیکھ لینے اور اُن کے متعلق قطعی فیصلہ کن علم حاصل

لے یورپ نے انسانیت پر جہاں جیسیوں مظالم توڑے ہیں اُن میں ایک بڑا ظلم اس حدیث العہد لفظ کلچر میں بھی چھپا ہوا ہے۔ قرآن سے پہلے کسی چیز یا مسلک و طریقہ کی صداقت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی تھی کہ ما وجدنا علیہ اٰباءنا الاولین یعنی جس پر اپنے باپ داداؤں کو ہم نے پایا ہے۔ چونکہ یہ وہی ہے اس لیے سچ ہے۔ قرآن نے ڈانٹ ڈانٹ کر اس بیہودہ استدلال کی بنیاد کو مضمحل کیا، لوگ شرمانے لگے کہ صداقت کی دلیل میں باپ دادا کے طرز عمل کو پیش کریں، لیکن یورپ نے پھر کلچر کا لفظ ایسا عطا کیا ہے کہ اس میں لپیٹ کر بیہودہ سے بیہودہ بات پر اصرار کرنا ہر قوم کا گویا جائز قومی حق ہو گیا ہے حتیٰ کہ بھولے مسلمان بھی اب اسی کلچر کے نیچے اپنے دین کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یا للعجب ۱۲

Marfat.com

کر لینے کے بعد غیر اہم امور میں اگر تخمینہ اور قیاس سے بھی کام لیں تو ظن غالب بھی اس کے لیے کافی ہے، لیکن بنیادی امور کو بھی بجائے قطعی اور یقینی بنانے کے جو لوگ صرف شک یا زیادہ سے زیادہ غالب گمان کی راہوں سے پار ہے ہیں، بہ ظاہر اپنے آپ کو لاکھ پائے ہوؤں میں باور کرائیں لیکن یقین کیجیے کہ قطعیت اور لاریبیت کی خنکی سے وہ محروم ہیں، یہ انسانی فطرت کا اٹل قانون ہے۔ مذہب کے بنیادی امور اساسی حقائق کے قطعی لازوال یقین کی ہی دولت گرانمایہ ہے جس کا سرمایہ دار کرۂ زمین پر اسی خدا کی قسم جس نے قرآن نازل کیا ہے۔ قرآن اور صرف

ذلك الكتب لا ريب فيه من رب العلمين ۔ — وہی کتاب ایسی ہے جس میں شک نہیں کہ جہانوں کے مالک کی طرف سے آئی ہے۔

یہی کتاب ماننے والوں میں اس متعدی یقین کو پیدا کرتی ہے، اور وہی پیدا کر سکتی ہے جو ماننے والوں سے نہ ماننے والوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ قرآنی یقین کے اسی آہنی لنگر سے صلاح و تقوی کی جو زندگی اور سیرت جکڑی رہتی ہے، اُسی میں اتنا زور ہوتا ہے کہ سارا فلسفہ، سارے خوارق بے زور ہو کر بازو ڈال دیتے ہیں، کہ بہر حال باہر میں کچھ بھی دعوی کیا جائے لیکن انسانی فطرت کی گہرائیوں میں نہ فلسفہ جڑیں جما سکتا ہے اور نہ عجائب و غرائب مافوق العادات قصے اور افسانے یقین کی اس گرفت اور عدم گرفت کا لوگوں میں شعور ہو یا نہ ہو لیکن انسانی فہم عامہ دونوں کے زور میں فطرتاً فرق محسوس کرتی ہے، مقابلہ کے وقت اس درخت کو سربسجود ہونا پڑتا ہے جس کی شاخیں باہر میں چاہے جتنی بھی پھیلی ہوں لیکن اندر میں اس کی جڑیں جمی ہوئی نہیں ہیں، خواہ لوگوں کو ہم سے اختلاف ہو لیکن میرے دماغ میں تو

ایں قوم (ہندو) را چند اں بگفت کسے دل نہ گردد اما اگر صحبت صالحے بیابد اُمید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود۔ ص۱۸۳

سلطان المشائخ کے قول سے یہی مطلب سمجھ میں آیا، بلکہ چنداں کے لفظ سے حضرت نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ یوں بطور بحث و اتفاق کے گفت یعنی لیکچر، تقریر وغیرہ کی لفاظیوں سے بھی

Marfat.com

بھی کوئی متاثر ہو جائے، لیکن جن حالات میں یہ قوم مبتلا ہے اس کا مقابلہ واقعی قرآنی یقین اور قرآنی یقین کے سوا یقین کی صورت ہی کیا ہے) سے پیدا ہونے والی سیرت صلاح و تقویٰ کی زندگی ہی کر سکتی ہے۔

تجربہ بھی اس کا شاہد ہے "گفت" کے ذریعہ سے جن لوگوں نے اس قوم میں کام کرنا چاہا! اولاً تو ان کو کامیابی ہی نہیں ہوئی اور الشاذ کالمعدوم کے طور پر بعضوں کو کبھی کامیابی ہوئی مثلاً شاہجہاں نامہ میں ملا محب علی سندھی کے متعلق لکھا ہے جس کا ترجمہ تاریخ برہان پور سے نقل کر رہا ہوں

"ملا محب علی اہل اسلام کی حاجت روائی میں بہت سعی کرتے تھے اور کفار کو ترغیب دین اسلام کی بذریعہ **وعظ و نصائح** وغیرہ دلایا کرتے تھے اور بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نومسلموں کے عرض کر کے اجراء کراتے تھے"۔ ص۲۴۱

واللہ اعلم ملا صاحب کو "گفت" کے اس طریقہ سے کس حد تک کامیابی ہوتی تھی لیکن خود آگے کا فقرہ "بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نومسلموں کے عرض کر کے اجراء کراتے تھے" خود دلالت کر رہا ہے کہ اسلام کی وہ تبلیغ جس سے اسلام لانے والوں کے لیے تقرر معاش کے اجراء کے واسطے بادشاہوں سے عرض کرنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ خود اسلام لانے والے

فان ابی ووالدتی وعرضی   لعرض محمد منکم فداء (حسان بن ثابت صحابی)

میرے باپ میری ماں اور میری عزت آبرو، سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت پر تم لوگوں کے مقابلہ میں قربان کرتے ہوئے "اللہ رسول" کے سوا اپنا سب کچھ اسلام کے لیے حاضر کرنے پر آمادہ ہو جائیں، یہ بات "گفت" والی تبلیغ میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ تبلیغ ہی کیا ہوئی جس کی کامیابی کے لیے پہلے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے خزانوں کا انتظام کر لیا جائے[1]

---

[1] آج کل خصوصاً جب سے سرشاری پر حقوق کی بنیاد مغربی حکومت نے رکھ دی ہے تبلیغ اسلام کا لفظی ذوق مسلمانوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے، اور اسکیمیں وہی سوچی جاتی ہیں جو نمونا پادری اپنے (باقی برصفحہ ۷۶)

Marfat.com

خواجگانِ چشت کا محورِ عمل

اب دنیا مجھے خواہ بیجا خوش اعتقادی ہی کے ساتھ کیوں نہ متہم کرے، جہاں تک میرے حقیر تتبع وتلاش کا تعلق ہی خواجگانِ چشت کا جو سلسلہ ہندوستان کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا ان کے پاس تو کم از کم میں جس چیز کو سب سے بڑے کارگر حربہ کی حیثیت سے پاتا ہوں وہ حقیقی اور واقعی صلاح وتقویٰ پیدا کرنے والے یقین کی واحد ضامن "کتاب مبین" ہی کو پاتا ہوں۔ جو دی ہی گئی ہو اس لیے کہ

یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ	راہ دکھاتا ہو اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو (واقعی یقین کی حقیقی
اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ	روشنی ہیں) اللہ کی رضامندی کو ڈھونڈھتے ہیں (اور ان کتابوں
السَّلٰمِ وَیُخْرِجُهُمْ	سے اعتماد اُٹھا چکے ہیں جن میں خدا کے ساتھ غیر خدا کی رضامندی
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ	شریک ہو گئی ہو تا کہ وہ کتاب ان کو اسلامتی کی راہوں پر ڈال دے
بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ	اور نکالے ان کو (شک) کی اندھیریوں سے (یقین) کی روشنی میں
اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ	(اپنی عقلی تجویزوں سے نہیں بلکہ) فرمان سے اللہ ہی کے اور لے
(مائدہ)	چلتی ہو وہ کتاب سیدھی راہ پر۔

میرا یہ مطلب نہیں ہو کہ ہمارے مشائخ چشت قرآن کے سوا اور کچھ پڑھتے پڑھاتے ہی نہ تھے۔ ہندوستان کے تعلیمی نظام کے ذکر میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہاں کے تعلیمی میدان کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اسلامیات کے چند لازمی مضامین کے ساتھ ادب، لغت، فلسفہ، منطق، ریاضی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) مشن کے چلانے میں اختیار کرتے ہیں، لیکن بندگانِ خدا اتنا نہیں سوچتے کہ پادریوں کا تعلق یورپ وامریکہ کے جن ساہوکاروں دولتمندوں اور حکومتوں سے ہو۔ غریب محکوم مفلس مسلمان ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں، آج وہ بیچارے مسلمان جو دانے دانے کے محتاج ہیں، اس پر بھی مسلمانوں کو جب پکارا جاتا ہو، مذہب کے نام سے پکارنے والے پکارتے ہیں تو ان کی اکثریت اپنی جیب جھاڑنے کو تیار رہتی ہو، افسوس ہو اس کا بھی صحیح مصرف نہیں لیا جاتا ۱۲۔

ہندسہ حتیٰ کہ موسیقی، السنہ غیرہ وغیرہ سب ہی چیزیں شریک تھیں۔ اور یہ تو اسلامی عہد میں اس ملک میں مسلمانوں کے تعلیمی ماحول کا عام حال تھا، مشائخ چشت کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نرے غیر عالمانہ تصوف کی ان نگاہوں میں کوئی قیمت معلوم نہیں ہوتی، نہ بنگال کے شیخ الشیوخ شیخ سراج عثمان جن کا شاید پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ جب وہ اس راہ میں خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہوئے جو مشائخ چشت کا اس ملک میں کاروبار تھا، تو حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا" اول درجہ دریں کار علم ست" (سیرالاولیا ص ۲۰۸) اور سلطان المشائخ کا یہ کوئی ذاتی خیال نہ تھا، ان کے شیخ حضرت فریدالدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی اسلامی تصوف اور درویشی کی بنیاد علم ہی پر قائم تھی، سلطان جی ہی ان سے ناقل ہیں کہ "درویش را قدرے علم باید ص ۱۰۱" "قدرے علم" کا کیا مطلب تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سلطان المشائخ ان کی خدمت میں مروجہ درسی علوم کے نصاب کو ختم کر کے گئے تھے، بلکہ نفس والے نصاب کو بھی انہوں نے تو پورا کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی شیخ کبیر نے ان کو براہ راست تمہید سالمی بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، عوارف بھی پڑھائی، اور اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ خود شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان المشائخ کو تجوید کی بھی تعلیم دی، حالانکہ گذر چکا کہ سلطان المشائخ نے بچپن میں قرآن جس استاد سے بداؤں میں پڑھا تھا وہ نو مسلم مقری شادی نامی تھے، جو خود قرأت سبعہ کے عالم تھے، لیکن باوجود اس کے بھی شیخ کبیر نے ضرورت محسوس کی کہ سلطان المشائخ کو صحیح تلفظ اور لہجہ کے ساتھ قرآن پڑھنا سکھائیں اور دو ایک پارے نہیں، اس توجہ، انہماک واہمیت کو ملاحظہ کیجیے کہ چھ پارے کامل تجوید کے ساتھ شیخ کبیر نے سلطان جی کو پڑھایا، اس کی تصریح تو مجھے ملی نہیں، کہ لفظی تجوید کے ساتھ قرآن کے معانی اور مطالب بھی بیان کرتے تھے یا نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ البتہ الفاظ کی تجوید و تصحیح جس طریقہ سے ہوتی تھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ "چوں من خواندن آغاز کردم مرا فرمود کہ الحمد بخوان چوں بخواندم در ولا الضالین

Marfat.com

رسیدم فرمود "ضاد" ہم چنیں بخواں کہ من می خوانم"

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ "ہر چند کہ می خواستم نیامد" یعنی ضاد کا جو خالص عربی تلفظ ہے، جیسے عربوں سے ٹ، ڑ وغیرہ حروف کے ادا کرنے کے لیے زبان کو جہاں جانا چاہیے وہاں عادت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاتی، اسی طرح ہندی نژاد کے لیے 'ضاد' کے حرف کا ادا کرنا عموماً سخت دشوار ہوتا ہے، یہی حال سلطان جی فرماتے ہیں کہ ہمارا تھا، لیکن شیخ کبیر کی معلوم ہوتا ہے کہ مشق بہت پختہ تھی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صوفیوں کے جس طریقہ میں قرآن کے الفاظ اور حروف کی ادائگی کو اہمیت دی جاتی ہو، ان کا قرآن کے معانی سے کیا تعلق ہوگا، سلطان المشائخ بھی قرآن کی اس تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ کبیر کی مہارت کے متعلق فرماتے

ایں چہ فصاحت و بلاغت بود شیخ شیوخ العالم ضاد بہ نوعے خواند کہ ہیچ کس را میسر نشد (سیر الاولیا، وغیرہ ص ۱)

بہر حال جب درویشی کے "قدرے علم" میں قرآنی الفاظ کی تجوید و تصحیح بھی داخل تھی، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ عام علوم درسیہ کے متعلق چشتی طریقہ کے بزرگوں کا مطمح نظر کیا تھا وہی شیخ بنگال عثمان سراج ہی کے قصہ میں دیکھیے کہ سلطان المشائخ نے اس راہ میں گام زن ہونے کی اجازت اس لیے نہیں دے رہے تھے "کہ از علم او چنداں نصیبے ندارد" اور جب تک مولانا فخر الدین زرادی نے حضرت والا کو یقین نہیں دلا دیا کہ عام علوم درسیہ دینیہ میں نے انہیں پڑھا دیا ہے اجازت نہ ملی۔ "علم" کی قدر و منزلت، اہمیت و ضرورت کا احساس سلطان المشائخ کو کس حد تک تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی مجلس مبارک میں سب سے آگے علماء کی نشست ہوتی تھی اور اس کے بعد دوسرے لوگ بیٹھتے تھے۔ حضرت والا کی طرف سے آدابِ مجلس کے سلسلہ میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا، سیر الاولیا میں انہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے کہ

"من نخواہم کہ ہیچ مجعدے[1] بالا تو متعمے برنشیند" ص ۲۰۲۔

اور یہ نقطۂ نظر کہ علم کے قدر ضروری کے متعلق تھا، باقی اس راہ میں جو لوگ دین کی خدمت کی نیت سے داخل ہوتے تھے ان کے لیے علمی مشاغل کا ایک درجہ وہ تھا جس میں اشتغال کی ممانعت تو نہیں تھی، لیکن عام طور پر ہمارے خواجگانِ چشت ان لوگوں کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے جس کے راوی میر خورد ہیں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں اودھ کے علماء کا جو گروہ آکر شریک ہوا تھا ایک مدت سے علمی مباحث جن کے وہ عادی تھے خانقاہی زندگی میں ان سے کچھ بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے، آخر ایک دن سبھوں نے مل کر مشورہ کیا کہ اس باب میں حضرت والا سے استمزاج کیا جائے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ

"وقتے یاراں اعلیٰ کہ از اودھ بودند اتفاق کردند کہ اجازتِ تعلم وبحث کردن از سلطان المشائخ بستانند"

یہاں "تعلم وبحث کردن" سے مراد اصطلاحی تعلم نہ تھا بلکہ پیشہ ورانہ تحقیق وتدقیق مطالعہ ومباحثہ کا پرانا ذوق ان کے دلوں میں جو گدگدیاں لے رہا تھا اسی مُلّائی ذوق کی تشفی چاہتے تھے، میر خورد ہی نے لکھا ہے کہ

"اگرچہ ہر یکے ازیں یاراں عالمے متبحر بود لیکن ہوس ایں کار کہ عمر دراں مشغول بودند باعث می شد"

---

[1] مجعد جعد سے ماخوذ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے شوقین حضرات کاکل بھی رکھتے تھے اور کاکلوں کو چوٹی بنا کر باہم گوندھ کر ادھر ادھر لٹکا دیتے تھے، ایک اور عبارت سے جو اسی سیر الاولیاء میں ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علوی سادات بجائے ایک ایک چوٹی کے دو دو چوٹیاں ادھر ادھر لٹکاتے تھے، اور غیر سادات ایک ایک متعمم تو ظاہر ہے کہ عمامہ سے ماخوذ ہے یعنی دستار والے یہ اس زمانہ میں علماء کی تعبیر تھی گویا عوام اور خواص میں یہی فرق تھا کہ خواص علماء دین متعمم ہوتے تھے اور عام لوگ مجعد فوائد الفواد کی ایک عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں سلطان المشائخ بھی کبھی مجعد رہتے تھے (فوائد الفواد ص ۲۰)

مگر جب یہ سوال اٹھا کہ حضرت گرامی کی خدمت میں ان کی اس خواہش اور ذوق کا اظہار کون کرے، تو ہر ایک کانوں پر ہاتھ دھرنے لگا، رد و قدح کے بعد طے ہوا کہ وہی مولانا جمال الدین جنہوں نے خراسان کے "مولانا بجاش" کے دماغ کا نشہ اُتارا تھا، چونکہ حضرت نے خصوصی خوشنودی کا ان کے ساتھ اظہار کیا تھا، اس لیے ان ہی کو آمادہ کیا گیا، بیچارے سیدھے آدمی تھے، تیار ہو گئے اور سب مل کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے آگے بڑھ کر مولانا جمال الدین نے عرض کیا۔ "مخدوم را اگر فرمان باشد یاراں وقتے بحثے کنند" یہ سُننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہو گیا، اگو پیش کرنے والے تو صرف مولانا جمال الدین ہی تھے لیکن مع دانست کہ ایں سوال ہمہ یاراں است کہ حاضر آمدہ اند" لایعنی غیر ضروری دماغ کاویوں میں وقت ضائع کرنے کی چاٹ جو ان لوگوں کو پڑی ہوئی تھی، یہ محسوس کر کے کہ ابھی ان کا یہ غلط ذوق بالکلیہ مردہ نہیں ہوا ہے، ذرا برہمی کے ساتھ آپ نے فرمایا۔

من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است وایشاں ہم چو پیاز پوست در پوست اند"

یہ بڑا اہم تاریخی فقرہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مریدوں کا ایک طبقہ تو عوام کا تھا، جو مرید ہوتا تھا اور چلا جاتا تھا، ان لوگوں کو مرید کرنے کی کیا غرض ہوتی تھی، اس کا ذکر تھوڑی دیر بعد کیا جائیگا، لیکن اہل علم کے ایک طبقہ کو سلطان المشائخ کسی خاص مطلب اور غرض کے لیے تیار کر رہے تھے، لیکن ان کو مایوسی ہوئی کہ مغز کار تک ان کی رسائی نہیں ہوئی، اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ارشاد ایک شیخ کا اپنے تلامذہ اور مریدوں کے ساتھ تھا، لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ پیشہ وارانہ علمی مشاغل کے ایک بڑے حصہ کو خصوصاً ان لوگوں کے لیے جنہیں اپنے کسی مطلوب خاص کے لیے تیار کیا جاتا تھا، ان کے لیے اس قسم کی غیر ضروری مشغولیت کو پسند نہیں فرماتے تھے، زائد از حاجت غیر ضروری مطالعہ جو زیادہ تر ذہنی التذاذ کے لیے کیا جاتا ہے، یہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے واقعی طالب العلمی کی ہو، ایک ایسا عارضہ ہے جس سے نجات آسان نہیں ہے، اس کے لیے بڑی گہری اور عمیق عقل کی ضرورت ہے، ورنہ جس بیچارے میں صرف پوست ہی پوست ہو مغز

Marfat.com

نہ ہواس کے نزدیک تحقیق و تدقیق، ریسرچ و اکتشاف سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے؟ غالباً ایں قدرم علم کفایت باشد۔

اس حقیقت تک رسائی ہر بے مغز آدمی کا کام نہیں ہے، علم کو صرف علم کے لیے حاصل کرنا چاہیے اس بے معنی نقرہ کا اہمال اگر کسی پر واضح بھی ہو جائے، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ ۔ع۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

علم گزیدہ دماغوں سے باوجود سب کچھ سمجھنے کے اس ذوق کا سمی اثر آخر وقت تک نہیں مٹتا۔ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اس قصہ کا دانائے راز حقیقت آگاہ اور کون ہو سکتا ہے، وہ بھی تو کبھی محفل شکنی اور بحاثی کی لذت اٹھا چکے تھے۔ حالت یہ تھی کہ "علم کو علم کے لیے" کے کاروبار کو چھوڑ دینے کے بعد کبھی کبھی خود اپنا حال بیان فرماتے جیسا کہ حسن علا سنجری نے فوائد الفواد میں نقل کیا ہے کہ ایک دن "مشغولی حق" کا ذکر ہو رہا تھا، ارشاد ہوا کہ

"کار آں دارد (یعنی کام کی بات یہ ہے) دو دیگر ہر چہ جز آں ست مانع آں دولت"

مگر اس تحقیق کے بعد بھی وہی دماغ سے گذری ہوئی پرانی چیزوں کا خیال آہی جاتا تھا مطالعہ کے لیے ان ہی کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنا شروع کرتے کہ معاً خیال آجاتا کہ یہ کیا کر رہا ہوں، خود ہی فرماتے ہیں

"اگر وقتے ازاں کتب کہ خواندہ ام مطالعہ می کنم وحشتے درمن ظاہر شود با خود گویم کہ کجا افتادیم" ص۱۹

بہرحال غیر ضروری معلومات کے ذخیرہ کو دماغ میں بھرتے چلے جانا یا اُن نکات اور پیچیدگیوں کا حاصل کرنا، جن کا نہ دین میں نفع ہو نہ دنیا میں جو ہمارے یہاں کے علوم نہیں بلکہ سارے جہان کے اکثر علوم وفنون کا حال ہے، کوئی مرے ہوئے لوگوں کی ولادت اور وفات کے سنین کی تحقیق میں مشغول ہے، کوئی کسی قبر کے کتابہ کو پڑھ رہا ہے کوئی ستاروں کو گن رہا ہے۔ کوئی آسمانی طبقات کو شمار کر رہا ہے۔ الی غیر ذلک من المشاغل العلمیۃ التی یتشاغلو

فیہا لا منتہا شغل علمی ؟ غزالی الامام نے اگر یہ لکھا ہے کہ آسمانی طبقات کا گننا اور کسی پیاز کے چھلکوں کو اُتار اُتار کر شمار کرنا، نتیجہ کے لحاظ سے بتایا جائے کہ دونوں میں کیا فرق ہے تو اس کا آخر کیا جواب ہے، جو گلیوں کے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو چن چن کر گنتا جائے اور اپنی ڈائری میں ان کی تعداد کو نوٹ کرتا پھرے، اگر اس پر جنون کا فتویٰ لگانا صحیح ہے تو پھر جو رات رات بھر جاگ جاگ کے آنکھوں پر دوربینیں لگا لگا کر کہکشاں کے ستاروں کو گنتے ہیں، اس کی باضابطہ رپورٹ تیار کرتے ہیں اور اسے اسٹرانومی (نجومیات) کی اہم خدمت قرار دیتے ہیں، اس فتوے سے ان بیچاروں کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ افادہ کے معیار پر آپ علوم و فنون کی اس لمبی فہرست کو اگر جانچینگے تو اکثر و بیشتر کا یہی حال نظر آئیگا، اس لیے حدیثوں میں علم لا ینفع (ایسا علم جس پر کوئی نفع مرتب نہ ہوتا ہو) سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہی ہمارے مشائخ چشت کا علم کے باب میں نقطۂ نظر تھا، تاہم پھر بھی علوم کی ان قسموں کے متعلق جن سے اگر نفع نہیں ہے تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچتا بجز اس ضرر کے کہ آدمی کا وقت بیکار ضائع ہوتا ہے، چنداں سختی نہیں کی جاتی تھی، سلطان المشائخ جب شروع شروع میں شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو آپ کا بیان ہے کہ حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد "عرض داشت کردم فرمان شیخ چیست ترک تعلم گیرم؟"

اس تعلم سے غیر ضروری علوم کا مطالعہ درس و تدریس تحقیق و تدقیق مراد ہے کیونکہ علم کی قدر ضروری سے تو حضرت فارغ ہی ہو چکے تھے، اور جو کچھ کمی رہ گئی تھی بابا صاحب نے اس کی تکمیل خود ہی فرما دی تھی۔ شیخ کبیر نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"من کسے را از تعلم منع نہ کنم آن ہم کن این ہم کن تا غالب کہ آید" ص ۱۰۷

مطلب یہ ہے کہ جس نے اس راہ میں حقیقت آگاہی کے صحیح مقام کی بافت کے بعد قدم رکھا ہے، اس کا تعلق غیر ضروری علوم سے خود بخود رفتہ رفتہ کمزور و مضمحل ہوتا چلا جائیگا اور "علم کا جو حقیقی مقصد و مآل کا رہے" اس پر قدم جما دیگا اور اگر یونہی دیکھا دیکھی اس راہ میں آیا ہو تو پھر

اپنے قدیم مالوفات کی طرف واپس ہو جائیگا، اور اس سے ان بزرگوں کے حکیمانہ طریقۂ کار کا سُراغ ملتا ہے کہ جس پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے زبردستی جبراً اس کو ایسی بات پر مجبور کرنا جس میں کوئی ضرر بھی نہیں ہے، تربیت کی صحیح راہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہی بات کہ "این ہم کن آں ہم کن تا کہ غالب آید" جو کچھ اندر میں ہے باہر اسی کا تابع ہو جائیگا۔

لیکن یہ فیصلہ صرف ان ہی علوم کی حد تک محدود رہ سکتا ہے جس سے نفع نہیں تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچ سکتا، باقی تعلیم و تعلم تحقیق و مطالعہ کی وہ راہ جس نے خدا جانے کتنوں کی راہ ماری اور جو بسا اوقات برہم زن ایوانِ انسانیت ہوئی ہے حضرت بابا صاحب ہی سے نظام الاولیا، نے نقل کیا ہے کہ ایک دن اجودھن میں حضرت کے پاس ایک شخص آیا اور کان میں کچھ کہنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں دلی میں ہم سبق تھے، پھر علم سے کیا کیا، دنیاوی فوائد حاصل کر سکتے تھے، اس کا ذکر اس نے کیا۔ شیخ کبیر کو میں نے دیکھا کہ وہ جواب میں فرما رہے تھے۔

"نے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل است مخواں و خلق ایذائے مرساں و اگر برائے عمل است ہمیں قدر کافی ست کہ می خوانند و عمل می کنند" ص ۸۵ سیر

اور یہ علم کی وہ قسم اور اس کا وہ استعمال ہے جس کے متعلق ہمارے بزرگوں کا فیصلہ "مخواں" کا تھا، یعنی جس کا پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہے، خصوصاً دینی علوم کے لیے تو زہرِ قاتل اور سمِ ہلاہل ہے، اس کے بعد خود شیخ کبیر کا ارشاد ہے

"مقصود از خواندن شریعت عمل ست نہ از برائے ایذائے خلق"

اور یہی وہ تماشا ہے جس کا نظارہ ہندستان میں آج تقریباً سو سال سے دیکھا جا رہا ہے جب تک اس ملک کے لازمی نصاب میں لوگ دینیات کی حیثیت سے صرف قرآن اور وہی مشارق الانوار یا مصابیح السنۃ، قدوری، ہدایہ پر قناعت کر رہے تھے اس وقت تک یہاں کے مسلمانوں کا ایک دین تھا ایک مشرب تھا لیکن آج ادب کا غلغلہ بلند ہے خطل

اور عنترہ اور ابوالعلاء اور فرزوق کی شاعری پر تنقید ہو رہی ہے۔ تحریر و تقریر کا بازار گرم ہے۔ اسماء الرجال اور تاریخ و سیر کا سمندر ہے کہ اُبل رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ شاید ہی ہندوستان پر کسی دن کا آفتاب گذشتہ صدی میں طلوع ہوا جس کے ساتھ کسی نئے فتنہ نے سر نہ اُٹھایا ہو، کہیں اجتہاد کا دعویٰ ہے، فقہ اور ائمۂ فقہ کی توہین ہو رہی ہے، کسی جگہ مہدویت و مسیحیت بلکہ نبوت کی تعمیر قلزم علم کے انہی صدف ریزوں سے عمل میں آرہی ہے۔ کسی گوشہ سے حدیث کے انکار کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے، کسی سمت سے قرآنی آیات کی نئی نئی تفسیریں پیش ہو رہی ہیں، کہیں "امت مسلمہ" کا نظام نو بنایا جا رہا ہے، ڈنڈ ہے جو مچی ہوئی ہے، فتنے ہیں کہ ٹوٹے ہوئے ہار کے مانند یکے بعد دیگرے اُٹھتے چلے جاتے ہیں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دینیات کا جو لازمی کورس ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں رکھا تھا، اگر علم کو جدل اور لڑائی جھگڑوں کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو عمل کے لیے وہ کافی نہ تھا؟ قرآن اور حدیث کی عام معمولی سادہ عربی سمجھنے کے لیے کیا واقعی امرؤالقیس اور طرفہ تابط شرا کے کلام کے نکات پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے کسی جگہ عرض کیا تھا کہ ہمارے اسلاف (قدس اللہ اسرارہم) کے جہاں اور بہت سے عجیب و غریب کارنامے ہیں اُن میں بڑا نمایاں کام اُن کا یہ بھی ہے کہ عربی زبان کے اس حصہ کو جس میں اسلامی ادبیات محفوظ ہیں اسے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی ملک کی مادری زبان اسے نہ بنا سکے تو ان علاقوں کے مسلمانوں کی جو مادری زبان تھی اس میں قرآن و حدیث کے ان الفاظ کو شریک کر دیا گیا تھا۔ جس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کے اس ذخیرہ سے جسے میں اسلامی الفاظ کہتا ہوں، تقریباً ۹۰ فیصدی الفاظ سے ہم عربی سیکھے بغیر واقف رہتے ہیں، مثلاً آپ سورۂ فاتحہ کو لیجیے۔ ایک انگریز کے سامنے بھی اسے پڑھیے اور ایک ہندوستانی مسلمان کے سامنے بھی، ظاہر ہے کہ عربی زبان نہ انگریز کی مادری زبان ہے اور نہ ہندوستانی مسلمان کی لیکن انگریز اول سے آخر تک ہر ہر لفظ کے معنی جاننے کے

لیے اس کا محتاج ہو کر اسے بتایا جائے۔ مگر ہمارا حال کیا ہو، ہم میں کون ہو جو حمد، اللہ، رب، عالم، رحمٰن، رحیم، مالک، یوم، الدین، عبادت، استعانت، ہدایت، صراط، مستقیم، انعام، غضب، غیر، ضلالت کے معانی سے واقف نہیں، اب آپ ہی گن لیجیے کہ ان اٹھارہ الفاظ کو نکال لینے کے بعد سورۂ فاتحہ میں کتنے الفاظ رہ گئے جن سے ہندستانی مسلمان ناواقف ہیں۔ بجز حروف جارّہ، اسم اشارہ، اسم موصول یعنی لِ، ایاکَ، نَا، الذین، ہم، علیٰ کے اور بھی اس پوری سورت میں کچھ ہو جس سے ہندستانی مسلمان عموماً واقف نہیں ہیں۔ تقریباً چوبیس الفاظ میں صرف چھ لفظوں کی عدم واقفیت کوئی عدم واقفیت قرار پا سکتی ہو، اور یہ الفاظ بھی ایسے ہیں جن کی حیثیت مفردات منتشرہ کی نہیں ہو، یعنی جن میں ہر ہر لفظ کے لیے لغت دیکھنے کی ضرورت ہو، بلکہ کلی الفاظ ہیں یعنی اسم اشارہ، اسم موصول، حروف جارہ یا ازیں قبیل چند گنے چنے کلی الفاظ ہیں، جنھیں بآسانی چند دنوں میں سکھایا جا سکتا ہو، گویا ان چند صنفی الفاظ کے معانی سے واقف ہو جانے کے بعد تقریباً قرآن کے پچانوے چورانوے فیصدی الفاظ کے ہم عالم ہو جاتے ہیں۔ ایک چیز یہ، دوسری بات صیغوں کی خصوصی شکلیں یعنی عبادت کے معنی سے واقف ہونے کے باوجود نعبدُ سے یا استعانت کے معنی جاننے کے باوجود نستعین کا مطلب ہندی مسلمان جو نہیں سمجھ سکتا، یہ بھی ایک معمولی سی بات ہو، چند سادہ صرفی ابواب سے روشناس ہونے کے ساتھ ہی وہ صیغوں کی صورت پہچاننے لگتا ہو۔ ایک فَعَلَ کی صرفی صورت سے اسے آشنا کر دیجیے واحد غائب ماضی کے سارے قرآنی الفاظ سے وہ آشنا ہو جاتا ہو اور صرفی صیغے یہ ہیں ہی کتنے۔ تیرہ چودہ شکلیں ماضی کی، تیرہ چودہ مضارع کی چھ شکلیں امر کی باقی اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ، مبالغہ تفضیل، صفت مشبہ۔ یہ بھی اتنے کلی قاعدوں میں جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کے یاد کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔[1] باقی تعلیلات کا قصہ وہ دراصل اشتقاق کبیر کا علم ہو جو نفعل کو سمجھتا ہو کہ جمع متکلم کا صیغہ ہو، قرینہ سے نقول کو بھی سمجھ لیگا، خواہ یہ نہ جانتا ہو کہ لفظ

[1] سا رنے ایک کتاب بھی ادب قرآنی کے نام سے ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھدی ہے جو طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے

میں فرق کیوں پیدا ہوگیا، اُردو میں ہم تھوکنا روز بولتے ہیں، لیکن اس پر کون غور کرتا ہے کہ یہ تھوکرنا کا مخفف ہے۔ راء کلمہ بوجہ ثقیل ہونے کے حذف ہوگیا، قرآن کے چند رکوع میں ہیر پھیر کر حسب صحیح معتل، مضاعف، مہموز کے ابواب کی صورتیں گذرینگی۔ دماغ خود اندازہ کرلیگا کہ عربی میں مثلاً نَصَرَ بھی ماضی کی ایک شکل ہے اور قَالَ بھی۔ ہر زبان میں اس قسم کے تغیرات ہوتے ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو کچھ کچھ کلیات ہی ہوتے ہیں، جن کے تحت یہ تغیرات پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کو بے جانے آدمی بولتا ہے سمجھتا ہے، آپ روز جانا مصدر بولتے ہیں گیا ماضی، جانے والا اسم فاعل، لیکن کبھی اس کو بھی سوچا کہ جانے کی جیم ماضی میں گاف سے کیوں بدل گئی اور مضارع میں پھر اصلی حالت پر کیوں واپس آگئی۔ آپ تمباکو بھی بولتے ہیں اور گڑاکو بھی، لیکن اس پر آپ نے کب غور کیا کہ گڑاکو میں تین تین حرف ت م ب کو حذف کرکے گڑاکو بنایا گیا ہے۔ سوچیے تو بات میں بات نکلتی چلی آئیگی اور نہ سوچیے تو ساری باتیں اس سوچ کے بغیر آپ کی سمجھ میں آتی چلی جائینگی۔

اور بالفرض اگر تھوڑے بہت تعلیلی قوانین سے صرف میں واقف ہونے کی ضرورت بھی ہو تو ان قانونوں کی تعداد ہی کیا ہے، یہ تو پچھلے زمانوں میں ان معلموں نے جنہیں غالباً خطرہ رہتا ہوگا کہ اگر صرف و نحو کی کتابیں جلد ختم کرا دیتا ہوں تو ہمارا سرمایہ ہی ختم ہوتا ہے آگے بقاء ملازمت کی شکل یہی ہوسکتی ہے کہ معاملہ کو دراز کیا جائے[1]۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان صرفی قوانین کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی اہمیت اسے خدا ہی جانتا ہے کہ اس ملک میں کب دی گئی، اگر ہمیشہ سے یہی حال تھا، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانہ میں فاتحۂ فراغ کی عمر عموماً چودہ پندرہ سے لے کر بیس بائیس کی کیسے ہوتی تھی - اب تو جس طریقہ

[1] میرے گاؤں گیلانی میں ہندوؤں کا ایک ابتدائی پاٹ شالہ ہے، اس پاٹ شالہ کے بوڑھے گروجی کا عام قاعدہ ہے کہ وہ سال میں بیس تک کے پہاڑے سے آگے بچوں کو پڑھنے نہیں دیتے۔ مدت ہوئی اُن سے ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ گروجی آپ دو سال میں بیس تک کا پہاڑہ سکھاتے ہیں! بولے کہ بابوا تنے پہاڑے تو میں چار مہینوں میں بھی سکھا سکتا ہوں لیکن اس کے بعد پھر میری تنخواہ کا کیا سامان ہوگا ۱۲

سے صرفی ابواب کو پنجابی طریقہ سے رٹایا جاتا ہے، اسی کے لیے یا زیادہ سے زیادہ نحو کو بھی ملا لیجیے، اتنی مدت کافی نہیں ہوتی جس کی شہادت پنجابی نحو و صرف کی وہ تعلیم دے سکتی ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے وہ مروج تھی خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کا جو اسلامی حصہ ہے، میرے خیال میں اس کے مطالب اور معانی سے واقف ہونے کے لیے عربی زبان کے ان الفاظ اور ترکیبوں بندشوں کے جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، جن میں جاہلی شعراء کا کلام ہے، اور بالفرض کہیں کہیں تھوڑا بہت ہو بھی تو تفسیروں میں وہ بیان کر دیا گیا ہے، اب تفسیروں کی ان ہی بتائی ہوئی باتوں کو پھر خود تحقیق کرنے کے لیے دواوین عرب پر عبور حاصل کرنا، اگر آپ کا ذاتی شوق ہے تو اختیاری مضامین کی حیثیت سے آپ یہ بھی کر سکتے ہیں، ہر زمانہ میں جن لوگوں کو شوق تھا، ان کو کون روکتا تھا، لیکن ہر طالب العلم کے لیے خواہ اسے براہِ راست ادبی تحقیقات کا شوق ہو، یا نہ ہو، وہ بجائے جلالین یا مدارک بیضاوی کے نہیں چاہتا کہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے متعلق جاہلی شعراء کے کلام سے شاہد پیش کرے، بلکہ مفسرین نے تحقیق کر کے جو معنی لکھ دیے ہیں یا جس فقرہ کی جس ترکیب کا جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، اس مفہوم کو بتا دیا ہے تو آپ اس بیچارہ کو خواہ مخواہ اس پر کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی آپ کے اس غیر ضروری مذاق کی ہمنوائی کرے۔ آخر زمخشری، ابو عبید وغیرہ ائمہ لغت سے تو آپ کا علمی احاطہ زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ قرآن کے جس لفظ کا مطلب جاہلی شعراء کے کلام میں تلاش کرتے ہیں، وہ بیچارہ کشاف میں یا بیضاوی میں اٹھا کر دیکھ لیتا ہے۔ حاصل تو دونوں کا ایک ہی ہوا۔

یہی حال حدیث کا ہے، سند کے مباحث مدت ہوئی کہ ختم ہو چکے، امام بخاری

لہ واللہ اعلم پنجاب میں یہ رواج کب سے جاری ہوا تھا کہ شرح جامی اور اس کے حواشی تک کی تعلیم میں پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال صرف ہوتے تھے لیکن بحمداللہ اب زمانہ بدل گیا، خود پنجاب کے ایک عالم حافظ عبدالرحمٰن امرتسری مرحوم نے کتاب الصرف و کتاب النحو لکھ کر صرف و نحو کے قصہ کو چند مہینوں تک محدود کر دیا ہے۔ ۱۲

مسلم جیسے ائمہ جن کی کتابیں تلقی بالقبول ہو چکی ہیں یہ مان لیا گیا ہو کہ جانچ کر پرکھ کر صحیح حدیثوں کو غیر صحیح حدیثوں سے جُدا کر کے ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہی اس لیے اب ہر حدیث کی ہر سند پر بحث کرتے ہوئے طلبہ کو پڑھانا ایک ایسے کام کو انجام دینا ہی جو اپنے سے بہتر شخصیتوں کے ذریعہ سے انجام پا چکے ہیں۔ رہ جاتا ہی متن کا معاملہ متن حدیث میں ایک حصہ خلافیات کا ہی اور وہ کم ہی، دوسرا حصہ وہ ہی جو علم حدیث کی جان ہی۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، ظاہر ہی کہ پہلے حصہ کے متعلق بھی پہلی ہی صدی میں بحمد اللہ اُمت کے بہترین دل و دماغ اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں ان کے متعلق ترجیح و تطبیق و تاویل کے لیے جو کچھ کرنا تھا سارا کام کیا جا چکا ہی اور اسی کام کے آخری نتائج کا نام فقہ ہی جو مختلف ائمہ کے ناموں سے اُمت کے مختلف طبقات میں معمول بہ ہی، اور یہ مسلّم ہی کہ ان میں کوئی طبقہ گمراہ اور استحقاقِ نجات سے محروم نہیں ہی، اس لیے حدیث میں طلبہ کو لازمی طور پر جو پڑھانے کی چیز اور سمجھانے کی بات ہو سکتی ہی وہ حدیث کا وہ حصہ ہی جس کا تعلق خلافیات سے نہیں، بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے مختلف پہلوؤں سے ہی۔ اور اس کے لیے کیا کوئی انکار کر سکتا ہی کہ مشارق الانوار یا مصابیح السنہ، مشکوٰۃ المصابیح جیسی کتابیں کیا کافی نہیں ہو سکتیں۔ ان کتابوں میں سے کسی کتاب کو جو اچھی طرح جانچ کر پڑھ لیگا آئندہ وہ حدیث کی دوسری کتابوں کا شرح، حواشی کی مدد سے یقیناً مطالعہ کر سکتا ہی، پھر ہمارے بزرگوں نے لازمی نصاب کا جزا انہی کتابوں میں سے کسی کتاب کو اگر رکھا تھا تو کیا غلطی کی تھی؟ باقی اس کے بعد بھی اگر کسی کو فن اسناد و فن خلافیات میں خصوصی مہارت پیدا کرنے کا خیال ہو تو اس سے کس نے کب منع کیا تھا، اور جن لوگوں کو شوق تھا، وہ اپنے شوق کی ہر زمانہ میں تکمیل کرتے ہی رہے، ہندوستان بھی ایسے بزرگوں سے کبھی خالی نہیں رہا، جس کا اجمالی ذکر پہلے آچکا ہی۔

Marfat.com

غالباً بعض خیالات جن کا میں پہلے بھی اظہار کرچکا ہوں، ان کا بالکلیہ تو نہیں، لیکن بعض اجزا کو میں نے پھر دہرایا ہے اور یہ میں نے قصداً کیا ہے، ایک بڑی غلط فہمی ہمارے قدیم نصاب کے متعلق پھیلی ہوئی ہے۔ چاہتا ہوں کہ لوگ اس کے افادہ کو سمجھیں اور اس وقت تو مقصد شیخ کبیر کے کلام کی تشریح تھی کہ شریعت یا دینی علوم کی تعلیم سے مقصود اگر عمل ہی ہے اور وہی ہو بھی سکتا ہے تو اس لحاظ سے ہمارا قدیم نصاب قطعاً کافی تھا۔ اور ایسا آسان۔ سہل الحصول تھا کہ جس طرح پہلے زمانہ میں اس کو مختلف عقلی علوم وفنون کے ساتھ جوڑا گیا تھا، اس زمانہ میں بھی بآسانی، پرانے عقلیات کو نکال کر جدید علوم وفنون کے نصاب میں "اسلامیات" کے اس لازمی نصاب کو بآسانی ہم شریک کرسکتے ہیں تاکہ دینی و دنیوی علوم کے جو مختلف دُو دھاری تلواروں کی طرح ہمارے ملک میں بہہ رہے ہیں، اور ان سے باہم خواص بھی کٹے جاتے ہیں، ان کا وقار برباد ہو رہا ہے اور عوام بھی ذبح ہو رہے ہیں، اس دو عملی کا خاتمہ ہو جائے۔ مذہب کو اپنی عملی زندگی میں شریک کرنے کا موقعہ اہل علم کی ہر جماعت کو براہِ راست حاصل ہو جائے

لیکن اگر بجائے عمل کے مذہب کو نکتہ نوازیوں اور دماغی زور آزمائیوں کی صرف مشق گاہ کی حیثیت سے آپ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یا بقول شاہ ولی اللہؒ علم حدیث کو قصاصوں کی خود نمائیوں کی تماشا گاہ بنانا چاہتے ہیں کہ جہاں کوئی ذرا سا اجنبی و مشکل لفظ حدیث میں یا قرآن میں آیا، گویا شکار ہاتھ آیا اور بقول شاہ صاحب

"شواہداں از کلام شعراء واخوات کلمہ در اشتقاق ومحال استعمال دے"

کا دریا بہنے لگا۔ ہر ہر سند کے ہر ہر راوی کے متعلق "احوال ایں قوم وسیرت ایشاں" کا بیان شروع کر دیا گیا۔ اور کہیں فقہ کے کسی مسئلہ کا ذکر آگیا تو ہر اں مسئلہ منصوص علیہ تخریج کا دروازہ کھل گیا اور ساری بحر الرائق اور شامی، عالمگیری اونڈیل دی گئی کوئی تاریخی قصہ ہاتھ آیا بس ع یا دنیٰ مناسبت قصص عجیبہ وحکایات غریبہ نوادر و امثال، محاضرات ومسامرات کی بھرمار شروع ہوگئی

Marfat.com

شاہ ولی اللہؒ نے اگر درس حدیث[1] و قرآن کے اس طریقہ کے متعلق یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ درس کا یہ طریقہ "طریقہ قصاص است و قصد ازاں اظہار فضیلت و علم ست نہ غیراں" تو انہوں نے کیا غلط لکھا ہے، مستعد طالب العلم پڑھنے کے بعد خود مطالعے کے ذریعہ سے جن چیزوں کو جان سکتا ہے اُسی کو سُنا سُنا کر اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ان چیزوں کے سمجھنے کی پوری اس میں صلاحیت بھی نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات اضاعت وقت کا سبب ہو جاتا ہے، اور یہی بات صادق آتی ہے جو ہندوستان کے ایک مشہور معقولی استاذ کی طرف منسوب ہے ان کا قاعدہ تھا کہ تہذیب میں ملا جلال کی باتیں، اور ملا جلال میں شفاء و اشارات کی باتیں طلبہ کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس درجہ کے طلبہ کی سمجھ سے وہ اونچی باتیں باہر ہوتی تھیں، طلبہ جب پڑھ کر اُٹھنے لگتے تو خود ہی فرما دیتے کہ پڑھانے کو تو میں نے سب کچھ پڑھا دیا، لیکن میری تقریر میرے مصلّے سے باہر نہیں ہوئی، گھوم گھما کر اسی میں رہ جاتی ہے

اور درس کے اس طریقہ میں خود نمائی ہی صرف ہو تو خیر متحمل بھی ہو سکتی ہے، آج تو جس چیز کا تجربہ ہو رہا ہے، فتنہ اور فساد کے جو دروازے بغیر کسی ضرورت کے کھولے جا رہے ہیں۔ تو جیسا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا تھا کہ "اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل ست مخواں" اس پڑھنے اور پڑھانے سے تو ملک کا جاہل ہی رہنا بہتر تھا، بلکہ پُرانے معقولی اگر اپنی خود نمائی کے لیے معقول کی کتابوں میں بال کی کھال نکالا کرتے تھے، میر زاہد اور ملا جلال کی ایک ایک سطر پر جھونپڑیاں ڈال ڈال کر خود بیٹھتے تھے اور طلبہ کو بٹھاتے تھے، حمد اللہ کے ایک مقام

---

[1] یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے، دار العلوم دیوبند اور اس کے متعلقہ مدارس میں حدیث کا جو دورہ ہوتا ہے، اُس کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنہ حادثہ کے مقابلہ میں جو غیر مقلدیت کی شکل میں نمایاں ہوا، بطور اختیاری مضمون کے حدیث کے دورے کا افتتاح کیا۔ ہندوستان کے مختلف مدارس سے فارغ ہونے کے بعد جن لوگوں کو تکمیل حدیث کا شوق ہوتا تھا وہ حضرت کے پاس جاتے تھے، اصل مقصود تو وہی دماغ کی اصلاح کے بعد دل کی اصلاح ہوتی تھی لیکن ضرورت وقت کو دیکھ کے حضرت نے حنفی مذہب کی تائید کے طریقہ کا اضافہ درس میں فرما دیا وہی دورہ گنگوہ والا دیوبند میں جاری ہے بجز ایک ترمذی کے لوگ نو مہینے میں صحاح ستہ بطور سرد کے ختم کرا دی جاتی ہے ۔ ۱۲۰

"وجود رابطی" پر خدا ہی جانتا ہے کہ اس زمانہ میں کتنے رسائل تصنیف ہوئے تو یہ ایک غیر دینی چیز کے ساتھ ملعبہ تھا، اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک قسم کی دماغی ورزش طلبہ کو کراتے تھے، لیکن دین کو دماغی عیاشیوں کا تختۂ مشق بنانا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ علوم کی قدر ضروری و غیر ضروری، مفید و مُضر کے متعلق ان لوگوں کے جو خیالات تھے جن کے ہاتھ میں ہندی مسلمانوں کی باگ قدرت نے سپرد کی تھی، میری مُراد خواجگانِ چشت کے اکابر سے ہے وہ آپ کی نظر سے گذر چکے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان بزرگوں نے اس باب میں جو رائے قائم کی تھی اس پر اب بھی کوئی اعتراض کر سکتا ہے ہندستان کے علما، عموماً چونکہ انہیں بزرگوں کے زیر اثر رہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے جو ان کی علم کے متعلق رائے تھی اُسی کے ماتحت یہاں کا علمی نصاب رہا، باقی یہ سوال کہ علم کے جس قدرِ ضروری کو عمل کی شکل وہ دیتے تھے اس کی کیا صورت تھی اور اس کا کیا طریقہ تھا۔ یہی دراصل اصل سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمان عموماً اور علما، خصوصاً اس پر غور کریں۔

علم کی تعمیلی شکل خواجگانِ چشت میں

دوسرے طرق و سلاسل کے مقابلہ میں کسی فخر و امتیاز کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ ہمارے بزرگوں کا جو طریقۂ کار تھا، اُس کی مثالیں پیش کرنی ہیں، اور ان مثالوں سے تربیت و اصلاح کے جن اصولی ضوابط کا سُراغ ملتا ہے، صرف ان کی طرف اشارہ کرنا، غرض صرف اتنی ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ان لوگوں کے متعلق جو "قدرِ علم" کے عام نصاب سے فارغ ہونے کے بعد ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، طبعاً دو طریقۂ کار اختیار کیے جاتے تھے، یعنی ایک تو وہی تزکیہ، یا چاہیے تو صاف اور عام تعبیر میں یہ کہیے کہ صفائی کا کام کیا جاتا تھا، ہم سلبی اور منفی طریقۂ کار اس کا نام رکھتے ہیں اور دوسری بات "تحلیہ" یعنی صفائی کے بعد جن صفات کی پرورش ان کے پیشِ نظر تھی اس کی عملی راہ پر لوگوں کو لگانا، نفوس کو ان صفات و ملکات سے آراستہ و پیراستہ کرنا۔

Marfat.com

تزکیہ اور صفائی

یوں تو تزکیہ کے ذیل میں بیسیوں چیزیں آتی ہیں لیکن خیر و شر کے اس مجموعہ میں جس کا نام "الحیوٰۃ الدنیا" ہے جس کی کوئی بھلائی برائی سے جدا ہو کر نہیں پائی جاتی اور کوئی برائی ایسی نہیں ہے جس میں بھلائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نہ نکل آتا ہو، حتیٰ کہ بقول عارفِ شیراز

چراغ مصطفوی با شرار بولہبی ست

اسی چمن کا ایک بہترین پھول علم کا بھی پھول ہے، لیکن قرآن کے حوالہ سے گذر چکا کہ اس پھول میں بھی

کلا ان الانسان لیطغیٰ   ہوشیار! کہ انسان ضرور سرکش ہو جاتا ہے

کا کانٹا بھی چھپا ہوا ہے، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ ایک دن فرمانے لگے کہ آدمی

"چوں علم بیاموزد او را شرفے حاصل آید" ص ۴۴ فوائد

اور اگر یہ علم کہیں دین کا علم ہوا اور دینی علم کے مطابق روزے نمازیں بھی کوئی لگ گیا، تو پھر کیا کہنے ہیں۔ "چوں طاعت کند کار او بہتر رود" سودا خوب چل نکلتا ہے، انگلیاں اٹھنے کے لیے، آنکھیں جھانکنے کے لیے ہر طرف تیار ہو جاتی ہیں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ علم اور عمل کی اس مجموعی کیفیت سے "پندار" کا فاسد مواد عالم کے دماغ میں پکنے لگتا ہے، یہی وقت ہوتا ہے کہ بباطِ علم کے ان تازہ نو واردوں پر کوئی پختہ کار "پیر باید تا ہر دو را بشکند یعنی علم و عمل را از نظر او فرود آرد" "علمی پندار" کی ریاح جب دماغوں میں بھر جاتی ہے اور ان مسکینوں کی گردنیں ان ہی ہریلی گیسوں سے اکڑ کر رہ جاتی ہیں، اس وقت اس کھنچی ہوئی گردن کو نرمانے کے لیے نشتر کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ سب سے بڑا سرطانی پھوڑا جس کا نام "خود پسندی" اور "عجب" ہے اس کی ٹیس سے انسانی روح کو نجات مل جاتی ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں "تا بہ عجب (خود پسندی) مبتلا نہ شود"

بہر حال یہ پہلی سلبی کارروائی ہوتی ہے جو اس راہ میں اختیار کی جاتی ہے، سلطان المشائخ کا علاج شیخ کبیر نے اس سلسلہ میں کس طریقہ سے کیا تھا، بعد کو اس کا ذکر خود کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ

Marfat.com

"مولانا بحاث" اور "محفل شکن" کے حجابات لے کر مولانا نظام الدین کے نام سے سلطان جی شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، پہلا کام شیخ نے یہی کیا کہ باوجود سب کچھ لکھ پڑھ چکنے کے حکم دیا کہ نظام تمہیں کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی پڑینگی، اسی بنیاد پر عوارف کا سبق شروع ہوا، غالباً چند ہی اسباق ہوئے ہونگے کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جو نسخہ عوارف کا شیخ کبیر کے ہاتھ میں تھا "ہمانا کہ نسخہ بود بخط باریک نوشتہ باسقیم گونہ" یعنی اس نسخہ کا خط باریک تھا یا اس کی لکھائی گونہ اچھی نہ تھی، ہوا یہ کہ "شیخ را در میاں ان اندک مکثے بود" یعنی شیخ کبیر کچھ اس مقام پر اٹکنے لگے بیچارے بوڑھے آدمی، وہ تو اس عبارت میں غور کر رہے تھے، ادھر جوان عالم کے جوان علم کے گرم خون میں جوش آیا، سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ

"من نسخۂ دیگر بخدمت شیخ نجیب الدین متوکل علیہ الرحمۃ دیدہ بودم"

اسی "دیدہ بودم" کے ذریعہ سے اپنی وسعت نظری کا اظہار فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ کبیر کے سامنے بایں الفاظ کیا کہ "شیخ نجیب الدین نسخۂ صحیح دارد" بس "دیدہ بودم" کے علم کا ادھر اظہار ہوا اور دوسری طرف سے ایک آواز جس میں ہیبت ملی ہوئی تھی سلطان المشائخ کے کان سے ٹکرانے لگی۔ "درویش را قوت تصحیح نسخۂ سقیم نیست" ایک دفعہ نہیں بار بار شیخ کبیر اس فقرہ کو دہراتے جاتے تھے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا کہ یہ اشارہ کس کی طرف ہے لیکن چند بار مکرر سہ کرر یہی الفاظ شیخ کبیر کی زبان مبارک سے نکلتے رہے تو جماعت کے دوسرے ساتھی مولانا بدر الدین اسحٰق نے سلطان جی کو اشارہ کیا کہ خطاب تمہاری طرف ہے سلطان جی کے ہوش اڑ گئے۔ فرماتے ہیں کہ "سر برہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم" شیخ کبیر کے قدموں پر "محفل شکن" "مولانا بحاث" کا سر پڑا ہوا تھا کہتے جاتے تھے۔

"نعوذ باللہ منہا کہ مرا مقصود ازیں سخن کنایتے بہ مخدوم بودہ باشد"

وہ یہ سمجھے کہ شیخ کبیر نے شاید میرے اس بیان سے کہ شیخ نجیب الدین کا نسخہ صحیح ہے اپنی اہانت محسوس کی اسی کی معافی چاہ رہے تھے، حالانکہ واقعہ تو کچھ اور تھا، فرماتے ہیں کہ

میں عرض کر رہا تھا کہ

"من نسخہ دیدہ بودم ازاں حکایت کردم مرا اصلا چیزے دیگر در خاطر نہ بود"

اور اسی "دیدہ بودم" کے پیچھے تو وہ بات چھپی ہوئی تھی جس پر یہ قیامت برپا ہوئی تھی خلاصہ یہ ہے کہ "من معذرت می کردم اثر بے رضائی ہمچناں در شیخ می دیدم" جرم ناقابلِ عفو قرار پایا سب کچھ بچ کر جو کسی کے آستانہ پر آیا تھا صرف ایک دیدہ بودم کے دعوے نے اس کو اس حال میں پہنچا دیا۔ صادق اور کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا دنیا دیکھ رہی تھی اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے، کیا مولانا بحاث اور محفل شکن" ہی کے لقب کو لے کر دنیا سے واپس چلے جائینگے جیسے لاکھوں ہی بحاث اور محفل شکن آئے اور چلے گئے یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے ورنہ سچ یہی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا　　ورنہ گلشن میں علاج تنگیِ داماں بھی ہے

"چند کلیاں" جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے، ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور میں نے غلطی ہی کیا کی ہے۔ ایک اچھے نسخے کا علم تھا اس کا اظہار کیا گیا تھا پھر اس پر اتنی برہمی کے کیا معنی؟ یہی شوشہ اگر سامنے آجاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا، اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے۔ مزاج میں تندی اور غصہ ہے۔ العیاذ باللہ۔ آگے بڑھ کر تو اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت بھی قرار دیا جاسکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لے کر سلطان جی چاہتے تو اسوۂ حسنہ نبویہ کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرزِ عمل کو کھوٹا بنا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنا علاج کرانے کے لیے آئے تھے شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ معالج طبیب ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا، بہرحال فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر

Marfat.com

کی "بے رضائی" کو ایک حال میں دیکھ کر مایوس مجلس سے اُٹھا "برخاستم ندانستم کہ چہ کنم" "ندانستم چہ کنم" یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے آج اجودھن میں نکل رہے ہیں، جو کل تک ہر محفل میں ہر سوال کا جواب دے کر محفل کا رنگ بگاڑ رہا تھا آج اُس کی قابلِ رحم نادانی اور "چہ کنم" کا یہ حال ہے، فرماتے ہیں۔

"مبادا ہیچ کس را آں چناں روز واں چناں غم کہ مرا آں روز بود"

دماغ میں جواب پیدا ہونے کی جگہ دل میں غم کی لہریں اُٹھنے لگیں اور کیسی لہریں جس کی کسک آخر وقت تک نہیں بھولے تھے، دعا کرتے تھے کہ خدا کسی پر ایسا سخت دن نہ لائے اور ایسے غم میں کسی کو مبتلا نہ کرے، دل کے اس درد اور سینہ کی اس سوزش کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا جو ہمیشہ غم دیدوں کا آخری علاج ہے، خود ہی فرماتے ہیں۔ "گریہ در من اُفتاد" اور یہی گریہ اصل مقصود تھا جس سے وہ سب کچھ دھل جاتا ہے جسے اپنے ساتھ وہ دلی سے دلی کے مدرسوں سے لائے تھے، روتے تھے، روتے جاتے تھے کوئی چپ کرنے والا بھی نہیں جب تک رونا ممکن تھا روتے رہے، آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، اب کیا کروں، فرماتے ہیں کہ "مضطرب وحیراں بیروں آمدم" سُننے والے سُن رہے ہیں "بیروں آمدم" یہ "بیروں آمدم" کس ارادے اور کس قصد سے ہوا ہے "شیخ نجیب الدین نسخہ صحیح دارد" صرف علم کے اس دعوے نے آج رونے والے کو حجرے سے باہر نکالا ہے، اس لیے نکالا ہے کہ "تا برسیدم بر سر چاہے" کیا پانی پینے کے لیے، ہاتھ مُنہ دھونے کے لیے، غم کی گرمی میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے "بر سر چاہے" رسائی ہوئی ہے۔ انہی سے سُنیے جو اس کنوئیں کے کنارے آکر کھڑے ہوئے ہیں:۔ "خواستم کہ خود را دراں چاہ اندازم" معالج نے علاج سے انکار کیا ہے اس مریض سے پوچھیے جو طبیب سے آخری جواب لے کر واپس ہوا ہو۔ نور اللہ ضریح السعدی حیث قال

ما جرائے دل دیوانہ بگفتم بہ طبیب — کہ ہمہ شب در چشم ست بفکرت بازم

گفت ازیں نوع حکایت کہ تو گفتی سعدی — درد عشق ست ندانم کہ چہ درماں سازم

Marfat.com

پھر کچھ خیال آیا، کیا خیال آیا۔ " لا ایں بدنامی بہ کہ باز گردد " کنویں میں فقیر کو کس نے دھکیل کر مار ڈالا، اس تہمت میں کس کس کی گرفتاری ہو، فرماتے ہیں کہ اسی خیال نے " چاہ اندازم " کے خیال سے باز رکھا عقل و ہوش کا تکلیفی سرمایہ اگرچہ گم ہو چکا تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ تحت الشعور " خودکشی " کے جرم کا خیال بھی مانع آرہا ہو، بہرحال کنویں کی منڈیر سے نیچے اُتر آئے اور

" دریں محنت و حیرت سراسیمہ وار جانب صحرا بیروں رفتم "

اجودھن کی فضاؤں میں کسی کے نالہائے زار اب تک گونج رہے ہونگے، فرماتے ہیں،

" جانب صحرا بیروں رفتم با خود گریہ و زاری کردم "

خدا ہی جانتا ہے " گریہ و زاری " کا یہ طوفان کب تک اُمنڈتا رہا، ہفتہ گذرا یا مہینہ، شیخ کبیر کے ایک صاحبزادے شہاب الدین لقب سلطان جی اور ان میں میل ملاپ تھا، موقع مناسب پا کر اُنھوں نے سلطان جی کا حال شیخ کبیر کے سامنے عرض کیا، جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ " بیا دم سر در قدم مبارک آوردم " جرم کی معافی ہو گئی، معافی کے دوسرے دن پھر طلبی ہوئی اور ارشاد ہوا، جو راز تھا، اس سے پردہ اُٹھایا گیا۔ شیخ کبیر نے مولانا نظام الدین بجائے محفل شکن کو جو اب صرف بابا فرید کے " نظام " بن چکے تھے مخاطب کر کے فرمانے لگے :" ایں ہمہ برائے کمال حال تو می کردم " مرید سے پیر کا کیا تعلق ہوتا ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اسی دن یہ راز بھی واضح ہوا شیخ کبیر نے فرمایا " پیر مشاطہ مرید باشد " مرید کی ساری ژولیدگیوں کو وہی سلجھاتا ہے میل کچیل کو دھو دھا کر صاف کرتا ہے، غازہ ملتا ہے، بال سنوارتا ہے اور یوں " یحببکم اللہ "[۱] کے مقام پر پہنچا کر اُسے ملاء اعلیٰ کا اور ملاء اعلیٰ کا اثر ملاء ادنیٰ پر، ملاء ادنیٰ سے محبوبیت کی وہی کیفیت قلوب انسانی میں پھیل جاتی ہے[۲]۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ

---

[۱] خدا کے تم محبوب ہو جاؤ گے، اگر تم اپنے اندر میرا رنگ ڈھنگ، میری شان و ادا پیدا کرو گے، حضرت حق سے محبوبیت ذاتی کا جیسے تعلق ہے، اسی کی زبان مبارک سے قرآن میں یہ اعلان کرایا گیا ہے، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ " کی آیت سے کون واقف نہیں ۱۲۔

[۲] ایک صحیح حدیث جو عام طور سے مشہور ہے یہ اسی کا حاصل ہے ۱۲۔

Marfat.com

اس ارشاد کے بعد" مراخلعت فرمود بخصوص خاص سراشرف گردانید" فوائد الفواد ص ۳۰

پندار و خود پسندی کا فاسد مواد اگر اتنے کا گرنشتر کے بعد بھی نہ نکلتا تو کب نکلتا، اس کے بعد سلطان المشائخ کا جو حال ہو گیا تھا، اس کی کیفیت بھی خود ہی بیان کرتے ہیں، شیخ کبیر نے سلطان جی کو ایک دعا سکھائی، پوچھا کہ اب سناؤ، سنانے لگے، ایک لفظ کے اعراب میں شیخ کبیر نے اصلاح فرمائی، فرماتے ہیں کہ گو جو اعراب میں نے پڑھا تھا "ہم معنی داشت" لیکن یہ تو ان کا نحوی علم تھا، اس سے دست بردار ہو چکے تھے۔ پس "ہمچناں کہ شیخ فرمود بخواندم" شیخ نے دوبارہ سنانے کے لیے حکم دیا، دعا سنائی گئی "واں شیخ فرمودہ بود ہمچناں بخواندم"

سلطان المشائخ فرماتے ہیں، میرے اس طریقۂ عمل کو مولانا بدرالدین اسحٰق دیکھ رہے تھے۔ جب شیخ کبیر کے سامنے سے اٹھ کر ان کے پاس آیا کہنے لگے: "نیکو کردی کہ ایں اعراب ہمچناں خواندی کہ شیخ فرمودہ بود" سلطان المشائخ نے جواب میں کہا۔

"اگر سیبویہ کہ واضع ایں علم نحو ہست واں دیگراں کہ بانی ایں قواعد بودند بیایند

مرا گویند کہ اعراب ہمچناں نیست کہ می خواندی من ہمچناں بخوانم کہ شیخ فرمود"

یہ تھا صفائی کا پہلا مقام جس پر پہنچنے کے بعد

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست — کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

یہ تو پندارِ علم کی شکست کی تدبیر تھی جو اس زمانہ میں اپنے مریدوں کے ساتھ پیروں کا وہ طبقہ اختیار کرتا تھا جو واقعی ان کی مشاطہ گری کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا تھا، لیکن علمی پندار سے بھی زیادہ ایک اور دوسرا عارضہ انسانی فطرت کو چمٹا ہوا ہے، عارضہ بھی ہے اور اسی پر ہماری ساری صحت مندیوں ترقیوں اور بلندیوں کا دار و مدار بھی۔

انسانیت کا "معکوس فلسفہ" جو دنیا پر چھایا ہوا ہے، اب تو اس کا سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔ بہر حال سمجھ میں آئے یا نہ آئے مجھے تو ہندوستان کے ایک خاص عہد کی تاریخ بیان کرنی ہے جو واقعات گذرے ہیں ان کا اظہار مقصود ہے سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے بات

Marfat.com

یہ ہے کہ مذہب کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں بجائے اپنی مرضی اور اپنے دماغی مشوروں کے حق تعالیٰ کی اس مرضی کی پابندی کی جائے جس کا اظہار پیغمبروں کے ذریعہ سے فرماتا رہا ہے اور جس کی کامل ترین محفوظ ترین آخری شکل کا نام قرآن اور اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے خدا کی مرضی جب اپنی مرضی سے ٹکرانے لگے، اس وقت خدا ہی کی مرضی کی رہنمائی قبول کر کے اسی کے تحت اپنے آپ کو ڈال دینا، اسی کی مشق کا اصطلاحی نام ہمارے بزرگوں میں یہ تھا کہ نفس کی خلاف ورزی کی مشق بہم پہنچانی چاہیے، قرآن کی آیت

ونھی النفس عن الھویٰ (القرآن الحکیم) اور روکا نفس کو "الھویٰ" سے

سے ان کی یہ اصطلاح ماخوذ تھی، خدا کی مرضیات سے نفس کی جو خواہشیں متصادم ہوتی ہیں ان ہی کا قرآنی نام "الھویٰ" ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نفس کی عام خواہشوں پر آدمی کو قابو حاصل ہو جائیگا تو پھر جو خواہشیں مرضی حق کے مطابق نہ ہونگی اُن کو چھوڑ کر بآسانی اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے مطابق بنانے کی اُس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

آزادی اور حریت کے اس دور میں جس میں نفسانی خواہشوں کی تعبیر رائے کی آزادی، فکر کی آزادی اور خدا جانے کون کون سی آزادیوں کی خوبصورت الفاظ سے کر کے انسانیت کی بلندی کا معیار ہی اب یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جو شخص جس حد تک اپنی نفسانی خواہشوں کا پابند ہے اسی حد تک وہ آزاد ہے، حُر ہے، اور جو حُر ہے آزاد ہے۔ اسی پر بنی آدم کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی ہیں۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی معکوس اور اوندھی ذہنیت کے زمانہ میں "مخالفت نفس" کا نظریہ جس حد تک بھی بے معنی ہو کر نہ رہ جائے کم ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ پرانے ادبیات کی پیروی میں کم و بیش اب بھی اس لفظ کا استعمال دنیا میں باقی ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے، اس مشق کا کیا مقصد ہے، میں تو نہیں سمجھتا کہ کسی کے سامنے ان سوالات کے وہی جواب جو واقعی ان کے جواب تھے اب باقی

ہونگے، کچھ دھندلا دھندلا سا اس قسم کا تصور عالم لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ صوفیہ کے نقطۂ نظر سے گویا آدمی میں ثانوی قسم کا کوئی زندہ حیوانی وجود اور بھی ہے جس کی دشمنی اور عداوت صوفیوں کے نزدیک ضروری ہے، حالانکہ واقعہ جو کچھ ہے وہ میں عرض کر چکا حق تعالیٰ کی مرضیات کے مطابق جو زندگی گذارنا چاہتا ہے، کیا اس مشق سے بے نیاز رہ سکتا ہے؟

بہرحال اب کسی کی سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن ایک زمانہ تھا جس میں کامیابی کا بڑا راز اسی مشق میں مستور سمجھا جاتا تھا، چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

"نفس آدمی بمنزلہ درختیست کہ بعد ہوائے شیطانی در ذات ایں کس بیخ می گیرد، محکم می شود اگر آدمی بتدریج و سکونت بزور عبادت و تقویٰ و بقوت محبت و عشق ہر روز آں درخت را بجنباند ہر آئینہ بیخ او سست شود، و قابلِ قلع گردد" سیر الاولیاء ۳۳۲

(اکھاڑنے)

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے، تو پھر آدمی کو قوانینِ الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

فان الجنۃ ھی المأوی (القرآن الحکیم) جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

کا نظارہ اسی "نھی النفس عن الھویٰ" کی تعمیل کے بعد ہی سامنے آجاتا ہے،

خلاصہ یہ ہے۔ اس زمانہ میں خواہ جو بھی فیصلہ صادر کیا جائے، اور آزادی، حریت جس چیز کا بھی نام رکھا جائے لیکن ہمارے بزرگوں کے نزدیک تو

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد   کہ بستگان کمند تو رستگار انند

حقیقی آزادی کا صحیح ترجمہ یہی تھا۔ اس آزادی کی تلاش میں سلطان المشائخ شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، شیخ اس سلسلہ میں ان سے کیا کیا کراتے تھے اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اجزاء کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، میں نے بیان کیا تھا کہ سلطان جی جب اجودھن میں تھے تو اُن کا ایک رفیقِ درس بھی اس عرصہ میں اجودھن پہنچا، ان کی

Marfat.com

اس حالت کو دیکھ کر جس میں بظاہر وہ مبتلا نظر آتے تھے اسے بڑا تعجب ہوا اور بولا کہ "نظام الدین ترا چہ پیش آمد"

میں نے لکھا تھا کہ شیخ کبیر نے اسی زمانہ میں حضرت نظام الاولیاء کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ تمہاری موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہنا کہ

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو　　ترا سعادت بادا مرا نگونساری

کیا شبہ ہے کہ سُننے کی حد تک اور کہنے کی حد تک شعر بڑا لذیذ ہے، لیکن جب اسی پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو کتنے ہیں جو سعادت کو چھوڑ کر نگونساری اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج نے صرف شعر سُنانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اسی کے بعد آپ نے سلطان جی کو حکم دیا کہ "در مطبخ برو و بگو تا خوانے پر بالوان نعم آراستہ بیارند"

یہ اجودھن کا وہ وقت تھا کہ جہاں ایک مدت تک سلطان المشائخ کی روایت کے مطابق کہ شیخ کبیر نے جب شروع شروع

"در اجودھن ساکن گشت بنان درویشانہ و چیزہائے کہ دراں دیار خیزد چوں پیلو و مانند آں قانع گشت۔"

لیکن اب وہ وقت باقی نہ تھا بلکہ "از آمد و شد خلق حد نہ بود" آنے والوں میں غیاث الدین[1] بلبن جیسے سلاطین بھی تھے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس اجودھن کا کیا حال ہوگا۔

---

[1] سلطان المشائخ ہی کی روایت ہے کہ جس زمانہ میں بلبن سلطان ناصر الدین محمود کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو ملتان جاتے ہوئے اجودھن بھی حاضر ہوا۔ ساری اسلامی فوج نے اجودھن کا احاطہ کر لیا تھا، ہر ایک شیخ کبیر سے تبرک حاصل کرنا چاہتا تھا، کوٹھے سے ایک آستین شیخ کی لٹکا دی گئی اور فوج کے لوگ اسی کو بوسہ دے کر آگے بڑھتے جاتے تھے تا اینکہ "آں ہم پارہ پارہ شد" والقصہ بطولہا، آخر میں بلبن نے خدمتِ مبارک میں نقد اور چار گاؤں کا فرمان پیش کیا، گاؤں کے فرمان کو تو واپس کر دیا گیا، اور نقد فقرا میں تقسیم کرنے کے لیے قبول فرمایا گیا، بلبن نصیحت کا طلبگار رہا، دو شعر سُنا دیے گئے ؎

فریدون فرخ فرشتہ نہ بود　　ز عود و ز عنبر سرشتہ نہ بود
ز داد و دہش یافت آں نیکوئی　　تو داد و دہش کن فریدوں توئی

Marfat.com

نظام الاولیاء کا بیان ہو کہ

در خانہ بہ قیاس نیم شب کم و بیش نہ بستندے یعنی پیوستہ در بانہ بودے و طعام و نعمت موجود از کرم خدائے آئندہ و روندہ را از آں نصیب شدے، ہیچ بخدمت ایشاں نیامدے کہ او را چیزے نصیب نہ گردے۔ (سیر الاولیاء ص ۶۵)

اور سچ تو یہ ہو کہ "تقویٰ" کی تاریخ میں۔

یجعل لہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب — بنا دیتا ہو اللہ اس کے لیے کشائش کی راہ اور روزی پہنچاتا ہو ایسی جگہ سے جہاں سے شان گمان بھی نہ ہو

کی قرآنی آیت کی ان تفسیروں کو دنیا نے کب نہیں دیکھا ہو، خصوصاً اسلام تو اراک (پیلو) ہی کے پھل کھانے والوں سے شروع ہوا اور "الوان نعم" پر ختم ہوا۔

بہر حال میں کیا کہنے لگا قصہ نظام الاولیاء کا سُنا رہا تھا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے نان کو مطبخ بھیجا کہ ایک "مکلف خوان" مرتب کر کے میرے پاس لایا جائے۔ خوان آگیا، کس لیے آیا، سلطان المشائخ ہی سے سُنیے فرماتے ہیں کہ مجھ ہی کو خطاب کر کے شیخ کبیر کا ارشاد ہو رہا تھا

"نظام! ایں خوان طعام را بر سر کن و در مقامے کہ آں یار فرود آمدہ است ببر"

ابھی جس ہم درس نے مولانا نظام الدین کو دلی میں محفل شکنی میں مصروف پایا تھا، اور اسی بنیاد پر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے چند گھنٹے پہلے اسی اجودھن میں اس حسن ظن کا اظہار کیا تھا کہ "اگر در شہر تعلیم می کردی مجتہد زمانہ می شدی" اسی بیچارے "مجتہد زمانہ" کا یہ انجام ہو کہ اس کے سر پر خوانچہ رکھا جاتا ہو اور دو رویہ بازار کے بیچ سے بھری ہو خلق کے سامنے سے اسی کو حکم دیا جا رہا ہو کہ اس طعنہ دینے والے ساتھی کے پاس اس خوان کو لیجاؤ خودداری کے گھاؤ رکھنے والے اس شیس کو کیا برداشت کر سکتے تھے؟ آزاد فکر، آزاد ناکیا اس بوجھ کو اٹھا سکتی تھی؟ "آہ ز سعادت با دامِ انگونساری" کی لذت صرف کانوں تک نہیں بلکہ جب روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہو تو پھر سب کچھ اٹھا لیا جاتا ہو۔ "مجتہد زمانہ" سمجھنے والوں کے

سامنے وہی آدمی چلا جاتا ہے، سر پر خوانچہ لیے چلا جاتا ہے، دیکھو مولانا نظام الدین اسی حال میں "اجودھن" کے بازار سے گذر رہے ہیں خود فرماتے ہیں۔

"من بحکم فرمان خواجہ آں خوان را بر سر گرفتم درواں شدم ودر سرائے کہ آں یار فرود آمدہ بود آوردم"

"مجتہد زمانہ" ہونے کی صلاحیت کا حسن ظن رکھنے والا سلطان جی سے کس حد تک متاثر تھا، اس کا اندازہ آپ اسی سے کیجیے کہ خود حضرت ہی کا بیان ہے۔

"چوں نظر آں یار بر من افتاد گریہ کناں دوید"

جو دلّی میں اتنا بلند تھا کہ دنیا اس کو سر پر اُٹھائے ہوئے تھی آج وہ ایک معمولی خدمتگاروں کی مانند بر سر بازار اپنے سر پر خوانچہ لیے چلا آرہا ہے۔ یہ حال تھا ہی اتنا رقت انگیز کہ وہ چیخ اُٹھا روتے ہوئے دوڑا، "وخوان از سر من فرود آورد و پرسیدن گرفت کہ ایں چہ حال ست" سلطان جی اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ ع کاں تحمل کہ تو دیدی ہمہ بر باد افتاد"

جو دل چاہے، دماغ چاہے، وہ نہ چاہا جائے، اس کی مشق گاہ میں یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے، جھوٹی عزت اور جھوٹے ناموس کا علاج کرنے والے یہی علاج کرتے ہیں، سننے والا اور دیکھنے والا بھی آدمی تھا، انسان کسی حال میں بھی کسی دلدل میں پھنسا ہو لیکن حقیقت شناسی کے فطری جواہر پھر بھی انہی کیچڑوں میں کسی سخت ضرب سے چمک اُٹھتے ہیں اب وہ بھی روشنی میں تھا، اعتراف کرنے لگا کہ

"ایں چنیں شیخے معظلے داری کہ نفس ترا بدیں صد ریاضت دادہ ست"

"نفس ترا بدیں صد ریاضت دادہ ست" یہ تھی سارے قصہ کی روح جسے افسوس اس زمانہ میں وہ بھی پالیتے تھے جو کچھ پائے ہوئے نہ تھے، اس نے بھی شیخ کبیر کی قدمبوسی کی تمنا ظاہر کی، سلطان جی نے کھانا کھانے پر اصرار کیا، کھانا کھا لیا گیا، اب خوانچہ خالی ہو چکا تھا، سلطان جی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

Marfat.com

دانشمند (وہی ان کا عالم دوست) خدمتگار خود را گفت کہ این خواں بر سر کن برابر ما بیا"

وہ خدمتگار سے یہ کہہ رہا تھا، لیکن خدمت لینے والے نے یہ خدمت جس کے سپرد کی تھی۔

"خیر چنانکہ اں خوان آوردہ ام ہمچناں ببرم و برسانم"

کہتے ہوئے جس خوان کو ان کے شیخ نے سر پر چڑھایا تھا، پھر سر پر اٹھالیا، دانشمند مجبور تھا، کیا کرتا، اسی حال میں "آں دانشمند برابر سلطان المشائخ بخدمت شیخ شیوخ العالم آمد"

اس قصہ کے براہ راست راوی حضرت چراغ دہلوی نے یہ فرماکر فقرہ کو ان الفاظ پر ختم کیا "سواد از سر رعونت را بر خاک درگاہ آں بادشاہ اہل محبت نہاد" (سیر الاولیاء، ص ۲۴۰)

میر خورد نے چراغ دہلوی کی زبان مبارک سے اس قصہ کو سن کر اپنی کتاب میں درج کیا ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں طریقہ چشت کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

مخالفۃ النفس راس العبادۃ وموافقۃ الناس اساس الکفر۔ "النفس کی مخالفت (چشتیوں) کے یہاں عبادت کی جان ہے، اور عام راہ و رسم کی پابندیوں میں پھنسے رہنا یہ ان کے یہاں کفر کی بنیاد ہے۔

اور یہ کہ "النفس ہو الصنم الاکبر" (چشتی صوفی نفس کو "صنم اکبر" کہتے ہیں۔

چشتی مجاہدات کی یہی بنیادی اینٹ ہے، ان کا "طریقہ خاص" جیسا کہ شاہ صاحب نے اسی کے بعد نقل کیا ہے، اس دستور پر مبنی تھا

"گر حیات خوب" خواہی نفس را گردن بزن — زانکہ از نفست توی تر ہیچ دشمن دار نیست"

اور "حیات خوب" ستھری زندگی" کے حاصل کرنے کی یہ پہلی شرط تھی، یعنی اپنی مرضی، اپنی خوشی اپنی خواہش سے جس وقت بھی دست بردار ہونے کا حکم دیا جائے، آدمی اسی وقت بغیر کسی کشمکش لیت و لعل کے دست بردار ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس ملکہ کو پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گو "طریقۂ چشت" میں مجاہدہ کے اس پہلو پر بہ ظاہر زیادہ زور دیا جاتا ہے، اور راہ کی پہلی منزل یہی ٹھہرائی گئی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اور بھی جتنے دوسرے طرق و وسائل ہیں، اس کی مشق تو سب ہی میں کرائی جاتی ہے، حتیٰ کہ اس حد تک تو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب کے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک نفس کی مخالفت کی مشق بہم نہیں پہنچائی جائیگی غیب کی راہ آدمی پر نہیں کھلتی، جوگیوں سے یوگیوں سے راہبوں سے جس سے بھی آپ پوچھینگے پہلی بات وہ آپ کے سامنے یہی پیش کریگا، اور وہ دل ہلا دینے والے ریاضات ہائلہ جن کا انتساب مختلف مذاہب کے درویشوں، اور فقیروں کی طرف کیا جاتا ہے، دریافت سے معلوم ہوگا کہ سب کی تہ میں یہی بات چھپی ہوئی ہے، گو جس کا مطالبہ کیا گیا تھا، غلو[1] پسند انسان جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے اپنے "نشان زدہ" حدود پر ٹھہرا نہ رہا، اور نفس کی مخالفت میں بڑھا، تو اتنا بڑھا کہ جس مقصد کے لیے یہ مشق تھی خود اس مقصد کی مخالفت کی بھی پروا نہ کی گئی، مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشوں کی مخالفت کے مشق کی غرض جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہی تھی کہ حق کی مرضیات کی تعمیل آدمی پر آسان ہو جائے، لیکن دیوانوں نے مخالفت نفس ہی کو مقصد بنا لیا، اور اس حد تک اب اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے کہ خدا کی مرضی کی بھی اس سلسلہ میں اگر مخالفت ہو رہی ہے تو اس سے بھی وہ بے پروا ہو گئے۔

خصوصاً ہمارے ملک ہندوستان نے تو "مخالفت نفس" کے مسئلہ میں وہ وہ عجیب تماشے تاریخ میں پیش کیے ہیں کہ شاید دنیا اس کی نظیر کے پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس ملک کے ہندو درویشوں ہی کا ایک فرقہ وام مارگی فرقہ تھا جو تنہائی میں عورتوں

---

[1] غلو کی ایک اچھی مثال مولانا غلام علی نے نقل کی ہے۔ حضرت برہان الدین غریب کے ایک مرید مولانا شمس الدین فضل اللہ نامی تھے ایک دن جوش میں آکر شیخ سے عرض کرنے لگے "ایں بیچارہ می خواہد کہ ترک عمل را او را می کند، شیخ نے پوچھا کیوں تو بولے کہ قرآن میں ہے من عمل صالحاً فلنفسہ جو عمل نیک کرتا ہے اپنے نفس کے لیے کرتا ہے، بولے کہ من برائے نفس کنندہ خود عمل نخواہم کرد" ۱۲ ظاہر ہے کہ اسی کا نام غلو ہے۔ شیخ مسکرائے اور فرمایا "فرمان چنین ست باید کرد"۔ اور جب فرمان کے مطابق ہوا تو نفس کے لیے کب رہا، ۱۲

Marfat.com

اور مردوں کے مخلوط مجمع میں شراب پی پی کر اس کا امتحان لیتا تھا کہ عورتوں کے متعلق مردوں کو اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں سارا برِ اعظم ہند ایسی خانقاہوں اور آشرموں سے بھرا ہوا تھا جن میں جوان مرد اور جوان عورتیں عریاں ہو کر نفس کشی کی مشق کرتی تھیں، اور بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی تھی، اگھوری پنتھ کے فرقے بھی "مخالفت نفس" ہی کی ایک غلیظ نظریہ کے ساتھ اس ملک میں پیدا ہوئے اور اپنے سارے گندے کاموں کی تعبیر "نفس کشی" سے کر کے مدعی تھے کہ ان کی آتما (روح) اس طریقہ سے مہا آتما (روح اعظم) کے مقام تک پہنچ جاتی ہے، پنڈت دیانند سرسوتی جی کا "ستیارتھ پرکاش" میں یہ بیان بھی ہے، کہ اسی ملک میں نفس دشمن فرقوں میں ایک فرقہ "یامپر دائے" ان لوگوں کا بھی تھا جو اپنے مسلک کی تعبیر "بانگ ودیا" سے کرتے تھے، پنڈت جی ہی نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کے یہاں مخالفت نفس کا سب سے اعلیٰ مقام یہ تھا کہ آدمی اپنی ماں سے بھی بدکاری کر گذرے کہ یہ سب سے بڑی مخالفت ہے نفس کی جس پر وہ کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا گویا جب یہ بھی کر گذرا تو اب اس راہ کی کوئی منزل باقی نہیں رہی اور یہی ہوتا ہے ہمیشہ انجام ان لوگوں کا جو خدا کی باتوں میں اپنے دماغی وسوسوں کو شریک کر کے اسی کو اپنا مذہب ٹھہرا لیتے ہیں، ہا! کتنا پاکیزہ اصول تھا لیکن نفس کے بندوں نے نفس ہی کی موافقت میں مخالفت نفس کے نام سے کن تباہیوں اور بربادیوں کا اسی ذریعہ بنا دیا۔

بہرحال یہ انجام تو ان کا تھا جنہوں نے مخالفت نفس کے طرز عمل کو حق تعالیٰ کی مرضیات کی موافقت کا ذریعہ نہیں بلکہ خود اسی کو ایک اہم مقصد بنا لیا، لیکن ظاہر ہے کہ اسلام میں مخالفت نفس کی بذاتِ خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کی قیمت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس مخالفت کو رضائے حق کی موافقت کا ذریعہ بنایا جائے، مخالفت نفس کے سلبی اور منفی مجاہدہ کے بعد قدرۃً یہ سوال ہوتا ہے کہ اس مشق کی قیمت حاصل کر لے کی صحیح راہ کیا ہے؟ زندگی کو مرضیات حق پر بآسانی منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا

جب یہی اس مجاہدہ کی اصل غرض تھی، تو اب یہی تلاش کرنے کی چیز تھی، کہ حق کی "مرضیات" کے ملنے کی ایسی راہ کون سی ہے جس میں خالق کے سوا کسی مخلوق کے دماغی مشوروں کے کانٹوں سے اُلجھ جانے کا قطعاً اندیشہ نہ ہو، کیونکہ اگر خالق کی مرضی کے ساتھ ساتھ مخلوق کی مرضی پر بھی ہمیں چلنا ہے، تو پھر مخلوقات میں بجائے دوسروں کے خود اپنی مرضی ہی کی شرکت کے ساتھ خدا کی مرضی کی اطاعت ہم کیوں نہ کریں۔

دنیا کی جن قوموں کے پاس "خدا کی مرضی" جو پیغمبروں کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھی، جب "خالص خدا کی مرضی" باقی نہ رہی تو مخالفت نفس کی ساری ورزشوں کے بعد ظاہر ہے کہ اس ورزش سے نفع اُٹھانے کی کوئی صورت ہی ان کے پاس باقی نہ رہی غالباً غیر اقوام و ادیان کے پیرؤوں میں مخالفتِ نفس کی بوالعجبیوں کے رواج پذیر ہونے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جس مقصد کے لیے ان کے بزرگ نفس کشی کرلتے تھے، جب اس مقصد کا حصول ہی ان کے لیے ناممکن ہوگیا تو اُنھوں نے بذاتِ خود "نفس کشی" ہی کو اپنا بالذات مقصود بنالیا، چونکہ مخالفت نفس کی انتہائی ہولناک بلکہ مہلک غیر فطری شکلوں میں بعضوں کو "یکسوئی" کے مواقع ہاتھ آجاتے ہیں، آخر جس نے کھانا بھی چھوڑ دیا ہو، پینا بھی چھوڑ دیا ہو، پھرتا بھی چھوڑ دیا ہو، ظاہر ہے کہ اس کے دماغ میں حرکت ہو تو کیوں ہو۔ انسانی دل و دماغ میں حرکت و جنبش تو ان ہی ضروریات حیات کی فراہمی کے لیے ہوتی ہے اور یہ ایک مذہبی نہیں بلکہ فطری بات ہے، انسان کی فطرت کا قانون ہے کہ یکسوئی کے بعد آدمی کی پوشیدہ قوتیں فعالیت کا رنگ اختیار کرلیتی ہیں، کیونکہ ضروریات حیات میں ژولیدہ قلوب ان قوتوں کے آثار سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو حیرت ہوتی ہے، لوگ ان پوشیدہ قوتوں کے کرشموں کے دکھانے والوں کے معتقد ہو جاتے ہیں، وہ مسکین یہ سمجھ لیتا ہے کہ لوگوں کا معتقد ہو جانا ہی، یہی مذہب کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اسی کو "وصول حق" قرار دے کر خود بھی فریب میں مبتلا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا کرتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اندھوں کے مقابلہ میں اگر سوانکھوں کے پاس بینائی کی قوت پائی جاتی ہے، ایسی بینائی جس سے رنگ روشنی وغیرہ کو وہ دیکھ سکتا ہے، جن کے دیکھنے سے اندھے معذور رہیں، تو کیا یہ سوانکھوں اور بینائی والوں کا یہ حال اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا رسیدہ اللہ کے برگزیدہ ہیں، چونکہ میں سنتا ہوں، اس لیے میں ولی ہوں، چونکہ میں دیکھتا ہوں اس لیے قطب ہوں۔ اگر دعویٰ اور دلیل کی یہ صورت مضحکہ خیز ہے تو پھر یہ بات کہ میں چونکہ تھاٹ ریڈر ہوں اس لیے ولی ہوں، مجھے اشراف علی الضمائر ہوتا ہے لوگوں کے قلبی اور دماغی خطرات کا علم ہو جاتا ہے اس لیے برگزیدہ حق ہوں، میں کچھ پیش گوئیاں کر سکتا ہوں اس لیے رسیدۂ حق ہوں۔ بتایا جائے کہ دعویٰ اور دلیل کی ان صورتوں پر بھی ہنسی کیسے رک سکتی ہے، دین کا مقصد تو خدا کی مرضی کو خدا کی خالص مرضی کی شکل میں پانا ہے کہ شخصی ہستی ہو یا کائناتی ہستی دونوں ہی معمہ کا حل اس مرضی کی یافت کے بغیر ناممکن ہے عقل اس معمہ کے حل میں درماندہ ہو چکی ہے۔

لیکن لوگوں نے بجائے اس کے باطنی قوتوں کے بیدار کرنے، احساس و علم کی بعض چھپی ہوئی طاقتوں کے اُبھارنے ہی کا نام دین اور مذہب رکھ لیا، حالانکہ اگر اسی کا نام مذہب ہے تو پھر وہ بیچارا پہلوان جو مٹی اور گرد کو بازوؤں پر مل کر اپنے مسل اور عضلات میں مقاومت کی قوتوں کو برسر کار لاتا ہے، ان کو یا جمناسٹک والے یا مداریوں کے تماشہ والوں کو بھی دین اور مذہب کی بلندی کا کوئی حصہ کیوں نہیں عطا کیا جاتا، آخر یہ لوگ بھی تو اپنی پوشیدہ قوتوں ہی کو بیدار کرتے ہیں، ان ہی چھپی ہوئی طاقتوں کو اُبھارتے ہیں جن کے امکانات ان کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔

یہ ساری بے تمیزیاں دراصل پیدا ہی اس سے ہوئیں کہ "حق کی مرضی" کو ان قوموں نے "حق کی مرضی" کی شکل میں باقی نہ رکھا، مقصود کا چہرہ نگاہوں سے چھپ گیا، وہ واپس ہوئے اور وہاں واپس ہوئے جہاں سے خدا ہی جانتا ہے کہ "مرضی حق" کی تلاش

Marfat.com

کی طرف انہیں کب واپسی میسر آئیگی، وہ قومی نخوتوں کے شکار ہیں، اپنی قوم اپنے وطن اپنی زبان کے سوا کسی دوسری قوم کسی دوسرے ملک کسی دوسری زبان میں وہ "خدا کی مرضی" کو ڈھونڈھنا نہیں چاہتے حالانکہ جس ذات گرامی نے (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری دفعہ کامل ترین شکل میں "خدا کی مرضی" کو دنیا پر ظاہر کیا۔ اس نے اپنی دعوت کو، اپنی آواز کو اپنی ہمدردیوں کو کسی قوم کسی ملک کسی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا ہے، وہ جہاں کا رسول بن کر آیا ہے، عالمین کے لیے رحمت لے کر آیا ہے لیکن قومی نشوں کے متوالے اسے اب تک عرب ہی کا رسول اُمیوں ہی کا پیغمبر مسلمانوں ہی کا نبی باور کر رہے ہیں۔

میں پھر دور نکلا چلا جارہا ہوں، عرض یہ کر رہا تھا کہ ہندوستان کے "خواجگان چشت" "مخالفت نفس" کی ممارست و مشق کے سلبی مجاہدے کے بعد پھر کس اثباتی مجاہدہ میں لوگوں کو مشغول کرتے ہیں؟

ایک سوال ہے اور بڑا بلکہ بڑے ہونے کے ساتھ دلچسپ سوال بھی ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں اپنے دعوے کا اعلان کیا ہے کہ اس سلبی مشق کے بعد جس ایجابی مشغلہ میں اپنے وابستوں کو وہ غرق کرتے تھے، دنیا سُن کر ضرور جھجکیگی، جن چشتیوں کا کام آج صرف گانا بجانا سمجھا جاتا ہے، یقیناً ان ہی کے متعلق یہ سُن کر اچنبھا ضرور ہوگا، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ یقین خالص کے تحت دینی زندگی کو منظم کرنے کے لیے اس کتاب میں غوطے دیتے تھے جس کے سوا رب العلمین کی طرف منسوب ہونے والی کتابوں میں ریب اور شک سے دنیا کی کوئی کتاب اب پاک نہیں ہے، جس ملک میں مذہب کو فلسفہ بنانے یا سیکالوجی بنانے میں آخری زور دکھلایا گیا ہو، میں نے عرض کیا تھا، اسی ملک میں اس کے سوا "چارہ کار" بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، کہ لوگوں میں "مرضی حق" کے اسی لاریبی مظہر اتم "القرآن الحکیم" کے ذریعہ سے لازوال الیقین کی روشنی پیدا کی جائے، اور یہی میرا دعویٰ ہے کہ "خواجگانِ چشت" کے طریقہ میں بھی ذکر و شغل، مراقبہ وغیرہ کے صوفیانہ مشاغل پائے جاتے ہوں، جیسا

Marfat.com

کہ عام طور پر صوفیاء اسلام کے دوسرے طرق و سلاسل میں پائے جاتے ہیں یا پائے جاتے ہوں لیکن جن بزرگوں کو سرزمینِ ہند میں "طریقۂ چشتیہ" کے معمارانِ اول کا مقام حاصل ہے۔ جہاں تک میں نے ان کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایجابی مجاہدات کے سلسلہ میں ان کا سارا زور اس "یقین" کی پیدائش پر مرکوز تھا جو قرآن سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ یقین کا یہی ایک ایسا سرمایہ یا کارگر حربہ ہو سکتا ہے جیسا کہ تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ اس سے فلسفیانہ دین یا قصاصانہ دھرم والوں کا عملی مقابلہ ممکن ہے۔ اس "لازوال یقین" سے پیدا ہونے والی عملی زندگی کے سامنے یقین کیجیے کہ نہ وہ زندگی ٹھہر سکتی ہے جو فلسفیانہ نظریات کے زیرِ اثر منظم ہوئی ہو، اور نہ وہ زندگی جس پر صرف مبالغہ آمیز خوارق و عجائب کے افسانوں کا دباؤ ہو میں کہہ چکا ہوں کہ فلسفہ ہو یا افسانوی وسوسہ، ظاہر ہے کہ دونوں کی بنیاد میں صرف شک ہے، ظن ہے، تخمینہ ہے، رجم بالغیب ہے، جو کچھ کہا گیا ہے بے دیکھے کہا گیا ہے بے جانے کہا گیا ہے۔ دونوں طریقوں سے پیدا ہونے والی مذہبی زندگیوں کی گرفت دکھانے والے خواہ قوت کی جس شکل میں بھی دکھلاتے ہوں، لیکن جس کی آخری بنیاد میں یقین نہیں ہے انسانی فطرت پر اس کی گرفت اتنی سخت ہو ہی نہیں سکتی جو صرف کامل یقین ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ جس ملک میں کام کرنے کی خدمت چشت کے پیشواؤں کے سپرد ہوئی اس میں تو خوارق اور کرامتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا، میں بتا بھی چکا ہوں اور کون نہیں جانتا کہ "مخالفتِ نفس" کی پریکٹس نے عوام نہیں تو اس ملک کے خواص میں وہ ساری خصوصیتیں پیدا کر دی ہیں جن سے ان خوارق کا تعلق ہے جو ہر اس شخص سے صادر ہو سکتے ہیں جس نے "مخالفت نفس" کی مشق کے ذریعہ سے یکسوئی پر قابو حاصل کیا ہو۔ اس کے لیے تو خدا کے ماننے کی بھی ضرورت نہیں، آج یورپ میں کتنے اسپرچولزم، مسمریزم، ہپناٹزم اور خدا جانے کون کون سے ازم والے ہیں، جن کی زندگی کو خدا کے عقیدہ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے، دیکھنے، سننے، سونگھنے، سمجھنے کی احساسی وادراکی

Marfat.com

قوتوں کے لیے اگر خدا کا ماننا ضروری نہیں ہے تو پھر اسی قسم کی بعض پوشیدہ ادراکی قوتیں اگر کسی کی برسرِ کار ہو جائیں تو اس کے لیے خدا کا ماننا کیوں ضروری ہو۔

مگر ظاہر ہے کہ ان سارے تماشوں سے سب کچھ ہو سکتا ہے، آدمی ہوا پر اُڑ سکتا ہے پانی پر چل سکتا ہے، دلوں کے بھید بتا سکتا ہے، لیکن "معمہ کائنات" کے "یقینی حل" کی جو قدرتی راہ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "خالق کائنات کی مرضی" کی یافت کا جو طبعی طریقہ ہے اس سے بے تعلق ہونے کے بعد "یقین" و "سکینت" کی کیفیت سے وہ اسی طرح محروم رہیگا جیسے ایک عام آدمی کا حال ہے۔

اور یہی ایک چیز ہے جو قرآن کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے کسی کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

خواجگانِ چشت اور قرآن

"چشتی اور غزلوں کے دیوان" کی جگہ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں "چشتی اور قرآن" کی ترکیب لوگوں کو ایک عجیب اکھڑی اکھڑی سی، اَن میل بے جوڑ بات محسوس ہو رہی ہوگی، لیکن میں کیا کروں کہ میرے معلومات یہی ہیں، اور آپ کو چاہیے کہ میرے بیان سے پہلے انکاری یا استعجابی فیصلے کے صادر کرنے میں عجلت نہ کریں، تمہیدی گفتگو بہت طویل ہو گئی، مختلف اغراض و مقاصد کے تحت مجھے اپنی اس تمہید میں بہت سی باتوں کو طے کرنا تھا، خدا کرے جو میں نے سوچا ہے، وہی اثر قلوب پر مرتب بھی ہو۔ اب سیدھے سادے الفاظ میں اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے متعلقہ معلومات کو پیش کرتا ہوں

یہ تو ظاہر ہے کہ خواجگانِ چشت میں پہلی ہستی جو اس ملک میں آئی وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اتنا تو مسلم ہے کہ حضرت خواجہ حافظِ قرآن تھے مناقب العارفین میں ہے کہ گھر سے نکلنے کے بعد حضرت خواجہ

"مدتے در سمرقند و بخارا ماند و حفظ قرآن و علوم ظاہری تحصیل کرد (ص ۲۵)

مگر اس سلسلہ میں حضرت والا کے متعلق مجھے جس تفصیل سے عرض کرنا ہے ابھی نامکمل ہونے کی وجہ سے میں ان کے متعلق سردست اسی پر اکتفا کر کے درخت پر بحث کرنے کے بجائے چاہتا ہوں کہ اس کے پھلوں کا کچھ ذکر کروں۔

آخر جس درخت کے پھلوں کو ہم پہچانتے ہیں آپ مجھے روک نہیں سکتے، اگر خود اس درخت کے پہچاننے کا بھی دعویٰ کروں، اس لیے خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو اپنے بیان کو ملتوی، صرف ملتوی کرتے ہوئے ان کے بعد کی کڑیوں پر آتا ہوں سب جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں پہلا نام مبارک حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ المعروف بقطب صاحبؒ کا آتا ہے، حضرت قطب کے ان سلبی مجاہدات کا ذکر مقصود نہیں ہے جو اپنے مرشد کے زیر ہدایت انجام دیے گئے۔ کیونکہ نمونہ کے لیے میں شیخ کبیر کے طرز عمل کو پیش کر چکا ہوں، بتانا یہ ہے کہ جب سلب اور نفی کی ساری منزلیں طے ہو چکیں تو ان کا آخری مشغلہ کیا رہ گیا تھا؟ سنیے ان کے یک واسطہ مرید و جانشین حضرت سلطان المشائخ کی شہادت سنیے۔ فوائد الفواد میں ہے حسن علا سنجری لکھتے ہیں، یہ بیان ۲۱ شوال روز چہار شنبہ ۱۷ء سنہ کا ہے

"نکتے حکایت بزرگی شیخ قطب الدین بختیار افتاد اقدس اللہ سرہ العزیز فرمود"

کیا فرمائیگے، کیا یہ کہ قطب بختیار رحمۃ اللہ علیہ قرآن کی تلاوت بہت کیا کرتے تھے، یا یہ فرمائیگے کہ وہ حافظ تھے، بچپن میں انہوں نے قرآن یاد کیا تھا، نہیں یہ نہیں بلکہ

"فرمود کہ در آخر عمر قرآن یاد گرفت چوں تمام محفوظ شد اں گاہ نقل فرمود" ص ۹،

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جب سب کچھ کر چکے، تزکیہ و تصفیہ کے سارے مراتب سے فارغ ہو چکے ... تو دل اور دماغ کی جو تختی دھو کر صاف کی گئی تھی، اسی صاف شدہ تختی پر جو نقوش آخر عمر تک سرزمین ہند کے اسلام کا دوسرا بنیادی معمار ثبت کرتا رہا وہ صرف "یقین" و

Marfat.com

"اذعان" کا وہی لاریبی سرمایہ تھا جس کا نام "القرآن" ہے اس کے بعد زندگی کی آخری سانس تک یہی مجاہدہ جاری رہا تا اینکہ جب یہ مجاہدہ بھی پورا ہو گیا، یقین کا یہ سارا سرمایہ ہضم ہو گیا تب "آں گاہ نقل فرمود" یہ خواجہ بزرگ اجمیری قدس سرہ العزیز کے پہلے خلیفہ اور جانشین کے متعلق شہادت ہے، ایسی شہادت جس سے زیادہ معتبر قابل وثوق شہادت اور کیا مل سکتی ہے کہ خود سلطان المشائخ کا یہ براہ راست بیان ہے۔

طریقۂ چشت کا جو پہلا پودا اس سرزمین میں آکر نصب ہوا، اس کے ایک ممتاز پھل (قطب صاحبؒ) کے متعلق تو یہ رپورٹ ہے، عوام واقف نہ ہوں، لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ خواجہ اجمیری قدس سرہ کے ایک اور نامور خلیفہ حضرت حمید الدین الناگوری السوالی ہیں شیخ محدث ان کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ "از اعاظم خلفا حضرت خواجہ بزرگ معین الحق والدین است" صاحب سیر الاولیاء "ہم خرقہ شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ" سے ان کو روشناس کراتے ہیں، ہندستان کی اسلامی تاریخ کے ایک دلچسپ سوال کے جواب میں لوگ ان ہی حمید الدین الناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا نام پیش کرتے ہیں، یعنی دلّی کو پایۂ تخت بنا کر مسلمانوں نے ہندستان کو باضابطہ دارالاسلام بنانے کا اعلان جب کیا، تو اس نئے جدید دارالاسلام میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا مسلمان کون تھا؟

شیخ محدث دہلوی نے خود خواجہ حمید الدین سے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے

"اول مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانہ مسلمانان آمدم منم" اخبار، ص ۳۰۔

ابوالفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معزز دولتمند اسلامی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا، لکھتا ہے۔

شیخ حمید الدین سوالی ناگوری پور شیخ احمد در سر آغاز جوانی بس نکو رو خواستہ، ثروت دولت دار بود (ص ۱۷)

یعنی صرف کسی خواستہ دار گھرانے ہی سے تعلق نہ تھا بلکہ بذاتِ خود بھی امیرانہ شکل و صورت

Marfat.com

رکھتے تھے جو عموماً ناز و نعمت میں پلنے والوں کی خصوصیت ہے۔ درمیان میں کن ذہنی اور قلبی انقلابات سے گذرنا پڑا۔ بڑا طویل قصہ ہے، آخر میں اسی "نیکو رو خواستہ دار" نوجوان کو مارواڑ کے علاقہ ناگور (نواگرام) کے ایک گاؤں سُوالی میں ان کو دیکھا گیا۔ میر خورد نے لکھا ہے:۔

یک بیگہ زمین داشت نیم بیگہ ازاں بدست مبارک بکلند (کدال) راست کردے و چیزے بکاشتے تا ایں غایت کر آں رسیدے (فصل تیار ہو جاتی) نیم بیگہ دیگرے راست کردے و چیزے بکاشتے" (سیر الاولیا، ص ۳۰)

خواجہ بزرگ نے اپنے محبوب اور راستباز مرید کو سلطان التارکین کا خطاب عطا فرمایا تھا، فرماتے، پیار کے لہجہ میں فرماتے

"التارک للدنیا والنازع عن العقبیٰ سلطان التارکین حمید الدین الصوفی" (اخبار، ص ۳۰)

علوم رسمیہ میں بھی پایہ بڑا بلند تھا، عمر بھی کافی طویل ہوئی۔ بعض تحریری یادگاریں اب بھی پائی جاتی ہیں جن سے علمی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ علم کا جو بوجھ آپ پر لدا ہوا تھا جب ارادہ ہوا کہ ہم ہی اس پر لد جائیں، محمول کی جگہ علم ہی ہمارا حامل ہو جائے اسی کی عملی ترکیب سیکھنے خواجہ اجمیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خاندانی اعزہ نے بُری طرح ان کا پیچھا کیا، .... کہ آخر میں ناصحانِ مشفق کو خطاب کرکے فرمایا۔

"بیہودہ چہ بشینید منکر از دار بند خود چناں محکم بستہ ام کہ فردا شاید بجو ماں جنت ہم باز نکنم" (سیر الاولیا، ص ۱۵۶)

لہ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ بوہم چاریوں کی زندگی آپ نے اختیار فرمائی تھی، آپ بیوی بھی رکھتے تھے، بال بچے بھی ہوئے، بس آپ کی مدتوں باقی رہی کیا تعجب ہو کہ اب بھی ہو، آپ کی بیوی صاحبہ کا ایک عجیب لطیفہ تاریخوں میں نقل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ناگور کے مقطع (صوبہ دار) نے شیخ سے چاہا کہ کچھ اس کی امداد قبول کریں، لیکن یہ پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے بادشاہ، خاقان نصیر الدین محمود یا التمش کو ان کے حالات لکھ بھیجے۔ دلی سے پانصد تنکۂ نقرہ و فرمان یک دیہ صوبہ دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو۔ صوبہ دار لے کر حاضر ہوا، آپ دیوانخانہ میں بیٹھے ہوئے تھے صوبہ دار نے حال سُنایا، کچھ نہ بولے۔ اندر زنانہ میں تشریف لے گئے بیوی سے جا کر قصہ ذکر کیا۔ اس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی میں بھی پیوند تھے، شیخ کی لنگی میں بھی پیوند تھے۔ (باقی بر صفحہ ۱۱۵)

Marfat.com

آپ کے خطوط کا ایک بڑا مجموعہ حضرت زکریا بہاء الدین ملتانی کے نام ہی بن کا نظر اس راہ میں ابوذری نہیں، سلیمانی و عثمانی تھا، اس لیے دونوں میں سوال جواب کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ان کے مکاتیب کی قیمت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ

"کلمات اور ا از تصنیفات او انتخاب نمودہ[ل] (ص ۳۰)

سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری ہندی خواجگانِ چشت میں جس مقام رفیع کے مالک ہیں اس کے لیے مذکورۂ بالا اجمالی تعارف غالباً کافی ہے۔ اب سُنیے حضرت شیخ محدث دہلوی شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سُنیے کہ ان کا طریقہ خاص جو صدیوں ان کے سلسلہ میں معمول بہ رہا وہ کیا تھا؟

واقعہ یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ دلّی کی مرکزی حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر چند حصوں میں جب تقسیم ہو گئی تو ان میں ایک مستحکم علم دوست دین پژوہ حکومت شادی آباد مانڈو کی بھی تھی، شادی آباد مانڈو کے بادشاہوں میں ایک مشہور بادشاہ محمود خلجی ہیں جنھوں نے مالوہ کے سوا "تمام ولایت بوندی و مارواڑ بزور شمشیر برگرفت (سیر المتاخرین ص ۱۴۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) مگر سُنتے ہو اس حال میں بھی اسلام کی خاتون کا حال سُنتے ہو، شیخ ان سے کہتے تھے "اے خواجہ تو چہ می خواہی کہ فقر چندیں سالہ خود را باطل کنی، تو خاطر جمع دار من دو سیر ریسمان بدست خود رشتہ ام ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترا فوطہ (لنگی)، ومرا دامنے (اوڑھنی) مرتب خواہد شد" (دو سیر سوت کات لیا ہے) (تکمیر ص ۱۵) ظاہر ہے کہ جس کی بیوی کا یہ حال ہو اس کا شوہر سلطان التارکین اگر ہو جائے تو کیا تعجب ہے ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ل میر خورد نے انتخاب کے طریقہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مطالعہ کی کتابوں میں نشان لگانے کا اس زمانہ میں کیا طریقہ تھا، اس کا پتہ چلتا ہے۔ سلطان المشائخ بقلم مبارک خود علامت "ح" در حاشیہ اختیار کردے" ح سے شاید ترجیح مراد ہو یا تحبت کا مخفف ہو، واللہ اعلم۔ ایک اور دلچسپ بات میر خورد نے یہ لکھی ہے کہ شیخ حمید الدین اور شیخ زکریا بہاء الدین میں خط و کتابت جو ہوتی تھی اس میں ذریعہ یہ تھا کہ سوداگرے بود در ناگور کہ کنجد و تل از ناگور در ملتان بردے و از ملتان پنبہ (روئی) در ناگور آوردے" یہی سوداگر دونوں کے درمیان ڈاکیہ کا کام انجام دیتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مارواڑ ناگور وغیرہ میں روغنی اجناس اور ملتان میں کپاس کی کاشت اس زمانہ میں ہوتی

Marfat.com

اسی وجہ سے اجمیر، ناگور وغیرہ کے علاقے بھی اسی کی دائرہ حکومت میں شریک ہو چکے تھے محمود خلجی کی عظمت و شوکت کا چرچا ہندستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں تک پہنچا ہوا تھا، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے۔

"خواجہ جمال الدین استرآبادی از جانب سلطان ابوسعید مرزا باگزیں ارمغاں (قیمتی تحفوں) پیش آورید"

یعنی تیمور کے پوتے نے دربار مانڈو میں اپنی سفارت بھیجی تھی ہندستان کی اس نئی طاقتور حکومت کا شہرہ سُن کر حسب دستور مختلف بلاد و امصار سے لوگ شادی آباد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، شاید پہلے بھی کہیں ذکر آیا ہے کہ علماء اور صلحا، کو اپنے شہر میں لا کر بسانے اور اپنے ملک میں آباد کرنے کا محمود کو خاص شوق بھی تھا، مآثر رحیمی میں محمود خلجی (سلطان مالوہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"چون سلطنت باوقار گرفت در تربیت علماء و فضلاء کوشید و مدارس ساختہ"

اس نے صرف یہی نہیں کیا تھا بلکہ

"زر با طراف و اکناف عالم فرستادہ مستعدان را طلب داشت"

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے اس عجیب و غریب ذوق و شغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مالوہ کے جنگلوں کے بیچ کا یہ شہر[1] "در زمان ادیونانِ ثانی گشت" ص۲۵۱

---

[1] ابوالفضل نے مانڈو کی آبادی کی توجیہ اور جنگل میں اس شہر کو بسا کر جس راجہ نے منگل بنایا تھا، یہ خرافی قصہ نقل کیا ہے کہ کسی کسان کی درانتی سنگ پارس جو اس علاقہ میں کوا کسان، ہندی نژاد کے خیال کے مطابق پایا جاتا ہے۔ اس سے چھوگئی، بجائے سیاہی کے رنگ اس کا پیلا پڑ گیا، کسان غریب بیچارہ پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت آئی۔ مقامی لوہار کے پاس اصلاح کے لیے گیا، لوہار نے پہچان لیا کہ یہ تو سونا ہو گئی ہے، واقعہ پوچھا کسان نے اس پتھر کا پتہ دیا جس کا یہ کرشمہ تھا، لوہار نے اس پتھر کو اٹھا لیا، کچھ دن خود نفع اٹھاتا اور آخر میں اس عہد کے راجہ کرنا جیت سنگھ دیو کی خدمت میں اس پتھر کو اس نے نذر گذران دیا اور صرف یہ خواہش کی کہ میرے نام سے کچھ قلعہ بنا دیا جائے۔ لوہار کا نام مانڈن تھا، اسی کے نام پر راجہ نے بارہ سال کے دور میں قلعہ بنوایا، پتھر جو قلعہ میں لگا ہے یہ جیں لوہار کی مناسبت سے سنداں (دھنائی) کی شکل کے ہیں، جب مالوہ کی (بقیہ بر صفحہ ۱۱۰)

Marfat.com

بہرحال اطراف واکناف عالم میں رو پڑ بھیج بھیج کر جن اہل علم وکمال والوں کو محمود خلجی نے مالوہ بلایا تھا اُن میں حضرت امام محمدؒ بن حسن الشیبانی صاحب ابی حنیفۃؒ الامام کے خاندان کے ایک بزرگ بھی تھے جنہیں بادشاہ نے تاج الافاضل کا خطاب دیا تھا، اجمیر شریف کی قضاءت ان کے سپرد ہوئی تھی۔ قیام گاہ راجپوتانہ کے مشہور شہر نارنول میں تھا جو کسی زمانہ میں شرفاء اسلام کا ایک بڑا مرکز تھا۔ تاج الافاضل کے صاحبزادے علامہ مجد الدین الشیبانی تھے جو قاضی مجد کے نام سے مشہور تھے، قاضی مجد کے سات صاحبزادے تھے شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ

"قاضی مجد الدین راہفت پسر بود، ہمہ دانشمند (عالم)، متقی و متدین"

لیکن ان ساتوں بھائیوں میں شیخ احمد مجد شیبانی نے اپنے وقت میں بڑی عظمت و شہرت حاصل کی، یہ نارنول سے اٹھارہ سال کی عمر میں اجمیر شریف چلے آئے تھے۔ اجمیر شریف میں اس وقت سلطان التارکین خواجہ حمید الدین ناگوری جن کا تعارف کرا چکا ہوں انہی کے خاندان کے ایک بزرگ خواجہ حسین ناگوری کی معرفت وہدایت کا چراغ روشن تھا۔ شیخ احمد مجد خواجہ حسین ناگوری ہی کے "شاگرد و مرید" (اخبار) ہیں۔ میں نے شیخ احمد مجد کے متعلق ذکر کیا تھا کہ عربی زبان پر ان کو اتنی دسترس حاصل تھی کہ "در عربی و فارسی تقریر کردے" (اخبار)

تقریباً چورانوے سال کی عمر ہوئی عمر کا زیادہ حصہ اجمیر میں گذرا لیکن وفات ناگور میں ہوئی شیخ محدث نے انہی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے معمولات میں ایک اہم ضروری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) مستقل حکومت کا مانڈو دارالسلطنت قرار پایا تو اس کا نام شادی آباد رکھ دیا گیا، لیکن چلا نہیں سلمانوں نے اپنے عہد میں اس قلعہ کی عمارتوں میں بہت کچھ رد وبدل کیا، بلکہ گویا نیا قلعہ تعمیر کیا، ایک ہشت منظری مینار درمیان قلعہ میں تھا جس سے دور دور کے مقامات نظر آتے تھے شاہ ہوشنگ کی قبر پر جو گنبد ہے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ گرمیوں میں اس سے پانی چھنتا رہتا ہے، لوگ اس کو ہوشنگ کی کرامت خیال کرتے ہیں "ژرف نگاہ داند کہ حال چیست" واللہ اعلم ژرف نگاہ نے کیا تحقیق کی ہے، تقریباً ایک سو ستر سال تک مالوہ میں سلمانوں کی مستقل حکومت قائم رہی اکبر کے زمانہ میں دلی سے الحاق ہو گیا ۱۲۔

Marfat.com

معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے" یہ بھی لکھا ہے کہ "ہفتاد سال در اجمیر بر ہمیں منوال گذاردند"

مدارک پڑھاتے وقت ان پر جو حال طاری رہتا تھا شیخ محدث نے اُس کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

"در بیان وعدہ وعید چنداں گریہ وحالت کرشے کہ صوفیاں در حالت سماع کنند وچشمان او را از غایت بکاء بیداری سرخ ومرمد (آشوب (دہ) بودے"

لیکن اس شیبانی بزرگ نے اس طریقہ کو کیا ہندوستان سے باہر کسی دوسرے اسلامی ملک سے یہاں داخل کیا تھا! مجھے اسی کے متعلق عرض کرنا ہے، شیخ محدث کی شہادت ہے

"وایں وظیفہ تفسیر مدارک طریقہ سلوک مشائخ ایشان ست"

"مشائخ ایشان" کون لوگ ہیں، ایشاں کی شرح میں محدث ہی فرماتے ہیں۔

"کہ خواجہ حسین ناگوری وشیخ حمید الدین صوفی نیز ہمچنیں می کردند" (اخبار الاخیار ص۱۹۲)

مطلب اس کا اور کیا ہوا کہ خواجہ حمید الدین صوفی جن کے متعلق آپ سن چکے کہ یکے از اعاظم خلفاء خواجہ بزرگ وہمخرقہ قطب الدین بختیار اوشی ہیں، یہ ان ہی کے عرفانی سلوک کا طریقہ تھا۔

اب خود ہی غور کرنا چاہیے، کہ خواجہ بزرگ اجمیری کے دو ہی خلفاء نے ہندوستان میں خواجہ کی نیابت کا فرض انجام دیا، دونوں میں سے ایک کے متعلق سلطان المشائخ کی کی گواہی گذر چکی کہ کامل قرآن "چوں محفوظ شد آنگاہ نقل فرمود"

اور دوسرے صاحب کے متعلق محدث دہلوی کی شہادت ہے کہ "تفسیر مدارک" کو سلوک کا طریقہ بنا کر اپنے سلسلہ میں اس کو رائج کیا، کہ اسی وظیفہ سے ان پر وہ حال طاری ہوتا تھا

"کہ صوفیاں در حالت سماع کنند"

کیا اسلام کا جو ایمانی وعرفانی شجرہ طیبہ سب سے پہلی دفعہ کفرستان ہند میں نصب ہوا، اس کے

دونوں پھلوں، خواجہ بختیار و خواجہ حمید رحمۃ اللہ علیہما کے اس رنگ و مزہ کو دیکھ کر ہم اس "شجرہ طیبہ" کے طریقہ سلوک کے متعلق فیصلہ کرنے میں اب بھی شک کر سکتے ہیں؟

خواجہ بزرگ کو روپوش ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے حضرت قطب صاحب زندہ ہیں اجمیر شریف کی جامع مسجد کے امام ایک بزرگ مادھو نامی ہیں، معلوم نہیں اصلی نام کیا تھا، سلطان المشائخ نے اسی نام سے ان کا تذکرہ کیا ہے، اجمیر کی جامع مسجد کے انہی امام صاحب کے سامنے سے ایک نوجوان لڑکا گذرتا ہے، احمد نام ہے، شیخ محدث نے لکھا ہے۔ "باقندہ بود" (ص ۴۴) آواز میں درد ہے، ہندی زبان کے گیت لوگوں کو سنا رہا ہے۔ امام جامع اجمیر ان کو پاس بلاتے ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ اسی گانے والے نوجوان کو خطاب کر کے امام نے کہنا شروع کیا۔

"چنیں آوازے تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندوی خرچ کنی"

یعنی جس قسم کی آواز تم رکھتے ہو افسوس کی بات ہے کہ ہندی گانوں میں اسے خرچ کرو" نوجوان پوچھتا ہے کہ پھر کیا کروں؟ اجمیر کو اجمیر والے نے جس فضا سے معمور فرمایا تھا کیا امام جامع کا یہ جواب فضا، کی اس تاثیر کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا سلطان المشائخ کے حوالہ سے فوائد الفواد میں مشورہ کا یہ فقرہ منقول ہے "ز ہود کہ قرآن یاد گیر" مشورہ قبول کیا جاتا ہے اور چند ہی دنوں میں ہندوی گیت والے باقندہ کے متعلق خبر ملتی ہے کہ "قرآن یاد گرفت" (فوائد الفواد ص ۱۷۴) کیا صرف "یاد گرفت" کا تعلق محض الفاظ سے تھا، شیخ محدث نے لکھا ہے، خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سامنے جب یہی احمد جواب "خواجہ احمد نہروانی" کے نام سے مشہور رہتے پیش ہوئے تو فرمایا

لہ اجمیر شریف میں اب بھی عہد خواجہ کا جو تبرک رکھا یا جاتا ہے واللہ اعلم تاریخی سند اس کی کیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے جو خواجہ بزرگ کی تلاوت میں رہتا تھا، اگر صحیح ہے تو پیر و مرید دونوں کے ذوق کا ثبوت ملتا ہے کہ ۔

بعد مرنے کے مرے گھر سے تو قرآں نکلا

Marfat.com

"اگر مشغولی احمد سنجند مایۂ دہ صوفی باشد" (اخبار ص ۴۰) "یعنی دس صوفیوں کا سرمایہ ایک شیخ احمد کی مشغولی کے مساوی ہے"

شیخ محدث نے زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کی یہ رائے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ "شیخ الاسلام زکریا ملتانی قدس سرہ کم کسے را پسندیدے" لیکن جس نے قرآن پایا تھا، بھلا اس کی پسندیدگی میں بھی کسی کو شک ہو سکتا تھا، قول ثقیل سے جو وزن پیدا ہو سکتا ہے، یقین کیجیے کہ اس وزن کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، پہاڑ جس سے پھٹتے ہوں، خود سوچنا چاہیے کہ اس کو کون پھاڑ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ بزرگ کے دونوں خلفاء میں سے حضرت قطب صاحب کو تو بجائے اجمیر کے دلی رہنا پڑا، شمس الدین التمش نے بڑی بڑی خوشامدوں سے ان کو خواجہ بزرگ سے مانگ لیا تھا، میر خورد کی روایت ہے کہ جب دلی میں رہنے کی اجازت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو عطا فرمائی تو

سلطان شمس الدین سعادت قدم بوس شیخ را دریافتہ ہمراہ شیخ قطب الدین شادی تمام متوجہ شہر گردید (سیر الاولیاء، ص ۵۵)

لیکن مارواڑ اور راجپوتانہ میں خواجہ اجمیری کی روشنی کو پھیلانے کے لیے، وہی ایک بیگہ زمین کے کاشتکار سلطان التارکین شیخ حمید ناگوری ہی رہ گئے تھے، انہوں نے طریقۂ چشتیہ کے حقیقی رنگ کو پیش کیا، آہ! کہ جو رنگ آج نگاہوں سے اتنا پوشیدہ ہو رہا ہے کہ میں دعویٰ کرتا جا رہا ہوں اور خود سمجھ رہا ہوں کہ لوگ اسے میری زبردستی قرار دینے پر تُلے ہوئے ہوں گے، مگر اب تک جو واقعات آپ کے سامنے پیش ہو چکے ہیں، کیا ان میں میرے دعوے

ے اشارہ قرآن کے ان چند امتیازی صفات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن ہی میں کیا گیا ہے، سورۂ مزمل میں اسی کو قول ثقیل (وزنی بات) سورۂ حشر کی مشہور قراۃ والی آیتوں میں ہے کہ اگر اس قرآن کو پہاڑ پر ہم اتارتے تو تم دیکھتے کہ اللہ کے ڈر سے پہاڑ جھک گئے، اور پاش پاش ہو گئے ۱۲۔

Marfat.com

کے ثبوت کی جھلک بھی آپ کو محسوس نہیں ہو رہی ہو، مگر نہیں مجھے ابھی تو بہت کچھ کہنا ہے۔
ہم نے شیخ احمد مجد شیبانی کے پیر خواجہ حسین ناگوری کا ذکر کیا تھا۔ بتایا تھا کہ یہ خواجہ حمید الدین ناگوری کی اولاد میں ہیں، مدارک کے وظیفہ کے سوا "ابًا عن جدٍ طریقۂ سلوک" کے طور پر ان کے خاندان میں منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا تھا، انہی کا وہ قرآنی ذوق تھا جس کا تذکرہ ہم نے کسی اور جگہ بھی کیا ہے، یعنی تیس جلدوں میں "نور النبی" نامی تفسیر انہی خواجہ حسین ناگوری کی لکھی ہوئی ہے۔ ہر پارہ کی تفسیر کے لیے الگ جلد ارقام فرمائی گئی تھی۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجمیر اور مارواڑ کا علاقہ محمود خلجی کے عہد میں حکومت مالوہ سے ملحق ہو چکا تھا، محمود خلجی کے بعد مانڈو کے تخت پر غیاث الدین خلجی بیٹھا۔ اسی کے عہدِ حکومت میں خواجہ حسین ناگواری اجمیر میں افادہ و استفادہ کی مسند بچھائے ہوئے تھے، غیاث الدین ان کا بیحد معتقد تھا، لیکن ساری عمر اسی آرزو میں اس کی گذری کہ کسی دن مانڈو بھی آپ کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہو، شیخ کی طرف سے باوجود رعیت ہونے کے نفی میں جواب ملتا رہا، محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ غیاث الدین کو کسی نے ترکیب سجھائی، بادشاہ کے پاس کسی نے موئے مبارک نذر میں پیش کیا تھا، ترکیب بتانے والے نے مشورہ دیا کہ موئے مبارک کی زیارت عام کا اعلان کیجیے، شیخ کھنچے کھنچے خود ہی چلے آئیں گے، یہی ترکیب کی گئی، اور چل گئی، محدث دہلوی کا بیان ہے کہ خبر پاتے ہی خواجہ حسین

"ہماں ساعت بے توقف سماع کناں و درود گویاں، احرام دیار مندو بست"

بادشاہ کو اپنے نسخہ کے کارگر ہونے کا جب علم ہوا شیخ کے استقبال کو شہر سے باہر نکلا، بیسیوں بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں، ان ہی میں ایک خستہ حال گاڑی شیخ کی بھی تھی، اسے خیال بھی نہ گذرا بعد کو پتہ چلا، بڑی معذرت سے پیش آیا، بعض کرامات کا بھی تجربہ ہوا، محمود خلجی کی قبر پر لے جا کر مغفرت کی دعا کرائی، شیخ نے منظور فرمایا۔ یوں غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری میں تعلقات پیدا ہوئے، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ "سلطان تحفہائے عالی پیش آورد او قبول نہ کرد"

Marfat.com

شیخ نے تو خیر سلطان کے تحفے قبول کیے یا نہ کیے لیکن ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں، اسی غیاث الدین خلجی سلطان مانڈو کے ذکر میں پڑھتے ہیں، فرشتہ راوی ہے۔ "ہزار کنیزک حافظ قرآن در حرم داشت" یعنی صرف شاہی محل سرا میں قرآن کا ذوق اتنا پیدا ہوگیا تھا کہ بادشاہ کی لونڈیوں میں ایک ہزار ہتیں قرآن کی حافظ تھیں، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پھر مردوں کا کیا حال ہوگا۔ ظاہری حکومت مانڈو کی اجمیر پر قائم تھی لیکن بباطن خدا نے یوں مانڈو کو اجمیر کے قرآنی مذاق کا تحت بنا دیا تھا۔ غیاث الدین کا یہ حال تھا کہ اس نے محل کی عورتوں کو حکم دے رکھا تھا۔

کہ جہت نماز تہجد او را بیدار کردہ می باشند و عند الاحتیاج آب بر روئے او می پاشید باشند اگر در خواب گراں باشد بزور بجنبانند، و اگر آنہم بیدار نشود دستش گرفتہ برخیزانند

یہ بھی فرشتہ ہی کا بیان ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس نے بادشاہ کی دنیا رد کی تھی بادشاہ پر اس کے دین کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا اور یہ ترکیب تو بادشاہ نے مادی نیند سے بیدار کرنے کی اختیار کی تھی غفلت کی خواب سے چونکنے کے لیے اس نے اپنے درباریوں کو یہ عجیب حکم دے رکھا تھا، کہ جب

در وقت عشرت و مشغولی بسخنان دنیا ہر چہ کہ اہم گفن بر و نہادہ بودند نظرش بآں ورز تا متنبہ شدہ عبرت گرفتہ از مجلس می برخواست و تجدید وضو کردہ، باستغفار و توبہ انابت می پرداخت"

اور یہی بات مجھے پیش کرنی تھی کہ خواجگانِ چشت کا تعلق قرآن سے کیا تھا، خواجہ حسین ناگوری کا چونکہ ذکر آگیا ہے، اس لیے ایک اہم تاریخی بات جس کا ان کی ذات سے تعلق ہے جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر بھی کردوں، شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خواجہ بزرگ اجمیری کی قبر شریف کے متعلق یہ واقعہ درج کیا ہے

"در اجمیر کہ موضع اقامت او بود مدفون گشت اول قبر خواجہ از خشت بود"

غالباً "خشت" سے کچی اینٹیں ہی مراد ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ کبیر شکر گنج

Marfat.com

کے روضہ طیبہ کے متعلق یہ مروی ہی کہ

بھمت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام حاجت شد چوں موجود نمی شد در خانہ شیخ

شیوخ العالم کہ خشت خام برآوردہ بودند ازاں خشت فرود آوردند تا در لحد خرج شد

طیب اللہ ثراہ" (سیر الاولیا ، ص ۹۱)

جس سے معلوم ہوتا ہی کہ طریقہ چشتیہ کے معماران اولین کی قبروں میں کچی اینٹوں ہی کے لگانے کا رواج تھا، محدث دہلوی نے خواجہ بزرگ کے مزار مبارک کے متعلق یہ تاریخی بیان بھی دیا ہی کہ جس زمانہ میں خواجہ حسین ناگوری نے جوار خواجہ میں قیام فرمایا، اس وقت

"حوالی او بیشہ شیراں گشتہ و دراں زماں بالائے قبر شریف عمارت نہ بود"

یہ بھی لکھا ہی کہ اطراف میں کوئی خانقاہ وغیرہ بھی نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس کے بعد جو محدث دہلوی نے یہ لکھا ہی کہ

دروازہ و خانقاہ بعضے از ملوک مندو ساختند" ص ۲۳

بعضے ملوک مندو سے یہی غیاث الدین خلجی ہی مراد ہی، کیونکہ غیاث الدین ہی کے عہد میں غالباً اپنے قیام اور واردین صادرین کے قیام کے لیے، جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہی

"اول کسے کہ در مقبرہ خواجہ عمارت کرد خواجہ حسین ناگوری بود" ص ۲۳

اور انہی کے زیر اثر اس عجیب و غریب بادشاہ نے اس مقام میں جو "بیشہ شیراں" بن گیا تھا، خانقاہ اور خانقاہ کا دروازہ بنوایا، واللہ اعلم بالصواب

میری غرض تو اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہی کہ خواجہ حسین ناگوری اور غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ کے تعلقات کو دکھاؤں، انہی تعلقات کی بنیاد پر میرا خیال ہی کہ شادی آباد مانڈو کے صرف شاہی محل سرا کی لونڈیوں میں ہزار ہزار عورتیں پورے قرآن کی حافظ تھیں اب دنیا خواہ کچھ ہی خیال کرے لیکن غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری کے جن تعلقات کا میں نے ذکر کیا ہی، انہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر غیاث الدین کے اس

Marfat.com

قرآنی ذوق کو خواجگانِ چشت کے قرآنی شغف کا نتیجہ قرار دیا جائے تو اس کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے طریقۂ چشتیہ کی حمیدیہ ناگوریہ کی شاخ میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد سے کم از کم بابر کی آمد کے زمانہ تک مدارک کے درس کو طریقۂ سلوک کی حیثیت مسلسل بغیر کسی انقطاع کے حاصل رہی، وجہ اس کی یہ ہے کہ خواجہ احمد مجد جن کے تذکرہ میں شیخ محدث نے اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے، اجمیر شریف سے ہجرت کر کے ناگور آخر عمر میں چلے گئے تھے اور وہیں وفات ہوئی، شیخ محدث نے ان کی اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے کہ۔

"چوں در اجمیر خلل شدہ و قلعہ را رانا سانگا کہ گبرے عظیم بود از دست مسلماناں بگرفت و اکثر مسلمانان را شہید ساخت احمد مجد پیش ازیں حادثہ بہ ہفت روز بحکم اشارت خواجہ بزرگ خواجہ معین الحق والدین از شہر برآمد و بہ مسلمانان خبر کرد کہ یک چندے برایں شہر نظر جلال ست فرمان بندگی خواجہ بریں ست کہ مسلمانان از شہر برآیند در روز دوشنبہ ۹۲۳ھ باجماعہ از مسلمانان از اجمیر برآمدہ و دو شنبہ دیگر کافراں بر سر اجمیر آمدند و آں دیار را زیر و زبر ساختند۔" ص۱۰۵[1]

واللہ اعلم شیخ احمد مجد کو یہ اشارہ خواب میں ہوا، یا کوئی کشفی واقعہ تھا، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ گبر عظیم رانا سانگا جس کا شیخ محدث نے ذکر فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ یہ وہی رانا سانگا ہے جو بیانہ کے میدان میں حضرت بابر بادشاہ سے نبرد آزما ہوا اور خاص غیبی تائید نے فیصلہ کیا کہ ہندستان میں تیموری خاندان کا تخت بچھیگا، بدترین شکست کے ساتھ رانا سانگا نے راہ گریز اختیار کی۔ شیخ احمد مجد کا انتقال ۹۳۰ھ میں ہوا ہے اور بابر نے ۹۳۲ھ میں پانی پت کا میدان ابراہیم لودی کے مقابلہ میں جیت کر کچھ ہی دن بعد رانا سانگا سے وہ مقابلہ کیا جس کی نظیریں دنیا کی تاریخوں میں کم مل سکتی ہیں اور یہی میری غرض تھی کہ بابر کے عہد تک طریقۂ

[1] (بر صفحہ ۱۲۴)

چشتیہ کی ناگوری حمیدی شاخ میں مسلسل تفسیر مدارک کے سلوک کا طریقہ جاری رہا۔ اسی شاخ کے ایک بزرگ نے قرآن کی وہ ضخیم تفسیر لکھی اور اسی بزرگ کے معتقد غیاث الدین خلجی کو ہم اس حال میں پاتے ہیں جس کا تذکرہ فرشتہ سے میں نے نقل کیا ہے جس کے قرآنی شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ صرف شاہی محل میں ہزار ہزار عورتیں قرآن کی حافظات پائی جاتی تھیں۔ کیا ان واقعات کو پیشِ نظر رکھنے والوں کے لیے اب بھی میرے دعوے کی تصدیق میں شک کی گنجائش ہے۔

اور یہ تو صرف چشتی شجرۂ طیبہ کے ایک پھل کا حال ہے۔ دوسرے دہلوی خلیفہ حضرت

ؔ کہتے ہیں کہ پتھورا اجمیر کے راجہ نے "مسلمانے از پیوستگان خواجہ قدس سرہٗ را بہ سببے از اسباب رنجانید" (اخبار) اسی ایک مسلمان کے ستانے کی علت میں راجہ پتھورا کو یہ سزا ملی کہ خواجہ بزرگ کی زبان مبارک سے مشہور فقرہ نکل گیا "پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم"

شیخ محدث نے لکھا ہے اسی زمانہ میں شہاب الدین غوری کے مقابلہ میں پتھورا کو شکست ہوئی "بدست معزالدین سام اسیر گشت" غور کرنے کی بات ہے کہ اس گبر عظیم رانا سانگا نے اجمیر کو لوٹا اور وہاں کے مسلمانوں کو شہید کیا، اگر اسی کی سزا میں بجائے شہاب الدین کے اندجان دپایہ تخت بابر در مراغہ) سے بابر ہندوستان آیا اور ابراہیم لودی جو لاکھوں لاکھ فوج کے باوجود مسلمانانِ اجمیر کی شہادت کا تماشا چپ چاپ دیکھتا رہا، اس کو بھی اور خود رانا سانگا کو بھی اپنے کیے کی سزا ملی، تو عقلاً کیا یہ مستبعد ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ ظہیر الدین بابر جس شان کے ساتھ رانا سانگا سے لڑا ہے وہ خود تاریخ کا ایک اعجوبہ طراز واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ بابر کے پاس یونہی کل دس بارہ ہزار فوج تھی، ہندوستان کی گرمی اس فوج کے لیے ناقابلِ برداشت بنی ہوئی تھی۔ رانا سانگا کی ٹڈی دل فوج جو ایک لاکھ سے متجاوز تھی، اس کو دیکھ کر افواج بابری کی ہمت چھوٹ گئی اور مقابلہ سے ہچکچانے لگی، بابر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ شاہی خیمہ جس میں پینے پلانے کا سامان رکھا ہوا تھا پہلے تو اس نے ایک ایک گلاس اور قرابۂ شراب کو توڑ پھوڑ کر برابر کیا، غسل کیا، نماز پڑھی، سجدہ میں گر گیا گڑگڑانے لگا، "حکومت کے خیال کو سر سے نکالتا ہوں، خالص جہاد کی نیت کرتا ہوں"۔ دل کو قرار آیا، باہر نکل کر اس نے اعلان عام کر دیا، اب جنگ نہیں جہاد ہوگا۔ جو رہنا چاہے رہے، جسے جانا ہو چلا جائے، بہت سے فوجی جو کرایہ پر آئے تھے چلے گئے بمشکل پانچ چھ ہزار فوج رہ گئی۔ انہی کے ساتھ تکبیر کے نعروں میں رانا سانگا کی فوج پر حملہ ہوا، کچھ ایسی صورت پیش آئی کہ رانا کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رانا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، اور تقدیر نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت صدیوں کے لیے بابر کی اولاد میں رہے گی۔ نواب عماد

قطب صاحب کا قرآن سے جو ذاتی تعلق تھا، اس کا ذکر تو گذر ہی چکا لیکن اس شاخ میں بھی بات انہی تک ختم نہیں ہوگئی ہے۔ یاد ہوگا کہ قطب صاحب کے خلیفۂ برحق شیخ کبیر شکر گنج خود قرآن کا درس دیتے تھے سلطان المشائخ نے چھ پارے تجوید کے ساتھ انہی سے پڑھے تھے لیکن یہ پڑھنا اور پڑھانا تو دیکھ کر تھا، میر خورد نے سیر الاولیا میں نقل کیا ہے کہ

"سلطان المشائخ بقلم مبارک خود نبشتہ است"

یہ چیز کیا تھی جسے سلطان المشائخ نے اپنے قلم مبارک سے ثبت فرمایا تھا، میر خورد نے وہ عبارت بجنسہٖ نقل کی ہے۔ میں بھی وہیں سے نقل کرتا ہوں لکھتے ہیں۔

"شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کاتب حروف را بخواند"

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"روز آدینہ (جمعہ) بعد از فراغ نماز بست و پنجم ماہ جمادی الاولیٰ ۶۶۹ھ سنہ تسع و ستین و ستمائۃ لعاب از دہن مبارک در دہن کاتب (سلطان المشائخ) کرد"

شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان جی کے منہ میں دہن مبارک کا لعاب کس لیے ڈالا تھا، اسی کا ذکر مقصود ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں

"وصیت فرمود بحفظ کلام مجید رزقہ اللہ تعالیٰ" (کتاب مذکور ص ۱۲۳)

گو مجھے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے کہ خود شیخ کبیر شکر گنج کو زبانی قرآن یاد تھا یا نہیں لیکن قرآن کے ساتھ ان کا شغف اسی سے ظاہر ہے کہ پچانوے سال کی عمر تک تراویح کی نماز جو ظاہر ہے فرض نہیں ہے پڑھتے رہے آخر عمر میں بیٹھ کر پڑھتے تھے، قرأت و تجوید کے ساتھ قرآن پڑھانے کا حال بھی سن چکے ہیں سلطان المشائخ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خانقاہ حافظوں سے بھری رہتی تھی میر خورد نے حضرت ہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ جب پہلی دفعہ اجودھن میں میری حاضری ہوئی اور شرف بیعت سے سرفراز ہوئے اس کے بعد شیخ کبیر نے خدام خانقاہ کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

Marfat.com

"بجت ایں متعلم (طالب العلم) غریب در جماعت خانہ کھٹ راست کنید"

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں جب جماعت خانہ میں واپس آیا تو دیکھا کہ میرے لیے پلنگ (کھٹ) بچھایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل میں خیال کیا بلکہ ارادہ ہوا۔

"من بارے ہرگز بر کھٹ نخواہم خفت"

اسی موقع پر "نخواہم خفت" کے خیال کی جو وجہ سلطان المشائخ نے بیان فرمائی تھی وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

زیرا چہ چندیں مسافراں عزیزاں و حافظان کلام ربانی و عاشقانِ درگاہ رحمانی می بینم

کہ بر خاک می غلطند من چگونہ بر کھٹ بغلطم"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان عز و جاہ (عزیزاں) و عاشقانِ درگاہ رحمانی کے ساتھ خانقاہ فریدیہ کا ایک حصہ خاص حافظانِ کلام ربانی کا بھی تھا۔

سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ شیخ کبیر عموماً لوگوں کو حفظ قرآن کی ایک وردی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے یعنی فرماتے تھے، غالباً حضرت والا کا خود تجربہ تھا۔

بجت یاد گرفتن قرآن اول سورہ یوسف فرموے کہ یاد باید کرد تا بہ برکت آں

حق تعالیٰ حفظ تمام قرآن روزی کند" (سیر الاولیا ص ۴۳۹)

سنداً اس حدیث میں ممکن ہے بعضوں کو کلام ہو جس پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں ہے لیکن شیخ کبیر عموماً اپنے لوگوں کو یہ حدیث بھی سنایا کرتے تھے

ہر کرا نیت یاد گرفتن قرآن باشد و بداں نرسد وہم دراں نیت از جہاں سفر کند چوں

او را بگور نہند فرشتہ بیاید و ترنجے از بہشت آوردہ بدست او دہد آں کس آں ترنج

ابتلاع (نگل جانا) کند تمام قرآن او را محفوظ گردد فردا چوں حشر شود، او حافظ مبعوث

گردد" (سیر الاولیا ص ۴۳۹)

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وابستوں میں وہ قرآن سے کس قسم کا تعلق پیدا کرنا چاہتے

(۱) ... حدیث فان ... لتلک ... اخوا ... آدمی قرآن کی جس آیت کو پڑھتے ہوئے مرتا ہے ... (بقیہ صفحہ ۱۲۷)

تھے، جس کا حاصل یہی ہوا کہ جس سے جتنا بھی ممکن ہو زندگی کا ایک حصہ اس کام میں وقف کرے، کامل قرآن محفوظ نہ ہو سکے تو جتنا بھی اپنے اندر قرآن کو اتارنے والا اُتار لیگا، یہی چیز دوسری زندگی میں اس کی تکمیل کی ضمانت بن جائیگی۔ گو پائے دو پارے سے بھی کم ہی محفوظ کرکے مرا ہو لیکن اٹھے گا پورے قرآن کا حافظ بن کر، ظاہر ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی زبانِ مبارک سے اس مفت کی دولت کا حال سُن کر حضرت والا کے دست گرفتوں میں کون ہوگا جس کے دل میں کم ازکم اس نیت کی گدگدی نہ پیدا ہوتی ہوگی۔

سب کچھ پڑھنے پڑھانے دینے دلانے کے بعد آخری وصیت بابا صاحب کی اپنے خلیفہ اکبر و محبوب سلطان المشائخ کو "قرآن جا کر یاد کرو" کی ہو، اور اس اہتمام کے ساتھ وصیت ہو، کہ لعاب مبارک سلطان المشائخ کے دہن پاک میں ڈالا جاتا ہے اور جیسا کہ میر خورد نے سلطان جی کی اسی یادداشت سے جو ان کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی تھی اسی کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ کلام اللہ کے حفظ کی وصیت کے بعد شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا "نظام! میں نے "لبیک" کے ساتھ جواب عرض کیا، اس کے بعد سلطان المشائخ ارقام فرماتے ہیں کہ "خواجہ گفت دین و دنیا ترا دادہ اند" گویا یہ اشارہ اسی قرآن کی طرف تھا، جس کے متعلق اجتماعی اور انفرادی تجربات تیرہ سو سال سے یہی ہیں، آگے ہے کہ شیخ کبیر نے فرمایا "ایں جاہ ایں ست" یہ بعینہٖ الفاظ ہیں جو میں سیر الاولیاء سے نقل کر رہا ہوں، واقعی مطلب کیا ہے، بولنے والے اور بولنے والے کا خدا ہی اسے جان سکتا ہے لیکن گفتگو جس مسئلہ میں ہو رہی ہے، اس کا تو کھلا ہوا اقتضا یہی ہے کہ "ہم ایں ست" سے وہی قرآن مراد ہے جس کے حفظ کی وصیت کے لیے خاص مجلس نماز جمعہ کے بعد آج قائم کی گئی ہے، بہرحال میرے نزدیک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) مقام ہوتا ہے جا ابو داؤد و ترمذی کی روایت ہے اور ترمذی نے "حسن صحیح" سے اس کی توثیق بھی کی ہے اگر اس حدیث کے اول و آخر کے الفاظ پر غور کیا جائے تو جو مفہوم شیخ کبیر کی بیان کردہ روایت کا ہے اس کی تائید اس سے تصدیق ہوتی ہے۔

ہمہ این ست" کے ایں کا مطلب اور مشار الیہ قرآن معلوم ہوتا ہے اور "این جا" کی "این" کا اشارہ خواجگان چشت کے اس طریقہ کی طرف ہے جو ہندوستان کے خصوصی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر اُنہوں نے اس ملک میں جاری کیا تھا، شیخ الاسلام فریدالحق والدین رحمۃ اللہ علیہ کا آخری فقرہ اس کے بعد یہ ہے:-

"برو ملکِ ہند گیر نظرة منك يكفيني"

قرآن حوالہ کیا جاتا ہے، اسی کو سب کچھ بتایا جاتا ہے، اور اسی کے بعد "ہندگیری" کی بشارت سنائی جاتی ہے، اگر اسے بشارت قرار دیا جائے، یا للکارا جاتا ہے، ایک ہتھیار دے کر جس سے ہندگیری کی مہم میں کامیابی ہو سکتی ہے، آگے عربی فقرہ

نظرة منك يكفيني تمہاری ایک نگاہ میرے لیے کافی ہے۔

واللہ اعلم مرشد نے اپنے اس مرید اور خلیفہ کو جسے قرآن دے کر "ہندگیری" کی مہم پر بھیج رہا ہے، یہ کیا کہا ہے کیا یہ مطلب ہے، ایمان و یقین کی جو روشنی قرآن سے پیدا ہوتی ہے اس کی صرف ایک نظر ان لوگوں پر قابو پانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے، جن کی پوری زندگی صرف شرک کے انگاروں پر لوٹتے کٹتی ہے یا کٹ رہی ہے، ایک دوسرے موقعہ پر سلطان المشائخ ہی کے حوالہ سے میر خوردہی نے قرآن کے متعلق ایک عجیب بات نقل کی ہے۔ سوال کرنے والے وہی مولانا فخرالدین زرادی ہیں جن کے غیر معمولی علم و فضل کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا زرادی نے عرض کیا۔

"مشغول شدن بکلام اللہ فاضل تر یا ذکر

تصوف جس کی بنیاد ہی ذکر و اذکار پر سمجھی جاتی ہے اور جہاں جہاں ضرورت تھی یقیناً وہاں کے لیے ذکر اذکار، اشغال و مراقبات کے ذرائع مفید بھی ہوئے، لیکن سوال ہندوستان میں پوچھا جا رہا تھا "ہندگیری" کی مہم اپنے پیر کی طرف سے جسے سونپی گئی تھی اس سے دریافت کیا گیا تھا جواب میں ارشاد ہوا

Marfat.com

"ذاکر را وصول زود تر بود، اما خوف زوال ہم بود، تالی را وصول دیر تر بود لیکن خوف
(تالی: قرآن پڑھنے والا۔)
زوال نہ باشد" (ص ۲۳۶)

وجہ ظاہر ہے کہ ذکر سری ہو یا جہری دونوں کی کثرت و مزاولت خصوصاً جب حضورِ قلب اور شعورِ معنی کے ساتھ ہو تو مذکور سے اشتیاق و انہماک، حب و الفت کی نسبتوں کے پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی، جن ممالک کے باشندے مسلمان ہو چکے ہیں، اجمالاً ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی مجمل کو منفصل کرنے کے لیے انہیں ذکر و فکر، مراقبہ اور مطالعہ کے مشاغل میں مشغول کیا جاتا ہے، ایمان کی حلاوت ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مذکور کی محبت کی آگ جو ایمانی فطرت میں بہرحال دبی ہوتی ہے، وہ ذکر کے ضربات سے بھڑک اٹھتی ہے اور یہی ان کا مطلوب ہوتا ہے، لیکن یہ سارے ذکری ذوق و شوق و ولولے اور شورش اسی وقت تک تو تازہ رہتے ہیں، جب تک ذاکر ذکری و فکری مشاغل کو بھی تازہ کرتا رہے۔ خدانخواستہ اگر کسی وجہ سے ان میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو جیسی اور جتنے دن کی رکاوٹ ہوگی اسی نسبت سے ذکری کیفیات کی شدت میں بھی ضعف اور ذوق و شوق کی لذت کم ہوتی جاتی ہے، اسی لیے ارشاد ہوا کہ گو ذکر سے مقصد تک رسائی تو جلد ہو جاتی ہے ایمان مجمل پر ایمان مفصل کے آثار تھوڑی محنت کے ساتھ ہی مرتب ہونے لگتے ہیں بلکہ غلبہ ذکر سے یکسوئی جو پیدا ہوتی ہے بسا اوقات اس کی وجہ سے کشف و کرامات جیسی چیزوں کا صدور بھی ہونے لگتا ہے، لیکن نتائج کا تعلق چونکہ تجدید ذکر کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اس لیے مرض و حرج یا دوسرے اسباب کے تحت یہ بالکل ممکن ہے کہ اس راہ پر چلنے والے اپنے آپ کو ان تمام حالات سے خالی پائیں جنہیں اتنی محنت و مشقت سے انہوں نے حاصل کیا تھا، اور یہی مطلب ہے "خوفِ زوال" سے۔

لیکن قرآن کا حال بالکل مختلف ہے، کچھ نہیں، ایک بات، اور صرف ایک ہی بات ہے جس پر اس کے افادہ کا دار و مدار ہے یعنی جس ذریعہ سے بھی ہو کسی طرح یہ طے ہو جائے کہ سرور

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک العیاذ باللہ غلط بیانی کے الزام سے پاک و بری ہے
ظاہر ہے کہ یہ سراسر ایک عقلی مقدمہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق کسی دوسرے
غیبی عالم سے نہیں اسی عالم محسوس و شہادت سے ہے۔ وہ ہم انسانوں ہی میں پیدا ہوئے
ہم ہی میں رہے، منٹ دو منٹ کے لیے نہیں جیسے بعض دفعہ کسی غیبی ہستی سے
سالک کا احساس متاثر ہو کر پھر اپنے سامنے کچھ نہیں پاتا، یہ حالت نہیں ہے سالہا
سال تک وہ ہم ہی میں رہے، ہم ہی میں زندگی گذاری، گورے کالے، مشرقی مغربی
ہندو مسلمان عیسائی، یہودی ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے آپ کو سب جانتے ہیں، آپ
سب ہی کے جانے بوجھے دیکھے بھالے ہیں،

اسی واضح المحسوس، بدیہی حقیقت کے متعلق ہمیں اپنی فطرت اور اپنے اندرونی
احساسات کو صرف اس حیثیت سے ٹٹولنا ہے کہ العیاذ باللہ کیا وہ سچ نہیں بولتے تھے
اس کے تصور کی بھی صلاحیت کیا ہم میں باقی ہے؟

ایسی بات جسے شاید اب کوئی غیر مسلم بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ
ایک پیدائشی مسلمان کے سینے میں اس کی کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے

ادھر یہ مقدمہ طے ہوا اور اچانک وہی درماندہ عقل جس کی آخری رسائی

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے کچھ ایسا کہ اٹھائے نہ بنے

پر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن کی روشنی میں جگمگا اٹھتی ہے، اب اپنے آپ کو وہ اس علم محیط کی راہنمائی
میں پاتی ہے، جس سے نہ ماضی غائب ہے نہ مستقبل نہ شہادت پوشیدہ ہے نہ غیب اوجھل ایسی
روشنی جو ظاہر ہے کہ اپنی خالص ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک کیفیت کے ساتھ کسی دوسرے ذریعہ
سے کسی کو اب کہیں میسر نہیں آسکتی، اور یہ سب کچھ ایک صرف ایک "نظرۃ"

خراباتیاں مے پرستی کنید　　محمد بگوئید و مستی کنید

کا نتیجہ ہے ع بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست۔

جسے اس ایک "نظرۂ" کی دولت حاصل ہو چکی ہو دراصل "معمۂ کائنات" کے وہ سارے اسرار جو دانش ماضی و حاضر کے کسی سرمایہ سے کسی پر کبھی کھل نہیں سکتے تھے اس کے حل کی ایک ایسی راہ اس کے سامنے آگئی ہو جس پر چلنے والا اپنے اردگرد پس و پیش میں شک و شبہ، ظن و تخمینہ کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا کیونکہ ظاہر ہو کہ اب اس سلسلہ میں جو کچھ جانیگا جو کچھ سمجھیگا وہ محدود عقل رکھنے والے انسان کا کوئی تخمینی نتیجہ نہ ہوگا جس میں ہر تھوڑی دیر بعد دغدغہ ہوتا ہو اور اس دغدغہ کو ہونا چاہیے کہ بے جانے صرف قرائن و قیاسات سے جن لوگوں نے نتائج پیدا کیے ہیں، کیا ضرور ہو کہ وہی واقعہ ہو خصوصًا جب آئے دن عقل کے تخمینی نتیجوں کے متعلق مسلسل تجربہ ہوتا چلا آرہا ہو کہ کل جس چیز کے واقعی قرار دینے پر عقل کو اصرار تھا آج وہی عقل جہل کے قہقہوں سے اُسی کا مضحکہ اُڑا رہی ہو۔ بشر انسانی کی ہزارہا ہزار سال کی تاریخ بیجا اصرار اور بیجا تمسخر کی داستانوں سے لبریز ہو۔

حالانکہ یہ سارا قصہ صرف اسی ایک "نظرۂ" کی تصحیح کے بعد ختم ہو جاتا ہو۔ آئندہ مسئلہ جو کچھ رہ جاتا ہو وہ راہ کا نہیں بلکہ راہ پر چلنے کا ہو۔ سلطان المشائخ نے علمارِ رسوم (علمارِ ظاہر) اور صوفیہ میں فرق بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ دونوں ہی دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی "لاریبی علم" "القرآن الحکیم" اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی دعوت دیتے ہیں لیکن فرق یہ ہو کہ۔

"ہرچہ علمار بزبان دعوت کنند مشائخ بعمل دعوت کنند (سیرالاولیار بحوالہ نوشتہ دست خاص سلطان المشائخ ص ۳۲۱)

اور اتنے دھوم دھام سے آپ شیخ کبیر کو جو دیکھ رہے ہیں کہ آخری وصیت اپنے خلیفۂ خاص کو حفظِ قرآن کی کر رہے ہیں اس حفظ سے غرض وہی ہو کہ "ہند گیر دعوت" کی جس مہم پر سلطان المشائخ کا اُنھوں نے تقرر کیا تھا، ضرورت تھی کہ پہلے اس دعوت کو وہ خود اپنی عملی زندگی بنالیں کہ ان کو زبان سے نہیں اپنے عمل سے دعوت دینی تھی۔

Marfat.com

خواجگانِ چشت میں قرآن کے علم کو عمل بنانے کی کیا تدبیر کی جاتی تھی: تلاوت و حفظ کا تو خیر الفاظ سے تعلق تھا لیکن اپنے الفاظ سے قرآن جن معانی کو عطا کر رہا ہے ان کو اپنے اندر ہضم کس طریقہ سے کرنا چاہیے۔ مشائخ چشت بیعت لیتے ہوئے پہلا معاہدہ جو یہ لیتے تھے جیسا کہ سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ

"پیر اورا (مرید را) تلقین کند دیدہ را نادیدہ کنی وشنیدہ را ناشنیدہ" (سیر الاولیاء ص ۳۳)

اس کا یہی مطلب تھا کہ اپنے حسی وعقلی معلومات کو ان معلومات کے مقابلہ میں جو قرآن عطا کریگا، جلا دینا پڑیگا، کیونکہ بہرحال عقل حواس کے معلومات جیسے کچھ بھی ہوں ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں جن کی رسائی محدود ہے اور محدود رسائی رکھنے والے ذرائع سے جو معلومات حاصل ہونگے ظاہر ہے کہ وہ ناقص ہونگے، ناقص مقدمات سے جو نتائج پیدا کیے جائینگے خواہ بظاہر جتنے بھی یقینی اور بدیہی معلوم ہوں لیکن ان معلومات بینہ قطعیہ کا تو مقابلہ نہیں کر سکتے جو حق تعالیٰ کے علم محیط کلی سے ماخوذ ہونگے۔

سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ معلومات جن ذرائع اور طرق سے آدمی کو حاصل ہوتے ہیں ان کے تین اطوار ہیں، فرماتے ہیں:

"یکے طور حس دوئم طور عقل سوئم طور قدس"

طور قدس سے اشارہ علم کے اسی قطعی لاریبی ذریعہ کی طرف ہے جو ہر قسم کے اندیشوں، شکوک و شبہات سے مقدس اور پاک ہے عقلی طور کے معلومات کی دونوں مشہور قسموں یعنی غور و فکر کے بعد آدمی جن نتیجوں تک پہنچتا ہے جنہیں منطق میں کسبی اور نظری کہتے ہیں اور غور و فکر کے بغیر جو معلومات ہر شخص کو حاصل ہوتے ہیں جنہیں بدیہی کہتے ہیں، سلطان المشائخ نے ان دونوں قسموں کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ

"بدیہیا علم قدس نیست تا کسبی چگونہ باشند" فوائد ص ۶۵

بہرحال یوں شنیدہ کو ناشنیدہ، اور دیدہ کو نا دیدہ بنا کر بزرگانِ چشت جیسا کہ معلوم ہوتا ہے،

Marfat.com

قرآنی معانی کو چوسنے کا حکم دیتے تھے فوائد الفواد ہی میں تلاوت کے جن قاعدوں کا ذکر ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرتبہ اس کا یہ ہے کہ

"آنچہ می خواند معانی آں بر دل گذراند"

دوسرا مرتبہ اس کا یہ ہے، کہ

"در حالت قرآن خواندن، جلال و عظمتِ حق بر دل بگذراند"

اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ

"وقت خواندن قرآن باید کہ دل خوانندہ را تعلق بحق باشد" (ص ۱۷)

اس آخری عمل کا مطلب یہی ہوا کہ براہ راست حق تعالیٰ سے گفتگو اور مناجات کی سعادت اسے حاصل ہو رہی ہے، گویا وہی چیز ہے جس کی تلاش میں لوگ سرگرداں ہیں، مجاہدات و ریاضات برداشت کرتے ہیں کہ شاید غیب کی کوئی کرن چمک اٹھے، کسی ایمار اور اشارہ سے سرفرازی ہو، قرآن کے پڑھنے والے کو بسہولت تمام یہی مقام حاصل ہے سلطان المشائخ لوگوں سے فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے کم از کم اس شعور کو تو ہر شخص میں ہونا چاہیے کہ

"این دولت چہ لائق منت و مرا چہ محل ایں سعادت باشد"

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس ناسوتی زندگی میں اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی بغیر کسی واسطہ کے حق تعالیٰ سے، ان ہی کے الفاظ میں ان علوم کو حاصل کر رہا ہے جن کے حاصل کرنے کا اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں ہے، شیخ محدث دہلوی نے ملتان کے ایک بزرگ سید صدرالدین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے

"دو نعمت در عالم بالفعل موجود است کہ فوق جمیع نعمتہاست لیکن مردم قدر آں دو نعمت را نمی شناسند وبداں پے نمی برند و از تحصیل آں غافل اند"

پھر ان دونوں نعمتوں کی شرح کرتے ہوئے ایک تو اسی نعمت کا ذکر کرتے کہ

Marfat.com

"قرآن مجید کلام پروردگار ست و وے سبحانہ تعالیٰ بے واسطہ بدان متکلم خلق ازاں غافل اند"

اور دوسری نعمت یہ ہے کہ

"وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجودست" (اخبار ص ۲۱۵)

اور اس سے ہندوستانی صوفیا کے اس نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے، جو میرے نزدیک مشائخ چشت کی برکتوں میں ایک برکت ہے، سید صدر الدین کا زمانہ سلطان المشائخ کے بہت بعد کا ہے، لودیوں کے عہد میں ملتان میں رہتے تھے۔

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں تو خواجگان چشت کے طرز عمل کا ذکر کر رہا تھا۔ کہ انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں میں کس قسم کا قرآنی مذاق پیدا کیا تھا، اور اس سے استفادہ کے طریقے ان کے یہاں کیا تھے، میر خورد نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ کا عام حکم قرآن خوانی کے متعلق یہی تھا کہ

"یک سپارہ بسکونت حرفاً بعد حرفٍ خواندن بہتر از پانزدہ سپارہ بسرعت خواندن ست"

فرماتے تھے کہ

"درچنیں خواندن نور تلاوت بیش تر باشد اگرچہ دررواں خواندن ہم از نور خالی نبود"

خود آخر عمر تک جوانی سے متجاوز تھی، پوچھنے والے نے جب یہ پوچھا کہ

"شما ہر روز چہ مقدار می خوانید، فرمود یک سپارہ"

ظاہر ہے کہ اس "ایک سپارہ" کے پڑھنے کا وہی مطلب تھا کہ "بسکونت حرفاً بعد حرفٍ خواندن" کے طریقہ پر حضرت والا کا عمل تھا، تلاوت کے اس طریقہ سے جیسا کہ سلطان المشائخ ہی سے میں نقل کر چکا ہوں کہ "تالی (قرآن پڑھنے) را وصول دیرتر بود"

لیکن گو ذکر کے عام طریقہ سے یہ وصول دیر میں ہوتا ہو، لیکن واقعہ وہی ہے کہ

"چنداں خوف زوال نبود"

اس لیے زوال کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ العیاذ باللہ کسی مسلمان کے دل

Marfat.com

میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدانخواستہ "غلط بیانی" کا شبہ پیدا ہو لیکن جس شبہ کی گنجائش اب غیر مسلموں کے قلوب میں بھی اگر سچ پوچھیے تو باقی نہیں رہی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا عام وزن نسلِ انسانی پر اتنا پڑچکا ہو کہ کھلے بندوں بغیر کسی جھجھک کے اس کی ہمت کسی میں باقی نہیں رہی ہو کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہہ سکتا ہو کہ خاکم بدہن "آپ جھوٹ بولتے تھے" تو اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ ایک مسلمان اپنے اندر اس شبہ کی گنجائش کہاں سے پا سکتا ہو، اور میں عرض کرچکا ہوں کہ قرآن سے استفادہ صرف ایک اسی مقدمہ پر مبنی ہو، میں نہیں جانتا کہ "وصول حق" کے لیے اس سے زیادہ مختصر قطعی اور یقینی راہ اور کیا ہو سکتی ہو، دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کے سامنے سب کچھ پیش کر سکتی ہیں لیکن قرآن ہی ایک دولت مسلمانوں کے پاس یقین کی ایسی دولت ہو جس کا مقابلہ نہ یورپ کا فلسفہ کر سکتا ہو اور نہ ہندوستان کا "اپنشد" نہ یہاں کے قصاصوں کے خوارق اور عجائب کا وہ طومار، صرف ایک مقدمہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے تھے اچانک علم و یقین کے ایک ایسے دروازے کو قرآن کی صورت میں کھول دیتا ہو جس کے بعد علم کے سارے دروازے جن میں بہر حال کچھ نہ کچھ شک ہو بے اعتمادی اور عدم وثوق کے جراثیم ان کی بنیادوں میں بھرے ہوئے ہیں، خود بخود بند ہو جاتے ہیں عقلی تخمینوں کی تاریکیوں سے نکل کر آدمی براہ راست حق تعالیٰ کے علم کی روشنی میں آجاتا ہو، البتہ اس علم سے استفادہ کے جو مذکورۂ بالا طریقے مشائخِ چشت میں مروج تھے، ان پر جب آدمی عمل کرنا شروع کرتا ہو اور جو ضابطے تلاوتِ قرآن کے ان بزرگوں نے اس ملک میں نافذ کیے تھے جو ان کے نہیں بلکہ سلف ہی سے منقول تھے، جب ان کو اپنا دستور العمل سلوک بناتا ہو، تو گو دیر ہی میں سہی، لیکن وصول کے نتائج اس کے سامنے اسی زندگی میں ظاہر ہونے لگتے ہیں سلطان المشائخ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ قرآنی راہ سے وصول کی جو سعادت اس زندگی میں میسر آتی ہو وہ کیا

ہوتی ہے، آپ نے اس کا جو جواب دیا تھا فوائد الفواد میں آپ ہی کے الفاظ میں وہ منقول ہے

"فرمود در حالت تلاوت وسماع سعادتے کہ حاصل آید آں بر سہ قسم ست انوار ست،

احوال ست وآثار ست"

ظاہر ہے کہ یہ تینوں چیزیں تجربے سے تعلق رکھتی ہیں، الفاظ سے ان کی تعبیر مشکل ہے۔ تاہم سلطان المشائخ نے اس کی کچھ تفصیل بھی فرمائی ہے۔ آخری چیز یعنی "آثار" کا چونکہ تعلق اسی عالم حس سے ہے، یعنی آدمی کے جسم پر آنکھوں پر یہ کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، اس لیے اس کو تو ہم آپ بھی سمجھ سکتے ہیں، سلطان المشائخ نے فرمایا تھا کہ گویہ آثار جہاں سے آتے ہیں، اس کا اصطلاحی نام "عالم ملک" ہے لیکن یہ انوار احوال آثار میں سے آخری چیز چونکہ "جوارح" یعنی بدن اور اعضا، بدن پر نازل ہوتے ہیں، اس لیے اس کا احساس دوسروں کو بھی ہو سکتا ہے آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ

بکائے وحرکتے وجنبشے کہ ظاہر می شود اں را آثار می گویند وآں از عالم ملک ست بر جوارح"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سابقہ ضوابط کے تحت جب قرآن آدمی پڑھتا رہتا ہے تو آخر میں پڑھتے پڑھتے اُس پر گریہ طاری ہوتا ہے بدن میں حرکت اور جنبش پیدا ہوتی ہے گویا قرآنی آیت

اللہ انزل احسن الحدیث کتابا | اللہ نے اتاری اچھی بات اس کتاب کی صورت
متشابھا مثانی تقشعر منہ | میں نازل فرمایا جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی ہیں
جلود الذین یخشون ربھم ثم | جو ہر اد ہر اکر پڑھی جاتی ہیں جو لوگ اللہ سے ڈرتے
یلین جلودھم وقلوبھم الی | ہیں ان کی جلدیں کانپنے لگتی ہیں پھر ان کی جلدیں
ذکر اللہ | اور قلوب نرم پڑجاتے ہیں اللہ کی یاد کے لیے

کی کیفیت اس پر شروع ہو جاتی ہے لیکن جوارح کے یہ آثار دراصل باطنی انقلابات کے ثمرات ہوتے ہیں، سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عالم ملکوت سے پڑھنے والے کی روح پر انوار[1] کا نزول ہوتا ہے، انوار کے بعد عالم جبروت سے قلوب پر احوال نازل ہوتے ہیں

[1] (بر صفحہ ۱۳۰)

آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

"نخست (یعنی تلاوت کے فوائد کا ظہور شروع میں) انوار از ملکوت بر ارواح، بعد ازاں احوال از جبروت بر قلوب، بعد ازاں آثار از ملک بر جوارح"

سلطان المشائخ کے مشہور "محبوب ترک" حضرت امیر خسرو جنہیں حضرت نے سلوک بالقرآن ہی پر لگا دیا تھا، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا وہ سات پارے روزانہ تہجد میں پڑھا کرتے تھے، ایک دن مجلس مبارک میں حاضر ہوئے پوچھا گیا۔ ترک! حال مشغولیہا چیست؟

حضرت امیر خسرو نے جواب میں فرمایا:-

"مخدوما! چندگاہ باشد کہ بوقت آخر شب گریہ مستولی میشود" (سیر الاولیا، ص ۳۰۲)

یعنی	اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ عَلَی الرَّسُوْلِ	جب سنتے ہیں وہ چیز جیسے اتارا اللہ نے رسول
	تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ	پر تو دیکھتے ہو تم ان کی آنکھوں کو کہ بہ رہیں
	مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ	آنسوؤں سے کیونکہ حق کو انہوں نے پہچانا۔

کی حلاوت امیر کو ملنے لگی، سلطان المشائخ نے سن کر فرمایا،

"الحمد للہ کہ ظاہر شدن گرفت"

آیات قرآنی کی تلاوت فابعد حرف اس طریقہ سے کہ ان کے معانی کو بھی دل پر گذارا جائے۔ اس سلسلہ میں مشائخ چشت کی فہم قرآنی کا کیا انداز تھا، ہم ان کے اس مذاق کا اندازہ مثالوں سے کرسکتے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآنی علم کو "جو عمل" کی شکل دیتے تھے اس باب میں ان کا نقطہ نظر کیا تھا، اور عمل سے ان کی غرض کیا تھی

شیخ کبیر شکر گنج سے سلطان المشائخ راوی ہیں کہ حضرت والا نے ایک دن

---

[1] بخاری میں ہے کہ بعض صحابی یعنی سید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عالم حس ہی میں ان قرآنی انوار کا مشاہدہ ہوتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب انہوں نے قصہ بیان کیا کہ میں قرآن پڑھ رہا تھا کہ گھوڑی میری بھڑکی، آسمان کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک ظلہ روشنی سے جگمگاتا ہوا آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قرآن کے انوار تھے۔

Marfat.com

ارشاد فرمایا کہ ۔

"فقیر صابر بر غنی شاکر رجحان دارد"

یعنی مفلس ہونے کے باوجود جو صابر ہو اس کو شکر کرنے والے آسودہ حال مسلمان پر ترجیح ہوگی۔ یہ تو دعوی تھا، دلیل میں شیخ کبیر نے جو بات پیش کی اسی سے اس کا سُراغ ملتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک قرآن فہمی اور قرآنی آیات پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہوتا تھا؟ سلطان المشائخ ہی راوی ہیں کہ شیخ کبیر نے دعوے کو پیش کرکے دلیل یہ بیان کی کہ

زیرا کہ غنی شاکر را بر شکر وعدہ چیست ؟

یعنی دیکھنا یہ چاہیے کہ تونگروں کو شکر پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں کس چیز کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت

وَلَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ   اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤنگا

تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ "وعدہ مزید نعمت" ہے لیکن

"در صبر بشارت چیست ؟ نعمت معیت"

اور ثبوت میں آیت قرآنی

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ   یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

حاصل یہ ہوا کہ شکر میں تو وہی نعمتیں جو آدمی کو ملتی ہیں، اُن ہی کے اضافہ کی بشارت قرآن میں دی گئی ہے، لیکن صبر میں تو نعمت ہی نہیں، صاحب نعمت کی رفاقت اور معیت کا مژدہ سُنایا گیا ہے، شیخ کبیر نے اس کے بعد فرمایا۔

"میاں ایں مرتبہ و آں بہ ہیں آں فرق از کجا تا کجاست"

جس وقت سلطان المشائخ شیخ کبیر کے اس قول کو بیان فرما رہے تھے، حضرت کے ممتاز مریدوں میں سے قاضی محی الدین کاشانی بھی موجود تھے، اُنہوں نے دریافت کیا کہ

هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ   وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔

Marfat.com

کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابر و غیر صابر ہر ایک کو معیت حق حاصل ہے، پھر صبر کی خصوصیت کیا ہوئی، سلطان المشائخ نے فرمایا کہ صبر میں

"معیت باعنایت است یعنی بحب و برضی"

یعنی صرف "معیت" ذاتی یا علمی نہیں بلکہ محبوبیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ معیت صابر کو میسر آتی ہے، اور صابر کی محبوبیت کے اس مقام کا قرآن میں جتنی بار اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْن (پیار کرتا ہے قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کو) دہرایا گیا ہے یا اسی قسم کی آیتوں سے قرآن کے پڑھنے والوں میں سے اس کو نا واقف ہے، نص محکم قطعی کے رو سے صابر محبوب الٰہی بن جاتا ہے۔

بہر حال یہی ایک مثال کافی ہو سکتی ہے، کہ قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب ان بزرگوں کے نزدیک کیا تھا، قرآن پر عمل کرنا چاہیے جو ایک عام بات ہے، جس کا چرچا خصوصاً اس زمانہ میں بہت زیادہ ہے، کیونکہ مغرب نے آج جو ذہنیت ملک میں پیدا کی ہے، اس میں ایمان یا علم صحیح کی کوئی قیمت نہیں، آپ کا علم کچھ ہی کیوں نہ ہو، دس خدا کے آپ قائل ہوں، شرک جیسی بدترین بغاوت کا کوئی مرتکب ہو، لیکن اگر اس کی زندگی کا کوئی عملی پہلو اچھا ہے، تو اس زمانہ میں اس کے عقائد سے قطع نظر کر کے عمل کی صرف اسی خوبی کی وجہ سے اس کا شمار نیکو کاروں، بلکہ بعضوں کے نزدیک تو خدا رسیدوں میں کیا جاتا ہے، اور یہ سارا عارضہ اس کا ہے کہ "الحیوٰۃ الدنیا" کے بعد "الحیوٰۃ الاخریٰ" کے یقین میں ضعف پیدا ہو گیا ہے، جو منکر ہیں وہ تو خیر منکر ہی ہیں، لیکن بظاہر جو اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بھی قیمت صرف ان ہی چیزوں کی ہے، جن سے موجودہ زندگی میں کچھ فائدہ پہنچتا ہو، چونکہ علوم صحیحہ، یا اعتقاداتِ حقہ کے نتائج عموماً دوسری زندگی میں ظاہر ہونگے اور اعمال صالحہ کے نتائج یہاں بھی ہویدا ہونے لگتے ہیں، جھگڑا فساد مٹتا ہے، امن حاصل ہوتا ہے، عافیت میسر آتی ہے، اس لیے مذہب کا عملی پہلو اب بھی ان تنگ نظروں کو اپیل کرتا ہے اور یہی راز ہے اس بات کا کہ سارا زور اس زمانہ میں عمل ہی عمل پر دیا جا رہا ہے

Marfat.com

بربادی و تباہی کے جتنے مراثی خواہ محراب و منبر پر پڑھے جاتے ہوں، یا پنڈال و ڈائس پر ہر جگہ عمل کا رونا رویا جاتا ہے، قرآن پر عمل جاتا رہا، اس لیے مسلمان تباہ ہو گئے، حتیٰ کہ بعض جوشیلوں کا غلو تو اس باب میں اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ یورپ کے ملاحدہ فساق جن کی ساری زندگی جاہلیت کی زندگی ہے، ان کو عموماً عمل بالقرآن کی سند دی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ان قوموں نے قرآن کو پکڑا، اس لیے آج حکومت و سلطنت کے مزے بھوگ رہے ہیں اور مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا، اس لیے افلاس و نکبت، خواری اور ذلت میں گرفتار ہیں۔

یورپ عامل بالقرآن ہے، اب اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

آنکھیں رکھتے ہوئے جو اندھے بنتے ہوں، انہیں کون دکھلا سکتا ہے، لیکن دوسری بات کہ مسلمانوں کا چونکہ قرآن پر عمل باقی نہ رہا، اس لیے وہ تباہ و برباد ہو گئے، اس میں شک نہیں ہے کہ کہنے والے جس معنی میں یہ کہہ رہے ہیں، وہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن واقع کے لحاظ سے اس کا کون انکار کر سکتا ہے، اس لیے میں تو عمل بالقرآن کے عصری مطالبوں کو

کلمۃ حق یراد بھا الباطل سچی بات ہے لیکن اس سے جو مقصد ہے وہ لاحاصل بے نتیجہ غلط ہے

کی ایک مثال سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، اتنا ضرور ہے کہ قرآن پر عمل آج مسلمانوں میں نہیں ہو رہا ہے، مگر سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن پر عمل کیا کیا جائے، قرآن کی حالت تو یہ ہے کہ اسلامی اعمال کے مہمات نماز و روزہ حج و زکوٰۃ تک کے تفصیلات تو اس میں نہیں پائے جاتے بلکہ قریب قریب سب کی حیثیت عنوان اور باب کی ہے، تفصیلات کا علم تو پیغمبر کی زندگی سے حاصل ہو رہا ہے۔[1]

---

[1] اور جن لوگوں نے قرآنی آیات ہی سے تفصیلات کے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اُن کی بوجھکڑی تفسیروں کا مطالعہ ان کے جنون کی کافی دلیل ہے بکڑ دالویوں کی تفسیر پڑھیے زعفران زار کشمیر کی سیر سے آپ کو مستغنی کر دے گی ۱۲۔

اور جب نماز و روزہ جیسے امہات الاعمال کا قرآن میں یہ حال ہے، تو پھر اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کرنا چاہیے، میں نے ایک دفعہ نہیں بسا اوقات عمل بالقرآن کے مطالبہ کرنے والوں سے پوچھا ہے، کہ قرآن پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہے، اس میں نہ زراعت کا طریقہ بتایا گیا ہے، نہ صنعت کا، نہ حرفت کا، نہ تجارت کا، ان چیزوں کا اگر ذکر قرآن میں ہے بھی تو محض ضمنی طریقہ سے لفظ دو لفظ میں کسی دوسرے مقصد کے ذیل میں ان کا ذکر بھی آگیا ہے، یہ تو ان اعمال کا حال ہوا جن کا تعلق دنیا سے ہے، اور دینی اعمال کی کیفیت تو آپ سن ہی چکے کہ قریب قریب ان میں اکثر کے عنوانوں کا ذکر ہے تفصیل جیسی کہ چاہیے وہ ان کی بھی نہیں، اگر صرف قرآن ہی کو پیش نظر رکھ کر کوئی نماز کے اجزاء کو مرتب کرنا چاہے تو اس میں شک نہیں کہ قیام، رکوع، سجود یہ مختلف اجزاء تو قرآن میں مل جائینگے، لیکن ان میں کس جزء کو مقدم رکھا جائے کن کو موخر کیا جائے، قرآن سے اس کا فیصلہ کیا ممکن ہے؟ جب تک کہ پیغمبر کی زندگی سے ہم اس کو نہ سمجھیں پھر عمل بالقرآن کا کیا مطلب؟ میں نے تو نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کا کوئی معقول جواب دیا ہو۔

لیکن شیخ کبیر نے قرآن کی دو آیتوں "لئن شکرتم لازیدنکم" "ان اللہ مع الصابرین" کو جس طرح سمجھایا ہے، اور عمل سے ان دونوں کا جو تعلق دکھایا ہے، اگر آپ اس طرح قرآن کو پڑھنا شروع کریں اور اپنے دیدہ کو نادیدہ اپنے شنیدہ کو ناشنیدہ بنا کر قرآن سے پھر علم لینا شروع کر دیں یعنی آپ سارے دیدوں اور شنیدوں کو باہر نکال کر ان ہی قرآنی علوم کو اپنی نظرت کی گہرائیوں میں یقین واذعان کی بنیادوں پر جمانا شروع کر دیں، صبر کے ساتھ حق تعالیٰ کے جو مواعید ہیں، توکل پر جن ثمرات کی بشارتیں سنائی گئی ہیں، ذات حق کے ساتھ آپ کا تعلق تقویٰ کا جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات وآثار قرآن نے بیان کیے ہیں اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر آپ قرآنی آیات کو سکون کے ساتھ حرفاً بحرف پڑھنا شروع کیجیے تو یقین مانیے کہ ہر آیت آپ کو عمل کے لیے ایک نیا اور جدید علم دیگی، لیکن جو کچھ

آنکھوں سے کانوں سے خود دیکھا یا سُنا ہے، یا آپ ہی جیسے کسی آدمی نے دیکھ سُن کر جو ناقص معلومات اپنے اندر جمع کئے ہیں، -- ان دیدوں، اور شنیدوں کو دیدہ اور شنیدہ ہی باقی رکھتے ہوئے آپ قرآن سے اگر کچھ لینا چاہینگے تو یقین ملنیے کہ آپ کو کچھ نہ ملیگا، اور اس زمانہ کی محرومیوں کے پیچھے دراصل تنگ نظری، دماغی انحطاط کا یہی زہر چھپا ہوا ہے، وہ پیغمبر کے پاس آتے ہیں کہ عقل وحس کے سوا ان کے ذریعہ سے کچھ جدید معلومات حاصل ہونگے، لیکن جب پیغمبر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے، کہ عالم محسوس کے پیچھے غیب کے عوالم ہیں، ان عوالم میں ملائکہ ہیں، جنات ہیں، حور ہیں قصور ہیں، نار ہے، نور ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں تو ہمیں پہلے سے معلوم نہ تھیں، میری آنکھوں نے تو ان کو نہیں دیکھا ہے، پھر ان کو میں کیسے مان لیں آپ ہی غور کیجیے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ آپ کو پہلے سے معلوم ہے اس علم پر آپ بال برابر اضافہ کرنا نہیں چاہتے، ظاہر ہے کہ جس شخص کی دماغی پستی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو، کہ جو کچھ پہلے سے اسے معلوم ہے اُس پر اضافہ کے نام سے کان میں انگلیاں ٹھونستا ہو چیختا ہو، چلاتا ہو، کیا اس کو اس جدید علم کی راہ سے کچھ بھی مل سکتا ہے، ان مسکینوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، کہ جب تمہارا یہی حال ہے کہ حس وعقل کے حدود کے آگے قدم رکھنے سے تمہارے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں، بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہے تو آپ پیغمبر کے پاس تشریف ہی کیوں لائے تھے، حسی اور عقلی معلومات کے لیے تو آپ کے پاس پیغام پہنچانے کے لیے آپ کے حواس آپ کی عقل موجود ہی تھی پیغمبر کی پیغمبر کے جدید ذریعہ علم وحی ونبوت کی ضرورت تو ہوتی ہے اس لئے ہی کہ حواس وعقل جہاں جواب دے دیتے ہیں وہاں سے علم کی ایک نئی راہ ہے، جو پیغمبروں کے ذریعہ قدرت نے کھولی ہے، لیکن حواس و عقل کی راہ سے جو کچھ جانا جا چکا ہے، اب مزید جاننے سے جو گھبراتا ہے، بھاگتا ہے، آپ ہی بتائیے کہ خدا کا کلام اُسے کیا دیگا۔ بہر حال اب دنیا جس طرح چاہے قرآن کو استعمال کرے لیکن ہندوستان کے جس عہد کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندی مسلمانوں کو قرآن سے استفادہ

Marfat.com

کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس کی ایک معمولی مثال شیخ کبیر شکر گنج کی فرمودہ وہ مثال تھی کتابوں میں ان بزرگوں کے جو اقوال اس سلسلہ میں بکھرے ہوئے ہیں، اگر ان کو کوئی جمع کرے تو وہ اچھی خاصی ایک کتاب بن سکتی ہے، ظاہر ہے کہ میرے لیئے یہاں ان سب کے ذکر کی کیا گنجائش ہے، تاہم خواجہ بزرگ اجمیری کے ایک سلسلہ یعنی قطبی سلسلہ کے بزرگ کا جب نقطۂ نظر آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، تو جی نہیں مانتا کہ طریقۂ چشتیہ کی دوسری شاخ حمیدیہ جس کے متعلق گذر چکا کہ صدیوں تک مدارک کا درس طریقۂ سلوک کے ایک جزب کی حیثیت سے ان میں جاری تھا۔ اس سلسلہ کے ذوق قرآنی کا بھی ایک نمونہ تو کم از کم پیش کر ہی دوں، شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں شیخ حمید الدین کے ترجمہ میں ان کے بعض مکتوبات نقل کیے ہیں، ان ہی میں قرآنی آیات کی چند تفسیروں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ چیز قرآن کی مشہور آیت۔

الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا	اپنے بندوں سے جن لوگوں کو ہم نے چنا
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ	ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اپنے نفس کے
مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ	لیے ظالم ہیں کچھ میانہ رو ہیں کچھ ان میں نیکیوں
بِاِذْنِ اللّٰهِ	کی طرف سبقت کرنیوالے ہیں اللہ کے فرمان سے

کے متعلق ایک نکتہ پیش کیا ہے، تفسیروں میں اس آیت کے مطلب میں لوگوں نے کیا فرمایا ہے، اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں بلکہ شیخ حمید الدین نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے صرف اس کا خلاصہ پیش کرنا مقصود ہے، ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا آیت میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ظالم لنفسہ (اپنے آپ کے ساتھ ظلم کرنے والا) مقتصد (میانہ رو) سابق بالخیرات (نیکیوں کے ساتھ آگے بڑھنے والا)

سوال ہوتا ہے کہ یہ تینوں قسمیں کیا ایسی ہیں جن میں مومن غیر مومن سب ہی شریک ہیں، یا اہل ایمان ہی کے اندر یہ تینوں طبقات پائے جاتے ہیں، شیخ ناگوری نے اس قرینہ سے

Marfat.com

کہ ذکران لوگوں کا ہی جو چنے گئے "یعنی اصطفینا من عبادنا" (ہم نے اپنے بندوں سے جنہیں چن لیا ہی) ان ہی کی یہ تین قسمیں بتائی گئی ہیں، اس لیے غیر مومن عباد ان قسموں کے نیچے داخل نہیں ہو سکتے۔ شیخ نے اس کے بعد اہل ایمان کے ان تینوں طبقوں کی تعبیر اپنے الفاظ میں معذوران، مشکوران، فانیان سے کی ہی۔ گویا ظالم لنفسہ والے ان کے خیال میں "معذوراں اند" کے نیچے داخل ہیں یہ معذران کون لوگ ہیں:

آنہا کہ بعد ایمان باللہ و اقرار ہم بالتوحید بحضرت حاضر نیامند، دیر آیند و آہستہ آمندو از خطاب سارعوا (تیزی دکھاؤ تعمیل احکام میں) غافل باشند"

گویا ان لوگوں نے اپنے ان فرائض کو جو ان کے نفوس پر عائد ہوتے تھے ان میں ظلم کا ارتکاب کیا ان حقوق کی ادائگی میں کمی کی، اس لیے وہ ظالم لنفسہ ٹھرے

مشکوران یعنی مقتصد کون لوگ ہیں:۔ "با یایان ہم عنان آمند و باقرار ہم رکاب"

مقتصد (میانہ رو) کا مطلب شیخ کے نزدیک یہ ہی کہ جو کچھ انہوں نے مانا تھا جن باتوں کا اقرار کیا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ لگے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ ہوا اقتصاد وہمعنانی کا مطلب۔

فانیان یعنی سابق بالخیرات کون لوگ ہیں، شیخ نے لکھا ہی کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی فطرت میں "الست بربکم" کے سوال کا جواب "بلیٰ" (کیوں نہیں) دب کر اپنے آثار کو کھو نہیں چکا تھا، بلکہ اس کا شعور ان میں باقی تھا، اس لیے۔

"دریں جہاں پیش از دعوت بحکم خطاب ازلی وجواب لم یزلی، اجابت کردہ"

شیخ نے اس قسم کے تمام واقعات یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہم اصحاب سے جو یہ مروی ہی کہ بغیر کسی تذبذب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سُننے کے ساتھ ہی ایمان لے آئے، یا اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بے دیکھے پیمبر کو مان لیا، یا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ تلاش حق میں اس ملک سے اس

Marfat.com

ملک، اس راہب سے اُس راہب کے پاس پھرے پھرتے تھے، تا اینکہ مدینہ منورہ پہنچے، اور دولتِ ایمان سے مشرف ہوئے۔

شیخ نے ان تمام بزرگوں کے ابتداءِ اسلام کے قصوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے جس سے ان کی اس وسعتِ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو معرفۃ الصحابہ کے فن میں انہیں حاصل تھی لیکن میرا مقصود اس وقت صرف خواجگانِ چشت کے قرآنی ذوق کا ایک دوسرا نمونہ پیش کرنا تھا، میں یہ نہیں کہتا کہ شیخ نے جو مطلب آیت کا بیان کیا ہے، اُس کی طرف دوسری تفسیروں میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن جس خوبی کے ساتھ اُنھوں نے اہلِ ایمان کے تینوں طبقوں پر ان تینوں لفظوں کو منطبق کیا ہے کم از کم میرے علم کی حد تک اتنی اچھی ستھری سلجھی ہوئی بات کسی اور تفسیر میں نہیں گذری تھی[1]۔

اور یہ تھا اُس زمانہ میں قرآن کی تلاوت کا طریقہ جسے ہندوستان میں بزرگانِ چشت نے جاری کیا تھا، ان ہی بزرگوں سے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ڈھول سارنگی، ستار کے سوا اس ملک میں وہ اور کچھ نہیں لائے۔

گفتگو دراصل اس میں ہو رہی تھی کہ حضرت سلطان المشائخ کو شیخ کبیر شکر گنج نے قرآن کے حفظ کی وصیت فرمائی، اسی سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود تھا، یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حفظ سے ان بزرگوں کی غرض صرف الفاظ قرآنی کا یاد کر لینا تھی، اسی لیے

---

[1] مدت ہوئی دلی میں کسی صاحب کے پاس سلطان التارکین ناگوری کی بعض چیزیں نظر سے گذری تھیں، ایک قرآنی لطیفہ کا خیال بھی آگیا۔ خواجہ بزرگ اجمیری نے ان کو خطاب کرکے کہا کہ جب تک میں متاہل نہ تھا بال بچے نہیں ہوئے تھے، یہ حالت تھی کہ دل میں کسی بات کا خیال آیا اور حضرت حق سبحانہ تعالیٰ پوری فرما دیتے تھے، لیکن بال بچوں کے قصوں میں پڑنے کے بعد اب یہ حالت نہیں رہی ہے، دعا قبول تو ہوتی ہے لیکن کچھ تاخیر کے ساتھ سلطان التارکین نے عرض کیا کہ مریم علیہا الصلوٰۃ کے متعلق بھی قرآن میں ہے کہ جب تک عیسیٰ علیہ السلام نہیں پیدا ہوئے تھے، من عند اللہ رزق ان کے پاس آجاتا تھا لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں تو اسی رزق کے لیے ان کو ھزی الیک بجذع النخلۃ (ہلا اپنی طرف کھجور کے درخت کو) کا حکم دیا گیا یعنی اسباب خواہ جیسے کچھ ہوں ان کی، وہ محتاج ہو گئیں، اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کا طریقہ تدبر فی القرآن

مناسب معلوم ہوا کہ مشائخ چشت میں تلاوت قرآن اور تدبر قرآن کا جو طریقہ تھا، اُس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

اب میں پھر اُسی مضمون کی طرف واپس ہوتا ہوں مطلب یہ ہے کہ یہ تو شیخ کبیر کی وصیت تھی۔

وصیت کی تعمیل

میں نے عرض کیا تھا کہ ۶۶۹ھ سنہ ہجری ۲۵ جمادی الاولیٰ نماز جمعہ کے بعد شیخ کبیر نے سلطان المشائخ کو حفظ بالقرآن اور "ہند گیری" کی مہم کی خدمت سپرد کی تھی، اس کے بعد کیا ہوا؛ خوش قسمتی سے اس سلسلہ کی بعض چیزیں میر خورد صاحب سیر الاولیاء کے ذریعہ سے ایسی مل گئی ہیں جو سلطان المشائخ کی خود نوشتہ یادداشت سے ماخوذ ہیں، جمادی الاولیٰ کا مہینہ تو گویا گذر ہی چکا تھا، دو مہینے بعد یعنی جمادی الثانیہ، اور رجب کے بعد پہلی شعبان کو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی خدمت میں میری طرف سے دعا کی یہ درخواست پیش ہوئی، میر خورد نے ان ہی کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

"از برائے آں کہ کاتب در بدر خلق نہ گردد" ص ۱۲۳

عجب درخواست اہم اتنی بڑی سپرد کی گئی ہے، کہ سارے ہندستان پر قبضہ کرنا پڑیگا، اور شرط یہ لگائی جاتی ہے کہ کسی مخلوق کے دروازے پر مارا مارا نہ پھرنا پڑے، آج اس کا تصور کون کر سکتا ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ اس مہم میں مشغول ہونے کے بعد سلطان المشائخ کے لیے اس کا موقع تو کہاں تھا کہ اب کسی کی وہ ملازمت کرتے، ملازمت کی آمدنی ہو یا کسی اور ذریعہ کی انفرادی آمدنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اتنی بڑی اہم خدمت کی سرانجامی کے لیے جسے بعد کو سلطان المشائخ نے انجام بھی دی اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن چندوں کا تو دروازہ کھلا ہوا تھا سلطان المشائخ اس کو بھی برداشت کرنا نہیں چاہتے، سب کچھ ہو جائے اور کسی مخلوق کے دروازے

Marfat.com

پر بچھنا بھی نہ پڑے، یہی ان کی درخواست تھی، فرماتے ہیں کہ شیخ نے درخواست قبول فرمائی

"باجابت دفاتحہ مقرون فرمود"

"فاتحہ" یہ اس زمانہ کا دستور تھا، کہ جب کوئی کسی کے لیے دعا، کرتا تھا تو سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعا کی جاتی تھی، اسی بنیاد پر محاورہ ہو گیا تھا کہ کسی دوسرے سے جب کوئی دعا، کی درخواست کرتا تو یہی کہتا کہ "برائے من فاتحہ بخوانید"

بہرحال یہ تو اس دن کا قصہ ہوا، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ایک خاص موقعہ پر شیخ کبیر نے یہ بھی فرمایا کہ

"من از خدا خواستہ ام کہ ہرچہ از خدائے بخواہی بیابی"

اور اپنی عصا بھی ان کے حوالہ کی، سلطان المشائخ کا بیان ہو کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شیخ کبیر حجرہ میں چلے گئے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ

"درحجرہ سر برہنہ کردہ و بشرہ متغیر کردہ، می گشت"

یعنی سر سے ٹوپی اُتار کر شیخ کبیر حجرہ میں ٹہل رہے تھے چہرہ متغیر تھا۔ فرماتے ہیں کہ اسی خاص حال میں سُن رہا تھا کہ ایک خاص کیفیت کے ساتھ شیخ کبیر کی زبانِ مبارک پر یہ اشعار جاری ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم ۔۔۔ خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی ۔۔۔ از بہر تو میرم از برائے تو زیم

گویا آیت قرآنی

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ ۔۔۔ میری نماز، عبادت، میری قربانیاں، میری زندگی میری موت، اسی اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پالنے والا ہے۔

کا ترجمہ ہو رہا تھا، سلطان جی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب یہ اشعار ختم ہو گئے تو شیخ کبیر

"سر بسجدہ نہاد، چند کرت (بار) من مثل این دیدم"

جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ کسی کے قدموں پر بار بار شیخ کبیر سر رکھتے تھے اور اُٹھاتے تھے، یہ کیا ہو رہا تھا، کیا اس کے لیے جس نے دعا کرائی تھی کہ "در بدر خلق نہ گردد" اُسی کو "در بدر گردی" کی جھنجھٹوں سے نجات کی تدبیر بتائی جا رہی تھی!

سیر الاولیا ہی میں دوسری جگہ سلطان المشائخ کے خلیفہ اعظم حضرت چراغ دہلوی کے حوالہ سے شیخ کبیر کے ایک قول کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کبیر کے منسوب وابستوں میں شیخ جمال الدین ہانسوی تھے اُنہوں نے کسی شخص کے ذریعہ سے شیخ کبیر کو کہلا بھیجا تھا کہ آج کل ذرا تکلیف اور ضیق میں گذرتی ہے، شیخ کبیر نے جواب میں کہلا بھیجا تھا

"چوں ولایت بکسے دادہ شود اورا واجب ست استمالت آں ولایت" ص۱۸۰

جس کا ظاہر مطلب تو یہ تھا کہ آدمی کو جہاں کی حکومت ملتی ہے، چاہیے کہ اُس ملک کے باشندوں کی دل دہی کرے، اور ان کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے۔

چراغ دہلوی سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ تو دنیا کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ ہے تو کیا دین کے بادشاہوں کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ شیخ کبیر کے اس فقرہ کا جو واقعی مطلب تھا چراغ دہلوی نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"استمالت ملوک آخرت توجہ القلب الی اللہ من کل الوجوہ"

یعنی آخرت کے بادشاہوں کو بھی "استمالت" سے کام لینا پڑتا ہے لیکن وہاں کے باشندوں کے قلوب کو نہیں بلکہ قلوب جس کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگانا ہے آخرت کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ قرآن کا تاریخی بیان ہے کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ	نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول مگر یہ
إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا	کہ ہم نے وحی کی اس رسول کی طرف اس
فَاعْبُدُونِ (سورۃ الانبیاء)	بات کی "نہیں ہے کوئی الٰہ" مگر میں "تو مجھی کو

Marfat.com

خاتم الرسل اور خاتم الرسل سے پہلے جو بھی آخرت کی بادشاہت کا پیغام لے کر آئے یہی کہتے تھے کہ اللہ سوا کوئی نہیں ہے جسے "الٰہ" بنایا جائے۔ سن کل الوجوہ قلب کی ساری توجہات کا ساری آرزوؤں کا ساری تمناؤں کا مرجع خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کی ذات مبارک ہی ہو۔ اپنی "ہندگیری" کی مہم میں سلطان المشائخ نے دراصل اسی قوت کی درخواست کی تھی، شیخ کبیر اپنے طرز عمل سے بھی بتا رہے تھے کہ اس قوت سے کام لینے اور استفادہ کا کیا طریقہ ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں نے شیخ کبیر شکر گنج کو دیکھا کہ بار بار وہ سجدے میں سر رکھتے ہیں اور اٹھاتے ہیں، ان پر ایک خاص حال طاری ہے، تو مجھ سے رہا نہ گیا، اور بے اختیار مضطربانہ حجرہ میں داخل ہو گیا، اور حضرت کے قدموں میں لوٹنے لگا، ایک عجب جلال کا عالم تھا، اس وقت فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے لیے دعا کی جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کی دعا کی اس وقت درخواست کی تھی فرمایا۔ "استقامت خواستم"

لا الٰہ الا اللہ پر استقامت ہی کا وہ نشہ تھا جو شیخ کبیر کی صحبت نے سلطان المشائخ میں بھرا تھا۔

ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دار السلطنت دلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں، جہاں نیچے سے اوپر تک بے شمار جھوٹے الٰہ پرا جمائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جس کی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سے سر جدا کر رہی ہے، وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جاتے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں، اور جن جن ذرائع سے یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں، سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں، آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے، کچھ نہیں تو قضاء کے عہدے سے لے کر شیخ الاسلامی اور صدر جہانی کے خدمات تک

کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پار ہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جوالہ ان کو مل چکا تھا، سینہ اسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی، قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی، جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے

"ایمان کسے تمام نہ شود تا ہمہ خلق در نزدیکی او ہم چو پشک شتر ننماید" سیر الاولیاء ص۵۵

مجلس مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا، جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لیے ساری ساری رات نمازیں پڑھتا تھا، اپنی ان ہی نمازوں کو نگاہ خلق میں حصول عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا، جامع ملفوظات راوی ہیں کہ

"دریں میان خواجہ ذکر اللہ بالخیر چشم پر آب کرد و بر لفظ مبارک راند کہ بسوز اول شیخ الاسلامی را دپس خانقاہ، را بعد از اں خود را" فوائد الفواد ص۲۳

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ کو جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے پہلے بداؤں پہنچے، والدہ اور ہمشیرہ، گھر میں اور جو لوگ تھے سب کو ساتھ لے کر جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایۂ تخت میں پہنچ گئے۔

دلی میں جب آپ شروع شروع قیام کے ارادے سے پہنچے ہیں۔ اور اس ارادے سے کہ سب کچھ ہوگا، لیکن کسی مخلوق کے دروازے پر جانا نہ پڑے۔ آخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ　　کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے

۱؎ میں نے بھی مختلف مقامات پر شیخ کبیر اور سلطان المشائخ دونوں حضرات کی طرف خانقاہ کا انتساب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشائخ چشت کی منجملہ اور خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اصطلاحی صوفیوں والی خانقاہ کا نظام ان کے یہاں نہ تھا، فوائد الفواد میں شیخ کبیر کا قول سلطان جی نے نقل کیا ہے "پیراں مارا رسم خانقاہ نبود ص۹" اس لیے جہاں جہاں میں نے خانقاہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے باضابطہ خانقاہ نہ سمجھا جائے ٹھیک جیسے اس چشتی ملک ہندوستان میں باضابطہ مدارس کم تھے ۱۲۔

Marfat.com

لَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا	اور تم سے پہلے جو گذرے ہیں ان جیسی باتیں
مِنْ قَبْلِکُمْ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَ	تم پر نہ آئینگی اُن کو سختی اور دُکھ نے چھوا، وہ
الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ	جھنجھوڑے گئے، خوب اچھی طرح جھنجھوڑے گئے
الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ	تا اینکہ بول اُٹھے پیغمبر اور ایمان والوں میں جو
مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؕ	ان کے ساتھ تھے، کب اللہ کی مدد ہو

تفصیلات دیکھنا ہو، تو سیر الاولیاء میں دیکھیے، جس میں میر خورد نے براہ راست اپنے والد میر مبارک کرمانی کے حوالہ سے اس زلزال شدید (سخت جھنجھوڑ) کے ان تفصیلات کو نقل کیا ہے، جن سے حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کو گذرنا پڑا، خلاصہ یہ ہے کہ ابتداءً دلی میں "سرائے نمک" کے نام سے کوئی سرا تھی، وہاں کچھ دن ٹھہرے، پھر امیر خسرو کی کوشش سے ان کا ننھیالی مکان جو راوت[1] عرض کے مکان سے مشہور تھا، یہاں قیام رہا۔ یہ مکان آرام بخش تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ "سہ پوشش داشت" یعنی سہ منزلہ مکان تھا، درمیانی منزل میں سلطان المشائخ کا قیام تھا، باقی اوپر اور نیچے والے حصہ میں آپ کے وابستگان میں سے کچھ لوگ رہتے تھے، جن میں میر خورد کے والد کا خاندان بھی تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد راوت عرض کے لڑکے اضلاع سے آگئے اور انہوں نے شباشب مکان خالی کرالیا۔

لکھا ہے کہ سراج بقال کی دکان کے پاس کوئی مسجد تھی، اسی مسجد میں کوئی علیحدہ "چھپر دار" تھا، غالباً سائبان ہوگا، وہاں رہنا پڑا، وہاں سے اُٹھے تو رکابدار کی سرائے میں کچھ دن قیام رہا، پھر کوئی محمد میوہ فروش کی دکانوں سے متصل کوئی شخص شادی گلابی کا مکان تھا، وہاں رہے، الغرض یونہی آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، دلی میں قیام کی صورت تھی[2] لیکن با ایں ہمہ پراگندہ خاطری، سلطان المشائخ کس مشغلہ میں مصروف تھے، میر خورد

---

[1] واللہ اعلم "راوت" کا لفظ کیا ہے۔ اعظم گڈھ بہار میں "روتاڑا" شیوخ کا ایک بڑا قبیلہ آباد ہے۔ کہا یہ "تاڑا" کا لفظ اسی "راوت" سے بنایا گیا ہے۔ تاڑا تو ہندی میں غالباً خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں ۱۲۔ دیکھو حاشیہ ۲ بر صفحہ ۱۵۲

نے لکھا ہے

"دراں ایام اتفاق ماندن در شہر نہ بود"

پھر کہاں رہتے تھے، سیر الاولیا، اور فوائد الفواد دونوں ہی میں آپ کا ہی بیان ہے کہ

"بر سر حوض قتلغ خاں بودم"

شہر سے باہر قتلغ خاں کا کوئی تالاب تھا، اسی تالاب کے کنارے زیادہ وقت گذرتا تھا، کس چیز میں گذرتا تھا؟ خود فرماتے ہیں:۔

"دراں ایام قرآن یاد می گرفتم" ص ۱۱۰

یعنی سب کچھ گذر رہا تھا، لیکن شیخ کبیر کی وصیت کی تکمیل کی دھن تھی، جو آپ کو دیا گیا تھا، من کل الوجوہ قلب کو اسی سے متعلق کرتے ہیں" یقین" کے اس نسخہ سے زیادہ مقوی نسخہ اور کیا ہو سکتا تھا، اور سچ پوچھیے تو گو اپنی جامعیت کے لحاظ سے قرآن میں وہ سب کچھ ہے جس کی تشریحی شکل کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، بار بار قرآن میں جن چیزوں کو دُہرا دُہرا کر بیان کیا گیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں یہی دو مقدمات ہیں۔

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کے دعوے میں سچے ہیں۔

(۲) اور دوسری بات یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، وہی ایاک نعبد (ہم تجھی کو پوجتے ہیں) وایاک نستعین (تیری ہی اعانت ہم چاہتے ہیں) وہی معبود وہی ہر حاجت اور ہر ضرورت کا مستعان ہے۔

پہلے مقدمہ پر یقین اور وثوق کی بنیاد قائم ہے اور اس بنیاد پر جس علم کو بنی آدم کے لیے

(حاشیہ صفحہ ۱۵۱) ۱؎ ان تفصیلات کا تذکرہ میں نے ایک اور مقصد سے بھی کیا ہے اس زمانہ (یعنی ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی) میں دلی اور دلی کی زندگی طریقہ بود و باش و تعمیر وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سہ منزلہ مکانات بھی بن گئے تھے، چھپر کی مسجد بھی ہوتی تھی، مسلمان بھی بقالی، میوہ فروشی، گلاب فروشی وغیرہ کے پیشے اس زمانہ میں کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ ۱۲۔

قدرت سب سے زیادہ یقینی قرار دینا چاہتی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارا الٰہ ہمارا معبود و مستعان اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ساری ضرورتوں ساری حاجتوں کا واحد مستعان کسی مخلوق کی ذات نہیں بلکہ خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی ذات بے ہمتا ہے تو اس کو چھوڑ کر جو اپنی حاجتوں کے لیے جہاں بھی جاتا ہے، قدرت کے قانون سے ٹکرا کر جا رہا ہے، قدرتی قوانین سے ہٹنا اور ٹکرانا اسی کا نام تو ظلم ہے، مقررہ حدود سے تجاوز ہے، یہی مطلب ہے تسبیح یونسی

لا الٰہ الا انت — یعنی الٰہ آپ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، آپ کی الوہیت میں

سبحانک انی کنت — کوئی دوسرا شریک ہو، اس سے آپ کی ذات پاک ہے، تو

من الظّٰلمین — میں ہی ظالم تھا کہ جو الٰہ تھا اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتا رہا جو الٰہ نہ تھے۔

کہا ان جن دلوں کو اپنے حقیقی الٰہ یعنی اپنی حاجتوں ضرورتوں اپنے رجحانات و میلانات سب کا مرجع حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی نظر آتی ہے، ایسے سارے فطری مطالبات کی تکمیل کا سرچشمہ صرف اسی علی کل شئ قدیر کی قوت بن جاتا ہے، ایسے قلوب میں طلب حق کی جو آگ بھڑکتی ہے، بقول سلطان المشائخ

ایں آتش جمیع اخلاق رزیلہ و ذمیمہ سوختہ می شود، وصفا پیدا آید و شایان محبت حق گردد (سیر ص ۳۶)

اسی لیے مشائخ چشت کو آپ جو پاتے ہیں، کہ اخلاق اور اس کے اقسام رذائل و فضائل مہلکات و منجیات اور ازیں قبیل تصوف کے دوسرے مسائل پر انھوں نے کتابیں لکھی ہی نہیں[1]۔ یا لکھی ہیں تو مختصر اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بات کو طول دینے کی انھوں نے

[1] فوائد الفواد میں ہے کہ سلطان جی کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ اودھ میں ایک صاحب نے مجھے کتاب دکھائی اور کہا کہ حضرت والا کی لکھی ہوئی ہے فرمایا اس نے سچ کہا ہے نہ نوشتہ ام عجب شان ہے نہ کتاب ہے نہ خانقاہ لیکن نام کتاب والوں اور خانقاہ والوں سے بھی زیادہ کر گیا ۱۲

ضرورت ہی محسوس نہیں کی "اللہ" کے لفظ کو سمجھاتا، یعنی جیسا کہ مولانا روم نے سیبویہ کے حوالہ سے اللہ کے معنی

یولھون فی حوائجھم الیہ — یعنی "الہ" اس کو کہتے ہیں جسکی طرف انتہائی ولہ اور وارفتگی کے ساتھ لوگ اپنی حاجتوں میں رجوع کریں۔

نقل فرمایا ہے، بس اسی کا تحقق، اسی کی یافت کہ حاجتوں میں جس کی طرف گڑگڑا کر بلبلا کر آدمی ٹوٹ پڑے وہ ارحم الراحمین رب و دود، رحیم کے سوا کوئی نہیں ہے، جس نے اس کو پالیا، سب کچھ پالیا، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ چشتیہ طریقہ کی بنیاد ولہ اور عشق پر مبنی ہے گویا ؏

سو علاجوں میں یہی ایک علاج اچھا ہے

بہرحال دلی میں سلطان المشائخ کی گذر رہی ہے، قرآن ہے قتلغ خان کا تالاب ہے اور وہ ہیں۔ آئندہ کیا ہوگا "ہندگیری" کی مہم سر کرنے کے اسباب کیا پیدا ہونگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجز ایک الٰہی تدبیر کے اور کسی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زلزال شدید کا یہ زمانہ مہینوں اور دنوں کا تھا۔ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال اس حال میں گذر گئے اور وہ گذارتے رہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان دنوں میں ان پر کیسی کیسی سخت گھڑیاں گذر گئیں۔ میر خورد نے آپ ہی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ

کہ در عہد غیاثی (غیاث الدین بلبن) کہ دراں وقت در دو جیتل[1] نے خربزہ بود، لیکن بیش تر از فصل گذشتہ بود کہ من خربزہ نہ چشیدہ بودم"

اور خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں سننے کی بات تو آگے کی ہے۔

"براں خوش می بودم و آرزو می بردم کہ اگر باقی فصل ہم خربزہ خوردہ نہ شود نیکو باشد" [ص ۱۱۳]

اور جب "ہرانچہ ساقی من ریخت" میں کسی کو لطف آجاتا ہے تو پھر اس کا یہی حال ہوتا ہے، توحید

---

[1] شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے کسی جگہ میں نے جیتل کا ترجمہ دمڑی کیا ہے، اور دمڑی پیسہ کی چوتھائی کو کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کرنا چاہیے کہ اس وقت کی چیزوں کا بھاؤ کیا تھا ۱۲۔

Marfat.com

کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں جن سے موحد لذت گیر ہوتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دل دوز جگر خراش وہ واقعہ ہے جو آپ ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج ہے کہ

"فرمود، یک شبانہ روز گذشتہ بود و شب دیگر آمدہ نصفے ہم گذشتہ کہ چیزے نخوردہ بودم" ص۴۵

اور یہ ارزانی کے کس زمانہ کی بات ہے، خربزوں کا حال تو سُن چکے کہ دو جیتل میں ایک من کے حساب سے دلّی میں بک رہے تھے، اب جو ایک دن ایک رات اور پھر دوسرے دن کی بھی آدھی رات اس شان سے گذری کہ "چیزے نخوردہ بودم" اس وقت کی ارزانی یہ تھی کہ

"دراں ایام بہ یک جیتل دو سیر نان میدہ می دادند" ص۲۵

جس کے معنی یہ ہوئے کہ پکی پکائی گیہوں کی دو سیر میدہ کی روٹی ایک دمڑی میں ملتی تھی لیکن اس ارزانی کے باوجود جو "البأساء" "والضراء" کی کسوٹی پر پرکھا جارہا تھا، اس کا حال یہ تھا کہ

"مرا یک دانگ ہم نہ بودے تا نان ہم بخورم"

اور خود یہ کیفیت اکیلے تنہا آپ ہی کی ذات پر نہیں گذر رہی تھی، بلکہ خود فرماتے ہیں۔

"والدہ و ہمشیرہ من و دیگر آدمیاں خانہ کہ در مؤنت من بودند ایشاں را ہم ہمیں حال بود" ص۱۱۳

(زیر پرورش)

اور ظاہر ہے جیسا کہ سلطان المشائخ سے ہی سیر الاولیاء میں ان کا یہ قول منقول ہے کہ درویشوں کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے یعنی

"برود معنوی کہ ظاہر خود در الطریق مشغولاں حق می نماید و باطن در بدر می گردد"

قلب کی اس کیفیت کے متعلق جس کا خیال ہو۔

"نعوذ باللہ کہ کسے را ایں معاملہ باشد"

کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی دوسرا خیال قائم کرسکتا ہے، بلکہ جہاں تک واقعات و حالات سے معلوم ہوتا ہے "یہ عہد زلزالی" عام اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ زیادہ تر شیخ کبیر شکر گنج

سلہ عہد اسلامی میں ہندوستان نے کن ارزانیوں کا لطف اٹھایا، میرے خیال میں اس سے بہتر شہادت کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی ہے۔ شہادت ادا کرنے والے سلطان المشائخ ہیں۔ اور جس کتاب سے شہادت نقل کی گئی اس کے مصنف سلطان المشائخ کے مرید ہم زمانہ ہیں ۱۲۔

Marfat.com

رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کی تکمیل ہی میں گذرتا تھا، غالباً یہ اشتغال بالقرآن ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ آپ پر یہ حال طاری ہوگیا تھا جس کا ذکر بعد کو فرمایا کرتے تھے کہ

"در مہد، حال با خود جزم کردہ بودم کہ نہ کتابے بنویسانم و نہ بہ بہار قیمت) بستانم" سیر ۱۴۵

گویا قرآن کے سوا نہ کچھ پڑھنا چاہتے تھے نہ کسی سے کچھ سُننا چاہتے تھے۔ شیخ نے یہی کتاب حوالہ کی تھی، اسی کو پی رہے تھے، پیتے جارہے تھے، بالآخر پیغمبر کے اس نسخہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا، یعنی حدیث میں جو آیا ہے، حدیث قدسی ہے، ترمذی اور دارمی اس کے راوی ہیں۔

من شغلہ القرآن عن	"القرآن" میں مشغول ہونے کی وجہ سے اگر کسی کو
ذکری ومسئلتی اعطیتہ	ذکر یا دعا کا موقعہ نہ مل سکے، تو میں اس کو دعا کرنے
افضل ما اعطی السائلین	والوں اور مانگنے والوں سے دیے مانگے ہی بہت
	زیادہ کرکے دیتا ہوں

سلطان المشائخ نے اس حدیث کا ایسا زندہ تجربہ پیش کیا ہے کہ جس کے چرچوں سے چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی ہندوستان کے گلی کوچے معمور ہیں، آج بھی ان کے دسترخوان کا تذکرہ لذت بخش کام و دہن بنا ہوا ہے، اور ایک دسترخوان کیا پھر خدا نے ان کو جس جاہ و جلال کے ساتھ اسی دلی میں رکھا، سب جانتے ہیں کہ سلاطین وقت کو بھی اس پر رشک آتا تھا، جس کی تفصیل کا نہ یہاں موقع ہے اور جس مقصد سے میں نے ان کے حالات کے تذکرہ میں ایک خاص قسم کی تفصیل سے کام لیا ہے، اس مقصد کے رو سے نہ اس کی ضرورت ہے۔

بہرحال یہ تو معلوم نہ ہوسکا، کہ حفظ بالقرآن کی وصیت کی تکمیل کا موقعہ آپ کو کتنے دنوں میں میسر آیا، تاہم اس کے تو بیسیوں قرائن ہیں کہ آپ نے کامل قرآن اسی عمر میں زبانی یاد کرلیا، فوائد الفواد میں بچپن کے اُستاد جن کی فیض بخشی مشہور تھی، ان کا ذکر کرتے

Marfat.com

ہوئے آپ نے فرمایا کہ

"بہ برکت آں قرآں یاد شد" ص ۱۵۴

اگرچہ اس کے بعد آپ کا وہ ارادہ کہ نہ کوئی کتاب لکھواؤنگا اور نہ خریدونگا باقی نہ رہا، اور نہ اس کو رہنا چاہیے تھا کہ وہ بہرحال ایک کیفیت تھی، جو آتی ہے اور گذر جاتی ہے سلطان المشائخ کا ادبی مذاق فارسی زبان کا طبعی تھا۔ اس لیے علاوہ دینی کتابوں کے کبھی کبھی ادبی کتابیں بھی دوسروں سے سنا کرتے تھے، اور امیر خسرو کی شاعری کے پیچھے تو سچ پوچھیے سلطان المشائخ ہی کی شعریت چھپی ہوئی ہے جس کا ظہور ان کے "ترک اللہ"[۵] کے ذریعہ سے ہوا، میر خورد نے لکھا ہے

"امیر خسرو درایام آغاز شعر گفتن بود ہر نظمے کہ گفتے بخدمت سلطان المشائخ گذرانیدے تا روزے حضرت سلطان المشائخ فرمود بہ طرز صفاہانیاں گوی"

کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں امیر نے ایسی شاعری شروع کی جس میں حقیقت کا اظہار مجاز کے پردہ میں کیا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے

دیوان جنداونسی برابر قاضی معزالدین پانچہ پدر مولانا رفیع الدین پانچہ بخدمت سلطان المشائخ بتمام گذرانید و رموز اشارات آں را تحقیق کرد" ص ۳۰۱

واقعہ یہ ہے کہ سلطان جی سے اگر ہندوستان کو اور کچھ نہ ملتا، صرف امیر خسرو ہی ملتے تو اس ملک کی سپاس گذاری اور منت شناسی کے لیے یہی کافی تھا لیکن باوجود ان مشاغل کے کبھی قرآن سے جو آپ کا تعلق تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ آپ جب کبھی حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر کے متعلق اس مشہور قصہ کا ذکر فرماتے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو جن سے بے تعلق ہو چکے تھے ایک دفعہ اٹھا کر چاہا کہ مطالعہ کریں، غیب سے آواز آئی "ابوسعید عہدنامہ بازدہ حضرت سلطان المشائخ اس قصہ کا ذکر فرماتے۔ ملا سجزی راوی ہیں کہ

---

۵ امیر خسرو کا یہ مشہور خطاب [illegible] پیر سے ان کو ملا تھا۔

Marfat.com

چوں بریں حرف رسید بگریست واین دو مصرعہ بر زبان مبارک راند ؎

تو سایہ دشمنی کجا در گنجی   جائے کہ خیال دوست زحمت باشد فوائد ص ۹۱

قرآنی ذوق کا یہ حال تھا کسی طرف سے ذرا خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی آواز آئی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ۔ ؎ بقول امیر خسرو۔

"از شنیدن آں حالے و ذوقے و شوقے پیدا شد" ص ۲۷۶

اسی طرح آپ کے دست گرفتوں میں جن لوگوں کی موزوں طبیعتیں تھیں، آپ شعر گوئی سے ان کو منع تو نہیں فرماتے بلکہ آپ دیکھ چکے کہ امیر خسرو کی شاعری کو تو آپ ہی نے راہ پر لگا دیا خود ان کے دواوین کو سنا اصلاح اور مشورے دیے لیکن اسی کے ساتھ اس کی کوشش فرماتے تھے کہ شاعری کا ذوق قرآنی ذوق پر جو طریقہ چشت کی خصوصیت خاصہ ہی، اس پر غالب نہ آئے، حسن علا سنجری نے فوائد الفواد میں لکھا ہی کہ۔

بندہ عرضداشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید ص ۳۹۲

پھر اپنی حالت عرض کی میری غرض تو یہ تھی کہ ادبی حوصلہ افزائیوں کے ساتھ ساتھ قرآن کے ساتھ جو خصوصی تعلق اپنے وابستوں کا حضرت رکھنا چاہتے تھے، اس کا ثبوت پیش کروں اور یہ بات "بارہا" کے لفظ سے ظاہر ہی۔

اسی "بارہا" اصرار ہی کا نتیجہ وہ تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسا مکثر شاعر جن کی کتابوں کے متعلق لوگوں کا خیال ہی کہ نتو تک پہنچ گئی ہیں روزانہ تہجد میں سات پارے اس طریقے سے پڑھتے تھے جس سے ان پر تلاوت کے آثار طاری ہوتے تھے۔

ایک غلطی جو غالباً صدیوں سے چلی آتی ہی اس کے ازالہ کے لیے کیا کروں مجبوراً مجھے طوالت سے کام لینا پڑ رہا ہی، ورنہ لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا، اور حضرت نظام المشائخ ہی کے گرد و پیش کے واقعات، ان کی خانقاہ جو جماعت خانہ کے نام سے موسوم تھی،

Marfat.com

اگر اسی کا حال غور سے پڑھتے تو ان پر کھل سکتا تھا، کہ اس کا سارا ماحول تلاوتِ قرآن سے بھرا ہوا تھا، بلکہ کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے، کہ ان کا جماعت خانہ دراصل ایک قسم کا مدرسۃ الحفاظ تھا واقعہ یہ ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ سلطان المشائخ نے آخر وقت تک تجرد کی زندگی گذاری اکن مصالح نے ان کو اس مسلک کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا، جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تاہل سے افضل ہے، ظاہر ہے کہ میری بحث سے یہ اس وقت خارج ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بظاہر وہ تاہل کے جھنجھٹوں سے آزاد تھے، لیکن جس کے دل کا حال یہ ہو جیسا کہ حضرت کے خادم خواجہ عبدالرحیم سحری کھلانے والے صاحب کا بیان ہے کہ باوجود عموماً روزہ رکھنے کے سحری برائے نام ہی آپ کے پاس آتی تھی، خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ

عرضداشت می کردم کہ مخدوم وقت افطار ہم طعام کمتری می خورد، اگر طعام سحر ہم اندکے تناول کند حال چہ شود وضعف قوت گیرد"

خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ میری اس عرضداشت پر

دریں محل بگریستے وگفتے چندیں مسکیناں و درویشاں در کنجہائے مساجد و دکانہا گرسنہ وفاقہ زدہ افتادہ اند ایں طعام در حلق من چگونہ فرو رود (سیر الاولیاء ۱۲۸)

روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے، خواجہ عبدالرحیم بیچارے سحری جیسی کی ویسی اٹھالیتے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس کے سینہ میں ایسا دل رکھا گیا ہو، وہ اصطلاحی تاہل کے خرخشوں سے اگر آزاد بھی رہا تو کیا واقعی اُسے آزادی میسر آسکتی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ دلی

۱؎ عجیب بات ہے کہ دن کے روزے اور رات کے کھانے کا یہ حال، افطار میں سبزی یا تلخ کریلے کے ساتھ روٹی آدھ روٹی پر کفایت لیکن باوجود اس کے عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ

چوں روز شدے ہر کرا نظر بر جمال مبارک سلطان المشائخ افتادے تصور کردے کہ مستی طاغ است وچشمہائے مبارک سُرخ بودے از بیداری شب" (سیر الاولیاء ص ۱۲۸)

کہتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کا مشہور شعر

تو شبانہ می نمائی بہ برے کہ بودی امشب \
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

اسی لاہوتی کیفیت کی تصویر ہے ۱۲۔

نہیں پچاس ساٹھ سال تک جس کا دسترخوان الوانِ نعمت ہزار ہا ہزار انسانوں کو تقسیم کرتا رہا۔ اس تقسیم سے اس کی کیا نیت تھی، یقیناً اس زمانہ کے غربا تک سلطان المشائخ کے ذریعہ سے وہ نعمتیں پہنچائی گئیں جن کا وہ بیچارے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اور کیا معلوم کہ اللہ والوں کے کام کے پیچھے کس قسم کی نیتیں پوشیدہ رہتی ہیں، خیر یہ تو ایک طویل قصہ اور مستقل بحث ہے، مجھے اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود غیر متاہل ہونے کے علاوہ ان عام لوگوں کے جو روزانہ بعد مغرب سلطان المشائخ کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے، جن کی تعداد کبھی کبھی سیکڑوں سے متجاوز ہو جاتی تھی، ان عام لوگوں کے سوا آپ کی خصوصی تربیت اور نگرانی میں مختلف خاندانوں کے بچے پرورش پاتے تھے، آپ ہی ان کے قیام و طعام و لباس و تعلیم اور دیگر ضروریات کے متکفل تھے، ان بچوں میں حضرت شیخ کبیر شکر گنج کے نواسے خواجہ محمد، خواجہ موسیٰ، خواجہ عزیز الدین، شیخ کمال الدین وغیرہ تھے، جن کے والدین کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا تھا، اور سلطان المشائخ نے سب کو دلی بلا کر اپنے زیر پرورش فرما لیا تھا، یوں ہی، آپ کے بھانجوں یعنی بہن کے بچوں کا ایک گروہ تھا جن میں خواجہ رفیع الدین ہارون، خواجہ تقی الدین، خواجہ ابوبکر مصلّی دار، مولانا قاسم، خواجہ عزیز الدین بن خواجہ ابوبکر مصلّی دار اور ان کے سوا بھی بعض دوسرے شریف خاندان کے بچے تھے، جن کا اقامت خانہ سلطان المشائخ کا جماعت خانہ تھا۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا، ان سب کی تعلیم و تربیت بھی حضرت والا کی خاص نگرانی میں ہوتی تھی، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا، اور اس سے حضرت سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق اور شغف کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ہر بچے کو التزاماً سلطان المشائخ نے قرآن مجید حفظ کرایا، خصوصیت کے ساتھ حفظ کے اس کام کو آپ نے مولانا علاء الدین اندپتی کے سپرد کیا تھا، میر خورد نے لکھا ہے

مولانا علاء الدین اندپتی کہ در غایت بزرگی بود و علوم بسیار و فضائلِ بے شمار داشت،

Marfat.com

وحافظ کلام ربانی واقربائے سلطان المشائخ بیشترے ازاں بزرگ حافظ شدند

(سیر الاولیا، ص ۳۱۶)

سلطان المشائخ کے چھوٹے بھانجے[1] تقی الدین نوح جب کبھی حضرت والا کی مجلس میں آجاتے تو لوگوں سے فرماتے۔

---

[1] ان کے بڑے بھائی کا نام رفیع الدین ہارون تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ "بواسطہ شفقت سلطان المشائخ حافظ کلام ربانی گشتہ" ان کی ایک خاص خصوصیت میر خورد نے یہ بتائی ہے کہ "در تیر و کمان و سباحت و شناوری و کشتی ہو سے تمام داشت" لکھا ہے کہ ان کے اس رجحان کو پاکر سلطان المشائخ ان کو اس قسم کے ملاعب سے روکتے نہ تھے جیسا کہ کچھ دن پہلے مسلمانوں میں دستور ہو گیا تھا، لیکن یہ دستور عہد موت کا تھا، زندگی کے دنوں میں سلطان المشائخ جیسی ہستی بجائے روکنے اور زجر و توبیخ کے

"از حال ایں ہنرہائے پسندیدہ کہ شرعاً مشروع ست بہ پرسیدے بلکہ غوامض ایں ہنرہا تلقین فرمودے"

سیر الاولیا، ص ۲۰۳

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بزرگوں میں اس قسم کی خود ساختہ سختیاں جن کے پچھلے دنوں مسلمان تربیت کے مسئلہ میں عادی ہو گئے تھے بہت کم تھیں، میر خورد ہی نے لکھا ہے کہ ان کے چچا سید حسین کی نوجوانی کا زمانہ تھا، اس خاص وضع میں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں "در آوان جوانی در عین کامرانی رو پاک (رومال) کشیدہ در سر بستہ و دستارچہ نازنین بر کتف مبارک انداختہ بطریق جواناں خراماں از در آمد" لیکن نوجوانی کی اس ترنگ کو دیکھ کر جو عمر کا اقتضا ہے، کیا سلطان المشائخ نے ان کو سامنے سے نکلوا دیا۔ لکھا ہے کہ

"دریں حال سلطان المشائخ فرمود کہ سید بیاو بنشیں و سعادتے بہ بہ"

پھر حسب دستور جس قسم کی باتیں فرمایا کرتے تھے ان سے اور چراغ دہلوی سے جو اس وقت سامنے بیٹھے تھے، کرتے رہے، میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ بزرگوں نے نوجوانوں کو نوجوانی کے حقوق عطا کرنے میں بشرطیکہ حدود شرع سے متجاوز نہ ہوں عموماً مسامحت برتی ہے، اصلاح کا یہی طریقہ مفید تھا، یہی صاحب سید حسین کا ایک زمانہ فیشن کا وہ تھا، کہ صرف پان خوری کی حالت یہ تھی۔

"یک ساعت از تنبول دہن خالی نبودے یعنی متواتر تنبول خوردے اگرچہ یک برگ بدہ تنکہ رسیدے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنبول خوری کی عادت مسلمانوں کو ہندوستان پہنچ کر ابتدائی صدیوں میں پڑ گئی تھی اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج بھی پان کھاتے تھے (ص ۱۹۴)، سلطان جی بھی عادی تھے، (ص ۱۴۴) بلکہ آپ نے پان کا نام ہی ابو الیاس رکھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ پان کھانے کے بعد پھر کسی چیز کے کھانے کی امید باقی نہیں رہتی، نمک کا نام آپ کے دسترخوان پر ابو الفتح تھا، دستور تھا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے لوگ نمکدانوں سے ایک انگلی نمک پہلے ضرور چکھ لیتے تھے تب کھانا شروع ہوتا تھا

Marfat.com

"یاراں ایں را عزیز دارید کہ ایں نیکو کسے ست"

نگران کی "نیک کسی" کی دلیل میں جو بات ارشاد فرمائی جاتی تھی وہ یہ تھی،

"ایں قران یاد دارد، و ہر شب آدینہ (جمعہ) ختم می کند" (سیر الاولیا ص۲۰۰ دفوائد الفواد

سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق کی یہ حالت تھی کہ آپ کے دسترخوان کا یہ دستور تھا کہ قبل کھانا شروع کرنے کے قرآن مجید کی کچھ آیتیں خوش الحانی سے کوئی قاری سُناتا عموماً یہ خدمت شیخ کبیر شکر گنج کے نواسوں حافظ محمد و حافظ موسیٰ کے سپرد تھیں، یہی دونوں بھائی نماز میں بھی عموماً امامت کرتے تھے۔ آواز میں بلا کا درد تھا، لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے جب قرآن پڑھا جاتا تو مسلسل سلطان المشائخ کی زبانِ مبارک سے "رحمت باد رحمت باد" (ص ۱۹۹) کے الفاظ بے اختیار نکلتے رہتے، آپ نے ان وابستگان دامن کے اندر قرآن کا وہ راسخ مذاق پیدا فرما دیا تھا کہ میر خورد کا بیان ہے کہ ان کے پھوپی زاد بھائی خواجہ عزیز الدین جن کی تعلیم و تربیت بھی سلطان المشائخ نے فرمائی تھی، اور دسترخوان کی قرأۃ جس کا نام ہی "دعا رمائدہ" تھا کبھی کبھی یہ بھی فرمایا کرتے، جیسا کہ قاعدہ تھا کہ سلطان المشائخ کی زیر نگرانی تعلیم پانے والے بچوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اُن کو بھی قرآن حفظ تھا میر خورد کی شہادت ہے کہ جب مرض الموت میں خواجہ عزیز الدین بیمار ہوئے تو

"دوسہ روز کہ زحمت (بیماری) بود یک ساعت لب مبارک از تلاوت

کلام اللہ بے کار نماندہ ہمدریں زحمت برحمت پیوست" ص ۱۹۹

واقعہ تو یہ ہے کہ سلطان المشائخ کو قرآن کے ساتھ جو غیر معمولی شغف پیدا ہو گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو اپنے ہر ایک مرید پر حفظ قرآن کے مسئلہ کو لازمی قرار دیدیتے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ کام آسان نہ تھا تاہم آپ کی کوشش یہی تھی کہ جس سے جتنا ممکن ہو، سلوک بالقرآن کے لیے قرآن زبانی یاد کرلے، خیال تو کیجیے حسن علا سنجری جو علاوہ شاعر ہونے کے ایک بڑے فوجی افسر تھے، اور اسی فوجی سلسلہ میں ان کو

دیوگیر (دولت آباد) آنا پڑا جہاں ان کا اب مزار ہے، عمران کی کافی ہو چکی تھی، جب شرف بیعت سے سرفراز ہوئے، شاعری کا جنون الگ سر پر مسلط تھا، لیکن آپ پڑھ چکے ہیں کہ حسن علا، کو حکم تھا کہ شعری ذوق کو کم کرکے قرآنی مذاق کو اپنے اوپر غالب کریں، جب یہ مذاق ان کا غالب ہو گیا، تو پھر ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس معمر سن رسیدہ مرید کو بھی آپ نے حفظ قرآن میں لگا دیا تھا، آپ ان سے دریافت فرماتے رہتے کہ "چہ قدر یاد کردہ" حسن کہتے ہیں کہ اس وقت تک ایک ثلث قرآن یاد کر چکا تھا۔ "ثلثے یاد گرفتہ ام" ارشاد ہوا

"دیگر ہا اندک اندک یاد گیر و یاد گرفتہ پیشینہ را مکرر می کن" فوائد الفواد ۔ص ۹۳

اور اس سے اس طریق کا بھی پتہ چلتا ہے جو حضرت والا نے سن رسیدہ ہونے کے بعد قرآن کو یاد کیا تھا، یہی واقعہ بھی ہے کہ اگر ایک ایک دو دو آیتیں بھی روزانہ آدمی یاد کر لیا کرے، اور ان ہی کے معانی کو اپنے اندر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھے، گھلاتا رہے تو حق تعالیٰ کے اس علم مقدس سے بتدریج سینہ میں جو روشنی پیدا ہوتی ہے، شاید کسی ذریعہ سے ممکن نہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے، آدمی کا دماغ بھی سلجھنے لگتا ہے، قرآن کی جو خاص منطق ہے، ذہن کو اس سے مناسبت ہونی لگتی ہے، ہر بات میں جو واقعہ ہے توازن کو قائم کرتے ہوئے آدمی اس میں غور کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، البتہ وہی بات جس کا صحیح حدیثوں میں بھی ذکر آیا ہے کہ محفوظ حصہ کی اگر نگرانی نہ کی جائے تو وہ فوراً نکل بھی جاتا ہے۔ اس لیے "یاد گرفتہ پیشینہ" کو مسلسل مکرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے حساب کیا ہے کہ اگر "اندک اندک یاد گرفتن" کے اصول کے تحت کوئی روزانہ ایک آیت بھی یاد کر لیا کرے، تو سات سال میں پورا قرآن اس کو محفوظ ہو جائیگا بہرحال کچھ میر حسن ہی کے ساتھ یہ خصوصیت نہ تھی، حضرت والا کے دست گرفتوں میں ایک بڑی جماعت حفاظ کی نظر آتی ہے، بعضوں کا تو عمر بھر یہی پیشہ

رہا کہ وہ قرآن لکھ کر زندگی گذارتے رہے، مولانا فخر الدین مروزی کے ذکر میں پہلے بھی اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

خود امیر خسرو جو تہجد کی نمازمیں روزانہ سات پارے پڑھتے تھے، ظاہر ہے کہ حفظ کے بغیر یہ ممکن نہ تھا لیکن مجھے اب تک ان کے کامل حافظ ہونے کی سند نہیں ملی ہے، بعض قرائن جن کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بلوغ کے بعد ہی اپنے محبوب شیخ کی اتباع میں قرآن یاد کیا تھا، ان کا تو عہدہ ہی شاہی دربار میں مصحف برداری کا تھا، گویا قرآن ہی میں معاش اور معاد دونوں کی فلاح حق تعالیٰ نے ان کی بلند قسمت کے لیے مقدر فرمائی تھی۔ امیر خسرو تہجد کی نمازمیں سات سات پارے پڑھتے تھے، اسی سے خیال گذرتا ہے کہ سلطان المشائخ کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں

چہار صد و پانصد رکعت نماز می گذارد (ص ۱۲۸)

گو صراحتہً اس کا ثبوت تو ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے لیکن خیال گذرتا ہے کہ جس قرآن کو سلطان جی نے یاد کیا تھا، اسی کو

"یاد گرفتہ پیشینہ را اگر کن"

کے اصول کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ان سیکڑوں نفلوں میں روزانہ پڑھ لیا کرتے ہونگے، اس سے نمازوں کے ساتھ ساتھ قرآن کی تازگی کا موقعہ بھی آپ کو مل جاتا ہوگا، واللہ اعلم بالصواب

بہر حال اب کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، سلطان المشائخ کے عہد میں دتی قرآن ہی قرآن سے بھر گیا تھا، بڑے بڑے شاہی عہدہ دار مقربان بارگاہ حکومت ہمیں اس زمانہ میں حافظ نظر آتے ہیں، امیر خسرو، حسن علا سنجری آخر یہ کون لوگ ہیں؟ انتہا یہ ہے کہ اس زمانہ میں دتی کے کوتوال (کمشنر پولیس) بھی حافظ تھے امیر خورد نے

Marfat.com

لکھا ہے۔

"مولانا ظہیر الدین کو تواں مندہ کہ حافظ کلام ربانی" (ص ۱۱)

اس عہد کے شاہی ولاۃ وحکام چونکہ زیادہ تر حضرت سلطان المشائخؒ ہی سے ارادت وبیعت کا تعلق رکھتے تھے، تو کیا تعجب ہے اگر طریقہ چشتیہ کا قرآنی مذاق ان حکام و ارباب مناصب امرا تک بھی متعدی ہوگیا ہو۔

اور یہ ذکر تو ان لوگوں کا تھا جو سلطان المشائخؒ کے عہد میں تھے، حضرت کے بعد یوں تو آپ کا سلسلہ بیسیوں وسائط اور ذرائع سے پھیلا، لیکن آپ کے خلیفہ اعظم سب جانتے ہیں کہ حضرت مولینا نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کے متعلق تو پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی چیز کے آگے سر جھکانے کے لئے وہ تیار نہیں تھے خود سلطان المشائخؒ کے زمانہ ہی میں لوگوں نے ان پر بھی الزام لگایا، مشہور بات ہے کہ کسی مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع شروع ہوا، چراغ دہلوی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا، فرمایا "خلافِ سُنت است" لوگوں نے یہ خیال کرکے کہ مطلقاً سماع سے آپ کو انکار ہے، یہ اعتراض کیا کہ از سماع منکر شدی واز مشرب پیر برگشتی؟ اخبار الاخیار میں شیخ محدث نے نقل کیا ہے کہ اس وقت حضرت نے فرمایا کہ "دلیل از کتاب وحدیث می باید (ص ۸۲) لوگوں نے یہ خبر سلطان المشائخؒ تک شکایتہً پہنچائی، لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، جب وہاں سے بھی جواب ملا کہ "راست می گوید"

بہرحال چراغ دہلوی کی زندگی تو اتنی عالمانہ تھی کہ ان پر لوگوں کو خشک مُلّا ہونے کا شبہ اس وقت بھی تھا، اور شاید اب بھی ہو، لیکن آپ کے خلیفہ اعظم حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ صاحب گلبرگہ نے تو صاف لفظوں میں اس مسلک کی تصریح فرمائی ہے، جو طریقہ چشت کی خصوصیت ہے، مولانا آزادؒ نے اپنی کتاب روضۃ الاولیا میں حضرت

Marfat.com

والا کا یہ فقرہ نقل کیا ہے۔

فتح کار من بیش تر از تلاوت قرآن و سماع بود (روضہ ص ۲۴)

یہ بھی اسی کتاب میں آپ ہی کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت سیدؒ کا معمول تھا کہ

وقت چاشت و بعد از نماز ظہر درس می گفت و بیش تر درس در علم تفسیر و حدیث

و سلوک می گفت و گاہے علم کلام" (ص ۲۳)

قرآن سے آپ کا کتنا گہرا تعلق تھا اس اعتراف کے علاوہ کہ ان کا فتح کار ہی قرآن کی تلاوت سے اور ان اشعار سے ہوا جن کے متعلق جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت نظم کی صورت میں قرآنی آیات کے وہ ترجمے ہیں، ان ہی ترجموں کو نغمہ کے ساتھ سُننا یہی ان بزرگوں کا سماع تھا۔ اسی لیے میں "قرآن و سماع" کی ترکیب میں معطوف کو معطوف علیہ سے کوئی الگ چیز نہیں قرار دیتا، اور اس پر تھوڑی بہت بحث بقدر ضرورت آئندہ بھی شاید آئے۔ بہر حال اس اعتراف کے سوا حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز نے ایک

(حاشیہ صفحہ ۱۶۵) مولانا غلام علی آزاد جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکن ہی میں گذرا ہے، حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دکن کے عوام جن میں ہندو اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہے ان کی عقیدہ تمندیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو عجیب باتیں نقل کی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ شخصے بہ یکے از اہل دکن پرسید کہ رسول اللہ بزرگ است یا سید محمد گیسو دراز۔ جواب داد کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پیغمبر خدا است اما سبحان اللہ مخدوم سید محمد گیسو دراز چیزے دیگر است۔ ص ۲۳۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ گلبرگہ کے نواح میں کوئی تالاب ہے از حضرت سید نقل می کنند کہ فرمودہ کسے کہ دریں "تالاب غسل کند سعید می شود یعنی نیک بخت و از گناہاں پاک می گردد" بہر حال روایت جیسی کچھ ہو، لطیفہ میر صاحب نے یہ درج کیا ہے کہ سعید کے لفظ کو بگاڑ کر عوام سادہ لوح گویند کہ حضرت سید فرمودہ کسے کہ دریں "تالاب غسل می کند سید می شود و بہ نیت تحصیل سیادت غسلہا بجامی آرند ص ۲۴۔ اب بھی لوگوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ دکن میں عموماً ایک عجیب بات یہ پائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین طبقہ جس کا کام عموماً خدمتگذاری کرنا سمجھا جاتا ہے ان کی اکثریت سے جب پوچھیے تو اپنے نام کے ساتھ سید کے لفظ کا اضافہ کرتے ہیں، حالانکہ اعلیٰ طبقوں میں بہت زیادہ احتیاط پائی جاتی ہے مشکل ہی سے ان میں کوئی اپنے کو سید کہتا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس طبقہ کی سیادت غالباً اسی تالاب کی کرامت کا نتیجہ ہے۔ میر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے۔ حسن علا بہمنی جو علاؤ الدین ... لوگ حسن شہر

ہی نہیں، بلکہ قرآن مجید کی دو دو تفسیریں لکھ کر انہوں نے اس خاندانی مذاق کا ثبوت پیش کیا ہے جو اکابر چشت سے منتقل ہو کر ان میں پیدا ہوا تھا، مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"تصانیف حضرت سید متعلقہ تفسیر قرآن بطور سلوک و تفسیرے دیگر بطریق کشاف پنج جزو" (ص ۲۴)

دکن ہی میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، سلطان المشائخ کے متوسلین و خلفا میں ایک حضرت برہان الدین غریب قدس سرہ صاحب خلد آباد ہیں، ان کے براہ راست خلیفہ اور جانشین مولانا زین الدین شیرازی کے متعلق مولانا غلام علی نے جس قرآنی ذوق کی روداد لکھی ہے، وہ عجیب و غریب ہے، لکھا ہے کہ محمد تغلق نے دلی اجاڑ کر دکن میں دولت آباد کو بسایا، لیکن جب دولت آباد میں اسماعیل مخ نے بغاوت کی اور سلطان اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے خود دولت آباد آیا، اپنے ساتھ دولت آباد سے لوگوں کو پھر دلی لے گیا تو ان میں مولانا زین الدین بھی تھے۔ دلی میں آپ کو چھوڑ کر خود سندھ چلا گیا، اس زمانہ میں مولانا زین الدین کا مشغلہ دلی میں یہ تھا جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے۔

"روزانہ شش پارہ و یک ختم کلام اللہ بروح پر فتوح سلطان المشائخ می کنم"[۱]

اس واقعہ کے بعد ہی بادشاہ جو سندھ ٹھٹھہ میں تھا، خدا جانے کیا احساس ۱۸

اس کو ہوا اس نے مولانا زین الدین کے متعلق فرمان بھیجا کہ وہ جہاں رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں، لیکن ابھی وہ دلی سے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادشاہ کے مرنے کی

---

[۱] خدا اب کون اسے جانے مانے لیکن سلطان المشائخ کی روح کو مولانا زین الدین کی اس قرآن خوانی سے کتنا سکون حاصل ہوا تھا، اس کے متعلق مولانا آزاد ہی کی کتاب میں شیخ زین الدین شیرازی کے حوالہ سے یہ بیان درج ہے کہ جن دنوں میں اس طرح قرآن خوانی میں ان کے روضہ پر مصروف تھا ایک دن بگوش سر یہ شعر میں نے سنا

با ما ئے زمین خود کہ جانم از تو آسودست   تو حسن سن برافزودی خدا حسنت بیفزاید

خادم اپنے دین کے ساتھ آسودہ ہو کہ میری روح کو تم سے آسودگی حاصل ہوئی ہے، تم نے میرے حسن کو بڑھایا خدا تمہارے حسن کو بڑھا ئے مولانا زین الدین کے الفاظ یہ ہیں: "این بیت از مرقد مطہر سلطان المشائخ استماع نمودم" ص ۲۶

خبر سندھ سے آئی اور اسی کے ساتھ فیروز تغلق بھی دلی پہنچ گیا۔ اُس نے مولانا پر اصرار کیا کہ دلی ہی میں قیام کریں، لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا۔

"مرا بگذار بہ آستانہ خواجہ خود یعنی برہان بمیرم"

فیروز نے زیادہ اصرار مناسب نہ خیال کیا، اور سامان زادراہ نیز بہت کچھ دے دلاکر اس نے دلی سے رخصت کر دیا، لیکن آپ کو خیال ہوا کہ دکن جانے سے پہلے اپنے دادا پیر بابا فرید شکر گنج کی قبر شریف پر فاتحہ پڑھ آؤں، اس لیے اجودھن روانہ ہو گئے۔ اجودھن میں ان کا قیام جس شان سے رہا ہے اسی کا تذکرہ مقصود ہے مولانا غلام علی آزاد کے الفاظ یہ ہیں:۔

"در گنبد شیخ فرید الدین دربستہ مشغول ماند غیر از اوقات نماز بر نمی آمد و شبانہ روز چہار قرآن ختم می کرد، در عرصہ سہ روز مجموع دوازدہ قرآن ختم کرد"

وہاں سے رخصت ہو کر دکن کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں اجمیر[1] میں ٹھہرے اور وہاں

---

[1] اجمیر شریف کے بعد مولانا زین الدین خلد آباد پہنچ گئے۔ یہاں اس زمانہ میں محمد شاہ بہمنی کی حکومت تھی، لکھا ہے کہ چونکہ شراب نوشی کا عادی تھا اس لیے بھی اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی، اس لیے باوجود سخت آرزو کے آپ نے اس کی ملاقات سے انکار کر دیا؛ اور غائبانہ طور پر اُس نے چاہا کہ اپنی تحریری بیعت بھیج دیں۔ اس سے بھی آپ نے انکار کیا، کہلا بھیجا

"سزاوار ریاست خلق کسے ست کہ در حفظ شعار ملت محمدی کوشیدہ مراد علانیۃ پیرامون شاہی نہ گرد"

سلطان بار بار آدمی شیخ کے پاس بھیجتا رہا آخر میں قاضی القضاۃ کو بھیجا کہ بیعت نامہ پر شیخ کے دستخط کرا لاؤ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ قصہ کہلا بھیجا کہ کسی کافر بادشاہ نے ایک مسلمان عالم و سید و ہیجڑے کو گرفتار کر کے بت کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، عالم اور سید دونوں نے اس کو اکراہ قرار دے کر بظاہر سجدہ کی صورت بنائی جب ہیجڑے مخنث سے کہا گیا، تو اس بیچارے نے کہا "تمامی عمر من در ارتکاب ناشائستہ گذشت" بولا کہ میں نہ میں عالم ہوں نہ سید سرمایۂ من لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ست اگر این ہم از دست دہم فردا حال من چہ باشد اگر سر از تن جدا کنند من بت را سجدہ کردنی نیستم" شیخ زین الدین نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا کہ من مخنث بلکہ بدتر از مخنث اگر بمجلس حاضر شوم یا بخلافت تو اقرار نمایم" بادشاہ پھر بھی جبر و اکراہ کرتا رہا، مگر آخر میں خدا نے اُس کے دل میں شیخ کی ہیبت ڈال دی اور پشیمانی کا (بقیہ بر صفحہ ۱۶۹)

بھی دی یک ہفتہ در روضہ مقدسہ خلوت گزید در روزے چہار ختم مجموع لبست وہشت قرآن ختم کرد" چونکہ مولانا زین الدین نے قرآن حفظ فرما لیا تھا، اس لیے ان کو پڑھنے میں آسانی ضرور ہوتی ہوگی، لیکن روزانہ چار ختم کرنا پھر بھی میں نہیں سمجھتا کہ اسے معمولی بات سمجھی جائے۔ اب لوگوں کو کیا کہیے، طریقہ علیہ چشتیہ کی ایک دوسری شاخ صابریہ ہے، صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے صاحبزادے مولانا رکن الدین سے مناقب العارفین میں یہ روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے:۔

"پدر بزرگ من از اولیا بودند، تلاوت قرآن وظیفہ داشتند و مسائل شرعی ہمیشہ مطالعہ کردند۔ ص ۳۵۷۔"

بتایا جائے کہ چشتیہ طریقہ کا اب کونسا سلسلہ باقی رہ گیا جس کا قرآن سے وہ تعلق ثابت نہیں ہوتا جس کا میں دعویٰ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہو اب اسے کوئی خوش اعتقادی قرار دے یا جو بات بھی سمجھی جائے مختلف قرائن و قیاسات منتشر معلومات نے مجھ میں یہ حسن ظن پیدا کر دیا ہے کہ حفظ قرآن کی دولت ہندوستان میں جو عام ہے، اتنی عام کہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی ملک میں حافظوں کی اتنی تعداد پائی جاتی ہو، جتنی بوقت واحد ہندوستان میں نکل سکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ دوسرے اسباب کو بھی دخل ہو، لیکن ایک بڑی وجہ اس کی میرے نزدیک خواجگان چشت ہی کا وہ مذاق ہے جو حفظ قرآن کے متعلق ہم ان میں پاتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) خط لکھا، حضرت نے کہلا بھیجا کہ سلطان محمد شاہ غازی شریعت محمدی کے مطابق شراب کی دکانیں ممالک محروسہ میں بند کرا دے اور اپنے علماء و قضاۃ و صدور کو حکم دیں کہ لوگوں کو دین محمدی پر قائم کریں تو زین الدین فقیر دوست تر کسے نخواہد بود "غازی" کے خطاب پر سلطان بہت خوش ہوا، اور تمام ملک سے یک قلم شراب نوشی کو حکماً بند کرا دیا۔ ملک میں ڈاکہ اور چوری کے واردات بکثرت ہو رہے تھے۔ سب کا انسداد سختی سے کیا لکھا ہے کہ چھ سات مہینوں میں اتنے چور ڈاکو ٹھگ مارے گئے کہ بیس ہزار سر گلبرگہ میں جمع ہو گئے اور شہر کے کنارے ان سروں سے ایک چبوترہ بنایا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ اور شیخ میں

Marfat.com

ان مثالی اور جزئی شہادتوں کے سوا جن کا ایک ذخیرہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے ایک عجیب و غریب شہادت اس باب میں ایک غیر چشتی بزرگ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، آپ کے ملفوظات "معدن المعانی" نامی میں براہ راست حضرت والا کا ایک بیان درج ہے، میں بجنسہٖ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں

مخدوم فرمود کہ من از شیخ زادہ شنیدہ ام کہ	مخدوم نے فرمایا کہ میں نے شیخ زادہ سے سنا ہے کہ وہ
می گفت پدر مرا ہزار ختم قرآن بود سہ صد در	کہتے تھے میرے والد نے قرآن مجید کو ہزار دفعہ ختم
خارج صلوٰۃ و ہفت صد در صلوٰۃ	کیا تھا، تین سو تو نماز سے باہر اور سات سو ختم نماز کے اندر

"معدن المعانی" ہی کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ "شیخ زادہ" کے لفظ سے مراد خاندان

۱؎ آپ کا ذکر پہلے بھی مختلف سلسلہ میں آیا ہے بقول شیخ محدث از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند (اخبار ص ۱۱۷) لیکن یہاں اتنی بات بتانی ہے کہ آپ طریقہ سہروردیہ کی ایک شاخ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ یاد رکھنے کی چیز ہے کہ حضرت والا کے پیر طریقت شیخ نجیب الدین فردوسی تھے اور ان کے پیر شیخ رکن الدین فردوسی۔ شیخ رکن الدین حضرت نظام الدین اولیاء کے معاصر ہیں، کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی جب سلطان المشائخ سے برسر پرخاش ہوا تو اس نے حضرت شیخ رکن الدین کو ان کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، ظاہر ہے کہ بزرگوں میں تو کیا مقابلہ ہوتا لیکن عام مریدوں کو شیخ رکن الدین کے طریقہ چشتیہ سے ایک گونہ رقابت پیدا ہو گئی تھی، اسی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے جو آپ کو شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات میں نظر آئیگا، کہ وہ سلطان جی کو اپنی مجلس میں مختلف طریقہ سے ستایش فرماتے، فردوسیوں میں خواہ مخواہ جو ایک غلط خیال پیدا ہو گیا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو مٹانا چاہتے تھے، تعجب اس پر ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین کو جن لوگوں نے بہار کے قیام پر مجبور کیا ان میں زیادہ تر حضرت نظام الدین اولیاء ہی کے خلفاء ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام میں اگر کچھ لوگوں میں رقابت ان مختلف سلاسل و طرق کے متعلق پیدا بھی ہو جاتی تھی تو اکابر ہمیشہ اس کے ازالہ کے درپے ہوتے تھے کہ سارے راستے اللہ کی طرف لیجاتے ہیں پھر بھی مذکورۂ بالا شہادت چونکہ کسی چشتی کی نہیں ہے اس لیے اس کو زیادہ وقعت دینی چاہیے ۱۲۔

Marfat.com

چشت کے ایک بزرگ ہیں۔ ملفوظات میں متعدد جگہ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، نام کا تو ان کے پتہ نہ چل سکا، لیکن شیخ زادہ چشتی سلمہ اللہ تعالیٰ کے عنوان سے ان کا ذکر مختلف مقامات میں پایا جاتا ہے۔ ملفوظات کے ص ۲۴۵ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے یہ آخر میں بہار پہنچے، اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ سے وہیں ملاقات ہوئی، یہ بھی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان ہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے

"من چندیں زبانہائے می دانستم از ترکی و فارسی و عربی"

بہر حال کچھ بھی ہو حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ان ہی شیخ زادہ چشتی سے ان کے والد کے طریقہ ختم کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"و ہمہ خواجگان چشت را رحمہم اللہ ہم بریں منوال است" ص ۱۸۶

اس کے سوا اور کیا مطلب اس کا لیا جا سکتا ہے کہ شیخ زادہ چشتی کے پدر بزرگوار کا جو دستور ختم قرآن کے متعلق تھا، وہی دستور "ہمہ خواجگان چشت" میں مروج تھا۔ اور اسی شہادت کا پیش کرنا میرا مقصود تھا۔

بلکہ اسی کتاب کے دوسرے مقام میں ایک اور دلچسپ چیز ملتی ہے۔ جامع ملفوظ ارقام فرماتے ہیں کہ

"بندگی مخدوم بحاضران مجلس روئے مبارک آورد و پرسید کہ کسے وایں آیت یاد است کہ در کدام سورہ ست کسے را یاد نہ بود"

حضرت نے اس وقت عجب حسرت کے لہجہ میں فرمایا کہ "اخر مرا آدمی باید ہاں یاد نیست" پھر اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

"در ایام خوردگی چندیں کتابہا را یاد کرانیدند چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات جزاں کہ بہا، مفتاح اللغات جزوے بستہ خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند"

Marfat.com

اس سے کم از کم مجھے تو ہندوستان کی آٹھویں صدی کے مکتبی نصاب کے بعض اجزا کا سُراغ ملتا ہے، مصادر سے مراد غالباً کوئی اس قسم کی کتاب ہے جسکو مکاتب میں آج کل بھی "آمدنامہ" یا دکن میں جسے "آمدن نامہ" کہتے ہیں، صفوۃ للمصادر یا "مصدر فیوض" وغیرہ مختلف ناموں سے لوگوں نے فارسی کے مصادر ایک جگہ جمع کر دیے ہیں، بچوں کو ابتدا میں یہی کتاب یاد کرائی جاتی ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ زندگی بھر بچپن کی یہ محنت لوگوں کو کام آتی ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علاوہ مصادر کے لغت کی کوئی کتاب بھی زبانی یاد کراتے تھے، جس کا اب رواج باقی نہیں رہا" ہر بار یاد تمام شنیدند" سے آموختہ سُننے کا جو قاعدہ تھا اُس کا بھی پتہ چلتا ہے، خیر یہ تو ایک ضمنی بات ہے، حضرت نے مندرجہ بالا فقرہ کو ختم کرکے پھر ارشاد فرمایا۔

"بایست بجائے ان قرآن یاد می کرانیدند" ص۴۳

اے کاش!

اور اس سے میرے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ حفظ قرآن کا مذاق چشتی طریقہ سے کوئی خاص مخصوصیت رکھتا ہے، اور آئندہ ملک میں اس کا جو عام مذاق پھیل گیا، وہ ان ہی بزرگوں کے انفاس طیبہ کی برکت ہے، اس کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ایک اور جز کا اضافہ آپ نے فرمایا، مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ جو عام طور پر مخدوم الملک کے نام سے کم از کم صوبۂ بہار میں مشہور ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم سنار گاؤں (بنگال) میں ایک عالم علامہ شرف الدین توامہ سے ہوئی تھی، جو دلی سے بنگال بھیجے گئے تھے کہتے ہیں کہ جہاں پر آج ڈھاکہ شہر کی آبادی ہے، اسی کے قریب کسی جگہ یہ سنار گاؤں آباد تھا حفظ قرآن کا ذکر جب چھڑا تو آپ کو اپنے ان ہی اُستاد شرف الدین توامہ کے حلقہ درس کا قصہ یاد آگیا، فرمانے لگے:

در سنار گاؤں برادر مولانا یعنی شرف الدین توامہ زین الدین نام داشت او را قرآن نیکو یاد بود، در وقت سبق خواندن، اگر در سبق کسے آیتے برائے ترک حکمے آمدے

Marfat.com

"دراں محل مولانا شرف الدین توامہ محتاج می شدند کہ درکدام سورہ است[1] و مولانا زین الدین نشستہ بودے درزبانفتے کہ مولانا تتبع می کند ایں آیت درکدام سورۂ ست"

مخدوم الملک فرماتے ہیں کہ مولانا کے بھائی زین الدین ایسے موقعہ پر

"برائے طیبت سوحرکت زمانے خاموش ماندے ودم نزدے ویاراں راچشمک (خوش مزاجی) دادے کہ اکنوں کہ خوار گفت"

گویا سارا مجمع ایسے موقعہ پر اپنے عجز کے اعتراف پر مجبور تھا، فرماتے ہیں کہ تب

"مولانا شرف الدین توامہ روئے مبارک سوئے او می آوردند و می گفتند کہ بس کنید اکنوں بگوئید کہ درکدام سورہ است"

جب مولانا بھائی کو اس لہجہ میں حکم دیتے تب "گفتے کہ در فلاں سورت است"

میری غرض اس تفصیل کے نقل کرنے سے ایک تو یہ ہو کہ کچھ اس زمانہ کے درس تدریس کے طریقہ کا پتہ اس بیان سے چلتا ہو اور دوسری بات وہی ہو کہ حفظ قرآن کے ساتھ طریقۂ چشت کے بزرگوں کو جو وابستگی تھی، ان واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہو کہ ان کا یہ کوئی خصوصی مذاق تھا، آج ان بزرگوں کو جس نظر سے بھی دیکھا جاتا ہو، جو باتیں بھی ان کی طرف منسوب کی جاتی ہوں لیکن اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہو کہ اسلام و ایمان کی روشنی اس کفرستان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پھیلانے میں جن بزرگوں کا سب سے زیادہ حصہ ہو، وہ

---

[1] اس موقع پر حضرت الاستاذ الامام مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کا خیال آتا ہو، ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ ہزارہا ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے، جس کتاب پر ایک دفعہ نظر پڑ گئی گویا ان کے حافظہ کی الماری میں بند ہو جاتی تھی، جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رُخ کر کے دریافت فرماتے "پوری آیت کیا ہو؟" فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا۔ پھر یہ کیا بات ہو؟ جواب میں فرمایا کہ قسمت! بخت، واللہ اعلم کیا بات تھی ۱۲

Marfat.com

خانوادۂ چشت ہی کے اکابر ہیں، اسلام کی جڑیں جب اس ملک میں مضبوط ہوگئیں، اس وقت تو یقیناً اوروں کو بھی یہاں کام کرنے کا موقعہ ملا، اور بڑی ناشکری ہوگی، اگر دوسرے طرق وسلاسل کے بزرگوں کی عظیم الشان خدمات اور قربانیوں کو بھلا دیا جائے۔

قادریہ، سہروردیہ اور آخر میں جب مغل آئے تو ان کے بعد نقشبندیہ سلسلہ کے جان فروشوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے پرچم کو سربلند رکھنے میں جو مجاہدات کیے ہیں یقیناً وہ بڑے قیمتی ہیں، علی الخصوص عہد اکبری کے فتنۂ ایمان سوز کے مقابلہ میں سرہند کے فقیر بے نوا نے جو کام کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہماری پچھلی نسلیں بحمد اللہ اسی جہادِ اکبر کی بدولت آج اسلام صحیح، اور ایمان واقعی سے قریب ہیں، ورنہ اکبری عہد میں اسلام کو مسخ کر کے جس خود ساختہ نئے قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ اگر نام کے ہم مسلمان باقی بھی رہتے، تو کیا واقعی ہمارا اسلام وہ اسلام ہوتا جو اللہ کے آخری رسول علیہ السلام نے ہمیں سونپا ہے۔

لیکن گفتگو آخر میں نہیں اول کار میں ہو رہی ہے، اور اسی لیے ذرا درا[ز] نفسی بلکہ تلخ نوائی پر مجھے مجبور ہونا پڑا کہ بعض خاص موثرات وعوامل جن میں بڑا حصہ مغربی دسیسہ کاریوں کا بھی ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ بزرگانِ چشت کی جانب سے قلوب میں عام سرد مہری بڑھتی جا رہی ہے، ان کے کارناموں کی اہمیت گھٹا کر لوگ شدید قسم کی محسن کشی کا ارتکاب کر رہے ہیں، ان بزرگوں کے کام تو کام بتدریج ناموں تک کے بھلانے کی غیر شعوری کوششیں ہو رہی ہیں۔ ارادہ تو زمانہ سے تھا، اور جو کچھ اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں کہا ہے، لیکن ہندوستان کے تعلیمی نظام کے سلسلہ میں چونکہ ان بزرگوں کا ذکر ناگزیر تھا جن کے دینی اور روحانی دباؤ کے نیچے اس ملک کے خواص و عوام صدیوں دبے رہے ہیں، اس لیے صرف ایک پہلو یعنی ان کا قرآن سے جو تعلق تھا، محض اس کے متعلق ذرا طویل گفتگو سے مجھے کام لینا پڑا، ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے

مجھ پر اپنے موضوع سے ہٹ جانے کا الزام بھی قائم کیا جائے لیکن ہر لکھنے والا اپنے لکھنے کی ایک غرض سامنے رکھتا ہے۔ مجھے نہ ریسرچ کرنا ہے، نہ اپنی تحقیق کی داد لینی ہے اپنا ایک فقیرانہ خیال تعلیم کے متعلق جو ہے، جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے اُسے بیان کر رہا ہوں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا خواجگانِ چشت کے متعلق مختلف دائروں میں چونکہ طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور اب وہ بتدریج اتنی گہری ہوتی چلی جا رہی ہیں کہ تفصیل سے اگر کام نہ لیا جاتا اور چند سرسری حوالوں کو دے کر گذر جاتا، تو اسے میری ایک نری خوش اعتقادی کے سوا شاید اور کچھ نہ قرار دیا جاتا بلکہ اس حملہ سے تو اب بھی اپنے آپ کو میں محفوظ و مصئون نہیں پاتا، مگر جو واقعات آپ کے سامنے معتبر حوالوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے بعد اب بھی کیا یہ صرف میری خوشِ اعتقادی ہی باقی رہتی ہے۔

کتنا بڑا ظلم توڑا گیا کہ جن لوگوں نے اس ملک میں قرآن کو پھیلایا، اسی کو اپنے طریقہ کا املاک کار قرار دیا، بے دیکھے، بے پڑھے محض افواہی روایات سُنے سُنائے قصوں اسلاف کی راہ چھوڑنے والے اخلاف کے غلط نمونوں کو دیکھ کر آج یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ چشتی طریق کے بزرگوں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ اسلام جیسے متین اور سنجیدہ باوقار دین میں انہوں نے طبلہ اور سارنگی کو داخل کر دیا، یہ الفاظ ہیں جو میرے سُنے ہوئے ہیں، اور اسی زمانہ سے دماغ گھول رہا تھا قلم جب ہاتھ میں آیا تو اختصار پر صبر نہ کر سکا، افسوس ہے کہ بات بہت طویل ہو چکی ورنہ اس "چنگ و چغانہ" کے قصہ پر بھی تفصیلی گفتگو ہو سکتی تھی جس کا الزام ہم چشتیوں کے اکابر و اسلاف پر بے دردی کے ساتھ لگایا جا رہا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے، اتنے معتبر ذریعے جس سے زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسن علا سنجری براہ راست حضرت سلطان المشائخ سے راوی ہیں کہ ایک دن آپ نے اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے، یعنی امام اجب نماز میں سہو ہو جائے تو یاد دلانے کا طریقہ جیسا کہ فقہ کا مشہور مسئلہ ہے کہ اگر مرد یاد دلانا چاہتا ہو تو چاہیے کہ وہ سبحان اللہ کہے۔

Marfat.com

لیکن یاد دلانے والی اگر عورت ہو تو مسئلہ یہ ہے کہ بجائے زبان کے وہ تصفیق سے کام لے یعنی بجائے سبحان اللہ کہنے کے "دستک" سے کام لے، مگر فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ دستک کا جو عام طریقہ ہے وہ صورت اختیار نہ کرے، مطلب یہ ہے کہ "کف دست برکف دست نزند" سلطان المشائخ نے اس کے بعد اس امتناعی حکم کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "آں بلہوی ماند" یعنی ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ جوڑ کر پیٹنے میں ایک قسم کے کھیل اور لہو کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ بجائے اس کے "پشت دست برکف دست زند" ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پٹکے، گویا اس شکل میں لہو اور کھیل تماشے والی تالیوں سے یہ صورت جدا ہو جاتی ہے، میر حسن کا اس کے بعد بیان ہے کہ سلطان المشائخ نے اس فقہی مسئلہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ

"تا ایں غایت از ملاہی (کھیل تماشے) و امثال آں احتراز آمدہ ست، پس در سماع بطریق اولی کہ ازیں بابت نہ باشد"

آگے اپنے مقصد مبارک کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں

"یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است، در منع مزامیر (باجہ وغیرہ) بطریق اولے"

یہ تھا خیال مزامیر و چنگ و چغانہ، دف و نے میں، طریقہ چشتیہ کے ایک معمار اعظم کا، وہی جسے آج اس مسئلہ میں سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے، اللہ اللہ جس کے نزدیک ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر پٹک کر تالی کی صورت بنانی بھی ناجائز ہو، ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ اس کی مجلس سماع میں ڈھول اور طبلے ٹھنکتے تھے، ستار اور سارنگی، بانسری اور سنجیرا بجایا جاتا تھا، ان ہی حسن علا سجزی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت والا سے کسی نے آکر عرض کیا کہ آج فلاں مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع سنا جا رہا تھا، سننے کے ساتھ ہی حضرت کا چہرہ بدل گیا اور فرمانے لگے "من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نہ باشد"

لہ اصل یہ ہے کہ ایران و خراسان سے ہندوستان میں ایک فرقہ قلندروں کا بھی آدھمکا تھا جو ٹاٹ پہنے، چار ابرو کا صفایا کیے ادھر ادھر مارا پھرتا تھا، ان کو حیدریان بھی کہتے تھے حیدر کوئی ان کے مرشدوں میں تھے، یہ فرقہ بھنگ بھی پیتا تھا، بے قید تھا، ڈھول ڈھکے میں رہنا ان کی عام عادت تھی، مشائخ چشت نے ہمیشہ ان کو بری نظر سے دیکھا ہے ۱۲۔

آپ دیکھ رہے ہیں، مزامیر کو جو محرمات قرار دے رہا ہو، کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود ان محرمات میں مبتلا تھے، امیر حسن نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"دریں باب بسیار غلو می فرمود" فوائد ص ۹۵

میں اس وقت مزامیر کے مسئلہ کو نہیں بیان کر رہا ہوں، بلکہ صرف اس ظلم کو دکھانا چاہتا ہوں جو مشائخ چشت کے ساتھ روا رکھا گیا ہے آپ کو بجائے خود اختیار ہے، جو چاہے کیجیے، اور جس قسم کا مسلک اپنے اجتہاد سے یا کسی مجتہد کے اجتہاد سے اختیار کیجیے، لیکن خدارا جھوٹ تو نہ بولیے، جس سلسلہ کے اساطین کا مزامیر کے باب میں اتنا غلو ہو اسی سلسلہ کی آڑ لے کر تو ان چیزوں کو جائز نہ قرار دیجیے، امیر علاء حسن ہی نے ایک دوسرے موقعہ پر لکھا ہے کہ کسی نے حضرت والا سے یہ عرض کیا کہ مزامیر کے ساتھ جو لوگ سماع سُن رہے تھے، ان سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کیا حرکت کی تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ "ما چناں در سماع مستغرق بودیم کہ ندانستیم کہ ایں جا مزامیر ہست یا نہ"

امیر حسن کہتے ہیں کہ "خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چوں آں سخن بشنید فرمود کہ ایں جواب ہم چیزے نیست" صرف یہی نہیں کہ "چیزے نیست" بلکہ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ "ایں سخن در جملۂ معصیتہا باید نوشت" صفحہ ۲۲۲ یعنی ایک گناہ تو مزامیر ہی میں مبتلا ہونے کا تھا اور اس قسم کی لغو توجیہ دوسرا گناہ ہوا، جو سب لکھا جائیگا، یہی میں بھی عرض کر رہا ہوں کہ مزامیر کا سُننا نہ سُننا یہ الگ مسئلہ ہوا، لیکن اس کو سُننا بھی، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا کہ مشائخ چشت کا یہ طریقہ ہے، کیا اپنے گناہ میں مزید گناہ کا اضافہ نہیں ہے، یہ خوب توجیہ ہوئی کہ ہمیں مزامیر کے ہونے یا نہ ہونے کا پتہ نہ چلا" کیا شراب اس لیے حلال ہو جائیگی کہ پینے والے یہ کہیں کہ ہمیں پینے کے وقت پتہ نہیں چلتا کہ شراب پی رہا ہوں، یا شربت پی رہا ہوں، سلطان المشائخ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا جیسا کہ اسی مجلس کے ملفوظات کے شروع میں امیر حسن نے نقل کیا ہے کہ

Marfat.com

"خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود، چیزے کہ حرام ست بحکم کسے حلال نہ شود، و چیزے کہ حلال ست بحکم کسے حرام نشود" ص ۲۲۷

اور حقیقت یہ ہے کہ ایک مزامیر ہی کا مسئلہ کیا، بلکہ ان لوگوں کو جو حضرت والا سے دینی عقیدت رکھتے ہیں، ان کو طریقہ چشتیہ کا یہ کلیہ یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت نے جس چیز کو حرام کیا ہے، کسی امتی کو خواہ وہ کوئی ہوں صحابی ہوں یا مجتہد ہوں، امام ہوں یا ولی ہوں کسی کو اختیار نہیں ہے کہ اُسے حلال ٹھہرائے، اور جو چیزیں حلال ہیں، کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ اُسے وہ حرام کرے، نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی، شریعت اُسی دن کامل ہو چکی جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" مسلمانوں کے سپرد کر کے رفیق اعلیٰ تشریف لے گئے۔ بالفرض اگر کسی اُمتی کی طرف ایسی بات کسی نے منسوب بھی کی ہو تو ہم یا اس انتساب ہی کو غلط ٹھہرائینگے، اگر اس کا انتساب کسی ایسے بزرگ کی طرف کیا گیا ہے جس کی امانت و دیانت، اخلاص و للٰہیت پر طبقۃً بعد طبقۃٍ مسلمانوں نے اتفاق کیا ہے، یا اس کی تاویل اگر ممکن ہوگی تو کی جائیگی، اور ان باتوں کا بھی امکان نہ ہو تو یہی سمجھا جائیگا کہ ان سے غلطی ہوئی، کیونکہ مسلمان بہرحال مسئول اسی شریعت کا ہے جس کی تعمیل کا مطالبہ حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کیا ہے۔ قیامت کے دن شریعت کے کسی مسئلہ کی خلاف ورزی کے متعلق یہ جواب قطعاً قابل شنوائی نہیں ہوگا، کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کا یہ طرز عمل یا قول تھا، اب کوئی نبوت نہیں کر سکتا، خدا کی جدید رسالت اب قیامت تک کوئی نہیں لا سکتا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی مرضی کی یافت کا دعویٰ کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے ختم نبوت کی تکذیب ہے، کیا تماشا ہے لوگ کچھ الفاظ بولتے ہیں، اور معنی سے بے تعلق ہو کر بولتے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ سمجھ رہے ہیں، کہا جاتا ہے کہ فلاں مسئلہ شریعت کے رو سے درست

Marfat.com

دہو، لیکن طریقت میں اس کی اجازت ہو حالانکہ ان دیوانوں کو یہی معلوم نہیں کہ طریقت سے مراد کیا ہے، کیا محمدؐ کی نبوت کے سوا ان کے لائے ہوئے قرآن کے سوا وہ کوئی اور چیز ہے، طریقت کا مادہ طریق ہے، یعنی شریعت کی راہ پر جو عملاً چلنے لگتا ہے، اسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طریق اور راہ پر لگ گیا، شریعت توان علوم کے مجموعہ کا نام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں کو عطا کیا ہے، ان ہی علوم کے مطابق عمل کرنے کا نام طریقت ہے

آخر یہ لفظ بولنے والوں کا تو بنایا ہوا نہیں ہے، یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے، ان ہی سے پوچھنا تھا کہ آپ کی کیا مراد ہے! سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے مزامیر ہی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

اگر یکے از مقامے بیفتد باے درشرع افتد مبادا اگر از شرع بیروں افتد پس چہ

ماخذ فوائد الفواد ص ۹۵

مطلب وہی ہے کہ طریقت تو شریعت ہی پر اخلاص اور صداقت سے چلنے کا نام ہے، فرض کیجیے کہ کسی بیچارے کو یہ چلنا جس راستبازی، صداقت، اخلاص، جوش ولولہ کے ساتھ چاہیے میسر نہ آیا، تو کم از کم وہ ان چیزوں کو جو شریعت میں حلال ہیں انہیں حلال ہی مانتا ہے جو حرام ہیں انہیں حرام ہی سمجھتا ہے، لیکن جس نے اس ماننے سے بھی بغاوت کی، تو طریقت تو خیر دور کی چیز ہے، وہ شریعت اور اسلام ہی کے دائرہ میں کب باقی رہا

بہرحال یہ واقعہ بھی ہے، اور یہی "مشرب ناب" ہمارے خواجگان چشت کا تھا، آپ دوسروں کے تصریحات میں تو ممکن ہے تناقضات نکال سکتے ہیں لیکن خدا کا بڑا کرم ہوا، ہندوستان کے مسلمانوں پر کرم ہوا کہ اس ملک میں اسلام جن بزرگوں کے ذریعہ سے پہلی دفعہ داخل ہوا، ان ہی میں سے ایک مسلم الثبوت ہستی نظام الاولیاء کے ملفوظات نے

Marfat.com

قلم بند ہو کر متواتر کی شکل اختیار کر لی، کہ آج اسی کے ذریعہ سے بیسیوں غلط فہمیوں کے متعلق جو اصل واقعہ ہے، اُس کا سُراغ لگانا ہمارے لیے آسان ہو گیا اور مزامیر کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق صرف حسن علا سنجری ہی کی یہ روایتیں نہیں ہیں، بلکہ میر خورد جن کی کتاب ظاہر ہے کہ اعتماد و وثوق میں فوائد الفواد کی ہم رتبہ نہیں ہے بلکہ بعض خاص حالات کے تحت اس کی بعض چیزیں محل غور و تامل ہیں۔ میر خورد[1] کی بعض تعبیریں بھی موحش

[1] چونکہ اپنے مقالہ میں میر خورد کی کتاب کے حوالے میں نے بکثرت نقل کیے ہیں۔ اس لیے میر صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ سادات کے ایک شریف گھرانے کے صاحب علم بزرگ ہیں، میں بتا چکا ہوں کہ حضرت سلطان المشائخ سے براہ راست شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہے، اور حضرت کی خانقاہ کے متصل ہی ان کے والد کا مکان تھا، تعلیم بھی ان کی سلطان جی کے خلفاء سے ہوئی ہے، خود لکھتے ہیں کہ نعمت دیدار و مشاہدہ آں بزرگوار (سلطان المشائخ) بھی ان کو مسلسل حاصل ہوتی رہی اور ذوق مجلس رادت و مساس دستِ مبارک سلطان المشائخ ص ۳۵۹ سے سرفراز ہوتے رہتے تھے، اسی لیے میں ان کے بیان کو عام تذکروں کے بیان سے خصوصاً سلطان جی اور ان کے خلفاء کے متعلق ایک ایسا تاریخی بیان قرار دیتا ہوں جس کا مقابلہ دوسری تاریخی کتابوں سے مشکل ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حضرت والا کی بیعت ان کو ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی کہ بقول خود "درک معانی دراں ایام چنداں نہ بود" ص ۳۵۹۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت والا کی وفات کے بعد خود ہی لکھتے ہیں کہ معاملہ نفس کہ دشمن دینی ست برحسب مطلوب آنحضرت (سلطان المشائخ) نہ بود" اور اس کی وجہ بیچارے نے خود ہی لکھ دی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا "از غلبۂ جوانی چنانکہ افتد دانی مزاحم شد" ص ۳۶۳ یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سلطان جی کو خواب میں جب دیکھا تو میں قدموں کی طرف بڑھا لیکن "کسانیکہ بودند مانع ایں دولت می شدند" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حضرت والا کا وہ پختہ چشتی گہرا رنگ نہیں چڑھا تھا جو سلطان جی کے خلفاء اور مریدوں کی خاص شان ہے، اسی لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں، کچھ ان میں ایک رنگ تعصب کا بھی ہے، یعنی حضرت بابا فرید شکر گنج کے دوسرے خلفاء خصوصاً سلسلہ صابریہ کے شیخ حضرت علی صابر صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا ان کو بابا صاحب کے یہاں چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔ اگرچہ یہ الفاظ بھی لکھے ہیں "شیخ علی صابر درویشے قدمے ثابت و نفسے گیرا داشت ساکن قصبہ ڈیکری بوئے وپیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم داشت او را از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود" یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کبیر سے شیخ علی صابر نے کچھ چاہا تو فرمایا "بھوگا خواہی کرد" بھوگا کا ترجمہ کیا ہے "بشے خوش خوالد گشت" (بقیہ برصفحہ ۱۸۱)

ہیں، لیکن باوجود اس کے سماع و شرائط سماع کے متعلق حضرت سلطان المشائخ کے مسلک کو ان الفاظ میں درج کرتے ہوئے، کہ

چندیں چیزے می باید کہ تا سماع مباح شود مسمع (سُنانے والا کون ہے) مستمع (سُننے والے کیسے لوگ ہیں) مسموع (جو چیز سنائی جارہی ہے وہ کیا ہے) آلۂ سماع (کن آلات سے سماع ہو رہا ہے)

پھر ہر ہر جزو کی خود تفصیل کرتے ہیں،

مسمع (سُنانے والے کی شرط یہ ہے) کہ کودک نہ باشد، عورت نہ باشد، مستمع (یعنی سُننے والوں کے متعلق یہ شرط ہے) از یاد حق خالی نہ باشد، مسموع (جو چیز سنائی جائے اس کی شرط یہ ہے کہ) فحش و مسخرگی نہ باشد"

آخر میں "آلہ سمع" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آلۂ سماع مزامیر است چوں چنگ و رباب و مثل آں می باید کہ درمیان نہ باشد" ص ۴۹۲

میر خورد ہی نے حضرت سلطان المشائخ سے نقل کیا ہے کہ گانا سُننے والوں کا

"اگر میل کلی طرف مجاز است آں حرام است"

یعنی مزامیر ہوں یا نہ ہوں، لیکن جن لوگوں کے قلوب مادی حسن و جمال سے مالوف ہیں، ان کے لیے تو ہر قسم کا گانا سُننا "حرام" ہے۔ یہ سلطان جی کا فتویٰ ہے جو اُنھوں نے نقل کیا ہے، لیکن آج ان مسلمانوں کو کون جا کر سنائے، جو علانیہ بے دھڑک اپنے نوجوان بچوں اور عورتوں تک کو سینماؤں میں بھیجتے ہیں، خود ہر قسم کے گیت جو جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، لوگ سُنتے ہیں اپنے لڑکوں لڑکیوں، بیویوں کو سنواتے ہیں، اور اس طور پر مسلمانوں میں یہ عمل جاری ہو گیا ہے کہ گویا ان کے مذہب کا اس باب میں کوئی حکم ہی نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۸۰) مُرشخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جاتے ہیں شیخ محدث بھی متنبہ ہوئے ہیں، لکھا ہے کہ یہ طرز تحریر "خالی از غرابت نیست" بلکہ ان کو یہ شبہ ہے کہ کسی دوسرے علی صابر کا تو یہ تذکرہ نہیں ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۶۹)

Marfat.com

آج ہمارے صوفیہ اس پر تو آستین چڑھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جو ان کے سماع پر معترض ہو، اور جواب میں بزرگوں کا فعل یا قول پیش کیا جاتا ہے لیکن جن بزرگوں کے قول سے آپ سماع کا جواز ثابت کرتے ہیں اور ان کی نصرت و تائید کی حمیت آپ کو آپے سے باہر کر دیتی ہے، بندگانِ خدا! ان ہی بزرگوں کا تو یہ فتویٰ بھی ہے کہ آج جن خصوصیات کے ساتھ تھیٹروں میں سینماؤں میں گانا گایا جاتا ہے، یہ گانا "حرام" ہے، پھر آپ میں اس فتوے کی تعمیل کا کیوں جوش پیدا نہیں ہوتا؟ اس میں حمیت کی رگ کیوں نہیں پھڑکتی، کچھ نہیں تو جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ان ہی سے جہاں اور امور کا معاہدہ لیا جاتا ہے حرمت غنا کے اس صوفیانہ فتوے کا بھی معاہدہ لیا جاتا، یہ نہیں تو جو لوگ آپ کے زیر اثر ہیں ان کو کم از یہ بھی بتا دیا جاتا کہ غنا کی یہ شکل جو سینماؤں میں مروج ہے، یہ صرف فقہار اسلام ہی نہیں بلکہ صوفیار اسلام خصوصاً ہندوستان کے طریقۂ چشتیہ میں بھی حرام ہے، آخر کچھ تو لوگوں پر اس کا اثر ہوتا اب تو کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سینماؤں کی شرکت ایک قسم کا غیر شریفانہ فعل ہے اور وہ بھی ان لوگوں میں جن میں اسلام کا دبا ڈھکا کچھ نہ کچھ ابھی باقی ہے، حالانکہ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ گانے بجانے کے مسئلہ کو جن بزرگوں کی آڑ لے کر ایک حد تک جائز ٹھیرایا جا رہا ہے ان کے نزدیک بھی "سینمائی گانے" حرام ہیں، آج اسلام کے اس حکم کی قیمت لوگوں کو نہیں معلوم ہو رہی ہے، لیکن انسانی فطرت کی خصوصیات پر جن کی نظر ہے، جو جانتے ہیں کہ "گانا" اور "نغمہ" کا تعلق آدمی کے جذبات کے ساتھ کیا ہے خصوصاً جب ہیجان انگیز قصوں کی جیتی جاگتی تصویروں کے ساتھ اس کا میل کیا گیا ہو، انسان کی نقل اُتارنے والی فطرت ان تماشاؤں سے کن خطرناک عناصر کو چراتی ہے، اور اپنی عملی زندگی میں اس کو شریک کر کے لوگ اپنے آپ پر، اپنی آئندہ نسلوں پر جن کے وہ امین و محافظ ہیں، ان پر کیا کیا مظالم ڈھاتے ہیں، اور ڈھائیں گے، اس کا اندازہ ابھی نہیں اس ملک کو اس وقت ہوگا جب علاج کا بھی وقت باقی نہ رہیگا۔

Marfat.com

اور بوالعجبی تو یہ ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں ہمارے بچوں کی تعلیم وتربیت کی جو یونیورسٹیاں آج ٹھیکہ دار ہیں جن جوامع وکلیات ومدارس ومعاہدہ کے متعلق دعویٰ کیا جارہا ہے کہ "انسانی اخلاق" کے نشوونما اور بالیدگی کے وہ واحد ذرائع ہیں، ان میں خود نوجوان بچوں سے تمثیلی تماشے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے نام سے علانیہ کرائے جارہے ہیں، خام عمر کے ان بچوں کو جن کی شبابی زندگی بالکلیہ اس وقت جذبات وعواطف کے زیر اثر رہتی ہے، عقل کی خوابیدگی کے ان دنوں میں ان کو تباہی کے جن غاروں میں ڈھکیلا جارہا ہے اس کی فریاد کس سے کیجیے۔

یقین مانیے کہ اس کا بھی واحد علاج صرف نظامِ تعلیم کی وحدت ہے، کاش! اس مسئلہ کی اہمیت کو جتنا میں سمجھ رہا ہوں، دوسروں کی سمجھ میں بھی یہ بات آجاتی تو مسئلہ کچھ زیادہ مشکل نہ تھا، آخر اتنا مشکل تو نہیں ہے جتنا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ لیکن زمانہ کو اختیار ہے جس چیز کو چاہے اہم قرار دے اور جسے چاہے بے معنی، لغو، فضول کہہ کر ٹال دے لوگ "فرعون" سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ "فرعونیت" سے نجات پانے کی کوشش کی جائے

یعقوب کی اولاد اور اسرائیل کے بچوں کو فرعون کے پنجہ سے رہائی مل چکی تھی لیکن "فرعونیت" اور اس کے لوازم وشعائر کا بھوت ان پر پھر بھی سوار ہی تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو "مصری تمدن" کے شعار خاص البقرہ گائے کے متعلق سوال وجواب کی بھرمار کے ساتھ

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ تو بنی اسرائیل نے گائے تو ذبح کرڈالی لیکن قریب تھا کہ اس کام کو وہ نہ کرتے۔

کی ہچکچاہٹ میں کیوں مبتلا ہوتے۔

آپ خوش ہیں کہ یہ سارے عوارض صرف ان تعلیم گاہوں تک محدود ہیں جہاں بقول آپ کے صرف "دنیاوی علوم" کی تعلیم دی جاتی ہے، باور کیے بیٹھے ہیں کہ "دینی علوم"

Marfat.com

کے مدارس ابھی ان آفات سے محفوظ ہیں، بلا شبہ ابھی ماحول کے سمی اثرات دینی مدارس میں کم منتقل ہوئے ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ دینی مدارس کے بکروں کی ماؤں کو خیر منانے کا موقعہ کب تک ملتا رہیگا۔

پرانی صحبتوں کے دقیانوسیوں کی آنکھوں کو بند ہونے دیجیے اور ظاہر ہے کہ بالآخر انہیں بند ہونا ہی پڑیگا، پھر ہم ہونگے یا نہ ہونگے لیکن دبے پاؤں جو چیز مختلف راہوں سے دینی علوم کے ان قلعوں میں بھی گھس رہی ہے، خصوصاً سیاسی سوراخوں سے نامحسوس لہریں مخفی طور پر پہنچ رہی ہیں، جو آنچ لگ رہی ہے ایسی صورت میں بس ان کا محافظ اللہ ہی ہے!

واللہ خلیفۃ علی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کچھ مصر کے عصری تجربات بھی ان امور کی طرف اشارے کر رہے ہیں، جنہیں میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کاش! نہ دیکھتیں کہ اس بصیرت نے جگر کو خون بنا دیا، جنون کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے، جب اس مستقبل کا دھیان آتا ہے، جن کی طرف سے دیکھ رہا ہوں کہ عام طور پر غفلت برتی جا رہی ہے۔

اُف میں پھر بہنے لگا، گفتگو خواجگانِ چشت کے مسلک سماع میں ہو رہی تھی، اور نکل آیا پھر وہی اسکولوں اور کالجوں کی طرف، میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کا ارادہ نہیں ہے، لیکن مزامیر کے متعلق جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس کے متعلق جو صحیح واقعات تھے، شاید اُن کا ذکر نہ کرنا گناہ ہو جاتا، آپ دیکھ چکے کہ "سماع" کے متعلق جس چشتی بزرگ کی سب سے زیادہ شہرت ہے عام تاریخوں میں بھی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے، آج ہی نہیں، خود سلطان المشائخ کے زمانہ میں بھی اس مسئلہ نے مختلف طریقوں سے فتنہ کی صورت اختیار کی، غیاث الدین تغلق کے دربار میں باضابطہ مناظرہ کی مجلس مرتب ہوئی، سوال وجواب ہوا، حالانکہ اس کی کل حقیقت

Marfat.com

اتنی بھی کہ کبھی کبھی سلطان المشائخ ان خاص شروط کے ساتھ جس کا ذکر میں نے قصداً امیر خورد کے حوالہ سے کیا ہے، اس لیے کہ ان کو "مسئلہ سماع" سے خاص دلچسپی ہے، ان کی کتاب کا ایک بڑا حصہ اسی مسئلہ کے متعلقہ مباحث سے بھرا ہوا ہے۔

لیکن باوجود اس اصرار کے وہی راوی ہیں کہ ان ہی شروط کے ساتھ سلطان المشائخ کبھی کبھی سماع سُن لیا کرتے تھے، ان شروط کے ساتھ بھی ان کے سماع کی کیا کیفیت تھی، اور اس کا مقصد کیا تھا؟ اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمان شعراء نے فارسی میں بہت زیادہ اور عربی میں کم بقول غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ایک خاص طریقہ کلام کا اختیار کیا تھا، جو آدمی ان شعراء کی اصطلاحوں سے ناواقف ہے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو نہ مسلمان ہیں اور نہ ہماری شاعری کی اس خصوصیت سے واقف ہیں۔ ان کو اس پر حیرت ضرور ہوتی ہے کہ "می و ساغر" سے "مشاہدۂ حق" کی گفتگو کا کام مسلمان کیسے لیتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ تقریباً تیسری چوتھی صدی سے اسلامی شعراء کے کلام میں یہ رنگ پیدا ہوا، ہمارے شاعروں نے اپنی کثرتِ مشق سے مسلمانوں کو ان الفاظ سے اتنا مانوس کر دیا ہے کہ حقیقی معانی کی طرف ذہنوں کا منتقل ہونا گویا اب دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے سوا بھی صوفیہ اسلام نے اس کے دائرہ کو یوں وسیع کر دیا کہ بولنے والے کی خواہ کچھ ہی مُراد ہو ہمیں اس سے بحث نہیں، انھوں نے ان الفاظ کا جو عام طور پر شعراء استعمال کرتے ہیں خاص خاص مطلب طے کر لیا تھا، اور ان مطالب کے ساتھ ان کی مشق اتنی بڑھ گئی تھی کہ گویا وہی مطالب ان کے نزدیک ان الفاظ کے حقیقی مطالب اور معانی ہوتے تھے، اور یہ کوئی چھپی ڈھکی راز کی بات نہ تھی، سلطان المشائخ کی مجلس کے محدث و عالم مولانا فخر الدین زرادی نے تو صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ

Marfat.com

"اگر مستمع (سننے والا) سماع حمل کند بر صورت مخلوق معین یا غیر معین۔ ایں سماع جوانان ذی شہوت بود"

الغرض سماع میں بڑی شرط یہ تھی کہ الفاظ کو ان معینہ مطالب پر محمول کرنے کی صلاحیت و مشق پیدا ہو چکی ہو، جو صوفیہ میں معین ہیں مثلاً۔

"مستمع (سننے والا) سماع را حمل کند بر احوال نفس خود، بتقلیب احوالے کہ با خدا تعالیٰ دارد"

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک بندے کا تعلق اطاعت و نافرمانی کے حساب سے حق تعالیٰ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے، جس کا احساس خود اس شخص کو ہو سکتا ہے جس کا خدا سے معاملہ ہے، اسی لیے صوفیہ اشعار کو

"در سلوک احوالے کہ پیش آید از قبول و رد و وصل و ہجر طمع و نومیدی"

ان ہی باتوں پر حمل کرتے ہیں، اور سلطان المشائخ سے اشعار کے محمول کرنے کے متعلق جو بیان سیر الاولیا میں منقول ہے، یعنی

"از لعف قرب خواہد بقولہ تعالیٰ لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ وازلون جنت دار چشم نظر رحمت ولتصنع علی عینی وکفر پوشیدن باشد ... یعنی تا ہستی واعمال و صدق بر تو پوشیدہ نشود دعوی عشق از تو درست نیاید" ص ۴۹۴

اور یہی میرا خیال ہے کہ در اصل قرآنی آیات کے ترجموں کو ایک خاص طریقہ سے یہ حضرات خوش الحانی کے ساتھ کبھی کبھی سن لیا کرتے تھے، میں نے کسی جگہ شیخ کبیر کا حال نقل کیا ہے کہ حجرۂ مبارک میں ٹہلتے اور کبھی کبھی سر بسجود ہو کر یہ اشعار پڑھتے۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم | خاکے بشوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی | از بہر تو میرم از برائے تو زیم

میں نے بتایا تھا کہ یہ آیت قرآنی ان صلوتی ونسکی کا حاصل ہے جسے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے میر خورد نے بعض ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جس سے سلطان المشائخ کبھی کبھی بہت متاثر

ہوئے تھے مثلاً

ترنج جملہ را نمود و مرا گفت تو ببیں   زین ذوق مست بے خبرم کیں سخن چہ بود

آپ ہی بتائیے کہ اگر اس شعر کو سن کر کسی کا ذہن

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہونگے اپنے رب کے نگراں

یا،

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ہاں! وے لوگ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہونگے

کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور اسی کیفیت میں وہ ڈوب جائے۔ تو وہ قرآن میں ڈوبا، یا کسی اور چیز میں ڈوبا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ اپنے ان تعلقات کو جو قرآن نے عبد و معبود یا امتی و رسول میں پیدا کیے ہیں۔ اسی کو ذرا بیدار اور زندہ کرنا چاہتے تھے، اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ خاص احباب کا مجمع ہو، ہم مذاق لوگ ملے جلے بیٹھے ہیں، کسی نے چند اشعار گا کر سنا دیے۔ اس میں کچھ خاص پیشہ ور قوالوں کی بھی حاجت نہ تھی، بہ کثرت آپ کو واقعات سلطان المشائخ ہی کے حالات میں ملینگے کہ امیر خسرو نے یا ان کے صاحبزادے امیر حاجی نے پڑھنا شروع کیا، کبھی شیخ نظام الدین پانی پتی جو قوال نہ تھے، وہ سناتے تھے۔ انتہا تو یہ ہے کہ حضرت شیخ کبیر کے حقیقی نواسے خواجہ محمد جو سلطان المشائخ کے باضابطہ جو ... کے امام بھی تھے، وہی سنا دیتے، کچھ اشعار کی بھی ضرورت نہ ہوتی اگر ان سے لطف آتا تو فرما دیتے کہ

له شیخ العلماء سیدنا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے فرماتے تھے کہ جنتی آدمی کی چیز کی دی جاتی ہے جس کا خواہشمند ہو، قرآن کی ایسی دھمکیاں کہ حق تعالیٰ اس کی طرف نگاہ نہیں کرے گا، قیامت کے دن اپنے رب سے وہ محجوب ہوگا یہ دھمکی اسی وقت ہو سکتی ہے جب مانا جائے کہ آدمی کی فطرت میں اس کی تڑپ موجود ہے، فرماتے تھے اوروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن میرے لیے تو ہزار دوزخ کی دھمکیوں سے لا ینظر الیہم کی دھمکی زیادہ زہرہ گداز ہے ۱۲

"سماع را بدار ید، وبہ حکایات دآثر بزرگان مشغول شوید" ص ۲۰۱ سیر الاولیاء

اور اب تو اس کا دستور نہ رہا، لیکن خواجگانِ چشت کے ایک مشہور رکن رکین خواجہ ممشاد علو دینوری کے زمانہ سے یہ روایت چلی آتی تھی، ان کا بیان تھا، کہ خواب میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو زیارت ہوئی تھی، اس وقت انھوں نے سماع کے متعلق دریافت کیا کہ حضور کو ہمارا یہ طریقہ اشعار سُننے کا ناپسند ہے؟ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں ناپسند تو نہیں کرتا لیکن

قل لھم یفتحون قبلہ بالقران و — لوگوں سے کہو کہ وہ قرآن سے آغاز کریں، اور قرآن

یختمون بعدہٗ بالقران (سیر الاولیاء ص ۲۹۶) — ہی پر ختم کریں۔

لیکن افسوس کہ بہ تدریج یہ رسم غالباً مٹ گئی، اور اب تو سماع کی مجلسوں کا جو حال ہے، اچھا ہی ہوا کہ قران کو ایسی مجلسوں سے الگ کر دیا گیا۔

بہرحال جس قسم کے سماع کا رواج خواجگانِ چشت کے معماران اولین میں تھا، اس کی تو یہ حالت تھی اور مقصود اس کا وہی تھا، جو میں نے عرض کیا حسن علا سنجری نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ

"مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر است اگر روزے وقتے خوش وقت دریافت ہمہ اوقات متفرقہ اں روز بناہ اں وقت باشد" فوائد الفواد ص ۹۶

اسی کے ساتھ ظاہر ہے کہ خوش الحانی کے ساتھ اشعار سُننے کو صرف جائز سمجھتے تھے، نہ کہ فرض و واجب، یا سنت و مستحب آپ کا یہ ضرور خیال تھا کہ جو لوگ اس طریقہ سے بھی اشعار سُننے کو حرام سمجھتے ہیں، تو ان لوگوں کو بھی اس پر اتنا اصرار نہ کرنا چاہیے؛ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ

"خود نشنود اما با دیگراں خصومت نہ کند" فوائد ص ۲۲۸

اور یہ منافع تو وہ تھے جو اشعار سننے سے ان بزرگوں کے پیش نظر تھے، لیکن اوروں کا تو میں

Marfat.com

نہیں کہتا، البتہ سلطان المشائخ نے جس طریقہ سے اس سماع کو سنا ہے، جو کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان ہی تک محدود نہیں رہتی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب کیا حال تھا، لوگوں کا بیان ہے کہ

"دراں ایام ہر بیتے و صوتے کہ حضرت سلطان المشائخ را در سماع ذوق دادے آں صوت و آں بیت ملتے مدید در میان خلق مشہور شدے، خورد و بزرگ، وضیع و شریف در مجلسہا و محلت ہا و محفلہا و کوچہا و دقہا می گرفتند"

اسی کے بعد لکھا ہے کہ

"کار محبت و عشق را روز بازارے در جہاں پیدا آمدے" (سیر الاولیا ص ۵۱)

یہ اس شخص کا بیان ہے جو اس زمانہ میں خود موجود تھا۔ آپ اس کے ساتھ علاء الدین خلجی کے اس مشہور فقرہ کو ملائیے جس کے ناقل بہت سے لوگ ہیں، یعنی سلطان المشائخ کی دن دونی مقبولیت کو دیکھ کر گو دوسروں کے اشارے سے ہی لیکن اس کو خطرہ ہوا کہ سلطان المشائخ کی موجودہ مقبولیت عامہ روزے از روزہا کوئی سیاسی کروٹ نہ لے علاء الدین کے یہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

"مقربان، ولوازم و جوانب تخت من و سائر خلق بندہ و مرید او (سلطان المشائخ) شدہ اند حیلہ باید انگیخت تا ازیں او چیزے مارا روشن شود" (سیر الاولیا ص ۱۳۳)

علاء الدین نے اس کے لیے جو حیلہ کیا مجھے اس سے بحث نہیں ہے بلکہ بتانا یہ ہے کہ عہد علائی کے اکثر امرا، ملوک و عمائد سلطان المشائخ کے مرید ہو گئے تھے حتیٰ کہ خود علاء الدین کا ولی عہد خضر خاں جسے دیول رانی کے قصہ کی وجہ سے امیر خسرو نے ذکر دوام کی سند دے دی ہے وہ بھی حضرت کے خاص مریدوں میں تھا، امیر خورد اسی زمانہ کے آدمی ہیں، ان کی بھی یہی شہادت ہے۔

"خلقے از علماء و مشائخ و امراء و ملوک مریداں حضرت گشتند"

Marfat.com

بہرحال اتنا تو سب ہی کو مسلم ہے کہ عہد علائی وہ زمانہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی طرف سے سلطان المشائخ کے حسنِ قبول کا آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا، عموماً مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی طرف تھا، ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمومی پیشہ فوجی خدمت ہی تھا، حضرت والا کے دونوں مشہور شاعر مرید امیر خسرو اور امیر حسن علا، ان دونوں بزرگوں کو بھی ہم مختلف فوجی مہموں میں شریک پاتے ہیں۔

ان واقعات کے بعد ایک تاریخی سوال ہے جو آج ہی نہیں جب سے واقع ہوا ہے، اُٹھایا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ مسئلہ مخفی نہیں ہے، جیسا کہ طبا طبائی نے بھی لکھا ہے۔

فتوحاتیکہ در اطراف ممالک ہند و دکن، سلطان را میسر آمد و احداث عمارات و ادخار (جمع کرنا)

خزائن در کمال فور در عہد او صورت گرفت ہیچ یک از سلاطین ہند را دست نداد ص ۹۰"

واقعہ یہ ہے کہ علاء الدین ہی کے زمانہ میں اسلام کی راہ دکن میں کھلی، اسی نے چتوڑ، رنتھنبور کے ناممکن التسخیر قلعوں کو فتح کیا، جنوبی ہند میں، نہ صرف دیوگڑھی کے مشہور قلعہ کو اس نے فتح کیا، بلکہ ورنگل کی حکومت بھی اسی کے ہاتھ سے مسخر ہوئی، اور بقول بدائونی

"در لشکر ولایت معبر (مدراس)، تا دہور سمندر[1] در حوزہ تصرف اہل اسلام درآمد ص جلد

حتیٰ کہ اپنی اسی فوجی قوت پر اس کو اتنا ناز ہوا کہ پہلے تو دماغی فتور میں مبتلا ہوا کہ کوئی نیا مذہب ہی جاری کرے، لیکن جب علاء الملک نے اس کی تفہیم کی تو اس سے باز آیا، پھر اس کا خیال جمانے لگا کہ

مانند سلطان سکندر رومی بہ تسخیر اقالیم سبعہ پردازد، و فرمود تا او را اسکندر ثانی در خطبہ خوانند و در سکہ نیز ہمیں لفظ داخل کرد" سیر المتاخرین ص ۱۱۷

گو علاء الدین اس ارادہ سے بھی باز آگیا، اور اسی کے مقابلہ میں ہندوستان کے باقی ماندہ حصوں کے فتح کا عزم کیا جس میں، وہ کامیاب ہوا، لیکن علاء الدین تو خیر مر گیا، اور

[1] اب میسور کا ایک غیر مشہور قصبہ یہ دہور سمندر کا شہر ہے ہی زمانہ میں اس علاقہ کا یہی مرکزی مقام تھا ۱۲

Marfat.com

اس کی موت کے بعد حکومت کا نظام کچھ درست نہ ہو سکا، لیکن علاء الدین کی موت کے کل نو سال بعد اسی فوجی قوت کے بھروسہ پر جو اس زمانہ میں ہندوستان میں مہیا ہو گئی تھی، محمد تغلق بھی وہی "چوں سکندر ربع اقالیم سبعہ را تسخیر نماید" (ص ۱۲۵) کا قصد صمیم کرنے لگا۔

یقیناً سوال ہوتا ہے کہ آخر ہندی فوجیوں میں یہ بے نظیر طاقت جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے، اور نہ اس زمانہ کے بعد اس کے اسباب کیا تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندی حکومت کی قوت اس زمانہ میں اتنی قوی نہ ہوتی، تو تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ تاتاریوں کے مسلسل حملوں کی مدافعت ناممکن تھی، ہر برس دو برس کے بعد ٹڈی دل شکلوں میں چنگیز خانی تاتاری کفار ہندوستان کے اسلامی ملک میں سر نکالتے تھے، لیکن ہر بار ان کو بری طرح ہزیمت اٹھا کر واپس جانا پڑا، تاتاریوں کا یہ ہجوم جب آتا تھا تو لاکھ دو لاکھ سے کم نہ ہوتا تھا، تفصیلات کے لیے اس عہد کی قدیم تاریخیں پڑھیے، میں نے جیسا کہ عرض کیا، یہ سوال نیا نہیں بلکہ پرانا ہے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، یعنی عہد علائی کے حیرت انگیز فتوحات اور مدافعات دونوں کے متعلق جو توجیہیں کی جاتی تھیں وہ یہ تھیں، ملا صاحب کے بجنسہ الفاظ یہ ہیں۔

"ایں فتوحات را بعضے حمل بر استدراج (یعنی ظالم کی خدا نے رسی دراز کی ہے) و بعضے بر کرامات سلطان علاء الدین می کردند و بعضے امن و امان عہد را از برکات بے نہایات سلطان المشائخ نظام الاولیاء قدس سرہ می دانستند"

ظاہر ہے کہ علاء الدین نے اپنے مربی و سرپرست چچا و خسر سلطان جلال الدین خلجی جیسے نیک،[1]

---

[1] اصل قصہ تو تاریخ میں پڑھیے لیکن اس لیے کہ بسا اوقات معمولی عورتوں کے خاندانی جھگڑے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں، اتنا ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ سلطان جلال الدین خلجی جو بڑے دیندار مسلمان تھے، انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی علاء الدین اپنے بھتیجے سے کر دی تھی لیکن علاء الدین کی ساس اور اس کی بیوی دونوں کی علاء الدین سے نہیں بنتی تھی اسی خانگی زندگی کی تلخیوں سے مجبور ہو کر اپنے علاقہ کڑہ مانک پور سے گویا اچانک معمولی سی فوج لے کر جنوبی ہند کی طرف غائب ہو گیا، جس کی جلال الدین کو بھی خبر نہ تھی (بقیہ بر صفحہ ۱۹۲)

Marfat.com

دیندار بادشاہ کو انتہائی سفاہت کے ساتھ ضرور قتل کیا تھا، لیکن

لیس ھٰذا اول قارورۃ انکسرت فی الاسلام — لیکن یہ پہلا شیشہ نہ تھا جو اسلام میں ٹوٹا تھا۔

کوئی پہلا آبگینہ نہیں تھا، جو اسلام میں ٹوٹا تھا، پھر علاء الدین ہی کے ساتھ استدراج کے کیا معنی ہو سکتے تھے، نیز فوجی طاقت کا یہ ناز تو محمد تغلق تک باقی تھا، اگر قوت محسوس نہ ہوتی تو ہفت اقلیم کی فتح کا غلط ارادہ بھی کیوں پیدا ہوتا، رہی علاء الدین کی کرامت سو ظاہر ہے کہ گو بعد کو وہ تائب ہو گیا تھا، شراب بھی اس نے چھوڑ دی تھی لیکن باایں ہمہ ایک معمولی دنیا دار بادشاہ سے زیادہ حیثیت اس کی کبھی نہ رہی۔

پھر آپ کو خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس عہد کے مسلمانوں میں جاں فروشی، جانبازی کی ایسی بے پناہ قوت کہاں سے آ گئی تھی، کہ بڑے سے بڑے قلعے جو برسوں میں فتح نہیں ہو سکتے تھے، ہفتہ دو ہفتہ میں ان کا سقوط ہو جاتا تھا، حوصلوں کی وہ بلندی کہ آج دلی میں ہیں، کل لکھنوتی، پرسوں دیوگڑھی، چوتھے دن کھمبائت، معبر، ورنگل کے قلعوں کے نیچے ان کے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں، رعب کی یہ حالت کہ آنکھ ملانے کی ہمت بھی دشمنوں کو نہیں ہوتی، ایک طرف یہ حال ہے، دوسری طرف تاتاریوں کا سیلاب آتا ہے اور سرحد ہی پر یا جس مقام پر وہ ظاہر ہوتے ہیں، وہیں روک دیے جاتے ہیں۔

یہ واقعات ہیں خیالات نہیں ہیں، پھر انقلاب کی وجہ کیا ہوئی؟ یہ قوت مسلمانوں میں کس سرچشمہ سے بھری گئی؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱) اب ھذا شرے برانگیزد کہ خبرداراں باشند علاء الدین کے ساتھ جو فوج تھی وہ سرفروشوں کا ایک مجمع تھا، دکن میں جو بھی ان کے سامنے آیا ٹھہر نہ سکا۔ اس غیر متوقع کامیابی کے بعد علاء الدین پھر اپنے علاقہ میں واپس آیا، اور خانگی تلخیوں کے مٹانے کی کوئی تدبیر اب اس کے سامنے نہ تھی بجز اس کے کہ اس نمک حرامی اور سنگدلی پر آمادہ ہو جائے جس کا ذکر عام تاریخوں میں ہے یعنی سلطان جلال الدین کو بڑی بے دردی کے ساتھ اسی نے قتل کر دیا، اور خود تخت ہند پر متمکن ہو گیا ۱۲

Marfat.com

بات یہ ہے کہ یوں کہنے کو تو جو کچھ کہا جائے اور کہنے والوں نے جب علاء الدین کی کرامت ہی کا دعویٰ کیا ہے، تو ظاہر ہے اور جو توجیہ بھی کی جائیگی وہ اس سے زیادہ کیا تعجب انگیز ہوگی؟

جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس میں سلطان المشائخ کے وجود کو جیسا کہ اس زمانہ میں بھی محسوس کیا گیا تھا، ہندوستان کی "فوجی قوت" کی اس خاص کیفیت کے پیدا کرنے میں ان کو بالکل بے تعلق نہیں کہا جا سکتا، اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جسے ہم ماورار عقل قرار دیں، بلکہ واقعہ وہی ہے جس کا ایک دفعہ نہیں، متعدد بار تجربہ کیا گیا ہے اور جس کا جب جی چاہے، تجربہ کرلے۔ وہ قرآنی آیات اور اس کی تعلیمات کا بے پناہ زور ہے، آپ سن چکے کہ سلطان المشائخ جس شعر سے خاص ذوق و مستی کی حالت میں آجاتے تھے اور وہ زیادہ تر

فاعلم انہ لا الہ الا اللہ ۔ پس جان لے کہ نہیں ہے الٰہ مگر اللہ ہی

کا فارسی ترجمہ ذرا شاعرانہ رنگ میں ہوتا تھا اُسی وقت وہ شعر سارے شہر بلکہ ملک میں مشہور ہو جاتا تھا گلیوں میں کوچوں میں لوگ اسی کو دہراتے پھرتے تھے، سلطان المشائخ کے جن حالات کے ساتھ ان خاص اشعار کی شہرت مسلمانوں میں ہوتی رہتی تھی کیا یہ ممکن تھا کہ جس دل میں ایمان کا حبہ خردل بھی ہوتا ہوگا، اس کا سینہ سلطان المشائخ کی اس بھڑکائی ہوئی آگ سے بھبک نہ اُٹھتا ہوگا، سلطان المشائخ کے زمانہ میں فراخنائے ہند کے قدیم جغرافیہ میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے، کاش! اس پر کچھ لکھا جاتا، صورت حال کے اندازہ کے لیے میں "چندیری" کی فتح کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتا ہوں، جسے میر خورد نے خود سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے، یعنی

"در عہد علائی والی از بادشاہ برائے فتح چندیری با لشکر بسیار تعین شد داد (والی) از معتقدان حضرت سلطان المشائخ بود"

میر خورد نے لکھا ہے کہ والی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور التماس کیا۔

"اگر یارے (خلفائے خاص میں سے کوئی خاص خلیفہ) از حضرت سلطان المشائخ

نیز بر ما نام زد شود"

حضرت والا نے مولانا وجیہ الدین یوسف کو لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔

"و در ولائت چندیری رواں کرد"

اب خدا ہی جانتا ہے کہ حضرت کے یہ خلفا، فوج میں کس قسم کے جذبات پیدا کرتے تھے کہ

"در اندک روز فتح آں مقام شد"

آج اس غریب چندیری کا تو بہتوں کو نام بھی معلوم نہ ہوگا، لیکن جس زمانہ میں مسلمانوں کو اس علاقہ پر کشمکش کرنی پڑی تھی اس کا حال تاریخوں میں پڑھیے، ہر ہر پرگنہ جس کا سنگین اور خشتین قلعوں سے پٹا ہوا تھا، ابو الفضل نے صرف اس علاقہ کا جس کا نام اس زمانہ میں بارہ تھا، لکھا ہے۔

"محل، دہر ترنج پرگنہ قلعہ دارند ازاں جملہ چہار سنگین و پرگنہ مال خشتین"

خود چندیری خاص اور اس کے قریب للت پور تھنوارہ ہر جگہ "قلعہ سنگیں" بنے ہوئے ہیں لیکن اس علاقہ کی قلعہ کشائیوں کا جو کام برسوں میں بھی انجام نہیں پا سکتا تھا، بلبن کی قاہرہ حکومت بھی چندیری کی فتح سے مایوس ہو چکی تھی، آپ سن چکے کہ "در اندک روز فتح آں مقام شد" اور کیا صرف فتح کر کے ہی یہ سرزمین چھوڑ دی گئی؟ مجھے ذاتی علم تو نہیں ہے لیکن ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس علاقہ کے صرف ایک مرکزی شہر چندیری کے متعلق لکھا ہے کہ

از بزرگ شہر ہائے باستانی (قدیم ہند) قلعہ سنگین دارد در وچہار[۱۴] دہ ہزار سنگین خانہ

بزرگ وسہ صد[۳] وہشتاد بازار وسہ صد[۳۶] وشصت فراخ سراو دو[۱۲] ازدہ ہزار مسجد[۳]

آپ چودہ ہزار سنگین کوٹھیوں، اور تین سو اسی بازار تین سو ساٹھ سراؤں کے متعلق جو چاہیے

رائے قائم کیجیے، خواہ انہیں قبل الاسلام یا بعد الاسلام کے کارناموں میں شمار کیجیے لیکن اس گمنام شہر کی بارہ ہزار مسجدوں کی توجیہ میں بھی کیا اس کے سوا کچھ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد یوسف وجیہ الدین کے سوا یہ مسجدی مذاق کسی اور کا پیدا کیا ہوا تھا؟ تاریخ ہمیں جب یہ بتاتی ہے کہ

"خلق چندیری بخدمت مولانا محمد یوسف توجہ کرد" سیر الاولیا ص ۲۸۷

میر خورد اپنی چشم دید گواہی کا بھی اضافہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

کاتب حروف ایں بزرگ را دریافتہ بود، ذوق مجلس او گرفتہ بیشترے خلق چندیری مریدان او اند" ص ۲۸۰

سچی بات یہی ہے کہ حضرت سلطان جی کے زمانہ میں ایمانی عواطف وجذبات کو بیدار کر کے جب قرآنی یقین کے قابو میں ان جذبات کو کر دیا جاتا تھا "از بہر تو میرم از برائے تو زیم" کی ٹھوکر سے جو آگ پیدا ہوتی تھی، اسے عقل

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	میری نماز میری قربانی میری زندگی میری موت سب کچھ جہانوں کے پالنے والے اللہ ہی کے لیے ہے۔

کے قطعی یقین کی گرفت میں دے دیتی تھی، اور گو "قرآن" کی یہ "روح" بظاہر چند لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن سارے مخلوقات سے ٹوٹ کر واقعی اپنی پرورش کرنے والی لامحدود قوت کے ساتھ جو جٹ جاتا ہے، کیا دنیا بھر کی پھر کوئی طاقت اس کو نیچا دکھا سکتی ہے۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا۔	اور جس نے طاغوت (خدا سے ہٹانے والی قوتوں سے رشتہ توڑا یعنی لا الٰہ کا مقام طے کیا) اور اللہ کو اس نے مان لیا (الا اللہ پر ڈٹ گیا) تو اس نے ایک ایسے مضبوط کڑے کو تھاما ہے جس میں مسک بھی پیدا نہیں ہوسکتی

میں یہ نہیں کہتا کہ حضرت سلطان المشائخ جان بوجھ کر اس ذریعہ سے ہندوستان کی فوجی قوت

Marfat.com

کو بڑھانا چاہتے تھے، میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان کے عشق جہاں سوز کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، جس قوت سے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھاما تھا، یقین کے جس نہ سکنے والی چٹان ...... پر انہوں نے قدم جمایا تھا، ان کے زمانہ میں انسانیت کو اپنے مالک کے قدموں پر جس اضطراب و بے تابی سے تڑپتے ہوئے ہندی مسلمانوں کی شکل میں پایا گیا تھا، ایمان کا یہ ذوق، یہ وارفتگی، یہ شوق یہ ولولہ، شائد اس ملک کو نہ اس سے پہلے نصیب ہوا، اور نہ بعد، پھر اگر اس کے نتائج بھی بے مثال ہیں تو آخر آپ ہی بتائیے کہ اور ہوتا ہی کیا؟

وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ۝ (آل عمران) — اگر تم مرگئے یا قتل ہو گئے، تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔

کے غیر مشتبہ علم کا دباؤ، بھڑکے ہوئے جذبات پر پڑ جاتا تھا، تو کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ

سَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ. (آل عمران) — لپکو اپنے مالک کی مغفرت اور بخشائش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی فراخی آسمانوں اور زمین کی فراخی جیسی ہے۔

کی تعمیل میں پھر کوئی پس و پیش کر سکتا تھا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ) — مول لے چکا ہے اللہ ایمان والوں سے ان کی جانوں کو اس معاوضہ میں کہ انہیں "الجنۃ" ملیگی۔

کے "وعدہ" کے متعلق کسی مومن کا ایمان مجمل مفصل بن بن کر اگر ان خوارق و نوادر کا ظہور ان سے کراتا تھا جن کا مشاہدہ ہم اس زمانہ میں کر رہے ہیں تو جذبات و عقل و ایمان تینوں کے باہمی اجتماع کا ہمیشہ لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ بعد کو صرف جذباتی ہیجانات تو رہ گئے لیکن عقل و "یقین" کے جس لازوال سرچشمہ سے سیراب ہو کر ان جذبات کو عملی پیکروں میں جلوہ گر

کرتی تھی، بہ تدریج اس کا قرآن سے تعلق ٹوٹتا چلا گیا، اور آخر میں وہی سماعی اشعار جن سے عمل پیدا ہوتا تھا، صرف ایک وقتی ہیجان اور کیفیت پیدا کر کے عمل کے میدان میں اپنے سارے زور و شور کھو بیٹھے تھے، اور وہی بات صادق آتی تھی، جو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

الغناء ینبت النفاق — گانا نفاق اگاتا ہے

وجد و حال کی مجلسوں کے سارے دعوے اعمال کے حلقوں میں پہنچ کر ایسی صورت میں جھوٹ بن جاتے ہیں اور ع فی الشمس ما یغنیک عن زحل۔ اور یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں، جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اسے دیکھ کر آپ جو چاہیے رائے قائم کیجیے۔ لیکن آپ جو کچھ سُن رہے ہیں، آپ کو جو کچھ اب تک سُنایا گیا ہے کیا ان شنیدوں پر اپنے دیدوں کا قیاس کرنا صحیح ہوگا کسی نے شیخ کبیر شکر گنج سے ذکر کیا کہ مشائخ چشت کے طریقہ سماع پر بعض علماء کو اعتراض ہے۔ فرمانے لگے:۔

"سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد، و دیگرے ہنوز در اختلاف ست"

آج کیا دیکھا جا رہا ہے اور کل کیا دیکھا گیا تھا، دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے، پچانوے سال کے بعد شیخ کبیر شکر گنج کی اس ناسوتی دنیا میں آخری رات تھی، سلطان المشائخ راوی ہیں

نماز خفتن و عشاء بجماعت بگذارد، بعد ازاں بیہوش گشت ساعتے بہ ہوش آمد پرسید کہ نماز خفتن گذاردہ ام گفتند آرے، گفت یکبار دیگر بگذارم کہ داند چہ شود، دوم کرت نماز گذارد باز بے ہوش شد ایں بار بے ہوشی بیش تر شد باز بہوش آمد پرسید کہ من نماز خفتن گذاردہ ام گفتند دوبارہ بگذارم الخ (سیر الاولیاء ص ۸۹)

الغرض یوں ہی پچانوے سال کی مشق سجدہ گزاری انہیں ہوش آنے کے بعد پھر اسی کام پر مجبور کرتی تھی جس کے لیے عمر بھر جیتے رہے، غالباً تین دفعہ یہ صورت پیش آئی، بعد ازاں برحمت پیوست" اور اسی سیرت فریدی میں فانی ہو کر جس نے بقا حاصل کی تھی، ایک کم

Marfat.com

نوے سال (۸۹) کی عمر پائی تھی، ان ہی سلطان المشائخ کا بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں یہ حال تھا،

پنج وقت نماز بجہت جماعت از بالائے بام جماعت خانہ کہ عمارتے بس رفیع است فرود آمدے وبا درویشاں وعزیزاں کہ در آں جمع ملکوت حاضر می شدند نماز گذاردے۔ (سیر الاولیاء ص ۱۲۴)

اور "عمارتے بس رفیع" سے پانچوں وقت نیچے اُتر کر جماعت کی شرکت عموماً روزہ کی حالت میں ہوتی تھی، کیونکہ یہ تو صحیح نہیں ہے کہ آپ ایام محرمہ کے سوا ہمیشہ روزہ دار رہتے تھے، لیکن یہ صحیح ہے کہ مہینے کے زیادہ دن روزوں ہی میں بسر ہوتے تھے، علاوہ ان خاص مُریدوں کے جن کا لقب آپ کے حلقہ میں "یارانِ نظام الدین" تھا، اور جن کی تربیت کی شرط حضرت کے نزدیک

"درصحبت ما باش، یا ما درصحبت تو باشیم" ص ۳۲۱

ان یارانِ خاص کے سوا، آپ نے بیعت کے دائرہ کو جب بہت زیادہ وسعت دے دی تو مولانا ضیاء الدین برنی جو آخر میں حضرت ہی کے آستانہ پر آکر پڑ گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ حضرت نے ایک دن مجھ سے اس بیعت عام کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا، آپ نے پہلے تو اس مسئلہ کی ایک مختصر تاریخ بیان کی، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابتداء میں مشائخ طریق اُن ہی لوگوں کی تربیت فرماتے تھے، جو بالکلیہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اللہ اور رسول کے دین، اور دین کی خدمت میں مستغرق ہونا چاہتے تھے، لیکن شیخ شہاب الدین سہروردی شیخ ابوسعید ابوالخیر سیف الدین باخرزی کے زمانہ سے بیعت توبہ او تبرک کا رواج بھی جاری ہوا، شیخ کبیر شکر گنج نے بھی یہی مسلک اختیار فرمایا، اس کے بعد سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ کی اتباع میں اب یہی کرنے لگا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ

بر تو اتر می شنوم کہ بسیاراں از درآمدن ارادت من، دست از معصیتے میدارند و نماز

Marfat.com

بجماعت می گذارند وباورادونوافل مشغول می باشند"

درد بھرے لہجے میں اس کے بعد ارشاد ہوا۔

می بینم مسلمانے بعجز واضطراب ومسکنت وبیچارگی برمن می آید ومی گوید کہ از جملہ گناہاں توبہ می کنم من بہ نیت آں کہ شاید سخن او راست باشد دست بیعت می دہم" (ص ۳۴۰)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان بزرگوں کی اصلی غرض عام پیری مریدی سے کیا تھی؟ ہاں جن کی ساری عمر اسی سوز و ساز درد وتپش میں گذری کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پیغمبر کی اُمت کو پیغمبر کے قدموں تک پہنچادیا جائے، سلطان المشائخ عموماً فرمایا کرتے کہ ہمارے طریق کی پہلی شرط یہ ہے کہ "طلب جاہ وکرامت نباشد" صرف توبہ اور استقامت مطلوب ہے، پھر استقامت کا مطلب خود ہی یہ فرماتے کہ

"استقامت می باید کہ بر متابعت رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد وہیچ مستحبے و آدابے ازو فوت نہ شود" (سیر الاولیا، ص ۳۲۸)

یہی طریقہ میں داخل ہونے کی غرض تھی، لوگوں کو "مرگ" کے ساتھ پکڑا جاتا تھا، تب جاکر کہیں "فرائض" نماز باجماعت وغیرہ کی "تپ" پر راضی ہوتے تھے، لیکن آج اُمت کی پچھلی نسلیں پہلی نسلوں پر لعنت کرتے ہوئے جسے پیغمبر ہی نے قیامت کے ہولناک علامات میں شمار کیا ہے، ان ہی بزرگوں پر خلاف سنت، بلکہ بعض تو خلاف اسلام تک چلنے کا فتویٰ لگا رہے ہیں، گذر چکا کہ آج اس کی ریسرچ ہو رہی ہے، کہ مسلمان صوفیوں نے افلاطن جدید مصری سے کیا لیا، یونانیوں سے کیا سیکھا، ایران کے آتش پرستوں سے کون کون سی چیز اخذ کی، ہندوستان کے جوگیہ کے کن کن اشغال واعمال کو اپنے طریقہ میں داخل کیا، گویا اسلام کا خود اپنا کوئی سرمایہ کسی باب میں کچھ نہیں ہے، فقہ رومیوں اور ایرانیوں سے لی گئی، تصوف، اشراقیوں اور جوگیوں سے چرایا گیا، ظاہر وباطن کی

Marfat.com

تعمیر ان ہی دونوں چیزوں سے ہوتی ہے جب دونوں ہی میں ہمارے اکابر العیاذ باللہ منتحل اور سارق نکلے، تو پھر اپنا ہمارے پاس کیا رہ گیا، قرآن نے ہمیں کیا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا ملا؟ مگر میں کیا کروں، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گیا۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور مرکزی صوفی سلطان المشائخ کا مطالعہ ایک زمانہ سے کر رہا ہوں، اب تک ان کے متعلق ہمیں اس کا بھی ٹھیک طریقہ سے پتہ نہیں چلا کہ وہ ذکر اور مراقبہ کے عام طریقہ کے سوا کسی خاص طریقہ ذکر یا مراقبہ کی بھی تعلیم دیتے تھے، مثلاً فلاں رگ دبائی جائے، فلاں عضو کو فلاں جگہ رکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ چیزیں اگر ملتی بھی ہیں تو اسی قسم کی، مثلاً ذکر ہو رہا تھا کہ مربع طریقہ کی نشست بنا کر یعنی آلتی پالتی مار کر اگر کوئی بیٹھے، اور ذکر کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس طریقہ سے بیٹھ کر ذکر کرنے کی ایک صورت جائز ہے اور ایک ناجائز، جائز صورت کے متعلق الفاظ مبارک یہ ہیں۔

"جائز خلاف نشستن جوگیان است کہ ہر دو قدم زیر ہر دو زانو باشد" (ص ۲۴۴)

ظاہر ہے کہ اٹھنے بیٹھنے کا معاملہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا، اسی لیے جواز و عدم جواز کے الفاظ کو اولیٰ اور خلاف اولیٰ ہی پر محمول کیا جائیگا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی بات یعنی بیٹھنے کی ہیئت تک کے متعلق بھی ان کا خیال تھا کہ جوگیہ کی چونکہ وہ نشست ہے، اس لیے مسلمانوں کو یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، انہی بزرگوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے اپنا سارا طریقہ جوگیہ یا اشراقیہ کو دیکھ کر مرتب کیا ہے

لے مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کثرت ذکر کا ظاہر ہے بار بار مطالبہ کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اپنے پہلوؤں پر) میں ہر طریقہ سے ذکر کی عام اجازت دی گئی، اب اگر بزرگوں کو کسی خاص طریقہ نشست یا طریقہ اداء وغیرہ سے تجربۃً وہ بات مفید معلوم ہوئی اور لوگوں سے ذکر اسی طریقہ سے کرانے لگے، تو کیا وہ قرآن سے باہر گئے، سچ یہ ہے کہ قرآن نے جسے مطلق چھوڑا ہے آپ اس میں تعین کس بنیاد پر کرتے ہیں ۱۲۔

Marfat.com

کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے، پہلے بھی بعض اجزار کا اس کے متعلق ذکر آچکا ہے، کیا تماشے کی بات ہے جس کے تربیت یافتوں کی یہ ذہنیت ہو اور جس کی مجلس مبارک ہیں، اس حدیث کے متعلق جس میں ہے کہ کوئی مسافر اگر بیابان ٹاپو میں تنہا پڑ جائے، یا ایسی حالت میں کسی کی سواری کا جانور بھاگ جائے، تو ایک صحابی سے نہیں، ابن مسعود، ابن عباس، عقبہ بن غزوان، تین تین صحابیوں سے مروی ہے کہ ایسے وقت میں مسافر کو چاہیے کہ

اعینوا یا عباد اللہ رحمکم اللہ — مدد کرو اے اللہ کے بندو، اللہ آپ پر رحم کرے

یا بعض روایتوں میں ہے۔

یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی۔ — اے اللہ کے بندو، میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔

حصن حصین میں مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی کے حوالہ سے اسے نقل کیا ہے نووی نے کتاب الاذکار میں مسند بزار اور ابن السنی کا بھی حوالہ دیا ہے، محدثین کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تحسین و توثیق کی ہے، اگرچہ بعضوں کو روایت کے بعض راویوں کے متعلق شک بھی ہے، تاہم شراح حدیث میں سے بعض معتبر لوگوں نے لکھا ہے مثلاً نووی ارقام فرماتے ہیں:۔

حکی لی بعض شیوخنا الکبار فی العلم انفلتت بہ دابۃ اظنہا بغلۃ وکان یعرف ھذا الحدیث فقالہ فحبسہا اللہ علیھم فی الحال وکنت مرۃ مع جماعۃ فانفلتت بھیمۃ فعجزوا عنہا فوقفت — میرے بعض کبار اساتذہ نے مجھ سے بیان کیا یعنی علم میں جن کا مقام بڑا تھا، انہوں نے بیان کیا کہ ان کا جانور سواری کا چھوٹ پڑا، میں خیال کرتا ہوں کہ خچر تھا، ان بزرگ کو یہ حدیث معلوم تھی، وہی الفاظ انہوں نے دہرائے جو حدیث میں آئے ہیں، معاً جانور وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا خود میں بھی ایک دفعہ لوگوں کے ساتھ تھا کہ جانور چھوٹ پڑا پکڑنے والے عاجز ہو گئے ہیں نے اُس وقت حدیث کے الفاظ کا استعمال کیا

Marfat.com

فی الحال بغیر سبب جانور وہیں کھڑا ہو گیا اور کوئی سبب اس کے کھڑے ہونے کا
سوی ھٰذا الکلام . پیش بھی نہ آیا بجز اس کے کہ حدیث والے الفاظ استعمال کیے گئے تھے

مگر باوجود ان تمام باتوں کے آپ اندازہ کیجیے اس ذہنیت کا جو سلطان المشائخ کی صحبت مبارک میں پیدا ہوتی تھی، یعنی اسی "اعینونی یا عباد اللہ" والی روایت کا ذکر کر کے کوئی خارجی آدمی نہیں، بلکہ مقربین خاص میں جن کا شمار تھا، اور جو از سرتا پا سلطان المشائخ کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا، میری مراد خود جامع ملفوظات امیر حسن علا سنجری سے ہو وہی لکھتے ہیں کہ

بندہ عرضداشت کرد کہ این دعا چہ گونہ است کہ مردمان می خوانند اعینونی یا
عباد اللہ رحمکم اللہ"

پوچھنے کی کیا غرض تھی خود ہی لکھتے ہیں

"مقصود بندہ این بود کہ معونت از غیر خدا خواستن چہ گونہ بود" (فوائد الفواد ص)

"معونت از غیر خدا خواستن چگونہ بود" بس مجھے صرف اسی فقرہ کی طرف توجہ دلانی ہے، باوجودیکہ دعا حدیث کی ہے، ایسی حدیث بھی نہیں جو موضوع اور بالکلیہ بے سروپا ہو بلکہ گذر چکا کہ محدثین ثقات کا ایک طبقہ اس کی تحسین کرتا ہے، بلکہ اپنے مختلف تجربات سے اس کی تصدیق بھی کرتا ہے، خود طبرانی نے بھی اس حدیث کی روایت کے بعد

وقد جرب ذٰلک اس کا تجربہ بھی کیا گیا ہے

لکھا ہے یوں بھی کسی خاص شخص کو پکارا نہیں جاتا، بلکہ اللہ کا کوئی بندہ ہو ملائکہ میں ہو، جن میں ہو، انسان میں ہو، کوئی بھی ہو اگر یہاں موجود ہو تو میری مدد کرے، اور پکارا بھی جاتا ہے تو معبود بنا کر نہیں بلکہ عباد اللہ (اللہ کے بندوں) کے الفاظ سے پکارا جاتا ہے رحمکم اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) کے الفاظ سے اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کہ ہماری طرح تم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے محتاج ہو، اب اس کے ساتھ اس کو ملا لیجیے کہ قرآن مجید کے

اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ — ہر شخص پر ایک نگران یقیناً ہے۔

اِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ — تم پر نگران قطعاً ہیں

وغیرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ کچھ فرشتے بھی رہتے ہیں، حدیثوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ملائکہ اطراف ارض میں گھومتے رہتے ہیں، نیز روایتوں کا ایک مجموعہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جن سے ابدال کے نظریہ[1] کی تائید ہوتی ہے، عام طور پر جنہیں رجال الغیب کہتے ہیں اور ان سب کو بھی جانے دیجیے، پکارنے والا تو پکارتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں کوئی ہو تو اگر میری مدد کرے، کون جانتا ہے کہ کسی چلنے پھرنے والے یا جھاڑ جنگل میں کوئی آدمی ہی ہو، جس کے کان میں آواز پہنچ جائے۔ جب عباد اللہ کا لفظ عام ہے تو سب ہی کی اس میں گنجائش ہے، اور شراح حدیث نے عموماً سارے احتمالات لکھے بھی ہیں، خود سلطان المشائخ نے امیر حسن علاء کو جو جواب دیا کہ

"دریں عباد اللہ مسلمین و مخلصین مضمر ست"

یعنی اللہ کے نیک اچھے مخلص بندے مقصود ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کا اشارہ ابدال والے رجال الغیب کی طرف ہو، یا یہی بات کہ اِدھر اُدھر کوئی اللہ کے اچھے نیک بندے ہوں

---

[1] ہر زمانہ میں طبقہ صالحین کے بعض افراد کو ابدالیت کے مقام سے حق تعالیٰ سرفراز فرماتے ہیں، یہ ایک ایسا خیال ہے جو سلف سے خلف تک مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس باب میں حضرت انس رح ابن مسعود، ابو درداء، معاذ بن جبل، عوف بن مالک صحابیوں، اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنہا سے حدیث کی کتابوں میں روایتیں بھی نقل کی گئی ہیں، گو محدثین و ائمہ نقد ان کی سندوں سے مطمئن نہیں ہیں، لیکن شارحین حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کا بطور قدر مشترک جو مفاد ہے، اس کا انکار مشکل ہے، یوں بھی امام بخاری امام شافعی امام احمد بن حنبل جیسے کبار ائمہ حدیث اپنی کتابوں میں اس قسم کے الفاظ دکہ فلاں بزرگ کا شمار ابدال میں تھا، یا مسلمانوں کا فلاں طبقہ ابدال کا طبقہ ہے پائے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں چالیس افراد کا مردوں اور چالیس ہی کا عورتوں میں سے اس روحانی خدمت کے لیے انتخاب ہوتا ہے، کوئی ایک ان میں جب مرجاتا ہے تو اسی وقت کسی دوسرے سے اس جگہ کو معمور کر دیا جاتا ہے ابدال کہنے کی یہی وجہ ہی ہے کہ ہمیشہ ایک کی جگہ بطور بدل کے دوسرے کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۲

وہ اس آواز کو سُن کر پہنچ جائیں، بہرحال اس طریقہ سے عباد اللہ کو عون اور مدد کے لیے پکارنا ظاہر ہے کہ ایسی نامحسوس غیبی ہستیوں کا بھی پکارنا نہیں ہے جن کے وجود کا کوئی ثبوت نہ ہو[1]
مگر آپ دیکھ رہے ہیں، توحیدی معرفت کے احساس کی نزاکتوں کو دیکھ رہے ہیں، کہ اس میں بھی سلطان المشائخ کے صحبت یافتوں کو "معونت از غیر خدا خواستن" کا شبہ ہوتا ہے۔

اللہ اللہ جس کے حلقۂ اخلاص و صفا میں وحدت کا یہ رنگ پیدا ہوتا تھا، اسی شاہباز فضائے تفرید، و یکتا تاز میدان تجرید پر آج الزام لگایا جا رہا ہے کہ قرآن کے نص محکم
مَا کَانَ اللّٰہ لبشر ان یوتیہ خدا ایسا نہیں کرتا کہ کسی آدمی کو کتاب اور "حکم" و النبوت

---

[1] مثلاً اصنامی نظام والے بت پرستوں کا جو حال ہے کہ خود ہی کسی پتھر یا مٹی کے تودہ کو فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ فلاں روح کا تعلق ہو گیا، اور اپنی ساری اُمیدوں آرزوؤں کا ماویٰ ملجاء اب اسی پتھر یا تودۂ خاک کو بنا لیتے ہیں، لیکن یہ بات کہ واقعۃً اس روح کا اس پتھر یا تودۂ خاک سے تعلق ہے بھی یا نہیں، حسًّا یا عقلاً یا کسی اور ذریعہ سے ان کو اس کا قطعی علم نہیں ہوتا، اس لیے بت پرستی علاوہ اس ناقابل عفو جرم کے جس کا نام شرک ہے یوں بھی وہ ایک بے بنیاد وہم ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان خود تراشیدہ یا نجی پتھروں یا خودساختہ مٹی کے تودوں کے ساتھ کسی زندہ وجود کا جو یہ تعلق مانتے ہیں، آخر اس کی بنیاد کیا ہے، جہاں چاہا ایک پتھر رکھ دیا، گویا یہ پتھر ایک قسم کے الٰہ دین الف لیلہ والے کا چراغ ہے کہ جلا نہیں کہ موکلین حاضر ہو گئے۔ یوں ہی جہاں کہیں ذرا چھیل چھال کے کوئی پتھر جما دیا، یا پتھر نہیں مٹی ہی کو پانی میں سان کر کہیں تھوپ دیا، اور روح مخفی کا اس کے ساتھ تعلق ہو گیا، بخلاف خالق تعالیٰ اجل مجدہ کے کہ گو بہ ظاہر حواس سے اس کا وجود بھی مخفی ہے، لیکن کائنات نام ہی ہے ان کی کارفرمایوں کی جلوہ گاہ کا ہر ذرہ اس عالم کا اپنے خالق کے افعال کا صفات کا وجود کا آئینہ بردار ہے، خالق قیوم کے تصور کے بغیر کسی قسم کی مخلوق کا وجود ناقابل تصور ہے، دھوپ کا تصور آفتاب کے بغیر ناممکن ہے، انفس و آفاق اس کے آیات و نشانیاں اور اس کے پتے ہیں اسی لیے وہ علیٰ کل شی شہید، بکل شی محیط، ہو معکم اینما کنتم ہے، لیکن تراشیدہ پتھر اور روح جن میں نہ کوئی کسی کا خالق ہے نہ کوئی کسی کا مخلوق، ان دو مخلوقوں میں آخر رشتہ کس بنیاد پر قائم کر لیا جاتا ہے، اور ایسا رشتہ کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے جدا نہیں ہو سکتا، پتھر کے سامنے کھڑا ہونا گویا اسی روح کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اس سے مانگنا اسی مخفی روح سے مانگنا ہے، جو اس جبری عمل تسخیر سے حاضر کی جاتی ہے ۱۲

الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول الناس عطا کرے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے
کونوا عبادا لی من دون الناس۔ نہیں بلکہ میرے بندے تم لوگ بن جاؤ۔

کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے فرمان ربانی

وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اُسی کو پوجتے ہو۔

کے علی الرغم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی امتیوں کو جن کے نزدیک غیر اللہ کی عبادت انسانیت کی سب سے بڑی تباہی اور جہنم کے ابدی عذاب کا مستحق بناتی ہے، ان ہی لوگوں سے اپنے آگے سجدے کراتا تھا، ان کو بجائے اللہ کے "عبادا لی" (اپنا بندہ بناتا تھا) اور دلیل میں کیا پیش کیا جاتا ہے؟ چند مشتبہ الفاظ یعنی جہاں دست بوسی، پائے بوسی کے الفاظ کی صراحت پائی جاتی ہے، وہیں بعض عبارتوں میں "سر بر زمیں نہاد" کے الفاظ بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس "سر بر زمین نہادن" کا کیا مطلب ہے کیا واقعۃً لوگ سلطان المشائخ یا شیخ کبیر شکر گنج کے سامنے سجدے کرتے تھے؟ اب میں لوگوں سے کیا کہوں، مختلف زمانوں میں مختلف محاورات چل پڑتے ہیں، لغوی معنی ان الفاظ کے اور ہوتے ہیں اور اصطلاحی دوسرے، سارا فتنہ محض اس پر مبنی ہے کہ اُس زمانہ کی جو اصطلاح تھی، جو دستور تھا، اُس سے قطع نظر کر کے حریفوں نے ان الفاظ کے معانی لغت کی کتابوں میں دیکھنے شروع کیے؟ حالانکہ کچھ نہیں تو کم از کم یہ لوگ اسی کو دیکھتے کہ اس فعل کے جواز میں جو دلیل سلطان المشائخ سے منقول ہے، وہ کیا ہے؟ وہی دلیل بتا سکتی تھی کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے، میر خورد تو عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں سمجھے جا سکتے، وہی یہ لکھنے کے بعد کہ "کاتب حروف بخط مبارک سلطان المشائخ نوشتہ دیدہ است" ارقام فرماتے ہیں کہ اس فعل کے جواز کی دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ

قال صہیب رأیت علیا یقبل حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت
ید العباس و رجلہ (ص ۳۴۰) علی کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا

Marfat.com

یعنی حضرت علیؓ اپنے چچا عباس کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں کو بھی احتراماً چومتے تھے اب آپ خود غور کیجیے اس سے کیا ثابت ہوا، صرف یہی ناکہ پاؤں چومنے کے وقت چومنے والے کا سر چونکہ بالکل زمین سے قریب ہو جاتا ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ پاؤں چومنے کی وجہ سے اگر سر کسی کے سامنے اتنا جھک جائے کہ پاؤں سے اور زمین جس پر پاؤں عموماً رکھے رہتے ہیں، قریب ہو جائے۔ تو صہیب کی اس روایت سے اتنے انحناء اور جھکاؤ کا جواز نکلتا ہے، مقصد یہ ہے کہ پائے بوسی کی وجہ سے سر میں اتنا جھکاؤ جو پیدا ہو جاتا ہے کہ قریب قریب سر زمین ہی پر چلا جاتا ہے، اس لیے ایک صورت سجدے کی سی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے چاہیے تو یہی تھا کہ جب غیر اللہ کے سجدے کو اسلام میں حرام کر دیا گیا ہے، پائے بوسی بھی جس میں سجدے کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے، ناجائز ہو جاتی لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پائے بوسی کا ثبوت ملتا ہے تو پائے بوسی کے جواز کی ایک صورت نکل آتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اس سے زیادہ تو کوئی اور بات اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتی، پھر کیا ہوا؟ یہی بات کہ لوگ قدم بوسی پر اس زمانہ میں معترض ہوتے تھے کہ اس میں سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، ایک شخص کا قصہ بھی فوائد الفواد میں منقول ہے کہ روم و مصر و شام کی سیاحت کر کے آیا تھا کسی کو قدمبوسی کرتے ہوئے اس حال میں جو اس نے پایا تو اس نے منع کیا کہ سجدہ اسلام میں ناجائز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ بذاتِ خود اس طریقہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ لوگ ہاتھ کے سوا قدم چومنے کے لیے بھی میرے سامنے سر جھکائیں، خود سیر الاولیاء میں میر خورد نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"در پیش من کہ روئے بر زمین می آوند من کارہ ام" ص ۳۴۱

اور وہ چاہتے تھے کہ قدم بوسی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ لوگوں کے سر زمین کی طرف چلے جاتے

Marfat.com

ہیں، ایک گونہ سجدے کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اس کو منع کر دیں، لیکن ان کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ بھی قدم بوسی سے لوگوں کو منع نہیں فرماتے تھے، اس لیے منع کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، عجب جملہ لکھا ہے کہ

"از دو چیز یکے لازم آید یا تجہیل مشائخ یا تفسیق ایشاں"

یعنی یہ سمجھا جائے کہ شیخ کبیر اس حکم ہی سے ناواقف تھے کہ قدم بوسی جائز نہیں ہے، یا عدم جواز کے علم کے باوجود شریعت کے حکم کی خلاف ورزی العیاذ باللہ کرتے تھے، جو ظاہر ہے کہ فسق ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت علیؓ کے اس اثر سے بھی ان کو گونہ مدد مل گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ باوجود "کارہ" ہونے کے لوگوں کو انہوں نے اس فعل سے منع نہیں کیا،

لوگوں کو فقہار کا مسلک چونکہ معلوم نہیں ہے، اس لیے سمجھتے ہیں کہ اگر صرف "قدم بوسی" ہی کا مسئلہ تھا حالانکہ قدم بوسی کی وجہ سے سر گویا زمین ہی سے آلگتا ہے، ورنہ آخر قدم بوسی کی صورت ہی کیا ہوگی، کیا جس کے قدم چومنا چاہیگا اُس کی ٹانگ اُٹھا کر اوپر کرلیگا، مقصود جب اعتراف فضل اور اظہار احترام ہے تو ظاہر ہے کہ چومنے والے ہی کو جھکنا پڑیگا، اور اتنا جھکنا کہ جہاں قدم رکھے ہوئے ہیں، وہیں تک اپنا مُنہ لیجائے، ایسی صورت میں سر یقیناً زمین سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور گونہ سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے بعض فقہانے علمار اور صالحین بلکہ سلاطین کی دست بوسی کی اگر اجازت بھی دی ہے تو قدم بوسی کو ناجائز ٹھہرایا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ جب مخلوق کے ہاتھ چومنے کی اجازت دے رہے ہیں تو اسی مخلوق کے پاؤں چومنے میں کیا خرابی ہوسکتی تھی مگر یہی بات کہ قدم بوسی میں سر زمین تک آجاتا ہے، عدم جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے، عالمگیری میں ہے۔

طلب من عالم او زاھد ان یدفع الیہ قدمہ لیقبلہ لا یرخص فیہ

کسی عالم یا زاہد سے کوئی استدعا کرے کہ اپنے قدم اس کی طرف بڑھائیں تاکہ وہ ان کو بوسہ دے اس کی اجازت نہیں دی جائیگی۔

Marfat.com

حتیٰ کہ اسی انخنار اور جھکاؤ کی وجہ سے فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلام کرنے کے وقت آدمی کو بالکل سیدھا رہنا چاہیے، بدن یا سر میں کسی قسم کا جھکاؤ نہ پیدا کرنا چاہیے، عالمگیری میں ہے۔

یکرہ الانحناء عند التحیۃ وبہ ورد النہی کذا فی التمرتاشی۔ — سلام کے وقت بھی جھکاؤ مکروہ ہے، اس سے منع کیا گیا ہے، التمرتاشی میں مسئلہ یونہی ہے۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی فقہی عبارتوں کی وجہ سے سلطان المشائخ کا دل اس جھکاؤ کو پسند نہیں کرتا تھا جو قدم بوسی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا تھا۔ مگر ان کی یہ قلبی ناپسندیدگی عملی شکل اختیار نہ کر سکی جس کے اسباب اُنہوں نے خود ہی بیان بھی فرما دیے ہیں کہ اپنے اسلاف کی تجہیل یا تفسیق کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ سلطان المشائخ کا یہ فعل یعنی قدم بوسی اور قدم بوسی کے انخناء مفرط کی وجہ سے سر بزمین نہادن کی جو شکل پیدا ہو جاتی ہے واقع میں یہ جائز ہے یا ناجائز اس کا فیصلہ تو علماء ہی کر سکتے ہیں، فقہ کی عبارت آپ دیکھ چکے، ایک طرف یہ قصّہ ہے، دوسری طرف حضرت علی کا یہ اثر امام بخاری کی کتاب الادب المفرد باب (۴۴۵) میں ہے اسی باب میں وفد عبدالقیس کے ایک رکن الوازع بن عامر سے روایت ہے کہ ہم جب خدمت میں آئے تو آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا بوسہ ہم سب نے دیا۔ مشکوٰۃ کی کتاب الایمان میں روایت ہے کہ دو یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کی "نو آیات" کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں نو چیزیں جو شریعت موسوی میں ممنوع تھیں، جن میں بجز سبت کے حکم کے اسلام میں بھی ممنوع ہیں ان کا ذکر فرمایا، دونوں یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جواب کو جب سُنا تو حدیث میں اس کے بعد ہے کہ

فقبلا یدیہ ورجلیہ وقالا — پس ان دونوں یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نشہد انک نبی کے دونوں ہاتھوں اور پائے مبارک کو بوسہ دیا اور بولے کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔

آگے اور باتیں ہیں، مجھے یہ کہنا ہے کہ حضرت علیؓ والا اثر معلوم نہیں کس کتاب میں ہے لیکن یہ حدیث تو صحاح ستہ کی مشہور حدیثوں میں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی ان یہودیوں نے کی۔

بہرحال اہل علم کا فتویٰ جو کچھ بھی ہو، لیکن میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں، ان لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں جنہوں نے اسی قدم بوسی اور انحنا مفرط والی شکل کو باضابطہ سجدہ بنالیا، اور دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹ دیا کہ سلطان المشائخ کا مذہب تھا کہ مرید پیر کو سجدہ کرسکتا ہے، العیاذ باللہ بات کہاں سے کہاں پہنچادی گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے بجائے قدم بوسی کے واقعی وہی نماز والا سجدہ کرایا کرتے تھے تو جن فقہا نے ان پر سماع کا الزام لگاکر طرح طرح سے بدنام کیا تھا تاآنکہ بات حکومت تک پہنچی، خود غیاث الدین تغلق کو اپنے شاہی دربار میں مجلس مناظرہ منعقد کرانی پڑی، دونوں طرف کے علماء جمع ہوئے، وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ آج چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اس مجلس مناظرہ کا شوروغوغا گونج رہا ہے، حالانکہ جو کچھ بھی ہو، سماع وہ بھی بغیر مزامیر والا کیوں کہ گذر چکا کہ مزامیر کو تو خود سلطان المشائخ محرمات میں شمار فرماتے تھے، اس غیرمزامیری سماع کا مسئلہ اتنا اہم تو نہیں تھا، جتنا کہ سجدہ والا مسئلہ سجدہ کا حال کہ غیراللہ کے سامنے بہ نیت عبادت تو کفر ہی، شرک ہی ہے، میں سمجھتا کہ اسلام کے کسی فرقہ کو بھی اس کے کفر و شرک ہونے میں اختلاف ہوگا، رہ گیا وہ سجدہ جس میں ساجد اپنی عبدیت اور بندگی اور غایت فقر و تذلل کو نہیں، بلکہ جسے سجدہ کیا جائے یعنی مسجود لہ کے احترام اور عظمت کا اظہار اپنے سجدوں سے کرنا چاہتا ہو، وہی جسے عموماً سجدہ تعظیمی کہتے ہیں، چونکہ کسی دوسرے کی عظمت

یا فضل کا اعتراف جو سجدۂ تعظیمی کی روح ہوتی ہے، یہ ناجائز نہیں ہے، اس لیے بظاہر اس سجدہ میں وہ خرابی جو سجدۂ عبادت میں پائی جاتی ہے نہیں پائی جاتی ہے، اسی لیے فقہاء اسلام تعظیمی سجدہ جو غیر اللہ کو کیا جائے اس کو کفر و شرک تو نہیں قرار دیتے، لیکن چونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے بھی صحابہ کو سجدہ کی اجازت نہیں دی، تو ظاہر ہے کہ اور کسی کو کب اس کی اجازت ہو سکتی ہے خود قرآنی آیت

وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ — اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرے بہرحال ان ہی وجوہ سے سجدہ تعظیمی کے متعلق فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لیے وہ بھی جائز نہیں ہے، عالمگیری میں تو لکھا ہے۔

لا یکفر ولکن یاثم لارتکابہ الکبیرۃ وھو المختار ص۳۶۹ — غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی جائیگی لیکن گنہگار ٹھہرایا جائیگا اس لیے کہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

جس سے معلوم ہوا کہ مذہب مختار فقہا کا یہی ہے کہ سجدہ تعظیمی کفر تو نہیں ہے، لیکن کبیرہ گناہ ہے۔

یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ العیاذ باللہ اگر فی الحقیقت سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے سجدہ کراتے تھے، خواہ تعظیمی ہی سہی، تو فقہ کی کتابوں میں جسے "کبیرہ" قرار دیا گیا ہے اس الزام کو چھوڑ کر غیر مزامیری سماع کا الزام ان پر کیوں لگاتے، اس قسم کے سماع کا مسئلہ اتنا تو سخت نہ تھا، جتنا کہ سجدہ کا مسئلہ، سماع میں تو بہت کچھ گفت گو ہو سکتی تھی[۱]، دیگر ائمہ کے سوا غیر مزامیری سماع کی حد تک تو فقہ حنفی میں بھی گنجائش پیدا ہو سکتی تھی، بخاری اور مسلم کی حدیثوں سے اس قسم کے سماع کا جواز پیدا کیا جا سکتا تھا مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت صحابہ کا رجز پڑھنا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ساتھ

۱؎ حتیٰ کہ مشہور عالم حدیث جو اپنی سخت گیری و ظاہریت میں شہرت عام رکھتے ہیں یعنی علامہ ابن حزم جیسی ہستی مزامیری و غیر مزامیری ہر قسم کے غناء کی اباحت و جواز کے مدعی ہیں ۱۲۔

دیا "ابینا ابینا" کے لفظ کو ذرا بلند آواز کے ساتھ ادا فرمانا انجشہ والی روایت، جواری مغنیات کی روایت عبداللہ بن رواحہ سے "ھات من ھنیا تلک" وغیرہ وغیرہ بیسیوں صحیح آثار اس کے ثبوت میں پیش ہو سکتے تھے، لیکن سجدہ کے جواز کی کیا صورت تھی، ان کو گرفت کرنی تھی، تو سب سے آسان بات تو یہی تھی خدانخواستہ اگر واقعی ان کے سامنے لوگ سجدے کرتے تھے، تو سلطان المشائخ کے پاس اس کے جواز کی کیا سند ہوتی، نہ کوئی قرآنی آیت، نہ حدیث، نہ فقہ، میرے نزدیک یہ خود دلیل ہے کہ وہ سجدہ ہی نہ تھا بلکہ وہی قدم بوسی کی شکل تھی، جس میں انحنا مفرط کا پیدا ہو جانا لازمی ہے، آپ فوائد الفواد اٹھا کر پڑھیے میر حسن علا سنجری عموماً یہی لکھتے ہیں۔

"سعادت پائے بوس بدست آمد" "سعادت پائے بوس حاصل شد"

"بسعادت پائے بوس رسید" "دولت پائے بوس حاصل آمدہ"

میں نے یونہی کتاب کھولی اور ص ۱۵۴، ص ۱۵۵، ص ۱۵۶ سب ہی جگہ یہی الفاظ نظر آئے، اگر یہ لوگ سجدہ کرتے تھے تو پھر وہی لکھتے، ہو سکتا ہے کہ اسی کیفیت کی تعبیر کبھی انھوں نے "سر بر زمین آورد" وغیرہ الفاظ سے کی ہو، گو مجھے خیال نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب بھی وہی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے، مجھے تو حضرت والا کے دوستوں اور دشمنوں دونوں سے شکایت ہے، دوست تو اس کے درپے ہیں کہ عیاذاً باللہ ان کی تفسیق کا سامان مہیا کریں، اور دشمن شاید تجہیل کے درپے ہوں، لیکن مسلمانوں نے کابراً عن کابرٍ ان جد مسلسل جن کے صلاح و تقویٰ کی روایتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچائی ہو، کیا یہ مناسب نہ تھا کہ ہم ان اکابر کی تفسیق یا تجہیل کی جگہ اگر کوئی بات ایسی نظر آئے تو اس کی تاویل کریں، اور میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، یہ تو تاویل نہیں، بلکہ ان شاء اللہ یہی واقعہ ہے اور اسی کی واقعیت پر مجھے اصرار ہے۔[۱]

[۱] پہلے کسی موقعہ پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ سجدہ تحیت کا رواج بادشاہوں کے سامنے بھی ہندوستان میں اکبر

(ماہنامہ ... ۱۹۰۳)

Marfat.com

حضرت سلطان المشائخ پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ باوجود ان گراں قدر فتوحات اور "لامحدود آمدنی" کا ذکر کر کے یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان پر حج فرض ہو گیا تھا، اور باوجود فرض ہونے کے اُنھوں نے اعراض کیا یہ صحیح نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کا "زلزالی عہدِ ابتلا" جب ختم ہو گیا، تو ان پر فتوحات کے دروازے ضرور کھُلے اور خوب کھُلے، لیکن اغنیاء سے جو کچھ لیا جاتا تھا، لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ خود اپنے لیے لیا جاتا تھا، ان کے محبوب رسول (علیہ السلام) کا تو حکم تھا کہ

توخذ من اغنیائھم و تقسم علیٰ فقرائھم — لیا جائے امیروں سے اور بانٹا جائے مسلمانوں کے غرباء اور فقراء پر۔

جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی "قاسم" ہونے کی حیثیت سے گذاری، دیوانوں نے سمجھ لیا کہ وہ ان آمدنیوں کے مالک تھے، مالک ہوتے تو چوبیس گھنٹوں میں اپنے لیے "صرف چند پر کالہائے نان دبستری و کریلہ تلخ" کی انطاری اور کھچڑی کی سحری، جو کبھی کھائی جاتی تھی اور کبھی یوں ہی واپس کر دی جاتی تھی کہ بہت سے لوگ دکانوں میں اور سڑکوں پر بھوکے پڑے ہیں۔

صرف پنڈالوں اور تقریر کے اسٹیجوں تک غرباء کے حقوق کے محافظوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ جن غریبوں کی صورت دیکھنی بھی جنھیں ناگوار ہو، کاش! تم دیکھتے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ان ہی بزرگوں کے دسترخوان پر ان بیچاروں کو وہ سب کچھ ملتا رہتا تھا جس کے نام سے بھی امراء نے ان کو محروم رکھا تھا، کیا ان بزرگوں کے دسترخوان پر صرف امراء بیٹھتے تھے؟ اب میں کیا بتاؤں سلطان المشائخ ہی ایک شخص کی تصویر ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۱) سے پہلے نہ تھا، بلکہ اکبری عہد میں ایک شرار الناس شرار العلماء کی شرارت تھی، اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا انسداد ہو گیا، جیسا کہ تمام تاریخوں میں لکھا ہے، پھر جب سجدۂ تحیت کا رواج بادشاہوں میں بھی نہ تھا تو فقراء میں کیا ہوتا، لوگوں کو اکبری عہد کے سجدۂ تحیت سے مغالطہ ہوا کہ شاید یہ سجدہ بادشاہوں کے سامنے ہندوستان میں پہلے سے چلا آتا تھا، اور ان ہی کی دیکھا دیکھی جیسے "شاہ" کا لفظ صوفیوں نے اپنے متعلق استعمال کیا اس سجدہ کو بھی اپنے سامنے کرانے لگے ۱۲۔

Marfat.com

"مردے ژندہ پوشے گلیمے سیاہ در بر و سر بندے رنگیں بر سر" (سیر الاولیا، ص ۱۱۵)

پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔

"در جاعت کندوری[1] (دسترخوان) کشیدہ بودند او آمد سلام کرد در مائدہ (خوان) نشست"

صرف کھانے ہی کی اجازت نہ تھی کہ جو کچھ دسترخوان پر موجود ہو، آزادی کے ساتھ کھا سکتے ہو، بلکہ اس کی بھی کہ لیجانے کی خواہش ہو، تو لے بھی جا سکتے ہو، اسی خستہ حال فقیر ہی کے ذکر میں ہے کہ جب دسترخوان بڑھایا جا چکا تو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ

"بعد فراغ طعام او راندیدم پرسیدم کہ آں درویش چیزے خورد"

سُنیے نظمارِ دسترخواں کیا جواب دیتے ہیں:۔

"گفتند چار نان و قدرے شوربا در کاسۂ چوبیں انداخت و پیشِ خانقاہ مقابل بلندی بود نشست و نان بخورد و رفت" (ص ۱۱)

یہ ایک جزئی واقعہ ہے، اسی سے آپ کو ان بزرگوں کے دسترخوان کا قانون معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کس قسم کے لوگوں کو اس "خوانِ یغما" پر بیٹھنے کی اجازت تھی، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے، کہ شناسائی کی بھی ضرورت نہ تھی اور جن کا حال یہ ہو، جیسا کہ میر حسن علاء نے فوائد الفواد میں نقل کیا ہے کہ

"دولت پائے بوس بدست آمد طعام پیش آوردند، خوردن گرفتند"

کھانا شروع ہو گیا، اس وقت سلطان المشائخ ایک قصہ کسی بزرگ کا ان الفاظ میں بیان فرمانے لگے۔

"بزرگے گفتہ است کہ خلق پیش من طعام می خورند من آں طعام را در حلق خود یابم یعنی گوئی آں طعام من می خوردم" (ص ۷۷)

---

[1] اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار میں شادیوں میں رواج "کندوری" کا ہے، لوگ عموماً اس کو ہندوؤں سے ماخوذ کوئی رواج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ترکی لفظ ہے بمعنی دسترخوان ہے۔ جو کھانا برادری کو کھلایا جاتا ہے اس کو کندوری کہتے ہیں۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ اگر کسی بزرگ کا یہ حال ہوگا، تو خود کہنے والا اس قصہ کو اپنے کسی تجربہ کی بنیاد پر اس وقت دہرا رہا ہوگا، جب اس کے دسترخوان میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

آج جن میزوں پر الوانِ نعمت کے لقموں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے، گویا یہ بھی ایک قسم کا حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے، ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیہ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا، جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے، خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ دلی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا، علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مالگذاری داخل کرنی پڑتی تھی، اسی بادشاہ کے ذکر میں طباطبائی نے لکھا ہے۔

"شیخ نظام الدین معروف باولیاء درزمانِ او (علاء الدین) بود اگرچہ سلطان درظاہر باشیخ ملاقات نمی کرد، امابارسال رسل ورسائل وتحائف وہدایا رسم اخلاق می سپرد" (ص ۱۱۹)

علاء الدین کو جتنا بھی بے شعور قرار دیا جائے لیکن آخر دور والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو کیا اتنے قریب سے بھی اپنی فوجی قوت کے حقیقی مخزن کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی فوجی قوت نے غیر معمولی طور پر جو اہمیت حاصل کرلی تھی، اس کی تہ میں حضرت سلطان المشائخ کے توحیدی جوش و خروش کا زور چھپا ہوا تھا، خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غربا، فقرا تک۔ ان کا حصہ پہنچایا جاتا تھا، اور یہی مطلب ہے اس مشہور فقرہ کا کہ "مال صوفی سبیل ست" (فوائد الفواد ص ۹۵) یعنی راستوں پر پانی پلانے کی جو سبیلیں لوگ کھولتے ہیں، اور ہر آنے جانے والے کو اختیار ہے کہ بغیر کسی معاوضہ کے پانی

پیے۔ صوفیہ کے پاس جو آمدنی آتی ہے، اُس کا بھی یہی حال ہے، فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالے سے بھی یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے۔ خود سلطان جی نے وفات سے پہلے حکم دیا کہ جو کچھ غلہ ساز و سامان میری خانقاہ میں ہے، اُسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور وفات ہی کے وقت نہیں، یوں بھی عام دستور ساری زندگی میں یہی رہا کہ جو کچھ آمدنی ہفتہ بھر میں ہوتی، وہ تقسیم ہوتی رہتی تھی اور

"در ہر جمعہ تجرید فرمودے و حجرہا و انبار خانہا خالی کنانیدے چنانکہ جاروب می کردند بعدہ در مسجد جمعہ رفتے"

میر خورد نے لکھا ہے کہ اگر کسی دن اتفاق سے غیر معمولی آمدنی آجاتی یعنی

وقتے اگر فتوحے گراں رسیدے گریہ بیش تر کردے و جہد بیش تر فرمودے کہ زود تر تفرقہ (جلد تقسیم کرو)

کنید و ساعۃً فساعۃً کساں می فرستاد کہ تفرقہ کردند؟"

گویا مسلسل آدمی پر آدمی بھیجتے چلے جاتے پوچھتے کہ سب خرچ (تقسیم) ہو گیا۔ (تھوڑی تھوڑی دیر بعد آدمی بھیجتا)

چوں می شنیدند کہ درحال قسمت کردند و بمحتاجاں رسانیدند خاطر مبارک قرار گرفتے (ص ۱۳۱)

میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاوہ دستر خوانی طعام کے سلطان جی کا قاعدہ تھا کہ افطار اور نماز مغرب کے بعد بالا خانہ پر تشریف لے جاتے۔ مغرب اور عشاء کے وقت ہر قسم کے لوگوں کو آنے کی اجازت تھی، اس وقت بھی

"از ہر جنس میوہائے خشک و تر و ماکولات و مشروبات لطیف و لذیذ پیش می آوردند

آں عزیزاں تناول می کردند و ایشاں را دلداری می فرمود، و از عالم ہر یکے پرسش می کرد"

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ معاملہ صرف واقعی کھلانے پلانے ہی کی حد تک محدود تھا، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے غریبوں کو کپڑے، لباس، جوتے اور دوسری ضرورت کی چیزیں ملتی رہتی تھیں، میر خورد نے ایک موقعہ پر لکھا ہے

"آنندہ و روندہ از غریب و شہری ہر کہ بیامدے سعادت پائے بوس حاصل کردے

ہیچ کس را محروم نگذاشتے از جامہ چتیل، تحفہ و ہدایا کہ از عالم غیب رسیدے ہمہ

بہ صرف رسانیدے دہر کہ آمدے بہر وقت کہ آمدے توقف نہ نمودے در حال

پیش می فرمودند"

یعنی ملنے کے لیے جو بھی جس وقت آتا حکم تھا کہ فوراً اُس کو خدمتِ اقدس تک پہنچا دیا جائے میر نے لکھا ہے کہ ایک دن سلطان المشائخ دوپہر کو قیلولہ فرما رہے ہیں، کوئی حاجتمند کسی ضرورت سے آیا اخی مبارک حضرت کے خادم نے اسکو ٹال دیا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے ہیں، ادھر یہ واقعہ ہوا اور دوسری طرف نیند میں سلطان جی شیخ کبیر شکر گنج کو دیکھتے ہیں، کہ فرما رہے ہیں:-

اگر در خانہ چیزے نیست بقدر وسع حسن رعایت آئندہ واجب است ایں کجا آمدہ

ست کہ چنیں خستہ دل را باز گردانید"

یعنی آنے والوں کے ساتھ برتاؤ تو اچھا ہونا چاہیے، نیند سے چونک پڑے، اخی مبارک بلائے گئے، پوچھا کہ کوئی آیا تھا، بولے کہ ہاں میں نے حضرت کے آرام کا خیال کر کے واپس کر دیا میر نے لکھا ہے۔

• سلطان المشائخ بروے تعنت کرد (گرم ہوئے) کہ خدمت شیخ المشائخ را در غضب دیدہ ام مرا عتاب می کرد"

اسی کے بعد عام حکم ہو گیا تھا کہ میں جس حال میں بھی رہوں آنے والوں کی فوراً خبر ہونی چاہیے "اگر در قیلولہ باشم مرا خبر کنی" قیلولہ سے اُٹھنے کے بعد اسی لیے عام عادت یہ تھی کہ دو سوال کرتے "یکے آں کہ سایہ گشت" یعنی زوال ہو گیا، ظہر کی نماز کے متعلق سوال تھا، اور دوسرا یہ کہ "آئندہ آمدہ ست نباید کہ منتظر باشد" (ص ۱۲۹)

فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ قصہ میر حسن علاء نے نقل کیا ہے کہ

در بغداد درویشے بود کہ ہر روز یک ہزار و دو دست کاسہ در مائدہ او خرج شدے و اورا

ہیژدہ مطبخ بود" ص ۱۱۸

مگر اٹھارہ باورچی خانوں والے خود ان درویش صاحب کا کیا حال تھا جن کے یہاں سے اتنا کھانا پک پک کر لوگوں میں تقسیم ہوتا تھا، اسی کے بعد ہے کہ ایک دن لوگوں سے درویش صاحب نے پوچھا کہ کوئی کھانے والا رہ تو نہیں گیا، نظم کرنے والوں نے کہا کہ

"خیر با ہمہ را یاد می کنم و ہمہ را طعام می دہم"

درویش صاحب بار بار یہی پوچھتے جاتے تھے کہ کسی کو فراموش تو نہیں کیا گیا ہی، ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ "ملکے را فراموش نمی کنیم ہمہ را وقت طعام حاضر کنیم" آخر میں اُنھوں نے کہا کہ "امروز سہ روز است کہ مرا طعام نداده اید" وجہ یہ تھی کہ "مطبخ بسیار بود مطبخیاں می دانستند کہ از دیگر مطبخ رسیده باشد" حقیقت جب معلوم ہوئی تو لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

اور خیر یہ تو ایک قصہ ہی، معلوم نہیں بغداد کے کس بزرگ کا ہی لیکن یہ واقعہ تو آپ کو ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں ملیگا کہ جلال الدین خلجی کے عہد میں مولہ[1] نامی دلی میں ایک درویش تھے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہی کہ ان کی خانقاہ میں

"ہزار من میده و پانصد من مسلوخ (گوشت بنا بنایا) و سہ صد من شکر خرج یومی شیخ بود کہ در لنگر بکار می رفت" (ص ۱۷۰)

اگر من سے وہی چالیس سیر والا ہندوستانی من مراد ہی، اور غالباً وہی مراد ہی بھی کہ اور جہاں کہیں بھی من کا لفظ اس زمانہ کی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہی اس سے وہی ہندوستانی من مقصود ہی، سوچنے کی بات ہی کہ ایسی صورت میں ہزار ہزار من آٹے کی روٹیوں اور پان پان سو من گوشت کے روزانہ کھانے والوں کی تعداد کیا ہوگی، اور واقعہ تو یہ ہی کہ بجائے خود یہ اس اولوالعزمی کی دلیل ہی جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر پائی جاتی تھی،

[1] ظفر الوالہ بجرات کی عربی زبان میں ایک مبسوط تاریخ ہی اس میں اس لفظ "مولہ" کا تلفظ درج کرتے ہوئے لکھا ہی، "بتشدید اللام المفتوحہ" یعنی "مولّہ" اس کا صحیح تلفظ ہی، اس میں شیخ مولہ کے متعلق لکھا ہی کہ کان سیدی مولہ مع سعۃ تصرفہ یقتصر فی الملبوس علی رداء من قطن و اذا رد فی الماکول علی قرص خبز من دقیق الارز و قلیل الادم من جنس البقول الحب کثیر الریاضۃ والمجاھدۃ لا زوجۃ لہ ولا غلام یخدمہ ولا یقبل الفتوح صفحہ ۲۶۶ ج ۲ یعنی سیدی مولہ ان تصرفات کے باوجود سادہ لباس رکھتے تھے، ایک سوتی چادر ایک لنگی، کھانے میں چاول کی روٹی کسی ترکاری کے ساتھ جس میں گوشت وغیرہ کچھ نہ ہوتا، مجاہدہ اور ریاضت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ ان کی نہ بیوی تھی نہ کوئی غلام خدمت کرنے والا، لوگوں سے نذر و نذور فتوحات بھی نہیں لیتے تھے پھر یہ خرچ کہاں سے مہیا ہوتا تھا؟

Marfat.com

اللہ اللہ آج جس چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے، حکومت نہیں، بلکہ مسلمانوں کے عام افراد اسے انجام دیتے تھے، آخر روزانہ اتنی بڑی مقدار میں کھانا پکوانا اور کھلانا بغیر کسی معمولی سلیقہ نظم کے ممکن ہے؟ لیکن قومیں جب زندہ ہوتی ہیں، تو ان پر ایسی باتیں بلکہ ان سے بھی عجیب تر باتیں آسان ہو جاتی ہیں[1]۔ اور جب مُردنی چھا جاتی ہے، تو دو آدمی کے کھانے پینے کا انتظام بھی دشوار ہو جاتا ہے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ جب سیدی مولہ کے اس "خوانِ یغما" کی خبر بادشاہِ وقت (جلال الدین خلجی) کے کانوں تک پہنچی تو خود اسے بھی تعجب ہوا، اور شاید کچھ خطرہ بھی، آخر

"شبے بہ لباس ناشناس در خانقاہ او رفتہ تصرف اورا انچہ شنیدہ بود زیادہ یافت"

---

[1] مآثر الامراء میں الہ وردی خاں ایک جہانگیری امیر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے شکاروں کو گھیرنے اور پھنسانے کے لیے ایک خاص قسم کا جال بنوایا تھا، مآثر الامراء میں اس جال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ "دامے ست در کمال استواری بار ہشتاد شتر" ایک جال تھا اور اسی اونٹوں پر لد کر شکارگاہ پہنچتا تھا، لکھا ہے کہ طول دہ ہزار ذرعہ بادشاہی وارتفاع شش" اللہ اکبر دس ہزار گز بادشاہی طوالت ملاحظہ فرمائیے۔ اسی اونٹوں پر لاگر جاتا تھا تو کیا تعجب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ٹکڑوں میں منقسم تھا جب اس سے شکار کا کام لینا چاہتے تو "بساں سراپردہ پستو بہا سترگ برپا کنند و انواع سباع (درندے) و وحوش درآں گرد آوردہ صید نمایند" ص ۲۵۸ ج ۱۔ گویا وہ سارے جانور جو اس جال کے احاطہ میں آجاتے تھے خود بخود شکار ہو جاتے تھے میں نے یہ اس لیے نقل کیا ہے کہ شکار جو صرف دل بہلانے کی ایک چیز ہے، لیکن اتنی غیر اہم چیزیں بھی زندگی کے دنوں میں قوموں سے کیسے عجیب کارنامے صادر کرا لیتی ہیں، سیر المتاخرین وغیرہ میں اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے جشن منانے کا حکم دیا حسب دستور بارگاہ شاہی نصب ہوا جس میں "دوازدہ ہزار کس در سایہ آں تواند گنجید" یعنی دس بارہ ہزار آدمی کی گنجائش اس بارگاہ میں تھی، اتفاق سے اس میں آگ لگ گئی لکھا ہے کہ "اندازہ ایں نقصان ہیچ محاسبے نتواند یافت" مگر قلوب میں جب قوت اور زندگی رہتی ہے تو جس نقصان کا حساب کوئی محاسب نہیں کر سکتا تھا، اس کی پروا بھی نہیں ہوئی۔ اسی کتاب میں ہے کہ "بعد انطفائے التہاب آتش مذکور (یعنی آگ کے بجھ جانے کے بعد) حکم شد کہ بجہت بزم شرف کہ نزدیک رسیدہ بود از سر نو بارگاہ والا درست گردد، در اندک روز بارگاہ فلک اشتباہ صورت انجام یافت" (سیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۰۳)

کسی جگہ میں نے شیخ محدث کے حوالہ سے بنگال بادشاہ غیاث الدین خلجی کے متعلق نقل کیا ہے کہ بنگال میں اتنا بڑا پل بادشاہ نے بنوایا تھا جس پر بارہ دن تک لوگ چلتے رہتے تھے۔

ملا عبدالقادر نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ سیدی مولہ کا دستر خوان سب کے لیے کشادہ تھا، عامی اور خاصی کی کوئی خصوصیت نہ تھی

"مردم نامی و سرداران معتبر[1] و سائر خواص و عوام پیوستہ ملازم خانقاہ او بودندے"

شیخ محدث نے بھی اخبار الاخیار میں سیدی مولہ کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے کہ

"اتباع و مریداں بسیار داشت و بمردم طعام می داد" ص ۲۰،

جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنی مقدار و وسعت کے لحاظ سے سیدی مولہ کا دستر خوان جو کچھ بھی خصوصیت رکھتا ہو، لیکن خانقاہی لنگر خانوں کے دروازے عموماً ہر کہ و مہ خاص و عام کے لیے کھلے رہتے تھے، اس میں ان کی کوئی خصوصیت نہ تھی، اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ فخرالدین نامی ایک بزرگ تھے ملا عبدالقادر ہی نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سماع کے بعد دستور تھا کہ

"سفرہ (دسترخوان) می کشیدند و شاہ و درویش گز دا و برابر بود"

---

[1] ان سردارانِ معتبر میں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ "ملوک و امرا معزول بلبنی" بھی شریک رہتے تھے، غالباً ان ہی لوگوں کی شرکت جلال الدین خلجی کی غلط فہمی کا باعث ہوئی اس کو خطرہ ہوا کہ شاید سیدی مولہ کے اس خانقاہی کاروبار کے پیچھے کوئی سیاسی سازش تو پوشیدہ نہیں ہے، خود جا کر خانقاہ اور لنگر خانے کی جو حالت اس نے دیکھی، اس سے بدگمانی میں اور اضافہ ہو گیا، بالآخر اس نے سیدی مولہ کو پا بزنجیر دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا پوچھ گچھ ہوئی، شیخ نے قسمیں کھا کر باور کرایا کہ میری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔ دربار کے امرا و علما سبھوں نے سلطان کو سمجھایا اور شیخ کی طرف سے صفائی پیش کی، لیکن اس کے دل سے کانٹا نہ نکلا، قاضیوں سے اس نے چاہا کہ شیخ پر کوئی شرعی الزام قائم کریں، لیکن بالاتفاق سبھوں نے اظہار کیا کہ ہمارے نزدیک شیخ پر کوئی شرعی الزام عائد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے بعض علما بادشاہ کے زیر عتاب بھی ہوئے مجبور ہو کر جلال الدین نے اس زمانہ کے بعض آزاد منش قلندروں کو جنہیں حیدریہ کہتے تھے شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا، اور ان ہی بدبختوں کے ہاتھ شیخ کو شہید ہونا پڑا، بداؤنی شیخ محدث دونوں نے لکھا ہے کہ جس دن سیدی مولہ شہید کیے گئے سخت آندھی آئی طوفان کا سماں قائم ہو گیا، شیخ محدث کا تو بیان ہے کہ گویا قیامت برپا شد، عالم تاریک گشت" بداؤنی کا بیان ہے کہ قحطے چناں واقع شد کہ ہندواں از غائت گرسنگی زن و فرزند جماعہ جماعہ دستہائے یک دیگر را گرفتہ خود را در آب جون انداختہ (باقی بر صفحہ ۲۲۰)

انتہا اس عمومیت کی یہ تھی کہ بیرم خان خاناں جو اس زمانہ میں وزیر ہی نہیں بلکہ مدار کل اور حقیقی معنوں میں وہی حکمراں تھا، لکھا ہے کہ

"بیرم خاں نمازِ جمعہ اکثر در مسجد ادا می گذارد ..... و در تناول طعام و سائر آداب مجلس ہیچ امتیاز از سائر الناس نداشت" (ص ۸ ج ۳)

غربت و امارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء و غرباء دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس نظم سے غریب حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہوگا، جہاں

توخذ من اغنیاءھم و تقسیم علی فقراءھم	امیروں سے ان کے لیا جائے اور غریبوں پر بانٹ دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق وصفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا خصوصاً جن بزرگوں کو کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یوں سمجھیے کہ غرباء کی قسمت جاگ اٹھتی تھی، گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں کے آغاز میں ایک مشہور ہستی حضرت شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جن کا اصلی نام سید محمد سعید تھا، لیکن عوام میں آپ کا یہ عرفی ہی نام مشہور ہو گیا، اور اب تک اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں، ہمارے مخدوم و مکرم جناب مولوی غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل انبالہ کے نام کا انتساب

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۹) طعنۂ ننگ و ناامی شدند و مسلمانان نیز با آتش گرسنگی سوختہ غریق بحر عدم بودند" عام خیال بھی تھا کہ شیخ مولہ کے خونِ ناحق کا یہ اثر ہے، لیکن بقول عبدالقادر "بریں طور چیزہا ادراہم نہ تواں نہاد کہ شاید از جملہ اتفاقیات باشد" بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ قتل ہونے سے چند دن پیشتر سیدی مولہ کی زبان سے یہ اشعار سُنے جاتے تھے

در مطبخ عشق جز نکو را نہ کشند ۔ لاغر صفتاں زشت خو را نہ کشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز ۔ مردار بود ہر آنچہ او را نہ کشند

Marfat.com

آپ ہی کے اسم گرامی کی طرف ہے۔

یہ شاہ بھیک قدس سرہٗ حضرت شاہ ابوالمعالی (انبیٹھا) ضلع سہارنپور کے ارشد خلفا میں ہیں، بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جب معزالدین جہاندار شاہ دلی کے تخت پر قابض ہوگیا، تو اُس زمانہ کا ایک امیر ظفر خاں حضرت سے مشورہ گیر ہوا کہ جہاندار شاہ کے مقابلہ میں فرخ سیر جو اٹھ کھڑا ہوا ہے، میں کس کا ساتھ دوں، آپ نے فرخ سیر کی رفاقت کا مشو . . دیا، وہ اپنی فوج کے ساتھ فرخ سیر سے جا ملا، جیسا کہ معلوم ہے قسمت نے دلی کے تخت کا فیصلہ فرخ سیر کے لیے کیا، ظفر خاں کی بن آئی اور نواب روشن الدولہ ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، سہ ہزاری کا منصب بخشی گیری کا عہدہ فرخ سیر کی طرف سے ان کو عطا ہوا، چونکہ یہ کامیابی حضرت والا کے مشورہ کی راہ سے روشن الدولہ کو حاصل ہوئی تھی، قدرتاً وہ شاہ بھیک صاحب کے انتہائی عقیدت کیشوں میں تھا، اور نواب روشن الدولہ کی وجہ سے فرخ سیر خود اور اُس کے دربار کے امرا، حضرت کے معتقدوں میں شریک ہوگئے، ان کے تذکرہ میں جس کا نام "ثمرۃ الفوائد" ہے۔ اور اُن کے براہِ راست مرید مولوی محمد لطف اللہ مرحوم کی تصنیف ہے، اس کتاب میں حضرت شاہ بھیک کے داد و دہش کے قصوں کی ایک طویل فہرست درج ہے، مولوی لطف اللہ نے لکھا ہے. حضرت کی خانقاہ میں ذاکرین وشاغلین کی تعداد "پانصد کس درداخل حال بدائرہ (خانقاہ) شریف . . . . بیاد الٰہی مشغول می بودند" ان کے سوا "ہیں نذ جمع صادر و وارد ہر روز تاہزار کس بودہ باشد" ص ۷۰، اور دونوں وقت انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو حضرت کی خانقاہ سے کھانا پہنچایا جاتا تھا۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ روشن الدولہ خود حضرت والا کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ حضرت کی خانقاہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائے، اپنے ساتھ "مبلغ ہفتاد ہزار روپیہ بجہت روضہ شریفہ آوردہ" اور عرض گذار ہوا کہ "ایں قدر زر را ہمراہ آوردہ اگر دیگر

-مطلوب خواہد باشد طلبیدہ می شود"

شاہ بھیک نے روشن الدولہ سے یہ سُن کر فرمایا کہ

بالفعل مبلغ رایک جا جمع دارند شما آرام کنید بوقت سہ پہر تتمیہ آں نمودہ معماراں را

طلبیدہ شرع عمارت کردہ خواہد شد"

روشن الدولہ ستر ہزار کی ان تھیلیوں کو حضرت کے پاس چھوڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف آرام کے لیے چلا گیا، ادھر شاہ بھیک صاحب نے

"درویشاں را طلبیدہ زر مذکور خانہ بخانہ بیوہ زناں و محتاجاں و مسکیناں ساکنان انبالہ

و تھانیسر و سرہند و پانی پت وغیرہ تقسیم نمودند کہ یک حبہ باقی نگذاشتند" ص ۱۱۹

روشن الدولہ بیچارہ سہ پہر کے وقت حاضر ہوتا ہے، اور آپ فرماتے ہیں۔

"بنار خانقاہ را چہ قبولیت شدہ کہ بچندیں گوشہ نشیناں و محتاجاں رسیدہ .....

با فقیر را عمارت عالی چہ کار ست"

روشن الدولہ نے یہ سُن کر عرض کیا "بسیار مستحسن و بجا شد خزانہ دیگر ہم موجود است"

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"روزے قاصد مرسلہ بادشاہ محمد فرخ سیر و نواب روشن الدولہ و نواب عبداللہ خاں

مع عرائض و ہندیات مبلغ سہ لک روپیہ رسید"

شاہ صاحب کو خبر ہوئی، ارشاد ہوا کہ حسب استحقاق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے

"بموجب امر عالی قصبہ پانی پت و رام پور و کرنال و انبیٹھ و گنگوہ وغیرہ قسمت نمودہ" ص ۱۱۹

اسی میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ بھیک کا

"معمول چناں بود کہ در سفر و حضر تا نصف اللیل دروازہ باز می ماند و سائلے کہ می آمد

محروم نمی رفت از نقد و جنس و طعام و پارچہ ہر چہ میسر و موجود بودے انعام می فرمودے" ص ۱۱۹

اس کتاب میں آپ کے داد و دہش اور عام بذل و کرم کے جو قصے درج ہیں اگر ان کو جمع

Marfat.com

کیا جائے تو ایک مستقل مضمون بن سکتا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادیاں حضرت نے کرائیں، کتنوں کو ان امیروں کے پاس نوکریاں دلوائیں، کتنے مظلوموں کو ظالم حکام کے پنجوں سے اپنے اثر سے کام لے کر آپ نے خلاصی دلوائی جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کسی ایک شخص کا حال نہ تھا، ان بزرگوں کے دیگر مشاغل و مکاسب میں ایک اہم چیز یہ بھی تھی۔ ان ہی دنوں میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شیخ سیف الدین بن عروۃ الوثقی شیخ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا قیام عموماً دلی میں رہتا تھا لکھا ہے کہ

"محمد اورنگ زیب و شاہزادگان و امراء را بخدمت ایشاں ارادتے پیدا شد ور امر معروف و نہی منکر کوشش بلیغ می داشتند"

لیکن امراء کی ارادت سے جو نفع اٹھایا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ

یک ہزار و چہار صد کس را موافق رغبت و فرمائش ہر یک از خانقاہ ایشاں ہر روز دو وقت طعام عنایت می شد" (مناقب العارفین)

ہر شخص کی رغبت اور فرمائش کے مطابق ہزار ہزار چودہ چودہ سو آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلانا کوئی معمولی بات ہے، لیکن وہ بیٹھے اسی لیے تھے کہ منجملہ دیگر مہمات کے ایک مہم ان غریبوں تک روزی پہنچانے میں ذریعہ بننا بھی تھا۔

ایک دلچسپ کیسے یادل دوز واقعہ اسی سلسلہ کا یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے ایک بزرگ جن کا عرفی اور مشہور نام شاہ بولن تھا، سہوارہ کے رہنے والے تھے، صاحب مناقب العارفین جوان کے دیکھنے والوں میں ہیں انہوں نے لکھا ہے

"در خانقاہ خود وارد و صادر را طعام می دادند، گویا لنگر خانہ وے حضرت سفرہ عام بود چہ دشمن و چہ دوست دریغ نمی داشتند"

اتفاق سے اسی زمانہ میں غدر کا فتنہ ہندوستان میں شروع ہوا لیکن اس زمانہ میں بھی

Marfat.com

شاہ بولن کا لنگر خانہ جاری رہا اسی کتاب میں ہے

"درایام غدر ہندی در لنگر خانہ وے حضرت دوست و دشمن می آمدند و طعام می خوردند

و می رفتند"

انگریزی حکومت اور اس کے ارباب حل وعقد اسلامی فقراء کے اس طرز عمل سے واقف نہ تھے، ان تک یہ خبر پہنچی کہ شاہ بولن نامی فقیر سرکار کے باغیوں کو کھانا کھلاتا ہے، حالانکہ ان بیچارے کو کیا خبر کون باغی ہے اور کون غیر باغی بقول صاحب مناقب "وے حضرت با کسے حاجتے وکارے نداشتند" لیکن حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ امیروں سے لے کر مفت غریبوں میں کھانا بلا وجہ تقسیم کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، شاہ صاحب پر بھی بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا، اور

"بجرم آں کہ دشمنان حاکم را مدارات می کردند و طعام می دادند . . . باعث گرفتاری

و رسانیدن وے حضرت در جزیرہ مذکور (انڈمان) شدہ بود (مناقب ص ۴۰ ۵)

زندگی کا آخری حصہ عبور دریائے شور کی اسی سزا کی وجہ سے انڈمان ہی میں گذرا، اور

"در جزیرہ انڈمان مدفون گشتند" ص رر

اپنے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے نمونے تکسب المعدوم وتحمل الکل وتعین الاخرق[1] کی اتباع میں ان کو جو لذت ملتی تھی، وہ ناآشنا قلوب اس کی حلاوتوں کو کیا محسوس کر سکتے ہیں، ملا عبد القادر نے شنیدہ نہیں بلکہ اپنی یہ دیدہ شہادت شیخ عزیز اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق نقل کی ہے، کہ ان کا عام حال یہ تھا۔

---

[1] یہ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں کا وہ مشہور فقرہ ہے جسے خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین علیہا السلام نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اس وقت فرمایا تھا جب غار حرا سے آپ پہلی دفعہ تشریف لائے۔ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جن مشاغل میں گذری تھی گویا اس کا اظہار تھا مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ناداروں کو کما دیتے ہیں، دوسروں کا بار خود برداشت کرتے ہیں جو اپنا کام اچھی طرح انجام نہیں کر سکتے تھے ان کی مدد فرماتے ہیں، صوفیۂ کرام میں عبادت کے اس طریقہ کو یینی "برآوردن

از جہت شفاعت ہر فقیرے بیچارۂ کہ رجوع باوکردے ہر چند در اعتکاف اربعین ہم بودے اگرچہ بخانہ بیگانہ از دین بانستے رفت مسافت بعیدہ را پیادہ طے می نمود و بعد از انجاح حاجت آں محتاج باز بحجرہ اعتکاف رفتہ مشغول می شد۔	جو کوئی محتاج بے وسیلہ آدمی ان کے پاس سفارش کے لیے حاضر ہوتا، شیخ خواہ چلّہ ہی میں کیوں نہ بیٹھے ہوں اور کسی ایسے شخص کے پاس ہی سفارش نہ کرنی پڑتی ہو جو دین سے بیگانہ ہوتا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے شیخ پیدل اس شخص کے گھر جاتے مکان اس کا جتنے فاصلہ پر بھی ہو، ضرورت مند کی حاجت جب پوری ہو جاتی تب پھر چلّہ کے حجرہ میں واپس ہو کر اپنے اشغال میں مشغول ہو جاتے۔

ملا صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ سفارش کے لیے چلّہ کے اعتکاف سے باہر ہونے کو چلّہ کشی کے منافی نہیں خیال کرتے تھے ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

گویا شکستے در اعتکاف واقع نہ شد	گویا سمجھتے تھے کہ ان کے اعتکاف کا تسلسل اس سے نہیں ٹوٹتا تھا۔

واللہ اعلم اعتکاف کو پھر نئے سرے سے شروع کرتے تھے، یا نفلی اعتکاف ہونے کی وجہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴) کار امیدوار کو جو اہمیت حاصل تھی، یہ کسی خاص بزرگ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کو ان بزرگوں کے حالات میں بکثرت اس کی مثالیں ملیں گی، ان کا امرا، اور سلاطین پر جو اثر تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشکل ہی سے ان کی سفارش رد ہو سکتی تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار رؤسا طریق میں ہے، حلب کا بادشاہ الملک الظاہر بامر اللہ حضرت کے عقید تمندوں میں تھا فتوحات میں ایک موقع پر شیخ نے لکھا ہے۔

لقد کلمت الملک الظاہر بامر اللہ صاحب حلب فی حوائج کثیرۃ نقضاہا فی یوم واحد مائۃ حاجۃ و ثمانیۃ عشر حاجۃ للناس ولو کان عندی فی ذلک الیوم اکثر من ذلک لقضاہ بطیب النفس (۳۲ء ف ۱)	میں نے حلب کے بادشاہ ملک ظاہر بامر اللہ سے مختلف امور کے متعلق سفارش کی بادشاہ نے میرے کہنے سے ایک سو اٹھارہ حاجتیں لوگوں کی ایک دن میں پوری کیں، اور اس وقت اگر میرے پاس کچھ اور ضرورتیں ہوتیں تو اسے بھی بخوشی وہ پوری کرتا۔

Marfat.com

اس قسم کے اربعینات میں وہ اس لیے باہر نکلنے کو جائز سمجھتے تھے، خیر یہ تو فقہ اور تصوف کا علمی مسئلہ ہے، امام محمد وغیرہ کی جو رائے نفلی اعتکاف کے متعلق ہے اس کے لحاظ سے گنجائش بھی پیدا ہوتی ہے مجھے اس وقت ان بزرگوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرنا ہے، قومی ہمدردیوں کے مدعیوں کے لیے اس میں کتنی بصیرتیں ہیں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ

ایں عبادت متعدی را تقدم بر عبادت لازم بنہادے۔

یعنی ان کا خیال تھا کہ کسی غریب آدمی کی حاجت براری کا کام چونکہ ایسی عبادت ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچتا ہے یعنی متعدی ہے، اس لیے لازمی عبادت پر جس کے منافع صرف اپنی ذات کی حد تک محدود رہتے ہیں، اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اسی لیے سفارش کو چلہ کشی کی عبادت سے مقدم خیال کرتے تھے

ذرا ان بزرگوں کی نگاہ کی بلندیوں کو دیکھیے، صرف یہی نہیں کہ اعتکاف اور چلے کو توڑ دیتے تھے بلکہ ملا صاحب کا جیسا کہ بیان ہے، کسی قسم کا آدمی ہو، دین سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو، فاسق ہو، فاجر ہو، لیکن غریب مسلمان کا کام نکلتا ہے اس لیے ان کو ایسوں کے پاس جانے میں بھی عذر نہیں ہوتا تھا، کل کیا دن تھے اور آج ان ہی کے اخلاف کا کیا حال ہے اور بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی ہے ملا صاحب نے اس کے بعد جو یہ اضافہ کیا ہے کہ

گاہے چناں بودے کہ اگر کافرے یا ظالمے مرتبہ اول شفاعتش قبول نہ کردہ یا عمداً از خانہ بدر نیامدہ شیخ تمام روز بر خانہ او نشستہ

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اگر کسی کافر یا ظالم حاکم کے پاس شیخ کی سفارش کارگر نہ ہوتی، اور وہ اس کو قبول نہ کرتا، یا قصداً گھر سے باہر نہ نکلتا تو دن بھر شیخ اس کے دروازہ پر بیٹھے رہتے۔

سُن رہے ہیں، فاسق اور فاجر ہی نہیں کافر اور ہندو عہدہ داروں کے پاس بھی اس غرض کے لیے جانے میں نہیں ہچکچاتے تھے، نفس کا یہ حال ہے کہ قصداً عہدہ دار باہر نہیں

نکل رہا ہو، لیکن وہ ہیں کہ اس کے دروازے پر اس لیے دھونی رمائے بیٹھے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کا کام نکلتا ہو نہ عزت کی پروا ہو اور نہ پوزیشن کی کیونکہ شیخ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کے علمی وقار کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ ملا عبدالقادر جیسے آدمی ان کے شاگرد ہیں، اور اس تلمذ پر ان کو فخر ہو خود لکھا ہو کہ

در درس آں صاحب کمال بعضے کتب رسائل تصوف استفادہ نمودہ الحمد للہ

اس باکمال بزرگ کی خدمت میں تصوف کے چند رسالوں کے پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملا ہو، الحمد للہ

علاوہ علوم باطنی کے ملا صاحب کا بیان ہو۔

"در علوم ظاہری ہم کامل و مکمل بود تفسیر عرائس و عوارف و فصوص الحکم و شرحش بہ تلامذہ درس گفتے، صاحب تصانیف مشہورہ ست"

بہر حال اگر عہدہ دار اس دن ہاتھ نہ آتا، یا شیخ کی سفارش نہ سنتا تو شیخ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے، ملا صاحب نے لکھا ہو کہ

روز دیگر بدر بار او مکرر رفتہ و دم نزدہ از یں معنی ہیچ رنگ کدورتے بر آئینۂ خاطر غیب نمائیش نہ نشستہ

دوسرے دن پھر اسی کا فر یا ظالم عہدہ دار کے دربار میں جاتے اور کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرتے، ان کے دل میں اس طرز عمل سے کوئی کدورت پیدا ہوتی۔

کچھ اس طرح لپٹ جاتے تھے کہ بالآخر

(حاشیہ صفحہ ۲۲۶) شہ کسر نفسی اور تواضع کے سلسلے میں ملا عبدالقادر ہی نے ان کا ایک عجیب قصہ نقل کیا ہو، لکھا ہو کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا، قدس سرہ کی خانقاہ میں سماع کی مجلس تھی شیخ عزیز اللہ بھی اس مجلس میں موجود تھے، اتنے میں کسی قلندر آزاد نے ایک چیخ ماری اور "دست بزانوے شیخ بردہ و بر داشتہ او را سرنگوں بر زمین زد، و دستارش پریشان شد، والے نیز رسید" بھری مجلس میں ان کو پٹک دیتا ہو، پگڑی بکھر جاتی ہو، "تکلیف بھی پہنچی ہو" لیکن شیخ نے خود ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید وجد اور حال میں اس قلندر سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو مگر در اصل اس نے شرارۃً یہ حرکت کی تھی، تھوڑی دیر بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کیا، حاکم شہر بھی مجلس میں موجود تھا اسے بڑا غصہ آیا "و ارادہ زجر و ضرب تہدید آں پریشاں کرد" مگر جانتے ہو شیخ نے کیا کہا "شیخ عذر خواہی او بسیار نمودہ دست و پائے او یعنی اس قلندر کے دست و پا کو بوسیدہ و در حمایت خویش نگاہ داشتہ و نہ گذاشت کہ تعرض باو رسانند" (ص ۱۰ ج ۳)

تا آنکہ مشفوع عنہ خود شرمندہ و خجلت زدہ در پائے او می افتاد و حاجت آں فقیر راسمعا وطاعۃ بر می آورد۔ — وہ شخص جس سے سفارش کی جاتی تھی، خود شرمندہ اور خجل و نادم ہو کر شیخ کے پاؤں پر گر پڑتا اور یوں بخوشی و رضا اس بیچارے غریب کا کام نکل جاتا۔

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھیے، اور اس پر غور کیجیے، آپ کو نظر آئیگا کہ امرا اور غربا کے درمیان، ان ہی بزرگوں کا وجود باجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا، اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسرے اغراض رکھتے تھے، ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں' مسافروں' بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں، جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو،

مسلمان جس ملک میں بھی پہنچے تھے، اس کے طول و عرض میں آپ کو اس قسم کی خانقاہوں کا جال بچھا ہوا نظر آئیگا، خیال تو کیجیے عہد التمش و بلبن یہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کا زمانہ ہے، لیکن دلی ہی میں نہیں، پایۂ تخت سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ہم دیکھتے ہیں کہ غربا کے لیے ان ہی خانقاہوں کے ذریعہ سے لنگر جاری ہیں، سیر الاولیا میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے "در اوائل از آئندگان می شنیدم کہ شیخ خضر پارہ دوز در بہار خانقاہے دارد و درویشاں را خدمت می کند" (ص ۱۱۲) سلطان المشائخ کا ابتدا میں ان ہی کے پاس بہار جانے کا خیال تھا: "نیت جزم کردم کہ بروم و غلام بچگاں او را تعلیم بکنم"

غور کرنے کی بات ہے کہ یہ زمانہ ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کی نو عمری کا زمانہ ہے غالباً ناصر الدین بن التمش کا زمانہ ہوگا، اور اسی زمانہ میں دلی سے اتنی دور بہار میں درویش کی خانقاہ جاری ہے، اور درویشوں کی خدمت ہو رہی ہے،

بہر حال "فتوحات" "نذور" "شکرانوں کی آمدنیاں ان خانقاہوں میں ضرور ہوتی تھیں

لیکن جب تک ہماری خانقاہیں واقعی خانقاہیں تھیں، دکانوں کی شکل اُنہوں نے نہیں اختیار کی تھی، تو اُس وقت خانقاہ کے درویش کی حیثیت مالک کی نہیں صرف قاسم کی رہتی تھی،

فتوحاتی آمدنیوں کے مالک نہیں، بلکہ قاسم، اور صرف قاسم ہونے پر جن خانقاہوں میں اصرار کیا جاتا تھا، اور اتنا شدید اصرار کہ شیخ کبیر شکر گنج خواب میں آکر سلطان المشائخ کو تنبیہ کرتے ہیں، کیا اس کے بعد بھی ان بزرگوں کے متعلق حج کی فرضیت اور عدم فرضیت میں کسی کو شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ ہا! جن دینی بادشاہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دین کی خدمت میں صرف کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر بنائے رکھا، آج اُن پر زبانیں کھل رہی ہیں، ان لوگوں کی جن کا سرمایہ دینی جدوجہد کی راہ میں زبان سے نکلنے والے چند تقلیدی الفاظ، یا قلم سے بننے والے چند فرسودہ پامال حروف کے سوا اور کچھ نہیں ہے جن سے بمشکل پانچ وقت کی نماز بھی ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں ہو سکتی، خدا کی شان ہے وہی آج ان بزرگوں کو ٹوکنے کی ہمت کر رہے ہیں، جن کی زندگی میں "دین" اور دین کی حقیقی سچی خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا،

اللہ کے ان دوستوں کے معاملہ میں اپنے عزیزوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا کی غیرت کو حرکت میں نہ لائیے، تنقید و تحقیق، ریسرچ و تنقیر کے کھیل کھیلتے رہیے لیکن خدارا ریش بابا تک تو آپ کی یہ بازیاں نہ پہنچ جائیں۔

من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب ۔	میرے کسی ولی سے جو دشمنی کرتا ہے میں اس کو جنگ کا اعلان دے دیتا ہوں

کی حدیث اگر آپ نے سنی ہوگی تو بیٹھے بٹھائے اس اعلان جنگ کو کیوں دعوت دیتے ہیں، جس کا جواب تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

کیا آپ واقعات کا انکار کر سکتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے "محمد تغلق" اور اس کی بے نظیر خونیں داستانوں، بے مثال مجنونانہ افسانوں کے نقوش کیا مٹائے جا سکتے ہیں؟ دولت آباد بسانے کے لیے دلی اُجاڑی گئی، اس حد تک اجاڑی گئی کہ کسی گوشہ کے کسی گھر سے دُھواں بلند نہیں ہو رہا ہے۔

عجیب بات ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی کی بعض معمولی باتوں کو تو لوگوں نے اہمیت دی کہ غیاث الدین تغلق پر جب نو تعمیر دعوتی مکان گرا، تو کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ کے ستانے کا چونکہ ارادہ رکھتا تھا، حضرت سے لوگوں نے عرض کیا کہ اب تو وہ جمنا کے ساحل پر آگیا، دو ایک روز میں دلی پہنچ کر معلوم نہیں کیا مصیبت پیدا کرے، بیان کیا جاتا ہے کہ اسی وقت زبانِ مبارک سے "ہنوز دلی دور است" کا فقرہ نکلا، جو نسلوں اور پشتوں سے منتقل ہوتے ہوئے آج تک زبان زد عام ہے، عموماً تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اسی طرح خلجی فاسق سیہ کار بادشاہ قطب الدین مبارک جب اپنے غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے مارا گیا، تو عموماً اس موقعہ پر بھی مورخین ذکر کرتے ہیں، کہ جس رات کو مارا گیا، اُس کی صبح کو وہ سلطان المشائخ کے ساتھ گستاخی کا عزم کیے ہوا تھا کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ ہی کی بد دعاء کا شکار ہوا[۱]۔

[۱] واقعہ یہ ہے کہ یہ خسرو خاں جو چار مہینوں کے لیے دلی کا بادشاہ بھی ہو گیا تھا، دراصل گجرات کا ایک خوش رو وجیہ چھوکرا تھا، اصل نام حسن پردار بچہ تھا قطب الدین اس کے ہاتھ سے مارا گیا یہ تو واقعہ ہے لیکن اس کے پیچھے کیا کسی اللہ کے ولی کی بد دعا بھی تھی؟ جیسا کہ میں نے کہا تاریخوں میں بھی سلطان المشائخ کے قصہ کو ذکر کرتے ہیں لیکن مجمل لفظوں میں میر خورد نے سیر الاولیاء میں اس قصہ کا ذکر کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا، اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لیے قطب الدین حضرت سے بھی ناراض رہتا تھا، اُس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ و علماء کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں، سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا "تا مسجد نزدیک داریم وایں احق است ہمیں جا خواہم گذارد" اور وہ جامع میری نہیں گئے بادشاہ سخت برافروختہ ہوا، اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان و مشاہیر شہر دربارِ شاہی میں پیش ہو کر نذر گذرانتے تھے، سلطان المشائخ اس تقریب (باقی بر صفحہ ۲۳۱)

بجائے خود اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں واقعات کچھ کم اہم نہیں ہیں، خصوصاً قطب الدین مبارک کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت اور چار سال تک اسی کشمکش میں دلی ہی کے گویا ایک محلہ میں رہنا، سلطان المشائخ کی ایمانی استقامت کی بڑی عجیب و غریب شہادت ہے، شخصی حکومت کے مطلق العنانہ اختیارات کا اندازہ کیجیے اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے، یقیناً ابتلاء کی یہ چار سالہ مدت کم مدت نہیں ہے. مگر پھر بھی مجھے لوگوں پر تعجب ہے کہ جب تاریخی کتابوں میں سلطان المشائخ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٢٣٠) میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کے لیے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے، اس سے بھی وہ برہم تھا، اس نے اپنے تمام امراء وزراء کو حکم دیا کہ کسے بزیارتِ شیخ غیاث پور نرود" میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ" بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ بیارد ہزار تنکہ زر او را بدہم"

ایک دن شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا، یوں مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کی چار سالہ مدت میں پیش آتے رہے، نوچندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا، قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ اگر" در غرہ ماہ آئندہ نیاید بیارم چنانکہ دانیم" گویا یہ اس کی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسیٹ کر بلواؤں گا، شاید قتل ہی کا ارادہ ہو، سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم صمیم کی خبر پہنچی" سلطان المشائخ ہیچ نگفت" اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا" ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں را روئے پیش تر می داد" الغرض، مہینہ ختم ہوا، چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے اعیان و امراء دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کیے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤں گا، قطب الدین بھی فیصلہ کیے ہوئے ہے کہ اگر" نیامد بیارم چنانکہ دانیم" صرف شب درمیان ست، دلی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دنیا اور دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے، رات گذرنے بھی نہ پائی کہ

"ہمدریں شب ماہ بلائے از آسماں برجان بادشاہ نازل شد"

یعنی خسرو خاں حسن پروار بچہ" موئے سر سلطان را گرفت و باہم در آویختند و پہلوئے سلطان را بخنجر شگافتہ بر زمین انداخت و سرآں مشوم را از تن جدا کردہ از بام ہزار ستوں بزیر افگند" (طباطبائی) صبح کو سر او را بالائے نیزہ کردہ بخلق نمود" میر خورد کہتے ہیں کہ جس رات کو یہ واقعہ پیش آیا، سلطان المشائخ اپنے بالاخانہ کی چھت پر ٹہلتے ہوئے زبانِ مبارک سے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔

اے روبہک چرا ننشستی بجائے خویش ‏ ‏ ‏ ‏ با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

میر خورد نے اس شعر پڑھنے کے واقعہ کو نہیں لکھا ہے، دوسرے تذکروں میں ہے۔ البتہ سعدی کے نام سے اسی مقام

متعلق اس قسم کے واقعات درج ہی کیے جا رہے تھے، تو اس سلسلہ کا جو سب سے بڑا واقعہ تھا اسی کو قلم انداز کیوں کر دیا گیا، حالانکہ میر خورد نے اسی زمانہ میں اپنی کتاب سیر الاولیاء میں بہ تفصیل اس کا تذکرہ کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق کے عہد میں "سماع" کے مسئلہ نے ایک سخت فتنہ کی شکل اختیار کی، سلطان المشائخ کے دربار کا جاہ و جلال، دسترخوان کی وسعت ارباب حاجات کا ہر طرف سے آنا، اور ان غریبوں کی عام اعانت و امداد کی وجہ سے ملک میں جو ہر دل عزیزی آپ کو حاصل تھی یہی چیز بعض علماء وقت کے حسد کا باعث ہوئی اور تو کوئی چیز قابل اعتراض بات سلطان المشائخؒ کی زندگی میں ملی نہیں، اسی غیر مزامیری سماع کے مسئلہ کو اہم بنا کر مولویوں نے محضر نامہ کی صورت میں غیاث الدین کے پاس پیش کیا، ایک صاحب جن کا نام شیخ زادہ جام حسام الدین تھا سلطان المشائخ ہی کی خانقاہ کے رہے ہوئے بلکہ پلے ہوئے تھے، میر خورد نے لکھا ہے

"یا تا بہ غریبی در خانہ سلطان المشائخ کشادہ بود"

یعنی شروع شروع جب دلی آئے تو حضرت ہی کے یہاں فروکش ہوئے، بڑے آدمی شیخ جام کے خاندان سے تھے اس لیے "بانواع تربیت و شفقت سلطان المشائخ پرورش یافتہ" بعد کو شاہی دربار میں ان کو رسوخ خاص حاصل ہو گیا تھا، یہی حضرت اس محضر نامہ کے پیش کرنے میں آگے آگے تھے، غیاث الدین کو حیرت ہوئی جب اس نے سنا کہ غیر مزامیری سماع بھی حرام ہے اس نے فرمان صادر کیا۔

چوں علماء دین در حرمت سماع فتوی کردہ بجہت ایں کار مزاحم شدہ سلطان المشائخ را حاضر کنند و جملہ علماء شہر و اکابر را طلب کنند"

فرمان کی تعمیل ہوئی، سلطان المشائخ بھی حاضر ہوئے اور شہر کے علماء و اکابر بھی بلائے گئے، اس زمانہ میں نائب السلطنت کے عہدہ پر قاضی جلال الدین لواجی سرفراز تھے، مجلس میں یہی سلطان المشائخ سے مخاطب ہوئے، بادشاہ بھی موجود تھا، طرفین میں گفتگو ہو رہی تھی،

دونوں کی سن رہا تھا، درمیان میں فریق مخالف کے علما جب شور برپا کرتے تو تغلق کہتا

"غلبہ مکنید بشنوید کہ شیخ (سلطان جی) چہ می فرماید"

اس عرصہ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے مولانا علم الدین بھی مجلس مناظرہ میں کہیں سے آپہنچے، غیاث الدین ان کا کچھ معتقد تھا، ان ہی کو اس نے حکم بنایا اور کہا کہ

"شما در بغداد و شام و روم گشتہ مشائخ آں دیار سماع می شنوند یا نے؟ وایشاں را دریں کار کسے مانع شود یا نے؟"

مولانا علم الدین نے جواب میں جو واقعہ تھا وہ بیان کیا، فرمایا

"در ہمہ شہرہا بزرگان و مشائخ سماع می شنوند"

بلکہ یہ بھی کہا کہ بعض مقامات میں تو "دف و چغانہ" کے ساتھ بھی سنتے ہیں "وکسے ایشاں را مانع نمی شود" تغلق نے ان کی یہ رپورٹ جب سنی "ساکت شد وہیچ نہ گفت" نائب السلطنت قاضی جلال الدین نے بادشاہ پر اصرار کیا کہ ممانعت سماع کا فرمان جاری کر دیجیے، سلطان المشائخ نے کہا بادشاہ ایسا حکم نہ صادر کریں، تغلق نے سلطان المشائخ ہی کی بات مان لی یعنی کوئی فیصلہ نہ ہوا، جو حال اب تک تھا وہی باقی رہا، مولانا فخر الدین زرادی کے عربی رسالے سے یہ فقرہ میر خورد نے نقل کیا ہے، جس میں اس مجلس مناظرہ کی کیفیت درج ہے۔

وکان ذلک من اول الضحی الی وان الفیٔ ثم قام اہل المجلس من عند السلطان	ابتداء وقت چاشت سے سایہ ڈھلنے تک مناظرہ کی یہ مجلس قائم رہی، پھر لوگ بادشاہ کے سامنے سے اٹھ گئے۔

بہر حال یہ تو مجلس مناظرہ کا مختصر حال ہے، میر خورد نے دیگر جزئیات کی بھی تفصیل لکھی ہے۔

میر خورد نے اس کے بعد مولانا ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی کے

Marfat.com

رسالہ "حسرت نامہ" سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

"چوں حضرت سلطان المشائخ از محضر مذکور در خانہ آمد بوقت نماز پیشیں (ظہر) مراد مولانا محی الدین کاشانی و امیر خسرو شاعر را طلب فرمود"

برنی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حضرت کی خدمت میں جمع ہو گئے اُس وقت حسب ذیل تقریر سلطان المشائخ نے شروع کی۔

"گفت کہ دانشمندان (علماء) دہلی بعداوت و حسد من پر بودند میداں فراخ یافتند و سخنہائے پر از عداوت ایشاں بسیار گفتند"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں جو تقریریں ہوئی تھیں ان سب کا خلاصہ سلطان المشائخ نے ذکر فرمایا، آخر میں ارشاد ہوا۔

"عجبے امروز معائنہ شد کہ در معرض حجت احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نمی شنوند وہمیں گویند کہ در شہر ما عمل بروائت فقہ مقدم ست بر حدیث"

اور صرف یہی نہیں، برنی نے براہِ راست سلطان المشائخ کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں

ہر بار کہ حدیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور می شد برمی آمدند و منع می کردند و می گفتند ایں حدیث متمسک شافعی است و او دشمن علما ماست مانمی شنویم"

اسی کو "بدنام کنندہ نکو نامے چند" کہتے ہیں، کیا واقعۃً یہی حنفیت ہے، یہی امام ابوحنیفہ اور علمائے احناف کا مسلک ہے، کیا ان خرافات کا اظہار جب ان مولویوں کی زبانوں پر ہو رہا تھا، تو وہ اصل حقیقت سے آگاہ نہ تھے، لیکن ان کو حسد اندھا بنائے ہوئے تھا، اس وقت

لہ خدا جانے بیجاپور میں بیٹھے بیٹھے ہندوشاہ کے بیٹے قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہاں سے یہ بات اُڑائی کہ امام غزالی کا قول یجوز لاھلہ ولا یجوز لغیر اھلہ کو حدیث قرار دے کر سلطان جی نے پیش کیا، گیا تماشا ہے دوہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پر یہ الزام ہے، اسی مجلس میں مولانا فخرالدین زرادی موجود تھے۔ گذر چکا کہ وہ دعوے کے دونوں پہلو، جواز و عدم جواز پر دلیل پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔

Marfat.com

ان کا ایمانی نور گھس میں آگیا تھا، سب کچھ جانتے تھے مگر جیسا کہ سلطان المشائخ نے فرمایا

"با اعتقاد اندیانہ کہ بحضور اولی الامر بمکابرہ می آیند"

ظاہر ہے کہ صرف دھاندھلی اور مکابرہ سے محض اپنی بات کی بیجا طرفداری بادشاہ کے سامنے کر رہے تھے، تعجب ہے کہ سلطان المشائخ کے اسی بیان کو بعض لوگوں نے اس کی دلیل بنا لیا ہے کہ ہندستان کے علما، حدیث سے ناواقف تھے، حالانکہ یہ جو کچھ کہا جا رہا تھا ناواقفیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف ضد، ہٹ دھرمی، حسد، شرارت نفس کا نتیجہ تھا۔ اسی کے بعد سلطان المشائخ ہی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہیچ عالمے ندیدم و نشنیدم کہ پیش او احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کردہ آید و او گوید کہ من نمی شنوم من نمی دانم"

سلطان المشائخ بیچارے تو ہندستان سے باہر ایک دن کے لیے بھی کہیں تشریف نہیں لے گئے، ان کا "ندیدم" کھلی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان ہی کے علما، سے متعلق ہو سکتا ہے جس کا یہی مطلب ہوا کہ اس مجلس خاص میں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ علمی نہیں بلکہ صرف حسدی گفتگو اور معاندانہ حجود و تعنت تھا، ورنہ کیا عام علمار ہند کا وہی حال تھا، جسے سلطان المشائخ نے دیکھا تھا، بھلا ایسا کونسا مسلمان ہو سکتا ہے جو حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ماننے کے بعد بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے نہیں مانتا، زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ مثلاً نسخ کا تخصیص کا تاویل کا دعویٰ کرے، نہ کہ علانیہ اقرار کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ماننے کے باوجود میں نہیں مانتا، کیا ایسے شخص کا اسلام باقی رہ سکتا ہے؟ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان مولویوں کی غرض بھی یہی ہوگی یعنی جس مقصد کو اس حدیث سے لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہم اس مقصد کے لیے اس حدیث کو مفید نہیں سمجھتے۔ لیکن بادشاہ جاہل تھا، علمی اصطلاحات کو کیا سمجھتا، انہوں نے اس کے سامنے ایسی تعبیروں میں اپنے مدعا کو پیش کیا کہ حقیقت

Marfat.com

یہ ہے کہ اس سے ایمان کانپ جاتا ہے۔

بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخؒ پر علماء کے اس طرزِ عمل کا سخت اثر تھا، اور کیوں نہ ہوتا، علانیہ رسول کی حدیث کی توہین کی گئی تھی، ضیاء برنی نے اس کے بعد لکھا ہے، سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلنے لگے۔

"ایں چہ روزگار است دراں شہرے کہ ایں چنیں مکابرہ کنند چگونہ آباداں ماند"

دین کی غیرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خون کھول رہا تھا، اپنے محبوب رسول کی حدیث کی اس اہانت نے دامن صبر کو ان کے ہاتھ سے الگ کردیا، اور خاص حال میں جو اہل اللہ پر ایسے مواقع میں طاری ہوجاتا ہے، یہ الفاظ کیا تھے، صرف خدا کا غصہ قہر الٰہی کے شعلے تھے جو فضا میں بھڑکنے لگے، برنی ناقل ہیں کہ سلطان المشائخؒ نے فرمایا "عجب است کہ خشت خشت نہ شود" پھر فرمایا کہ

"بعدازیں بادشاہ و امراء و خلق کہ از قاضی شہر و علماء شہر بشنوند کہ دریں شہر عمل بر حدیث نیست"

ظاہر ہے کہ جس پیرایہ میں قاضی شہر اور علماء نے مسئلہ کو پیش کیا تھا، اس کا ظاہر مطلب تو یہی ہوسکتا تھا کہ باوجود اسلامی شہر ہونے اور باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور ان کے دین پر ایمان لانے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر چلنا ضروری نہیں ہے، سلطان جی نے سچ فرمایا کہ جب اسی قسم کی تعبیریں پیش کی جائیں گی تو پھر "سنت" پر اس ملک کے مسلمانوں کا عمل کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

"چگونہ اعتقاد بر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راسخ ماند"

آخری الفاظ آپ کے یہ تھے

ازاں وقت باز کہ ایشاں روایت کردن حدیث منع کردند، من ترسام کہ شومت "
ایں چنیں بداعتقادی کہ بر علماء شہر معائنہ شد از آسمان بلا و جلا و قحط و وبا بر سر شہر

Marfat.com

خواہر بارید" ص ۵۳۲

یہ مولانا ضیاء الدین برنی کی روایت ہے، جو براہ راست سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے انہوں نے نقل کی ہے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجیگی، اس شہر کے لوگ جلا وطنی کی مصیبت کے شکار ہونگے، قحط میں مبتلا ہونگے، وبا کی مار ان پر پڑیگی، بادشاہ کے دربار میں علماء شہر اور قاضی الملک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ساتھ جو گستاخی کی ہے اس کی سزا ان شکلوں میں لوگوں کو بھگتنی پڑیگی، سلطان المشائخ نے تو "می ترسانم عجب است کہ خشت خشت نہ شود" کے الفاظ سے صرف اندیشہ کا اظہار فرمایا لیکن واقعہ اس کے بعد کیا ہوا" شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ کی وفات" روز چہار شنبہ ہیزدہم ماہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ" (ص ۵۸) میں ہوئی، اور ملا عبد القادر بداؤنی لکھتے ہیں۔

ایں واقعہ (یعنی تصر افتادن بر غیاث الدین تغلق) در سنہ خمس وعشرین وسبعمائۃ ۷۲۵ھ روے نمود (ص ۲۲۵)

اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجانے والا، دلی کے ایک ایک متنفس کو دلی سے جلا وطن کر کے دیوگڑھی (دولت آباد) لیجانے والا، اور ان سارے مصائب ہائلہ کا سرچشمہ جس کا نام محمد تغلق ہے،

"سلطان محمد عادل شاہ بن تغلق شاہ کہ الغ خاں باشد در سنہ خمس وعشرین ۷۲۵ھ باتفاق امراء وارکان دولت بر مسند سلطنت نشست" (ص ۲۲۵، البداؤنی)

میں اب اس پر کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتا، صرف اتنی بات کہ برنی نے جو الفاظ سلطان جی کی زبانی نقل کیے ہیں، ان کو سامنے رکھ لیجیے، اور "محمد تغلق" جس نے خود تو اپنا نام "عادل" رکھا تھا، لیکن عوام میں "محمد تغلق خونی" کے نام سے مشہور ہے، اس کی چھبیس سال کی حکومت کی تاریخ پڑھ جائیے، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے، ہو سکتا ہے کہ محمد تغلق کی مختلف الآثار والجوانب، متضاد صفات والی حقیقت، عامہ مورخین واہل نظر کے لیے جو معمہ بنی ہوئی ہے، وہ معمہ حل ہو جائے

Marfat.com

مشہور ہو کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تابعی کو حجاج نے شہید کیا، اور اس پر وہ خاص کیفیت طاری ہوئی یعنی

کان اذا نام رأی سعید بن جبیر — جب حجاج سوتا تو خواب میں حضرت سعید کو دیکھتا کہ

اخذ بمجامع ثوبہ یقول یا عدو — وہ اس کے کپڑوں کو پکڑے ہوئے فرما رہے ہیں اے خدا

اللہ فیم قتلتنی فاستیقظ مذعورًا — کے دشمن کس قصور میں تو نے مجھے قتل کیا، حجاج اس

ویقول مالی ولسعید — خواب کو دیکھ کر ڈرا ہوا اٹھ جاتا اور بوتا کہ سعید کو ہم سے

(الیافعی ص ۱۹۸) — کیا تعلق ہو گیا ہو

اور ابن جبیر ہی کے قتل کے بعد اس کو وہ بیماری ہوئی جس کا نام لوگ "زمہریرہ" بتاتے ہیں۔ ایسی سخت سردی کلیجے سے اٹھ کر سارے جسم پر چھا جاتی تھی کہ کانپتا جاتا تھا اور

وکانت الکوانین تجعل حولہ مملوۃ — انگیٹھیاں آگ سے بھری اس کے پاس لائی جاتی تھیں

نارًا وتدنی منہ حتی یحرق جلدہ — اور اس سے قریب کی جاتیں تا اینکہ اس کی کھال بھی

وھو لا یحس بھا۔ — جل جاتی لیکن اس کو حس بھی نہ ہوتا۔

پیٹ میں اطباء نے سرطان تجویز کیا، یافعی وغیرہ نے لکھا ہو کہ

فدعا بالطبیب فاخذ لحما وعلقہ — حجاج نے طبیب کو بلایا، طبیب نے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا،

فی خیط وسرحہ فی حلقہ وترکہ — اور اس میں تاگا باندھا اور گوشت کے اس ٹکڑے کو حجاج

ساعۃ ثم اخرجہ وقد علق بہ — کے حلق میں اتار دیا تھوڑی دیر کے بعد تاگے کو کھینچا تو

دود کثیرۃ (یافعی ج ۱ ص ۱۹۵) — دیکھا کہ اس گوشت کے ٹکڑے میں بکثرت کیڑے لپٹے ہوئے ہیں

کہتے ہیں کہ جب مادی تدبیروں سے حجاج مایوس ہو گیا، تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو بلوایا، اور دعا کی درخواست کی، ابن عساکر نے لکھا ہو کہ حضرت حسن اس کے اس حال کو دیکھ کر چیخ مار کر رونے لگے اور حجاج کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

قد نھیتک ان تتعرض للصالحین (یافعی وغیرہ ۱۹۵) — میں نے حجاج تجھے منع کیا تھا کہ ایک بندوں کو نہ چھیڑنا

ظاہر ہے کہ حجاج کے پیٹ کا آکلہ (سرطان) ہو یا زمہریرہ (سردی) کی بیماری ہو، یہ تو بجائے خود ایک واقعہ ہے لیکن یہ بات کہ یہ کیفیت حضرت سعید بن جبیرؒ کے قتل اور خون ناحق کی آواز بازگشت تھی، جس کی طرف خواجہ حسن بصریؒ نے اشارہ فرمایا، اس کا آپ کو اختیار ہے کہ مانیے یا نہ مانیے[1] بجنسہٖ یہی کیفیت محمد تغلق کی ہے، اس کا جنون، اور عجیب و غریب جنون جس کی نظیر شاید تاریخ میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد، کہ لاکھوں کی آبادی رکھنے والے معمور شہر کو بہ یک گردش قلم ویران کرتا ہے اور ایسا ویران کہ بقول ملا عبدالقادر بدایونی۔

دہلی چناں خراب شد کہ سگ و گربہ ہم دراں نہ ماند وایں بیت حسب حال آں بود

جائے کہ بوداں دلستاں بادوستاں در بوستاں

شد گرگ و روبہ را مکاں شد گرگ گرگس را وطن

عجیب و غریب جلاوطنی کا یہ واقعہ ضرور پیش آیا، دوآبہ کی رعایا پر سخت قسم کے ٹیکس عاید کرنا

و گاؤشماری[2] و خانہ شماری و رسوم بدعتہائے دیگر نیز پیدا کرد کہ موجب خرابی و ویرانی آں

---

[1] بلا تشبیہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ولادت باسعادت نبوت کبریٰ کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، بحیرۂ ساوہ خشک ہو گیا۔ اب بعض لوگ خواہ مخواہ عقلی حلقوں میں اونچی جگہ حاصل کرنے کے لیے ان واقعات ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ واقعات تو تاریخی ہیں۔ کہتے ہیں کہ طاق کسریٰ کے کھنڈر مدائن میں اب بھی جس حال میں موجود ہیں، اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ زدہ عمارت ہے اور اسی زلزلہ میں اس کے مشہور کنگرے گر گئے تھے، یونہی عرب کا نقشہ اٹھا کر دیکھیے آپ کو حضرموت کی وادی میں ایک خشک دریا ساوہ نامی نقشہ میں نظر آئیگا۔ بہرحال ان واقعات کا انکار کرنے کی تو وجہ نہیں، ہاں! ہم مسلمان لوگ اپنے پیغمبر کی ولادت کے علامات میں ان حوادث کو شمار کرتے ہیں اور جنہیں پیغمبر سے عقیدت نہیں ہے، وہ اس کی توجیہ کسی کونی قانون کے تحت کر سکتے ہیں ۱۲

[2] اعداد و شمار کا خبط جن فاسد اغراض کو سامنے رکھ کر یورپ نے اس زمانہ میں پھیلایا ہے، خدا کی پرانی دنیا جو لامعلوم زمانے سے موت و حیات کی ایک خاص گردش کے ساتھ چل رہی ہے اس کے حوادث پر قابو پانے کا جو ارادہ اس

Marfat.com

ولایت بالکلیہ گردید ضعیفاں نابود شدند، اقویا رجیا و فساد نہادند"

نیز "سکہ" کے مسئلہ میں جو حماقتیں باایں ہمہ عقل و ہوش اس بادشاہ سے سرزد ہوئیں کہ لوگ

"مس بدار الضرب آوردہ سکوک می گردانید ند و امتعہ و اسلحہ ہا خریدہ در اطراف عالم می فرستند ..... و بدیں حیلہ زرہائے بسیار اند و ختند امامردم دار السلطنت (دہلی) بخاک سیاہ برابر شدند" (سیر تاجرین ص ۱۲۵)

قحط کی وہ صورت نمایاں ہوئی کہ

"گندم قیمت آدم پیدا کرد و برنج ہم سنگ طلا گردید. غلہ یکباب چہ نایاب گردید تہی دستاں بگرسنگی مردند و متوسطین ہم جاں بحق تسلیم کردند"

اور اس پر کریلے کو نیم پر دلی میں یوں اور چڑھا دیا گیا کہ

"سلطان بے رحم سپاہ درون دروازہائے شہر (دہلی) بند کرد، تا ہیچ کس از شہریاں بیروں نہ رود، عامہ خلائق بدیں سبب زیادہ از حد شمار بگرداب فنا فرو شدند" ص ۱۳۶

ظالم بادشاہ نے بالا خانہ سے جب اپنی بربریت و وحشت کے اس دردناک نتیجہ کا معائنہ کرلیا، تب اس کی تسلی ہوئی، کہا جاتا ہے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اندھے فقیر کو دلی سے گھسیٹ کر سپاہی دولت آباد کی طرف لے چلے وہ مرگیا، اس کے جسم کا ایک ایک عضو راستہ میں گرتا چلا گیا، تا ایں کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل اس شکل میں ہوئی کہ گھسٹتی ہوئی لاش کا صرف ایک ہاتھ دولت آباد کی سرزمین میں لاکر دفن کیا گیا۔

واقعہ یہ ضرور ہوا، اسی طرح ہوا جیسے ہمالیہ کی راہ سے چین پر چڑھائی کی مہم روانہ کی گئی، جواب تک واپس نہیں ہوئی، خلاصہ یہ ہے کہ جب تک دلی میں رہا۔

"پیوستہ پیش سرا پردۂ سلطانی و درگاہ دیوانی او از کشتہ پشتہ و از مردہ تودہ بود و کناساں و جلاداں از کشیدن و کشتن انبوہ بستوہ آمدہ بودند" (بداؤنی ص ۲۳۸)

کشتوں کے پشتے اور مردوں کے تودے جن جن شکلوں میں ڈھیر کیے جاتے تھے، طباطبائی کا بیان ہو کہ

"بریدن دست و پا و گوش و بینی و میل کشیدن در چشم، و گرفتن استخواں ہائیج کوب و سوختن اندام ذی حیات بآتش و کشیدن پوست بدن، و دو پارہ ساختن آدمی و بسن اندا ختن در پائے فیل و بردار کشیدن"

جس میں کسی کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔

"مردم ہر طائفہ از صوفی و قلندر و لشکری و نویسندہ و عمال و رعیت و تاجر باندک تقصیر و کمتر لغزش سیاست عظیم کردے" (ص ۱۲۴)

واقعہ سب کے سامنے ہوا، لیکن کیوں ہوا، دلّی پر بلکہ ہندوستان پر اچانک یہ آفت کہاں سے ٹوٹ پڑی، لوگوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا؟

یہ جستہ جستہ فقرے ان لوگوں کے لیے میں نے معتبر تاریخوں سے نقل کر دیے ہیں، تا کہ جن لوگوں کی نظر تاریخ پر نہ ہو، یا واقعات مستحضر نہ ہوں، ان کے سامنے تازہ شکل میں وہ نقشہ گھوم جائے، جس کا اندیشہ سلطان المشائخ نے علماء دلّی کی توہین حدیث نبوی کے بعد ظاہر فرمایا تھا، تعجب تو اس پر ہو کہ یہ حیرت انگیز مدہش فقید المثال ساری باتیں کس بادشاہ سے سرزد ہوئیں، جس کے متعلق ارباب تاریخ کا اس پر بھی اتفاق ہو کہ

"در اکثر علوم خصوص تاریخ و معقولات و نظم و انشاء وغیرہم مہارت تمام داشت"

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ

گاہ در نماز و روزہ و ترویج احکام شرع قیام نمودہ در اجتناب ملاہی و مسکرات و سائر مناہی کوشش بلیغ نمودہ بہ تعصب می رسانید" (سیر المتاخرین۔ ص ۱۲۳)

اب آپ کا جی چاہے، جیسا کہ قرآن نے روشن خیالوں کا یہ نظریہ حوادث کائنات کے متعلق نقل کیا ہو کہ

Marfat.com

قَدْ مَسَّ اٰبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ — مصیبتیں اور سرتیں دونوں قسم کے واقعات گذشتہ نسلوں پر بھی گذرتے رہے ہیں (اس لیے ان کے پیچھے کسی اخلاقی قانون کی حکومت کو پوشیدہ سمجھنا حماقت ہے)

کی عام مادی ذہنیت والوں کی تعبیر کی چادر اُڑھا کر جو چیز محسوس کرائی گئی ہے، اُسے اپنے لیے نامحسوس بنا لیجیے یا خوش اعتقادی وغیرہ کے الفاظ کی عصری گالیوں کے برداشت کرنے کی صلاحیت ہو تو آپ بھی تغلقی عجائب وغرائب جلا و بلا قحط و وبا، میں وہی دیکھیے جو آج ہی نہیں، اُسی زمانہ میں جب دلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، میر خورد نے مجلس مناظرہ کے واقعات بالا کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

ازاں بود کہ در چہارم سال ازیں ماجرا تمامی علماء کہ دریں محضر (مجلس مناظرہ) بودند و دیگراں راہم بسبب ایشاں در دیو گیر بلا کردند و بیشترے ازاں علماء در دیو گیر سر نہادند قحطے مہلک و دبلائے سخت در شہر پیدا شد"

میر خورد کے سامنے کی بات ہے، آخر میں لکھتے ہیں:۔

"تا ایں غایت ایں بلاہا بکلی دفع نمی شود سبحان اللہ ہر سخنے کہ بزبان مبارک سلطان المشائخ گذشتہ بود عین آں معائنہ و مشاہدہ شد" ص ۵۳۲

اور اسی پر مجھے تعجب ہے کہ محمد تغلق کی فتنہ سامانیوں کے پیچھے اسی زمانہ میں لوگوں کو علماء دلی کی وہ گستاخیاں نظر آئیں جو اللہ کے ایک دوست اور محبوب کو ذلیل کرنے کے لیے پیغمبر کی حدیث کی تحقیر و توہین پر بھی آمادہ ہو گئے تھے، لیکن اتنا بڑا واقعہ تو بھلا دیا گیا، اور صرف "ہنوز دلی دور است" یا قطب الدین مبارک کے اچانک قتل کا واقعہ لوگوں کو یاد رہ گیا۔

میرا مقصد اس واقعہ کے نقل کرنے سے جہاں ایک عجیب وغریب تاریخی واقعہ کی ایک توجیہ کا تذکرہ ہے، اسی کے ساتھ ان عزیزوں سے بھی التماس ہے جو اپنے چند سرسری سطحی بے سروپا معلومات کو سامنے رکھ کر ایسے نتائج پیدا کر رہے ہیں، جن کا حاصل اس کے سوا اور کیا

نکل سکتا ہے، کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت تھی، دولت تھی، اقبال تھا، جلال تھا، اس وقت تو وہ خود ان کے علما ان کے اولیا، سب اسلام سے دور تھے، لیکن جب سب کچھ جاتا رہا تو غلامی کے اس دور میں اب حقیقی اسلام ان کے سامنے چہرہ پرداز ہوا ہے۔

پچھلے دنوں میں ایسے بعض مضامین شائع ہوئے جن سے دل کو سخت دُکھ پہنچا، اور گو مجھے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن جیسے جیسے موقعہ ملتا جائیگا، اس سلسلہ میں جو اپنے حقیر معلومات ہیں، انہیں پیش کرتا چلا جاؤنگا، شاید غلط فہمیوں کا اس سے کچھ ازالہ ہو، میں نے قصداً اپنے اس مضمون میں خواجگانِ چشت اور ان میں بھی سلطان المشائخ کے حالات کے تذکرہ میں ذرا زیادہ طوالت سے اسی لیے کام لیا کہ ہندی مسلمانوں کی قلبی تربیت، اور اخلاقی نشوونما ایمانی رسوخ، اعتقادی شگفتگی، شرح صدر، کا زیادہ کام اسی خانوادہ سے متعلق رہا، اور ان میں بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء کے خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ ان ہی کے حالات پر دوسرے بزرگوں کے حالات کو بھی قیاس کیا جائیگا، واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی نمائندگی اور اپنے پیغمبر کے دین کی مخلصانہ خدمت، جتنی راستبازی، وفاشعاری، بےنفسی کے ساتھ ان بزرگوں نے انجام دی ہے، بڑی ناشکری ہوگی اگر غیروں کے اغواء سے جس کا اکثر حالات میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا، ان کے خدمات کی اہمیت گھٹائی جائے، اصل حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا جس دن "السرائر" کو "الظواہر" کا رنگ دیا جائے گا۔ لیکن یوں بھی عام مسلمانوں کا "تلقی بالقبول" میرے نزدیک تو ان بزرگوں کی مقبولیت الٰہیہ کی دلیل ہے، آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن اسی زمانہ کے لوگوں کی یہ روایت ہے کہ جب سلطان المشائخ پر وقت ناگزیر آگیا تو ٹھیک جو حال شیخ کبیر شکر گنج کا نماز کے باب میں تھا کہ بار بار پوچھتے، اور دُھرا دُھرا کر ایک ہی نماز کو ادا کرتے، یہی حال سلطان المشائخ پر بھی طاری تھا، نیم بےہوشی کی سی حالت تھی، اسی حالت میں پوچھتے۔

"وقت نماز شدہ است و نماز گذاردہ ام، اگر گفتند کہ شما نماز گذاردہ اید می فرمود بار دیگر بگذارم"

پھر جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں بیان کیا ہے کہ انبار خانہ اور جو کچھ بھی گھر میں تھا، سب کو آپ نے بٹوا دیا، لٹوا دیا، لوگوں نے "مقام مستودع" یعنی قبر کے متعلق دریافت کیا، فرمایا

من زیر عمارت کسے خفتنی نہ ام، من در صحرا خواہم خفت [۱]"

عیادت کے لیے شیخ زکریا ملتانی کے پوتے مولانا رکن الدین آئے، بعض تشفی و تسلی کے کلمات فرما رہے تھے، اور یہ کہ اللہ آپ کو ہم لوگوں میں زیادہ دیر تک سلامت رکھے، "تا ناقصاں را کمالے حاصل شود" اس وقت سلطان المشائخ چشم پرآب کردہ فرمود

"من حضرت رسالت را صلی اللہ علیہ وسلم در خواب دیدہ ام کہ می فرمود نظام! اشتیاق تو ما را بسیار است"

مجلس ان کلمات کے سننے کے ساتھ چیخ اٹھی، مولانا رکن الدین پر بھی گریہ طاری تھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے خدمات کی قیمت آج گھٹائی جا رہی ہے، بلکہ جن پر رسول کے دین کے بگاڑ کا الزام لگایا جا رہا ہے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہ میں اس کا اور اس کے کارناموں کا کیا مقام ہے، رضی اللہ و رسولہ عنہم و رضوا عنہما

خدا جانے اصل مضمون کو میں نے کہاں چھوڑا تھا، غالباً اسی کا ذکر ہو رہا تھا کہ ہمارے قدیم تعلیمی نظام کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دماغوں کی تصقیل و تشحیذ کے بعد میدان عمل میں آنے سے پہلے عموماً قلوب کی تصحیح کا مسئلہ قریب قریب ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اسی سلسلہ میں خواجگانِ چشت اور ان کے قرآنی ذوق کا ذکر آگیا، بات چونکہ عام خیالات کے خلاف تھی، ضرورت ہوئی کہ ذرا تفصیل سے کام لیا جائے سلطان المشائخ کا وجود میرے نزدیک صرف چشتیوں ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے عام صوفیا

---

[۱] میر خورد نے لکھا ہے کہ حضرت والا کو لوگوں نے ایک کھلے میدان میں ہی حسب خواہش دفن کیا تھا، "آنجا کہ روضہ متبرکہ سلطان المشائخ است صحرا بود" لیکن بعد کو اسی محمد تغلق نے قبر شریف پر گنبد عمارت کنا نیدہ (سیر الاولیاء، ص ۱۵۴)

میں ایک مثالی وجود تھا، اور ان کے حالات بھی ایسے ذرائع سے جو ممکنہ حد تک تاریخ میں معتبر ترین ذرائع سمجھے جا سکتے ہیں بآسانی مل سکتے تھے، اس لیے ان کے تذکرہ میں کافی طوالت سے قصداً کام لیا گیا، گویا سمجھنا چاہیے کہ ایک طرح سے سلطان المشائخ کی سوانح عمری ہی درج ہو گئی، اگرچہ اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے، خدا کرے کہ اس کے لکھنے کی مجھے توفیق میسر ہو، واللہ علی مایشاء قدیر۔

اب میں اپنے اصل مضمون کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ نری دماغ کی تصحیح سے علم صحیح کے فوائد و ثمرات نہ خود عالم کو حاصل ہو سکتے ہیں، اور نہ دوسروں کو جیسا کہ چاہیے وہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس خیال کی تائید غالباً سلطان المشائخ کی زندگی کے واقعات سے بھی ہو سکتی ہے، علی الخصوص محضر سماع والی مجلس میں دل کی اصلاح سے غافل ہو کر محض دماغ والے مولویوں نے جو مکروہ نمونے اپنی نفسانیت، دنائت، حسد، انانیت وغیرہ کے پیش کیے، اس سے بھی قلبی تصحیح کی ضرورت آپ خود انصاف کیجیے کہ کتنی اہم ہو جاتی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ قاضی جلال الدین لوانجی جیسا عالم بھی باوجود سب کچھ جاننے کے محض سلطان المشائخ کی شخصی عداوت اور حسد کے نشے میں سرشار ہو کر علانیہ بھرے دربار میں اس قول کی ہمت کرتا ہے کہ

"ایں حدیث متمسک شافعی ست، او دشمن علمائے ماست، مانمی شنویم دنمی دانیم"

اور یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے متعلق مدعی ہوتا ہے کہ میں اس کو نہیں مانونگا، میر خورد کا بیان ہے کہ قاضی جلال الدین نے بادشاہ کے سامنے سلطان المشائخ کو اس کی بھی دھمکی دی، کہ

"اگر سماع بشنوی من حاکم شرع ام ترا بیازارم"

سلطان المشائخ قاضی کی تمام باتوں کو سن کر علم می ورزید و تحمل می کرد، لیکن اس کی اس دھمکی پر زبان مبارک سے صرف "معزول باد" کا فقرہ نکل گیا، کہتے ہیں کہ "بعد از دوازدہ روز معزول شد"

خیر یہ تو الگ بات ہے، میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ علم جب تک دماغ اور تن سے تعلق رکھتا ہے اُس وقت تک آستین کے سانپ سے زیادہ اس کی وقعت نہیں اس کی کیتنی اچھی مثال ہے۔

اسی کے مقابلہ میں اسی دلی کے دوسرے قاضی محیی الدین کاشانی کو دیکھیے۔ شیخ محدث وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ التمش کے عہد کے مشہور قاضی شہر قاضی قطب الدین کے نواسے تھے، اور مدتوں خود بھی درس وتدریس کا کام اُنہوں نے شہر میں انجام دیا تھا، اسی وجہ سے "استاد شہر بود" لیکن دماغ کے ساتھ ان کو اپنے قلب کی اصلاح کا موقع بھی سلطان المشائخ کی صحبت میں مل گیا تھا، ان کی استعداد و صلاح مزاج کو دیکھ کر سلطان المشائخ نے ان کی خاص تربیت کی تھی، جس خاص خدمت کے لیے ان کا انتخاب سلطان المشائخ نے کیا تھا، اس کا اندازہ خلافت نامہ کے اس فقرہ سے ہو سکتا ہے جو سلطان المشائخ نے ان کو لکھ کر دیا تھا، آخری فقرہ یہ تھا۔

فان فعلت ما امرتك فظني بك ان تفعل كذلك فانت خليفتي وان لم تفعل فالله خليفتي على المسلمين۔	پس اگر تم نے وہی کیا جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے تو میرا گمان تمہارے ساتھ یہی ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے اور اس صورت میں تم میرے خلیفہ اور جانشین بن سکتے ہو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر مسلمانوں کی نگرانی کے لیے میرے خلیفہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

مجھے یہی دکھانا ہے کہ یہ سارا قصہ بھی "المسلمین" کے لیے تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کی حفاظت وصیانت کے لیے تھا، قاضی کاشانی میں باوجود خاندانی قاضی ہونے اور مولوی ہونے کے چند ہی دنوں میں سلطان المشائخ کی صحبت میں وہ ایمانی قوت

لہ مخدوم الملک شاہ شرف الدین منیری بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جس وقت ہو رہی تھی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ زبان مبارک پر اللھم اغفر امۃ محمد اللھم ارحم امۃ محمد اصلح امۃ محمد کی...... امت کو بخش دے اے اللہ محمد کی اُمت پر رحم فرما، جاری تھا، ایک سو بیس سال کی عمر کس تڑپ اور درد وسوز میں اللہ کے اس فقیر کی گذری تھی اس کا اندازہ سکرات کے ان آخری الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے ۱۲

پیدا ہوئی کہ

"مثال ادرار کہ مایۂ دانشمنداں ست بخدمت سلطان المشائخ آورد و پارہ کرد"
ذیقعہ وظائف شاہی"

اسی چیز نے سلطان المشائخ کی نگاہ میں ان کی بڑی قدر پیدا کر دی تھی لکھا ہے کہ سر دقہ ہو کر بجز قاضی کاشانی کے سلطان المشائخ اپنے مریدوں میں اور کسی کو تعظیم نہیں دیتے تھے۔ لیکن یہی رتبہ کی بلندی بیچارے کے لیے ایک دفعہ مصیبت بن گئی، شاہی وظائف سے دست برداری کے بعد ظاہر ہے کہ امارت اور اُس کا سارا ساز و سامان ٹھاٹھ باٹھ باقی نہیں رہا تھا، فقر و عسرت میں بسر ہوتی تھی، علاء الدین خلجی کو اس کی خبر ہوئی اُس نے فرمان صادر کیا کہ

"فضلائے اودھ کہ موروث قاضی محیی الدین ست با انعامات قریات بسیار بدو مفوض داند"

شاہی فرمان قاضی صاحب کے پاس آیا، بس غلطی یہ ہوگئی کہ اُسی وقت واپس کر دینے کی جگہ، وہ اس فرمان کو لے کر سلطان المشائخ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"سلطان بغیر خواستِ من ایں چنیں فرمانے دادہ ست تا فرمان مخدوم چہ شود"

جس کے سپرد "المسلمین" کی خدمت ہوئی تھی، اپنے اسی خلیفہ کی زبان سے ان الفاظ کا سننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ و فرمود

"ابتہ شغل بایں معنی در خاطر تو گذشتہ باشد آنگاہ ایں معنی برائے تو پیش آوردہ اند"

اس فقرہ کا مطلب اس زمانہ میں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیگا، لیکن کسی زمانہ میں قلوب کی صفائی اس درجہ کو پہنچ جاتی تھی کہ خیال ادھر دل میں آیا، اور دوسروں پر اس کا عکس پڑتا تھا، اسی مسئلہ کی طرف سلطان المشائخ نے اشارہ فرمایا، اتنے برہم ہوئے کہ اُسی وقت حکم دیا کہ "خلافت نامہ" واپس کر جاؤ، یعنی جب تم سے وہ کام سر انجام نہیں ہو سکتا، اور وہی شاہی ملازمت کے شغل میں اُلجھنا چاہتے ہو، تو پھر تم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کے لیے المسلمین پر تمہیں نائب بنایا گیا ہے۔

سلطان المشائخ کی یہ خفگی کہتے ہیں کہ سال بھر تک قائم رہی، قاضی بیچارے حیران تھے کہ کیا کروں سال بھر کے بعد پھر ان کو جدید معاہدہ کا موقع دیا گیا۔ افسوس ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ ورنہ جو عہد کیا تھا شاید ان کے بعد وہ مسلمانوں کی خدمت کرتے۔

یہ تھا اس زمانہ میں ان لوگوں کی تربیت کا طریقہ جو اپنی زندگی قومی خدمات کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ آج بھی لوگ "المسلمین" کا نام لے کر اُٹھتے ہیں، لیکن اس جلیل خدمت کے لیے دل سے کن کن چیزوں کے نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان بیچاروں کو اس کا موقعہ نہیں ملتا، پھر بجز چند اخباری بیانوں، مجلسی تجویزوں کے عام طور پر جو شکایت ہے کہ قومی لیڈروں سے اور کچھ بن نہیں آتا، تو آپ گولر کے درختوں سے انجیر توڑنے کا خیال کیوں پکاتے ہیں، صورت اور نام کی شباہت سے حقیقت نہیں بدلتی، دماغی علم اتنے بڑے اہم کام کے لیے جو دراصل سچ پوچھیے تو پیغمبروں کی نیابت ہے، یقین کیجیے قطعاً کافی نہیں ہو سکتا اس راہ میں ذروں کو آفتاب سے اور رائی کو پربت سے کاہ کو کوہ سے ٹکرانا پڑتا ہے۔

مولانا فخرالدین زرادی اور اُن کے علم و فضل کا ذکر مختلف طریقے سے ہو چکا ہے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ منجملہ اور مالیخولیاؤں کے محمد تغلق پر اس کا جنون سوار ہوا کہ ہندوستان سے باہر نکل کر براہ راست تاتاریوں کے ملک میں پہنچ کر ان کا قلع قمع کر دے، اس کے لیے اس نے "جہاد" کی مہم کا اعلان کیا، عظیم الشان بارگاہ نصب ہوئی، اس میں منبر رکھا گیا، مقصد یہ تھا کہ اسی منبر سے بادشاہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیگا، لیکن دعوت سے پیشتر اُس نے چند علماء سے مشورہ ضروری سمجھا، جن میں ایک مولانا فخرالدین زرادی بھی تھے۔

مولانا کی حاضری کا حکم ہوا، قطب الدین دبیر جو سلطان المشائخ کے مریدوں میں تھے اور محمد تغلق کے دبیر (سکریٹری) تھے۔ یہی مولانا فخرالدین کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے جوتے اتار کر فرش پر جب قدم رکھا تو قطب الدین دبیر نے اُن کی جوتیاں اُٹھا لیں اور

Marfat.com

بغل میں دبا کر پیچھے پیچھے چلے تغلق قطب الدین کی ان تمام حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے، کس بادشاہ کے سامنے؟ "محمد تغلق خونی" کے سامنے، بادشاہ مولانا سے خطاب کرکے پوچھتا ہے۔

"می خواہم کہ کال چنگیز را براندازیم، شما دریں کارباما موافقت خواہید کرد"

مولانا نے جواب میں فرمایا "ان شاء اللہ تعالیٰ"

دیوانے تغلق کی اس سے کیا تشفی ہو سکتی تھی بولا کہ "ایں کلمہ شک است"

سننے کی بات ہے، سامنے تغلق ہے، تغلق کے جلاد ہیں، اس کی کھنچی ہوئی تلوار ہے، بغیر کسی جھجک کے جواب میں مولانا نے فرمایا "در مستقبل ہمی آید"

مطلب یہ تھا کہ یہی ہو کر رہیگا، یعنی خود تمہارا عزم شکوک اور شبہ ہو کر ختم ہو جائیگا، تغلق کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، خون کھولنے لگا، لیکن کسی معمولی کردار کا سامنا نہ تھا، بات بدل دی اور بولا کہ شما مارا نصیحت کنید"

نصیحت کی درخواست تغلق کر رہا ہے، خدا جانے کتنے نصیحت کرنے والوں کو جو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے کشتوں کے پشتوں سے بھرے ہوئے دربار کا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا لیکن مولانا اسی سنجیدگی اور وقار سے تغلق کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

"غضب فرو خورید"

پوچھتا ہے، کدام غضب؟ مولانا فرماتے ہیں "غضب سبعی"

یعنی درندوں جیسا غصہ تم نے اپنے اندر پیدا کر لیا ہے کہ کسی کی ادنیٰ مخالفت برداشت نہیں کر سکتے، اس غصہ کو پی جاؤ۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس جواب کے بعد مولانا کے سامنے اپنا جو انجام ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے، شاہی دربار کی طرف جس وقت قطب الدین دبیران کو لے چلے تھے، اسی وقت یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے۔

Marfat.com

"من سر خویش بر درسرائے ایں مرد (تغلق) غلطیدہ می بینم باو مسامحت نخواہم کرد او زندہ نخواہد گذاشت"

سیکڑوں کا انجام ان کے سامنے تھا، اسی پر قیاس کر رہے تھے، کچھ ہی دن پہلے اسی حق گوئی کے الزام میں مولانا عماد غوری کا سر اسی محمد تغلق کی تلوار سے اُڑ چکا تھا، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں محمد تغلق پر جدید دین کی تجویز کا خبط سوار تھا مولانا عماد غوری کو بلا کر اس نے پوچھا۔

"فیض خدا منقطع نیست چرا باید کہ فیض نبوت منقطع شود[۱]"

شیخ محدث نے لکھا ہے کہ "مولانا عماد بر فور گفت کہ گہ مخور چہ می گوئی" آخر جہنم میں گہ خوری کے لیے اُس نے حکم دیا کہ "اور از بع کنید وزبانش برآرند" ص ۲۰۱

اور ایسے واقعات تو ہر دن بلکہ دن کے اکثر گھنٹوں میں پیش آتے رہتے تھے، البتہ زیادہ تر اس کے ستم کے تختۂ مشق بیچارے وہی لوگ تھے جو اُس کے دربار کے ملازم تھے معمولی قصور پر قتل کی سزا پاتے تھے، مولانا عماد رحمۃ اللہ علیہ ان عاشقانِ پاک طینت میں ہیں جنہوں نے اپنے وقت میں اللہ اور اس کے رسول کے عشق میں "بخاک وخوں غلطیدن" کی رسم کو زندہ کیا تھا، رضی اللہ عنہ۔

بہر حال مولانا زرادی بھی اسی رسم کی تازگی پر کمر ہمت چست کیے بیٹھے تھے، لیکن خدا ہی جانتا ہے کیا صورت پیش آئی کہ تغلق مولانا کی زبان سے ایسی سخت بات سننے کے بعد بھی خاموش ہی رہا، بلکہ بجائے اس کے خاصہ طلب کیا، اور مولانا کو اپنے ساتھ بٹھا کر

"دریک صحنک بطعام خوردن مشغول شدند"

---

[۱] یہی فقرہ ہے جو ہندستان کی جدید نبوت اور جدید وحی کے مدعی قادیانی مرزا کو ہاتھ لگا، اسی تغلقی فقرہ پر ان کے تنبی کی دیوار قائم ہے، کانمذا ور ربابی کی کمی قادیان میں تو کبھی محسوس نہیں ہوئی لیکن تحلیل وتجزیہ کے بعد سارے ہفوات کا خلاصہ اسی ایک فقرہ میں مندرج ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ صدیوں کے بعد پھر اسی تغلقی بالخولیا نے قادیان میں زور باندھا ۱۲

مولانا کھانے میں شریک تو ہو گئے، لیکن چہرہ کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر سخت بار ہے تغلق کو بھی ان کے اس بار کا احساس ہو رہا تھا، لیکن خلاف معمول وہ اور نرم پڑتا جاتا تھا حتیٰ کہ مولانا کی دل دہی کے لیے۔

"گوشت از استخواں جدا می کرد و پیش مولانا فخر الدین می نہاد"

مگر مولانا پر وہی ناراضگی کی علامت برابر باقی تھی" بکراہ تمام اندک اندک تناول می کرد" خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا، اور مولانا کو رخصت کرتے ہوئے تغلق نے حکم دیا کہ روپیہ کی ایک تھیلی اور اونی کپڑے کا ایک تھان ہدیہ میں پیش کیا جائے۔ اس کی نیت فاسد تھی، ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس ہدیہ کو اگر مولوی نے واپس کیا، بس رد ہدیہ کو خلاف سنت قرار دے کر گردن اڑا دو نگا، اس وقت سلطان المشائخ کے صحبت یافتہ قطب الدین دبیر جان پر کھیل گئے اور قبل اس کے کہ مولانا کی طرف ہدیہ بڑھایا جائے، دبیر نے ان کی طرف سے خود لے لیا، دبیر کو یقین تھا کہ مولانا واپس کرینگے اور دیوانہ اسی کو کاربراری کا ذریعہ بنائیگا، خدا خدا کر کے مولانا کو تغلق کے دربار سے نجات ملی اور بخیر و خوبی گھر واپس ہوئے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ مولانا کے چلے جانے کے بعد قطب الدین دبیر پر تغلق کا سارا نزلہ رجوع ہو گیا، چلا چلا کر ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"اے مرد و شکال ایں چہ حرکتی بود کہ کردی اول کفشہائے فخر الدین را زیر بغل گرفتی بعدہ جامہ و سیم او خود پسندی، و او را از تیغ من خلاص دہانیدی و بلائے او بر خود گرفتی"

لیکن دبیر نے جو کچھ کیا تھا، طے کر کے کیا تھا، بادشاہ کے ان غضبناک بلکہ پیام موت کے فقروں پر آزادی کے ساتھ انہوں نے بھی جواب دیا۔

"تو استاد من است و خلیفہ مخدوم من مرا شاید کہ کفشہائے او تعظیم بر سر گیرم نہ کیف کہ زیر بغلے و جامہ و سیم را خود چہ اعتبار است"

تغلق ان کی صاف گوئی سے متاثر ہوا، چلے تو بولا

"ایں اعتقادہائے کفر آمیز را بگذار و الا تر اہم خواہم گشت"

گویا اُستاد اور پیر کی عظمت اس کے نزدیک "اعتقادہائے کفر آمیز"[1] تھی مگر "خواہم گشت" کی دھمکی دھمکی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ اسی قسم کا ایک واقعہ تغلق ہی کے ساتھ سلطان المشائخ کے ایک اور تربیت یافتہ بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور کا بھی ہے، یہ شیخ کبیر شکر گنج کے مشہور خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے پوتے ہیں، ہانسی ہی میں ان کا قیام رہتا تھا، محمد تغلق برسبیل دورہ ہانسی پہنچتا ہے، اطراف کے لوگ اُس سے ملنے آتے ہیں، لیکن شیخ قطب الدین منور اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ہیں، محمد تغلق کو اس کی خبر ملتی ہے، حاضری کا فرمان صادر کرتا ہے اور حسن برہنہ نامی امیر کو حکم دیتا ہے کہ فوراً شیخ کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کیا جائے۔ حسن برہنہ ہانسی پہنچتا ہے، شیخ کو بادشاہ کا حکم سُناتا ہے، شیخ پوچھتے ہیں، جبراً لانے کا حکم ہے یا میری مرضی کو بھی دخل ہے اُس نے کہا کہ جبراً جس طرح ممکن ہو لاؤ اسی کا حکم ہے۔ شیخ بیوی کے پاس جاتے ہیں، خدا کے حوالہ ان کو اور بال بچوں کو کرتے ہیں۔ "مصلی بر کتف، عصا در دست گرفتہ پیادہ پا رواں شد"

حسن گھوڑا پیش کرتا ہے، انکار کیا گیا، ہانسی سے باہر نکلتے ہوئے اپنے آبا و اجداد کے مقبرے کے سامنے سے گذرتے ہیں، فرماتے ہیں

"من از کنج شما باختیار خود بیروں نہ آمدہ ام مارا می برند"

شاہی بارگاہ بانسی نامی قریہ میں تھی، جو ہانسی کے قریب ہے لیکن بادشاہ بجائے ملاقات کرنے کے حکم دیتا ہے کہ شاہی کیمپ کے ساتھ ان کو دلی لے چلو، اب ساتھ ساتھ منزل بمنزل دلی پہنچتے ہیں، دلی میں ان کے صاحبزادے میاں نور الدین بھی آجاتے ہیں، تغلق شیخ کی حاضری کا حکم دیتا ہے، شیخ نور الدین صاحبزادے بھی ساتھ ساتھ جاتے ہیں، شاہی محل سرا میں

---

[1] کاش! اس زمانہ میں تغلق نہ ہوا، بہت پہلے پیدا ہو گیا، ورنہ قادیاں کے سوا، ہندوستان کے اور بہت سے دائروں میں اس کی پوجا ہوتی۔ گویا جن باتوں کو آج ہم سُن رہے ہیں، ان سب کا بانی اوّل وہی تھا۔

Marfat.com

دونوں باپ بیٹے داخل ہوتے ہیں، ہر طرف ننگی تلواریں لیے سنتری ٹہل رہے ہیں، در و دیوار سے دہشت وخوف کی بارش ہو رہی ہے، شیخ قطب الدین مطمئن آگے بڑھے چلے جاتے ہیں، لیکن کمسن نوجوان شیخ نورالدین کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے، بیٹے کو پلٹ کر شیخ اس حال میں پاتے ہیں، فرماتے ہیں۔

بابا نورالدین العظمۃ والکبریاء للہ" (یعنی بابا نورالدین بڑائی اور عظمت صرف اللہ ہی کے ہے"

یہ وہ نشہ تھا، توحید کا جو سلطان المشائخ کی مجلس میں پلایا جاتا تھا، نورالدین سنبھل جاتے ہیں، تخت سامنے نظر آتا ہے۔

ہاتھ میں تیر و کمان ہے، بادشاہ کا غصہ سے چہرہ بگڑا ہوا ہے، آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں، شیخ السلام علیکم کہتے ہیں۔ مصافحہ کے لیے بادشاہ ہاتھ بڑھاتا ہے، شیخ ہاتھ ملاتے ہیں، ہاتھ کا ملانا تھا کہ تغلق کا رنگ فق پڑ جاتا ہے، خدا جانے کیا کچھ کہنے کے لیے تیار بیٹھا تھا، لیکن اب زبان سے جو الفاظ اس کے نکلتے ہیں وہ یہ ہیں۔

"من در دیار شما رسیدیم تربیت نفرمودند و بملاقات خویش مشرف نگردانیدند"

شیخ اسی توحیدی سکینت و وقار کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

"ایں درویش خود را دریں محل نمی دارد کہ ملاقات بادشاہاں کند، در گوشہ بدعا گوئی بادشاہ وکافۂ اہل اسلام مشغول می باشد، معذور می باید داشت"

تغلق چپ ہو جاتا ہے، اور فیروز باربک جو بعد کو فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہوئے ان کو حکم دیتا ہے " از مطلوب شیخ ست ہمچناں کنید"

شیخ پھر فرماتے ہیں: "مقصود من نقد مطلوب من کنج جلد پدر ست"

محمد تغلق یہ سن کر ان کو رخصت کر دیتا ہے، میر خورد نے تغلق کے ایک نامی امیر اعظم ملک کبیر معظم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ شیخ کی روانگی کے بعد محمد تغلق نے اہل دربار کو خاطب کر کے کہا کہ جس کسی نے مجھ سے آج تک مصافحہ کیا،

Marfat.com

"البتہ دست او لرزید مگر ایں بزرگ کہ بقوت دین دست ما محکم گرفتہ بود .... از سیمائے او مہابت دین احساس کردم"

لیکن دین کی یہ مہابت اور ہاتھ میں یہ قوت کہ محمد تغلق جیسا جابر بھی، ان کی نگاہوں میں پرپشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، یہ کہاں سے پیدا ہوا تھا؟ آگے قصہ سُنیے تغلق نے فیروز شاہ، اور مولانا ضیاء الدین برنی کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ان کو مطلع کرو

"بادشاہ یک لک تنکہ انعام فرمود"

خبر شیخ کو پہنچتی ہے۔ بے ساختہ زبانِ مبارک سے "نعوذ باللہ ایں درویش یک لک تنکہ قبول کند" ٹکا سا جواب دے دیا جاتا ہے، دونوں بادشاہ کی خدمت میں شیخ کے انکار کی خبر پہنچاتے ہیں۔

"فرمان شد کہ پنجاہ ہزار بدہید"

مگر شیخ کو انکار ہی پر اصرار رہا، آخر میں تغلق عاجزی کے ساتھ کہلا بھیجتا ہے۔

"اگر شیخ ایں مقدار قبول نہ کند خلق مرا چہ گوید"

بالآخر بڑے رد و کد کے بعد دو ہزار پر بات طے ہوئی، شیخ اس رقم کے لینے پر راضی ہوگئے اور اس لیے راضی ہوگئے .... کہ فیروز شاہ اور برنی دونوں نے عرض کیا کہ "ما کم ازیں نتوانیم پیش تخت ذکر کردن کہ شیخ ایں ہم قبول نمی کند"

شیخ قطب الدین نے دونوں کو جواب دیا:

"سبحان اللہ درویش را دو سیر کھچڑی و دانگے سیر روغن کفاف باشد، ہزار ہا چہ کند"

یہی چیز تھی جو سلطان المشائخ دین کے خادموں کے قلوب میں پیدا کرتے تھے۔ جس دل سے ہزار ہا کا وزن نکل گیا۔ اگر "تغلق" کا وزن پشکِ شتر سے بھی کم اسے محسوس ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ روپے والوں کا بوجھ تو وہی اپنے اندر پاتے ہیں جن کے دل پر روپیہ کا وزن ہو، جب روپیہ ہی کا وزن نہ رہا صرف دو سیر کھچڑی اور دانگے سیر روغن زرد زندگی گذارنے کے لیے جنہیں بس کرتا ہو وہ بھلا کسی کے بس میں آسکتے ہیں؟

Marfat.com

سبک روح تجرد بھی کہیں پابند ہوتے ہیں — شمیم گل کے نقاشو! ذرا تصویر تو کھینچو

اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ — یہ شیطان ہی جو اپنے دوستوں کو دہلاتا رہتا ہی

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ — پس نہ ڈرو ان سے اور مجھ ہی سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

کے قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل ہی، بلکہ اس کا زندہ اور کھلا ہوا تجربہ ہی کہ "الشیطان" کی ولایت سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کی ولایت ہی کو جو اپنی پناہ گاہ بنا لیتے ہیں، ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی دھمکی نہیں دے سکتی "محمد تغلق" کی عناں گسیختہ طغیانیاں بھی جس دل کو ہلا نہیں سکیں، خود اندازہ کرنا چاہیے کہ ایمان قوت کے جن لامحدود خزانوں سے قلوب کو بھر دیتا ہی اس قوت کو جانچنے کے لیے اس سے بھی بہتر کسوٹی کیا اور مل سکتی ہی، جس کے کام ہی سے نہیں صرف نام کے سننے سے بھی روح لرز جاتی ہی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ولایت الٰہیہ کے وارثوں کا صرف مصافحہ بلکہ صرف "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" کی ایک جھلک اسی کو کپکپا دیتی ہی، شیخ قطب الدین منور کے صاحبزادے شیخ نورالدین کا بیان ہی، میر خورد نے غالباً براہ راست ان کی زبان سے سنا ہی کہ بارگاہ شاہی کے سرادق جلال سے مرعوب ہو کر جب ان کے پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی، اور شیخ منور نے ان کو "الکبریاء للہ" کی ڈانٹ سے چونکایا تو فرماتے ہیں

بمجرد آں کہ ایں سخن "العظمۃ والکبریاء للہ" بسمع من رسید تقویتے و باطن من ظاہر گشت و اطمینانے و استظہارے حاصل شد

کیسا اطمینان کیسی پشت پناہی جس کا احساس ان کے نوجوان قلب نے محسوس کیا؛ خود کہتے ہیں: چنانکہ آں ہیبت و رعب از دل من کلی زائل شد"

تغلق کے دربار میں ذرہ و بکتر آہن پوش تیغ بکمر گرز بدوش امراء و ملوک پرا باندھے جو لوگ کھڑے تھے، غالباً شیخ نورالدین اسی نظارۂ ہوش ربا سے متاثر تھے لیکن فرماتے

Marfat.com

ہیں کہ احساس کی تبدیلی کے ساتھ ہی "آن امراء و ملوک در نظر من ہمچو گوسپنداں نمودند"

یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں ہے، ذاتی تجربہ ہے۔ اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ ہے، پہلی دفعہ نہیں بلکہ جب کبھی "ایک ہی کا خوف دل میں قائم ہوا ہے تو ہر ایک کا ڈر یوں ہی نکل بھاگا ہے" آدم اور آدم کی اولاد ڈرنے ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے اس کی سرشت کی افتاد، اور فطرت کی ساخت یہی ہے مجانین یا پاگلوں کے سوا، آدمی کی عقل جب تک سلامتی اور صحت کی حالت میں رہتی ہے ڈرنے کا مشورہ دیتی رہیگی لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ "ایک" سے اگر آپ نہیں ڈرینگے، جس سے ڈرنے کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا ہے، تو عقل مجبور ہے کہ "ہر ایک" سے ڈرنے کا آپ کو مشورہ دے، لیکن بجائے "ہر ایک" کے اگر "ایک" ہی کی خشیت اور ڈر میں آپ کا دل ڈوب گیا، اسی کی عظمت اور کبریاء کے استحضار و شعور میں غرق ہو گیا، تو اُس وقت وہی عقل ایمان کی روشنی میں "ہر ایک" سے بے پروا ہونے پر اصرار کرتی ہے۔

میرے نزدیک صحیح حریت اور آزادی یہی ہے، باقی جو لوگ نہ ایک سے ڈرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ہر ایک سے بھی نہیں ڈرتے، کم از کم میری سمجھ سے یہ باہر ہے کہ اپنے عقلی احساسات کے کچلے بغیر اس دعوے کی ہمت ان میں کیسے پیدا ہوتی ہے، جو بے زور ہے، اس کو زور والوں سے قطعاً ڈرنا چاہیے جو نہتا ہے اُس کو ان لوگوں سے دبنا چاہیے جن کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں، بندوقیں ہیں، اُس وقت تک ڈرنا چاہیے، دبنا چاہیے، جب تک کہ کسی زیادہ زور آور کی ولایت و حمایت کا اُسے یقین نہ حاصل ہو جائے۔ زندگی میں بھی۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل   اللہ ہمیں بس ہے بڑا اچھا وکیل

کی نہ ہلنے والی چٹان پر اپنے آپ کو جو کھڑا پاتا ہو، اور موت یا قتل کے متعلق بھی۔

ولئن متم او قتلتم لالی اللہ تحشرون   اور اگر تم مرے بھی یا قتل ہوئے تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤگے۔

کی نہ بجھنے والی روشنی اس کے سامنے جگمگا رہی ہو، لیکن اس کے بغیر جن کمزوروں کی زبان سے

Marfat.com

"ہم کسی سے نہیں ڈرتے" دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی" کے الفاظ نکلتے رہتے ہیں، یقین کیجیے کہ یا ان کی عقل جنون کی آفت سے ماؤف ہو۔ یا جو کچھ وہ بولتے ہیں، صرف بولنے کے لیے بولتے ہیں، وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے صرف کہنا چاہتے ہیں، یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے دماغی تصحیح کے ساتھ قلبی اصلاح کا جو ایک مرکب نظام اس ملک میں قائم کیا تھا، اس کے حیرت انگیز نتائج و آثار ہندی اسلام کی پہلی صدیوں ہی تک محدود رہے اس میں شک نہیں کہ نتائج کی آب و تاب، ان کی تازگی اور رونق میں دن بدن انحطاط پیدا ہوتا رہا، ان چھ صدیوں میں اُتار چڑھاؤ کے بیسیوں حوادث سے اسے گذرنا پڑا لیکن یقین کیجیے کہ اس وقت تک جب تک کہ ہماری زندگی کی واپسیں سانس اس ملک میں پوری ہوئی، حکومت کے چراغ کی آخری ٹمٹمانے والی لو جب تک نہ بجھی تھی، اور بزرگوں سے تعلیم و تربیت کا جو نظام وراثت میں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا تھا جب تک کہ آخری ہو ہی کا وہ شکار نہ ہوا تھا، اس وقت تک اِن انقلابی ہستیوں کے سوا جو اس ملک کی دینی و علمی تاریخ میں "مقام خاص" کے مالک ہیں، یوں بھی ملک کا کوئی گوشہ ان رسیدہ پھلوں سے خالی نہ تھا جس کا پھلنا تعلیم و تربیت کے اس "شجرۂ طیبہ" میں تقریباً لازمی تھا، جسے صدیوں کے مسلسل تجربات کے بعد ہمارے بزرگوں نے یہاں نصب فرمایا تھا، ضخیم تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، اگر کتابوں سے ان کے بکھرے ہوئے حالات ایک جگہ جمع کیے جائیں۔

سمجھانے کے لیے میں نے آپ کے سامنے تقریباً ہندی اسلام کی پہلی صدیوں کے چند نمونے اب تک پیش کیے ہیں، اب تک میری گفتگو کا دائرہ زیادہ تر ان ہی بزرگوں کی حد تک محدود رہا ہے جن کا تعلق ساتویں اور آٹھویں صدی کے آغاز سے ہے، اب میں آپ کے سامنے چند مثالیں گیارہویں بلکہ بارہویں صدی ہجری کی مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مختصر کتاب "مآثر الکرام" سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں، جس کا کسی صوبہ، یا ضلع، یا تعلقہ کے باشندوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر وہ کے قصبہ "بلگرام" ہی کے لوگوں سے تعلق ہے، ایک قصبہ

Marfat.com

کی پیداواروں کا جب یہ حال تھا، تو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ سارا ملک کس رنگ میں رنگین ہوگا، اس میں شک نہیں کہ بلگرام کا شمار ہمیشہ سے ہندوستان کے ایک مردم خیز قصبوں میں ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کو علم یا دین کی کوئی خاص مرکزیت حاصل تھی خود مولانا آزاد بھی باوجود وطن دوست ہونے کے یہ مانتے ہیں کہ خود اودھ ہی میں بلگرام جیسے بیسیوں قصبات تھے، ابوالفضل نے تو بلگرام کے ذکر میں لکھا ہے۔

"قصبہ ایست خوش ہوا، بیشتر مردم آں خوش فہم و سرود سرا"

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خوش فہمی کے ساتھ جہاں سرود سرائی کا بھی لوگوں کو عارضہ ہو، وہاں خوش فہمی سے صحیح استعمال کہاں تک لیا جا سکتا ہے، گو اسی کے ساتھ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"در آنجا چاہے ست کہ ہر کہ چہل روز آب از و آشامد شناسائی و حسن منظر فزاید"

شناسائی کا واللہ اعلم کیا مطلب ہے، دقت نظری یا معرفت کچھ بھی ہو، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو خوش اعتقادی کے زمانہ کی باتیں ہیں، خوش اعتقادی کا ایسا زمانہ کہ ابوالفضل جیسے بداعتقاد آدمی کو بھی اس کے تذکرہ میں ندامت محسوس نہیں ہوئی، لیکن بداعتقادی کے اس عام دور میں اب کنوؤں کے پانی سے حصول شناسائی کی کون توقع کر سکتا ہے۔

بہر حال میری غرض یہ ہے کہ ان مثالوں کو مثالوں ہی کی حیثیت سے پڑھنا چاہیے، یہ خیال غلط ہوگا کہ یہ بلگرام کی خاص خصوصیت تھی، بلکہ اس زمانہ کے ماحول کی یہ عام پیداواریں تھیں، جن میں بلگرام نے بھی اپنا حصہ پایا تھا،

میں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستانی تصوف خصوصاً طریقہ چشتیہ کی خاص خصوصیت "سلوک بالقرآن" تھی، گو میرا یہ دعویٰ عجیب تھا، لیکن بحمد اللہ جو شواہد اور وثائق آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد بھی لوگوں کا تعجب باقی رہا ہوگا، لیکن وہ مثالیں تو ساتویں اور آٹھویں صدی کی تھیں، اب آئیے گیارہویں یا بارہویں صدی میں آکر، دیکھیے کہ ہندوستانی

مسلمان اس وقت تک بھی قرآن کو کس طریقہ سے استعمال کر رہے تھے۔

مولانا آزاد نے سید نور اللہ نامی ایک صاحب کا ذکر کیا ہے، مولانا ان کے دیکھنے والوں میں ہیں اس لئے جو کچھ سُنایا جائیگا، شنیدہ نہیں، بلکہ زیادہ تر دیدہ ہی ہوگا،

ان ہی سید نور اللہ صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ دماغی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قلبی تصیح کی فکر میں گھر سے باہر نکلے دلی پہنچے کسی پر نظر جمی نہیں، سیدھے سلطان المشائخ کے جوار میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے، کچھ دن کے بعد یہاں سے پھر بلگرام ہی واپس گئے بلگرام میں اس وقت دوائے دل کا کام سید لطف اللہ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھا، مولانا آزاد بھی خود ان ہی کے دست گرفتہ ہیں، عوام سید صاحب کو میر لدھا یا پیر لدّھا کے نام سے پکارتے تھے، اور مولانا آزاد اپنی کتاب میں ہر جگہ ان کو سید العارفین کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں۔ سید نور اللہ سید العارفین میر لدّھا صاحب کے برادر صغیر تھے، ان ہی سے آکر بعیت حاصل کی اور ان ہی کی صحبت میں اپنے علم میں عمل کے رنگ بھرنے کی مشق بہم پہنچانے میں مشغول ہوئے۔ استعداد بالغ تھی رنگ بہت جلد نکھرنے لگا، مولانا ہی فرماتے ہیں "حالتے عجب بہم رسانید" یہ حالت عجیب کیا تھی! "شبہا چشم کم برہم می زد"

لیکن رات کی ان تاریکیوں میں کیا ستارے گنتے تھے، دوربین لگا لگا کر آسمانی فضاؤں میں دب اصغر اور دب اکبر کی جستجو کرتے تھے، مولانا فرماتے ہیں۔

"اکثر اوقات می گریست در رکوع گاہے و گاہے در سجود شب را صبح کردے"

استغراق کا یہ عالم تھا کہ

"احیاناً بعض اوقات بحالت ربود اکہ تا یازدہ روز بیشتر اکل و شرب نمی پرداخت"

مگر باوجود اس استغراق کے جوان کا ایک خاص حال تھا، بیداری کی یہ کیفیت تھی کہ سید العارفین کی مجلس میں ایک رند قلندر بیٹھا تھا، کہیں سے مزامیر (باجوں) کی آواز آئی، قلندر نے میر صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہا،

Marfat.com

"جائے کہ مزامیر ست رواں باید شد"

سید نور اللہ جو عموماً خاموش رہتے تھے وہ بھی سامنے بیٹھے تھے، مہر سکوت ان کی ٹوٹتی ہے، قلندر سے پوچھتے ہیں: "در انجا چیست؟"

قلندر نے قلندرانہ جواب یہ دیا۔ گفت "اللہ ست"

یعنی "جہاں باجا ہے وہاں خدا ہے" اس فقرہ کا سننا تھا کہ سید نور اللہ میں حمایت شریعت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے، کھڑے ہو جاتے ہیں، قلندر کا ہاتھ پکڑتے ہیں، اور گرجتی ہوئی آواز میں "برخر اسد ابنا"

صرف دعویٰ نہیں دلیل کا سوال تھا، قلندر کی ساری قلندریت غائب ہو گئی، کھسیانی صورت بنا کر ان کا منہ دیکھنے لگا، سید صاحب پر جلال طاری تھا، آخر سید العارفین نے اُٹھ کر قلندر کو ان کے ہاتھ سے نجات دی،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی توہین ہو رہی تھی، سید صاحب کو ہوش آگیا، مگر جانتے ہو، یہی ہوش بے ہوشی سے کب بدلتا تھا، کیا طبلہ کی کسی تھاپ، یا کسی راگ کے الاپ پر، مولانا آزاد راوی ہیں،

"شبے نماز تراویح بہ جماعت می خواند"

قرآن سن رہے تھے، براہ راست خالق کائنات کے مخاطب تھے

امام بریں آیت رسید فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا (تم کم ہنسا کرو اور چاہیے کہ زیادہ رویا کرو) درعین نماز بے ہوش افتاد)

خدا جانے کب ہوش آیا، مگر آیا تو کس حال میں آیا، "تا چندروز از گریہ نیاسود"

جس "اللہ" کو الٰہ بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے سپرد کیا تھا، اسی الٰہ کی تلاش میں سید صاحب کو کہیں رکاوٹ پیدا ہوئی، پیر سے عرض رسا ہوئے، بعض اشغال اور تدبیریں بتائی گئیں، مشکل حل نہ ہوئی

میں جب کہتا ہوں کہ ہندوستان کا تصوف قرآنی تصوف تھا تو لوگ حیران ہوتے

Marfat.com

ہیں، آپ اس سلسلہ میں جو کچھ سُن چکے وہ تو سُن ہی چکے لیکن وہ تو ہندی اسلام کی ابتدائی قرون کی باتیں تھیں، سُنیئے بارہویں صدی میں بھی سلوک کی راہ میں مرید رکاوٹ محسوس کرتا ہے پیر علاج تجویز کرتا ہے۔

"برو قرآن مجید حفظ کن" مآثر الکرام ص ۱۲۰

جس کی تلاش تھی، اس کے پانے کی قریب ترین راہ یہی ہو سکتی تھی، محبوب مل بھی جائے۔ ع "تم ہمارے سامنے ہو، ہم تمہارے سامنے" کا نظارہ بھی پیش آجائے، لیکن دل کی بیکلی "کچھ اپنی ہم سنائیں، کچھ وہ سُنائیں اپنی" کے بغیر کیا مٹ سکتی ہے؟ "قرآن حفظ کن" اسی کی تدبیر تھی، مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

"چند جزاز قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت"

اب بات ہی کیا باقی رہتی ہے، عمر زیادہ گذر چکی تھی، لیکن چند جز کے بعد کل اجزا، قرآنی کے حفظ کی دھن سوار ہو گئی، جب تک جیتے رہے، اسی شغل میں جیتے رہے۔

"بست و پنج جزیاد کردہ بود"

کہ جس وقت کے لیے جی رہے تھے، وہ وقت آگیا، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جب "وقتِ احتضار رسید" پوچھا گیا "تمنائے بخاطر دارید"
نزع

ساری آرزوؤں کو سینے سے نکال کر ایک ہی آرزو کی لذتوں میں جو ڈوب گیا تھا، سُنتے ہو، بارہویں صدی کا ہندی مسلمان بھی یہی جواب دیتا تھا

"ہمیں تمنا با خود دارم کہ پنج جزاز قرآن باقی ماند فرصت حفظ نہ یافتم"

پانچ پاروں کے حفظ کی تمنا گور تک لیجانے والے کی وفات کی تاریخ مولانا آزاد کو "بشرٰی لکم الیوم جنات" ملی۔

جس قرآن میں حفظ کرتے تھے وہ گم ہو گیا، گھر کے لوگوں کو تلاش تھی، خواب میں آئے اور اطلاع دی کہ "قرآن در خانہ فلاں در فلاں محل ست" اور بیداری میں لوگوں نے "چوں خبر گرفتند ہمانجا یافتند"
عکاظمہم

Marfat.com

اللہ کی راہ میں مرنے والوں کے متعلق قرآن میں "بل احیاء" یعنی وہ مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں کی خبر دی گئی تھی، خواب میں جس خبر دینے والے کی بات بیداری میں دیکھی گئی کیا خواب کی اس تجربی تفسیر کے بعد بھی یہی سمجھا جائیگا کہ ایسے لوگوں کا صرف نام زندہ رہتا ہے، ورنہ واقع میں وہ معدوم[1] ہو جاتے ہیں۔

مولانا آزاد نے بارہویں صدی کے اس واقعہ کے ساتھ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیز شکربار جو حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد میں ہیں، یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک قاری حضرت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ، خوش الحانی کے ساتھ سورہ ق کی تلاوت اس نے شروع کی، جوں ہی کہ

"نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (میں اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں) رسید حالت شوق غلبہ کرد، سہ مرتبہ کلاہ از سر مبارک برقص آورد"

قاری طبع عالی کا مذاق شناس تھا، اب تک جو قریب سے آگے بڑھ کر اقرب کی

---

[1] فقیر سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی سابق صدر الصدور سرکار آصفیہ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ان کے چچا نواب عبدالشکور خاں مرحوم کے پاس حضرت مولانا عالم علی صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لایا کرتے تھے، مولانا کو کشف قبور میں خاص ملکہ تھا، ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، ایک بی بی صاحبہ جن کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا ان کی قبر پر مراقب ہوئے، اور فرمایا کہ ان بی بی صاحبہ کے پاس کسی نے اپنی جوتیاں امانۃً رکھنے کو دی تھیں اس عرصہ میں ان کا انتقال ہو گیا، کہتی ہیں کہ ان جوتیوں کی وجہ سے ان کو تکلیف ہے، پتہ یہ بتاتی ہیں کہ فلاں کمرے کے فلاں مقام پر جو صندوق رکھا ہوا ہے، اس کے کپڑوں کے نیچے جوتیاں ہیں، جس کی امانت ہے پہنچا دی جائے، لوگوں نے تلاش کیا، ٹھیک جوتیوں کا جو پتہ انہوں نے دیا تھا، وہیں نکلیں، حافظ ابن قیم نے کتاب الروح میں عہد صحابہ کا بھی واقعہ کچھ اسی نوعیت کا درج کیا ہے کہ خواب میں اپنے دوست صحابی کو مرنے کے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ میرے مکان کے چھپر میں سینگ کے اندر اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں، جو ایک یہودی سے میں نے لی تھیں، تم یہودی تک ان کو پہنچا دو، صحابی جنہوں نے خواب دیکھا تھا، ان کے گھر آئے، پردہ کیا، اور چھپر میں دیکھا تو ٹھیک جہاں پر انہوں نے اشرفیوں سے بھرے سینگ کا پتہ دیا تھا ملا، گھر والوں سے انہوں نے قصہ خواب کا بیان کیا، اور ان کی اجازت سے یہودی کو دے آئے یہودی اس قصہ کو سن کر مسلمان ہو گیا۔ اس قسم کے تجربات کا ایک ذخیرہ کتابوں میں ملتا ہے۔

Marfat.com

شکل میں محسوس ہو رہا تھا، قاری نے جیسا کہ مولانا آزاد لکھتے ہیں،

بازمانظ آیت ھوالاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شئ علیم

(وہی اول بھی ہے، وہی آخر بھی ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے، وہی ہر شئے کا دانا و علیم ہے)

پڑھنا شروع کیا، مولانا لکھتے ہیں کہ

"شیخ را طرفہ ذوقے و حالتے بہم رسانید چوں قرآن تمام کرد و آیت سبحان ربک

رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العٰلمین

خواند حضرت شیخ ہر دو دست مبارک بر روے مشکبوے فرود آورد و بر سینہ فیض گنجینہ برد"

اہل مجلس کی نظر اسی پر تھی کہ اچانک انہیں محسوس ہوا، کہ شیخ

"جان بجاناں تسلیم نمود" ماثر الکرام ص ۵۷۔

میں صرف نمونہ دکھا رہا ہوں، ہندوستانی مسلمانوں کا جو تعلق قرآن سے تھا، ہندی اسلام کی ابتدائی وسطانی و آخری صدیوں سب ہی کے نمونے اور سب ہی کی شہادتیں آپ کے سامنے گذر رہی ہیں، استیعاب مقصود نہیں صرف ان چھوٹوں سے جو آج اپنے بڑوں سے اسی لیے روٹھے بیٹھے ہیں کہ ہندوستان میں پہنچ کر انہوں نے خدا کے کلام سے رشتہ توڑ لیا، رسول کی حدیثوں کو اس ملک میں آکر چھوڑ دیا، ان ناآگاہوں کی آگاہی کی ایک راہ کھولنی ہے، ورنہ ان واقعات کی اس ملک میں کب کمی رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی وفات ان کی قرآن پر نہیں بلکہ کسی شعر پر ہوئی ہے، کسی نے

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں زغیب جانے دیگرست

شہادت کے کشتوں میں شریک ہو کر غیب کے زندوں میں اپنے آپ کو شریک کیا "سبحن المومن" سے آزادی کسی کو "خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی" پر میسر آئی، تو کیا واقع میں یہ سب شعر تھا، لوگ غور نہیں کرتے ورنہ جسے وہ شعر سمجھ رہے ہیں، قرآن میں پا سکتے ہیں، اور کہ یہ کوئی ایک دو قصے ہیں، تعلیم کا وہ نظام ہی اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ جینے والوں میں مرنے کا

صحیح سلیقہ پیدا ہو جائے۔ ساری تربیت کا حاصل اسی دن سامنے آتا تھا، جس دن اس دنیا سے وہ روپوش ہوتے تھے۔[1]

میں نے کسی جگہ سید محب اللہ بلگرامی کا ذکر کیا ہے کہ عہد جوانی میں "در شش ماہ قرآن یاد کرد" مولانا آزاد نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "سر حال شعار خود ساخت" سپاہیوں کے لباس میں رہتے تھے، عالمگیر کے صاحبزادے محمد اعظم کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے، شاہزادہ کو اجین مالوہ کی صوبہ داری سپرد ہوئی، فوج بھی ساتھ گئی، میر صاحب بھی اندر قرآن اور باہر میں ڈھال ڈنلوار لگائے شاہزادے کی فوج کے ساتھ اجین پہنچے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اجین کے قریب ایک مقام جس کا نام "سرائے سیسی" ہو گھوڑے پر سوار جا رہے تھے، وہیں "سرائے سیسی" کے کسی باغ میں گھوڑے سے اُترے، زین پوش بچھائی، خدام جو ساتھ تھے اُن کو بھی روک لیا، گٹھری سے نیا سفید لباس نکالا، پہنا، شربت بنایا، پیا، اور "بہ تلاوت قرآن مشغول گشت" تلاوت ختم ہوئی، قرآن جزودان میں رکھا گیا، اور خود "چادر کشیدند" چادر تنی کی تنی رہ گئی، لوگوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ

"جاں بحق سپردہ است" رحمۃ اللہ علیہ (مآثر۔ ص ۱۲۸)

عالم نہیں، فاضل نہیں، پیر نہیں، فقیر نہیں، فوج کے ایک سپاہی کو دیکھ رہے ہو جو قرآن نے اپنا اثر اس پر قائم کیا تھا،

قرآن کے ساتھ جن کے اگلوں کا بھی یہی رشتہ تھا، پچھلوں کا بھی یہی تعلق تھا، جو

[1] میری ایک کتاب "دم واپسیں" کا بکھرا ہوا اور غیر مرتب حال میں پڑا ہوا ہے، چند اجزاء احتضاریات کے عنوان سے القاسم دیوبند میں شائع بھی ہوئے تھے پھر سمیٹنے کا موقع نہ ملا، خدا کرے کہ توفیق میسر ہو، عجب واقعات ہیں، ان کے بھی جو مرنے کے لیے جیتے تھے اور اُن کے بھی جو جینے پر مصر تھے، لیکن بہر حال ان کو مرنا پڑا، ۔۔۔۔ میں نے مذکورہ بالا دو واقعات میں دراصل حضرت خواجہ بختیار کاکی اور حضرت حاجی امداد اللہ چشتی مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا محمد حسین الہ آبادی کی وفاتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو عام طور پر مشہور ہیں۔ قطب صاحب کا انتقال پہلے شعر پر اور مولانا الہ آبادی کا دوسرے شعر پر ہوا۔ ۱۲

درمیان میں تھے، ان پر بھی یہی کیفیت طاری تھی، خواص بھی اسی رنگ میں عوام بھی اسی حال میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کے بعد بھی کیا اپنے بزرگوں سے منھ پھلانا ان عزیزوں کا درست ہو سکتا ہے، جن کے منہ خواہ جتنے بھی پھولے ہوئے ہوں، لیکن ان میں شاید کسی ایک کا دل بھی قرآن کے لیے اتنا پھیلا ہوا نہ ہوگا، جس انشراح اور وسعتوں کا نظارہ ہم ان بزرگوں کے قلوب میں کر رہے ہیں،

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ   جب صور میں پھونکا جائیگا۔

والی مشہور قرآنی آیت سے اثر پذیر ہو کر جامع ترمذی میں ہے کہ ایک تابعی خَرَّ مَغْشِیًّا عَلَیْہِ (چکرا کر نماز میں گر پڑے) اور اسی بیہوشی میں وفات پا گئے، بلا شبہ یہ واقعہ بھی اہم تھا، اور ہے، اسی لیے ابو عیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں اس کو جگہ دی، لیکن پوری کتاب میں ایک واقعہ ہے، لیکن قرآنی مخدرات کی دلبریوں، بلکہ جاں برآریوں کے کرشموں کو دیکھ رہے ہو، ہندوستانیوں کی کوئی کمی ہے، یاران عزیز!

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن

آخر حدیث میں بھی تو ہے

اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ   اپنے مُردوں کا ذکر نیکی سے کیا کرو۔

ھٰذا والسلام علی من اتبع الھدیٰ

اس سلسلہ میں سر دست جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا، آخر میں ایک بات جس کا گذشتہ بالا واقعات میں مولانا آزاد نے تذکرہ کیا ہے، دل چاہتا ہے کہ تنبیہ کیے بغیر اسے نہ چھوڑا جائے، میرا اشارہ سید نور اللہ کے ترجمہ کے اس جزو کی طرف ہے یعنی مولانا آزاد نے جو یہ لکھا ہے۔

"وقتے اورا در طے ایں راہ مشکلے پیش آمد بخدمت سید العارفین اظہار کرد، حضرت

Marfat.com

شغلہا فرمودند عقدہ دانہ شد آخر فرمودند برو قرآن مجید حفظ کن، چند جز از قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت، آمدہ بہ پائے حضرت اُفتاد و باقی قرآن یاد کردن گرفت" (ص ۲)

اس واقعہ کا بہ تفصیل ذکر ہوچکا ہے اس وقت اس کے نقل کرنے سے میری غرض پھر اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہوچکا ہے، پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ "حفظ قرآن" کو اس راہ کی مشکل کے حل کا ذریعہ کیا جوگیوں میں بتایا جاتا ہے، ہندستان کا تصوف جوگیہ اور یوگیہ سے ماخوذ ہے، اس دعوے کے مدعیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسی تصوف کا نام جوگیت اور بیراگیت ہے؟ یہ سید العارفین جنہوں نے اپنے مرید کو حفظ قرآن کا مشورہ دیا، ان کے طریقۂ عمل کی خصوصیت مولٰنا آزاد نے یہ بیان کی ہے

"ریاضات شاقہ کہ آدمی را مزمن سازد نمی فرمودند واگر در اربعین من نشانند اغذیہ لطیف می دادند می فرمودند کہ قوام انسان غذا ہست اگر تندرست است جہاد ازو خوب می آید واگر ناتواں قصور واقع شود"

اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً ان کے مرید سید نور اللہ کے متعلق جو یہ بات گذری کہ گیارہ گیارہ روز تک کچھ نہیں کھاتے تھے یہ ان کا خاص حال تھا، یہ خیال کرنا کہ خود مرشدوں کی طرف سے اس کی تعلیم دی جاتی تھی، میرے نزدیک اکثریۃً یہ صحیح نہیں ہے، اور کبھی کبھی اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس کی حیثیت کسی وقتی علاج کی تھی، اسی قسم کا وقتی علاج جیسے حضرت کعب بن مالک صحابی کا علاج بارگاہ نبوت سے وقتی طور پر یہ کیا گیا تھا کہ عموماً صحابہ کو ان سے ملنے جلنے بات چیت کی ممانعت کردی گئی تھی، حتیٰ کے آخر میں ان کی اہلیہ کو بھی اسی کا حکم دیا گیا تھا، جس کی تفصیل بخاری میں موجود ہے، لیکن ظاہر ہے کہ چالیس پچاس دن کے لیے حضرت کعب کو یا ان کے ساتھ دو اور صحابیوں کو جو اس حال میں رکھا گیا تھا، اس کا تعلق ان کے خاص ذاتی خصوصیات سے تھا، اس کی حیثیت عام قانون کی نہ تھی، مولانا آزاد نے یہ بھی ان ہی سید العارفین کے متعلق لکھا ہے کہ

"ازدلق پوشیدن، ومرقع دوختن، وخود را در نظرِ خلق وانمودن، منع می کردند وازتاہل وکسب معاش کہ سنت سیّد انبیاء است بازنمی داشتند"

سید العارفین سے ان کے تصوف کا حاصل مولانا نے جو نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے

"مرد آں ست کہ ظاہرش با معاملہ خلق متفق باشد، وباطنش در یادِ مولیٰ مستغرق" ص۱۱

آپ اگر دیکھینگے تو عام اسلامی صوفیہ کا آپ کو یہی مسلک نظر آئیگا، البتہ ان میں جو حضرات ملّی اور دینی خدمات کے لیے اپنے آپ کو پابند بنا لیتے تھے، تو ظاہر ہے کہ کسبِ معیشت کا ان کو موقعہ کہاں سے مل سکتا تھا، خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو منصب نبوت ودعوت پر سرفراز ہونے کے بعد کوئی معاشی پیشہ اختیار نہیں فرمایا تھا، لوگ باوجودیکہ عموماً ان باتوں سے واقف ہیں مگر پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہندو ستانی جوگیت اور ہمارے بزرگوں کے طریقۂ کار میں لوگوں کو کیا مشابہت نظر آئی، جو یورپ کے اس افترا کے تسلیم کرنے پر مضطر ہو گئے۔ یورپ تو تصوف ہی نہیں، ہمارے سارے علوم بلکہ خود ہمارے دین ہی کو بجز!

لہ اور سید العارفین کے متعلق تو آپ پڑھ رہے ہیں کہ وہ کسبِ معیشت سے لوگوں کو صرف "بازنمی داشتند" یعنی منع نہیں کرتے تھے۔ مگر کسی مولوی یا کسی معاشی سلمان نہیں بلکہ طبقۂ صوفیہ کے سرخیل، اس راہ میں ایک خاص مکتبِ خیال کے بانی حضرت علاء الدولہ ابو المکارم سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مولانا جامی نے نفحات مطبوعہ کلکتہ میں ان ہی کا یہ قول نقل فرمایا ہے، یہ فرمانے کے بعد کہ حق تعالیٰ زمین ... بحکمت آفریدہ" یعنی زمین اور اس کی کھیتیوں کو خدا نے مصلحت اور حکمت سے پیدا کیا ہے، حضرت سمنانی فرماتے تھے "می خواہد کہ معمور باشد وفائدہ بخلق رسد" یعنی خدا چاہتا ہے کہ زمین اور اس کی قابلِ کاشت زمین آباد رہیں اور ان سے خلق اللہ کو نفع پہنچے، اس کے بعد ہے "اگر خلق بدانند کہ از عمارت دنیا کہ برائے فائدہ دخل کنند نہ برائے اسراف چہ ثواب است ہرگز ترک عمارت نہ کنند" یعنی دنیا کی آبادی جو بغرض فائدہ اور آمدنی کی جائے محض فضول خرچی مقصود نہ ہو اگر لوگوں کو اس کا ثواب اور اجر معلوم ہو تو ہرگز زمین کو غیر آباد نہ رکھیں، اسی طرح "اگر بدانند کہ از ترک عمارت وگذاشتن زمین را معطل چہ گناہ حاصل می شود ہرگز نہ گذارند کہ اسباب او خراب شود" یعنی غیر آباد رکھنے میں جو گناہ ہوتا ہے اگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو ہرگز آبادی کے اسباب و ذرائع کے برباد ہونے پر کوئی تیار ہو سکتا ہے، بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے آخر میں ارشاد ہے تمثیل سے سمجھایا گیا ہے۔ "ہر کسے کہ زمینے دارد کہ ہر سال از آں زمین ہزار من غلہ حاصل می تواند کرد، اگر بتقصیر واہمال نہ صد من حاصل کند بسبب آں صد من حق خلق در واقعہ بقدر آں از وے باز خواست خواہند کرد" یعنی کسی کے پاس زمین ہو جس سے ہزار من

راہب اور ورقہ بن نوفل کی تعلیم سے ماخوذ قرار دیتا ہے، پھر ایک بیچارے صوفیہ نے کیا قصور کیا تھا، کہ اسلامی صفوں سے ان ہی کو باہر نکال کر سرقہ و انتحال کے الزام میں ان ہی کو گردن زدنی قرار دیا گیا، اس الزام سے اسلام کا کونسا شعبہ محفوظ ہے، ہندو فقیروں، جوگیوں، بیراگیوں کا طرز عمل کوئی ایسا پوشیدہ راز بھی تو نہ تھا کہ اسلامی صوفیہ کے طریقۂ کار اور اس کا موازنہ اور مقابلہ ناممکن تھا، ابوالفضل طباطبائی سبھوں نے تحقیق کے ساتھ "ہندی تصوف" کی کیفیت لکھی ہے، کم از کم لوگ اسی میں پڑھ لیتے ہیں طباطبائی کی کتاب سیر المتاخرین سے نقل کرتا ہوں کہ اس کے الفاظ ذرا مانوس ہیں، یہ بتا کر کہ ہندو درویشوں کی چند قسمیں ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"نخستیں (اول قسم) صنف سناسیاں ازاں خاک نشیناں جمعے مہر خاموشی برلب نہادہ حرف زدن ندارند"

یہی لوگ منی ہوتے ہیں، یہ صوم صمت پر گویا عامل ہیں، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی ہے، اگرچہ حضرت مریم کے قصہ میں قرآن نے اس روزہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"فریقے ہر دو دست را مائل بآسماں گذارند و بعضے خود را معکوس در درخت آویختہ تکمید تن خویشتن بآتش می نمانند و چندے نظر بسوئے آسماں برداشتہ نظر بر آفتاب دوختہ دارند و برخے بر پا ایستادہ شب و روز می گذارند"

آپ ہی بتلائیے کہ جو پانچوں وقت کی نماز اور وہ بھی باجماعت جس کے لیے پڑھنا ضروری ہو، کیا وہ اسلامی صوفی ان عجیب وغریب مشاغل کو مذہباً اختیار کر سکتا ہے، میری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷) غلہ پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن قصداً کوتاہی اور غفلت کو کام میں لاکر بجائے ہزار من کے نو سو من ہی غلہ اس کھیت میں پیدا ہوا، تو سو من جو محض اس کی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے خلق اللہ کے منہ تک نہ پہنچ سکا، تو یہ سو من غلہ اس غافل سست عمل کاشتکار سے وصول کیا جائیگا، (اس کی باز پرس ہوگی) بتلائے جس طبقہ کا یہ خیال ہو اس پر رہبانیت اور جوگیت کا افترا کس حد تک درست ہو سکتا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب "اسلامی معاشیات"۔

Marfat.com

گفتگو کا تعلق ان بازاری بھنگڑوں سے نہیں ہے جنہوں نے بے دینی کا نام دین اور لامذہبیت کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے، بلکہ اکابر و ائمۂ صوفیہ سے بحث ہے خصوصاً خواجگانِ چشت کے سربرآوردہ بزرگوں سے کہ ان ہی کی طرف ہندوستان کی خصوصیت کی وجہ سے اس قسم کے خرافات کا انتساب اس زمانہ میں ذرا زیادہ جسارت سے کیا جارہا ہے، ان پر سب سے بڑا الزام سماع کا لگایا جاتا ہے لیکن اس کی جو اصل حیثیت بزرگوں میں تھی اسے آپ سن چکے اور سماع کے متعلق تو میرا خیال ہے کہ جس خاص طریقہ سے بعض صوفیوں میں یہ مروج تھا، اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں بمشکل مل سکتی ہے، بلاشبہ گاتے بجاتے اچھلنے کودنے کا رواج بعض غیر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ہمارے بزرگوں کی سماع کی مجلسوں کا جو وقار تھا اور جن خاص خصوصیتوں کے ساتھ اکابر سماع سنتے تھے، میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں اس قسم کی مجلسوں کا رواج ہو، اب اگر کہیں مروج ہو بھی ہو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اسلامی صوفیہ ہی سے یہ طریقہ ماخوذ ہے ورنہ کہاں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے سامنے اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر بھجن خوانی، اور کہاں پاکوں کے یہ روحانی مجالس، کاش: جن لوگوں کو ریسرچ کا شوق ہے وہ اسی مضمون پر ریسرچ کرتے، میرے لیے تو اتنا وقت نہیں ہے کہ اس پر کوئی مفصل مضمون لکھ سکوں، اس لیے ان چند اشارات ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

خیال تو کیجیے کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو، کہ معمولی جادوگروں اور ساحروں کی نفسانی قوتوں سے جو متاثر ہو جاتے ہوں اور اس کے ازالہ میں وہ اسی طرح عاملوں وغیرہ کے محتاج ہوں جیسے مادی امراض میں طبی تدبیروں کے، کیا ان ہی کے متعلق یہ قابل تصور بات ہو سکتی ہے وہ بھی کچھ اسی قسم کی نفسانی ورزشوں سے اپنے اندر تصرف وغیرہ کی قوت پیدا کرتے تھے، فوائد الفواد میں حسن علا سجزی نے براہ راست حضرت سلطان المشائخ کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے، یہ لکھنے کے بعد کہ

Marfat.com

"بندہ ایں خبر ناخوش آنحضرت ہم از لشکر شنیدہ بود کہ کسے سحر کردہ بود ایں معنی عرضداشت کردہ شد کہ چگونہ بود"

جواب میں سلطان المشائخ نے جو فرمایا امیر نے اُسے بجنسہٖ نقل کیا ہے، یعنی

فرمودند کہ آرے مدت دو ماہ زحمت (بیماری) دیدم زحمتے عظیم شد تا مردے را بیاوردند کہ او دریں (افسوں) آوردن علامات سحر مہارتے داشت، القصہ آں مرد بیامد پیش خانہ وحوالی آں می گشت و ہر بار قدرے گِل (مٹی) از زمین برمی داشت و بوئے می کرد دریں میاں گلے را بوئے کرد و گفت ایں جا بکاوید (کھودو) بکافتند (لوگوں نے کھودا) علامات سحر پیدا شد، آں گاہ اندک مایہ خفتے پیدا شد، دریں میاں آں مردم گفت من اں قدر مہارت می دارم کہ اگر گویند آں کس را کہ سحر کردہ است نام آں ہم بگویم خبر بمن رسانیدند، گفتم زنہار او را منع کنید تا نگوید ہر کہ کرد من از او عفو کردم (فوائد الفواد ۱۷۸)

سوچنے کی بات ہے کہ سحر اور جادو اور اسی قسم کی نفسانی درزشوں سے جو ایک عام آدمی کے طریقے سے متاثر ہوتے ہوں اور رد عمل کرنے والے کی دفع سحر کے لیے ان کو بھی ایسی ہی ضرورت ہو، جیسے ایک عامی آدمی کو ہو سکتی ہے۔

کیا ان کے متعلق جوگیانہ مشقوں کا شبہ بھی ہو سکتا ہے، اور کچھ سلطان المشائخ ہی کے متعلق سحر کا یہ قصہ نہیں ہے، اسی کے بعد امیر حسن علاء نے لکھا ہے کہ

"دریں میاں عرضداشت کرد شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز را نیز سحر کردہ بودند فرمود آرے، آں سحر بروں آمد (یعنی ازالہ کیا گیا) و طائفہ را کہ ایں حرکت بودہ دریافتند"

آگے طویل قصہ ہے کہ اجودھن کے والی نے ان ساحروں کو گرفتار کر کے حضرت شیخ کبیر شکر گنج کے پاس بھیجا، آپ نے سب کو بخش دیا، اور حاکم سے سفارش کی کہ ان کو چھوڑ دیا جائے، واللہ اعلم والی اجودھن نے بخشا بھی یا نہیں کیونکہ اسلامی قانون میں تو ساحر واجب القتل ہے

اس واقعہ کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ بھی ہے کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی بعض صحیح روایتوں میں جو آتا ہے کہ آپ پر سحر کیا گیا تھا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسپر بچولزم، مسمریزم وغیرہ ساحرانہ اعمال کا جو شبہ خواہ مخواہ دلوں میں ایسی ہستیوں کے متعلق ہوتا ہے جن کی ساری کرامت یا سارا معجزہ تعلق باللہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے واقعات سے اسی شبہ کی تردید قدرت کی طرف سے ہوتی ہے۔

پلٹ پلٹ کر ایک خاص مسئلہ میں میری واپسی ممکن ہے کہ بعضوں کو گراں بھی گذر رہی ہو لیکن دلوں کی ویرانی کا جو عام حال ہے اس نے میرے اندر جو زخم پیدا کیے ہیں، کیا کروں، رہ رہ کر ان ہی میں ٹیس اٹھتی ہے، خصوصاً ان مخلص نوجوانوں پر افسوس ہوتا ہے جو ہوائے دل کی بساط کے تازہ واردہیں، دماغی تنور ہی کو کافی سمجھ کر ان میں اکثر اخلاص کے ساتھ عمل کے میدان میں اتر پڑے ہیں، لیکن ہلکی سی آزمائش، معمولی سا ابتلا، ان کے قدم میں لغزش پیدا کر دیتا ہے اور یہ اس خامی کا لازمی نتیجہ ہے، جو غیر تربیت یافتہ قلوب میں بہر حال باقی رہ جاتی ہے، خواہ دماغوں کو کتنا ہی روشن کیا گیا ہو، آخر جس کی بینائی قوی ہے کیا ضرور ہے کہ شنوائی بھی اس کی ضعیف نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ سارا اخلاص معمولی ٹھیس کی برداشت کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا، اچانک نفسانیت، تعصب، بے انصافی کے زہر سے سینے معمور ہو جاتے ہیں، چاہتا ہوں کہ قلبی تربیت کی جو حقیقی موروثی راہ ہے جن سے حریفوں نے بے بنیاد باتوں کے ذریعے سے انہیں بدکا دیا ہے، اس کی متعلقہ غلط فہمیاں دور ہوں، ہوسکتا ہے کہ ان میں کوئی خیر کے ساتھ موفق ہو۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۔	نہیں چاہتا ہوں میں لیکن صرف سلجھاؤ، جہاں تک میرے بس میں ہے (صلاقت) کی توفیق اور اس کے ساتھ سیل اللہ ہی کے حکم سے ہو ملتا ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف جھکتا ہوں

میں تو چند اوراق میں ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تھا، لیکن بے اختیار مضمون نے مقالہ کی، اور مقالہ نے اب تک تو شاید ایک مستقل کتاب ہی کی شکل اختیار کر لی بات میں بات نکلتی چلی آئی، قلم کو میں نے بھی نہیں روکا، واللہ اعلم حق تعالیٰ کی کیا غرض ہے۔

أشر أريد بمن في الأرض زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ (میرے ان معروضات

أم أراد بهم ربهم خيرا کے اظہار سے، کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے

بہر حال جب طوالت کا مجرم ہو ہی چکا ہوں، تو اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کیوں تشنہ چھوڑ دی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تصوف و صوفیہ کے متعلق جہاں ایک طرف جوگیت اور بیراگیت کے اتہام کو اچھالا گیا ہے، اسی سلسلہ میں بعضوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ تصوف کا رشتہ تشیع سے ملاتے ہیں، منشا صرف اتنا ہے کہ عموماً صوفیہ کرام کا رجحان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف بظاہر زیادہ نظر آتا ہے، واقعہ یہی ہو یا نہ ہو لیکن بات مشہور کر دی گئی، سوچنے اور غور کرنے سے پہلے چیزوں کو چلتا کر دینے کی عادت جن لوگوں میں ہوتی ہے، وہ اسے لے اڑے پھیلا دیا گیا کہ صوفی ایک قسم کے شیعہ ہیں، بلکہ بعض لوگ تو شیعیت کی ذمہ داری صوفیوں ہی کے سر تھوپتے ہیں۔

اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں کہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ساتھ حضرات صوفیہ کے جس رجحان طبع کو مشہور کیا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، یا اہل بیت نبوت سے کیا واقعی صوفیوں کا تعلق جادۂ اعتدال اور ایمان و اسلام کے حقیقی اقتضاؤں سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کے لیے تو بجائے میرے زیادہ مناسب ہوگا کہ خود ان حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ غزالی، ابن عربی، سلاسل صوفیہ کے ائمہ حضرت سیدنا الشیخ جیلی سیدنا شہاب الدین سہروردی، سیدنا بہاء الدین نقشبند عارفِ روم اور ہندوستان کے مشائخ

ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے خود اور ان کے بعد اس خاندان کے اکابر شاہ ولی اللہ میرزا مظہر جانجاناں شاہ عبد العزیز وغیرہم حضرات نے تشیع کے خلاف میں جو کام کیا ہے وہ آج کس پر پوشیدہ ہے، اسی ہندوستان میں (باقی بر صفحہ ۲۷۳)

چشت، اکابر مجددیہ وغیرہم کے اقوال، ملفوظات مکتوبات وتالیفات پڑھیے آپ پر خود حقیقت واضح ہوجائیگی، ان میں اکثر بزرگوں کی خود لکھی مستند کتابیں موجود ہیں، اور جن کی کتابیں نہیں ہیں ان کے ملفوظات یا مکتوبات پائے جاتے ہیں۔

بہرکیف اس وقت جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مسئلہ پر اس حیثیت سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کے سامنے میں ایک نئی چیز پیش کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ صوفیہ کرام کی طرف تشیع کا انتساب صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خود شیعوں کا حضرات صوفیہ کرام کے متعلق کیا خیال ہے، حضرت غوث پاک یا مجدد الف ثانی کے متعلق تشیع کے حلقہ میں جو ناگفتہ باتیں کہی جاتی ہیں، اس کی تو شاید یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان بزرگوں سے نفرت شیعوں کو شخصی حیثیت سے ہے، مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ اشخاص و افراد نہیں پورے طبقہ صوفیہ کے متعلق ارباب امامیہ کے کیا خیالات ہیں، نجوم السماء شیعہ علماء کی تاریخ ہے اس کے مصنف ..... مولوی میرزا محمد علی ہیں، جن کے نام کے آگے دو سطروں کے طویل القاب لکھے ہوئے ہیں، یعنی شیعوں کے کوئی مستند عالم ہیں، انہوں نے مذہب امامیہ کے ایک عالم شیخ حر عاملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"شیخ حر عاملی در رسالہ اثنا عشریہ فی رد صوفیہ آوردہ کہ جمیع شیعہ انکار بر صوفیہ داشتہ اند

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲، ۳) حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم تھے، جو مجدد ہی نہیں بلکہ شیخ ابن عربی کے غالی عقیدت مندوں میں ہیں، ان کا نام ایک سطر کے آداب والقاب کے بغیر نہیں لیتے، ان کے متعلق حدائق حنفیہ میں یہ لکھا ہے، ان کا (مولانا بحر العلوم کا) قول تھا کہ مجھ کو عالم رویا میں حضرت ابوبکر صدیق کی زیارت ہوئی انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھ کو اپنی بیعت میں داخل کیا اور تعلیم وارشاد طریقت کا حکم دیا، پس میں خاص ان ہی کا مرید ہوں اور ان کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجھے سلسلہ انتساب بیعت کا پہنچتا ہے ص۴۶۷ مولانا بحر العلوم کو اس باب میں اتنا غلو تھا کہ اسی کتاب میں ہے، "چنانچہ جو شخص اس سلسلہ میں ان سے بیعت کرتا تھا، آپ اسے ایک واسطے سے شجرہ لکھ کر اس کو دیتے تھے" ص؟ میرا خیال ہے کہ تصوف کا اگر تشیع سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو سب سے زیادہ اس کا اثر سرخیل صوفیہ ابن عربی اور ان کے پیرووں پر ہونا چاہیے، حالانکہ نہ شیخ ہی کا یہ رنگ ہے نہ ان کے ماننے والوں کا ۱۲۔

Marfat.com

وتکفیر ایشاں نمودہ اند، در روایات مذہب ایشاں از ائمہ معصومین علیہم السلام نقل کردہ اند"

(نجوم السماء ص ۳۲)

سُنا آپ نے جن بیچاروں پر تشیع کا الزام لگایا جا رہا ہے، ان پر ایک دو طرف سے نہیں بلکہ جمیع شیعہ کی طرف سے کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے، بعض شیعی علماء مثلاً نور اللہ شوستری یا بہاء الدین عاملی کی کتابوں میں بعض اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابن عربی وغیرہ کی تعریف پائی گئی ہے، مصنف کتاب نے سب کو تقیہ پر محمول کیا ہے، بہاء الدین عاملی کے متعلق تو یہاں تک نقل کیا ہے، کہ تقیہ کے طور پر انہوں نے جو کچھ کہا ہو لیکن اصل اعتقاد صوفیوں کے متعلق ان کا جو تھا، اس کا اندازہ ان کے اس طرز عمل سے ہو سکتا ہے کہ

"ہرگاہ در مجلس شیخ بعضے ازاں فرقہ حاضر شدے بعد از بیروں رفتن او جناب شیخ بتطہیر فرش امری فرمود" ص — ۳۳

یعنی فرقہ صوفیہ کا کوئی آدمی اگر ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوتا تو اس کے باہر نکلنے کے بعد ملا نور اللہ اس فرش کے دھونے کا حکم دیتے تھے جس پر غریب صوفی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح اہلِ سنت والجماعت میں ایک گروہ اہلِ حدیث کا پیدا ہو گیا ہے، جو صوفیہ سے بدگمان ہے، اسی طرح شیعوں میں بھی "اخباریوں" کا ایک طبقہ جو حال ہی میں ظاہر ہوا ہے اور وہ بھی "اجتہاد و قیاس" کا دشمن ہے، شاید صوفیہ سے یہ ناراضی اخباری جماعت کی کوئی خصوصیت ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مصنف کتاب نے یہ بتاتے ہوئے کہ امامیوں میں اخباری جماعت کی ابتدا، ملا محمد امین ابن محمد شریف استرآبادی سے ہوئی، جیسا کہ اسی کتاب میں ہے:-

[1] ان ہی شیعی مولویوں میں صدر شیرازی المشہور بہ صدرا بھی ہیں۔ چونکہ وہ صوفیوں کے معتقد ہیں اس لیے طبقۂ شیعہ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے ان کے بیٹے ابراہیم نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے:-

"میرزا ابراہیم" از علما متبحرین وبخلاف پدر خود (صدر الدین شیرازی) سالک مسالک حق ریقین "

یہ بھی لکھا ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ملا صدرا سے مصداق یخرج الحی من المیت بود اس "

"اورسے یعنی ملا امین اول کسے کہ دروازہ طعن بر مجتہدین کشادہ فرقہ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ را بدو قسم منقسم گردانید[1] یکے اخباری و دیگر مجتہد" (ص ۴۱)

بہرحال مصنف کتاب نے اس تفریق کی یہ تاریخ بتا کر لکھا ہے کہ ملا امین نے

"در کتاب خود فوائد مدینہ طعن و تشنیع بسیار در حق مجتہدیں نمود، بلکہ گاہے ایشاں را بسوئے تخریب دین نسبت کردہ است"

مصنف کی اس باب میں جو رائے ہے، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

لیکن ملا امین سخن نیک نگفتہ است و کلام خوب نہ کردہ و بموافقت صواب سداد نرسید زیرا کہ فسادے عظیم بریں مرتب شدہ است" (ص ۴۲)

مندرجہ بالا قول جیسا کہ ظاہر ہے اس کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ مصنف کتاب کا تعلق اخباریوں (یا شیعہ وہابیوں[2]) سے نہیں ہے بلکہ وہی پرانے خیال کے مجتہدیہ یا گروہ

---

[1] شیعوں میں گویا یہ اہل حدیث کا فرقہ ہے، ملا محمد امین کی وفات ۱۰۳۳ھ میں ہوئی ہے، یعنی گیارھویں صدی کے آدمی ہیں، یہ ٹھیک وہی زمانہ ہے جب یورپ میں عیسائی بھی دو فرقوں میں منقسم ہو کر باہم ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان تھے، یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ (احتجاجیہ) عجب اتفاق ہے کہ قسطنطنیہ جو یورپ اور ایشیا بلکہ اسلام اور عیسائیت کا سنگم تھا وہاں چونکہ ترکوں کی کڑی حکومت تھی، یورپ کے اس مذہبی فتنہ کا اثر نہ پڑا۔ لیکن بجائے قسطنطنیہ کے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران کا ایک شیعی عالم مجتہدین یا عیسائی اصطلاح میں کہیے کہ کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہا ہے، اور اس کے کچھ ہی دن بعد جامع ازہر کا ایک طالب العلم عرب کے ایک دور افتادہ علاقہ نجد میں بیچ کر سنیوں کے اندر بھی یورپ کی اسی آواز کو دہرا رہا ہے کہ ہم پر علما و ائمہ کا قول حجت نہیں براہ راست قرآن و حدیث سے جو بات میری سمجھ میں آئیگی وہی مانینگے، یعنی وہی بات کہ کلیسا کی تشریح سے پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کو اختلاف تھا تورات و انجیل سے براہ راست اجتہاد کرنے کے وہ مدعی تھے، کیا ان ہی دنوں میں نصرانیت نے یورپ سے پاؤں نکال کر اسلامی ممالک کو اپنے سیاسی اقتدار کے نیچے دبانا شروع کیا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے، میں نے صرف اشارہ کیا ۱۲

[2] میرے اس اصطلاحی الفاظ پر برہم ہونے کی ضرورت نہیں، ملا امین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "او در مدینہ منورہ اختیار مجاورت نمودہ بود و بعد ازاں در مکہ معظمہ رحل اقامت انداخت"، وہ مرے بھی ہیں مکہ معظمہ ہی میں تاریخ کی کڑیوں کے ملانے والے اگر چاہیں تو بہت سی باتیں جو ابھی صیغہ راز میں ہیں۔ (باقی بر صفحہ ۲۷۶)

مقلدہ سے تعلق ہو۔ ورنہ اگر اخباریوں سے ان کا تعلق ہوتا، تو اپنے پیشوا ملا امین کی شان میں وہ یہ الفاظ لکھ سکتے تھے کہ اس نے اچھی بات نہیں کہی ہو، اور سیدھی راہ پر نہیں چلے ہیں، ان کی وجہ سے بڑا بھاری فساد پیدا ہوا۔

میری غرض اس تفصیل سے یہ تھی کہ صوفیہ کرام سے ناراضی اور اتنی سخت ناراضی کہ صوفی جس فرش پر بیٹھ جاتا تھا، اس فرش کو دھلوالیا جاتا تھا۔ جن شیعوں میں صوفیہ اور تصوف کے متعلق یہ خیال ہو، کیا تماشے کی بات ہو کہ ان ہی صوفیوں پر شیعہ ہونے کی تہمت جوڑی جاتی ہو، واقعہ تو یہ ہو کہ اگر ان بزرگوں کا تشیع کی طرف میلان بھی ہوتا تو کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ شیعوں کی طرف سے ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا، اور ائمہ کی طرف سے ان کی مذمت میں روایتیں پیش کی جاتیں۔

اس وقت صوفیہ کے باب میں انتساب تشیع کے متعلق مجھے صرف اتنی بات کہنی تھی، لوگوں کی معکوس فہمیوں کا ماتم کس سے کیجیے، افسوس ہے کہ اس وقت تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہو، ورنہ میں واقعات کی روشنی میں بتاتا کہ شیعہ تحریک کا جتنی سختی سے مگر بطرز حکیمانہ کارگر و موثر مقابلہ حضرات صوفیہ نے کیا ہو، علماء ظاہر سے وہ بات بن بھی نہیں پڑی ہو، آج مسلمانوں کی اکثریت[1] جو اہل سنت کی شکل میں بحمداللہ کرۂ ارض پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۵) ان کو پا سکتے ہیں، میں تو ابھی صرف اسی پر اس وقت قناعت کرتا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مشاہدات و محسوسات کے خلاف دنیا میں چند خلاف واقعہ باتیں جو مشہور ہوگئی ہیں بے سوچے سمجھے ہر شخص ان کو دہراتا رہتا ہو، ان میں سب سے بڑا فریب اور سفید جھوٹ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کی شہرت ہو۔ جہاں جائیے جس سے سنیے یہی سنیے کہ فرقہ بندیوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رکھا ہو، مسلمانوں کی بربادی اور تباہی میں تو شبہ نہیں لیکن فرقہ بندیوں کا دعویٰ قابل غور ہو، یہ صحیح ہو کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب غیر اقوام کے افراد شروع شروع اسلام میں داخل ہوئے تو اپنے آبائی اور موروثی جراثیم اپنے ساتھ لائے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جراثیم کا اثر مسلمان ہونے کے بعد بھی (باقی بر صفحہ ۲۷۷)

پھیلی ہوئی ہے، میرا دعویٰ ہے کہ سنیت کے مسلک پر کم از کم عامۂ مسلمین کو قائم رکھنے میں سب سے زیادہ مؤثر حصہ حضرات صوفیہ ہی نے لیا ہے، اہلِ بیت اطہار کے ساتھ ان کا ایک خاص ربط باوجود شدید تسنن کے اس کامیابی کی بہت کچھ ذمہ دار ہے، ورنہ مولویوں کے مناظرانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۶) کچھ دنوں ان میں باقی رہا، ان ہی آثار میں مذہبی اور اعتقادی اختلاف کا عارضہ بھی تھا۔ اسلام کے سوا آپ کسی مذہب کا جائزہ لیجیے، ایک ایک مذہب میں بیسیوں کمیونٹیاں سیپروالے فرقے آپ کو نظر آئیں گے۔ اور کیسے فرقے کہ باہم خدا تک ان کے الگ الگ ہیں، کسی کا معبود شیو ہے تو کسی کا وشنو، کوئی مسیح و بیٹے کا پجاری ہے کوئی باپ کا، کوئی ماں کا، میں نے جیسا کہ کہا کہ ابتدائی صدیوں میں غیر قوموں نے اپنے اس عارضہ کو مسلمانوں میں بھی منتقل کیا۔ نحل و الملل کی کتابوں میں ان اسلامی فرقوں کی ایک طویل الذیل فہرست نظر آتی ہے، لیکن کیا یہ حال ہمیشہ باقی رہا؟ واقعہ یہ ہے کہ بتدریج یہ سارے فرقی اختلافات مٹتے مٹتے کچھ ہی دن کے بعد اسلام نے زمین کے اس کرہ پر اپنا یہ حیرت انگیز معجزہ پیش کیا اور شاید ایک حد تک یہ تماشا ابھی ختم نہیں ہوا ہے کہ نسل انسانی کی اتنی بڑی برادری جس کی تعداد چالیس سے ستر کروڑ کے لگ بھگ سمجھی جاتی ہے، ان میں شیعوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا جن کی عددی حیثیت ایک فی صدی بھی مشکل ہی سے ہے بحمد اللہ ایک عقیدہ ایک خیال ایک قسم کے جذبات رکھتے ہیں، یعنی جن کی عام تعبیر اہل السنت والجماعت سے کی جاتی ہے، نادانوں کا گروہ جو یا تو فرقے کے مفہوم سے ناواقف ہے، یا ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے اتباع اور پیروکاروں کے باہمی اختلافات کی جو نوعیت ہے اس سے جاہل ہے، بہر حال وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اہل السنت والجماعت میں بھی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی چار فرقے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں باہم عملاً کچھ اختلافات ضرور ہیں لیکن کیسے اختلافات؟ اسی قسم کے جیسے خود حنفیوں میں امام محمد، ابو یوسف، زفر، ابوحنیفہ وغیرہ کے آرا میں اختلاف ہے، غور تو کیجیے کہ جب حنفی، شافعی کے پیچھے نمازیں پڑھتا ہے، باہم ایک دوسرے سے بیعت ہوتے ہیں۔ تمام سنی مسلمانوں کے سب سے بڑے شیخ طریقت حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ حنبلی ہیں، مگر حنفی، شافعی، مالکی تمام مسلمانوں کے وہ پیشوا ہیں، کیا جن لوگوں میں اس قسم کے تعلقات ہوں۔ ان لوگوں کو مختلف فرقوں سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے؟ لوگ کتابوں میں معتزلہ کرامیہ کے ساتھ خدا جانے کن کن فرقوں کا نام پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں وہ اب بھی موجود ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شیعہ فرقہ کے سوا تقریباً تمام فرقے صدیاں گذریں کہ ختم ہو چکے، شاید خارجیوں کی تھوڑی سی تعداد مسقط وغیرہ میں سنا جاتا ہے کہ پائی جاتی ہے، ورنہ بحمد اللہ شیعوں کے سوا سارے مسلمان اس وقت ایک فرقہ اہل السنت والجماعت کی شکل میں موجود ہیں۔ بعض فرقوں مثلاً داؤدیہ، سلیمانیہ، اسماعیلیہ، دروزیہ وغیرہ دراصل شیعوں ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ کل شیعہ طبقہ جب سو میں ایک کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ قابل لحاظ کب ہے، میرا خیال ہے کہ اس یکسانیت کے پیدا کرنے میں حضرات صوفیہ کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے، لیکن صوفیہ کا زور جب سے گھٹ رہا ہے یا اغیار کی دسیسہ کاریاں اسے گھٹا رہی ہیں، اب پھر حالات بدل رہے ہیں، اسلامی حکومتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، عام مسلمانوں پر اقتدار رکھنے والی نہ روحانی قوتیں باقی رہیں اور نہ سیاسی ایسی حالت میں اب جو کچھ بھی پیش آئے یا آ رہا ہے تو اس کا گلہ کس سے کیجیے شاخ پر بیٹھ کر جڑوں کو کھودنے والوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ درخت کے ساتھ خود ان کو بھی گرنا پڑے گا۔

مباحث کتابوں میں جس شکل میں پائے جاتے ہیں، ان کے پڑھنے والوں کے اندر کسی ایک طرف غلو اگر پیدا کر دے تو کچھ تعجب نہیں۔

بہرحال "تعلیم" اور "تربیت" دونوں کا جو نظام اس ملک میں قائم تھا، قریب قریب تمام اسلامی ممالک نہیں تو اسلام کے مشرقی علاقے یعنی خراسان، ترکستان، ایران، ہندستان وغیرہ میں صدیوں سے اسی اصول پر تعلیم بھی ہو رہی تھی، اور تربیت بھی، اور یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک بجائے مشرق کے مغرب سے ایک عجیب تعلیم اور غریب تربیت کا آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد تو خیر قیامت ہی برپا ہو گئی، ہند میں بھی، مصر میں بھی، ترکی میں بھی، ایران میں بھی، حتیٰ کہ اب تو اس کی شعاعیں عرب کو بھی گرما رہی ہیں اور اسلام غریب اسلام کا آخری کوہستانی حصار یا پناہ گاہ افغانستان بھی اسی کی روشنی نما تاریکی میں بتدریج گھرتا چلا جا رہا ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا

خاتمہ اب آخر میں اسی مرحوم تعلیم و تربیت جو ہندوستان میں جاری تھی اس کی بعض دیگر خصوصیتوں کا ذکر کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بلکہ ان سے پہلے حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہندوستان کے دینی و علمی کاروبار میں جو نئی ہلچل پیدا ہوئی۔ اور اس کے بعد ہندستان کی طرف سے بعض ایسی چیزیں دنیائے علم میں یا کم از کم اسلامی علوم کے حلقہ اثر میں پیش کی گئی ہیں، ان کے متعلق اگر ہمارا یہ ملک امتیاز کا دعویٰ کرے تو کچھ بیجا نہ ہو گا۔ اسلامی ممالک نے مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو جس نظر سے دیکھا ہے، اس کا اندازہ آپ کو اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان کے فارسی خطوط کا عربی زبان میں ترجمہ قازان (روس) کے ایک مہاجر مکہ عالم ملا مراد نے کیا۔ سلطان عبدالحمید خاں خلیفۃ المسلمین ترکی مرحوم کے عہد میں بغداد کے ایک عالم جلیل شہاب محمود آلوسی نے نو جلدوں میں روح المعانی کے نام سے جو قیمتی معلومات سے مملو تفسیر لکھی، بہ کثرت اس تفسیر میں آپ کو

مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات عربی شکل میں نظر آئینگے

یوں ہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات بدیعہ خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ کے متعلق بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم اسرار الدین میں یہ کتاب اپنی آپ نظیر ہے متعدد بار مصر میں اس کا شائع ہونا خود اس کتاب کی افادیت کی دلیل ہے، اور شاہ صاحب کے بعد مسلسل ہندوستان کا اسلامی علوم کی طرف جو رجحان بڑھتا رہا، اس نے چودھویں صدی تک پہنچتے ہوئے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کے متعلق ہندوستانی علماء اسلام کے خدمات کو اتنا وزنی کر دیا ہے کہ اس وقت اگر یہ کہا جائے کہ اس باب میں ہندی مسلمانوں کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے تو اسے شاید مبالغہ نہیں سمجھا جا سکتا، صرف فن حدیث ہی میں ان پچھلے دنوں میں جو کام ہندوستان نے کیا ہے، مصر ہو، یا عرب، ترکی ہو، یا ایران تونس ہو یا مراکش کیا اس کے مقابلہ میں اپنا کوئی سرمایہ پیش کر سکتا ہے؟ اجمالاً میں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

اسی طرح تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ہندوستان کے بعض جدید کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہو سکتی ہے جسے ہم ہندوستان کے ان کارناموں کے مقابلہ میں قابل لحاظ قرار دے سکتے ہوں۔

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے، وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے، عجیب بات ہے کہ باوجود اہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی، اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسن قبول اہل علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز یعنی نویں صدی کے ابتداء میں پیش ہوئی، وہ ہندوستان ہی کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے، یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے

اوران کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مگر یہ تو پچھلے زمانہ کی بات ہے، میں نے جیسا کہ عرض کیا ولی اللہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشأت ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "نظام الفرقان" کی طرف ہے، جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث)، کے سوا سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انہوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی:

بہرحال حدیث کے سوا عربی زبان میں بھی، اور عربی سے زیادہ ہندوستان کی جدید مقامی زبان اُردو میں ہندوستانی علماء نے اسلامی علوم کے مختلف شعبوں کے متعلق بعض ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ ہندوستان کا اگر اسے طغرائے امتیاز و سرمایہ ناز قرار دیا جائے تو اس کا وہ بجا طور پر حقدار ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسلام کا ایک خاص فلسفہ عہد جدید کی ذہنیتوں کے مطابق جو تیار کیا ہے، یا مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ نے سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ترتیب جس نئے اندازمیں انجام دی ہے بلکہ دے رہی ہے، حتیٰ کہ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ اُردو کی اس کتاب کے چند حصوں کا ترجمہ ترکی زبان میں شائع ہو چکا ہے اور عربی میں بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے، ترجمہ کی تیاری ہو رہی ہے، یا ہو چکی ہے، اسی تالیفی ادارہ نے معرفۃ الصحابہ کے علم میں جو ضخیم مجلدات اُردو میں شائع کیے ہیں، نیز اس کے سوا دوسرے علمی شعبوں پر جن تحقیقی اور تصنیفی کاموں کا سلسلہ جاری ہے مشکل سے ان کی نظیر اس وقت آپ کو کسی دوسرے اسلامی ملک میں نظر آئیگی، خود مولانا شبلی مرحوم جو اس ادارہ کے بانی ہیں، شخصی طور پر اسلام کی سیاسی و علمی تاریخ کے متعلق جو مختلف کتابیں اُنہوں نے لکھی ہیں، انصاف سے اگر کام لیا جائے اور مذہبی اختلاف کو اعترافِ فضل

ہیں بلا وجہ دخل نہ دیا جائے۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کاموں کا اکثر حصہ ایسا ہی جو اپنی خصوصیات کی بنیاد پر اچھوتا ہے، اُردو ہی میں نہیں عربی میں بھی مولوی صاحب مرحوم کی تصنیفات و مقالات امتیازِ خاص کے حصہ دار ہیں۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی زبان میں بھی "اسلامیات" کے متعلق اس وقت تک جتنا اچھا مواد مسلمانوں کے قلم سے منتقل ہوا ہے اس میں بھی سب سے بڑا حصہ ہندوستان ہی کا ہے، جس کا اندازہ آپ کو مصر کے جدید مصنفین کی کتابوں سے ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں زیادہ تر ان کے اقتباسات اور شواہد سید امیر علی اور صلاح الدین خدابخش مرحوم کی کتابوں سے لیے گئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اہلِ قلم کے سوا گویا انگریزی بلکہ شاید کسی دوسری مغربی زبان میں بھی دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔

بہرحال ہندوستان کے یہ سارے کارنامے جو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے بعد کے ہیں، جن کی اگر تفصیل کی جائے تو میں نے جو کچھ اجمالاً عرض کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کاش! اس کام کو کوئی الگ کر کے دکھاتا، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں حقیقت یہ ہے کہ بالکل نئی ہیں، مگر میری بحث کا زیادہ تر تعلق چونکہ ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم اور اس کے نتائج سے ہے اس لیے چند ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جنہیں بظاہر چنداں اہمیت حاصل نہیں، لیکن خصوصیت بہرحال خصوصیت ہے جب اس تعلیم اور اس کے نتائج کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہی ہو رہی ہے تو خصوصیت و امتیاز کے اس پہلو کو کیوں چھوڑ دیا جائے، بلکہ ممکن ہے جیسا کہ آئندہ شاید معلوم بھی ہو کہ خصوصیت کے سوا ہندوستان کے ان خصوصی خدمات کی کوئی چاہے تو قیمت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں بارہویں صدی کے وسط میں ایک کام ہندوستان کا وہ ہے، جسے ہم چاہیں تو اسلامی علوم کا اسے انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف قرار دے سکتے ہیں۔

میں حضرت شیخ محمد علی بن علی التھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "کشاف اصطلاحات الفنون" کی طرف اشارہ کر رہا ہوں عربی دائرۃ المعارف کے مصنف بستانی نے بھی "التھانوی" کے عنوان سے مولانا کی اس کتاب کا ذکر ان الفاظ میں ذکر کیا ہے (دیکھیے جلد ششم ص ۷۴۳ دائرۃ المعارف للبستانی)

افسوس ہے کہ صاحب کتاب کے متعلق باوجود تلاش و کوشش کے اب تک صرف اتنا ان ہی کی کتاب سے معلوم ہو سکا کہ ان کا نام اور نسب تو یہ تھا، جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

یقول العبد الضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولانا اتقی العلماء محمد صابر الفاروقی السنی الحنفی	یعنی عرض کرتا ہے بندۂ ضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولانا محمد صابر جو اتقی العلماء کے لقب سے ملقب تھے (اپنے نسب کی طرف فاروقی کے لفظ سے اور عقاید و عمل کے لحاظ سے سُنی حنفی ہونا اپنے کو بیان کیا ہے۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ علمی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا غالباً آپ کے خاندان میں قضا کا عہدہ بھی چلا آ رہا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں سب اپنے والد سے پڑھی تھیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

فلما فرغت من تحصیل العلوم العربیہ والشرعیہ من حضرۃ جناب استاذی و والدی	یعنی علوم عربیہ اور دینیہ شرعیہ کی تعلیم سے میں فارغ ہوا اور یہ تعلیم حضرت جناب والد سے میں نے حاصل کی۔

البتہ علوم عقلیہ مثلاً طبیعیات، الٰہیات ریاضیات وغیرہ فنون کا اُستاد کی امداد کے بغیر خود مطالعہ کیا ہے، جو ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

شمرت عن ساق الجد الی اقتناء ذخائر العلوم الحکمیۃ الفلسفیہ والحکمۃ الطبیعیہ والالٰھیہ والریاضیہ کعلم	میں علوم حکمیہ فلسفیہ اور حکمت طبعی، الٰہی، ریاضی مثلاً حساب، ہندسہ، ہیئت، اسطرلاب وغیرہ کے سیکھنے کے لیے آمادہ ہوا لیکن ان فنون کے

Marfat.com

الحساب والهندسه والهيئة والاسطرلاب	اساتذہ سے پڑھنے کا موقع نہ مل سکا، تب میں نے
ونحوها فلم يتيسر تحصيلها من الاساتذة	ان فنون کی مختصر کتابوں کا مطالعہ شروع کیا جو
فصرفت شطرا من الزمان الى المطالعة	ہمارے پاس موجود ہیں، خدا نے ہم پر ان کے مسائل
مختصراتها الموجودة عندي فكشفها الله علي	کھول دیے۔

بس ان چند اجمالی باتوں کے سوا اور کوئی تفصیلی چیز ان کے متعلق کسی کتاب میں اب تک نہیں ملی ہے۔ تذکرہ علمائے ہند میں بھی ان کا ترجمہ درج نہیں ہے، جو محل حیرت ہے، دیباچہ کے آخر میں مصنف نے یہ لکھ کر "حصل الفراغ من تسويدها سنة الف ومائة وثمانية وخمسين" یعنی ۱۱۵۸ھ میں اس کتاب کی تصنیف سے وہ فارغ ہوئے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بارھویں صدی کے عالم ہیں، گویا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے ہمعصروں میں ہیں

بہرحال مصنف کتاب کے حالات نہ معلوم ہوں تو کام تو موجود ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان سے پہلے اس قسم کا جامع اور حاوی کام کسی اور اسلامی ملک میں انجام دیا گیا ہے[1]۔ زیادہ سے زیادہ دو کتابیں یعنی میر سید شریف کا مختصر رسالہ "تعریفات" اور ابوالبقا کی کلیات کے سوا مجھے کسی دوسری کتاب کا اس سلسلہ میں حال معلوم نہیں لیکن کشاف کے مقابلہ میں جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دو کتابوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر کو اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور کلکتہ سے مدت ہوئی ٹائپ کے حروف میں دو ضخیم جلدوں کی شکل میں یہ کتاب شائع کی گئی لیکن اب تقریباً نادر الوجود ہے، صرف یہی اس کتاب کی خصوصیت نہیں ہے ہر قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ مسلمانوں میں ان کے زمانہ تک مروج تھے ان کے اصطلاحات کی تعریفیں کتابوں سے اخذ

---

[1] ایک کام قریب قریب اسی نوعیت کا ہندوستان کے جنوبی علاقہ احمد نگر میں مولانا عبدالنبی احمد نگری نے دستور العلماء نامی کتاب کے ذریعہ سے دیا ہے جس کے بعض اقتباسات کا ذکر اس کتاب میں بھی میں نے کیا ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے مدت ہوئی یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے ۱۲۔

Marfat.com

کرکے اس کتاب میں درج کردی گئی ہیں بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق سے بھی مصنف نے بکثرت کام لیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتاب دنیا کی انسائیکلوپیڈیاؤں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا ہے بشرطیکہ چینی اور جاپانی انسائیکلوپیڈیاؤں کو مستثنیٰ کردیا جائے کیونکہ وہ خصوصاً چینی انسائیکلوپیڈیا تو دیوار چین کی طرح دنیا کے عجائبات میں ہے، لیکن ان کے سوا یورپ میں بھی جو انسائیکلوپیڈیائیں لکھی گئی ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے التھانوی کی اس عجیب وغریب کتاب کے بعد ہی مرتب ہوئی ہیں۔ انگریزی، فرنچ وغیرہ مغربی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا کا رواج اٹھارویں صدی کے وسط میں ہوا

البتہ فارسی میں ایک کتاب نفائس الفنون فی عرائس الفنون ضرور ایسی کتاب ہے جسے حاویات اور محیطات کے سلسلہ میں جگہ دی جا سکتی ہے، لیکن پھر بھی کشاف الاصطلاحات والفنون کے مقابلہ میں یہ کتاب نہیں آسکتی۔ امام رازی نے بھی ایک کتاب حدائق الانوار فی حقائق الاسرار نامی ترکی بادشاہ کے نام سے لکھی ہے کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ساٹھ علوم کے مسائل جمع کردیے گئے ہیں، مگر اسی کے ساتھ غالباً اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان (جس سے میں کشمیر وغیرہ کو مستثنیٰ نہیں سمجھتا) کے ایک کشمیری عالم شیخ الاسلام مفتی قوام الدین محمد حسن کی وفات سنہ ۱۲۱۹ھ میں ہوئی ہے صاحب حدائق حنفیہ نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ آپ نے

"کتاب صحائف سلطانی ساٹھ علم میں تصنیف کی" ص ۴۶۳

واللہ اعلم بالصواب یہ امام رازی کی کتاب سے ماخوذ ہے یا شیخ الاسلام نے کوئی الگ کتاب لکھی ہے، بہر حال ہے تو ہندوستان کی یہ بھی ایک چیز اسطح واجد علی خان کی کتاب

مطلع العلوم و مجمع الفنون

کشاف الاصطلاحات والفنون کے بعد دوسری چیز اس سلسلہ میں جو قابل ذکر ہے وہ وہی ہے جس کے متعلق میں نے پہلے بھی وعدہ کیا ہے، فیضی کی غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام فیضی اور ابو الفضل دونوں کے پدر بزرگوار کے دینی پہلو کے متعلق جو میرے خیالات

ہیں، مختلف حیثیتوں سے بغیر کتمان کے میں اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں لیکن

"می بہا جلوہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو"

ناانصافی ہوتی، اگر میں اس کے ذکر سے لاپروائی برتتا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی، اشارہ ملا ابوالفیض فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام کی طرف کر رہا ہوں، یوں تو اہل علم میں ایسا کون ہوگا، جو ان کی اس تفسیر اور اس کی خصوصیت خاصہ سے واقف نہ ہو، میں نے بھی شاید اشارے اس کی طرف کیے ہیں، لیکن اس تفسیر کے پیچھے جو واقعات ہیں، ان پر لوگوں کی کم نظر گئی۔

اتنا تو سب ہی جانتے ہونگے کہ ملا فیضی نے عربی زبان میں کامل تیس پارول کی تفسیر ایسے الفاظ میں کی ہے جن میں ہر لفظ غیر منقوط ہے۔ یہ تفسیر مدت ہوئی چھپ چکی ہے۔ اہل علم کی نظروں سے عموماً گذرتی رہتی ہے یوں تو ظاہر ہے کہ کلام اللہ کی تفسیر کا کام ابتدا، اسلام سے اس وقت تک جاری ہے، اور ٹھیک جس طرح حق تعالیٰ کے کام کے سلسلے کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے، اور ہر دن اس عالم کون کے نئے ناموس فطرت کے نئے قانون کا علم بنی آدم کو ہو رہا ہے۔ باوجود اس کے طے شدہ ہے کہ جو کچھ جانا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی نہیں جانا گیا ہے، بجنسہ یہی حال اللہ کے کلام کا بھی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں، جلد جلد میں اس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں، لیکن ہر قرآن پڑھنے والے کو کم از کم اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ اس کتاب کو جتنا سمجھا گیا ہے اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو نہیں سمجھا گیا ہے، خواہ جو نہیں سمجھا گیا ہے وہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مشہور روایت

لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد — قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے اور بار بار دہرانے سے وہ پرانی نہیں ہو سکتی

ہیں قرآن کی اس لامحدودیت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، اپنے ایک رسالہ "کائنات روحانی" میں مدت ہوئی، بعض نقاط خیال کا اظہار کیا گیا تھا، خیر یہ ایک مستقل بحث ہے، اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ مذہبی اور دینی حیثیت سے فیضی اور اس کے طرز عمل کے متعلق جو رائے بھی رکھی جائے، اور ملا عبدالقادر نے جو حالات اس شخص کے بیان کیے ہیں، کون ایسا مسلمان ہے جو اس کے بعد بھی اپنے دل میں فیضی کے متعلق کوئی گنجائش پا سکتا ہے، لیکن میری گفتگو اس وقت صرف علمی اور ادبی حیثیت سے ہے، اور اسی لحاظ سے ملا فیضی کے اس کام کو ہندوستانی تعلیم کے نتائج میں کم از کم میرے نزدیک نمایاں مقام حاصل ہے، اس تفسیر کی ضخامت پچھتر جز ہے، اور یہ واقعہ ہے، مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود ملا نے یہ کمال کیا ہے کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق عموماً جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہے، ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مولانا غلام علی آزاد نے بھی اپنے زمانہ تک اس کا دعویٰ کیا ہے۔

"کہ دریں ہزار سال پیشتر ما ہیچ مستعدے را میسر نہ شد"

اور اس سے بھی طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ پچھتر جزوں کا یہ ضخیم مجموعہ کتنے دنوں میں تیار ہوا ہے، مولانا لکھتے ہیں۔

"طرفہ ایں کہ ایں چنیں کار دشوار را در عرض دو سال از مبدء (آغاز) با منتہیٰ (ختم) رسانید"

ہندوستان کے نظام تعلیم کا دماغی ارتقاء پر کیا اثر پڑتا تھا، ملا فیضی کے ذاتی عقائد کچھ ہوں لیکن ان کی اس تفسیر کو تو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے، یا دو سال کی مختصر مدت میں ایسے عجیب و غریب کام کا پورا ہونا کیا کوئی معمولی بات ہے، رہ گئی یہ بات کہ آخر اس ادبی زور جس کا عملاً ظاہر ہے کہ ایک "فخر قصیدہ" سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں ہے، اس کے محرکات عقلی کیا ہیں؟

Marfat.com

واللہ اعلم بالصواب، پہلی بات تو میری سمجھ میں وہی آتی ہے جس کا اظہار ابوالفضل نے آئین اکبری میں کیا ہے، ابوالفضل نے ایک مستقل باب اپنی اس کتاب "ہندوؤں کے علوم و فنون" کی تفصیل کے لیے مختص کیا ہے، اور اس کے ذیل میں اس نے سنسکرت زبان کی نحو و صرف، قرأۃ، بدیع، بلاغت وغیرہ وغیرہ مختلف علوم کا ذکر کیا ہے، وہیں لکھتے لکھتے آخر میں اس کے قلم سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ہیں۔

"پیش ازاں کہ بدیں زبان (سنسکرت) سخنے آشنا شود"

یعنی سنسکرت زبان کا تھوڑا بہت علم میں نے جو حاصل کیا ہے اس سے پہلے

"چناں می دانست کہ ضابطہ لغت عرب بے ہمتا باشد"

مگر جب سنسکرت زبان سے آگاہی حاصل ہوئی تو آپ فرماتے ہیں۔

"اکنوں چناں پیدائی گرفت (ظاہر شد) کہ ہندی نژاداں فراواں کوشش بجا آوردہ اند و کار را استوار ساختہ"

گویا عربی زبان جو عہدِ اکبری میں ہر قسم کی تحقیر و توہین کی مستحق قرار پا چکی تھی، اس کے مقابلہ میں ایک اور باضابطہ زبان کا سُراغ لگا یا گیا، گو ابوالفضل نے کھُل کر تو اظہار نہیں کیا ہے لیکن انداز کا رجحان بتا رہا ہے کہ سنسکرت کو عربی کے مقابلہ میں فضیلت بخشی جا رہی ہے، ظاہر ہے کہ ہم جیسے لوگ جو سنسکرت زبان سے قطعاً نا آشنا ہیں ابوالفضل کے اس دعوے کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن جس خاندان سے اس دعوے کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی گھر سے عربی زبان کے متعلق کم از کم عظیم سرمایہ داری کا جو ثبوت فیضی کی اس تفسیر سے ملتا ہے، میں تو گونہ ابوالفضل کی اس تعریض کا اسے ایک قدرتی جواب سمجھتا ہوں، بلکہ عہد اکبری میں بھی "عربی الفاظ" سے فارسی زبان کی العیاذ باللہ تطہیر کی جو خفیہ تحریک اٹھی تھی، جس کے ثبوت میں علاوہ ملا عبدالقادر کے بیان کے خود ابوالفضل کی طرز تحریر کو پیش کیا جا سکتا ہے اپنی

Marfat.com

پوری کتاب میں گویا قسم کھائے ہوئے ہے کہ سمتوں کے بیان میں مغرب اور مشرق کے عام الفاظ استعمال نہیں کریگا بلکہ اس زمانہ میں ٹھیک جس طرح پچھمی اور اتری وغیرہ کے الفاظ سے شائستہ کانوں کو مجروح کیا جارہا ہے۔ ابوالفضل بھی مغرب کی جگہ باختر اور مشرق کی جگہ خاور کے الفاظ استعمال کرتا ہے، شمال اور جنوب کے متعلق فارسی میں جو الفاظ تھے، شاید وہ اتنے نسیاً منسیا ہوگئے کہ ابوالفضل کو غالباً لغتوں میں بھی اس کا پتہ نہ چلا، اس لیے مجبوراً شمال وجنوب کو استعمال کرتا ہے، انتہا یہ ہے کہ کسی ملک کی مشرقی حد کو "خاور رویہ" مغربی سرحد کو "باختر رویہ" کہنے سے کبھی نہیں تھکتا، "مرکز" کی جگہ التزاماً "بن گاہ" کی بھونڈی ترکیب شاید اسی کی تراشی ہوئی ہے، اور یہی حال اس کا دوسرے عربی الفاظ کے متعلق ہے، یقیناً اس تنگ دلی کا ایک زندہ جواب ہے کسی زبان کا سرمایہ اتنا وسیع ہو کہ وہ سارے معانی اور مطالب جو عربی تفسیروں کی ضخیم مجلدات میں بیان کیے گئے ہیں، غیر منقوط الفاظ میں ادا کردیے جائیں، کیا یہ کوئی معمولی بات ہے، دوسری زبانوں میں اس قسم کے التزامات شاید چند سطروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے، گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہے، تاہم بہرحال وہ ایک غیر معمولی ذہن ودماغ کا آدمی تھا، بیچ بیچ میں بعض نکتے اس کے قلم سے بے ساختہ نکل پڑے ہیں اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اچھی خاصی چیز ایسی جمع ہوسکتی ہے جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دی جاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر بات بھی ہے، ماٰثر الامرا میں اکبری عہد کے ایک عجیب واقعہ کا ذکر ہے، لکھا ہے کہ جس زمانہ میں اکبر کے دربار میں دنیا کے تمام مذاہب کے علماء اور پیشواؤں کو مدعو کرکے ان کے مذہب کی حقیقت کی تحقیق ہورہی تھی۔ ان ہی دنوں میں پارسیوں کے ایک پیشوا جس کا نام آذر کیوان مجوسی تھا، اکبر نے پٹنہ[1] سے اُسے طلب کیا

[1] یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ مولانا شبلی نے اپنے مقالات میں ایک جگہ لکھا ہے۔ آذر کیوان ہندوستان آیا۔ عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی اور ۱۰۲۷ھ میں ۸۵ سال کی عمر پاکر مر گیا صفحہ ۱۷ مجموعہ مقالات

Marfat.com

کیوان خود تو نہیں آیا، لیکن ایک کتاب لکھ کر اکبر کے پاس بھیجی جس کی خصوصیت مآثر الامرا میں یہ بیان کی گئی ہے۔

"کیوان مجوسی کتابے بر چہار جز بر در اکبر فرستاد، ہر سطرش پارسی بحت (یعنی شدہ فارسی تھی) و تصحیف آن عربی، و چوں قلب می کردند ترکی و مصحف آن ہندی"

مطلب یہ ہے کہ اصل کتاب کو سیدھے سادے طور پر اگر پڑھیے تو خالص فارسی جس میں عربی الفاظ کا میل نہ ہو، آپ کو نظر آئیگی لیکن اسی عبارت کے الفاظ کی تصحیف کر دیجیے یعنی نقطوں کو حذف کر کے ان ہی الفاظ کو ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو بجائے فارسی کے آپ کو یہ کتاب عربی زبان کی کتاب معلوم ہوگی، پھر ان الفاظ کو اُلٹ دیجیے یعنی حروف کو اُلٹ کر الفاظ بنائیے جسے صنعت قلب کہتے ہیں، تو اب یہ ترکی زبان کی کتاب ہو جاتی ہے، ان مقلوبہ الفاظ کی اس کے بعد تصحیف کیجیے، یعنی وہی نقطوں کو ادل بدل کر کے ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو اب یہی کتاب آپ کو ہندی زبان کی کتاب نظر آئیگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیوان نے اپنی کتاب کی ان ہی خصوصیات کو اپنے مذہب کی صداقت کی دلیل قرار دیا تھا، کیونکہ مآثر الامرا میں اسی کے بعد یہ فقرہ بھی درج ہے۔

"شیخ ابوالفضل می گفت، ایں نامہ افصح از قرآن ست" مآثر ج ۲ ص ۳۸۶

اس ابوالجہل کے نزدیک اگر اسی لفظی کرتب کا نام فصاحت ہے، تو آپ کی فضیلت کو کیا کہا جا سکتا ہے یہ طفلانہ بازیگری جس کا کسی زمانہ میں پرانے مکتبوں میں رواج تھا، اس شخص

لہ بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک عالم میاں الہ داد نامی رہتے تھے، فقہ، اصول فقہ میں بڑی دستگاہ تھی، ملا عبدالقادر ان سے لکھنؤ میں خود بھی ملے ہیں۔ انہوں نے ملا صاحب کو اپنی مصنفہ چند کتابیں دکھائیں جن میں ایک کتاب کی خصوصیت یہ تھی۔

رسالہ کہ از طول چہار دہ سطر و از عرض بہان قدر سطر بجدول نوشتہ بودند و احکام و مسائل چہار دہ علوم ازیں استخراج می ماندند ص ۸۶ (باقی بر صفحہ ۲۹۰)

کو ملاحظہ فرمائیے آپ اسے فصاحت قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کی فصاحت پر اسے ترجیح دیتے ہیں :-

میرے پاس اس کا کوئی بین تصریحی ثبوت تو نہیں ہے لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آذرکیوان کی اس کتاب کی لفظی "صناعیوں" نے اگر واقع میں ایسی کوئی کتاب اُس نے لکھ کر بھیجی بھی تھی، اس زمانہ میں کچھ خاص اہمیت حاصل کی شاید فیضی کی اگر دینی نہیں تو نسلی اور علمی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی، اور اسی کتاب کے مقابلہ میں ایک دوسری لفظی صنعت کا التزام کرکے اس نے یہ تفسیر لکھی، اب خواہ یہ واقعہ ہو یا نہ ہو، اور فیضی کے سامنے آذرکیوان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۵) یعنی لکیریں کھینچ کر اُنھوں نے طول اور عرض دونوں میں چودہ چودہ سطریں ایسے الفاظ میں لکھی تھیں کہ ان سطروں کے ایک ایک خانہ سے طولاً و عرضاً چودہ علوم کے مسائل پیدا ہوتے تھے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ دو چیزوں میں ایک غریب اور نادر چیز تو ان کے پاس یہ دیکھی، اور کوئی شبہ نہیں کہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ایسی عبارت بنانا کہ ایک طرف سے مثلاً طول کی طرف سے پڑھیے تو ایک فن کا مسئلہ ہو، اور عرض کی طرف سے پڑھیے تو دوسرے فن کا، یوں ہی ایک ایک خانہ کو چھوڑ کر پڑھتے چلے جائیے الگ الگ فن کے مسائل کی وہ عبارت بنتی چلی جائیگی، یہ عبارتی عجائب نگاری کا ایک دلچسپ کمال ہے، اور میرے خیال میں آذرکیوان کے کام سے کم حیرت انگیز نہیں ہے، دوسری چیز "فنیطون" نامی ان کی ایک اور کتاب بھی لکھا ہے کہ "مثل مقامات حریری داشت" مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا کمال یا غایت بھی البتہ ایک اور کتاب کا جو ذکر کیا ہے کہ وہ نحو میں تھی جس عبارت میں مسئلہ بیان کیا گیا تھا وہی عبارت مثال کا کام بھی دیتی تھی، لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ اس میں میاں الہ داد کو تفرد و تقدم حاصل نہیں ہے، اسی ہندوستان میں نحو کا ایک "متن" اسی صنعت میں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی لکھ چکے تھے، جس کا نام ارشاد ہے وہ چھپ بھی چکا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ارشاد ہو، کیونکہ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے کہ میاں الہ داد کے بنی اعمام کہتے تھے کہ "رسالہ چہار دہ علمی و فنیطون تصنیف حکیم زبرقی ست کہ در جونپور آمدہ با قاضی شہاب الدین مشہور معارضہ نمودہ" کیا تعجب ہے کہ یہی حال نحو کے اس متن کا بھی ہو، ملا عبدالقادر کو اس کی خبر نہ ہو۔ علامہ شرف الدین اسمٰعیل پشاوری کے رسالہ عنوان الشرف میں اسی

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ چند سال ہوئے کہ مسٹر ظریف نامی ایک صاحب نے اسلام اور مذہب کے خلاف میں ایک سخت کتاب لکھی تھی جس کے متعلق ہنگامہ بھی سخت ہوا تھا، مولانا عبدالباری ندوی فرماتے تھے کہ مسٹر ظریف کشمیر میں تھے میں بھی وہیں تھا، کانپور کی مسجد مچھلی بازار والی کا قضیہ اسی زمانہ میں پیش آیا تھا میں نے

[illegible]

Marfat.com

کی کتاب کا مقابلہ ہو یا نہ ہو لیکن میں تو اس کو بھی قرآن کی طرف سے ایک غیبی جواب سمجھونگا کہ اصل قرآن کا مقابلہ تو خیر کوئی کیا کرسکتا ہے جس طرح خدا کے بنائے ہوئے کسی پتہ کا بھی جواب ہو بہو جیسا کہ وہ ہے آسمان و زمین کی کوئی طاقت پیش نہیں کرسکتی، یہی چیز قدرتی اور مصنوعی امور میں فرق پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن کے قدرتی ہونے کی دلیل میں متعدد جگہ اسی چیز کو پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اس جیسا کلام نہیں بنا سکتا۔ مگر فیضی کے کام نے یہ ثابت کردیا کہ آذر کیوان کی کتاب کا مقابلہ قرآن کی ایک تفسیر سے کیا جاسکتا ہے، جو معمولی آدمی کی لکھی ہوئی ہے، آخر آذر کیوان کی کتاب کی اس سے زیادہ تو کوئی خصوصیت نہیں کہ انشا، یا کتابت کی چند صفتوں کے التزام کے ساتھ چار جز کا ایک رسالہ اُس نے لکھ دیا ہے اسی قسم کی انشائی صنعت میں چار جز نہیں پچھتر جز کی تفسیر تیار ہے۔

فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے، جیسا کہ میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے کہ اس تفسیر کے چند اجزاء بطور نمونے کے فیضی نے اسلامی ممالک میں بھی روانہ کئے تھے، اگرچہ ملا عبدالقادر نے رفیعی شاعر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اکبر اور دوسرے امراء سے انعام و اکرام لے کر رفیعی جب اپنے وطن کاشان واپس جارہا تھا، اور فیضی نے اس کے ساتھ

> چند جزو از تفسیر بے نقطہ بہ توقیعات (تقریظات) افاضل و دیوان بولایت برائے شہرت فرستادہ بود"
> ایران و خراسان ہے

لیکن خدا جانے کیا نحوست پیش آئی ملا صاحب لکھتے ہیں کہ جہاز پر سوار ہو کر رفیعی جب ایران جارہا تھا تو:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) مسٹر ظریف کو دیکھا کہ جو لوگ اس مسجد کے سلسلہ میں شہید ہوئے تھے، ان سے ہمدردی کرتے ہوئے، حکومت کے خلاف سخت لعن طعن کررہے ہیں میں نے کہا کہ آپ کو جب اسلام ہی سے انکار ہے تو مسلمانوں سے ہمدردی کے کیا معنی؟ بولے کہ واہ تو کیا میں قومی حیثیت سے بھی مسلمان نہیں ہوں، مذہبی حیثیت سے مجھے ہمدردی نہ ہو، لیکن قومی حیثیت سے تو میرا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے اور مسجد سے بھی۔

"چوں از ہرمز (جزیرہ) گذشت نزدیک بہ کچھ و کران رسید کشتی او بہ تباہی شد و ہرچہ داشت

بہ تاراج رفت" ص ۲۳۲

وراسی ہرچہ داشت میں فیضی بیچارے کا سرمایۂ شہرت بھی تھا وہ بھی دریا برد ہوگیا، مگر ملا صاحب

ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیضی نے اپنی کتابوں کی نقل کے لیے ایک سررشتہ قائم

کر رکھا تھا۔

'زرہائے جاگیر صرف کتاب و تذہیب (مطلاّ و مذہب کرنے میں) تصانیف خود ساختہ' (ج ۳ ص ۳۰۶)

ایک ایک کتاب کے کتنے نسخے فیضی نے تیار کرائے تھے اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے

یہ مرنے کے بعد جب اس کا کتب خانہ شاہی خزانہ میں منتقل ہو رہا تھا، تو ملا صاحب نے لکھا ہے

"ازو دان کتابوں میں) صد و یک کتاب نل دمن بود" ج ۳ ص ۳۰۶

یعنی صرف مثنوی نل دمن کے ایک سو ایک نسخے تو وہ تھے، جو تقسیم و اشاعت کے بعد

کتب خانہ میں بچ گئے تھے، ایسی صورت میں کیا تعجب ہے کہ فیضی کے ساتھ جو نمونہ تفسیر کا

بھیجا گیا تھا وہ ڈوب گیا ہو، مگر اور ذرائع سے جو نسخے اسلامی ممالک میں بھیجے گئے تھے

وہ وہاں پہنچ گئے ہوں، اگرچہ اس تفسیر کا ذکر باہر کے علماء کی کتابوں میں ہم نہیں پاتے

مگر جس کی ایک ایک کتاب کے سو سو نسخے بانٹنے اور تقسیم کرنے کے بعد باقی بچ جاتے

ہوں، جو اپنی جاگیر کی آمدنی کا بیش قرار حصہ صرف اپنی کتابوں کی کتابت و زیبائش

پر خرچ کرتا ہو، اس کے متعلق یہ کیوں سمجھا جائے کہ اگر ایک نقل اس کی ڈوب گئی تو دوسری

نقلیں اس کی کتابوں کی اسلامی ممالک میں نہ پہنچی ہونگی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ دن ہوئے قسطنطنیہ سے ایک تفسیر "درر الاسرار" نامی

چھپ کر آئی ہے، مصنف اس کے سید محمود آفندی ہیں، دمشق کے رہنے والے ہیں، اپنی

اس تفسیر میں محمود آفندی نے بھی اسی صنعت اہمال کا التزام کیا ہے، یعنی پوری تفسیر غیر منقوط

ہے، سلطان عبدالمجید خاں خلیفۃ المسلمین مرحوم کے نام یہ کتاب معنون ہے، سنہ تالیف ۱۳۲۳ھ

یعنی سو سال سے کچھ ہی زیادہ زمانہ گذرا ہی۔

ظاہر ہی کہ فیضی کی تفسیر کے دو سو سال بعد یہ کتاب لکھی گئی ہی، چونکہ فیضی سے پہلے اس صنعت میں تفسیر لکھنے کا جہاں تک میں جانتا ہوں رواج نہ تھا رمفتی عنایت احمدؒ نے پچاس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا قصد اس صنعت کے ساتھ کہ

کیا ایسی صورت میں اگر یہ خیال کیا جائے کہ شام کے ایک عالم کے دل میں اس تفسیر کے لکھنے کا ارادہ ہندوستان کے ایک ملّا کے کام کو دیکھ کر پیدا ہوا تو کوئی دور از قیاس بات ہوسکتی ہی، میں نے فیضی کی تفسیر کے بعض مقامات کا مقابلہ محمود آفندی کی تفسیر سے کیا ہی، شاید دوسروں کو مجھ سے اختلاف ہو، لیکن اس مقابلہ سے مجھ پر تو یہی ظاہر ہوا کہ عموماً اظہار مطالب میں الفاظ کے ان ہی ذخیروں سے محمود آفندی نے بھی کام لیا ہی جن سے فیضی پہلے کام لے چکا تھا فرق دونوں میں اگر کچھ نظر آیا تو صرف اجمال اور تفصیل کا، فیضی نے جس مطلب کو دس سطروں میں مثلاً ادا کیا ہی، محمود آفندی نے اسی خیال کو مثلاً دو تین سطروں میں سمیٹ لیا ہی، اور اسی چیز نے دونوں کتابوں میں فرق پیدا کردیا ہی، ورنہ اگر محمود آفندی بھی اسی تفصیل سے کام لیتے تو دونوں کتابوں میں اس وقت شاید امتیاز مشکل ہو جاتا،

جن لوگوں کو بایزید یلدرم عثمانی ترکی بادشاہ اور تیمور کے تعلقات کا علم ہی اور جو عثمانی خانوادۂ شاہی اور تیموری خاندان کی موروثی چشمکوں اور رقابتوں سے واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تیموری دربار کے ایک ملّا کے کام کا جواب "اخوندروم[1]" کے دربار کے عالم کی طرف سے اگر دیا جائے تو یہ چنداں محل تعجب نہیں ہوسکتا۔

بہرحال سید محمود آفندی کی بے نقط تفسیر درر الاسرار کے باوجود پھر بھی اس قسم کی تفسیر

---

[1] مغل سلاطین ترک کو "اخوندروم" ہی کے لفظ سے یاد کرتے تھے اکبر نے اپنے امیر میرالزام بھی لگایا تھا کہ اندرونی طور پر اخوند روم سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہی۔ مجدد الف ثانی کے مقالہ میں خاکسار نے اس کا تذکرہ

کی اولیت کا سہرا ہندوستانی نظام تعلیم کے سر سے اُتارا نہیں جا سکتا، بلکہ اگر واقعہ یہی ہے کہ بایزید یلدرم کے وارثوں نے تیمور کے وارثوں کو اس طریقہ سے خاموش جواب دیا ہے تو یہ بات کہ فیضی کے کارنامے کے ساتھ بیرون ہند کے اسلامی ممالک نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، درست نہیں رہتا۔

خیر فیضی کی تفسیر سواطع تو گونہ ایک انسانی کمال کا اظہار ہے، گو ضمناً اس ذریعہ سے اس زبان کی عجیب و غریب حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ایک زندہ ثبوت مہیا ہو جاتا ہے جس میں خدا کا آخری پیغام کرہ زمین کی ساری نسلوں اور قوموں کے لیے نازل کیا گیا، اور رہتی دنیا تک اسی کو کافی و وافی قرار دیا گیا۔

اسی سلسلہ میں ہندوستانی نظام تعلیم کے ایک اور نتیجہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا میں نہیں جانتا کہ دنیا کی کسی ملک اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اور ان ممالک کی کسی زبان میں کسی دینی یا دنیوی علم یا فن کے مسائل کو اس طریقہ کے التزام کے ساتھ ادا کیا گیا ہو کہ فن کا ہر مسئلہ خود ہی اس مسئلہ کی مثال بھی ہو۔

لیکن عوام تو خیر کیا واقف ہو سکتے ہیں شرح مُلّا جامی کے پڑھنے والے طلبا ر کہیں کہیں اسی کتاب میں کافیہ کی شرح ہندی کا تذکرہ پاتے ہیں، اسی شرح ہندی کے

لہ حال میں ایک مضمون مولانا ابوالاسرار رمزی کے قلم سے مجلہ "ندائے حرم" میں شائع ہو رہا ہے، میں مولانا سے شخصاً واقف نہیں ہوں، لیکن ادھر چند دنوں سے اُنھوں نے اپنی شعریت کا استعمال جس پاک مقصد کے لیے شروع کیا ہے، اس کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، ان شاء اللہ مستقبل ان سے مستفید ہوگا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ کہنا یہ ہے کہ ندائے حرم کے اسی مضمون میں "گرامر آف لنگویج" نامی کتاب سے جو کسی نصرانی کی ہے آپ نے ایک بڑا اچھا فقرہ یہ نقل فرمایا ہے: "درحقیقت انسانی زبانوں میں یہ (عربی زبان) سب سے زیادہ قابل احتمال اور مالدار زبان ہے" اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ منجملہ اور دلائل کے عربی زبان کی مالداری کا ایک ثبوت ہندوستانی نظام تعلیم کا ایک نمایاں ثمرہ، فیضی کی تفسیر بھی ہے، بچھتر جزوں کی کتاب میں سارے جہان کی تفسیری معلومات کا غیر منقوطہ الفاظ میں ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ۱۲

مصنف ملک العلماؒ شہاب الدین دولت آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب الارشاد نامی علم نحو میں لکھی تھی، عجب کتاب، مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں۔

"ارشاد متن در علم نحو کہ تمثیل مسئلہ در ضمن تعبیر التزام کردہ وطرزے تازہ بر روئے کار آوردہ" ماثر ص ۱۸۹

یہ کتاب چھپ چکی ہے، لیکن اب نایاب ہے، غالباً کسی زمانہ میں درسی نصاب میں شریک تھی، محدث دہلوی نے اپنے حالات میں لکھا ہے، اپنے تعلیمی نصاب کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے۔

"از مختصرات نحو مثل کافیہ ولب وارشاد" (اخبار ص ۳۱۱)

اغلب یہی ہے کہ ارشاد سے مراد ملک العلماء کا یہی متن عجیب ہے۔

اس زمانہ کے علمی ماحول کی ایک نادر دلچسپ چیز جسے لوگوں نے شاید کم کیا، کچھ اہمیت نہ دی، وہ اس ملک کے ایک نہیں بلکہ متعدد اہل علم کا ایک عجب کارنامہ ہے۔

لہ ملک العلماء کا خطاب ان کو جونپور کی حکومت شرقیہ کی طرف سے ملا تھا، دلی میں پیدا ہوئے تھے، مولانا آزاد نے لکھا "تولدا و در دولت آباد دہلی است" معلوم ہوتا ہے دلی میں دولت آباد نامی کوئی محلا تھا، ملک العلماء مولانا خواجگی دہلوی کے شاگرد ہیں جو چراغ دہلوی کے اجلہ خلفا میں تھے، کہتے ہیں کہ مولانا خواجگی نے قاضی شہاب الدین کے متعلق طالب العلمی کے زمانہ میں فرمایا تھا: "پیش من طالب العلمے آمد کہ پوست او علم مغز او علم، استخوان او علم است" یہی اس زمانہ کی سند اور اس عہد کا ڈپلوما جو اساتذہ اپنے خاص خاص طلبہ کو دیا کرتے تھے، فیروز تغلق کے بعد دلی کے تخت پر عموماً نالائق جانشینوں کا قبضہ ہوتا تا آنکہ ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہوگیا، تیمور نے موقع کو خالی پاکر حملہ کردیا کہتے ہیں کہ اس حملہ کی اطلاع حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز صاحب گلبرگہ قبل از قبل دے چکے تھے جو دلی چھوڑ کر بہمنیوں کی حکومت میں جو دکن میں قائم تھی چلے آئے، کچھ لوگ جونپور کی حکومت کی طرف چلے گئے، قاضی شہاب الدین جونپور جانے والوں میں تھے، وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، قضا کا عہدہ سپرد ہوا اور ملک العلماء کا خطاب ملا، عربی زبان میں مختلف کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی زندگی ہی میں جیسا کہ محدث دہلوی نے لکھا ہے "درحیات او مشہور عالم گشتہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کا اس زمانہ میں کیسا نظم تھا۔ جونپور میں کتاب لکھی جاتی ہے۔ اور ترکستان میں جامی اس پر تنقید کرتے ہیں ان کی ایک تفسیر بحر مواج فارسی میں ہے، نظر سے گذری ہے بعضوں کا خیال ہے کہ شرح ملا جامی دراصل دولت آبادی کی شرح کا ایک نسخہ ہے لیکن میں نے خود ہندی کی شرح نہیں دیکھی ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا ۱۲۔

Marfat.com

شاید لوگوں تک یہ بات پہنچی ہو گی کہ ابن حاجب کی کافیہ سے ہندوستانی مولویوں نے اپنی عقیدت اس حد تک بڑھا دی تھی کہ بجائے علم نحو کے اُنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کافیہ نحو نہیں، بلکہ تصوف اور حقائق کی کتاب ہے[1]۔ صرف دعویٰ نہیں بلکہ عملاً کافیہ کے الفاظ کی شرح اسی طریقہ سے کی گئی ہے، مولانا آزاد نے صاحب سبع سنابل میر عبدالواحد بلگرامی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"از نوادر تصانیف او شرح کافیہ ابن حاجب است بطور حقائق (یعنی تصوف)

تا مبحث غیر منصرف"

یعنی غیر منصرف کی بحث تک کافیہ کے جتنے مسائل ہیں سب کو بجائے نحو کے معارف و حقائق کی تعبیر قرار دے کر میر صاحب نے اسی التزام کے ساتھ اس کی شرح لکھ بھی ڈالی، اور کچھ میر صاحب ہی اس کام میں منفرد نہیں ہیں، مولانا آزاد ہی لکھتے ہیں۔

"مخفی نماند کہ دو شرح بعبارت عربی و فارسی تا مبحث غیر منصرف بطور حقائق در نظر فقیر آمدہ"

پھر ان دونوں شرحوں، عربی و فارسی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نام شارح اول میر ابوالبقا است ظاہر معاصر میر باشد و نام شارح فارسی ملا موہن

بہاری ست کہ از میر متاخر ست" مآثر۔ ص ۳۲

میر ابوالبقا کا حال تو معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں، لیکن اتنا یقینی ہے کہ ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں، اور ملا موہن[2] بہاری کا ذکر تو پہلے بھی آچکا ہے کہ حضرت اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بھی اُستاد[2] تھے۔

---

[1] کتابوں کے ساتھ عقیدتمندی کبھی حد سے گذر جاتی ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مفتاح السعادۃ میں لکھا ہے، کان شمس الدین شیخ الربوۃ المعروف بابن ابی طالب یقول زعم بعضہم ان المقامات وکتاب کلیلہ ودمنۃ رموز فی الکیمیا۔ یعنی مقامات حریری اور کلیلہ و دمنہ دراصل کیمیا کی کتابیں ہیں۔ گلستاں کے متعلق بھی بعضوں کا یہی خیال ہے۔

[2] کچھ عجیب بات ہے کہ بہار باوجودیکہ دارالسلطنت سے کافی فاصلہ رکھتا تھا لیکن عموماً بادشاہی خاندان کے

Marfat.com

اپنی طالب العلمی کے دنوں میں کافیہ کی ان صوفیانہ شرحوں کا ذکر جب میں نے سُنا تھا، تو قدرتی طور پر جیسا کہ چاہیے یہ کچھ عجیب بے معنی سی بات معلوم ہوئی، اس وقت بجز ایک لاحاصل کام کے اس کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اور میں خیال کرتا ہوں کہ جو بھی یہ سنیگا، حیرت کے ساتھ اس کا بھی یہی خیال ہوگا کہ بیٹھے بٹھلائے ان لوگوں کو یہ کیا سوجھی؟ مگر دنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی، اس کا تجربہ مجھے شرح کے اسی طریقہ کے متعلق اُس وقت ہوا جب مدت ہوئی دار العلوم دیوبند کے قیام کے زمانہ میں دہلی آنا ہوا یہاں اُس زمانہ میں قرآن کی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا، اس ادارہ کے بعض طلبہ سے ملاقات ہوئی، گفتگو کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اس ادارہ میں قرآنِ مجید کو سیاسی نقطۂ نظر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۶) اساتذہ میں ہم بہار کے علماء کو پاتے ہیں، عالمگیر کے بعد شاہ عالم بادشاہ عالی گوہر کے اُستاذ مولوی سراج الدین صاحب کے متعلق تذکرہ صبح گلشن میں لکھا ہے۔

"متوطن فرید پور کہ بہ فاصلہ شانزدہ کروہ از عظیم آباد است وایں مولوی سراج الدین احمد شاہ عالم عالی گوہر بادشاہ دہلی را اُستاد بود"

زیب النساء کے اُستاد ملا سعید کے متعلق بھی مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مونگیر میں مدفون ہیں، مآثر الامراء میں سے   کہ سید محمد جونپوری مدعی مہدویت کے خلفاء کا مقدمہ جب حکومت دہلی کے سامنے پیش ہوا تو فیصلہ کے لیے ملا بدہ حقانی بہاری کے پاس مقدمہ بھیجا گیا، واللہ اعلم کیا بات تھی خود سید محمد جونپوری کو لوگ جونپور کا بتاتے ہیں، لیکن ان کے واقعات و حالات میں داناپور کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے جو پٹنہ کا گویا ایک محلہ ہے، ان کے تذکروں میں لکھا ہے کہ دعوئے مہدویت سے پہلے اسد العلماء کا خطاب ان کو داناپور کے علماء نے دیا تھا، خود سید صاحب کے صاحبزادے سید محمود جن کی قبر گجرات میں ہے سارا گجرات "بہاری پیر" کے نام یاد کرتا ہے، یہی چیز شک میں ڈالتی ہے کہ مہدویوں کا مقدمہ ملا بدہ حقانی کے پاس بہار کیا اسی تعلق سے بھیجا گیا کہ سید محمد صاحب کا حقیقی وطن بہار ہی تھا، شرقیوں کی حکومت جب جونپور میں قائم تھی تو مقبوضہ رقبہ کے تمام باشندوں کو لوگ جونپور ہی کی طرف منسوب کردیتے تھے، صاحب شمس بازغہ ملا محمود جونپوری کے نام سے مشہور ہیں، حالانکہ ان کا اصلی وطن دلید پور ضلع اعظم گڈھ تھا ہوسکتا ہے کہ سید محمد کو اسی بنیاد پر بجائے بہار کے جونپور کی طرف منسوب کردیا گیا ہو۔ ملا الہداد ہدایہ اور بزدوی کے مشہور شارح و محشی بھی عموماً الجونفوری کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن ملا جیوں نے اپنی تفسیرات احمدیہ کے دیباچہ میں غالباً ان ہی کو الشیخ الہداد البہاری کی نسبت سے ذکر کیا ہے (دیباچہ تفسیرات احمدیہ) ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ سید محمد جونپوری کے والد کا نام بھی بدہ بتایا جاتا ہے، اور

(بقیہ صفحہ ۲۹۸)

سے پڑھایا جاتا ہے، صاحب تفسیر یورپ کے موجودہ پارلیمانی نظام، ووٹنگ، حزب الاختلاف، ریزولیشن وغیرہ وغیرہ ساری باتیں قرآن سے ثابت کرتے ہیں، جوں ہی کہ یہ بات میں نے سُنی معاً میرا خیال کافیہ کی اُس صوفیانہ شرح کی طرف منتقل ہو گیا میں نے خود تو ان شرح کو دیکھا نہیں تھا، لیکن جن صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی، ان سے میں نے عرض کیا کہ اگر الفاظ سے معانی پیدا کرنے میں اتنی آزادی برتی جائیگی تو بقول اکبر مرحوم

"مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے"

ہر مدعا جو بھی پیش کیا جائے اپنی تفسیر سازی کے زور سے اس مدعا کو قرآن سے نکال کر دکھایا جانے لگے، تو لیجیے میں آپ کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ کافیہ نحو کی نہیں بلکہ "النبوات" کی کتاب ہے، میں نے معاً اسی کے ساتھ مطلب برآری کا کام شروع کر دیا بات تو لمبی تھی، لیکن کافیہ کے ابتدائی فقروں کا جو مطلب میں نے عرض کیا تھا، وہ غالباً یہ تھا "الکلمہ" سے مُراد النبی ہے، عقلاً تو اس لیے کہ کلمہ بھی ایک پوشیدہ مافی الضمیر حقیقت کو ظاہر کرتا ہے، یوں ہی حق تعالیٰ کی غیبی حقیقت کی ترجمانی نبی کرتے ہیں، اور نقلاً اس کی تائید قرآن ہی سے ہوتی ہے کہ مسیح علیہ السلام جو اللہ کے نبی تھے، ان کو کلمۃ منہ کہا گیا ہے، قرآن میں لاغلبن انا ورسلی بھی ہے اور ان کلمۃ اللہ ھی العلیاء بھی، معلوم ہوا کہ کلمۃ اللہ سے یہاں رسل ہی مُراد ہیں، جن کو غلبہ عطا کیا جاتا ہے، آگے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ عالم علوی سے طرف عالم سفلی کے نبی ملفوظ ہوتے ہیں یعنی پھینکے جاتے ہیں، ان کی حقیقی غرض چونکہ "مالکم من الٰہ غیرہٗ" اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کی دعوت ہی ہوتی ہے، اس لیے وضع لمعنی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۶ (۱) اسی زمانہ میں بہار میں ملا بدہ نامی ایک مشہور عالم گذرے ہیں یعنی شیخ محدث نے لکھا ہے کہ وہ فصوص الحکم اور وحدت الوجود اور صوفیانہ خیالات کے سخت مخالف تھے، اور یہ وہی ملا بدہ ہیں جن کی جوتیاں شیر شاہ سوری اپنے ہاتھ سے ملا صاحب کے سامنے سیدھی کیا کرتا تھا۔

(دیکھیے اخبار الاخیار، ذکر شیخ حسن طاہر، ص ۱۹۵)

Marfat.com

مفرد (بنایا گیا ایک مفرد معنی کے لیے) یعنی کلمۂ توحید اور معبود کی انفرادیت کا اعلان یہی نبی کا منصب حقیقی ہے جس کے لیے وہ بنائے جاتے ہیں، یوں ہی میں نے کہا کہ ایک قسم انبیاء کی تو وہ ہوتی ہے جن کی نبوت زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ ہے، سمو اور بلندی کی وجہ سے ان کو اسم کہہ سکتے ہیں، بعضوں کی نبوت کا تعلق کسی خاص قرن اور زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جیسے انبیاء سابقین اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نبوت کسی دوسرے نبی کی نبوت سے ملے بغیر مکمل نہیں ہوتی، جیسے حضرت ہارون کی نبوت کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے ہے پس یوں فعل، حرف اور اسم تینوں قسمیں النبی یعنی الکلمہ کی پیدا ہو جاتی ہیں، الی غیر ذلک من الخرافات۔ وہ صاحب میرا منہ تاکنے لگے، میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی بڑی ذہانت کی بات نہیں ہے اور نہ یہ تفسیر ہے، بلکہ تحریف ہے تغییر ہے۔[1]

واقعہ یہ ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کافیہ کی صوفیانہ شرح کی گوش زدہ بات ہی اس دن مجھے کام آگئی اس وقت سے علماءِ ہند کے اس عجیب و غریب طرز عمل کی بے حاصلی کا جو خیال تھا وہ بدل گیا۔

دل سوچنے لگا کہ ہندوستان کے علماء کو کسی کتاب کی ایسی شرح جس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہ ہو آخر سوجھی تو کیوں سوجھی، بیرون ہند کے علمی حلقوں میں اس نوعیت

[1] خیال آتا ہے کہ میں نے ان ہی صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کسی کلام میں مطلب کو یوں ہی باہر سے داخل کیا جا سکتا ہے تو پھر داغ مرحوم کا سب سے انحش ترین شعر

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو دا ہو شباب میں

کے متعلق دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تیمم کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے یعنی حور حوراء کی جمع ہے حوراء حواری سے مناسبت رکھتا ہے حواری ماہی گیر تھے، ماہی گیروں کو پانی سے ذہنی تعلق ہوتا ہے پس لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا یعنی پانی کا حشر تک سے یہ مراد ہے کہ آفتاب اتنا جھک جائے کہ سر سوا نیزہ کے قریب آجائے، عصر کا وقت جب اتنا تنگ ہو جائے تو پانی کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ شباب یعنی وقت کے بقا کا وقت جب جوانی کی طرح فانی نظر آ رہا ہو تو مٹی پر ہاتھ مار کر تیمم کر لینا چاہیے ۱۲

کی شرح کا بھی کوئی سُراغ نہیں ملتا کہ سمجھا جاتا، تقلید میں ایسا کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ تو سراسر ان کا اجتہاد اور ابتداعی طریقہ ہے جس کا کوئی نمونہ کم از کم میرے علم کی حد تک اس سے پہلے اسلامی ادبیات میں نہیں ملتا، اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال آتا تھا کہ میر ابوالبقار کے سوانح کی حقیقت کا صحیح علم اب تک حاصل نہ ہوسکا۔ باقی دو صاحب یعنی میر عبدالواحد بلگرامی کا شمار تو اپنے عہد کے ممتاز و سر برآوردہ بزرگوں میں ہے، ایک مدت تک ان کی کتاب سبع سنابل علم و معرفت کے اونچے حلقوں میں خاص قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مولانا آزاد نے براہِ راست شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ایک قصہ[1] نقل کرنے کے بعد یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

سنابل تصنیف او در جناب حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم مقبول اُفتادہ ۳۰

اکبر جیسا بدعقیدہ آدمی بھی میر صاحب سے متاثر ہوتا تھا، پانسو بیگہ زمین بطور جاگیر بلگرام میں میر صاحب کو اکبر ہی نے عطا کی تھی اور مُلا موہن بہاری کی عظمت و جلالت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت نے ہندی اسلام کو وہ فرزند سعید عطا کیا جس کا نام محیی الملۃ والدین اورنگ زیب عالمگیر رحمہ ہی، آج اس ملک میں مسلمانوں کا وجود مختلف وجوہ سے اسی کی حمیت دینی، اور حق پژوہی کی رہینِ منت ہے[2]۔

پھر کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان فاضلوں کا واقعی یہ خیال تھا کہ ابن خاجب

---

[1] خلاصہ اس قصہ کا یہ ہے کہ شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ منورہ میں خواب کے اندر ذات ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، اس مجلس میں ایک شخص کو دیکھا کہ "حضرت باو لب تبسم شیریں کردہ حرفہا می زنند و التفات تمام دارند" دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ میر عبدالواحد بلگرامی ہیں اکتاب سبع سنابل ان کی مقبول ہوئی ہے، میر صاحب کی عمر سو سال سے متجاوز تھی کہتے ہیں کہ یکے از کفار جینان بر دست حضرت میر بدولت اسلام مشرف اندوز شد" ماثر۔ ص ۳۱۔

[2] یہ واقعہ ہے کہ اکبر اور داراشکوہ کے ذریعہ سے اسلام کا حشر قریب تھا کہ اس برہمن کدہ میں وہی ہو جائے جو بدھ مت کے ساتھ حادثہ پیش آیا لیکن حضرت مجدد کی روحانی اور اورنگ زیب کی سیاسی قوت نے اس قیامت کو برپا ہونے سے روک دیا اور انشاء اللہ خدا کی غیبی تائیدوں کا یہ سلسلہ بند نہ ہوگا ۱۲

Marfat.com

نے کافیہ میں بجائے نحوی مسائل کے صوفیانہ حقائق و معارف بیان کیے ہیں، اگر یہ بات نہ تھی، بلکہ اُنھوں نے اپنی طرف سے کافیہ کے الفاظ میں صوفیانہ خیالات کے بھرنے کی کوشش کی تھی تو سوچنے کی بات ہی کہ اس کا حاصل کیا ہو سکتا ہی، ان بزرگوں کو حقائق و معارف ہی کے مسائل بیان کرنے تھے تو اسے کافیہ کی شرح بنائے بغیر یوں بھی لکھ سکتے تھے، یا کم از کم تصوف کی بیسیوں کتابیں سیکڑوں متون مل سکتے تھے، ان ہی کو بہانہ بنا کر دل کا ارمان نکالتے، یہ بے جوڑ انمیل رشتہ کافیہ اور تصوف میں قائم کرنے کی کیا حاجت تھی؟

واللہ اعلم کوئی تصریحی شہادت تو اس باب میں مجھے نہیں ملی ہی، لیکن دلی کا جو قصہ میں نے سُنایا، اسی قصہ کی بنیاد پر میرا ذہن ادھر جاتا ہی کہ شاید ان بزرگوں پر بھی کوئی اس قسم کی اُفتاد پڑی تھی جس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ و رسول کے الفاظ کو آڑ بنا کر جو لوگ اپنے خود تراشیدہ دماغی پیداواروں کو دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں، اور اسی کو اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے ہیں کہ جس لفظ سے جس معنی اور جس مطلب کو چاہوں لوگوں کو نچوڑ کر بتا سکتا ہوں، گویا ایک قسم کا جادو کرتے ہیں، گائے کے تھن سے عرق انار اور انار کے پھل سے گائے کا دودھ نچوڑتے ہیں۔

دل سوچتا تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک کے متعلق تو نہیں کہتا لیکن ہندستان کا علمی دماغ موجودہ زمانے سے پہلے تو کبھی اس آفت میں مبتلا نہیں ہوا تھا جس کا سانحہ حالی پچاس سال یا یوں کہیے کہ مغرب زدگی کے آسیب میں مبتلا ہوئے اور یورپ کی علمی ایکاڈ سے مرعوب ہونے کے بعد شکار ہوئی، قرآن سے ثابت کیا گیا کہ زندہ مستقل ہستیوں کا نہیں بلکہ عناصر کی عام قوتوں کا نام ملائکہ ہی، معجزہ کا ظہور نا ممکن ہی مسلمانوں کے نزدیک جنت اور دوزخ کا جو مطلب بارہ تیرہ سو سال سے سمجھا جاتا ہی، قرآن کی رو سے وہ قطعاً غلط ہی اور ان تمام قرآنی الفاظ سے وہی مراد ہی، جو یورپ ان مسائل کی بابت اپنا خیال رکھتا ہی

Marfat.com

خدا کا پیغام لے کر جبریل نامی فرشتہ کسی انسان پر نازل نہیں ہو سکتا۔ عقل کا بھی یہی تقاضا ہے، اور قرآن بھی اسی کا مدعی ہے

انیسویں صدی کی یہی چیز اس زمانہ میں اور آگے بڑھی، تا اینکہ سرزمین ہند کے پیدا ہونے والوں ہی میں سے بعض صاحبوں نے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ تمہارے قرآن میں ہمارا ذکر موجود تھا اور تم لوگ اب تک اس کو عرب کے رسول محمد نامی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر منطبق کرتے رہے، خاتم النبیین کے دعویٰ کو جس قرآن نے سب سے پہلے دنیا کے آگے پیش کیا تھا، عرب و عجم کے مسلمان اس کے جو معنی سمجھتے تھے اسی معنی کو "خاتم النبیین" کے الفاظ سے پونچھ کر صاف کیا گیا، اور اپنی طرف سے خود ایک مستقل معنی چھیل چھال کر بنائے گئے، اور اسی خود ساختہ معنی پر "خاتم النبیین" کا قالب کس دیا گیا۔

بدتمیزی کا یہی طوفان بالآخر بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ کر رہا کہ دنیا کی وہ ساری قومیں جو قرآن کو اللہ کا کلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتی ہیں، ثابت کیا گیا اور قرآنی آیات ہی سے ثابت کیا گیا کہ یہ سب کے سب کافر ہیں، جہنمی ہیں، لیکن قرآن خداوند تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے اور محمد اللہ کے سچے رسول ہیں، جنہیں ان دونوں باتوں سے انکار اور قطعاً انکار ہے ثابت کیا گیا، قرآن کے نصوص اور آیات ہی سے ثابت کیا گیا کہ یہی لوگ مومن اور مسلم ہیں، خدا کی رضامندی ان ہی کے لیے ہے، جنت کے وارث یہی لوگ ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ تماشے جن شکلوں میں بھی پیش ہو رہے ہوں، یہ اسی زمانہ کی بات ہے جب تعلیم کے نظام کو دینی اور دنیوی دو حصوں میں بانٹ دیا گیا، اور دماغ کی بیداری کے ساتھ دل کی جانب سے صرف غفلت ہی نہیں برتی گئی، بلکہ اس کو غافل بنانے اور سلا دینے کی جو ممکنہ تدبیریں تھیں وہ اختیار کی گئیں۔

لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں نے تو اس ملک کو وطن بنانے کے بعد تعلیم کا

Marfat.com

جو خاکہ تیار کیا گیا تھا، اس میں نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ علم کی طغیانی لے سہ پر

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ۔ تیرے رب کی طرف رجعت (اس کا علاج ہے)

کی ترشی کا یہ نچوڑ نا بھی تعلیم کا قریب قریب ایک لازمی جز قرار دیا گیا تھا تاکہ دماغ کی لگام ہمیشہ دل کے ہاتھوں میں یا عقل کی باگ ایمان کے پنجوں میں دبی رہے شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جن دنوں میں اپنی دماغی بیداری کی تیاری میں مدرسوں میں کر رہا تھا، تو بار بار ان کے والد شیخ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ متنبہ کرتے تھے کہ

"یاں! تا ملائے خشک وناہموار نہ باشی" صد ۱۱ اخبار

ملائیت (تعلیم یافتگی) کی یہ خشکی جس کا لازمی نتیجہ ناہمواری ہے ہندوستان کے مسلمان علم کے ان طغیانی آثار سے واقف تھے چونکہ اس ملک میں اسلام جب آیا تو دین کا سارا ذخیرہ بحمد اللہ منقح ہو چکا تھا، حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی، فقہ کے اصول منضبط ہو چکے تھے یہاں کے اہل علم کو یہ ساری چیزیں پکی پکائی حالت میں ملی تھیں اس لئے مذہب کے متعلق صرف عمل کا کام رہ گیا تھا، یا زیادہ سے زیادہ حوادث یومیہ جو لامحدود ہیں، ان کے متعلق فقہی کلیات کی روشنی میں حکم پیدا کرنا، آپ دیکھیں گے، کہ ایک مدت تک اس وقت تک جب تک مذہب کو دماغی بازی گاہ کی گیند کی حیثیت سے استعمال کرنے کا لوگوں پر دورہ نہیں پڑا تھا خاموشی کے ساتھ مذہب جن زندہ کمالات اور ارتقائی زینوں کے طے کرنے کا ذریعہ ہے ان ہی مقاصد کے حصول تک مذہب کا استعمال محدود رہا اس وقت تک اس ملک کے مذہبی دائروں میں نہ فساد تھا نہ جھگڑے ایک روح پرور سکون کا عالم تھا جو طاری تھا۔

تقریباً صدیوں اس ملک کے مسلمانوں میں شیعہ اور سُنّی یا حنفی و شافعی کے اختلافات بھی نہیں پائے جاتے تھے، سب کا ایک مسلک ایک مشرب تھا، اسی لئے سارا زور جس طرف ڈھلک گیا تھا وہ عمل اور اخلاص کا زور تھا جو جیسے تھے تو اسی کے

مخلیں تھیں تو اسی کی کتابیں لکھیں جاتی تھیں تو اسی پر لوگوں کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ بہ نسبت دوسرے علوم وفنون کے ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کے سلسلہ میں تصوف کی کتابیں زیادہ اور بہت زیادہ کیوں نظر آتی ہیں، بے سوچے سمجھے جواب دینے والے خیال کرلیتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو اس جواب کی جرأت بھی کر گذرتے ہیں کہ ان کو آتا ہی کیا تھا، تصوف کے چند رٹے رٹائے مقررہ مسائل تھے، بس ان ہی کو یہ تختہ مشق بنائے ہوئے تھے۔

ہندوستانی علماء کو آتا کیا تھا؟ اس کا جواب تو بحمد اللہ گذر چکا اور جتنا لکھا گیا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو نہیں لکھا گیا ہے، اور اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ تصوف کی کتابوں کی کثرت کی وجہ یہی تھی کہ اس ملک کے پر اسی کی دھن سوار تھی۔

ہمیشہ رسد طلب کی تابع رہی ہے اسی پرسکون فضائیں جو اکبری عہد سے پہلے اس ملک کے دینی اور علمی دائروں پر چھائی ہوئی تھی، مسلمانوں کی ساری توانائیاں اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

افسوس کہ بات بہت طویل ہوجائیگی، ورنہ بتاتا کہ اخلاص وعمل پر ابھارنے والا جو تیز اور سریع النفوذ ادب نظم کے سوا نثر میں ہندوستانی مسلمانوں کے قلم نے تیار کیا ہے، علی الخصوص حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بہاری، حضرت شاہ نور عالم پنڈوی بنگالی، سید محمد بن جعفر، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز وغیرہم حضرات سلف میں اور اکبری فتنہ کے بعد شیخ مجدد و سرہندی، شاہ ولی اللہ الدہلوی، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل رحمہم اللہ اجمعین کی کتابیں تیر ونشتر کے جن خزانوں سے لبریز ہیں، مجھ پر شاید ہندوستان کی بیجا پاسداری کا الزام لگا دیا جائیگا، ورنہ کہہ سکتا تھا کہ ان بزرگوں نے اس خاص فن میں جو کچھ لکھا ہے دوسرے اسلامی ممالک میں ان کی نظریں

Marfat.com

مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہیں[1]

مذہبی سکون کے اس زمانہ میں آپ چاہتے ہیں کہ ایامِ فتنہ کی وہ کتابیں ملیں جن سے صدی ڈیڑھ صدی کے اندر اندر ہندوستان کو کیا بتاؤں کہ کیا ہو گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ محکومیت کے اس قلیل عرصہ میں خلافیات کا جو لٹریچر ہندوستان نے تیار کر لیا ہے، حاکمیت کے قرونِ متطاولہ میں اس طرز کا رسالہ نکالنا بھی مشکل ہے، اکبر کے عہد میں سُنتے ہیں، جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے، مُلا عبد النبی گنگوہی اور مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری میں کچھ مذہبی جھگڑے چلتے تھے، لیکن وہ اکبر کا زمانہ تھا، اکبر کے زمانہ میں جو

[1] پچھلے بزرگوں خصوصاً حضرت مجدد، شاہ ولی اللہ، مولانا اسمٰعیل کے متعلق شاید عام لوگوں کو بھی واقفیت ہو، اگرچہ مولانا اسمٰعیل کی عبقات نامی کتاب باوجود مطبوع ہونے کے لوگوں تک نہ پہنچ سکی، اس لیے اس کتاب کی منزلت کا اندازہ نہ ہو سکا، میرا تو دعویٰ ہے کہ فنِ تصوف کو پہلی دفعہ اس کتاب میں فن کی صورت بخشی گئی ہے، باقی سلف کے جن بزرگوں کا میں نے نام لیا ہے، کچھ نہیں تو اخبار الاخیار محدث دہلوی میں ان کے کلام کے چند نمونے جو درج ہیں وہی دیکھ لیے جائیں، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاریؒ کے متعلق ایک واقعہ بیان قابلِ ذکر ہے، جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر فلسفہ مولانا عبد الباری ندوی جو اسلامی و مشرقی فلسفہ کے سوا اس وقت مغربی فلسفہ کے بھی مستند علما میں ہیں، مدت تک مغربی فلسفہ کی کتابیں ایم اے تک جامعہ عثمانیہ میں آپ پڑھاتے رہے ہیں، جدید فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے اور مستقل کتابیں آپ نے جو لکھی ہیں اُن کی تعداد نصف درجن کے شاید قریب ہو، جو دار الترجمہ سرکار عالی و دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہو چکی ہیں، بہر حال مولانا عبد الباری صاحب کو ایک دن میں نے شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکاتیب پڑھنے کے لیے دیے، پڑھنے کے بعد کتاب جب مجھے اُنھوں نے واپس کی تو دیکھا کہ بیسیوں جگہ سُرخ پنسل کے نشانات لگے ہوئے ہیں، میں نے عرض کیا یہ کیا ہیں، فرمایا کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کے کلام میں سطر دو سطر نہیں صفحے کے صفحے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا موجودہ زمانے کے مغربی مفکرین کی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہے، کانٹ ہیگل، برکلے، ہیوم، از قبیل فلاسفۂ جدید کے نظریات جن پر موجودہ فلسفہ کو ناز ہے شاہ صاحب کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں، میں نے بطور یادگار کے اس نسخہ کو اپنے کتب خانہ کے تبرکات میں شریک کر لیا ہے، شاہ شرف الدین یحییٰ منیری حضرت سلطان المشائخ کے معاصرین میں ہیں آپ کی مستقل سوانح عمری سیرۃ الشرف کے نام سے مولوی ضمیر الدین احمد مرحوم بہاری سابق چیف سکرٹری بیگم صاحبہ بھوپال نے بڑی جانکاہی سے مرتب کر کے شائع کر دی ہے، غالباً صوفیۂ ہند کے حالات میں عصری رنگ میں سیرۃ الشرف پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریزی خواں طبقہ کے فاضل نے مرتب کیا، بعض مکاتیب کا حضرت کے انگریزی میں غالباً مسز سروجنی نائیڈو نے بھی ترجمہ کیا ہے، مزار پُر انوار قصبہ بہار شریف میں ہے۔

Marfat.com

کچھ بھی نہ ہوتا کم تھا، اس سے پہلے اور جب تک حکومتِ اسلامیہ کا شباب رہا نہ اس کے بعد ہم شقاقیات بعیدہ کی کوئی کتاب اس طرز کی پاتے ہیں، کچھ نوک جھونک اس زمانہ میں اگر ہو بھی جاتی تھی تو عقلی مسائل میں مولانا آزاد نے ملا محب اللہ بہاری صاحب[1] سلم و مسلم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ان کا اور مولانا حافظ امان اللہ بنارسی کا اجتماع اتفاقاً لکھنؤ میں ہو گیا، یہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا عہد تھا، ملا محب اللہ لکھنو کے قاضی تھے اور حافظ صاحب صدر الصدور، دونوں ایک ہی اُستاد مولانا قطب الدین شمس آبادی کے شاگرد تھے اسی معاصرت نے دونوں میں مقابلہ کا بازار کچھ دن کے لیے گرم رکھا تھا، مولانا آزاد لکھتے ہیں

"باہم طریق مباحثہ علمی سلوک می داشتند" ص ۲۱۲

مگر یہ "مباحثہ علمی" تھا جو دونوں میں جاری تھا "مکافرہ جہلی" جس کے شکار عہد حاضر کے علماء ہیں اس سے تو اس چھ سو سال میں غریب ہندوستان، جہاں تک میرا خیال ہے واقف بھی نہ تھا، عجب تماشا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دونوں کو دعویٰ ہے، اور ہر اُمتی دوسرے کی گردن پکڑ کر اسلام سے اس کو خارج کر رہا ہے۔

بہر حال ہم نے تو جہاں تک غور کیا ہے. مذہب اور مذہبی علوم کو ہمارے بزرگوں نے صرف عمل اور اخلاص کے لیے استعمال کیا تھا، دماغی ورزشوں کے لیے عقلی اور ادبی

---

[1] ملا محب اللہ بہاری سے تو خیر کون ناواقف ہے، بقول مولانا شبلی مرحوم جس نے ڈھائی صدی تک اسلامی نصاب کی نصف کتابوں کو اپنی سلم و مسلّم کے نیچے دبائے رکھا، باقی حافظ امان اللہ بنارسی سے اب لوگ غالباً کم واقف ہیں، اپنے وقت میں مشاہیر مدرسین میں ان کا شمار تھا، بیضاوی عضدی تلویح شرح مواقف شرح حکمت العین، شرح عقائد جلالی، تقریباً اکثر درسی کتابوں پر ان کے قیمتی حواشی ہیں، محکم الاصول فقہ میں ایک مستقل متن ان کا بھی ہے۔ مسلّم میں بھی ملا محب اللہ نے محکم پر جرح بھی کی ہیں، حافظ صاحب نے برادر ملا محمود جونپوری کے درمیان مسئلہ ؟ پر محاکمہ بھی لکھا ہے۔ دوانی کے قدیمہ و جدیدہ پر بھی ان کے حواشی ہیں رشیدیہ مناظرہ کی کتاب پر تنقید بھی لکھی ہے

Marfat.com

علوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اگر سعدی وحافظ اپنے ادبی تحفے طوطیانِ ہند کی شکرشکنی کے لیے بھیج رہے تھے، تو کیا اسی زمانہ میں ہندستان خسرو اور حسن کی شکر ریزیوں سے ایران اور ترکستان کو شیریں کام نہیں بنا رہا تھا، امیر خسرو اور امیر حسن علاؒ (مریدان سلطان المشائخ) کا جب انتقال ہوا تو مولانا جامی کے قلم سے بے اختیار یہ اشعار نکلے۔

اں دو طوطی کہ بہ نوخیزی شاں　　بود در ہند شکر ریزی شاں

عاقبت سحرۂ افلاک شدند　　خامشاں قفس خاک شدند　　ابداؔدی ۲۰۱

اور ان ہی دونوں پر کیا موقوف ہے، بیدل اور غالب جیسے شعرا جن کا سکہ سارے فارسی سمجھنے والے علاقوں میں رواں ہوا، ہندوستان میں ان کی کیا کمی ہے، میر جرجانی اور علامہ تفتازانی اگر اپنے عقلی اور ذہنی کمالات سے ہمیں سرفراز فرما رہے تھے تو سیالکوٹی، جونپوری، خیرآبادی، دولت آبادی کیا اس احسان کا معاوضہ نہیں ادا کر رہے تھے۔

بہرحال مجھے یہ عرض کرنا ہے، جب نصوص قرآنی اور احادیث نبوی کے ساتھ ہندوستان میں اس بازی گری کا رواج نہ تھا جس کا تماشا ہم آج کر رہے ہیں کہ ہر وہ نظریہ ہر وہ اصول حیات جو یورپ سوچتا ہے، قرآنی آیات میں اس کی گنجائش نکل آتی ہے، جب تک سرمایہ داری کا زور رہا تو قرآن ہی سے ثابت کیا جا رہا تھا کہ وراثت کا قانون قانون نہیں بلکہ مالک جائداد کے اختیاری فعل کے لیے ایک نیک مشورہ ہے، اور جب اشتمالیت اور اشتراکیت کے ڈنکے پر یورپ نے چوٹ لگائی تو ہر طرف سے قرآنی آیتیں تلاوت کرتے ہوئے لوگ باہر نکل آئے کہ اشتراکیت کے سوا تو قرآن نے کسی

لہ تعمیرات، نباتیات، فلاحت، پارچہ بافی، طباخی اور سب سے زیادہ فنون حرب میں ہندوستانی مسلمانوں کے کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس کی نظیر دوسرے ممالک میں مشکل سے ملتی ہے۔ ۱۲

Marfat.com

بات کی تعلیم ہی نہیں دی ہے۔

میں اس جستجو میں حیران تھا کہ کانیہ کی یہ شرحیں اگر اسی طرز عمل کے جواب میں لکھی گئی ہیں، تو اس وقت جب کہ اس ملک میں یہ سوال ہی نہیں اُٹھا تھا، جواب کی کیا حاجت تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے باہر بعض دماغوں میں اس قسم کی کریزگی کے جراثیم ضرور پیدا ہوئے تھے، اور خصوصاً فرقہ باطنیہ جنہیں قرامطہ بھی کہتے ہیں، ان کے عقیدہ کی تو بنیاد ہی یہی تھی کہ قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے، وہی سمجھنا اور اسی کے مطابق عمل کرنا بے ایمانی ہے بلکہ ہم جو کچھ قرآن سے سمجھنا چاہتے ہیں، اُس پر ایمان لانا بھی عین ایمان ہے[1]، لیکن ظاہر ہے کہ قرامطہ کو ہندوستان کے اس دور سے کوئی تعلق نہیں ہے جس

---

[1] اہل علم کے لیے یہاں ایک مسئلہ پر تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ اسلام کے متعلق ایک چیز کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے یعنی کسی قسم کے اشعار ہوں ان میں محو معشوق ہی کا ذکر کیوں نہ ہو لیکن اس شعر سے بھی وہ خیر نکالنے کے عادی ہو گئے تھے، اور یہ ایک عام رواج عربی اور فارسی دونوں قسم کی شاعری میں پایا جاتا ہے، اسی مشق نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ بعض دفعہ بازار کے صدا لگانے والوں کی صدا پر بھی ان کو حال آجاتا تھا مشہور ہے کہ بغداد کے بازار میں ککڑی بیچنے والا ککڑیاں بیچتے ہوئے یہ صدا لگا رہا تھا "عشر خیار بدانق" دس ککڑیاں ایک پیسہ میں، عربی میں خیار ککڑی کو بھی کہتے ہیں اور نیک لوگوں کو بھی، حضرت جنید یا شبلی بھی اُدھر سے گذر رہے تھے، کان میں یہی صدا آئی، چیخ ماری اور بیہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے پوچھا گیا کہ کیا ہو گیا تھا، بولے کہ بھائی خیال گذرا کہ جب ایک پیسہ میں دس نیک بکتے ہیں تو بروں کا کیا حال ہو گا، بس اسی کا خیال آ گیا طبیعت بے قابو ہو گئی، اب ظاہر ہے کہ ان کی غرض یہ قطعاً نہ تھی کہ بیچنے والے کا مقصد بجائے ککڑیوں کے نیک لوگ ہیں، بلکہ ان کا ذہن نیک لوگوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا، گو ایسا کم ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بعض قرآنی آیات یا احادیث سے ان بزرگوں کا ذہن کسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور زبان یا قلم سے کبھی وہ نکل بھی گیا ہے لیکن حاشا و کلا ان بزرگوں کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ یا اللہ کے رسول کی بھی یہی غرض ہے، اپنے اس ذہنی انتقال کا اُنہوں نے نام بھی رکھ دیا ہے یعنی اسکو اعتبار اور "الاشارہ" کہتے ہیں، لوگوں کو ان کی اس اصطلاح یا طرز عمل سے ناواقفیت کی وجہ سے کبھی کبھی ان پر بھی فرقہ باطنیہ کی جیسی باتوں کا شک گذرتا ہے لیکن جب وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ اسے مراد حق نہیں کہتے تو پھر باطنیوں کے طریقۂ کار اور ان کے طریقۂ عمل میں آسمان و زمین کا فرق پیدا ہو جاتا ہے (باقی بر صفحہ ۱۹۹)

کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، ان کا ایک مخذول و مذموم طائفہ کہیں سے بھٹک بھٹکا کر ملتان یا سندھ کے بعض علاقوں میں اگر آ بھی گیا تھا، تو غزنوی کی تلوار ان کا صفایا اس زمانہ سے بہت پہلے کر چکی تھی جب سلطان غوری رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت ہندوستان کو اسلام کا وطن بنایا گیا تھا، بہر حال کافیہ کی ان عجیب و غریب شرحوں کے متعلق کوئی خاص بات میری سمجھ میں مدتوں نہ آئی۔

لیکن کچھ دن بعد جب اس پر نظر پڑی کہ جس زمانہ میں کافیہ کے ساتھ یہ کارروائی کی گئی، یعنی مغلوں کے عہد میں یہ شرحیں لکھی گئی ہیں اور مغلوں سے پہلے دلّی میں جو لودیوں کی حکومت قائم تھی، کہیں ذکر آ چکا ہے کہ ان ہی لودیوں میں ایک بڑا علم دوست معارف پژوہ بادشاہ سکندر لودی بھی گذرا ہے، اسی سکندر لودی کے زمانہ میں ایک صاحب جن کا نام شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری ہے، یہ شیخ محدث دہلوی کا بیان ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ان بخاری صاحب کا عرف عجیب بتایا گیا ہے یعنی

"عبدالوہاب بخاری مشہور بہ مچھی روٹی" (ملفوظات عزیزیہ ص ۹۷)

شاہ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو دلّی والے مچھی روٹی کیوں کہتے تھے، بہ ظاہر یہ کچھ مجذوب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں، خود ان کا یہ عرف "مچھی روٹی" گونہ ان کی بہت مجذوبی کی دلیل ہے، ان کا مولد و منشا، ملتان تھا، ملتان ہی سے یہ متاہل ہونے کے بعد ایک خاص جذبہ کے تحت

"براہ خشکی بزیارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بشافت" اخبار ص ۲۱۵

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۸) باطنیوں کی کتابیں عام طور سے نہیں ملتیں لیکن بازاروں میں ایک تفسیر شیخ اکبر محی الدین بن عربی کے نام سے مشہور ہے، جو در اصل اسی قسم کے ایک گمراہ کاشانی نامی کی کتاب ہے، نمونہ دیکھنا ہو تو اسے دیکھ سکتے ہیں، ہر آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے ۱۲۔

Marfat.com

اور ایک دفعہ نہیں متعدد بار ممالک اسلامیہ کی سیر کی اور حجاز آتے جاتے رہے، آخر میں ملتان چھوڑ کر دلی آ گئے، سکندر لودی بادشاہ اہل دین و علم کا قدردان تو تھا ہی، ان کے ساتھ بھی خاص حسن سلوک سے پیش آیا، ان کے پیر شیخ عبد اللہ تھے، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ پیر کے ساتھ حبِ مفرط رکھتے تھے، شیخ محدث کے الفاظ ہیں۔

"او را با شاہ عبد اللہ نسبت محبت و نیاز و طلب و استرشاد چنداں می بود کہ انچہ می گویند کہ فنا فی الشیخ می باشد، ایں چنیں خواہد بود نسبت" ص ۲۱۵

اس سے بھی افتاد مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبد الوہاب بخاری صاحب نے قرآن کی ایک عجیب و غریب تفسیر عربی میں لکھ ڈالی، عجب تفسیر، شیخ محدث فرماتے ہیں۔

"اکثر قرآن بلکہ تمام قرآن را ارجاع بہ نعت پیغمبر و ذکر او کردہ صلی اللہ علیہ وسلم"

یعنی الحمد سے لے کر والناس تک قرآن اور قرآن کی ہر آیت سے آپ نے یہ معنی پیدا کیا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور تعریف بیان کی گئی ہے، صرف دعویٰ ہوتا تو غنیمت تھا، پوری تفسیر اسی دعوے کے اثبات میں لکھ بھی ڈالی، اس قسم کی تفسیر میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ظاہر ہے شیخ محدث نے بھی لکھا ہے۔

"غالباً وقوع آں در غلبہ حال و استغراق وقت بودہ است"

ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی زندگی چونکہ مخلصوں کی زندگی سمجھی جاتی تھی، اور یہی معلوم بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے کہ جذب اور استغراق میں یہ کام اُنھوں نے کیا۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام میں ان کے اس کام نے بڑی اہمیت حاصل کی ہو گی، سارا قرآن پیغمبر کی نعت ہے، عام مسلمانوں کے لیے بہ ظاہر ایک بڑا دلکش فقرہ ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندستان کے سوا قرآن کی ایسی تفسیر کہیں اور لکھی گئی ہو، کشف القرآن

وغیرہ میں بعض ایسی الٹی پلٹی تفسیروں کا ذکر تو کیا گیا ہے، جس میں من ملنے مطالب قرآنی الفاظ میں بھرے گئے ہیں، بعض تو اس میں ناگفتہ بہ ہیں، لیکن غنیمت ہے کہ ہمارا ہندوستان اس زمانہ میں اگر بہکا بھی تو کسی بُری بات کی طرف نہیں بہکا، اگرچہ بہکنے کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا، اور اگر قرآنی تعبیرات میں اس قسم کے کھینچ تان کی اجازت دیدی جائے تو جہاں کسی اچھے رجحان رکھنے والے آدمی نے سارے قرآن کو پیغمبر کی نعت بنا دیا، ہوسکتا ہے کہ شیطان کی کوئی ذریت سارے قرآن کو شیطان کی مدح ثابت کرنے پر آمادہ ہو جائے، اور ہو جائے کیا معنی! اس زمانہ میں دنیا جہان کے سارے مسلمانوں کو قرآن ہی کے رو سے کافر، اور کافروں کو مومن ومسلم جب ثابت کیا جاچکا ہے تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں اگر کوئی صاحب شیطانی مدح کے اثبات کی ہمت نہ کرگذریں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ لودیوں کے بعد مغلی حکومت جب قائم ہوئی اور اکبری زیغ کا عہد شروع ہوا، اس وقت اشرار نے بیچارے حاجی مچھی روٹی صاحب کے اس طریقہ کار سے بھی ممکن ہے نفع اٹھایا ہو، غالباً یہ تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اکبر کو تناسخ کے مسئلہ پر سخت اصرار تھا، جس کا تفصیلی ذکر حضرت مجدد الف ثانی والے مقالہ میں میں نے کیا ہے، اب کتاب کا تو نام صحیح طور پر اس وقت یاد نہیں، لیکن اسی تناسخ کے مسئلہ کو قرآن کی آیت سے اس میں ثابت کیا گیا تھا، بات ذرا فحش سی ہے لیکن عبرۃً لاولی الابصار نقل کفر، کفر نباشد کے طور پر ذکر کرتا ہوں، سورہ یٰسین کی آیت

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّورِ فَاِذَا ھُم مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ

پھر جب "الصور" میں پھونکا جائیگا، تو اچانک وے قبروں سے اپنے رب کی طرف قطار در قطار نکلتے چلے آئینگے۔

صور کے معنی سینگ کے ہیں، صوری مشابہت کی وجہ سے صور سے مردوں کے توالد کے واسطہ کو لے کر آگے مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اس میں نفخ کی حالت پیدا ہوتی ہے

تواسی سے نکل کر الاجداث یعنی رحم کی قبروں سے گذرتے ہوئے لوگ اپنے رب کے زیر پرورش بننے کے لیے قطار در قطار نکلتے چلے آتے ہیں، اور یہی صورت تناسخ میں ہیں پیش آتی ہے کہ مرنے کے بعد لوگ اسی طریقہ سے دوسرا جنم لیتے رہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں ڈاڑھی منڈانے کا زور ہوا، کسی نے فقہی دلیل یہ نکالی کہ کما یفعلہ عصاۃ العراق کو قضاۃ العراق بنا کر پیش کیا گیا، طبی نکتہ پیدا کیا گیا کہ "ریش از خصیتین آب می خورد" اس لیے اس چیز کا رکھنا کیا ضرور ہے اور شاید اسی زمانہ کا استدلال ہے کہ حدیثوں میں واعفوا اللحی کے الفاظ ہیں، عفو کے معنی بڑھانا اور مٹانا دونوں آئے ہیں، 'عفت الدیار محلہا ومقامہا' میں عفو سے مٹنا ہی مراد ہے، قرینہ یہ قائم کیا گیا کہ اس حدیث میں اور نو باتیں مثلاً ناخن کٹوانا، بغل کے بال کا ازالہ، اور مونچھوں کا کٹانا ان سب کا تعلق ازالہ سے ہے، پھر ایک چیز کا تعلق ابقاء سے کیوں ہو۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طبقۃً بعد طبقۃٍ جس آیت یا جس حدیث کا مطلب مسلمان عہد صحابہ سے اس وقت تک منتقل کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں، اگر اس سے قطع نظر کر کے جس مطلب کو جو چاہے قرآنی آیات واحادیث پر چسپاں کرتا چلا جائے۔ اگر اس کی عام آزادی لوگوں کو دیدی جائے جیسا کہ اس زمانہ میں اس کی عام وبا پھیلی ہوئی ہے، تو اس ذریعہ سے بدیہی سے بدیہی مسائل کو بھی نظری بنا لیا جا سکتا ہے، ڈاڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کترانا صرف سنت نہیں بلکہ اسلام کا ایک متواتر اور متوارث شعار ہے جسے غیر مسلمان بھی جانتے ہیں لیکن یاروں کے جی میں آیا تو اسی حدیث سے جس سے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم پیدا ہوتا ہے العیاذ باللہ لوگوں نے ڈاڑھیوں کے مٹانے کا حکم پیدا کر لیا،

جہاں تک میرا خیال ہے خواہ وہ اچھے رجحان ہی کے تحت کیوں نہ ہوا ہو لیکن اس طریقۂ عمل کی ابتدا اسکندر لودی کے عہد میں ان ہی "مچھی روٹی" والے صاحب سے ہوئی، اور اکبر کے زمانہ میں مختلف قرائن ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلط رجحانات

Marfat.com

کی توجیہیں اس سے فائدہ اُٹھایا گیا

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی صریح شہادت تو اس کی موجود نہیں ہے لیکن میرا غالب گمان یہی ہے کہ کافیہ کی صوفیانہ شرح بجائے ایک کے تین تین جو اس ملک میں لکھی گئیں، وہ اسی قسم کے فتنوں کے سدباب کا ایک بہترین طریقہ تھا، اس قسم کی گمراہ ذہنیتوں کا یہ بہترین علاج ہے، قرآن و حدیث میں تحریفِ معنوی کی قینچیاں جو چلائی جاتی ہیں، تو چلانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی دُور کی کوڑی لا رہے ہیں، گویا ابھی ابھی عقد ثریا سے کوئی تازہ خوشہ توڑ کر لائے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں یہ بدترین عباوت، اور دماغی توازن سے محرومی کی دلیل ہے کسی چیز کا نہ ماننا یہ اور بات ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے تو اس کا انکار صاف لفظوں میں کر دینا چاہیے، آپ کی سمجھ میں آدمی کا وجود تو ممکن ہے، مٹی کا یہ پتلہ دیکھ سکتا ہے، سُن سکتا ہے الغرض اس سے سارے حیاتی آثار ظاہر ہو سکتے ہیں، لیکن زندگی اور احساس کے یہی آثار اگر کسی غیر مرئی عنصر مثلاً ہوا یا نار یا نور وغیرہ کے کسی ٹکڑے یا قطعۂ خاص میں ظاہر ہوں، تو آپ کی عقل میں اگر یہ بات نہیں سماتی ہے جن اور ملائکہ کا وجود اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو علمی دیانت کا یہ اقتضا ہے کہ آپ اس کا علانیہ انکار کر دیجیے، لیکن اس خیانت اور مردہ ضمیری کا ثبوت تو نہ پیش کیجیے کہ قرآن میں بھی نہ ملائکہ کا ذکر ہے، نہ جنوں کا، اور یہ الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں، ان سے مراد آپ کا دماغی مقصد ہے یعنی عناصر کے قوی یا جنگلی آدمی وغیرہ وغیرہ، آپ کے نزدیک مسلمان اگر بدترین قوم ہے، خدا کی معتوب ہے، مقہور ہے، جہنمی ہے، تو آپ اس قوم سے جُدا ہو جائیے، اور جو آپ کی نظروں میں بہترین قومیں ہیں، خدا کی جو پیاری ہیں، جنت جن کا اجارہ ہے، ان میں جا کر شریک ہو جائیے، لیکن اپنے اس خیال کو قرآن پر تو نہ لادیے، آپ اس طریقہ سے خدا پر افتراء کر رہے ہیں، رسول پر جھوٹ باندھ رہے ہیں

Marfat.com

بہرحال اس قسم کے ماؤف عقول واذہان کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ قرآن وحدیث کے جن الفاظ میں اُنہوں نے اپنے دماغی مطالب پہنائے ہیں، اور اُن کو غلط فہمی ہو رہی ہو کہ ان کے ان دور از کار مطالب کی شاید قرآنی یا نبوی الفاظ میں کچھ گنجائش نکلتی ہو، ان کو چاہیے کہ ہندوستانی علماء کی ان تریاقی شرحوں کا مطالعہ کرلیں، جن میں نحو جیسے علم کی کتاب سے تصوف کے مسائل نکالے گئے ہیں، اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ بھینس سے انڈے اور رانڈوں سے روغن گل نکالنے کا کرشمہ جو آپ بڑے ناز وانداز، فخر وغرور سے دکھا رہے ہیں، یہ شاطروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، آپ اسی کو داہنے ہاتھ سے کھیلنے کی ناحق تکلیف اُٹھا رہے ہیں، آپ کی ذہنی سمیت ان شاء اللہ ان کتابوں سے زائل ہو جائیگی، آخر اتنا غبی کون ہوگا، جو واقع میں یہ باور کرنے لگے کہ ابن حاجب کی مُراد کافیہ کی عبارتوں سے حقائق ومعارف کے مسائل ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر کچھ بھی کسی میں سمجھ ہوگی، ضمیر میں تھوڑی سی زندگی بھی جن کے باقی ہوگی، اُن کی گردنیں ان کتابوں کے دیکھنے کے بعد شرم سے جُھک جائینگی ثابت ہوگا کہ اُنہوں نے بڑا بُرا کھیل کھیلا، کھیلنا تھا تو کچھ اسی قسم کی کتابوں کو بساط بنا کر کھیلتے، جن کے ساتھ اس قسم کی بازیگری شاید گناہ نہ ہو۔

ہندوستانی نظامِ تعلیم کے سلسلہ کی ایک اور بات جو بہ ظاہر خواہ جتنی بھی ناقابلِ لحاظ نظر آئے مگر میرے خیال میں اربابِ فکر کے لیے خاص توجہ کی دعوت دے رہی ہے وہ شیخ محدث دہلوی کی خود اپنی خود نوشتہ سوانح عمری کا وہ جز ہے جس میں اُنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کی یہ عجیب خصوصیت بیان کی ہے، شیخ نے اپنے حالات اخبار الاخیار کے آخر میں لکھے ہیں، اسی میں ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے والد نے

"اوّل از قرآن مجید بے سابقہ تعلیم وقواعد حروف ہجی کہ اطفال خوانند دو سہ جزء بلکہ کمتر واللہ اعلم تعلیم فرمودند"

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ہجار کے حروفِ مفردہ کی تعلیم کے بغیر براہ راست قرآن کے حروفِ مرکبہ ہی سے شیخ کی تعلیم شروع ہوئی، اور یہی بات سوچنے کی ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ

"سبق در سبق ایشاں می نوشتند و من می خواندم"

یعنی روزانہ قرآن کی چند سطریں لکھ لکھ کر ان کو پڑھاتے تھے، حروفِ تہجی کی شناسائی کے بغیر مرکب الفاظ سے تعلیم کا آغاز اور اُس میں اتنی کامیابی کہ شیخ فرماتے ہیں کہ وہی "دوسرا جز" جو اس طریقہ سے والد نے پڑھایا تھا۔

"قرآن ہمیں مقدار تعلم کردہ ام"

آگے قرآن خوانی کا ایسا ملکہ پیدا ہوگیا، اور

چناں قوت رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم

پیش ایشاں (والد) می گذرانیدم

سنتے ہیں وہی قرآن جسے عموماً بچے برس برس بلکہ اس سے زیادہ مدت میں ختم کرتے ہیں، شیخ فرماتے ہیں

"در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم" اخبار ۔ ص ۳۱۱

بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مجھے ذاتی تجربہ نہیں ہے لیکن شیخ نے جو بات لکھی ہے اگر یہ ان کے والد کی کرامت یا خود ان کی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، تو ان لوگوں کے لیے جو اس مسئلہ میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور عملی تجربات کے مواقع بھی ان کو حاصل ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا، کہ اس کا تجربہ کریں، بظاہر اتنی بات تو میری سمجھ میں بھی آتی ہے کہ حروفِ مفردہ کی تعلیم میں بچوں کو جیسے حروف سکھائے جاتے ہیں، الف، با کی شکلیں پہچنوائی جاتی ہیں، بجائے ان کے خود الحمد اور اللہ وغیرہ کی شکلیں ان کو کیوں نہ پہچنوائی جائیں، تاہم مسئلہ غور طلب ہے، ہندوستان کی تاریخ میں چونکہ اس کا تجربہ ہوا ہے اس لیے اربابِ نظر و فکر کے لیے اس کو پیش کر دیا گیا مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ چند سال ہوئے حیدرآباد کی نمائش میں ایک صاحب

Marfat.com

نے اُردو کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کے تجربہ کا دعویٰ کیا تھا، لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا غالباً انہوں نے اپنی کتاب کا نام "بولتا قاعدہ" رکھا تھا، کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے، مجھ سے بھی ملے تھے کہتے تھے کہ میرا قاعدہ تجربہ کی منزل سے گذر چکا ہے لیکن کسی نے توجہ نہ کی، شیخ نے اسی سلسلہ میں اپنی فارسی تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ

"شاید کہ چند جزو از بوستاں وگلستاں و دیوان خواجہ حافظ تعلیم کردہ باشند"

ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی نظم ونثر کی تعلیم ان کی بس ان ہی چند کتابوں کے انتخابات تک محدود تھی اس کے بعد انہوں نے جو کچھ پڑھا عربی زبان ہی کے متعلق پڑھا، اور اس سے میرے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے فارسی کی جو شکل بنا دی ہے، اور عربی الفاظ سے اس زبان کو انہوں نے مالا مال کر کے جو قالب اس کا تیار کر دیا ہے، کم از کم اس فارسی میں قابلیت حاصل کرنے کے لیے مسلسل فارسی ہی کی کتابیں پڑھتے چلے جانا جیسے کسی زمانہ میں رواج تھا، یعنی یوسف زلیخا کی مثنوی، سکندر نامہ بدر چاچ بہار دانش، طغرا، مینا بازار، رقعات عالمگیری، سہ نثر ظہوری، ترشیزی، ابوالفضل کے مکاتیب، انشائے خلیفہ، انوار سہیلی وغیرہ وغیرہ بیسیوں کتابوں کا ایک طومار تھا، لیکن پھر بھی جہاں کہیں کوئی قرآن کی آیت، عربی کا کوئی شعر، یا فقرہ یا عربی کا کوئی نامانوس لفظ یا نادرالوباب کے الفاظ ان کتابوں میں آجاتے تو طلبہ ہی کی نہیں مدرس صاحب کی پالکی بھی وہیں رکھ دی جاتی تھی، بچپن کے زمانہ میں خیال آتا ہے کہ گلستاں کے عربی اشعار کا ترجمہ مکتب کے جو مولوی صاحب بآسانی کرا سکتے تھے، اُن کا شمار فضلاءِ وقت میں ہوتا تھا، میرا خیال ہے کہ نظم، خصوصاً نثر کی ان تمام فارسی کتابوں کی ساری دشواریاں عربی الفاظ سے پیدا ہوئی ہیں، معمولی صرف ونحو، قدرے عربی ادب کے جاننے والوں کے نزدیک طغرا اور بدر چاچ، درہ نادرہ، انوار سہیلی وغیرہ کی عبارتوں کا حل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہوتا کہ ان کی دشواری عربی الفاظ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی لیے میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ

Marfat.com

فارسی کی تھوڑی سی مناسبت پیدا کر دینے کے بعد فارسی اور اردو ادب کی تکمیل کے لیے ضرورت ہے کہ بچوں کو عربی کی ابتدائی کتابیں بلکہ قرآن اور حدیث کے ذریعہ سے ادب عربی کی تعلیم صرف ونحو کی معمولی تعلیم کے بعد دلانی زیادہ مفید ہو سکتی ہے، جس کی شہادت میں شیخ محدث دہلوی کو میں پیش کر سکتا ہوں، گلستاں بوستاں اور دیوانِ حافظ کے چند انتخابات کے سوا انہوں نے فارسی میں کچھ نہیں پڑھا تھا، لیکن فارسی زبان پر ان کو جو قدرت حاصل ہے، اس کا اندازہ ان کی فارسی کتابوں سے ان کے مکاتیب وغیرہ سے ہو سکتا ہے، ان کی معیاری فارسی کا کون انکار کر سکتا ہے، فارسی کے بڑے سے بڑے انشاپرداز کے مقابلہ میں شیخ کا قلم پیچھے نہیں رہ سکتا، نظم بھی اچھی لکھتے ہیں[1] اور یہی مشورہ میرا اردو کے لیے ہے کہ اردو کے لیے اردو ہی کی کتابوں پر کتابیں پڑھانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ تھوڑی بہت فارسی وہی جزدے چند از گلستاں و بوستاں و خواجہ حافظ اسی قسم کے منظومات و منثورات سے گذارنے کے بعد بچوں کو عربی میں لگا دیا جائے، عربی کی تعلیم میں فارسی اور اردو دونوں کی قوت اور ترقی کا راز مضمر ہے، کم وقت میں فائدہ زیادہ اور بہت زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ عربی کی تعلیم اگر قرآن کے پاروں اور مختصر حدیثوں کے ذریعہ سے دی جائے، یعنی بجائے ادبی قصوں اور اشعار کے ان ہی کو ادب عربی کے سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو پھر مسلمان جس دینیات کے لزوم کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، وقتی طور پر دینیات کے چند مسائل کا سکھا دینا، اور عمر بھر کے لیے بچوں میں اس کی صلاحیت پیدا کر دینی کہ براہِ راست خطابِ الٰہی کے وہ مخاطب اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کو پیغمبر ہی کی زبان میں سمجھنے پر قادر ہو جائیں، دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے، میں نے پہلے بھی اپنے اس مالیخولیا کا ذکر کیا ہے اور دوبارہ پھر دہرایا ہے، شاید کہ کسی صاحبِ دل صاحبِ عمل کو

[1] حدائق الحنفیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ کی کتوبہ شعروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچتی ہے۔

ان ناچیز مشوروں کی طرف توجہ ہو جائے۔

ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام میں جس چیز کی ہمیں کمی نظر آتی ہے، یا کم از کم اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا، وہ عجیب بات ہے کہ ریاضی (حساب) کا مسئلہ ہے، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں ہندوؤں کے سوا خود مسلمانوں میں بھی بعض بڑے بڑے محاسب گذرے ہیں[۱]، لیکن مکتب خانوں میں بچوں کو حساب بھی سکھایا جاتا تھا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چلتا، ہندوؤں کے یہاں تو جیسا کہ اب تک پاٹھ شالوں میں رواج ہے، تقریباً حساب ہی سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اور یہ خاص قومی مزاج کی علامت ہے، جس پر یہ قوم مفطور ہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں پر خواہ وہ کسی حال میں ہوں، دین کا پہلو ہمیشہ غالب رہا ہے، اسی لیے سب سے پہلی چیز جس سے ان کے یہاں تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے وہ قرآن کے حروف ہجا کی تعلیم ہے، ان کا خیال ہے اور بجا خیال ہے کہ آئندہ بچہ کے ساتھ کس قسم کے حوادث پیش آئینگے اسے کون جان سکتا ہے تعلیم میں وہ کہاں تک جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے، اسی لیے ان کی نگاہ میں جو چیز ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، یعنی قرآن اس سے بچوں کو آشنا کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں، آئندہ اگر کچھ بھی نہ پڑھ سکا تو بیچارہ مر پٹ کر کچھ قرآن تو پڑھتا رہیگا، دنیا نہ سہی دین تو سنبھال لیگا، میرا بھی یہی خیال ہے کہ کچھ اور ہو یا نہ ہو، لیکن قرآن کی حرف شناسی کا جو مرحلہ ہے، اس کو تمام مراحلِ تعلیم پر مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک دلچسپ چیز اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری "حیات النذیر" میں نظر آئی، مطلب یہ ہے کہ جب سے ہندوستان میں جدید نظامِ تعلیم کا رواج ہوا ہے، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو معنی مطلب سمجھے بغیر بچوں کو قرآن پڑھانے کا مخالف ہے اور یہ گروہ اس طبقہ کے سوا ہے جو سرے سے قرآن پڑھانے کا ہی قائل نہیں، ظاہر ہے کہ یہ

---

[۱] مآثر الامراء دیکھیے خود نعمت اللہ شیرازی خانِ اعظم ان لوگوں کا شمار تو اس فن کے نوابغ جینیس میں ہے۔

طبقہ تو قابل خطاب بھی نہیں ہے، کیونکہ ان کا مسلمانوں سے صرف نسلی تعلق ہے، دینی حیثیت سے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن دولت کو چھوڑ چکے ہیں، اپنے مرنے جینے کا فلسفہ اُنھوں نے خود گڑھ لیا ہے یا بجائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلسلہ میں وہ کسی دوسرے کے مشوروں پر ایمان لا چکے ہیں۔

لیکن جو ابھی مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، اور مسلمان ہی مرنا چاہتے ہیں خود بھی یہی چاہتے ہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بھی یہی چاہتے ہیں، مگر باوجود اس کے ان کے دماغ میں کسی نے یہ وسوسہ پھونک دیا ہے کہ معنی مطلب سمجھے بغیر قرآن کے خود پڑھنے یا بچوں کو پڑھوانے کا کیا فائدہ ہے، یہ ترقی پسندوں کا گروہ ہے، شروع شروع میں ترقی پسندوں کی جو ٹولی ہندوستان میں بنی تھی اس کے ایک سرگرم رکن جیسا کہ سب جانتے ہیں ڈپٹی نذیر احمد صاحب بھی تھے، تجدد مآبی کا جنون جب شباب پر تھا، اُس وقت ڈپٹی صاحب کے خیالات بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق جو تھے، اسی کتاب میں ڈپٹی صاحب کے ایک خط سے (جو اپنے لڑکے مولوی بشیر احمد مرحوم کے نام اُنھوں نے لکھا تھا، ان الفاظ میں منقول ہیں، ڈپٹی صاحب نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔

تم کو پہلے قرآن شریف شروع نہیں کرایا، کہ تم اس کو نہیں سمجھ سکتے اور بے سمجھے الفاظ کا دہرانا بے فائدہ اور لاحاصل ہے

لیکن جوں جوں ترقی پسندی کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا، قبر کا گڑھا منہ پھاڑے سامنے جھانکتا نظر آنے لگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کے ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے، اس کے بعد بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق اپنی بدلی ہوئی رائے جو اُنھوں نے قلم بند کی تھی وہ اسی کتاب میں، ہے:

"بڑے ہو کر خدا جانے اعصاب دہن (یعنی مُنہ کے رگ پٹھوں) میں کچھ ایسی خلوت سختی و کرختگی آجاتی ہے کہ زبان جن حروف کے ادا کرنے کی ابتداً سے

Marfat.com

خوگر نہیں ہوتی پھر وہ اس سے بڑی عمر میں ادا نہیں ہو سکتے"

اور اسی تجربہ اور مشاہدہ نے ڈپٹی صاحب کو اس خیال کے قائم کرنے پر مجبور کیا کہ

"طوطے کی طرح پڑھنا بھی خاص کر مسلمان بچوں کے لیے ضروری ہے"

ڈپٹی نذیر احمد نے اس کے بعد ایک اور دلچسپ دلیل اس کی یہ پیش کی ہے۔

"اگر یہ بے سود ہو، تو مولود (پیدا ہونے والے نوزائیدہ بچے) کے کان میں اذان کا دینا اس سے بھی زیادہ بے سود فعل عبث ہے"

کوئی شبہ نہیں کہ ڈپٹی صاحب کا یہ سوال ایک چبھتا ہوا سوال ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس دقیانوسی ترقی پسند انسان کو کیا معلوم کہ جس چیز کو آپ حجت میں پیش کر رہے ہیں، یعنی نومولود بچوں کی کان والی اذان خود اُسی کے افادہ پر ان ہی کے پروردہ ترقی پسند نوجوانوں کو کب اعتماد ہے۔

ڈپٹی صاحب نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ اور تجربہ کی بات یہ بھی بیان کی ہے کہ

"سب سے بڑا فائدہ بچوں کو طوطوں کی طرح بے فہم مطلب قرآن پڑھانے سے مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ چاہے کوئی اس کو حسنِ عقیدت سمجھے، یہ ہے کہ قرآن خواں لڑکے زیادہ مودب اور کم آزار دیکھے جاتے ہیں، وجہ یہ کہ قرآن شریف پڑھنے کے لیے مؤدب بٹھائے جاتے ہیں، اور ادب رفتہ رفتہ داخل عادت ہو جاتا ہے"

ایک فائدہ یہ بھی بتایا ہے کہ

"قرآن سے بچوں کو تعلیم شروع کرنے کا یہ مفاد بھی کچھ کم نہیں کہ ذہین بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں مماثلت خطی کے سہارے قرآن کا اردو ترجمہ پڑھنے پر قادر ہو جاتے ہیں، بہ یک کرشمہ دو کار"

یہ بھی ان ہی کا آخری تجربہ ہے۔

Marfat.com

تعلیم کے پُرانے طریقے کے رو سے قرآن پڑھنے کے ضمن میں بچے چھوٹی چھوٹی دس پانچ سورتیں بھی نماز کے لیے یاد کر لیا کرتے تھے، یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے جو جدید طریقہ سے تعلیم پا رہے ہیں ان کو "الحمد" تک پوری نہیں آتی، درود اور التحیات کی کون کہے، اور آئے کہاں سے، بیچاروں کو راستہ پر ڈالا ہی نہیں۔ ص ۱۲ حیات النذیر

ایجوکیشنل کانفرنس کے پُرانے جلسوں میں قدیم تعلیم کی تضحیک و تحمیق پر لکچر دینے والوں کو دیکھ رہے ہیں، وہی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو اپنی راہ سے پھیرا تھا، آج اس کا دکھڑا لے کر بیٹھے ہیں کہ مسلمان بچوں کو "الحمد" بھی پوری یاد نہیں ہوتی۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے عفا اللہ عنہم

بہر حال اگر ہمیں اس ملک میں مسلمان ہو کر جینا ہے اور مرنا بھی ہے اسلام اور ایمان کے ساتھ، اپنے متعلق بھی جن کا یہی خیال ہے، اور اپنے بچوں کے متعلق بھی جن کی یہی آرزو ہے، ان کے لیے ناگزیر ہے، خواہ کچھ بھی کہا جائے کچھ بھی سُنا جائے لیکن قرآن مجید سے بچوں کی تعلیم کی ابتداء کا جو قاعدہ تیرہ سو سال سے نسلاً بعد نسلٍ ہر ملک اور خطہ میں چلا آرہا ہے، اس کو بہر حال باقی رکھنا چاہیے۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

لیکن اسی کے ساتھ اس زمانہ کے جدید اسکولوں میں بچوں کو حساب کی تعلیم جس وقت اور جس عمر سے شروع کرائی جاتی ہے، اس سے بھی غفلت نہ برتنی چاہیے۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا ہندوستان میں کیا ہوتا تھا، اس وقت تک کوئی وثیقہ اس باب میں نفیاً یا اثباتاً مجھے نہیں ملا ہے، لیکن ابن خلکان سے ابن سینا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو فقرہ میں نے نقل کیا تھا، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ ساتھ حساب الہند اور دوسرے

حسابی قواعد بچوں کو قدیم زمانہ سے سکھانے کا رواج مسلمانوں میں پایا جاتا تھا۔[1] بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے کہ عام سرکاری مدارس کے میٹرک کلاس تک حساب کی جتنی تعلیم دی جاتی ہے، اسلامی مکاتب میں اتنی تعلیم حساب کی تو ضروری ہے، گویا اردو اور اردو کو قوی کرنے کے لیے فارسی، فارسی میں زور پہنچانے کے لیے عربی کا ایک سلسلہ جاری رہیگا۔ اور دوسرا مضمون اسی کے ساتھ ساتھ حساب کا بھی مسلسل جاری رہنا چاہیے میٹرک کی منزل تک اسی سلسلہ کو پہنچا دینا چاہیے، نیز حکومتِ وقت کی جو زبان ہو اس کی تعلیم کی بھی گنجائش آغاز تعلیم کے تیسرے چوتھے سال سے نکالنی چاہیے، قرآن کے سوا ان تینوں سلسلوں کو مکاتب میں جہاں تک میرا خیال ہے لازمی طور پر ہر بچہ کے لیے جاری رہنا چاہیے، البتہ عمر کے حساب سے بعض سلسلے، مثلاً حکومت کی زبان کا سلسلہ خصوصاً جب اجنبی زبان ہو، مناسب ہوگا کہ چند سال کے بعد شروع کیا جائے۔

ان تین لازمی سلسلوں کے ساتھ اور بھی کچھ گنجائش نکلے تو ایسے مضامین جو تعلیم کے بغیر نہیں آسکتے، ان کو بھی رکھا جاسکتا ہے، لیکن مسلمانوں کو بہرحال بزرگوں کا وہ طریقہ یعنی قرآن سے تعلیم کی ابتدا، اس کو کسی حال میں قطعاً کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے البتہ سہولت پیدا کرنے کے لیے طریقۂ تعلیم میں ردوبدل ممکن ہے، مثلاً شیخ محدث نے جو طریقہ اپنی تعلیم کا بتایا ہے اس کو آزما کر دیکھا جائے، بہرحال کچھ بھی ہو، قرآن سے آغازِ تعلیم یہ ہمارے بزرگوں کا وہ متروکہ ہے جس پر ہر زمانہ میں ہر اسلامی ملک نے اصرار کیا ہے، اسلامی گھرانوں میں بشرطیکہ وہ اسلامی باقی بھی رہ گئے ہوں، تسمیہ خوانی کی رسم کو جن خصوصیتوں کے ساتھ ہم آج پا رہے ہیں، بجنسہ اپنے ان ہی لوازم کے ساتھ یہ رسم اسی ملک میں آج سے پانچ چھ سو سال پیشتر بھی ادا ہو رہی تھی، فوائد الفواد میں

[1] ابوالفضل نے آئین اکبری میں عہد اکبری کے نصاب کا ذکر کیا ہے، اس میں اور چیزوں کے ساتھ حساب و ریاضی کا بھی ذکر ابتدائی مکتبی تعلیم کے سلسلہ میں کیا گیا ہے ۱۲۔

امیر حسن علا سنجری ناقل ہیں کہ

شنبہ شانزدہم ماہ محرم ۷۱۶ھ سعادت دست بوس حاصل شد، بندہ آں

روز خردکے را از اعزہ پیش برد، عرضداشت کرد کہ ایں را بہ قرآن خواندن

فرستادہ می شود اول بخدمت مخدوم آوردہ شدہ است تا بہ برکت نظر مخدوم

ونفس پاک خدائے تعالیٰ اورا قرآن روزی کند" ص۱۰

اور یہی رواج بحمداللہ مسلمانوں میں اب تک جاری ہے کہ شہر یا قصبہ، گاؤں میں نسبتاً جو
زیادہ صاحبِ دین وعلم ہو، بچوں کا مکتب ان ہی سے کراتے ہیں، امیر حسن اس کے
بعد لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے یہ سُن کر "دعا خیر ارزانی داشت"
جب دعا ہو چکی

بعد ازاں تختہ بدست مبارک گرفت و نوشت "بسم اللہ الرحمن الرحیم"

"اللہ الرحمن الرحیم" کی یاد تو ہر کام سے پیشتر مسلمانوں کا دستور ہی ہے، لیکن عجب بات
ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ آج بھی بچوں کے مکتب کا آغاز ہوتا ہے، سلطان المشائخ رحمتہ
اللہ علیہ کے زمانہ میں بھی آغاز کے وہی الفاظ مروج تھے حسن لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کے
بعد حضرت والا نے ارقام فرمایا۔

"رب یسر ولا تعسر" (اے اللہ علم کو آسان کر اسے دشوار نہ بنا)

"ا ب ت ث ج"

ہجا کے یہ حروف سلطان المشائخ نے اپنے دست مبارک سے لکھے، خردک آگے بڑھایا
گیا، اور حضرت والا نے

"آں گاہ ایں حروف را بزبانِ مبارک خود تلقین کرد"

یہ چھ سو سال کی تسمیہ خوانی اور آغاز مکتب کی رپورٹ دلّی کی ہے لیکن جیسا کہ میں نے
عرض کیا کہ مسلمان اس ملک کے جس گوشہ میں بھی آباد تھے، باوجود مسافت کے زنگ

Marfat.com

سب کا ایک تھا، عہد خلجی و تغلقی میں یہ تماشا آپ کو دلّی میں نظر آ رہا ہے، آئیے، سیکڑوں میل دور دلّی سے مشرق چلے آئیے، بہار آ جائیے، یہاں مخدوم الملک حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ مسندِ ارشاد پر جلوہ فرما ہیں، ان کے ملفوظات طیبہ معدن المعانی کے نام سے مطبوع ہو چکے ہیں، ایک مجلس کا ذکر جامع ملفوظ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"قاضی شرف الدین خواہر زادۂ خود بردہ بود و عرضداشت کہ امروز روز تعلیم خواہر زادۂ بندہ ماست، مطلوب ایں است کہ اول تختہ پیش مخدوم آغاز کند"

ایک ذہنیت، ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ سے دلّی میں بھی بچے آغاز مکتب کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں اور بہار میں بھی۔

دلّی میں بھی آپ نے دیکھا تھا کہ تختہ کو لے کر سلطان المشائخ نے اس میں ارقام فرمایا تھا، یہاں بھی دیکھیے جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ قاضی شرف الدین نے عرض کیا

"اول تختہ بندگی مخدوم بدست مبارک نویسد، بندگی مخدوم عظمہ اللہ اجابت فرمود بدست مبارک ایں چہار حرف نبشت ا ب ت ث بعدہ اورا ہمیں چہار حرف تعلیم کرد"

البتہ یہاں طریقۂ تلقین میں ذرا سا فرق ہے، یعنی مخدوم الملک نے اس کے بعد خواہر زادۂ قاضی کو کہا۔

"بگو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان پسرک (اللہ الرحمٰن الرحیم کے نام سے کہ علم کو تجھ پر آسان کرے) بچہ نے

"بسم اللہ تمام گفت بعدہٗ اں چہار حرف تعلیم تلقین فرمود"

اور بچہ سے صرف چار حروف ہی بسم کے ساتھ ادا نہیں کرائے گئے بلکہ

ان پسرک نیز چنانچہ بندگی مخدوم تعلیم فرمود ہمچناں حرف چہارا بگفت"

Marfat.com

واللہ اعلم خود بچّے نے سب کے ساتھ اسے بھی ادا کر دیا یا ادا کرایا گیا، مکتب کی رسم ادا ہو گئی۔

بعدہ برلفظ مبارک راند کہ "الحمد للہ" وایں دعا در حق وے ارزانی فرمود کہ حق تعالےٰ

ترا عالم گرداند"

بچہ کا مکتب ختم ہو گیا، اب بڑوں کی تعلیم شروع ہوئی جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ اسی مناسبت سے حضرت والا نے انسانیت کی ان بلندیوں کی طرف اشارہ فرمایا جو آدمی زادہ کو تعلیم عطا کرتی ہے، فرمایا عجب بات فرمائی

"از الف تا با وتا کجا با بُدر سانید"

خود جو یہ کہہ رہا تھا، اُسی الف تا بآ نے دنیا اور دین کی مخدوم الملکی کے کس مقام تک اُسے پہنچایا، کہ ابو الفضل جیسا طاغی بھی ان کے ترجمہ میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

زاداں تصنیف از و یادگار از اں میان مکتوبات او در شکنی نفس آزموں دارد

(ج ۳ ص ۱۷۲)

شیخ محدث نے تو بجائے تعارف کے یہ ارقام فرما کر

"وے از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند او را تصانیف عالی ست" ص ۱۱۱

اور صرف چند مکاتیب کو نقل کر کے بجائے بگوئید کے مشک کے لیے بر بوید کے تجربہ پر ان کے فضائل کو محول کر دیا۔

مکتب کے اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حسب دستور مکتب کے بعد دعوت یا مٹھائی وغیرہ کوئی چیز تقسیم ہوئی یا نہیں، غالب گمان یہ ہے کہ یہ رسم ادا ہوئی ہوگی، امیر حسن علا نے ذکر نہیں فرمایا، لیکن مخدوم الملک کے جامع ملفوظات نے اس کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں

طعامے نیز آوردہ بودند پیش یاراں کشیدند یک کاک (بسکٹ) وقدرے
شیرینی بندگی مخدوم بستدو ہماں پسرک را خورانیدن گرفت وایں لفظ فرمود
کہ "ما خدمت تو کنم" (معدن المعانی ص ۴۲)

ہر پہلی نسل پچھلی نسل کی خادم ہے، گویا اسی نظریہ کی طرف گومزاحاً سہی اشارہ تھا، رحمہم اللہ اجمعین، شاید اس بہاری مخدوم کے اس بہاری خادم کی غرض اپنی بکواس سے بھی یہی ہو اللھم ارزقنا اتباعھم، وتقبل منا انک انت السمیع العلیم، ھذا واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

۱۷- ربیع المنور سنہ ۱۳۶۱ھ پنجشنبہ

حیدرآباد دکن، جوار الجامعۃ العثمانیہ

Marfat.com

دعاءِ خاتمہ

کتابوں میں خاتمہ لکھنے کا بھی عام دستور ہے، جب میرے اس مضمون نے کتاب ہی کی شکل اختیار کرلی، تو یہ رسم بھی کیوں چھوڑی جائے لیکن کیا لکھوں؟ بعض کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ دیباچوں، یا تمہیدی کلام ہی میں ان کے مصنفین کتاب کے ناظرین سے صلہ کی خواہش خواہ وہ کسی شکل میں ہو مثلاً دعا ہی کی آرزو اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے کرتے ہیں، مگر بہ ظاہر میرے خیال میں یہ استدعا کچھ قبل از وقت ہے، حقیقی مقام اس کا خاتمہ ہی ہو سکتا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد اگر کسی کو اس کتاب سے یا اس کے کسی جزء سے کسی قسم کا کوئی فائدہ محسوس ہوا ہو، تو غالباً اس کے بعد "دعاءِ ظہر الغیب" کی تمنا بے جا نہ ہوگی، اسی بنیاد پر اب میری التجا ہے کہ خود مجھے میرے والدین مرحومین اور میرے اساتذۂ کرام کو ناظرین حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعاؤں سے محروم نہ فرمائینگے، علی الخصوص عم محترم استاذ معظم حضرت مولانا الحکیم الحاج السید محمد ابو النصر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کی آغوشِ تربیت میں فقیر کی تعلیم ہوئی، اور سلامت روی کی راہ کا بڑا حصہ ان ہی کی پاک صحبتوں میں میسر آیا، فاتحہ خیر سے ان کی روح پُرفتوح کو سکون بخشینگے،

اللھم ارحمہ کما ربیانی صغیرا

اسی کے ساتھ آخر میں اپنے عزیز دوست و صاحب مولوی محمد مخدوم محی الدین صاحب حیدرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ خود اپنی طرف سے اور ان تمام لوگوں کی طرف سے ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں جو اس کتاب کو اپنے مطالعہ سے سرفراز فرمائینگے۔ مخدوم صاحب نے بڑی جانکاہی اور محنت سے میرے مسودہ (نامہ سیاہ) کو سچ پوچھیے تو مبیضہ (نامۂ سفید) کی شکل میں بدل دیا ہے، اگر ان کی دستگیری میسر نہ آتی، تو جس طرح میرے بہت سے مسودے مسودوں کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے اس کا حال بھی یہی ہو جاتا، ناظرین اپنی دعاؤں سے ان کو بھی اور ان کے والد مرحوم کو فراموش نہ فرمائینگے۔

Marfat.com

غالباً خواہد کشود از خام رام کالے کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبح آمیں می دمید (عارف شیرازی)

۲۶۔ ذی حجہ سنہ ۱۳۶۱ھ م یکم اسفندیار سنہ ۱۳۵۲ ف

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات، آج ۴۔ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء روز دوشنبہ بعد الظہر اپنے وطن گیلانی (بہار) میں اس مبیضہ کی نظر ثانی سے فراغت میسر آئی

کہف الایمان ”گیلان (بہار)

Marfat.com

ہماری دیگر مطبوعات

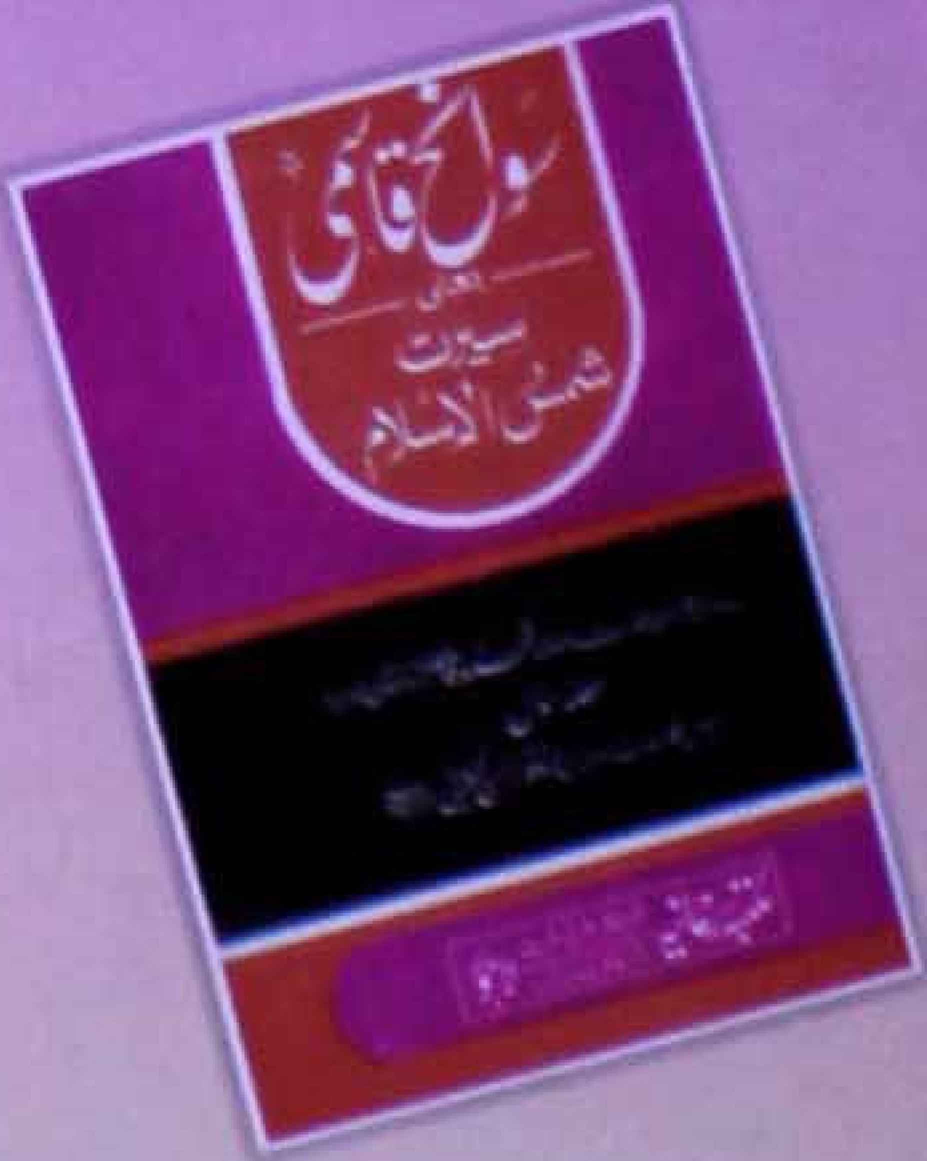

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

فون: 042-7355743-7224228 فیکس: 042-7221395

Marfat.com